رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

سالنامہ

جنوری ۱۹۶۳ء

۹۶

مدیر

محمد طفیل

اُردو مرکز (جامعہ)
اندرا نگر۔ دہلی
اُردو مرکز (جامعہ)
ماندرا نگر۔ دہلی

قیمت موجودہ پرچہ
۶ روپیہ

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالک غیر سے ۲۵ روپے

ادارۂ فروغِ اُردو۔ لاہور

طلوع

لت کوئی بھی ہو، بُری ہوتی ہے۔ اگر کوئی لت لگی نہ ہو۔ تو زندگی کا لطف بھی کیا۔ اس اعتبار سے خوش بخت ہوں کہ ایک چھوڑ کئی کئی لتیں لگا رکھی ہیں۔

پچھلے دنوں دوست احباب "تعزیت" کے لیے آنے لگے — "بھئی کیا بات ہے۔ اب کوئی خاص نمبر نہیں آ رہا؟" — میں جواب دیتا رہا — "بہت ہو چکی، تھک گیا ہوں، کوئی موضوع بھی تو ہو۔ جن جن نمبروں کا ڈول ڈال رکھا ہے۔ وہی مکمل نہیں ہوتے۔ کیا کروں؟ — میں تو خود شوق اور بے بسی کے درمیان معلق ہوں۔"

یاروں نے مشورہ دیا: "اور کچھ نہیں تو ہر سال ایک سالنامہ ہی نکال دیا کریں۔"

چلو، یہ بات، اس نمبر کے نکالنے کے لیے سہارا بن گئی — وہی لت والی بات!

یوں تو نقوش کے پہلے بھی سالنامے نکلے۔ مگر یہ پہلا نمبر ہے۔ جسے میں خود سالنامہ سمجھ کر پیش کر رہا ہوں۔ ایک آدھ دفعہ کے علاوہ، پہلے تو یہ ہوا کہ بغیر کسی پلان کے، اگر زیادہ چیزیں جمع ہو گئیں تو ادارہ نے پرچے کی پیشانی پر سالنامہ کا لفظ لکھ دیا۔ اب کے ایسا نہیں ہوا۔ اچھا یا بُرا، جو کچھ بھی ہوا۔ خوب سوچ سمجھ کر ہوا۔ ذرا آپ بھی تو دیکھیں کہ اس سالنامہ پر زرِ کثیر صرف ہوا ہے۔ یا کثیر خونِ دل، یا کچھ بھی نہیں؟ — میں اپنی طرف سے کیا کہوں، چُورا ہو چکا ہوں۔ اگر کچھ بھی سکت ہوتی، تو باتیں کرنے کی بجائے، آسمان سے اور تارے نہ توڑ لاتا — اب ذرا اطمینان ہے تو یہ، کہ میرا قلم گُنگ بھی ہوا تو نقوش کے صفحات بولیں گے۔

منٹو کہا کرتے تھے "جب تک میرا لکھا ہوا افسانہ چھپ نہیں جاتا۔ میں یہی سوچتا ہوں میرے ہاں میت رکھی ہے۔" میں بھی اپنی اور اپنے دوستوں کی کاوشوں کو جب تک آپ کے حوالے نہیں کر لیتا۔ چین نہیں پڑتا۔ بے کل رہتا ہوں۔ جان سُولی پر لٹکتی رہتی ہے۔

اُف! — خونِ دل کی سبیل لگانا بھی کتنا دشوار ہے!

— محمد طفیل

ڈاکٹر اعجاز حسین

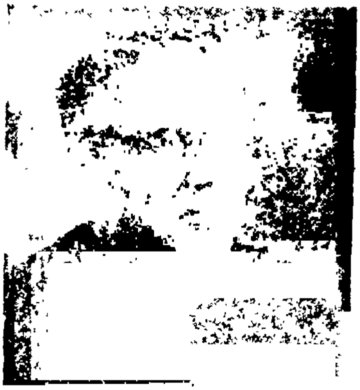

راز یزدانی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

منظور الہی

نثار احمد فاروقی

کرنل عبدالرشید

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

سہیل بخاری

محمد اکبر الدین صدیقی

عبدالعزیز خالد

نور بجنوری

شفقت کاظمی

صادق حسین

سلمےٰ صدیقی

بشیر بدر

اختر جمال

رفعت سلطان

مصطفےٰ ز[illegible]

جوگندر پال

رام لعل

احمد سعید

امر سنگھ

[illegible] انجم

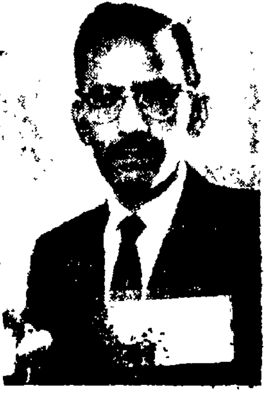
احمد شریف

ترتیب

میں آپ کے دو تین منٹ اور ضائع کروں گا۔

لاہور نمبر کے بعد، لاہور ہی کے بارے میں مضامین کا سلسلہ پچھلے دو تین شماروں سے شروع کر رکھا ہے۔ اب کے مکاتیب نمبر کا بھی جمع جتھا، جب سامنے رکھ کر بیٹھا تو جی چاہنے لگا کہ کسی طرح اپنے تمام نامکمل کاموں کو بھی مختصر مگر مکمل ہی کرتا چلا جاؤں۔ اس لیے کہ کوئی عمرِ خضر لے کے تھوڑی آیا ہوں کہ صدیوں کے پلان بنا کے بیٹھ رہوں۔ یہی دھڑکا مکاتیب نمبر (جلد دوم) کے لیے روک بن گیا۔ چنانچہ اب مکاتیب نمبر کی الگ کوئی جلد نہ چھاپوں گا۔ بلکہ عام شماروں میں، برسوں کی محنت سے جمع کیے ہوئے خط، قارئین کے سامنے پیش کرتا رہوں گا۔ یوں میری آرزوؤں کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر مجھے اب یہ سب کچھ منظور ہے۔ یہ سب سوچ کر دُکھ بھی ہوتا ہے۔ مگر آج کل ایک انسان کے دُکھ کی قیمت ہی کیا ہے۔

اس شمارہ میں چند چیزیں "نوادرات" کے عنوان سے پیش کی جا رہی ہیں۔ غالب کے بارہ غیر مطبوعہ خط، مولانا حالی کا غیر مطبوعہ کلام، مولوی عنایت اللہ دہلوی کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کا سلسلہ، یہ ساری ادبی دستاویزیں موجود تھیں اور برسوں سے موجود تھیں مگر انھیں پیش کرنے کا فخر نقوش ہی کے مقدر میں تھا۔

ایشیا کے نامور مصور، عبدالرحمٰن چغتائی نے ہمیشہ ہی سے ادارۂ نقوش پر اپنی عنایتیں ارزانی رکھیں۔ اس بار بھی نقوش کا سرورق انہی کے موقلم کا شاہکار ہے۔ اب کے تو نہ صرف ٹائیٹل بنا کر مرحمت فرمایا بلکہ مصور کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار بھی (ایک الگ مضمون کی صورت میں) کیا اور پھر میری درخواست پر اپنی چار تصویریں بھی اشاعت کے لیے دیں[1]۔ (میں سمجھ یوں سوچا کہ ایک بڑے آرٹسٹ کی فکری اڑانوں کے ساتھ، جب تک اُس کے اپنے فن کا عملی ثبوت بہم نہ پہنچایا جائے۔ بات ادھوری رہے گی) ــــ جو لوگ فوٹو گرافی اور آرٹ کو دو الگ الگ فن سمجھتے ہوں گے۔ وہ ان تصویروں میں بہت کچھ پائیں گے اتنا کچھ کہ جو پاک و ہند کے کسی مصور کو نصیب نہ ہوا۔

اس مرتبہ فوٹو صرف اُن دوستوں کی چھاپ رہے ہیں۔ جن کی تصویریں آج تک نقوش میں نہیں چھپیں۔ یہ عمداً ہے یا بدعت جو کچھ بھی نام دیں شعوری ہے۔ ان میں بزرگ بھی ہیں "ادھ کڑ" بھی، جوان بھی، مگر یہ اپنی اپنی جگہ نگینہ!

لیجئے اب آپ پرچہ پڑھیں۔ مجھے اجازت دیں۔ اس لیے کہ میرا ملازم کہہ رہا ہے "بابو جی ٹیکسی لے آؤں۔ بارہ بجے کے بعد تو ٹیکسی بھی نہیں ملتی ــــ اور ابھی اس سے تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا ــ بابو جی! ــــ میں نے سنا ہے " دنیا کے کئی بڑے آدمی پاگل تھے "

میرا خیال ہے کہ میرا ملازم مجھے بڑا آدمی تو نہیں سمجھتا۔ مگر اُسے یہ شک ضرور ہے ــــ صاحب پاگل ہے۔

---

[1] یہ تصویریں نقش چغتائی کی ہیں۔ جو ۲۹ برس کے بعد دوبارہ شائع ہوا ہے۔

۹۶۲۷

نوادرات

۱ — نوادرِ غالب	(غالب کے ۱۲ غیر مطبوعہ خط)	عطیۂ نثار احمد فاروقی	۷
۲ — واقعۂ ہجرت	(مولانا حالیؔ کا غیر مطبوعہ کلام)	عطیۂ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۲۸
۳ — تاریخِ مغل	(عنایت اللہ دہلوی کا غیر مطبوعہ ترجمہ)	عطیۂ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۳۰

غالبؔ کے چار شعر ، چغتائی کی چار تصویریں ، ۹۷

مضامین

۴ — مکاتیب	مولوی ڈاکٹر عبدالحق	۵۲
۵ — تخلیق اور تخلیق کار	عبدالرحمٰن چغتائی	۸۷
۶ — شاعری میں عظمتِ گناہ	ڈاکٹر اعجاز حسین	۹۷
۷ — قومی یک جہتی کا مسئلہ	فراق گورکھپوری	۱۰۷
۸ — رنگین کی تصنیفات	عبدالقادر سروری	۱۱۳
۹ — دیوانِ نوا	قاضی عبدالودود	۱۱۹
۱۰ — شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین	مختار الدین آرزو	۱۲۳
۱۱ — مثنویاتِ رنگین	ڈاکٹر گیان چند	۱۳۵
۱۲ — عظمت اللہ خاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۱۴۵
۱۳ — خانِ آرزو	راز یزدانی	۱۶۳
۱۴ — مومن کے ناقدین	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۷۹
۱۵ — ادبی تنقید کے مسائل	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۰۰
۱۶ — اردو کی زبان کا آغاز	سہیل بخاری	۲۰۸
۱۷ — تحقیقاتِ امیر مینائی	کسریٰ منہاس	۲۳۰
۱۸ — وقت کا ادب اور زندگی کے ساتھ رشتہ	یوسف جمال انصاری	۲۴۷
۱۹ — ڈاکٹر زورؔ صاحب	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۵۷
۲۰ — بنگلہ دیش	منظور الٰہی	۲۶۶
۲۱ — لاہور کی چند تاریخی عمارتیں اور ان کے کتبے	کرنل عبدالرشید	۲۷۸
۲۲ — لاہور نامہ	آغا صادق	۲۷۷

نظمیں ، غزلیں

۱ — نعتِ سرورِ کونین (صلعم)	جگر مراد آبادی	۲۸۰
۲ — دعوتِ سفر	جوش ملیح آبادی	۲۸۱
۳ — یہ گھاٹیاں یہ اداسی یہاں نہ باندھو ناؤ	فراق گورکھپوری	۲۸۲
۴ — کھینچی، ہال کا پردہ بھی چھوڑ دے	اثر لکھنوی	۲۸۳

۵ —	نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	فیض احمد فیض، ۲۸۴
۶ —	نقشِ ہستی معجزہ ہے سعیٔ تدبیر کا	حفیظ ہوشیارپوری، ۲۸۵
۷ —	عام ہو جائے نہ میرے بتِ سے فام کا نام	احمد ندیم قاسمی، ۲۸۶
۸ —	بارکش	مجید امجد، ۲۸۷
۹ —	دستِ پُرخوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے	مجروح سلطان پوری، ۲۸۸
۱۰ —	مشکل سے اُس بت کی قسمیں	شاد عارفی، ۲۸۹
۱۱ —	اے ہم وطنو	مصطفےٰ زیدی، ۲۹۱
۱۲ —	وفا نے شکوۂ تسلیم اختیار کیا	غلام ربانی تاباںؔ، ۲۹۵
۱۳ —	مرثیہ	جگن ناتھ آزاد، ۲۹۶
۱۴ —	جنوں سے حلقۂ دانش کے درمیان پہنچی	راز یزدانی، ۲۹۷
۱۵ —	کلائی اس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی	میکش اکبرآبادی، ۲۹۸
۱۶ —	دل کا فسانہ طلسم ہوشربا ہے	عبدالعزیز خالد، ۲۹۹
۱۷ —	آپ کی جب سے توجہ کم ہے	عبدالمجید حیرتؔ، ۲۰۲
۱۸ —	ٹیڑھی دیوار	ظہور نظر، ۳۰۳
۱۹ —	مجھے اب اعتبارِ غم نہیں ہے	ساغر لکھنوی، ۳۰۵
۲۰ —	ایک حادثہ	نور بجنوری، ۳۰۶
۲۱ —	خوابوں سے ڈر لگتا ہے	خلیل الرحمٰن اعظمی، ۳۰۸
۲۲ —	شعر گوئی کی میسر ہو جو فرصت اے دوست	احسن علی خاں، ۳۰۹
۲۳ —	رو رو آنسو خشک ہوئے برسات آئی، برسات آئی	جمیل ملک، ۳۱۱
۲۴ —	طلوع و غروب	فارغ بخاری، ۳۱۲
۲۵ —	جان پہچان	خاطر غزنوی، ۳۱۳
۲۶ —	خوش ہو کے سہہ رہا ہوں زمانے کے غم ابھی	شفقت کاظمی، ۳۱۵
۲۷ —	زہر بھی اب نہیں پہچانے ہیں	رفعت سلطان، ۳۱۶
۲۸ —	کسی گوشہ بُدھ ہے تن من کی کس کو ہے اپنا چاؤ یہاں	یوسف جمال انصاری، ۳۱۷
۲۹ —	جب تک نگارِ دوست کا سینہ دُکھا نہ تھا	بشیر بدر، ۳۱۸
۳۰ —	صحنِ چمن میں ذکر ہے گفتارِ یار کا	خالد مینائی، ۳۱۹
۳۱ —	یوں تو خود کو کبھی آوارہ و رسوا کرتے	اختر ہوشیارپوری، ۳۲۰
۳۲ —	جاگتا سوتا موسم	شاعر ندیم، ۳۲۱
۳۳ —	عالمی اسلحہ۔ نمائش	ابوسعید قریشی، ۳۲۲
۳۴ —	پوچھو دریا کا خبر دینے لگیں گے نہر کی	آتش لدھیانوی، ۳۲۹
۳۵ —	شہرِ طلب میں آج عجب حادثہ ہوا	صادق نسیم، ۳۳۰
۳۶ —	یہ کس کی آنچ ہے کس کے بدن کی خوشبو ہے	خورشید احمد جامی، ۳۳۱
۳۷ —	خوشا وہ دور کہ جب تجھ سے رسم و راہ نہ تھی	عبید اللہ علیم ۳۳۲
۳۸ —	محقق	راہی، ۳۳۳
۳۹ —	ٹیڈی گرل	غلام احمد فرقت، ۳۳۶

افسانے

۱ ـ ایک دوست کی موت — کرشن چندر، ۴۴۳ (332)
۲ ـ روشنی — عصمت چغتائی، ۴۵۹۱
۳ ـ فیشن — احمد ندیم قاسمی، ۴۷۰
۴ ـ ماں جی — قدرت اللہ شہاب، ۳۵۰
۵ ـ پھول کی چھڑی — علی عباس حسینی، ۳۵۸۱
۶ ـ سشاف آرٹسٹ — ممتاز مفتی، ۳۶۳
۷ ـ خرمن — خدیجہ مستور، ۴۸۲
۸ ـ نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — ل احمد، ۳۷۴
۹ ـ سوکھے پتے — حجاب امتیاز علی، ۳۷۷
۱۰ ـ تہمت — کنہیالال کپور، ۴۰۰
۱۱ ـ گاڈ بلس یُو — مہندر ناتھ، ۴۹۸
۱۲ ـ بے مصرف ہاتھ — جیلانی بانو، ۵۰۹
۱۳ ـ پتھیرا — صادق حسین، ۵۲۰
۱۴ ـ سکندر نامہ — سلمیٰ صدیقی، ۴۰۳
۱۵ ـ میری شادی کی پچیسویں سالگرہ — فکر تونسوی، ۴۳۴
۱۶ ـ لمحے — مختار مسعود،
۱۷ ـ رنگوں کا بھرم — جوگندر پال، ۴۳۹
۱۸ ـ دھرتی — رام لعل، ۴۵۱
۱۹ ـ اُڑان اپنی اپنی — امر سنگھ، ۵۲۳
۲۰ ـ شام کے ساتھی — رتن سنگھ، ۴۵۶
۲۱ ـ اُترن — احمد شریف، ۵۴۵
۲۲ ـ بند راستے — احمد سعید، ۵۵۳
۲۳ ـ محل — نوید انجم، ۵۹۰
۲۴ ـ ڈائن — اختر جمال، ۵۷۳

تبصرے،

۱۔ شعر العرب
۲۔ تواریخ عجیب
۳۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور
۴۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

نوادرِ غالب

[۱۲ - غیر مطبوعہ خطوط]

نثار احمد فاروقی

(الف) مقدمہ

یہ میرزا غالب کی خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اُن پر اتنا تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن ابھی تک کوئی نہ کوئی نیا پہلو گفتگو کے لیے مل ہی جاتا ہے ——— میں آج میرزا غالب کے ایک درجن غیر مطبوعہ خطوط "نقوش" کے توسط سے غالب پسندوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اِن میں ایک خط اُردو کا ہے (بنام تفتہ) اور گیارہ خطوط فارسی میں لکھے گئے ہیں، جن میں سے آٹھ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی (متوفی ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) کے نام ہیں، باقی تین خطوط کے مکتوب الیہم منشی نبی بخش حقیر[1] (متوفی ۱۸۶۰ء) میرزا ہرگوپال تفتہ (متوفی ۱۸۷۹ء) اور مولوی فضل اللہ ہیں۔ یہ خطوط ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں نہ آج سے پہلے کسی کے علم میں آئے ہیں۔ ان کا ماخذ ایک قلمی بیاض ہے[2] جس کا عنوان، جامع کا نام، سالِ تالیف یا سنہ کتابت کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اگرچہ صاف نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہے لیکن اِس میں املا کی بے شمار غلطیاں ہیں اس کے خط کی روش اور ظاہری حلیے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی ہے۔ گو اس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت موجود نہیں ہے۔ اسے بیاض کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ یہ دراصل کسی خوش ذوق نے ۹۴ فارسی انشا پردازوں کے خطوط و رقعات کا انتخاب کیا ہے اس میں جن لوگوں کے مکتوبات شامل ہیں اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

---

[1] منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک فارسی خط اور بھی ہے جسے اپنے مضمون "حادثۂ اسیری اور غالب" (نقوش شمارہ/۹۴، اگست ۱۹۶۲ء) میں پیش کر چکا ہوں۔ یہ اگرچہ پنج آہنگ (کلیات نثر غالب/۱۰۳) میں شامل ہے مگر مجھے جو روایت دستیاب ہوئی ہے اس میں بعض اہم اختلافات ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس سے غالب کی ایک غزل (ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا) کی شانِ نزول مع تاریخ تصنیف معلوم ہو جاتی ہے۔

مرزا معز موسوی فطرت - ملا ظہوری - عرفی - قاسم کاہی - محمد قلی سلیم - مرزا صائب - مرزا جلال اسیر - طالب کلیم - مرزا داراب بیگ جویا - طالب آملی - فیضی - حکیم ثنائی - شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی - عبدالقادر بیدل - میرزا اسد اللہ خاں غالب - مولانا فیض الحسن سہارن پوری - مولوی فضل حق خیر آبادی - اور نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ -

یہ نسخہ ۷½ × ۱۱½ سائز کے ۱۷ سطری مسطر پر لکھا ہوا ہے، ہر سطر میں تقریباً ۱۷ - ۱۸ الفاظ ہیں، متن کی روشنائی سیاہ اور عنوانات کی شنگرفی ہے -

اس مجموعے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی - مولانا فضل حق خیر آبادی[1] - نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے خطوط بھی بعض اعتبارات سے بہت اہم ہیں، اور ان میں سے اکثر غیر مطبوعہ ہیں، وہ پھر کبھی نذر کروں گا - اِن شاء اللہ -

میں نے غالب کے خطوط نقل کرنے میں اصل کے املا کی پابندی نہیں کی ہے، یعنی وہی کہ یائے معروف و مجہول کا فرق نہیں ہے، یا الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے یا مرکز اور نقطوں کے معاملے میں کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہے' وغیرہ - کیوں کہ اگر یہ خطوط غالب ہی کے قلم سے لکھے ہوتے ہوتے تو البتہ اصل کے املا کی نشان دہی ضروری ہو جاتی - یہ مجموعہ اگرچہ نستعلیق میں صاف اور روشن لکھا ہوا ہے تاہم خطوط فارسی کے بعض الفاظ نہیں پڑھے جا سکے یا اُن میں التباس پیدا ہوا، میں نے اکثر جگہ قیاسی تصحیح کر دی ہے اور جہاں التباس کا اندیشہ تھا وہاں اصل کا املا حاشیے پر نقل کر دیا ہے -

اِس مضمون کی ترتیب یوں رکھی گئی ہے :

(الف) مقدمہ (ب) متن (ج) اردو ترجمہ (د) لفظیات (ہ) توضیحات (و) مراجع

ترجمہ کرنے میں اپنی سی احتیاط سے کام لیا گیا ہے وہ نہ ٹھیٹھ لفظی ہے نہ ترا مرادی - بعض جملے قطعاً پلے نہیں پڑے وہاں اٹکل سے بھی کام چلایا ہے - ترجمے سے مقصد صرف یہ ہے کہ اِن خطوط کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو جائے -

ترتیب میں نے وہی رکھی ہے جو بیاض منقول عنہ میں ہے صرف اتنا کیا ہے کہ اُردو کا خط جو سب سے آخر میں تھا اُسے میں نے یہاں شروع ہی میں درج کر دیا ہے - اور جس خط پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے اُس کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے -

توضیحات کے سلسلے میں محب مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) سے بعض مفید مشورے ملے تھے اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے -

---

[1] مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک ہی خط ہے " عرضی در بارۂ امتناع ٹیکس وغیرہ " میں اسے سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی) جلد ۱۳ شمارہ ۳/ جولائی ۱۹۶۲ء میں چھپوا چکا ہوں -

(ب) متن

(۱) بنام ہرگوپال تفتہ:

شفیق میرے لالہ ہرگوپال تفتہ میرا قصور معاف کریں اور مجھ کو اپنا نیازمند تصور فرماویں۔ آپ کا پارسل اور آپ کا خطِ سابق و عنایت نامۂ حال پہنچا۔ جواب نہ لکھنے کی دو وجہ۔ ایک تو یہ کہ میں بیمار، چار مہینے سے تپ لرزہ میں گرفتار، دم لینے کی طاقت نہیں، خط لکھنا کیسا۔ بارے اب فرصت ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ کوں تو معلوم مگر مکان آپ کا نہیں معلوم، خط لکھوں تو کس پتے سے لکھوں؟ ہاں آپ نے سرنامہ پر چاہِ گرمابہ لکھا، میں یہ نہیں لکھ سکتا، کس واسطے کہ یہ حمام کے کنوئیں[1] کی مٹی خراب کر کر اوس کو چاہِ گرمابہ لکھا ہے۔ اسماء و اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا یہ خلافِ دستورِ تحریر ہے۔ بھلا اس شہر میں ایک محلہ تلی واڑوں کا ہے اب ہم اوس کو "گذرِ کنجشکان" کیوں کر لکھیں۔ یا املی[2] کے محلے کو "محلہ تمرِ ہندی" کس طرح لکھیں۔ بہرحال، ناچار تمہاری خاطر سے اس کو بھی قبول کیا اور وہی لفظ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ بھائی میرا دل اب شعر و سخن و امارت و ریاست و دین و دنیا و مرگ و زیست و کفر و اسلام سے سرد ہو گیا ہے۔ مگر تمہاری خاطر ——— سو یہ خوب یاد رہے کہ جتنی دیر میں تم ایک نئی غزل لکھ سکتے ہو، مجھ سے اتنے عرصے میں آپ کی ایک غزل کو اصلاح نہیں دی جاتی۔ جلدی نہ کرو اور میرے طور پر رہنے دو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس قدر تمہاری جو کہ از قسم غزلیات ہیں وہ سب دیکھ کر بھیج دوں گا۔ نصف دیوانِ سابق دیکھ چکا ہوں، نصف باقی ہے۔ مگر اب خدا کے واسطے جب تک یہ آپ کا کلام نہ پہنچے اور کلام نہ بھیجے کہ میں گھبرا یا جاتا ہوں۔ فقط

[جون ۱۸۵۴ء] اسد اللہ خاں

(۲) بنام شیفتہ:

جنابِ عالی؛

در تموزِ دی روز کہ خون در رگ سوخت، و مغز در استخوان گداخت، بلائے استسقاء آن چنان عام بود کہ سمندر تا خود را از آتش در آب نینداختہ باشد آرام نیافتہ[3] باشد۔ ہرگاہ کہ خوی من است جرعہ جرعہ آب آشامیدے شما را ہر دم یاد آوردمے۔ اگر دل از تشنگی یک رہ سوخت، از بہرِ شما صد رہ سوخت ؎

کسے در عاشقی ہم پیشہ را چوں من نمی خواہد
خورم گر آب شیرینے بیادم کوہکن آید

بارے بگویند کہ روز چوں سپری گشت و شب چگونہ گذشت۔ خاں صاحب چہ تجویز کردہ اند دی روز و امروز کدام

---

[1] اصل: کوی کی۔ [2] اصل: املے کے۔ [3] اصل: یافتہ

دوا آشامیده اند۔ دیگر آں اگر امروز زنده مانم، فردا بامداد کہاراں فرستند تا مرا ببرند۔ والسّلام۔ از اسد اللہ۔

(۳) بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :

خداوند نعمت را گرد سر گردم، و سپاس یزداں پرمدی بجا می آرم۔ عطیۂ آور بعد پرسش[1] دیگر ارزانی داشت، همانا از صحت[2] و بہجتِ مزاجِ همایوں بشارت داده باشد که ورا اشارت چنیں گفتہ آمد، فردا که آدینہ روز است بہ بارگاہِ سپہر اشتنباہ[3] سلطان می روم۔ امید که چوں برگردم بہ آستاں بوس مخدوم رسیده باشم[4] بحضرت سید سلام می رسانم۔ والسّلام از اسد اللہ

(۴) بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :

قبلۂ من: چوں مخدوم صوم و نوم باہم آمیختہ، لاجرم من که با یکے ازیں ہر دو مقاومت نتوانم کرد، باہر دو چوں حرف گردم، همانا در معذرت کاہل قدمی من می، ود تا فرا رسند، اگر بملازمت نرسیده ام چرا نرسیدم و چہ اندیشیدم۔ ہاں بنده پرور۔ امروز پنجمیں روز است، کتابِ مسوده باز دہند و بر من سپاس نہند کاش ایں نیز دانم کہ چوں بنظرِ مولانا گذشت، کدام[5] عبارت دلآویز منظورِ نظرِ عطوفت گشت۔ امید کہ از حالِ مزاجِ مبارک کیفیتِ روزه، خاصہ در پی تموز یزداں سوز، آگہی بخشند۔ حق حفظِ صحت ادا و روزه قضا کرده باشند۔ فقط

از اسد اللہ [غالباً اگست ۱۸۵۰ء]

(۵) بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :

بندگی می فرستم، و دوامِ دولت و اقبالِ خواجہ از یزداں می خواہم، اگر نبشتہ باشم کہ روداده جہاں ستانی امیر تیمور تاجور بہ نگارش گرانی[6] پذیرفتہ است، بدرگاه می برم و خودش می کشم، خواجہ بر من خورده گرفت کہ فلانے ماه بہ تفریح[7] سبزه و آبِ رواں می رود (کذا)۔ ہیہات ہیہات چوں منے را سرِ سبزه و تماشا کجا۔ یا رب کے رفتم۔ آخر آں شد کہ چوں احترام الدولہ بہادر بشہر تشریف ورود بخشید، پیشِ وے رفتم و آں نگارش کہ بیش چہار جزو کاغذ بوده بوے سپردم۔ پنہاں مباد کہ من از اندوه ستوہم و از زیستن بیزار۔ ایں کار را بدم سردی و دل افسردگی می کنم، عنانِ توسنِ خامہ پنداری بدستِ من نیست، خود بہر شیوه کہ خواہد گام می زند و ره می شود[8]۔ و حالِ مزاجِ مبارک آنچہ گماں داشتم بہ یقین انجامید، یزداں توفیق پرہیز و بذریعۂ پرہیز تندرستی عطا فرماید۔ قرۃ العین محمد علی خاں دعا خوانند۔ والسّلام [غالباً آخر اگست ۱۸۵۰ء]

---

[1] اصل: پرستش۔ [2] اصل: صحبت۔ [3] اصل: سپہر اشہنشاه [4] اصل: باشد
[5] اصل: بکدام۔ [6] اصل: گراں۔ [7] اصل: تبصرح۔ [8] اصل: روند

(۶) بنام محمد مصطفیٰ خاں شیفته:

اُمیدگاهِ اهلِ معنی سلامت۔ ریخته از نتائج تازگی[1] فکر است وغزلهای پارسی (که تا بنامے آں هم پیش ریختهٔ شمه بود) امشب بپایاں رسید۔ خدا را دریں هردو غزل آں باید نگرست[2] که باکه حرف می زند وچه می گوید۔ حالیا حیله ایں ابیات را خواستارم وسپاس را، (کذا) به رفتار آفرینِ جوی نبستم۔ همان نوید خرسندی وتندرستی وشادکامی می خواهم وبس۔

(۷) بنام محمد مصطفیٰ خاں شیفته:

روز چهارشنبه یعنی دی روز عرضه داشته ام که روزِ آدینه بارم می دهند وبعطاے خلعت وخطاب وتوقیعِ نوکری بر من سپاس می نهند۔ احترام الدوله بهادر بمقتضاے فحواے ایں فرد:

فرداست وعدهٔ جنت (و) امروز شد نصیب
آرے خلافِ وعده کریماں چنیں کنند

هم امروز که روزِ سعدِ اکبر است مرا به بزم خسروی خواندند کامیاب خطاب (و) خلعت وفرمانم گرداند۔ دی شحنهٔ شهرهٔ بدمعاش "و" مهر اساطم "نوشت، واز من هیچ نکاست۔ امروز بادشاهِ دلی نجم الدوله ودبیر الملک خواند، وبر من هیچ نیفزود[3]۔ کانا فرداست (کذا) تا دراں روزم چه نویسند وبکدام نامم خوانند ودراں چه ماندم بود۔ یارب بیایند وزود بیایند تا فرمانِ شاه (و) نگارش هاے ایں روسیاه نگرند[4]۔ والسّلام اُلوف الاعتزام نگاشته یوم الخمیس ۲۳ شعبان وچهارم جولائی سنه ۱۸۵۰ء۔

نهاں نماناد۔ که "تاریخ نوکریٔ من در سرکارِ شاه بعهدهٔ "تاریخ نویسیٔ اسلاف" ایں خاندان بمشاهرهٔ پنجاه روپیه، یکم همیں ماه است، یعنی وصول زرِ تنخواه در سالے دو بار[5] است۔ فقط

(۸) بنام مصطفیٰ خاں شیفته

للهِ الحمد والمنّة که خواجه بسر منزلِ نعمت باز[6] رسیده، ونورِ دیدهٔ خویشتن را دید، اُمید که چوں نمونه بپایاں رسیده، وهوا خنک گردیده است، اعتدالے درمزاج پدید آمده باشد، وهر قدر بکاهد نشاط افزاید۔ ــــ دو سه روز است که نگارشِ رُوداد امیر تیمور گورگان گراں پذیرفت، حالیا خود را بوعدهٔ دو هفته آرامش سهرد بخشیده ام پس ازاں که دم گرفته خواهد شد بسر که (کذا)، ارس وحالِ بابر بادشاه رفته خواهد شد۔ بالله فکرِ ایں نثر از فکرِ نظم لختے جانگداز تر است۔ روزِ عید قدمبوسیٔ مولانا دست بهم داد نوازش فرمودند

---

[1] اصل: نازگی [2] اصل: نگذشت [3] اصل: بغزود [4] اصل: بگیرند [5] اصل: که
[6] اصل: نعمت وناز

و نثر را ستودند۔ — شاہ گردوں بارگاہ بہ مزارِ فائض الانوارِ قطب الاقطاب روے آوردہ، و احترام الدولہ نزد[1] بادشاہ است۔ اگر اتفاق افتاد من نیز می روم و دو سہ روز دریں جا روے شفقے و رنگ ہوا می نگرم۔ چکنم تا آنچہ نبشتہ ام بشما برسد، و دیگر ہرچہ می نوشتہ باشم ورق ورق بنظرِ انور می گذشتہ باشد۔ — ورقے چند کہ نواب فخر الدین خاں نبشتہ اند (کہ نزد ایشاں ہستند۔ تا آنچہ فراہم می آید می نوشتند و آں اوراق صورتِ کتاب یافت۔ [غالباً ستمبر ۱۸۵۰ء]

۹ بنام مصطفیٰ خاں شیفتہ:

یارب ایں نامہ کہ از والیٔ لا اُبالی و مولاے فارغ از موالی بمن رسید از نگرانی چہ کاست و در آگہی چہ افزود۔ مگر دانستم کہ برام پور کے رفتند و چند روز انجمن آرا بودند، کے باز آمدند، و بدہلی کے خواہند آمد، ایں ہا ہمہ بر کنار، آہ از من کہ ندانستہ باشم کہ چہ حال دارند، و مرض (کہ) پیش ازیں داشتند و حالیا نصیبِ اعدای دولت باد، چہ صورت دارد۔ ایں رنج کہ مرا نیز روزگارے وارد در آزار داشتنہ، لختی گراں بہاست[2]، فضل و کرم است، و خواجہ عشرت دوست بزماں نگہباں باد۔ و جان (د) تن توانا، عیش و عشرت مہیا، با آں کہ سخن ازاں شرحاً نگذشت[3] (کذا)، و ثنا بدعا منتہی گشت؛ ہنوز جنبشِ نفس دستہ برلب می زند، (کذا)، و مرا ہم بداں ہنجار بہ نوا می آورد۔ ہاں اے داور، چوں گویم، کہ بیداد گر ہمیں است کہ نگویم — و دیگر، اینچہ ادا است کہ باحصالِ عبارتِ نامہ (کذا) جز یک دو بذلہ، بتوجہ مشابہ (کذا) احباب، بزبانِ قلم سخن ہا می ردد، گوئی ما و شما موجدِ ایں شیوہ و مخترعِ ایں ادا ایم — من بداں درخورم کہ مرا بہ یک لطیفہ و چند لفظ لدمنز (کذا) واکنند — ندانستند کہ جگر تشنۂ دیدارم، پنداشتند کہ جویاے اختبارم[4]، نیندیشیدند[5] کہ (خیر) خواہ جان و تنِ شما ستم۔ نسنجیدند کہ غالب سرگذشت سفرِ رامپور نخواہد شنود، نتواند آسود — نفہمیدند کہ وعدۂ دیدارے می خواہد، نخواستند کہ از حالِ غلام علی خاں سر سخن رانند، باللہ شگفتی فرو ماندم و نشگفت (کذا) کہ استعجاب مرا عجبی ندارند — بارے بندگی و بیچارگی — از ہمہ قطع نظر کردم۔ ہائے شاعر ریختہ گوے کہ ندانم کیست چہ خوش می گوید ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پہ تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

---

[1] اصل: نیز [2] اصل: گرانہا [3] اصل: سرخانہ گذشت [4] اصل: اختبارم [5] اصل: نیستدیشیدند

صبح می کنم و دریں کہ از حالِ مزاجِ مقدّس اوّلاً و از قصدِ مقصودِ دلی ثانیاً آگہی بخشند۔ زیادہ بندگی بیچارگی
— نبشتہ صبح چہارشنبہ ۸ رمئی ۱۸۵۰ء

(۱۰) بنام منشی نبی بخش اکبر آبادی:

شفیقِ مکرّم و مطاعِ معظّم، از درویشِ گوشہ نشین، اسد اللہ حزیں، پس از آں کہ سلام خوانند، مژدۂ دریافت نامہ را کہ فرستادہ، خاطر نشانِ خویش گردانند۔ فردا دلِ ستم زدہ را با خیال آویزشے بود، و نارسیدنِ نامہ از آں سوی لختے مشوّش داشت۔ امروز ہمیں دم کہ نیم روز است، بریدِ ڈاک آمد و نامہ آورد۔ خواندن ہماں بود و پاسخ نگاری نشستن ہماں — چوں کارپردازانِ ڈاک دکان بگاہ می کشایند، و پس از گذشتنِ نیمہ روز نامہ نمی ستانند، ہر آئینہ ایں ورق کہ امروز نگاشتہ ام فردا چاشت بہ ڈاک خواہم فرستاد۔ بارے آں کہ حالِ من پرسیدہ اند، و غزل از من طلب کردہ اند، باور دارند کہ دل بجائے بود، زبان زمزمہ سرائے بود، اکنوں کہ دل آں چناں افسرد کہ گوئی مُرد، چہ بجوش آید، غالب در خروش۔ نمی نگرند کہ ہم ازیں حکّام کہ مرا بہ سر و چشم می نشاندند چہ رفت و معاشِ من صورتِ معادِ کفّار گرفت۔ بسخن چہ گرویم و تا چند باد پیمائیم: دو سہ روز است کہ بے رونقیٔ کارِ خود را در نظر می سنجیدم، بیتے کہ تخلّص نیز داشت بے خواست بر زبان گذشت، تازہ اگر ہست ہمیں است و بس:—

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

از آلامِ جسمانی اگرچہ فراوان است، تاہم (و) اندوہِ روحانی ست کہ دل و جگر را بہم می زند۔ اُفَوِّضُ اَمْرِی اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَاد۔ جلیل القدر تفتہ سلّمہ اللّٰہ تعالیٰ ندانم کجاست، غزلہائے آں شمعِ بزمِ سخن وری بشما می فرستم، می تواں رساند و می تواں گفت کہ رباعیات بعد ازیں خواہد رسید۔
عبدالقاہر اسد اللہ نگاشتہ شدہ ۱۶ رستمبر ۱۸۴۹ء

(۱۱) بنام لالہ ہرگوپال تفتہ:

مہربانا رافت نشانا۔ فہرستِ متاعِ کارخانۂ خیال، یعنی کلیاتِ آں عدیم المثال رسید، و از رسیدنش رواں آسائی آمد، از دیر باز بسوئے شما نگراں بودم، و چوں مسکن و مقامِ شما، در نظر نداشتم، نامہ نتوانستم فرستاد۔ شما را چہ براں داشت کہ نامہ نفرستادید و از حالِ خودم آگہی ندادید۔ بارے ازیں التفات نامہ بداں وارسیدم کہ شما را عافیت حاصل و مرادِ دلِ شما جلسے ہست۔ کلیات را می نگرم

در بر خود لازم گرفتہ ام کہ سرا سر نگرم، و در حک و اصلاح خود را معاف ندارم، امّا ایں کار زود به سر انجام نه پذیرد، لاجرم اگر دیرنگ روے دہد ملول نشوند۔ حالیا دو جلد دیوانِ فارسی به سبیل پارسل بعد ادائے تمغاے ڈاک می فرستم، و نامہ بنام نامی مشفقی منشی نبی بخش سررشتہ دار عدالت فوجداری کول ہم ہست۔ شگفت کہ شما را با منشی صاحب آشنائی باشد، و اگر ہم نباشد، بدیں تقریب آشنا می تواں شد، و می تواں رفت، و نامہ کہ باسمِ سامیِ ایشاں است، با یک جلد دیوان می تواں برد، و نامہ و کتاب رساند۔ می توانستم بدیں بزرگوار کتاب جداگانہ فرستادن، امّا خوشتر آں دیدم کہ بشما فرستم، عمرے است کہ آوازہ خجستگی خوئی و فرخی نہاد مکرمی منشی ظہور علی صاحب دام بقاؤہٗ می شنوم، و از ارادت مندانِ آں صاحب دلِ دیدہ ورم، چشم دارم کہ بر من سپاس نہند و از من سلام و نیاز و شوق بداں حضرت عرضہ دہند ـــ دیگر، آں سپہرِ سخن را ماہِ دو ہفتہ، یعنی لالہ ہرگوپال تفتہ، از شما آں خواہم اگر زود زود نبود، گاہ گاہ بفرستادنِ نامہ شادم دارید، من خود وعدہ می کنم کہ بعد یک ماہ اجزاے دیوانِ شما را، بطریقِ پارسل بشما خواہم فرستاد، و زاں پس رسم و راہِ نامہ نگاری میانہ ہم برہم نخواہد خورد۔

از اسد اللہ نامہ سیاہ نگاشتہ بیست (و) ہشتم جمادی الاوّل سنہ ۱۲۶۳ھ مطابق دو از دہم مئی سنہ ۱۸۴۷ء۔

۱۲ بنام مولوی فضل اللہ

حضرت سلامت - ایں داوری کہ در پیش است، چوں سترد بن بودنش بجاے خویش است، ایں مایہ درنگ برنمی تابد۔ لختے میر قاسم علی صاحب را دلیر ساختہ آید، و نبذے خود از راہِ التفات پرداختہ آید، من و ایمانِ من، کہ بر من اندوہِ ایں درنگ گران است، و دل خود پیش ازاں کہ ایں بار بر روے نہد، ناتوان است ـ والسّلام خیر ختام اسد اللہ۔

مضمون لفافہ ایں رقعہ

چوں نامہ بر جادہ شناسِ منزلِ مقصود نیست، امّید کہ یکے از خواجہ تاشانِ غالب، یعنی عزیزے از ملازمانِ حضرت مولوی صاحب قبلہ جناب مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر، ایں نامہ را بہ مخدومی مکرمی، مظہرِ اسم خویشتن، لیکن نہ از بہرِ من، جناب مولوی فضل اللہ صاحب زادہ لطفہٗ می رساند و منت بر فرستندہ نہد۔

(ج) لفظیات

(خط نمبر۲)	سپری گشتن	ختم ہونا ، گذرنا
	سمندر	ایک فرضی کیڑا ، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آگ میں رہتا ہے اور وہی اس کی غذا ہے یہ سَم (آگ) اور اندرون کا مرکب ہے ، مخفف ہو کر سمندر ہو گیا ہے ۔
(خط نمبر۳)	رواں پروری	جاں پروری ، مراد نوازش
	برگردیدن	پلٹنا ، واپس ہونا
(خط نمبر۴)	حرف گشتن	مقابل ہونا ، برداشت کرنا
	فرارسیدن	پہنچنا ، پالینا (بات کی تہ کو
	کاہل قدمی	کوتاہ قدمی
(خط نمبر۵)	کراں پذیرفتن	انجام پاتا ، مکمل ہونا
	خوردہ گرفتن	نکتہ چینی کرنا
	ستوہ	اجیرن ، بیزار
	دم سردی	بے دلی
(خط نمبر۶)	خواستار	خواہندہ ، چاہنے والا
(خط نمبر۷)	روز سعد اکبر	مبارک ستارے کا دن ۔ علم نجوم کی رو سے زہرہ VENUS کو سعد اصغر اور مشتری JUPITER کو سعدِ اکبر کہا جاتا ہے ۔ یہاں مراد پنجشنبہ جو مشتری کا دن ہے ۔
	مہر بساط	سردار ، سرغنہ (یہاں بدمعاشوں کا سرخیل مراد ہے)
(خط نمبر۸)	آرامش	آرام (بکسر سوم)
	ارس	عالی خاندان
(خط نمبر۹)	نگرانی	انتظار ، پریشانی
	اختبار	مکمل اطلاع
	شگفت	بکسر اول و دوم ۔ حیرت ، تعجب
(خط نمبر۱۰)	آویزش	الجھنا
	معاش	زندگی
	معاد	مرنے کے بعد کا معاملہ ، آخرت
	تالم	ایذا

عبدالقاہر : قہر کرنے والے کا بندہ۔ یہاں غالب نے اپنے لیے یہ نام طنزاً استعمال کیا ہے اور قہر کے وہ معنی سمجھے ہیں جو اُردو میں رائج ہیں۔ عربی میں قاہر کا مفہوم "پورا غلبہ رکھنے والا" ہے۔

(خط نمبر۱۱) رواں آسائی : روح کی طمانیت، خوشی
معاف داشتن : کوتاہی کرنا
لفافۂ ڈاک : غالباً ڈاک محصول کے ٹکٹ مراد ہیں
(خط نمبر۱۲) داوری : محاکمہ، قضیہ
سروبن : ایک تناور درخت کا نام، مجازاً معاملے کی اہمیت اور بڑائی کا اظہار
برتافتن : جھیلنا (مجازاً مراد ہے)

[نوٹ: ان الفاظ کا مطلب متعین کرنے میں ایف اسٹائن گاس کی "پرشین انگلش ڈکشنری" گیلانی کی فرہنگ گیلانی اور حییم کی لغات سے استمداد کی گئی ہے]

(د) اُردو ترجمہ

(۲) بنام شیفتہ

جناب عالی، کل کی گرمی میں جس سے رگوں میں خون جل رہا تھا اور ہڈیوں میں مغز پگھلا جاتا تھا، پیاس کی شدت اتنی عام تھی کہ سمندر نے جب تک اپنے تئیں آگ سے نکال کر پانی نہ ڈال دیا ہو گا چین نہ پایا ہو گا۔ چوں کہ میری عادت ہے کہ ایک ایک گھونٹ پانی پیتا رہتا ہوں، آپ کو ہر وقت یاد کرتا رہا، پیاس سے اگر دل ایک بار تڑپا تو آپ کی یاد سے سو بار تلملایا:

[شعر: عاشقی میں کوئی بھی میری طرح اپنے ہم پیشہ کو پسند نہیں کرتا
میں اگر آبِ شیریں بھی پیتا ہوں تو مجھے کوہکن یاد آجاتا ہے]

بارے یہ بتائیے کہ دن کیسے گذرا اور رات کیوں کر کٹی — خاں صاحب نے کیا تجویز کیا ہے؟ آپ نے کل اور آج کون سی دوا پی ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر میں زندہ رہا تو کل کہاروں کو بھیج دیجیے تاکہ مجھے لے جائیں۔ والسلام۔ از اسداللہ

(۳) بنام شیفتہ

خداوندِ نعمت کے قربان جاؤں، جان پروری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، عطیہ لانے والے نے پوچھنے پر کچھ اور بھی دیا، یعنی آپ کی صحت اور مزاجِ مبارک کی عافیت کا مژدہ سنایا، جسے میں نے بطور استعارہ یوں ادا کیا ہے۔ کل جمعہ ہے، بادشاہ کے دربار میں جاؤں گا، اُمید ہے کہ واپسی میں آپ کی آستاں بوسی کر دوں گا۔ حضرت سید کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں۔ والسلام۔ از اسداللہ

(۴) بنام شیفتہ

قبلۂ من، چوں کہ آپ نے روزے اور نیند کو ملا لیا ہے، اور میں اِن دونوں میں سے ایک کی بھی مقاومت نہیں رکھتا چہ جائیکہ دونوں کا حریف بنوں، اسی لیے معذرت پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ سمجھ جائیں کہ اگر میں حاضرِ خدمت نہ ہُوا تو مجھے کس بات کا اندیشہ تھا، ہاں بندہ پرور، آج پانچواں دن ہے کتاب مسوّدہ واپس کر دیں اور مجھے ممنون فرمائیں۔ کاش مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جب یہ مولانا کی نظر سے گذری تو اُنھوں نے کس عبارت دلآویز کو پسند فرمایا۔ امید ہے کہ مزاجِ مبارک کی کیفیت، خصوصاً اس شدّت کی گرمی میں، روزے کا حال، تحریر فرمائیں گے۔ شاید آپ نے حفظِ صحت کا حق ادا اور روزہ قضا کیا ہوگا۔ فقط از اسد اللہ

(۵) بنام شیفتہ

بندگی بھیجتا ہوں اور خواجہ کی دولت و اقبال کا دوام خدا سے چاہتا ہوں۔ میں نے شاید آپ کو لکھا ہو کہ امیر تیمور کی جہاں ستانی کی روداد تحریر کی جا چکی ہے میں اُسے خود دربار میں لے جا رہا ہوں۔ آپ نے مجھ پر خردہ گیری کی ہے کہ فلاں مہینے میں تو سبزہ اور آبِ رواں کی سیر کے لیے گیا تھا۔ افسوس، میرے ایسے انسان کو سیر و تماشا کا دماغ کہاں ہے؟ یا اللہ میں بھلا کب گیا تھا —— بہرحال یہ ہُوا کہ جب احترام الدولہ بہادر شہر میں تشریف لائے تو میں ان کے پاس گیا اور وہ مسوّدہ جو کم و بیش چار جزو تھے، اُن کے حوالے کر آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں غم سے اجیرن اور زندگی سے بیزار ہوں۔ میں یہ کام بہت ہی بے دلی اور افسردگی کے ساتھ کر رہا ہوں۔ گویا توسنِ قلم کی باگیں میرے قبضے میں نہیں ہیں وہ خود جدھر اور جیسے چاہتا ہے چلتا رہتا ہے۔ مزاجِ مبارک کا حال، جیسا مجھے گمان تھا وہی ہُوا، خدا پرہیز کی توفیق اور پرہیز کے ذریعے تندرستی عطا فرمائے۔ نورِ چشم محمد علی خاں کو دعا۔ والسّلام۔

(۶) بنام شیفتہ

اُمیدگاہِ اہلِ معنی سلامت۔ ریختہ تازگیِ فکر کے نتائج میں سے ہے اور فارسی کی غزلیں جن کی ابتدا ریختہ سے پہلے ہوئی تھی، آج رات کو تمام ہوئیں۔ خدارا اِن دونوں غزلوں میں یہ نہ بھولیے کہ کس سے گفتگو ہے اور کیا کہا ہے؟ ...... (یہاں عبارت مغشوش ہے)، . . . میں عجلت کی داد نہیں چاہتا۔ آپ کی خوشی، تندرستی اور شادکامی کا مژدہ سُننا چاہتا ہوں اور بس ——

(۷) بنام شیفتہ

بُدھ کے دن، یعنی کل میں نے عرض کیا تھا کہ جمعہ کے دن مجھے دربار میں باریابی ملے گی اور خلعت و خطاب عطا کر کے اور نوکری کا فرمان صادر کر کے مجھے احسان مند کیا جائے گا۔ لیکن احترام الدّولہ بہادر نے اس شعر کے مصداق:

[شعر: جنّت کا وعدہ تو کل کا تھا، مگر آج ہی نصیب ہو گئی
جی ہاں کریم لوگ ایسی ہی وعدہ خلافی کیا کرتے ہیں!]

چنانچہ آج ہی، کہ یہ بھی روزِ سعدِ اکبر ہے، مجھے شہنشاہ کے دربار میں بُلایا اور خلعت و خطاب و فرمان سے سرفراز کیا۔

کل کوتوال شہر نے مجھے "بدمعاش" اور "سرغنہ" لکھا تھا، تو میرا کچھ نہ گھٹا تھا، آج بادشاہ دہلی نے "نجم الدولہ" اور "دبیر الملک" کا خطاب دیا ہے تو کچھ بڑھ نہیں گیا اب فردائے قیامت میں دیکھنا ہے کہ مجھے کیا لکھا جاتا ہے، کس نام سے پکارا جاتا ہے اور وہاں میری کیا ارزش ہوتی ہے — خدا کے لیے آئیے اور جلدی آئیے تاکہ آپ شاہی فرمان اور اس روسیاہ کی تحریر دیکھ لیں۔ والسلام اُلوف الاحترام ۔ جمعرات ۲۳ر شعبان ر ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء

دراز نوشت، پوشیدہ نہ رہے کہ سرکار شاہ میں میرا تقرر اسی مہینے کی پہلی تاریخ سے اس خاندان کے اسلاف کی تاریخ لکھنے پر ہوا ہے۔ پچاس روپے تنخواہ ہوگی۔ اور زرِ تنخواہ کی وصولی سال میں دو بار ہوگی۔ فقط۔

(۸) بنام شیفتہ

خدا کا شکر اور احسان ہے کہ آپ واپس تشریف لے آئے اور اپنے نورِ چشم کو دیکھ لیا۔ چوں کہ اب گرمی ختم ہو چلی ہے اور ہوا ابھی کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہے، امید ہے کہ آپ کے مزاج میں اب اعتدال آ گیا ہوگا اور جتنی گرمی گھٹتی جائے گی آپ کی صحت عود کرتی جائے گی۔ دو تین دن ہوئے کہ امیر تیمور گورگان کی روداد لکھ کر نمٹا ہوں اب دو ہفتے تک آرام کروں گا، پھر ذرا دم لے کر بابر بادشاہ کا حال لکھا جائے گا۔ بخدا اس نثر میں نظم سے کچھ زیادہ ہی جانگداز کاوش کرنا پڑتی ہے۔ عید کے دن مولانا کی قدم بوسی نصیب ہوئی، انھوں نے نوازش فرمائی اور نثر کی تعریف کی۔ شاہ گردوں بارگاہ (ظفر) حضرت قطب الاقطاب کے مزار کی طرف (مہرولی) تشریف لے گئے ہیں اور احترام الدولہ بادشاہ کے ساتھ ہیں۔ اگر موقع ملا تو میں بھی جاؤں گا اور دو تین دن رہ کر وہاں کا موسم اور ہوا کا رنگ دیکھوں گا۔ کیا تدبیر کروں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ آپ تک پہنچ جائے اور آگے جو کچھ لکھتا رہوں وہ ایک ایک ورق کر کے آپ کی نظر سے گذرتا ہے۔ چند ورق جو نواب فخر الدین خاں نے لکھے تھے وہ انھیں کے پاس ہیں اور جو کچھ ملتا رہتا ہے لکھتے رہتے ہیں تا آن کہ ان اوراق نے کتاب کی صورت اختیار کر لی۔

(۹) بنام شیفتہ

یا اللہ — یہ خط جولاؔبالی، اور غلاموں سے بے نیاز آقا کی طرف سے میرے پاس پہنچا ہے اس نے آخر میرے تردد میں سے کیا گھٹایا اور آگہی میں کیا اضافہ کیا؟ بس یہ جانا کہ رامپور کب گئے اور چند روز وہاں انجمن آرا رہ کر کب واپس آئے، اور دہلی کب آئیں گے۔ یہ سب باتیں ایک طرف۔ حیف ہے مجھ پر جیسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اب مزاج کا کیا حال ہے، جو مرض پہلے تھا، اور خدا کرے اب دشمنوں کے حصے میں آیا ہو، اس کی کیا کیفیت ہے؟ [[1] اس مرض نے مجھے بھی بہت دنوں تک آزار پہنچایا ہے اس لیے زیادہ تردد ہے کیونکہ خدا کا فضل و کرم ہے اور آپ عشرت دوست واقع ہوئے ہیں، اللہ ہی نگہبانی کرنے والا ہے، جان و تن توانا اور عیش و عشرت مہیا ہیں بہر حال یہ بات کتابوں میں لکھی گ

---

[1] یہاں سے آگے قوسین کی عبارت صاف نہیں ہے، مطلب مشکل سے سمجھ میں آتا ہے، میں نے محض اٹکل سے ترجمہ کیا ہے، ممکن ہے اس میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو، اصل فارسی عبارت پوری احتیاط کے ساتھ جوں کی توں نقل کر دی گئی ہے اور اغلاط حاشیے میں بتا دیئے ہیں۔

اور تعریف دُعا پر منتہی ہوئی۔ (یہاں سے عبارت مغشوش ہے اور مطلب صاف نہیں نکلتا) ..... ہاں سلے خدا کیسے کہوں کہ بیداد گر یہی ہے جس کا میں نام نہیں لیتا ...... (عبارت مغشوش) ..... ہم تم اس شیوہ کے موجد اور اس ادا کے مخترع ہیں۔ کیا میں اسی لائق ہوں کہ مجھے ایک لطیفہ اور چند باتوں (پر ٹرخا دیا جائے)۔ آپ نے یہ نہ جانا کہ میں دیدار کا شدید پیاسا ہوں، یہ نہ سمجھا کہ آپ کی مفصل کیفیت معلوم کرنے کا جویا ہوں، یہ بھی دھیان نہ آیا کہ آپ کی جان و تن کا خیریت خواہ ہوں۔ یہ نہ سوچا کہ غالب سفرِ رامپور کی سرگذشت سن کر آسودہ نہ ہوگا۔ یہ نہ جانا کہ وہ دیدار کا وعدہ چاہتا ہے اور یہ بھی آپ نے نہ چاہا کہ غلام علی خاں کا کچھ حال لکھیں۔ بخدا میں حیرت میں ڈوب گیا .....] بہرحال بندگی بے چارگی۔ میں نے سب باتوں سے قطع نظر کی۔ ہائے ایک شاعر ریختہ گو، معلوم نہیں کون ہے، کیا ہی اچھی بات کہہ گیا ہے :

ظالم تو میری سادہ دلی پہ تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

اس پر صلح کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تو مزاجِ مقدس کے حال سے پھر اپنے دہلی آنے کے ارادے سے آگاہی بخشیں زیادہ بندگی بے چارگی —— لکھا ہوا، بدھ کی صبح، ۸ مئی ۱۸۵۵ء

(۴) بنام منشی نبی بخش حقیر :

شفیق مکرم و مطاعِ معظم، درویش گوشہ نشین اسد اللہ حزیں سے بعد سلام معلوم فرمائیں اور پھر اپنے بھیجے ہوئے عنایت نامے کے پہنچنے کا اطمینان فرمائیں۔ کل دلِ ستم زدہ کو خیال سے کچھ آویزش تھی اور آپ کا خط نہ آنے سے قدرے تشویش تھی۔ آج اسی وقت کہ دوپہر ہے، ڈاک کا ہرکارہ آیا اور آپ کا خط لایا پڑھتے ہی جواب لکھنے بیٹھ گیا چونکہ کارپردازانِ ڈاک صبح کو دوکان کھولتے ہیں اور دوپہر کے بعد خطوط وصول نہیں کرتے اب لامحالہ یہ ورق جو آج لکھا ہے کل صبح کی ڈاک سے بھیجوں گا۔ بارے یہ کہ آپ نے میرا حال پوچھا ہے اور مجھ سے غزل طلب کی ہے یقین کیجئے کہ دل ٹھکانے ہوتا ہے تو زبان بھی زمزمہ سنج ہوتی ہے اب تو دل اتنا بجھ گیا ہے گویا مر گیا، تو جوش کہاں سے آئے جو لبوں کو جنبش ہو۔ آپ نہیں دیکھتے کہ انھیں حکام سے جو مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے مجھ پر کیا بیتی اور میری زندگی کافروں کی عاقبت جیسی ہو گئی۔ شاعری کی طرف دل کیا مائل ہو اور کیا یاوہ پیمائی کروں۔ دو تین روز ہوئے اپنے حال کی بے رونقی کا خیال کر رہا تھا ایک شعر جس میں تخلص بھی ہے بے ارادہ زبان پر جاری ہو گیا، بس تازہ ہے تو یہی ہے :

[شعر : بیاں میں نہیں آسکتا کہ غالب ناکام پر کیا
گذر گئی۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس بندے کا خدا نہ تھا]

آلامِ جسمانی بھی اگرچہ بہت ہیں لیکن اندوہ رُوحانی اُن سے کہیں بڑھ گئے جو دل و جگر دونوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ (عربی : میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں یقیناً خدا بندوں کے معاملات کو دیکھنے والا ہے) جلیل القدر تفتہ سلمہ کا حال نہیں معلوم کہاں ہیں۔ اس شمع بزمِ سخن وری کی غزلیں تمھیں بھیج رہا ہوں اُن تک پہنچا دیجئے اور یہ کہہ دیجئے کہ رباعیات اس کے بعد پہنچیں گی۔

عبدالغافر اسد اللہ۔ لکھا ہوا، ۱۶ - ستمبر ۱۸۴۸ء

(۱۱) بنام ہرگوپال تفتہ:

مہربانا، رافت نشانا، متاعِ کارخانۂ خیال کی فہرست یعنی آں عدیم المثال (تفتہ) کا کلیات پہنچا۔ اور اس کے پہنچنے سے روح کو طمانیت ہوئی۔ بہت دنوں سے تمھارا منتظر تھا لیکن چونکہ تمھارے مسکن و مقام کا پتا معلوم نہ تھا، خط نہ لکھ سکا۔ تمھیں آخر کون مانع تھا جو تم نے خط نہ لکھا اور اپنے احوال سے مجھے مطلع نہ کیا۔ بارے اس التفات نامے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم خیریت سے ہو اور میرے لیے تمھارے دل میں جگہ ہے۔ کلیات دیکھ رہا ہوں اور میں نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ شروع سے خر تک اُسے دیکھوں اور حک و اصلاح میں قطعاً کوتاہی نہ کروں لیکن یہ کام جلدی نہ ہو سکے گا، اگر دیر ہو جائے تو ملول نہ ہونا۔ اب کہ دیوان فارسی کی دو جلدیں ڈاک کا محصول ادا کرنے کے بعد بھیج رہا ہوں اور ایک خط بھی مشفقی منشی نبی بخش سرشتہ دار عدالت بہادری کول (علی گڑھ) کے نام ہے۔ عجب نہیں کہ تمھاری منشی صاحب سے شناسائی ہو اور نہ بھی ہو تو اس تقریب سے ہو سکتی ہے۔ اُن کے پاس جاؤ اور جو خط ان کے نام کا ہے وہ اور ایک جلد دیوان اپنے ساتھ لے جاؤ اور یہ نامہ اور وہ کتاب انھیں دے دو۔ میں ان بزرگوار کو علیحدہ ڈاک سے بھی کتاب بھیج سکتا تھا لیکن یہی اچھا معلوم ہوا کہ تمھارے پاس بھیج دوں۔ بہت دنوں سے نیک خوے و فرخ نہاد مکرمی منشی ظہور علی صاحب دام لطافۂ کا آوازہ سن رہا ہوں اور اس صاحبدل دیدہ ور کے ارادت مندوں میں سے ہوں، اُمید ہے کہ تم میرا اسلام نیاز و شوق اُن کی خدمت میں پہنچا کر مجھے ممنون کرو گے —— اور سپہر سخن کے ماہ دو ہفتہ یعنی لالہ ہرگوپال تفتہ تم سے یہ بھی چاہتا ہوں کہ اگر جلد جلد نہ ہو سکے تو کبھی کبھی خط لکھ کر مجھے شاد کرتے رہا کرو۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ماہ کے بعد تمھارے دیوان کے اجزا تمھیں پارسل کے ذریعے بھیج دوں گا اور رسم و راہ نامہ نگاری اس درمیان میں نہیں ٹوٹے گی۔ از اسد اللہ نامہ سیاہ، نگاشتہ ۲۸ جمادی الاول ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۴۷ء

(۱۲) بنام مولوی فضل اللہ

حضرت سلامت، یہ محاکمہ جو درپیش ہے بہت اہم ہے اور اتنی تاخیر کی تاب نہیں لا سکتا، کچھ میر قاسم علی صاحب کو دلیر بنانا چاہیے اور کچھ خود آپ کو توجہ فرمانی چاہیے۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ مجھے یہ تاخیر بہت شاق گذر رہی ہے اور دل اس کے بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ والسلام خیر ختام اسد اللہ

اس کے لفافے کا پتا

چونکہ نامہ بر منزلِ مقصود کو نہیں پہچانتا امید ہے کہ غالب کے خواجہ تاشوں میں سے کوئی، یعنی حضرت مولوی صاحب قبلہ مولوی صدر الدین خاں کی خدمت کے حاضر باشوں میں سے کوئی عزیز، اس خط کو مخدومی و مکرمی مولوی فضل اللہ (جو اسم بامسمّٰی ہیں مگر میرے لیے نہیں) کی خدمت میں پہنچا کر بھیجنے والے پر احسان کرے گا۔

(۵) توضیحات

خط نمبر ۱) —— ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کا یہ خط جون ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں غالب نے [illegible] سے تپ لرزہ میں گرفتار ہونے کا ذکر کیا ہے: تفتہ کو ۲ مارچ ۱۸۵۰ء کے مکتوب میں غالب نے لکھا تھا:

"منشی صاحب تمہارا خط اس دن، یعنی کل بدھ کے دن پہنچا۔ کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزا یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ، پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب ..... اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں بعد اچھے ہونے کے اِن کو دیکھوں گا اور تم کو بھیجوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہزار جبر ثقیل لکھی گئی ہیں" [ر ک: خطوطِ غالب (جلد اوّل) مرتبہ مہیش پرشاد، الہ آباد، ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۶]

مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۲۶ فروری ۱۸۵۴ء کو لرزے میں مبتلا ہوئے تھے اور ہمارے پیش کردہ خط سے ظاہر ہوا کہ بیماری کا یہ سلسلہ چار مہینے تک جاری رہا، اسی شہادت کی روشنی میں ہم نے (خط نمبر ۱) کا زمانۂ کتابت جون ۱۸۵۴ء متعین کیا ہے۔ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد میں تفتہ کے نام خط نمبر ۲۵ (مکتوبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء) اور خط نمبر ۲۶ (مکتوبہ جولائی ۱۸۵۴ء) ہے، گویا اس عرصے میں تفتہ و غالب کے درمیان بہت کم خط کتابت رہی۔ یہ خط مجموعہ مکاتیب میں شمول کے وقت باعتبار زمانہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء کے خط کے بعد آئے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے اپنے دیوانِ فارسی کا مسودہ نظرِ ثانی و اصلاح کے لیے غالب کے پاس بھیجا تھا۔ تفتہ بہت پر گو شاعر تھے، کثرت سے اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ غالب بھی اُن کی زود گوئی سے تنگ تھے اور بلطائف الحیل ٹالتے رہتے تھے، بلکہ کچھ اچاٹتے تھے۔

"کول تو معلوم مگر مکان آپ کا نہیں معلوم": کول، علی گڑھ کا قدیم نام ہے۔ مکان نہ معلوم ہونے سے قیاس ہوتا ہے کہ تفتہ اسی زمانے میں علی گڑھ گئے ہوں گے یا انھوں نے اپنا مکان تبدیل کیا ہوگا۔ اس خط سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تفتہ ۱۸۵۴ء میں علی گڑھ کے کس محلے میں سکونت پذیر تھے۔ [تفتہ کے حالات کے لیے رجوع کیجیے: مالک رام: تلامذۂ غالب صفحات ۶۳ تا ۶۶]

(خط نمبر ۲) :—— نمبر ۲ سے ۹ تک فارسی کے آٹھ رقعات نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کے نام ہیں۔ غالب انھیں اکثر فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ چناں چہ ایک جگہ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں:

"آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔ . . . نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے: کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے، کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا، بچوں کو دعا، بندگی۔ . . ." (خطوطِ غالب مرتبہ مہر / ۳۴۷)

لیکن یہ صحیح نہیں کہ کبھی اُردو خط نہیں لکھا، خود عودِ ہندی میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک اُردو خط شامل ہے (ر ک: خطوطِ غالب مرتبہ مہر / ۵۷۹)

زیرِ بحث خط میں گرمی کی شدت اور شیفتہ کی بیماری کا ذکر ہے۔ شیفتہ سوداوی مزاج کی وجہ سے اکثر اختناق دم وغیرہ کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے ان کی عیش پسندی اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی (ر ک: خط نمبر ۹)

خاں صاحب سے یقیناً شیفتہ کے معالج مراد ہیں اور وہ حکیم امام الدین خاں، حکیم احسن اللہ خاں یا حکیم محمود خاں

میں سے کوئی ہو سکتے ہیں۔ قرینہ یہ کہتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی طرف اشارہ ہے۔

(خط نمبر ۳) :—— اس خط میں کسی تحفے کی رسید دی ہے۔ شیفتہ اکثر ہدایا بھیجتے رہتے تھے۔ آم چونکہ غالب کو مرغوب تھے اور شیفتہ اکثر بھیجا کرتے تھے، نیز یہ خط موسم گرما میں لکھا گیا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ آموں کا تحفہ آیا ہوگا۔ یہ خط جمعرات کے دن لکھا گیا ہے اور اگلے دن دربار میں حاضری دینے کا ذکر ہے۔ غالب ہر جمعے کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوا کرتے تھے۔ حضرت سید سے کون بزرگوار مراد ہیں، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

(خط نمبر ۴) :—— یہ رقعہ ماہ رمضان کا لکھا ہوا ہے اور اس میں جس مسودۂ کتاب کا ذکر ہے وہ قریب بہ یقین ہے کہ مہر نیمروز کے اوراق ہوں گے۔ مولانا سے دو ہی شخصیات مراد ہو سکتی ہیں! مولانا فضل حق خیرآبادی یا مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ میرا قیاس ہے کہ یہ رقعہ اواخر جولائی یا اوائل اگست ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔

(خط نمبر ۵) :—— اس خط میں غالب نے امیر تیمور تک کی روداد اتمام پذیر ہونے کی اطلاع دی ہے۔ غالب جولائی ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسیٔ اسلاف کی خدمت پر مامور ہوئے تھے (رک: خط نمبر ۷) ابتداءً یہ طے ہوا تھا کہ امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کے حالات لکھے جائیں گے۔ جب غالب نے ہمایوں تک کے حالات لکھ لیے (مارچ ۱۸۵۱ء) اور تاریخی کتابوں کی چھان بین کی کھکھیڑ ان سے برداشت نہ ہو سکی تو انھوں نے یہ شرط لگائی کہ مواد حکیم احسن اللہ خاں فراہم کر کے دیں اور میں بطور خود اسے فارسی نثر میں منتقل کرتا جاؤں۔ اس مرحلے پر بہادر شاہ نے یہ حکم دیا کہ ابتدائے آفرینش عالم سے تاریخ کا آغاز ہونا چاہیے۔ غالب نے اب مجوزہ تاریخ "پرتوستان" کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ ابتدائے عالم سے ہمایوں بادشاہ تک اور دوسرا عہدِ اکبری سے دورِ ظفر تک۔ جلد اول کا نام "مہر نیمروز" اور دوم کا "ماہِ نیم ماہ" رکھا گیا۔ غالب نے اگرچہ مارچ ۱۸۵۱ء میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال لکھ لیا تھا (رک: نادرات غالب/۸) لیکن بعد میں انھیں ابتدائے عالم سے تیمور تک کے حالات لکھ کر اضافہ کرنا پڑے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی حالات فراہم کرنے میں ڈھیل دیتے رہے۔ مارچ ۱۸۵۲ء تک کام تعویق ہی میں پڑا رہا (تفصیلات کے لیے رجوع: ذکر غالب (طبع سوم) صفحات ۱۴۷ تا ۱۵۲ نیز مقدمہ نادرات غالب صفحات ۵۰ تا ۶۲) مہر نیمروز کے بارے میں مولوی رجب علی کو ایک خط میں (مارچ ۱۸۵۲ء) غالب نے لکھا ہے:

> "آں سواد جزوے چند بیش نیست ...... از کشورکشایان تا نصیر الدین
> سلطان ہمایوں سخن راندہ ایم۔ باقی داستان فرداست"

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مارچ ۱۸۵۲ء میں عہد ہمایوں تک لکھ چکے تھے۔ مہر نیمروز پہلی بار ۱۸۵۴ء میں فخر المطابع دہلی سے شائع ہوئی (ذکر غالب/۱۵۱)

مرزا کے خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے جنوری ۱۸۵۱ء میں تیمور سے بابر تک کے حالات لکھ لیے تھے اور بارگاہ سلطانی میں پیش کرنے کے لیے مسودہ بھی صاف کرانے لگے تھے۔ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط موسومہ منشی نبی بخش حقیر میں لکھتے ہیں:

> "ہاں صاحب۔ اب بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں…… اب چھ مہینے پورے ہو چکے جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کیونکر ملتا ہے بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بماہ کر دیں گے تو تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے، ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا، صاف ہو رہا ہے اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔ اس سبب سے فرصت تم کو لکھنے کی نہ ہوئی۔ (نادراتِ غالب/۸)

چونکہ غالب نے بابر کا حال یکم جنوری ۱۸۵۱ء تک لکھ لیا تھا اور مارچ ۱۸۵۱ء میں ہمایوں کی سوداد بھی لکھ چکے تھے (رک: نادراتِ غالب/۱۱) اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ہمارا پیش کردہ خط نمبر ۵ جنوری ۱۸۵۱ء سے بہرحال پہلے لکھا گیا ہے چونکہ اس میں بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کے "تفرجِ سبزہ و آبِ رواں" پر جانے کا اشارہ ملتا ہے اس لیے یہ برسات کا موسم ہونا چاہیئے۔ بدیں اسباب میں اس خط کو اواخر اگست ۱۸۵۰ء کا نوشتہ سمجھتا ہوں۔

اس میں محمد علی خاں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ شیفتہ کے فرزند اکبر نواب محمد علی خاں رشکی ہیں جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے حالی انھیں کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔ رشکی اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور غالب سے مشورہ کرتے تھے انھوں نے مئی ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ درگاہ حضرت نظام الدین رح میں دفن ہوئے۔ یہ مشہور شعر رشکی ہی کا ہے:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

[تفصیلی حالات کے لیے رک: تلامذۂ غالب/۱۱۷)

(خط نمبر ۶): ———— اس رقعے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی دو تازہ غزلیں شیفتہ کو بھیجی تھیں۔

(خط نمبر ۷): ———— یہ خط بہت اہم ہے۔ یہ اسی روز لکھا گیا ہے جس دن غالب کو دربار ظفر سے خلعت و خطاب ملا ہے اور ان کی ملازمت کا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلعت و خطاب کے لیے ۵ جولائی ۱۸۵۰ء یوم جمعہ طے ہوا تھا، لیکن انھیں ایک دن پہلے ہی ۲۳ شعبان مطابق ۴ جولائی (۱۸۵۰ء) کو پنجشنبہ کے دن باریابی مل گئی۔ اس رقعہ سے اس غلطی کی تصحیح بھی ہو جاتی ہے جو غالب کے سہو قلم سے کلیات نثر فارسی (صفحہ ۲۷۱) میں رہ گئی ہے وہاں غالب نے ۴ جولائی کی جگہ ۴ جون لکھ دیا ہے حالانکہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کو جمعرات کا دن اور جولائی کی چوتھی تاریخ تھی۔ لیکن اس رقعہ میں بھی ایک فروگذاشت یہ ہے کہ اپنا خطاب غالب نے پورا نہیں لکھا۔ انھیں "نجم الدولہ دبیر الملک" کے ساتھ نظام جنگ کا خطاب بھی عطا ہوا تھا [رک: ذکر غالب/۸۹-۹۰] اس خلعت و خطاب اور قلعہ کی ملازمت سے غالب کو جو خوشی ہوئی تھی وہ اس خط سے ظاہر ہے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ حادثۂ اسیری نے جو داغ "بدمعاشی" و "میر لبساطی" کا ان کے دامن پر لگایا تھا وہ کسی حد تک اس خلعت سے ڈھک جائے گا۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب اگرچہ ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو سلک ملازمت میں آئے تھے مگر ان کا تقرر بکم جولائی ۱۸۵۰ء ہی سے تسلیم کیا گیا تھا اور سال میں دو بار تن خواہ ملنا طے ہوا تھا، لیکن اس سے غالب کا کام کہاں چل سکتا تھا انھوں نے دیکھا کہ تن خواہ ۶ - ۶ مہینے میں ملتی ہے اور وہ بھی متصدیوں کی ہزار خوشامد کے بعد — اور معاش کا دار و مدار قرض پر ہے تو جنوری ۱۸۵۱ء میں، گویا ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد، انھوں نے وہ مشہور درخواست منظوم لکھی :-

میری تن خواہ کیجئے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

غالباً ان کی یہ درخواست منظور ہو گئی تھی ۔

(خط نمبر ۸) :— یہ خط بھی شیفتہ کے نام ہے ۔ اس میں ان کے کسی سفر سے واپس آنے کا ذکر ہے اس میں امیر نیمروز کی روداد مکمل ہو جانے کا حوالہ بھی ملتا ہے یہ غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء ہی میں مکمل کر لی تھی ۔

عید کے دن قدمبوسیٔ مولانا سے غالباً مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے ملاقات ہونا مراد ہے ۔ اگر یہ خط ۱۸۵۱ء کا مانا جائے تو اس سال ۳۰ر جولائی کو عید ہوئی تھی ۔ اس لحاظ سے یہ تحریر اگست ۱۸۵۱ء کے نصف اول کی ہونی چاہیئے اس خط کے یہ فقرے : "چوں تموز بپایاں رسیدہ است و ہوا خنک گردیدہ" بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خط اگست ۱۸۵۱ء کا ہو سکتا ہے ۔ بہادر شاہ ظفر موسم برسات میں قطب جایا کرتے تھے اس خط میں اس کا حوالہ بھی ہے ۔

فخر الدین خاں غالب کے مسودات صاف کیا کرتے تھے اکثر خطوط میں ان کا تذکرہ ملتا ہے ۔

(خط نمبر ۹) :— یہ خط بھی اسی زمانے کا ہے جب شیفتہ سفر رامپور سے واپس آئے ہیں (غالباً اگست ۱۸۵۱ء) اس میں شیفتہ کی عشرت دوستی کی طرف بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ وہ غالباً احتراق الدم کے مریض تھے اور شراب و شاہد کی دوستی نے اس مرض کو اور بھی استوار کر دیا تھا ۔ غالب کہتے ہیں کہ میں بھی اس آزار میں مدتوں مبتلا رہا ہوں اور آپ کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے کیونکہ خدا کے فضل سے عیش و عشرت کے سارے ہی ساماں مہیا ہیں اور جان و تن، توانا ہیں ۔ خدا ہی حافظ ہے "بیدلے داور چوں گویم کہ بید او گرہمیں است کہ نگویم" اس میں شیفتہ کے رنجو سے تعلقات کی طرف اشارہ ہے ۔ یہ اپنے زمانے کی ایک طرح دار عورت تھی ۔ (رک : تلامذۂ غالب ۸۰/۷ حاشیہ) اور شیفتہ سے اس کے تعلقات کا حال اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ۔ یہ شاعرہ تھی اور نزاکت تخلص کرتی تھی ۔

اس میں غلام علی خاں کا بھی حوالہ ہے ۔ ان کے بارے میں سردست کچھ کہنے سے قاصر ہوں ۔ اُردو کا جو شعر نقل ہوا ہے یہ قائم چاندپوری کا ہے (قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن) یہ شعر غالب نے خواجہ غلام غوث بے خبر کو بھی ایک خط (مکتوبہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء) لکھا تھا :

" جناب عالی، ایک شعر استاد کا مدت سے نوکِ حافظہ چلا آتا ہے :

ظالم تو میری سادہ دلی پہ تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے ازراہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی :

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا ..... " (خطوطِ غالب مرتبہ مہر/۳۲۹)

(خط نمبر ۱۰) :——— منشی نبی بخش حقیر (متوفی ۱۸۶۰ء) کے نام یہ خط ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے اور اس خط پہ تقدم زمانی رکھتا ہے جو کلیاتِ نثرِ غالب فارسی میں شامل ہے (پنج آہنگ/۱۰۳) اور اسے میں اپنے مضمون "حادثۂ اسیری اور غالب" (نقوش ۹۴/جولائی ۱۹۶۲ء) میں درج کر چکا ہوں ۔ اس میں غالب نے اپنا فارسی شعر :

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

لکھا ہے اور اسے "تازہ ترین" بتایا ہے ۔ اس خط کے اعتبار سے یہ شعر ۱۳ ستمبر ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے لیکن یہی شعر منشی نبی بخش کے موسومہ خط (مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء کے آغاز میں نقل ہوا ہے (کلیاتِ نثرِ غالب فارسی/۱۰۳) اب یہ معما حل طلب رہا کہ جو شعر غالب نے ستمبر ۱۸۴۸ء میں لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دو تین دن قبل فی البدیہہ ہوا تھا، وہ انھوں نے فروری ۱۸۴۸ء کے خط میں کیسے لکھ دیا ؟ ہم نے جس بیاض سے یہ خطوط اخذ کئے ہیں اُن میں پہلے خط (مشمولہ پنج آہنگ) کے آغاز میں یہ شعر نہیں ہے ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کلیاتِ نثر میں شمول کے وقت غالب نے اس کا اضافہ کر دیا ہوگا جیسا کہ انھوں نے بعض الفاظ تبدیل کئے تھے اور آخر سے ریختہ کی غزل نکال دی تھی ۔

یہ اختلافات محولہ بالا مضمون میں ظاہر کر چکا ہوں ۔

یہ خط حادثۂ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے اور اس زمانے میں غالب کے دل و دماغ پر حزن و ملال کے جو اثرات مستولی تھے وہ اس خط میں بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں ۔ اس فارسی شعر میں بھی اسی حزن و یاس کا غلبہ ہے ۔ اسی مفہوم کو اُردو میں اُنھوں نے یوں ادا کیا ہے :

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی/۲۳۴)

اس شعر کے سلسلے میں ملاحظہ ہو : مولانا امتیاز علی عرشی کا مضمون "دیوانِ غالب کا ایک اور نسخہ" مطبوعہ نقوش لاہور ۸۱، ۸۲ جون ۱۹۶۰ء ۔

[نبی بخش حقیر کے حالات کے لیے رجوع : "تلامذۂ غالب/۹۴ و بعد ۔ نادراتِ غالب/۱۷ و بعد]

(خط نمبر ۱۱) :——— آفاق دہلوی نے لکھا ہے کہ : "تفتہ نے اپنا پہلا دیوان ۱۸۴۸ء کے آغاز میں مکمل کر لیا تھا ۔ اس کے دیباچے کے لیے اُنھوں نے غالب کو لکھا، غالب نے اپنی روش کے مطابق اس کا دیباچہ لکھ دیا، تفتہ کو یہ دیباچہ پسند نہ آیا اور شکایت کی کہ آپ نے میری ہجوِ ملیح لکھی ہے ۔ غالب اس سے بہت آزردہ ہوئے" (نادراتِ غالب/۲۲) اس فارسی خط سے جو ہرگوپال تفتہ کے نام ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۲ء کے وسط میں تفتہ نے اپنا "کلیاتِ فارسی" غالب

کو نظرِ ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ یہ خط اس لیے اور بھی اہم ہے کہ شاید اسی کے ذریعے تفتہ اور منشی نبی بخش حقیر کا تعارف ہوا تھا۔
ان دونوں حضرات کے تعلقات پر بحث کرتے ہوئے آفاق دہلوی نے لکھا تھا:

> "ان دونوں کے باہمی مراسم کی ابتدا کا حال معلوم نہ ہو سکا اور نہ یہ اتنا اہم ہے نبی بخش بھی آگرے کے رہنے والے تھے، تفتہ کا بھی اکبر آباد سے کچھ تعلق تھا، ممکن ہے ان حضرات کے آبائی تعلقات ہوں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی باہمی ملاقات کی تقریب کوئی ادبی صحبت یا ذوقِ سخن کی مطابقت ہو"
>
> (نادراتِ غالب/۲۲)

غالب کے اس خط سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ انھیں غالب ہی نے باہم متعارف کرایا تھا۔

اس خط میں غالب نے دیوانِ فارسی کے دو نسخے بھیجنے کا ذکر کیا ہے اس سے صریحاً دیوانِ فارسی کا وہ ایڈیشن مراد ہے جو ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ مطبع دار السلام دہلی سے شائع ہوا تھا۔

منشی ظہور علی، علی گڑھ کے صدر الصدور تھے، تفتہ کے ان سے بہت گہرے تعلقات تھے ان کے ایک فرزند محمد سلیمان کا انتقال ہو گیا تھا اس کی "یادگار" کے لیے ظہور علی نے تفتہ سے مثنوی سنبلستان (بطرز بوستانِ سعدی) لکھوائی تھی۔ سنبلستان میں جا بجا ظہور علی کا ذکر ملتا ہے:

زمانیکہ گشتمش دہ و ہفت سال   ز گردوں لبے داشتم خستہ حال
گذر اتفاقم بکول اوفتاد   شنوی شاد گر بشنوی روئداد
کہ مردے نکو سیرت و حق تلاش   صفائے درونش بروں از قیاس
اگر پرسیم نامش از خوشدلی   خود اوّل ظہور است و آخر علی

ظہور علی بہت دنوں سے تفتہ کی ملاقات کے مشتاق تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ کول (علی گڑھ) میں آئے ہوئے ہیں تو انھوں نے اپنے فرزند وارث علی کو بھیجا، تفتہ ان کے ساتھ ملاقات کے لیے گئے۔ وہاں حال و قال کی محفل برپا دیکھی، تفتہ کو دیکھ کر مولوی ظہور علی کھڑے ہو گئے اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ پھر اصرار کیا کہ تم میرے پاس ہی قیام کرو۔ تفتہ راضی ہو گئے اور ان کے لیے ایک مکان خالی کر دیا گیا۔ منشی ظہور علی کی درویشی اور خدا پرستی کی تفتہ نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی توجہ سے میرے لڑکے امراؤ سنگھ کو محکمہ دیوانی میں ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔

کتاب سنبلستان جو ۱۸۶۷ء میں تصنیف ہوئی، دراصل مولوی ظہور علی کی فرمائش ہی پر لکھی گئی تھی اور اس کے دو مطلب تفتہ نے لکھے ہیں:

نہ بے مطلب ایں جہد کردم بجاں   دو مطلب مرا نیز بود اندراں
یکے آں کہ غیر از غزل مثنوی   نگفتم ہنوز از طریق نوی
دگر ایں کہ ماند ز راہ وداد   سخن از محمد سلیمان باد

یہ ۱۳ - ابواب پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں شاعروں کی حکایات، اور بارھویں میں خود تفتہ کے حالات ہیں اس میں متعدد حکایات منشی ظہور علی سے متعلق ہیں یا ان سے روایت کی گئی ہیں۔

(خط نمبر ۱۲) ——— مولوی فضل اللہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہوسکے۔ اِن کے نام شیفتہ کا بھی ایک خط ملتا ہے (دیوان و رقعات حسرتی / ۵۱ - ۵۲ طبع ۱۸۸۷ء) نظر بظاہر یہ منشی فضل اللہ برادر منشی امین اللہ (عرف امّو جان) دیوان الور ہیں۔ جن کے نام غالب کا ایک خط کلیات نثرِ فارسی (پنج آہنگ) میں بھی ملتا ہے۔ ان کا ذکر مرقع الور مولفہ محمد مخدوم تھانوی (ص ۱۵۱ : و بعد طبع ۱۸۸۹ء) میں بھی ہے:

> "منشی امّو جان نے عہدہ بخشی گری اپنے بھائی انعام اللہ خاں کو دیا تھا اور فضل اللہ خاں برادر خورد کو کاروبار متعلقہ دیوانی میں شریک کیا تھا۔ یہ شخص فضل اللہ خاں بڑا فسادی تھا اور شر کا ابتدا سے عادی تھا۔۔۔۔"

میر قاسم علی آگرے اور ہاتھرس میں عہدۂ منصفی پر مامور رہے بعد ازاں صدر الصدور ہوئے۔ ان کا ذکر غالب کے اور خطوط میں بھی ملتا ہے (مثلاً نادراتِ غالب / ۲۱ و ۸۸)

جامع رقعات نے اس رقعے کا پتا بھی ساتھ ہی درج کر دیا ہے جو یقیناً دلچسپ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مفتی صدرالدین آزردہ کے توسط سے بھیجا گیا تھا۔

(و) مراجع

کتب :- مہیش پرشاد :	خطوطِ غالب جلد اوّل	ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد	۱۹۴۱ء
غلام رسول مہر :	خطوطِ غالب	کتاب منزل لاہور (طبع دوم)	سنہ ندارد
غالب :	کلیاتِ نثرِ غالب	نولکشور لکھنؤ	۱۸۶۷ء
محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ :	دیوان و رقعات حسرتی	مطبع نیو امپیریل لاہور	۱۸۸۷ء
تفتہ :	سنبلستان	مطبع نولکشور	ناقص الآخر سنہ ندارد
محمد مخدوم تھانوی :	مرقع الور	مطبع آگرہ اخبار آگرہ	۱۳۰۷ھ
مالک رام :	تلامذۂ غالب	مرکز تصنیف و تالیف نکودر	۱۹۵۷ء
مالک رام :	ذکر غالب (طبع سوم)	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۵۵ء
امتیاز علی عرشی :	دیوان غالب (نسخہ عرشی)	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۵۸ء
آفاق حسین آفاق :	نادراتِ غالب	مشہور پریس کراچی	۱۹۴۹ء
قائم چاندپوری :	دیوان آزردہ (قلمی)	مخزونہ انڈیا آفس لندن	(ہندوستانی مخطوطات)

رسائل : سہ ماہی نوائے ادب بمبئی جلد ۱۳ - شمارہ ۳، جولائی ۱۹۶۲ء۔ رسالہ نقوش لاہور - شمارہ ۹۴، جولائی ۱۹۶۲ء
رسالہ نقوش لاہور، شمارہ ۸۱، ۸۲ جون ۱۹۶۰ء۔ سہ ماہی معاصر (پٹنہ) حصہ اوّل

واقعۂ ہجرت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار
اور مولانا حالی کا اُردو ترجمہ

پیش کردہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۳ برس تک مسلسل کفّار کے ظلم وستم سہنے کے بعد مجبور ہو کر مکّہ سے ہجرت فرمائی اور حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کو اپنے ہمراہ لے کر غارِ ثور میں تین دن قیام فرمانے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اُس وقت حضرت علیؓ نے حضور علیہ السلام کی شان اور خدمتِ اسلام کے متعلق چند اشعار کہے تھے۔ جب میں ۱۹۱۷ء میں پانی پت میں حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی لائبریری کا لائبریرین تھا تو ایک روز حضرت مولانا مرحوم کے پُرانے مسودات تلاش کرتے ہوئے مجھے اُن کی ایک بیاض میں ان متبرک عربی اشعار کا مولانا مرحوم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا اُردو ترجمہ ملا۔ مولانا مرحوم نے اُس بیاض میں یادداشت کے طور پر لکھ رکھا تھا کہ میں نے یہ ترجمہ (مشیرالدولہ، ممتاز الملک، خان بہادر) خلیفہ سیّد محمد حسین (میر منشی ریاست پٹیالہ) کی فرمائش پر ۳۰ر نومبر ۱۸۸۶ء کو بمقام لاہور کیا۔

مولانا مرحوم کے مترجمہ یہ اشعار آج تک اُن کے کسی مجموعہ میں نہیں چھپے تھے۔ اس لیے میں نے ان اشعار کو اُن کی قلمی بیاض میں سے نقل کر لیا اور اس فکر میں رہا کہ اصل عربی اشعار بھی مل جائیں تو پھر ان کو اکٹھا شائع کروں۔ لیکن عرصہ دراز کی تلاش کے بعد بھی مجھے عربی اشعار دستیاب نہ ہوئے۔ اور یہ ترجمہ یونہی پڑا رہا۔ اصل کے بغیر ترجمے کی اشاعت مجھے منظور نہ تھی۔ اتفاقاً ایک روز خلیفہ سید محمد حسن مرحوم وزیرِ اعظم ریاست پٹیالہ کی کتاب "اعجاز التنزیل" دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس میں یہ عربی اشعار مل گئے۔ جو خلیفہ صاحب نے "ناسخ التواریخ" سے نقل کیے تھے۔ عجیب۔ اتفاق یہ کہ اُسی وقت میرے محترم دوست محمد طفیل صاحب مدیر نقوش نے اپنے سالنامہ کے لیے کسی غیر مطبوعہ چیز کی فرمائش کی۔ اور میں نے خوشی کے ساتھ یہ متبرک تحفہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جو آج ناظرینِ کرام ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ خدا کی قدرتیں اور مصلحتیں عجیب ہوتی ہیں۔ محض سالنامہ نقوش میں شائع ہونے کے لیے میرے پاس مولانا حالی کے یہ غیر مطبوعہ اشعار ۴۶ برس تک پڑے رہے۔ گم اور ضائع ہونے کے کئی مواقع کے بعد یہ پاکستان آئے اور یہاں آ کر بھی ۱۶ سال تک پڑے رہے اور آج یہ سالنامہ نقوش کی زینت بن رہے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اشعار

وَقِيتُ بِنَفْسِي خَيْرَ مَنْ وَطِئَ الْحَصٰى   وَمَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ وَبِالْحَجَرِ
رَسُوْلُ الٰلهِ خَافَ اَنْ يَّمْكُرُوْا بِهٖ   فَنَجَّاهُ ذُو الطَّوْلِ الْاِلٰهِ مِنَ الْمَكْرِ
فَبَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِي الْغَارِ آمِنًا   مُوَقًّى وَفِيْ حِفْظِ الْاِلٰهِ وَفِيْ سِتْرِ
اَقَامَ ثَلٰثًا ثُمَّ ذُمَّتْ قَلَائِصُ   قَلَائِصُ تَفْرِيْنَ الْحَصٰى اَيْنَ مَا تَفْرِ
وَبِتُّ اُرَاعِيْهِمْ وَمَا يُثْبِتُوْنَنِيْ   فَقَدْ وُطِّنَتْ نَفْسِيْ عَلَى الْقَتْلِ وَالْاَسْرِ
اَرَدْتُ بِهٖ نَصْرَ الْاِلٰهِ تَبَتُّلًا
وَاَضْمَرْتُهٗ حَتّٰى اُوَسَّدَ فِيْ قَبْرِ

ترجمہ از شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی

رسولِ مطہرؐ کہ ہے اُس سے کمتر   زمیں پر خدا کی۔ جو ہے چلنے والا
پھرے گرد کعبے کے جو۔ یا پھریں گے   وہؐ قدر و بزرگی میں ہے سب سے بالا
ہوا خوفِ اعدا۔ تو اُسؐ پر سے میں نے   سپر بن کے خود نشترِ اعداء کو ٹالا
بچایا اُسےؐ مکرِ اعدا سے حق نے   وہ جو سب پہ ہے لطف و احسان والا
خدا خود رہا غار میں اُسؐ کا امین   کہ پردہ تھا اُس نے سب آنکھوں پہ ڈالا
ہوئے تین دن جب تو اُس حد سے باہر   سواروں نے ناقوں کو اپنے نکالا
وہ ناقے جنھوں نے کہ پیروں سے اپنے   گئے جس زمیں پر اُسے پیس ڈالا
میں اعداء کی ایذا کا تھا منتظر وہاں   نہ بیڑی ہی تھی شاق مجھ پر۔ نہ بھالا
غرض اس سے تائیدِ حق تھی اور اب بھی
یہی دُھن ہے تا وصلِ ایزد تعالیٰ

تاریخِ مغل

ترجمہ: مولوی عنایت اللہ دہلوی

مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

مشہور یورپین مورخ سر ہنری ہوورتھ نے "ہسٹری آف منگولز" کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں مغلوں کی ایک نہایت بے نظیر اور بے مثل مفصل اور مکمل تاریخ نہایت تحقیق، تدقیق اور عرصہ دراز کی تلاش، کوشش کے بعد بڑی قابلیت اور لیاقت کے ساتھ لکھی جو چار ضخیم اور مبسوط جلدوں میں سنہ ۱۸۷۶ء لغایت ۱۸۸۸ء تک بارہ سال کے عرصہ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ مغلوں کی اس سے بہتر۔ اس سے اعلیٰ اور اس سے زیادہ تفصیلی تاریخ اس وقت تک دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس محققانہ اور عالمانہ تاریخ میں مغلوں کی ایسی ایسی سلطنتوں اور حکومتوں اور ایسے ایسے قبائل اور خاندانوں کا حال درج ہے جن کا روس اور وسط ایشیا کی تاریخوں میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس میں چین۔ ترکستان۔ بخارا۔ خیوا۔ دشت والگا۔ کریمیا۔ ایران۔ روس۔ قازان اور وادی ڈینیوب غرض جن جن ملکوں اور جن جن علاقوں جن جن صحراؤں اور جن جن کوہستانوں اور میدانوں میں مغلوں نے اپنی عظیم الشان سلطنتیں مختلف زمانوں میں قائم کیں سب کی مفصل حالت اور مکمل کیفیت اور سب کی عہد بعہد کی تاریخ اس لاجواب کتاب میں اُس کے لائق اور قابل مصنف نے نہایت جامعیت اور لیاقت کے ساتھ مرتب اور مدون کی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مغلوں کی قدیم تاریخ کے متعلق یہ کتاب ایک سائیکلو پیڈیا کا حکم رکھتی ہے۔ اور مصنف کا یہ بلاشبہ ایک ایسا اعلیٰ پایہ کا علمی اور تاریخی کارنامہ ہے جس کی دوسری نظیر موجود نہیں۔

علمی دُنیا کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ جیسی بے نظیر۔ بے مثل اور لاثانی یہ تاریخ ہے ایسا ہی قابل۔ لائق اور فاضل مترجم اس کتاب کو ملا۔ جو انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں اپنا عدیل اور مثیل نہیں رکھتا تھا۔ ہماری مراد شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ دہلوی کے نامور فرزند مولوی عنایت اللہ مرحوم ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے ہے جو اس فن میں تمام ملک میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور جن کے ترجمہ کی لیاقت کے متعلق سر سید مرحوم نے ایک مرتبہ اُن کے والد کو لکھا تھا کہ "تمہاری ساری عمر ترجمہ کرتے گذر گئی اگر تم کسی مضمون کا ترجمہ کر دو جیسا عنایت اللہ نے کر کے مجھے دیا ہے تو جو کہو وہ تمہیں کھلاؤں"۔ ترجمہ کی اس حیرت انگیز قابلیت کی بدولت مولوی عنایت اللہ نے متعدد اعلیٰ درجہ کی انگریزی کتابوں کو اُردو کا حسین جامہ پہنایا ہے۔ اور پچاس سے زیادہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

جب میں مئی ۱۹۳۰ء میں پانی پت سے حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (فرزندِ گرامی حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی) کے ہمراہ حیدر آباد دکن گیا تو اُس وقت مولوی عنایت اللہ وہاں سرکاری دارالترجمہ کے ناظمِ اعلیٰ (ڈائرکٹر) تھے۔ انھوں نے ہالینڈ کے مشہور مستشرق پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی کی مشہور عالم ضخیم کتاب "سپینش اسلام" کا اُردو ترجمہ مجھے اشاعت کے لیے دیا۔ ترجمہ پر حواشی لکھنے۔ اُس کا مقدمہ تصنیف کرنے اور کتاب کو حسن و خوبی اور صحت و صفائی کے ساتھ چھپوانے میں مجھے ۹ سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ اور آخر میں نے اُسے بڑی محنت کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں "عبرت نامہ اندلس" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا۔

اسی اثنا میں مولوی عنایت اللہ حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر ڈیرہ دون چلے آئے اور وہاں ملی روڈ پر ایک کوٹھی خرید کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

"عبرت نامہ اندلس" کی اشاعت کے بعد مولوی عنایت اللہ نے "تاریخ مغل" کا ترجمہ جو تین نہایت موٹی موٹی جلدوں میں تھا مجھے اشاعت کے لیے پانی پت بھیجا۔ جو انھوں نے سالہا سال کی محنت میں تیار کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کی طباعت کا کام فوراً شروع کر دوں۔ مگر واقعات و حالات ایسے پیش آتے رہے کہ میرا ارادہ عمل کی شکل اختیار نہ کر سکا اور اس کتاب کا قلمی مسودہ میرے پاس پڑا رہا۔ اسی دوران میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو مولوی عنایت اللہ کا ڈیرہ دون میں انتقال ہو گیا۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد بھی میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باعث اس ترجمہ کو شائع نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ آخر کار ۱۹۴۷ء میں وہ قیامت کی گھڑی آ پہنچی اور بڑے کشت و خون کے بعد "ہندوستان" "بھارت" و "پاکستان" میں تبدیل ہو گیا۔ میں اُس گھڑی لاہور میں تھا اور میرے اہل و عیال پانی پت میں۔

تھوڑے ہی دنوں بعد بھارتی پولیس نے پانی پت کے مسلمان باشندوں کو زبردستی اُن کے گھروں سے نکال کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا تو اس ہولناک ہجرت کے وقت میرے فرزند محمد احمد نے گھر سے نکلتے وقت مال و اسباب کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ صرف میرے جس قدر مسودات وہ لا سکتا تھا لے کر پاکستان آ گیا۔ اُنھی مسودات میں "تاریخ مغل" کی تینوں جلدیں بھی تھیں۔

مسودہ اگرچہ محمد احمد کے علمی ذوق کے باعث مجھ تک پہنچ گیا۔ مگر میں اسے یہاں بھی شائع نہ کر سکا یہاں تک کہ آج اس واقعہ کو پندرہ برس گزر گئے۔ اسی دوران میں مجھ پر غم و رنج کا ایک ایسا عظیم پہاڑ ٹوٹ کر گرا جس نے میرے ہوش و حواس گم کر دیے یعنی میرے نہایت ہی لائق فرزند محمد احمد نے جو میرا قوتِ بازو اور تمام علمی کاموں میں میرا زبردست معاون تھا اور جس نے خود بھی ۳۰ کے قریب بہترین عربی کتب کو اُردو کا حسین اور دلکش جامہ پہنایا تھا۔ عین جوانی کے عالم میں بعمر ۴۴ سال ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو انتقال کیا اور میری دُنیا سونی کر گیا۔

محمد احمد کے انتقال کے بعد بھی یہ مسودہ یونہی پڑا رہا۔ اور زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں میرے مخلص دوست مکرمی محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کو اس کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ اس صورت میں کہ "نقوش" میں اس کے اجزا وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہیں۔ جب طفیل صاحب نے اپنے اس خیال کا اظہار مجھ سے کیا تو میں اپنے محترم دوست کے ارشاد

کو شائع نہ سکا۔ اب آج میں اس "علمی تبرک" کی پہلی قسط قارئین کرام کی خدمت میں نقوش کے ذریعہ پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ ناظرین شوق اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اس اشاعت میں کتاب کے اولین دو باب حاضر کئے جاتے ہیں۔ پہلا باب مغلوں کی اصل کے متعلق ہے۔ اور دوسرا مغل خاندانوں کی قدیم روایات پر مشتمل ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ آہستہ آہستہ اور بالاقساط چھپ کر مکمل ہو جائے۔ والسعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

راقم۔ خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

باب اوّل

مغلوں کی اصل

لفظ مغل یا مونگل کی اصل لفظ مونگ ہے جس کے معنی بہادر اور دلیر کے ہیں۔ یہ تحقیق ڈاکٹر شمٹ نے کی ہے اور ڈاکٹر شاٹ نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

سانگ ست ستن جو مغلوں کا مشہور مورخ ہے۔ لکھتا ہے "یہ مغل یا مونگل کا نام اس قوم کو چنگیز خاں کے زمانہ میں دیا گیا تھا" مگر یہ خیال درست نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ نام چنگیز خاں کے زمانہ سے بہت پہلے کا ہے۔ جیسا کہ چینی مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان مورخوں کے بیانات پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ لفظ مونگل کو لفظ موہو سے خلط ملط نہ کر دیا جائے (موہو ایک قبیلے کا نام تھا جو منچوریا کے تنگوسی قبیلوں میں سے ایک قبیلہ تھا)

ملک چین کے حالات میں سب سے پہلے مونگل کا نام شاہی خاندان ٹھانگ (سنہ ۶۱۸ء تا سنہ ۹۰۷ء) کی تاریخ میں آتا ہے یہ تاریخ سنہ ۹۰۷ء کے تھوڑے ہی دنوں بعد لکھی گئی تھی (گویا دسویں صدی عیسوی میں اس تاریخ میں یہ نام آیا ہے) اس تصنیف میں یہ نام منگو لکھا ہے۔ اور شی وی پی کی ذیل میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منگو قوم شی وی پی کی ایک شاخ تھی۔

جب ہم چینیوں کی ایک دوسری کتاب کو پڑھتے ہیں جو ملک چین کے متفرقات کے حالات میں ہے اور سنہ ۹۷۶ء تا سنہ ۹۸۳ء میں لکھی گئی تھی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ منگو کا لفظ شی وی پی کے ساتھ بطور صفت آیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں منگو اور لوقان کے قبیلوں کو منگو شی وی پی اور لوقان شی وی پی لکھا ہے۔

ٹھانگ کے خاندان کی جگہ شمالی چین میں قوم ختان کا دور دورہ ہوا۔ اس قوم ختان کی تاریخ جنوبی چین کے ایک باشندے نے جس کا نام لی لنگ لی تھا۔ اور جو صوبہ چی کیانگ کے شہر کیا ہنگ فو کا رہنے والا تھا۔ سنہ ۱۱۸۰ء میں لکھی۔ اس تاریخ میں اُن قبائل کا مختصر حال درج ہے جو منچوریا کے شمال مغربی ملک میں آباد تھے۔ ان ہی قبیلوں میں سے مورخ نے ایک قبیلے کا ذکر کیا ہے جس کا نام مونگ کو لی تھا۔

ختان کی سلطنت کو قن نے غارت کیا۔ لفظ قن کے معنی زرین تاتار کے سمجھنے چاہئیں۔ اس شاہی خاندان قن کی تاریخ

میں ہم کو قبیلہ منگو کے حالات۔ بالخصوص وہ تعلقات جو سلطنت چین سے وہ رکھتا تھا تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں۔

مفصلہ بالا معلومات سے ثابت ہوتا ہے کہ مونگل کا نام چنگیز خاں کے عہد سے بہت پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور یہ ایسا نام نہ تھا جسے چنگیز خاں نے سب سے پہلے اپنی محکوم رعایا کا رکھا ہو۔ اس کے علاوہ ان معلومات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ رشید الدین نے لکھا ہے کہ مغل ابتدا میں ایک مجموعۂ قبائل کا جزو تھے۔ لیکن جب اس قبیلے کے ایک شخص کو بادشاہی عظمت حاصل ہوئی تو اس کل مجموعۂ قبائل کا نام مغل ہو گیا۔

ان ہی معلومات کی بنا پر ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مجموعۂ قبائل سے مغل تھے اس مجموعہ کو چینی لوگ شی وی پی کہتے تھے۔ اور مغل درحقیقت اسی شی وی پی کی ایک شاخ تھے۔ ہم ڈاکٹر شاٹ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے یہ تمام امور بالکل صاف کر دیئے۔ مصنف کل پروفیسر نے شی وی پی کو تنگوسی لکھا ہے۔ لیکن اس میں اس نے غلطی کی ہے۔ چینیوں کو شی وی پی کا علم ساتویں صدی عیسوی سے تھا۔

شی وی پی مختلف قبائل کا ایک مجموعہ تھا۔ یہ قبائل علیحدہ علیحدہ تھے اور سب تھوکیو یعنی ترکوں کے ماتحت تھے۔ شی وی پی کی اصل وہی تھی جو ختان کی تھی۔ ختان کی طرح شی وی پی بھی اپنا سر منڈاتے تھے۔ گاڑیوں میں مویشی جوتتے تھے اور ایسی جھونپڑیوں میں رہتے تھے جن کی چھتیں بوریے کی ہوتی تھیں۔ ترکوں کی مانند ان کے پاس بھی نمدے کے خیمے ہوتے تھے جنھیں گاڑیوں پر رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ ہوا بھری ہوئی مشکوں میں بیڑا باندھ کر دریاؤں کو عبور کرتے تھے۔ گھوڑوں کی زین میں بجائے اون کے گھاس بھر کر سوار ہوتے تھے۔ اور گھوڑوں کی راسیں بجائے چمڑے کے رسی کی ہوتی تھیں۔ سور کی کھال پر سوتے تھے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کو خاص طور پر ترتیب دے کر ان سے جنتری کا کام لیتے تھے۔ ان کا ملک بہت سرد تھا۔ بھیڑیں ان کے پاس نہ تھیں۔ گھوڑے بھی کم تھے۔ لیکن سور اور مویشی بہت تھے۔ ایک قسم کی شراب بناتے تھے جسے پی کر بدمست ہو جاتے تھے۔ لڑکی کی شادی پر دولھا والے لڑکی والوں کو روپیہ دیتے تھے تب شادی ہوتی تھی۔ رانڈوں کو پھر شادی کرنے کا حکم نہ تھا۔ امیروں میں میت کا سوگ تین برس تک کیا جاتا تھا۔ چونکہ غلہ ان کے ملک میں نہ ہوتا تھا اس لیے حسب ضرورت کوریا کے ملک سے لایا جاتا تھا۔

جنوب کے شی وی پی پچیس قبیلوں میں تقسیم تھے اور زیادہ شمال میں شمالی وی پی رہتے تھے۔ ان کے ۹ قبیلے تھے اور ان کے سردار کا لقب کی ان مو ہو تو تھا۔ ممکن ہے کہ یہ لقب ''خان مغول'' کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہی شمالی شی وی پی کے ۹ قبیلے وہ تھے جن سے اصل قوم مغل بنی تھی اور یہ قوم خاندان لوپ جیک کی محکوم تھی۔ اور یہی ۹ قبیلے چنگیز خاں کے زمانے میں ۹ فوجی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر گروہ کا سردار ۹ اورلوقوں میں سے ایک اورلوق ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ قومی جھنڈے یعنی طوغ میں ۹ غبانغ (پہاڑی بیل) کی دمیں بندھی ہوتی تھیں۔ ان شمالی شی وی پی کا ملک بہت ٹھنڈا تھا۔ اور یہ سب لوگ بن پہیوں کے ٹھیلوں پر سوار ہوتے تھے۔ سردیوں میں یہ لوگ پہاڑوں کے غاروں میں جا کر رہنے لگتے تھے۔ ان کا گزر مچھلی کے گوشت پر ہوتا تھا۔ اور مچھلیوں کے پوست کو سی کر پہنتے تھے۔ سیاہ سمور اور اس کی مثل اور جانور وہاں کثرت سے ہوتے تھے۔ لومڑیوں اور بجوؤں کی کھال کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔

ان ہی شمالی شی وی پی سے ایک ہزار لی کے فاصلے پر پو شی وی پی ایک پہاڑ کے قریب جس کا نام آئی ہو پو تھا رہتے تھے۔ یہاں سے مغرب کی جانب چار دن کے سفر پر دریائے تن موقان کے شی وی پی اور یہاں سے کئی ہزار لی کے فاصلے پر شمال مغرب کی سمت میں ایک بڑے پہاڑی ملک میں شی وی پی بزرگ رہتے تھے۔ ان کی زبان باقی شی وی پی قبیلوں سے بالکل مختلف تھی۔

مصنف کل پروتھہ لکھتا ہے کہ نویں صدی عیسوی یعنی چین کے شاہی خاندان ٹھانگ کے زمانہ حکومت میں شمالی شی وی پی کے ۹ قبیلوں کو مغربی پہاڑوں (یعنی خنگان) والے شی وی لی - شمالی شی وی لی - زرد سری شی وی لی - بوچی شی وی لی بزرگ - بوچی شی وی لی خورد - تو پھو وہ کے شی وی لی - تامو کے شی وی لی - اونٹوں والے شی وی لی کہا جاتا تھا۔

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے مورخ جو قوموں کے حالات میں اکثر غلطیاں کرتے تھے۔ وہ شی وی لی کا نام اسی طرح استعمال کرتے تھے جیسے تاتار کا نام استعمال کرتے تھے۔ یعنی اسے بطور ایک جنس یا مجموعہ اقوام کے معنی میں بولتے تھے جس کے مختلف قبائل ملک دور تا میں رہتے تھے خواہ وہ مغل ہوں یا تنگو۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ مغلوں کا ذکر سب سے پہلے چین کے شاہی خاندان کی تاریخ (یعنی ٹھانگ شو) میں آیا ہے۔ اس تاریخ میں شی وی لی کا جہاں ذکر کیا ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ اس قوم کے وہ قبیلے جو چین سے قریب تر تھے لیاؤ چنگ کے شہر سے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ (یعنی وہاں بود و باش رکھتے تھے جہاں آجکل جاؤ این ہین کا شہر مشرقی تومیہ کے ملک میں ہے) قریب تر شی وی لی چین سے شمال مشرق میں تین ہزار لی کے فاصلے پر اور جو شی وی لی زیادہ دور آباد تھے۔ وہ چھ ہزار لی کے فاصلے پر رہتے تھے۔ سب سے زیادہ مغرب میں جو قوم رہتی تھی اس کا نام یوسو کو تھا۔ جو جھیل کیولون سے جنوب مغرب میں آباد تھی۔ اور ایغور کے ملک کی سرحد پر تھی۔ ایغور کا دارالحکومت قراقرم تھا۔

جھیل کیولون کے مشرق میں آئی سی مو رہتے تھے۔ اور ان سے بھی زیادہ مشرق میں دریائے چو آؤ کے شمالی ساحل پر سائی ہو چی کا طاقتور قبیلہ آباد تھا۔ سائی ہو چی کا دوسرا نام ین چی تھا۔ سائی ہو چی سے مشرق میں ہو کی آئی اور آلو ہو اور توفی قبیلے آباد تھے۔ قبیلہ تنگ سی کے بالکل شمال میں تو چی تی کا قبیلہ رہتا تھا۔ اور ان کے شمال میں بڑے پہاڑ کے آگے تاشی وی لی کا قبیلہ دریا شی کی ان کے ساحل پر آباد تھا۔ یہ دریا جھیل کیولون سے نکلا تھا اور مشرق کی طرف بہتا ہوا گیا تھا۔

مقامات کے متعلق چینی مورخوں کے بیانات مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ یہاں دریائے شلکا (یا اونان) اور دریائے ارگون کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اور دونوں کا منبع جھیل کیولون کو قرار دیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شی کی ان دریا جس کا ذکر اوپر آیا ہے وہ درحقیقت دریائے شلکا ہے اور تاشی وی لی سے مراد تائجوت کا قبیلہ ہے۔

شی کی ان یعنی شلکا کے جنوب میں منگو کا قبیلہ رہتا تھا۔ اور اس سے شمال میں توفان کا قبیلہ۔ مغلوں کے مورث اعلیٰ کا اس طرح یقین کرنا جن کی نسبت ہم جانتے ہیں کہ وہ اونان کے کنارے رہتے تھے۔ بظاہر درست معلوم ہوتا ہے۔ توفان کون تھے؟ ان کا حال مجھے معلوم نہیں۔

دوسری کتاب جس میں مغلوں کا ذکر آیا ہے وہ ملک کی پیمائش والی کتاب ہے جس کا نام چینی زبان میں ہوآن یو کی ہے۔ یہ

تصنیف سنہ ۹۷۶ء اور سنہ ۹۸۳ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں قبیلہ سا ئی ہو چی کو بجائے شمال کے دریائے چو آو کے جنوب میں آباد بتایا ہے۔ قبیلہ آلو ہو جسے آلو بھی لکھا ہے۔ اور قبیلہ آلو ہو این کے رہنے کا مقام قبیلہ مو کی آئی کے مشرق میں لکھا ہے جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ قبیلہ مو کا ئی تو کے پہاڑ کے شمال میں آباد تھا۔ اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ آلو ہو نے شاہی خاندان یو آن وی ری کے بادشاہ تائی پنگ کے چوتھے سال جلوس (سنہ ۴۲۳ء) سے لے کر خاندان ٹھانگ کے بادشاہ نیان باؤ نے نویں سال جلوس (سنہ ۷۲۰ء) تک برابر خراج ادا کیا۔

قبیلہ آلو سے مشرق میں ۲۰۰ لی کے فاصلے پر دریائے تو (یعنی تولی) کے کناروں پر یو ہو آن کے کچھ بچے ہوئے لوگ جن کو ہوانگ ہو نے منتشر کر دیا تھا، رہتے تھے۔ اس قبیلہ یو ہو آن کے لوگوں نے خاندان ٹھانگ کے پہلے دو شہنشاہوں کو خراج ادا کیا تھا۔ اس قبیلہ کے مقام رہائش سے شمال میں ایک اور قبیلہ آباد تھا جس کا نام تاچی شی تھا۔ اور یہ قبیلہ ایک دریا کے کنارے رہتا تھا جو جھیل کیوہ ن سے نکل کر خو کیو کی زمین کے شمال مشرق میں بہتا ہوا چلا گیا تھا۔ یہ دریا اپنے مشرقی گذر میں سی اور تاشی وی لی کے ملکوں کو سیراب کرتا تھا۔ پھر یہ دریا منگوسی وی لی کے ملک کو جو اس دریا کے جنوب میں رہتے تھے (تنان شی وی لی کے ملک سے جو دریا کے شمال میں رہتے تھے، جدا کرتا تھا۔ کچھ دور مشرق میں اس دریا میں دریائے تو اور یو مان شامل ہو جاتے تھے اور شمالی اور جنوبی ہی چو ان کو جدا کر کے یہ دریا سمندر میں جا گرتا تھا۔ اس دریا سے جس کے حالات سمجھنے مشکل ہیں مراد بلاشبہ دریائے امور ہے اور اس کے بالائی گذرگاہ کے معاون دریاؤں اونان اور شلکا بھی اس میں شامل ہیں۔ تاچی شی وی لی سے مطلب ڈاکٹر شاٹ کے خیال میں ان شی وی لی سے ہے جن کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں تھیں۔ اس لیے اس سے مراد وسبید تو کے بیان کردہ قبیلہ ہی چی شی سے ہے جن کی سکونت اسی قرب و جوار میں تھی اور جس کے معنی چینی زبان میں "کالی گاڑیوں" کے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ تاچی کی دوسری شکل تاتا یا تاتار کی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان تاچی شی وی لی سے مراد تاتار ہوں جو جھیل بوئیر اور جو دریا اس جھیل میں گرتے تھے ان کے علاقوں میں رہتی ہوں۔ غالباً یہ وہی قبیلہ ہے جس کا نام ٹھانگ کی تاریخ میں تو یو چی آیا ہے۔ دریا کے حالات پریشان طریقہ پر بیان کرنے سے جیسے کہ اوپر بیان ہوئے ہیں، خیال ہو سکتا ہے کہ دریائے ارگون، دریائے اونان اور شلکا کا بالائی معاون تھا۔

اس کے بعد مغلوں کا ذکر لیاؤ کے شاہی خاندان کی تاریخ میں آتا ہے۔ اس تاریخ میں مو ہو کے ذکر کے بعد تھی ای لی ہی شی کی ان کا ذکر آتا ہے۔ ڈاکٹر شاٹ نے اس نام کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ ایک تھی ای لی اور دوسرا ہی شی کی ان۔ تھی ای لی ایک بڑی قوم کا نام بتایا ہے جس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ اور یہ نام منچو اور ترکی قوموں میں دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ دوسرا حصہ نام کا یعنی ہی شی کی ان اس کو ڈاکٹر شاٹ نے مغلوں کے ایک کم مشہور قبیلے سے مطابق کیا ہے جس کا نام کی شک تین تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوسری شکل لفظ ہی چی شی کی تھی جیسے وسبید تو نے بیان کیا ہے اور جس سے مراد تاتا ہے۔ بیان ہوا ہے کہ یہ قوم شان کنگ سے ۵۰۰ لی سیدھی شمال میں آباد تھی۔ اور وہ چینیوں کو خراج نہیں دیتی تھی۔ اُن سے صرف تجارت کرتی تھی (شان کنگ کا موقع غالباً یوردخونان کے قریب علاقہ ہارہن میں تھا) اس سے بالکل شمال میں اور تقریباً ۵۰۰ لی شان کنگ سے وہ قوم رہتی تھی۔ جسے مونگ کو لی کہتے تھے۔ اور جس کی گذر اوقات صرف شکار اور مویشی پالنے پر تھی۔ اور جس کے لیے کوئی مقررہ چراگاہ نہ تھی۔ اور یہ قوم سال بھر تک چاتے

اور پانی کی تلاش میں خانہ بدوش رہتی تھی۔ ان کی غذا گوشت اور قمیز تھی۔ ان کے لوگ ختان کو نقصان نہ پہنچاتے تھے بلکہ اپنے مویشیوں کی کھالوں، بھیڑوں، اونٹوں اور گھوڑوں کا ان سے بیوپار کرتے تھے۔ یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مغل اپنی محکوم حالت کی تاریکی سے نکل کر اہمیت حاصل کر رہے ہیں۔

اس بیان میں ان کے نام کے معنی پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور ان میں اور کئی قبیلے شامل نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ مونگ کو لی سے مغرب میں شان کنگ سے ۵۰۰۰ لی کے فاصلے پر یو کی او کا قبیلہ آباد تھا (یہی یو کی او خاندان تھانگ کی تاریخ میں بلاشبہ یوسو کو لکھے گئے ہیں) یو کی او قوم مونگ کو لی سے ہر بات میں یکساں تھے۔ شہنشاہ شنگ تسونگ کے تیسویں سال جلوس (سنہ ۱۰۱۳ء) میں یو کی او نے چین پر یورش کی۔ لیکن چین کے شہنشاہ نے انھیں ایسی سخت شکست دی کہ پھر ان میں دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت نہ رہی۔ اور اب وہ شہنشاہ کے دربار میں صرف تجارت کے لیے آتے تھے۔

یو کی او تجارت کی وہی چیزیں لاتے تھے جو مونگ کو لی لاتے تھے۔ ان سے آگے شمال مغرب میں قبیلہ پی کو لی رہتا تھا اور ان سے آگے تاتا یا سفید تاتار تھے۔ ان سے آگے کچھ ترکی قبائل تھے اور سب سے آخر میں تنگوت تھے۔

شاہی خاندان قن کی تاریخ میں مغلوں کو منگو لکھا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ وہ قبیلہ جورچی کے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر شاٹ کا خیال ہے کہ شمال مشرق یہاں غلطی سے لکھا گیا ہے۔ شمال مغرب ہونا چاہیئے۔

اوپر کے بیانات وہ ہیں جو چین کے مصنفوں نے مغلوں کی اصل کے متعلق لکھے ہیں جن سے ہم مغلوں کا سراغ شی وی لی تک لگا سکتے ہیں۔

ان سے پہلے قبیلوں کی مثلاً ہون اور دیگر قبائل کی اصل تحقیق کر کے میں اس بیان میں طوالت پیدا کرنی نہیں چاہتا۔ جو کام میں نے اس وقت اپنے ذمہ لیا ہے وہی زیادہ مشکل ہے۔ مزید مشکلات پیدا کرنے میں اور زیادہ پریشانی ہوگی۔ لیکن یہ بات کہنی ضروری ہے کہ مغلوں کی اصل دریافت کرنے میں ہم مغلوں کا تعلق شی وی لی سے کرتے ہیں اور کسی قدر واسطہ ان کا ختان سے بھی کر دیتے ہیں۔ جن کی نسبت چینیوں کی دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ ختان کی اصل شی وی لی سے تھی۔ اگر ایسا ہے تو ہم مغلوں کا نسلی واسطہ سیان پی اور یوہوآن سے بھی سمجھ سکتے ہیں جن کی اصل ختان اور یو آن یو آن سے ملتی تھی۔ یہ اخیر نام اس نام سے ملتا جلتا ہے جو مغلوں کے شاہی خاندان نے چین میں بادشاہ ہو کر اختیار کیا تھا۔ یعنی یو آن۔ اور ان کا ملک وہی تھا جو اوبرات کا تھا۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ یو آن یو آن اوبرت کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

یہ کہنا کافی ہوگا کہ چھٹی اور بارھویں صدی عیسوی کے درمیان مغلوں نے دنیا کی تاریخ میں بہت کم کام کیا۔ اس زمانہ میں مغل شمالی مغلولستان کے علاقوں سے باہر نہ نکلے۔ مغل بحر بیکال کے جنوب مغرب میں بھی آباد تھے۔ قوم یو آن یو آن کے تنزل کے بعد جس کا باعث ترک تھے۔ ترک مشرقی ایشیا پر مسلط ہو گئے۔ اور یہی ترک ہوانگ نو کے نام سے مغلولستان کے صحرا اور اس صحرا کے کناروں پر جس قدر زمینیں تھیں سب پر قابض ہو گئے اور نیا نام ترک اختیار کر کے پھر وہی درجہ حاصل کر لیا جو صدیوں پہلے انھیں حاصل تھا۔ مغلوں کی تاریخ میں ہر جگہ ترکوں کا ذکر ملتا ہے۔ خاقان۔ خان۔ بیگونی۔ بیگ۔ ترخان وغیرہ وغیرہ مغلوں اور ترکوں کی زبان میں مشترک الفاظ ہیں۔ اور یہی الفاظ مغلوں اور ترکوں کے سرداروں کے ہوتے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم

کو جوہات حد سے زیادہ پریشان کرتی ہے وہ قبیلوں کے ناموں کا ہے جیسے کہ قنقرات وریات وغیرہ میں خلط ملط ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قبیلے ترک تھے یا مغل۔ کیونکہ یہی نام بعد کے زمانہ کے مغل اور ترک قبیلوں نے اختیار کیے تھے۔ قدیم زمانہ میں ترکوں کے غلبے کی وجہ سے جس قدر روایات رشید الدین نے جمع کی ہیں اُن کی تائید ہوتی ہے۔ ان روایتوں میں خانانِ مغل کا سلسلہ نسب ترکوں کی حکمران قوم سے جا ملتا ہے۔ اور اس کا ثبوت مجھے حال میں ملا ہے۔ جو یہ کہ ڈاکٹر شاٹ نے چینی سیاحوں کے سیر و سفر کے حالات کا جو انھوں نے مغلوں کے دورِ حکومت میں کئے تھے ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کے آخر میں اُس نے چنگیز خاں کا ایک خط نقل کیا ہے جو اُس نے چنگ چو سیاح کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں اُس نے تشان لو باد شلو ہی اونگ نو کو "ہمارا تشان لو" لکھا ہے۔ مترجم یہاں لکھتا ہے کہ اس جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ چنگیز خاں قدیم ہی اونگ نو کو مغلوں کا مورثِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اس سے میں خیال کرتا ہوں کہ چنگیز خاں جس شاہی خاندان کا آدمی تھا اُس کی اصل قدیم ترکی قوم ہی اونگ نو سے تھی۔

قوم مغل کی اصل کے متعلق تحقیقات یہاں ختم ہوتی۔ اب میں شاہی خاندانِ مغل کے متعلق روایات لکھتا ہوں۔

باب دوم

خانانِ مغل یا مغلوں کے حکمران خاندان کے متعلق روایات

مورخ سانانگ ست ستین لکھتا ہے کہ مغلوں کے حکمران خاندانوں کی اصل تبت کے شاہی خاندان اور اس خاندان کے ذریعہ ہندو کے شاہی خاندان سے تھی۔ اس مورخ کا بیان ہے کہ تبت کا بادشاہ جس کا نام ولائی سوبن اندا التان شابیر غنو تھا۔ اُس کو اُس کے وزیر نے دھوکے سے مار ڈالا اور خود تبت کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس وزیر کا نام لنگلم بیان ہوا ہے۔ اس مقتول بادشاہ کے تین فرزند تھے۔ باپ کے قتل کے بعد یہ تینوں شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بڑا لڑکا شیبا خوچی ننگ بو کی زمین کی طرف اور منجھلا بیٹا بوراچی بوبو کی زمین کی طرف اور سب سے چھوٹا بیٹا بورتی چینو گونگ بو کی زمین کی طرف بھاگا۔ بورتی چینو گونگ بو کی زمین میں زیادہ نہ ٹھہرا۔ ایک لڑکی سے جس کا نام غوا مارال تھا۔ شادی کر کے کچھ دنوں تنگیر کی سرحد پر قیام کیا۔ پھر وہاں سے چل کر بحر بیکال کے ساحل پر کوہ برقان خلدون کے قریب آیا اور یہاں قوم بیدی سے ملا۔ جب اس قوم کے لوگوں نے اس سے اُس کے سفر کا سبب پوچھا۔ اور انھیں معلوم ہوا کہ اُس کی اصل ہندوستان کے امیر اولانا ارکوک دلگین خان اور تبت کے خان تول اسین سے ہے۔ تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ "یہ نوجوان بڑا عالی خاندان ہے چونکہ اس وقت ہمارا کوئی سردار نہیں ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ ہم اسے اپنا سردار بنا لیں" یہ کہہ کر بیدی قوم نے بورتی چینو کو اپنا سردار مان کر اُس کی رعایا بننا قبول کر لیا۔

اس بیان میں دو مختلف قصّے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی قصہ کو بھی خصوصیت کے ساتھ مغلوں سے تعلق نہیں

ہے۔ وزیر کنگلم کا تبت کے تخت کو غصب کرنا تبتی ماخذوں سے لیا ہے تبتی بیان کالموک زبان میں ترجمہ ہو کر ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ جس کا نام توم غوخوی ندرخوی نوئی ہے۔ اسی کتاب سے کلاپروتھ اور شمٹ نے اس قصہ کو جو اوپر بیان ہوا۔ اقتباس کیا ہے۔ اصلی تبتی زبان میں جو بیان ہے اس میں تینوں بھائیوں کے نام جا تھی، ینا تھی، اور شازا تھی ہیں۔ لفظ تھی جسے تری لکھتے ہیں شاہی تخت کے معنی رکھتا ہے۔ اور یہ پرانے تبتی بادشاہوں کے نام سے پہلے ہمیشہ لکھا جاتا تھا۔ جا کے معنی ہوا یا پانی کے پرند کے ہیں، ینا کے معنی مچھلی اور شازا کے معنی گوشت خور کے ہیں۔ سانانگ ست زین نے مقتول بادشاہ کے دو بڑے بیٹوں کے نام شیبوا غوچی اور بوراچی لکھے ہیں۔ ان دونوں ناموں کے معنی بھی وہی ہیں جو جا اور ینا کے ہیں۔ یعنی چڑی مار اور ماہی گیر۔ تیسرا بھائی جس کا نام شازا تھا۔ اور سانانگ نے اسے بورتی چینو لکھا ہے تو اس بورتی چینو کے معنی جیسا کہ میں ابھی ظاہر کروں گا گہرے نیلے رنگ کی پوستین رکھنے والے بھیڑیے کے ہیں جو بڑا گوشت خور ہوتا ہے۔ تبتی بیان میں شازا کا کونگ بو تک جانا بیان کر کے وہیں اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (کونگ بو سے مراد تبت کا وہ علاقہ ہے جو دریائے برہم پتر کے شمال میں ہے) بحر بیکال تک اس کا سفر کرنا بیان نہیں کیا ہے۔ اور نہ یہ لکھا ہے کہ قوم بیدی سے وہ ملا تھا۔ پس ہم کافی صحت کے ساتھ کلاپروتھ کے اس خیال سے متفق ہو سکتے ہیں کہ بورتی چینو اور شازا کو مطابق کرنا صرف لاماؤں کا کام تھا جس وقت مغلوں نے ان لاماؤں کا مذہب اختیار کیا تو انھوں نے مغلوں کی خوشامد اور تعریف میں اپنے شاہی خاندان سے ان کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اور اپنے شاہی خاندان کے ذریعہ ان کو ہندوستان کے سکھیا تھی تک جا ملایا۔

بورتی چینو کا نام اور قصے کے اور واقعات تبتی ماخذ سے نہیں بلکہ دوسرے ماخذوں سے لیے گئے ہیں اور قصے کے دوسرے اور واقعات سانانگ ست زین اور چینی مورخوں اور رشید الدین اور ابوالغازی خاں اور مغربی اور مشرقی مصنفوں کی کتابوں میں جنھوں نے مغلوں کے حالات لکھے ہیں۔ اکثر بیان ہوئے ہیں۔ بیشتر اس سے کہ لاماؤں نے اپنی طرف سے اس قصے میں اضافہ کیا ہو چینی مصنفوں میں سے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ شاہی خاندانِ مغل کا جدِ اعلیٰ ایک آسمانی رنگ کا بھیڑیا تھا جس کا نام بورتی چینو تھا۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ بورتی چینو کے معنی ایک ہلکے رنگ کے بھیڑیے کے ہیں اور یہ ہلکا رنگ ایسا تھا جیسے جاڑے میں بھیڑیے کی پوستین کا ہو جاتا ہے۔ اس بھیڑیے نے ایک سپید رنگ کی بھیڑنی جو بڑی غضب ناک اور غصہ ور تھی۔ شادی کی۔ اس بھیڑنی کا نام خوا مارال تھا۔ خوا کے معنی مغل زبان میں بیگم کے ہیں اور مارال کے معنی بھیڑیے کی مادہ کے ہیں۔ قوم کا یہ جدِ اعلیٰ آوارہ گردی زندگی بسر کرتا تھا۔ اسی آوارہ گردی میں ایک جھیل کو (جس کا نام تن عز تھا) عبور کر کے دوسری طرف پہنچا۔ اور آخر کار کوہ برخان پر آیا جو دریائے اونان کے منبع کے قریب تھا کلاپروتھ اور دوسرے مورخوں نے لکھا ہے کہ اس زمانہ سے بہت پہلے چین کی تاریخوں میں تھیوکیو (یعنی قدیم ترکوں) کی اصل کو تحقیق کرنے میں بھی بھیڑیے کی نسل سے پیدا ہونے کا قصہ لکھا ہے۔ تھیوکیو کے بزرگ جھیل سی ہائی کے کنارے رہتے تھے۔ تھیوکیو کے شاہی خاندان کو قریب کی ایک قوم نے غارت کر دیا۔ سب لوگ مارے گئے صرف ایک لڑکا جس کی عمر دس برس کی تھی بچ گیا۔ لیکن دشمن نے اس کے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ اس بچے کو ایک بھیڑیے کی مادہ نے پرورش کیا۔ دشمن قوم نے جب اس بچے کی جان لینی چاہی تو ایک جن اس پر مہربان ہوا اور اسے مع بھیڑنی کے جس نے بچہ کی پرورش کی

تھی۔ جھیل سی ہانی کے مشرق میں پہنچا دیا۔ یہاں سے یہ بچہ اور بھیڑنی ایک پہاڑی ملک میں جو کاؤ چنگ کے ملک سے شمال مغرب میں تھا آئے۔ یہاں اُن کو پہاڑوں میں ایک غار ملا جو ایک وادی کے کنارے تھا۔ یہ وادی ۲۰۰ میل لمبی تھی۔ بھیڑنی نے یہاں دس بچے دیے۔ ان بچوں نے جوان ہو کر بیویاں کیں اور اپنی اپنی اولاد کے نام رکھے۔ اس اولاد میں اسینا سب سے زیادہ بہادر تھا۔ اس سبب سے وہ قوم کا امیر اور سردار مقرر ہوا۔ اور اُس کی اولاد نے اُن قوموں پر جو وہاں تھیں حکومت کی۔ یہ لوگ بھیڑیے کا سر اپنی ڈھالوں پر بناتے تھے اور اُن کے بیان کے مطابق اُن کی نسل کا نام سینا تھا جس کے معنی بھیڑیے کے ہیں۔

چینی مورخوں کا یہ بیان جو ھیونگ نو کی اصل کے متعلق ہے اور سانگ کا بیان جو مغلوں کی اصل کے متعلق ہے۔ ایک جیسے ہیں۔ دونوں قصوں میں بھیڑیا آتا ہے۔ دونوں میں ایک جھیل کا ذکر ہے۔ دونوں میں جھیل سے رخصت ہونے کے بعد اُس کا مشرق کی طرف جانا لکھا ہے۔ دونوں میں وہ ایک پہاڑی ملک میں پہنچا ہے۔ اور جو قومیں وہاں تھیں اُن کا سردار ہو جاتا ہے۔ ایک اور بات بھی ایسی موجود ہے جسے غالباً ابھی تک کسی نے نہیں لکھا اور اگر وہ معلوم ہو جاتی تو بہت سی تحریریں جو کلپروتھ اور شمٹ میں غصّے کے ساتھ ہوئیں نہ کی جاتیں۔ سانگ نے لکھا ہے کہ بورتی چینو قوم بیدا کا سردار ہو گیا۔ یہ قوم برقان خلدون کے پہاڑوں میں رہتی تھی۔ چینی مورخوں کے قصے میں بیان ہوا ہے کہ بورتی چینو۔ کاؤ چنگ یعنی ایغور کے شمال مغرب کی طرف گیا۔ میں نے اس کتاب کے حواشی میں لکھا ہے کہ ایغور کو پرانے زمانہ میں تبت۔ اور اس کے قرب و جوار کے لوگ بیدا کہتے تھے۔ اور یہ کہ ایغور ترکی قوم کا ایک ٹکڑا تھے۔ اور نویں صدی عیسوی کے وسط تک وہ مغولستان کے شمال مغربی حصے میں برقان خلدون کے پہاڑوں میں رہا کرتے تھے۔ اور اُن کا دارالحکومت قراقورم تھا۔ ابو الغازی خاں نے یہ بات اور بیان کی ہے کہ جب بورتی چینو شمال کی طرف گیا تھا تو وہ ارگینی کن کی وادی میں جس کے گرد بہت سی پہاڑیاں تھیں جن کی چوٹیاں کنگورے دار معلوم ہوتی تھیں۔ آیا تھا۔ اس ارگینی کن کی وادی کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ کہیں جھیل ایسک کل کی وادی میں تھی۔ اور سب سے الگ واقع ہوئی تھی۔ ایسک کل کو مغل تمور نور گول کہتے تھے جس کے معنی لوہے کی جھیل کے ہیں۔ یہی وادی مغلوں کی قدیم روایات کے بموجب اُن کا اصلی وطن تھا۔

ان چند واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح لاماؤں سے مغلوں نے اپنا تبتی سلسلہ نسب مستعار لیا تھا۔ اس طرح ایغوروں نے جو نویں صدی عیسوی میں اُن کے معلم تھے۔ یہ قصہ سُنا تھا کہ اُن کے شاہی خاندان کا سلسلہ نسب ترک بادشاہوں سے ملتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آخر کے قصّے میں زیادہ سچ ہے۔

رشید الدین نے جس کی انتقادی قوت بہت تیز تھی مغلوں کے شاہی خاندان کا سلسلہ ترکی شاہی خاندان سے چلایا ہے۔ ایک خوش عقیدہ مسلمان کی طرح وہ انبیاؑ کے تذکرے سے اس سلسلے کو شروع کرتا ہے اور یہ انبیاؑ وہ ہیں جن کا ذکر انجیل کے عہد عتیق اور قرآن میں بھی اکثر آیا ہے۔

ان عجیب علمائے انساب نے مغلوں کا ابتدائی نسب نامہ اس طرح لکھا ہے :-

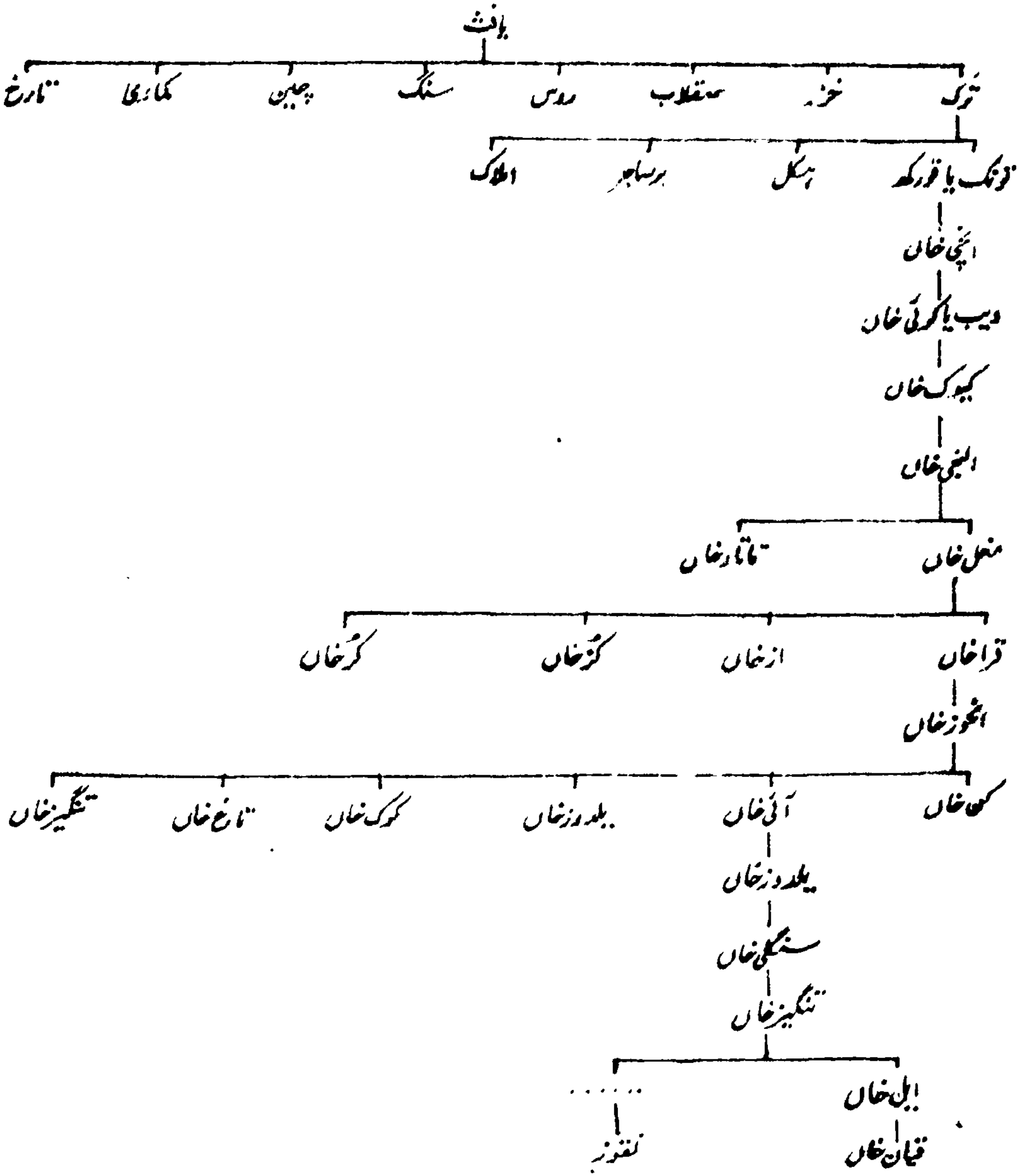
یافث
ترک
خزر
صقلاب
روس
سنگ
چین
کماری
تارخ
تونک یا تورکھ
چگل
برساجر
املاک
ایچی خاں
دیب باکوئی خاں
کیوک خاں
النجی خاں
مغل خاں
تاتار خاں
قرا خاں
از خاں
کرخاں
کرخاں
اغوز خاں
کن خاں
آئی خاں
بلدوز خاں
کورک خاں
تاغ خاں
تنگیز خاں
یلدوز خاں
منگلی خاں
تنگیز خاں
ایل خاں
. . . . . .
قیان خاں
نقوز

اس نسب نامہ میں ترک اور مغل خلط ملط ہیں اور یہ شجرہ ترکی قبیلوں اور قرا خان، اوغز خاں اور ایل خاں کا جو ترکی تاریخ میں مشہور نام ہیں۔ محض افسانے کے طور پر ہے۔ جس ملک میں یہ بادشاہ رہتے تھے وہ جھیل ایسک کل۔ صحرائے قرا قورم اور دریائے سیحون کے ساحلی علاقے بتائے گئے ہیں۔ یعنی پرانا ترکستان۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ جب مغلوں کو شہرت حاصل ہوئی تو ترکی اور ایرانی مورخین نے جیسا کہ بعد کو تبت کے لاما پریشان ہوئے کہ اپنے مغل بادشاہوں کا ایک نسب نامہ جو ان کی شان کے لائق ہو کس طرح تیار کریں۔ بس انھوں نے بڑی بے باکی سے مغل بادشاہوں کا نسب نامہ ترک بادشاہوں سے قائم کر دیا۔

بیان ہوا ہے کہ تاتار خاں اور مغل خاں کی اولاد میں ہمیشہ نزاع رہا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مغل خاں کی اولاد کو تاتار خاں کی اولاد نے غارت کر دیا۔ اس اولاد میں صرف قیان اور نقوز بچ گئے اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ارکنہ قون کی مشہور وادی میں جا کر آباد ہو گئے۔ اس وادی ارکنہ قون میں ان کی اولاد چار سو برس تک آباد رہی۔ یہ نہیں معلوم کہ ان چار سو برس میں کن کن بادشاہوں نے حکومت کی۔ ان چار سو برس کے بعد قصہ از سر نو شروع ہوتا ہے۔ اس چار سو برس کے وقفے نے مضمون کے ایک بڑے جزو کو چھپا دیا ہے اور اس کی کچھ قیمت ہے تو یہی کہ کچھ مختلف النوع مواد جوڑ جاڑ کر ایک پورا نسب نامہ تیار کرنا پڑا۔ آخر کار ان چار سو برس کے بعد مغلوں کو تاتاریوں سے آزادی حاصل ہوئی اور وہ ارکنہ قون کے پہاڑوں سے باہر نکلے۔ ابوالغازی خاں لکھتا ہے کہ جب ارکنہ قون سے مغل نکلے ہیں تو ان کے بادشاہ کا نام بورقی چینہ تھا۔ یہ بورقی چینو، قیان خاں کی اولاد میں قبیلہ کرولاس کا شخص تھا یہ بورقی چینو اور سانانگ کا بورقی چینو دراصل ایک ہی شخص ہے۔ کرولاس، قبیلہ قنغرات کی ایک شاخ تھا۔ پس ترکوں سے تعلق یہاں بھی قائم رہا۔

چینی مورخوں کے بیان کے مطابق بورقی چینو کا ایک بیٹا بیدی تسی تھا۔ سانانگ ست زتن جس نے کچھ نام اپنے شجرہ نسب میں بڑھا دیے ہیں اس نے بیدی تسی کا ایک بھائی بیدیس بھی لکھا ہے۔ اور بیدی تسی کو تاجگوت کا جد اعلیٰ لکھا ہے اور بیدیس کو مغلوں کا۔ یہ بیان رشیدالدین کے بیان سے جو زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مختلف ہے۔

ذیل کی فہرست سے بادشاہوں کی جانشینی کا حال جیسا کہ سانانگ ست زتن اور رشیدالدین نے لکھا ہے دریافت ہوتا ہے:-

سانانگ ست زتن	رشیدالدین
بورقی چینو	بورقی چینہ
بیدی تسی	ای جین خاں
تمغک	تیماج
خوریت سر سرگین	یکیچا سہرگویں
اغوجم بغوررول	خوجم بغرول
ساقی علجیگو	یکی ندون
تبگی تددن	سمسوجی
سمسوجی	خالی خوجو
خالی خرتشو	

یہاں تک یہ دونوں فہرستیں ایک ہی سی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ماخذ بھی ایک ہی ہے۔ لیکن اس سے آگے ان فہرستوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

سانانگ ست زتن نے خالی خرتشو کا جانشین بورچی گئی مرگن کو بیان کیا ہے۔ مگر یہ نام محض سرتش کا ایک نام ہے جو بورچیگ

نے خاندانی نام کی صراحت کے لیے، جمع کر لیا ہے۔ بوربگی گنی مرگن کی بیوی مرگین شکل جن گوا تھی۔ یہ نام مغل کا مرادف معلوم ہوتا ہے۔ ان میاں تبدی کے بیٹے کا نام سانانگ ست زتمن نے ترغل جن بیان لکھا ہے۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک دوا سوخر اور دوسرا دربومرگن۔ دوا سوخر کے چار بیٹے بیان ہوئے ہیں۔ دونوی۔ دوکشن۔ ایمنیک اور ارکی۔ ان چاروں سے چار قبیلے اوبراد کے چلے۔ سوائے دوبومرگن کے ذکر کے باقی سب باتیں بعد کو اضافہ ہوئی ہیں۔ اور اس اضافہ کی وجہ بڑی ہوشیاری سے بیان ہوئی ہے۔ دربومرگن کو جسے رشیدالدین نے دوبون لکھا ہے۔ توبوخان سے مطابق کیا گیا ہے۔ توبوخان ترکوں کا سب سے بڑا سردار تھا اور اس کی موت سنہ ۵۱۸ء میں پیش آئی تھی۔ دوبوان کا ایک بھائی تھا جس کا نام سکین باسا کوتی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سانانگ ست زتمن کا دوا سوکر ہے۔ بیان ہوا ہے کہ توبوخان کے مرنے پر ترک چار حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ یہ وہی بات ہے جسے کہ سانانگ ست زتمن نے دوا سوخر کے چار بیٹوں کو اوبراد کے چار قبیلوں کا سردار لکھا ہے۔ رشیدالدین جو زیادہ معتبر مورخ ہے اس نے خان توتو کے بعد ہی دوبون بیان کا جانشین ہونا مانا ہے۔ لیکن ابوالغازی خاں نے دربون بیان کے بعد ہی بیٹے بعد دیگرے تین جانشین اور بتائے ہیں۔ ایک تو رتاش دوسرا منگل خواجہ اور تیسرا ایلدوز خاں۔ ایرڈمین نے لکھا ہے کہ معلوم نہیں ابوالغازی خاں نے یہ چیز کہاں سے اخذ کی ہے۔

دوبون بیان کے ذکر پر ہم پھر ایک مشترک زمین پر آ جاتے ہیں۔ (بیان کے معنی بیل کے ہیں)۔

سانانگ ست زتمن لکھتا ہے کہ دوا سوخر کا نام دوا سوخر اس لیے ہوا کہ وہ ایک آنکھ رکھتا تھا اور یہ بھی اس کی پیشانی پر تھی۔ ایک دن وہ اور اس کا چھوٹا بھائی برقان خلدون کے پہاڑوں میں کھیل رہے تھے تو بڑے بھائی نے کہا "دیکھو تورنگ سگرودی کے علاقہ سے دریائے تنگ گلو کے کنارے کنارے ایک کارواں آ رہا ہے۔ (یہ دریا کوہ برخان خلدون کی مغربی سمت سے نکل کر بہتا ہوا قراکول میں گرتا ہے) اور اس کارواں کی ایک گاڑی میں ایک جوان لڑکی ہے جس کی پیدائش خلافِ عادت طور پر ہوئی تھی۔ چلو۔ ادھر جا کر اسے دیکھیں اور وہ تمہاری بیوی بنے گی" یہ کہہ کر دونوں بھائی چل پڑے اور معلوم کیا کہ وہ لڑکی برغوجن قوا کے بطن سے ہے۔ برغوجن قوا خوری تانی رکین کی بیوی تھی جو توبار نومبہ کے قبیلے سے تھا۔

رشیدالدین نے لکھا ہے کہ یہ نوجوان لڑکی قبیلہ کوردلاس سے تھی۔ یعنی وہ ترک تھی اور اس کا باپ انسان نہ تھا بلکہ وہ ایک روح تھی۔ جب اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا تو الان قوا نے کئی برس کے بعد ایک رات خواب دیکھا اور اس خواب میں روشنی کی ایک شعاع چھت کے سوراخ سے خیمے کے اندر آئی اور فوراً وہ ایک حسین خوش رو نوجوان مرد کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ جس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا اور بال بہت خوبصورت تھے۔ یہ نوجوان مرد الان قوا کے پہلو میں بیٹھا نظر آیا۔ الان قوا کے ہاں اس نوجوان سے تین بیٹے ہوئے۔ ایک برغو ختاکی۔ دوسرا برغو سالجیکو اور تیسرا بدنستر مونگ خاں۔

اس خرقِ عادت پیدائش کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ بدھا ساکھیا منی کے مجسم ہونے کے قصے کو اس میں دہرایا گیا ہے۔ اور ایسا ہی قصہ اپادگی کی پیدائش کے بارہ میں جو حکمران خاندان لیاؤ کا جدِ اعلیٰ تھا اور منچو خاندان شاہی کے بانی آئی شین گیارو کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ الان قوا کا وجود اس قدر مختلف شہادتوں سے دریافت ہوتا ہے کہ اس کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔

رشید الدین نے لکھا ہے کہ چنگیز خاں کی تاریخ جو شاہی خزانہ میں محفوظ ہے اُس سے اور معمر لوگوں کی زبان سے سُننے میں آیا ہے کہ الان قوا چنگیز خاں سے چار سو برس پہلے زندہ تھی۔ گویا عباسیوں اور سامانیوں کے شروع زمانہ میں حیات تھی۔ یہ زمانہ اُس زمانہ سے مطابق ہوتا ہے جس میں چین کی تاریخ میں مغلوں کا نام سب سے پہلے آیا ہے۔

الان قوا کی اولاد بورچیک کہلائی۔ غالباً یہ نام اس اولاد کے جدِ اعلیٰ کی ہلکی نیلگوں آنکھوں کی مناسبت سے رکھا گیا۔ شمٹ نے لکھا ہے کہ بورچیک کے معنی ہلکے رنگ کی بھوری آنکھوں کے ہیں۔

یہ قصہ جو اوپر بیان ہوا صاف طور پر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مغلوں کی اصل ایک آسمانی کرشمہ یا خلافِ عادت واقعہ تھا۔ الان قوا کے تین لڑکے جو خلافِ عادت طور پر پیدا ہوئے تھے اُن کو اور اُن کی اولاد کو نیرون یعنی "نور کے بچے" کہا جاتا تھا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ ان تین لڑکوں کی اولاد میں اور اُن کے بھائیوں کی اولاد میں تمیز رہے۔ ان دوسرے بھائیوں کی اولاد کو درلگین کہتے تھے۔

رشید الدین لکھتا ہے کہ نیرون اور درلگین میں وہی واسطہ تھا جو موتی اور صدف یا پھل اور اُس کے درخت میں ہوتا ہے۔ نیرون اور درلگین میں تمیز قائم رکھنے پر ایرانی مورخوں کو بہت اصرار ہے۔ اور یہی چیز تاریخ کے طالب علم کی پریشانی کا موجب ہے۔ مشرق کے لوگ مغلوں کے متعلق بہت کم لکھتے تھے اور نسلوں میں جو تمیزیں وہ قائم کرتے تھے وہ بجائے نسلی ہونے کے سیاسی ہوتی تھیں۔ ہم لوگوں کو ان نسلی امتیازوں میں جو عربی اور ایرانی جغرافیہ نویسوں نے لکھی ہیں بڑی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے مثلاً درلگین کا سب سے معتدبہ حصہ یعنی قنقرات جن کے چھ قبیلے تھے۔ اُس کے متعلق مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مغل نہ تھے بلکہ ترک تھے۔ اور اُن کی جائے رہائش جیسا کہ دھوسن نے لکھی ہے منچوریا نہ تھی بلکہ وہ دشت شام میں دریائے اونغین کے جنوب میں رہتے تھے۔ نیرون کے قبیلوں میں سے بعض کے متعلق میرا خیال ہے کہ غالباً وہ ترک تھے۔ یہ قبیلے دربان۔ بارین اور سکونوت تھے جو دشت شام کے مرکزی حصے میں رہتے تھے۔ اور ایک قبیلے کا نام بارین۔ علاقہ بارین کے نام پر اب تک چلا آتا ہے۔ درلگین کے قبائل میں بایوت کی نسبت مضبوط شہادت موجود ہے کہ وہ ترک تھا۔ بایوت دریائے سلنگا کے معاون دریاؤں کے کنارے رہتے تھے۔ بجانب دیگر درلگین کے قبیلے ارنوت۔ ہوشین۔ الدرکن اور کنگیت غالباً مغل تھے۔ لیکن یہ اس حکمران خاندان کے تابع نہ تھے جس سے چنگیز خاں تھا۔ اور نہ چنگیز خاں کے عزیزوں پر براہ راست حکومت کرتے تھے۔ بلکہ اُن پر ایک دوسری نسل کا خاندان حکومت کرتا تھا۔ نیرون کا نام صرف اُن لوگوں پر عائد ہوتا تھا جو بورچیک کے شاہی خاندان کے تابع ہوتے تھے اور غالباً اُن یوسون (سپید ہڈی) کا لفظ نیرون کے لیے بولا جاتا تھا۔ جو ہمارے زمانہ میں قزق لوگ صرف شاہی خاندان والوں کے لیے بولتے ہیں۔ الان قوا کے تینوں فرزندوں میں جو خرق عادت طور پر پیدا ہوئے تھے ہر فرزند ایک ایک نسل کا جدِ اعلیٰ قرار پایا۔ سب سے بڑا لڑکا نسل کتاکین کا اور منجھلا بیٹا سالجوت کا اور چھوٹا صاحبزادہ بورچیک کا یعنی مغلوں کے شاہی خاندان کا مورثِ اعلیٰ مانا گیا۔ پہلے دو قبیلے یعنی کتاکین اور سالجوت شروع زمانہ میں چنگیز خاں کے جانی دشمن تھے۔ یہ قبیلے چنگیز خاں کو سب سے چھوٹی شاخ سے سمجھتے تھے کیونکہ وہ الان قوا کے سب سے چھوٹے فرزند کی اولاد تھا۔ اس چھوٹے بیٹے کا نام بدنتسر مونگ خاں تھا۔ اس کو لوگ بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس کی عادتوں میں بڑی سادگی تھی۔ بدنتسر مونگ خاں کی ماں الان قوا نے

لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ بدنسر کی نسل سے بہت لوگ ہوں گے۔ الان قوا کی موت پر اُس کے بیٹوں میں ترکہ پر نزاع ہُوا۔ بدنسر نے کہا کہ دولت کے لیے کون لڑے؟ کیا انسان کی تدبیریں خدا کے حکم سے پلٹ نہیں جاتیں؟ پس وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور بالیغلون الان کی زمین کو چلا گیا۔ سانانگ سِتسن لکھتا ہے کہ "الان قوا کا ترکہ اُس کے سب بیٹوں میں تقسیم ہُوا تھا۔ بدنسر کو سوائے ایک گھوڑے کے جس کا نام ایک سولک تھا اور کچھ نہیں ملا۔ اس گھوڑے پر بدنسر سوار ہُوا اور دریائے اونن کے کنارے چلا۔ جب بالیغلون الان پہنچا تو کھانے کو کچھ پاس نہ تھا۔ اسی حال میں ایک باز کو دیکھا کہ ایک جانور کو جس کا نام غارا تورو تھا۔ پھاڑ کر کھا رہا ہے۔ اُس نے اس باز کو لاسے سے پکڑا اور اُسے اپنے لیے شکار مارنا سکھایا۔ اور پانی ایک بستی سے جہاں تھوڑے سے آدمی رہتے تھے پینے کے لیے لیا۔ اس بستی کے لوگ اپنے قبیلے سے جدا ہو گئے تھے اور اُن کا کوئی سردار نہ تھا۔ بدنسر رات کو ایک جھونپڑی میں پڑ رہتا تھا" اس بستی کا نام تون کیبی ہولی تھا۔ کچھ عرصہ بعد بدنسر کا بھائی بوغو ختاکی بدنسر کے پاس گیا اور بھائی کو واپس لے کر گھر آیا۔ یہاں آکر بدنسر نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ میں بہت تھوڑے آدمیوں سے تون کیبی ہولو کے لوگوں کو مطیع کر سکتا ہوں۔ پس وہ تھوڑے سے آدمیوں کی مدد سے تون کیبی ہولو کی زمین میں گیا اور اس زمین کو فتح کر لیا۔

رشیدالدین اور چینی مورخوں نے لکھا ہے کہ بدنسر نے اپنے بعد ایک بیٹا چھوڑا جو اُس کا جانشین ہُوا اُس کا نام دوتمینین تھا اور اُس کی بیوی کا نام مونامون تھا۔ چینی مورخوں کی تحریر کے مطابق دوتمینین کے سات بیٹے تھے۔ رشیدالدین نے ۹ بیٹے لکھے ہیں اُس کی بیوی مونامون کا ایک قصہ اس طرح بیان ہُوا ہے کہ اس قصے کے سچ ہونے کا ہم کو کسی قدر یقین ہو جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب قن تاتار نے جیلر کو دریائے کلوران کے قریب شکست دے دی تو جیلر کے ۷۰ خاندانوں نے مغلوں کے پاس آکر پناہ لی۔ یہ لوگ بھوکے تھے اس لیے زمین سے جڑیں کھود کر کھانے لگے۔ ان جڑوں کا نام رشیدالدین نے سدوسم لکھا ہے۔ مونامون نے جو تند مزاج عورت تھی ان لوگوں سے کہا کہ تمہیں اس زمین میں گڑھے کھودنے کی کیسے جرأت ہوئی جہاں میرے لڑکے گھوڑے دوڑاتے ہیں؟ ابھی یہ لوگ جواب نہ دینے پائے تھے کہ مونامون نے طیش میں آکر اپنا رتھ اُن پر چلا دیا جس کے نتیجے میں بہت سے جیلر کچلے گئے۔ اب جیلر کو مونامون کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور اُس نے مونامون کے قبیلے کے گھوڑوں پر چھاپا مار کر اُن کو اپنے قبضے میں کیا۔ مونامون کے بیٹے بغیر ہتھیار لگائے جیلر کے پیچھے چلے۔ مونامون کو اپنے بیٹوں کی طرف سے اندیشہ ہُوا اُس نے فوراً اُن کی بیویوں کو مع گاڑیوں اور ہتھیاروں کے بلوایا۔ مگر یہ چیزیں دیر میں پہنچیں۔ اس عرصہ میں بہت سے سردار مارے گئے۔ جیلر نے واپس آکر مونامون اور اُس کے خاندان کے تمام لوگوں کو جو ہاتھ آئے قتل کر ڈالا۔ اس قتل عام میں مونامون کا سب سے چھوٹا بیٹا قاچین بچ گیا جو اُس وقت برغو کے ملک میں رہتا تھا اور یہاں اُس نے اپنی شادی کر لی تھی۔ دوسرا جو بچا تھا وہ مونامون کے سب سے بڑے لڑکے کا شیرخوار بچہ قیدو تھا۔ جسے اُس کی دایہ نے لکڑیوں کے ایک ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ قاچین جب بڑا ہُوا اور اُسے اس حقیقت کا علم ہُوا تو وہ اپنے قبیلے میں آکر انتقام لینے کی فکر میں ہُوا۔ اور ایک گڈریے کا بھیس بدل کر جیلر کے ملک میں پہنچا۔ راستے میں دو آدمی جو باپ بیٹے تھے اُسے ملے۔ یہ دونوں اُس وقت ایک باز کے ذریعہ شکار کر رہے تھے۔ قاچین نے یہ دیکھ کر کہ اس کے بھائی کا باز چھوٹے جیلر کے ہاتھ پر ہے۔ اُس سے کہا کہ میں نے بہت سی بطخیں اور مرغابیاں ایک جگہ دیکھی ہیں۔ یہ جگہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس بہانے قاچین اس جیلر کو کچھ دور لے گیا اور وہاں

اُس نے اُسے قتل کر دیا۔ پھر پلٹ کر اُس کے باپ کو بھی مار ڈالا۔ اس کے بعد قاچین گھوڑوں کے گلے کے قریب آیا تو دیکھا کہ گھوڑے بھی اُس کے بھائی کے ہیں۔ اس گلے کی رکھوالی جو جبلیر کر رہا تھا اُس کو بھی قاچین نے مار ڈالا۔ اور باز کو اپنے ہاتھ پر بٹھائے ہوئے مع گھوڑوں کے گلے کے گھر واپس آیا۔ اس کے بعد قاچین نے اپنے بھائی کے بچے قبیدو کو برگوجین بھیج دیا۔ اس مقام کا نام قبیدو کے نام پر قبیدو جن لون ہو گیا۔ جب قبیدو بڑا ہوا تو قاچین یعنی اُس کے چچا نے اُسے برغو اور تبیکو کے قبیلوں کا سردار بنا دیا۔ اس کے بعد قبیدو جبلیر کے مقابلہ کو چلا اور اُن کو مطیع کر کے دریائے قراکل کے کنارے سکونت پذیر ہو گیا۔ بہت سے قبیلوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ قبیدو کی بیویاں اور اُس کے مواشی بہت ہو گئے اور اُس نے بہت سے شہر اور گاؤں دریائے اونان کے کنارے بسائے اور اس دریا پر ایک پل بھی بنوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ قبیدو خان اصلی بانی مغلوں کی قوت اور اقتدار کا ہوا۔

قبیدو نے تین لڑکے چھوڑے۔ ایک بائی سنغر جو باپ کا جانشین ہوا۔ دوسرا چرکی لنگوم جو تائجوت کا سردار رہا۔ تیسرا جوچین اردگی جو ساگجوت اور ارتبکن کے قبیلوں کا سردار ہوا۔ سانانگ ستن ژتبن نے صرف بڑے بیٹے کا ذکر کیا ہے اور اُس کا نام اُس نے شنگ کور دوک شن لکھا ہے۔

شنگ کور دوک شن کا ایک فرزند تھا جس کا نام تمبا غائی تھا۔ اس نام کو رشید الدین اور ابوالغازی خاں نے تومنہ خاں لکھا ہے۔ شنگ کور دوک شن کے مرنے پر اُس کی بیوی نے اپنے شوہر کے بھائی چرکی لنگوم سے شادی کر لی۔ رشید الدین نے لکھا ہے کہ یہ نام چینی تھا اور چینی زبان میں اس کے معنی شہزادہ کے ہیں۔ اس بیوی سے چرکی لنگوم کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک گیند و جنہ اور دوسرا الیگچن جنہ اور یہ جاتمن کے قبیلوں کے سردار ہوئے۔ چرکی لنگوم کی دوسری بیوی سے دو لڑکے اور پیدا ہوئے جن کے نام سرکل اور لجبینہ تھے۔ سرکل کا بیٹا اور وارث ہموکائی خان تھا جس کا ذکر ہم ابھی کریں گے۔

تمبا غائی پسر شنگ کور دوک شن نے ۹ لڑکے چھوڑے اور یہ متعدد قبیلوں کے جد اعلیٰ ہوئے۔ یہ اس قدر بڑھے کہ سنہ ۱۲۰۰ء میں یعنی صرف دو سو برس بعد اُن کی تعداد ۳۰ ہزار ہو گئی۔ ان لڑکوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) جکسو۔ یہ باپ تھا نویاکن۔ اورووت اور منگکوت کا۔ جو اِن ہی ناموں کے قبیلوں کے سردار ہوئے۔

(۲) باریم شیرا تو خابچو۔ یہ جس قبیلہ کا سردار رہا۔ اُس کا نام بیان نہیں ہوا۔

(۳) خاچولی۔ یہ باپ تھا اردمجی برولاس کا۔ یہ قبیلہ برلاس کا سردار ہوا جس کی نسل سے تیمور ہوا۔

(۴) رسم کدجون۔ یہ قبیلہ ہیدرکن کا سردار ہوا۔

(۵) بایت کلکی۔ یہ بوداتن کے قبیلے کا سردار رہا۔

(۶) قبل خاں۔ یہ چنگیز خاں کا جد تھا۔

(۷) اودور بیان۔ یہ سردار تھا قبیلہ جاجرات یا جوریات کا

(۸) بودنجر دوغلان۔ (یعنی لنگڑو) یہ دوغلات کا سردار تھا۔

(۹) جنتائی۔ یہ قبیلہ بیسوت کا سردار تھا۔

جنتائی کا لقب اچیگن بھی تھا جیسے اور سب خانانِ مغل کے سب سے چھوٹے بیٹوں کا ہوا کرتا تھا۔ اچیگن کے معنی

ابوالغازی خاں نے "گھر کے الاؤ کے مالک" کے بتائے ہیں۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ یہ لقب اس بات سے چلا تھا کہ جب بڑے بیٹے اور مقامات پر آباد کر دیئے جاتے تھے تو سب سے چھوٹا بیٹا گھر پر رہتا تھا اور باپ کے گھر کا وارث ہوتا تھا۔ مگر مورخ شاٹ کو اس معنی سے اختلاف ہے وہ کہتا ہے کہ اچگین کے معنی سب سے چھوٹے بیٹے یا بچے کے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں تیمور کی عظیم الشان فتوحات کی وجہ سے اُس کی خوشامد کرنے والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُس کے بزرگوں اور چنگیز خاں کے خاندان میں بہت صاف طریقہ سے تعلق اور واسطہ ثابت کریں اور تیمور کے جد اعلیٰ کو قراچار ثابت کریں اور قراچار کو نام کی بجائے لقب کہیں اور اُس کا مطلب یہ بیان کریں کہ وہ فوجوں کا سردار تھا۔ اور یہ سرداری اُس کی اولاد میں وراثتاً چلی آتی تھی۔

یہی نسخہ بعد کے زمانہ کے مورخوں نے لکھا ہے۔ میر خواند کی تحریر کے مطابق یہ موروثی سرداری قوم کا افسانہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ ایک روز قاچولی نے جو تومنہ خاں کا منجھلا بیٹا تھا۔ خواب دیکھا کہ ایک ستارہ اُس کے بھائی قبل خاں کی ران سے نکلا ہے۔ لیکن آسمان پر تاریکی بدستور رہی۔ پھر ایک دوسرا ستارہ نکلا اور ہلکی ہلکی روشنی ہو گئی۔ پھر ایک تیسرا ستارہ نکلا اور ہلکی روشنی باقی رہی۔ پھر ایک اور ستارہ طلوع ہوا۔ اور سب طرف آسمان پر تیز روشنی ہو گئی اور اور ستارے بھی اس تیز روشنی میں زیادہ چمکنے لگے۔ قاچولی جاگا اور سمجھا کہ ابھی رات کا تہائی حصہ گذرا ہے۔ وہ اپنے خواب پر غور کرتا رہا اور پھر سو گیا۔ اب پھر ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ مگر اس مرتبہ وہ اپنی ران سے نکلے۔ اس طرح آٹھ ستارے یکے بعد دیگرے طلوع ہوئے۔ ان میں سب سے آخری ستارہ نہایت درخشاں تھا۔

جب دن نکلا تو قاچولی اپنے باپ تومنہ خاں کے پاس گیا اور اپنا خواب بیان کیا۔ تومنہ خاں اُس کے خواب کو سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے لڑکے قبل خاں کو طلب کیا اور اُس کے سامنے خواب بیان کیا۔

اس خواب کی تعبیر اہلِ دربار نے یہ کی کہ قبل خاں کی اولاد میں تین بادشاہ تخت پر بیٹھیں گے اور اُس کی اولاد میں ایک اور شخص شہنشاہ ہوگا۔ اور وہ دنیا کو اس سرے سے اُس سرے تک فتح کرے گا اور اُس کے مرنے پر مدت تک اس کی سلطنت اُس کی اولاد میں قائم رہے گی اور قاچولی کی اولاد میں سات آدمی ہوں گے جو حکومت کریں گے اور آٹھواں سب کو گھن لگا دے گا۔ اور یہ بادشاہ بھی کل روئے زمین پر حکومت کرے گا۔

تومنہ خاں کو اس تعبیر پر بہت حیرت ہوئی اور اُس نے اپنے درباریوں کی رائے سے قبل خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، اور قاچولی کو سردار فوج اور وصیت نامہ میں لکھ دیا کہ فوج کی سرداری کا عہدہ موروثی ہوگا۔ لکھنے کے بعد اس پر مہر لگائی گئی اور یہ سرکاری خزانے میں محفوظ کر دیا گیا۔ قبل خاں باپ کے مرنے کے بعد اُس کا جانشین ہوا۔ اور قاچولی خاں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے عہدہ کی خدمات ادا کیں۔

قبل خاں پہلا مغل بادشاہ تھا جو شہنشاہ چین کے دربار سے تعلقات رکھتا تھا۔ بیان ہوا ہے کہ قن کے شہنشاہ نے قبل خاں کو اپنے دربار میں بلوایا۔ شہنشاہ کو قبل خاں کی بھوک دیکھ کر تعجب ہوا۔ ایک دن قبل خاں بہت شراب پیئے ہوئے تھا۔ نشے میں اُس نے شہنشاہ کی داڑھی پکڑ لی۔ جب نشہ اُتر گیا تو قبل خاں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اُسے سزا دی جائے۔

لیکن جواب میں شہنشاہ صرف ہنسا اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اُس نے قبل خاں کی حرکت کا کچھ خیال نہیں کیا ہے۔ قبل خاں کو خلعت، تلوار اور زریں کمربند عنایت کیا۔ لیکن جب قبل خاں دربار سے رخصت ہوا تو درباریوں کے کہنے سننے سے اُس نے قاصد قبل خاں کو واپس بلانے کے لیے روانہ کئے۔ قبل خاں کو جب ان قاصدوں نے واپس لانا چاہا تو قبل خاں نے ان قاصدوں کو مار ڈالا۔

غالباً یہی زمانہ تھا جس میں وہ واقعات پیش آئے جو قن کے خاندان کی تاریخ میں واقع ہوتے اور وہ واقعات یہ تھے کہ شہنشاہ قن تائی تسنگ کے زمانہ حکومت میں ۱۱۲۳ء تا ۱۱۳۷ء مغلوں کی ایک بڑی تعداد نے شہنشاہ کی اطاعت قبول کی۔ لیکن ۱۱۳۷ء اور ۱۱۴۰ء کے درمیان وہ سب شہنشاہ سے باغی ہو گئے۔

۱۱۳۵ء میں مغلوں کو اس قدر قوت حاصل ہو گئی کہ قن کے شہنشاہ کے حق میں وہ ایک خطرہ ہو گئے اور اس سال کے اخیر میں شہنشاہ قن نے اپنے سپہ سالار ہوشاکو کو مغلوں کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ مگر ہوشاکو کو مغلوں کے مقابلہ میں کامیابی نہیں ہوئی اور مجبور ہو کر وہ پیچھے ہٹا۔ اُس کے پسپا ہونے سے مغل آگے بڑھے اور ہوشاکو کے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ہوشاکو کے تعاقب میں مغل ہائی لنگ تک گئے۔ یہاں ہوشاکو نے پلٹ کر مغلوں پر حملہ کیا۔ لیکن مغلوں نے اُس کے لشکر کو بالکل غارت کر دیا۔ اس پر قن کے شہنشاہ نے ایک دوسرا لشکر جو بہت زبردست تھا ۱۱۳۹ء میں مغلوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔

یہ قبل خاں کا زمانہ حکومت تھا جس میں مغلوں اور تاتاریوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ان لڑائیوں کا انجام یہ ہوا کہ چنگیز خاں نے تاتار کو بالکل غارت کر دیا۔ قبل خاں کی بیوی قواکلو ایلتی جو قبیلہ قنقرات سے تعلق رکھتی تھی۔ اتفاق سے اس کا بھائی سائن تکین بیمار ہوا۔ ایک تاتار شامان (طبیب) جس کا نام جرکل نودری تھا اُس کے علاج کے لیے طلب کیا گیا۔ اُس نے بہتیرا جادو اور سحر سے کام لیا۔ مگر سائن تکین اچھا نہ ہوا اور بالآخر مر گیا۔ سائن تکین کے عزیزوں نے اس شامان سے بدلہ نکالا اور ایک روز موقع پا کر اُسے مار ڈالا۔ تاتار کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے انتقام لینے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔ دونوں میں ایک مقام پر جس کا نام باران سگدان تھا لڑائی ہوئی۔ کیدان بہادر نے تاتار کے سردار متیہ بہادر سے تنہا لڑ کر جوانمردی کے جوہر دکھائے۔

اس کے بعد دوسرے سال پھر لڑائی ہوئی۔ اور اب کثرت سے مغلوں اور تاتاریوں میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار تایجوت ہموکائی جو تاتاریوں سے اپنی بیوی کو لینے گیا تھا۔ تاتاریوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔

یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ہموکائی قبل خاں کا قریبی عزیز تھا۔ تاتاریوں نے ہموکائی کو پکڑ کر قن کے شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔ شہنشاہ نے قبل خاں سے اپنے قاصدوں کے خون کا بدلہ لینے کو ہموکائی کو مست اونٹ سے مروا ڈالا۔ ایسی ہی اذیت سے جیسے باغی مارے جاتے تھے۔ یعنی لکڑی کے ایک گدھے پر باغی کو میخوں سے جڑ دیتے تھے اور پھر اُس کی کھال کھینچ کر جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے۔

اس کے کچھ زمانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تاتاریوں نے قبل خاں کے بڑے بیٹے اوکین برقاق کو گرفتار کر کے شہنشاہ قن کے پاس بھیج دیا۔ اور وہ بھی شہنشاہ کے حکم سے اسی طرح ہلاک کیا گیا جس طرح ہموکائی کیا گیا تھا۔

قبل خاں کے ۶ بیٹے تھے۔ وہ سب ایسے طاقتور اور زبردست تھے کہ وہ قیات یعنی سیل تیز کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا۔ ابوالغازی خاں نے لکھا ہے کہ مغلی زبان میں پہاڑوں میں سے گرتے ہوئے پانی کو قیان کہتے ہیں اور قیات قیان کی جمع ہے۔ قیات، چنگیز خاں کا خاندانی نام تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام قبل خاں کے زمانے سے بھی پہلے کا تھا۔ چینی شکل اس نام کی کیون ہے۔ قیان اور نقوز یا بالقوز مغلوں کے دو بڑے گروہ تھے جنھوں نے ارگنی کن (ارکنہ قون) میں پناہ لی تھی۔ اور عجیب بات ہے کہ ترکی ازبکوں کے چار گروہوں کا نام قیات عنقرات یا قیات قنقرات ہے۔ یہ دوسرا ثبوت اس بات کا ہے کہ مغلوں کی حکمران قوم ترکوں کی اولاد تھی۔ قبل خاں کے ۶ بیٹوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) اُکین برتاق	(ارکین برقاق)
(۲) برزان بہادر	(تربان بہادر)
(۳) قوتو قتو منکر	(قوتوقو مونکہ)
(۴) کدان بہادر	(قوروان بہادر)
(۵) قبتولہ خاں	(قوبلہ خاں)
(۶) توزان اتشکین	(چیکین)

(ان ناموں کا املا ایم۔ ہیبرساکن کے اس نوٹ سے لیا گیا ہے جو اس مصنف نے ابوالغازی خاں کی کتاب پر لکھا ہے)

قبل خاں کے فرزندوں میں قتولہ خاں سب سے زیادہ مشہور گذرا ہے۔ یہ مغلوں کی تاریخ کا مشہور ہیرو ہے۔ اس کی آواز کو پہاڑوں میں بادلوں کی گرج اور اس کے ہاتھوں کو ریچھ کے پنجوں کے برابر طاقتور لکھا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ آدمی کے اس طرح دو ٹکڑے کر دیتا تھا جیسے کوئی تیر کے دو ٹکڑے کر دے۔ جاڑے کے موسم میں ایک آتشدان کے قریب برہنہ پڑا رہتا تھا جلتی لکڑیوں کے پتنگے اور ٹکڑے اس پر گرتے تھے مگر اسے کچھ پروا نہ ہوتی تھی جب اٹھتا تھا تو آگ سے جلے ہوئے داغوں کو یہ سمجھتا تھا کہ کیڑوں نے کاٹ لیا ہے۔ ایک بھیڑ روز کھاتا تھا۔ اور قمیز بڑی مقدار میں پیتا تھا۔

اب مغلوں نے اپنے عزیزوں کا بدلہ نکالنے کے لیے چین کی سلطنت سے ایک زبردست جنگ شروع کی۔ اس جنگ میں سرداری قتولہ خاں کے سپرد کی گئی۔ اس لڑائی میں یسوکائی بہادر، جو قبل خاں کا پوتا اور چنگیز خاں کا باپ تھا شریک ہوا۔ کدان باتی ہموکائی کا بیٹا اور تودا کدان باتی کا بیٹا بھی ساتھ ہوا۔ ان لوگوں نے شہنشاہ کے لشکر کو شکست [illegible] اور بہت سا مال غنیمت لے کر واپس آئے۔

قتولہ خاں گھر واپس آتے ہی شکار میں مصروف ہوگیا۔ اور اپنی قوم سے جدا ہو کر صر[illegible] ایک ساتھی اور ایک غلام کے ساتھ جنگل میں تنہا رہ گیا۔ اسی حال میں قوم دربان نے اس پر حملہ کیا۔ جب ان لوگوں کا لشکر قریب آیا تو قتولہ نے اپنے گھوڑے کو ایک دلدل کی زمین کی طرف سرپٹ دوڑایا۔ گھوڑا دلدل میں پھنس گیا۔ قتولہ پہلے تو گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہوگیا اور پھر وہاں سے جست کر کے زمین پر آرہا۔ مگر حملہ آوروں نے یہ کہہ کر اسے ہاتھ نہ لگایا کہ "ایک مغل بغیر گھوڑے کے کیا کر سکتا ہے"۔ غرض دربان قتولہ خاں کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب قتولہ اپنے گھوڑے کی طرف چلا اور اس کی ایال پکڑ کر

اُسے دلدل سے نکالا۔ اور اُس پر سوار ہو کر اپنے گھر واپس آیا۔ اس اثنا میں اُس کے گھر جو مصیبت اُس پر پڑی تھی اُس کی خبر آ چکی تھی۔ اور گھر والوں نے سمجھ لیا تھا کہ قتولہ مارا گیا۔ قتولہ خاں کا پوتا یسوکائی اپنے دادا کے مرنے کا کھانا لے کر ہموکائی کے سرہ بدلی کے پاس گیا۔ لیکن انھوں نے قتولہ کے مرنے کا یقین نہیں لیا۔ اور کہا کہ ایسا آدمی جس کی آواز بادل کی گرج ہو اور جس کے ہاتھ ریچھ کے پنجے ہوں۔ وہ بھلا کہیں دربانوں کا شکار ہو سکتا ہے؟ یقین جانو کہ اُس کے واپس آنے میں کسی اور وجہ سے دیر ہوتی ہے۔ وہ ضرور اب گھر آتا ہوگا۔

قتولہ خاں نے گھوڑے کو دلدل سے نکال لینے کے بعد سوچا کہ گھر خالی ہاتھ کیا جاؤں۔ کچھ نہ کچھ ساتھ لے چلوں۔ چنانچہ اُس نے دربانوں کا ایک گھوڑا پکڑ لیا اور اُن کے بیلوں کے ایک گلہ کو ہانکتا ہوا گھر پہنچا۔ اپنے موزے اُتار کر اُن میں جنگلی مرغابیوں کے انڈے بھر لیے اور خود ننگے پاؤں اپنے یورت میں آیا۔

مگر دوسرے مورخوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اور قتولہ خاں کے بھائیوں کے حالات اس طرح لکھے ہیں کہ قتولہ خاں کی جانشینی خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سانگ ست زتین لکھتا ہے کہ قبل خاں کے سات بیٹے تھے اور ہموکائی سردار تاتجوت کے دس فرزند تھے۔ جب اُن میں ایک مرتبہ نزاع ہوا تو تاتجوت نے قبل خاں کے بیٹوں پر حملہ کیا اور اُن کا مال و اسباب لوٹ لیا اور اُن کے ملک پر خود قابض ہو گئے۔ قبل خاں کا ساتواں لڑکا بردان بہادر (جسے اردمان نے تربان بہادر لکھا ہے) تین زخم کھا کر اپنی جان بچانے کو بھاگا۔ اُس کے ساتھ اُس کے چار ہمراہی تھے اور اُس کے بڑے فرزند یسوکائی نے جو اُس وقت تیرہ برس کا تھا۔ ایک زرہ پہنے ہوئے سوار کو برچھا مار کر چھید ڈالا اور اُس کا گھوڑا چھین کر باپ کے ساتھ ہو لیا۔ سایتن مرل خاتک جو بردان بہادر کی بیوی تھی اس اثنا میں پیدل اپنے تین لڑکوں کو ساتھ لے کر بھاگی۔ ان تین لڑکوں کے نام نیکون۔ منگیقو اور آت چگن تھے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ تاتجوت سے مغلوں نے اس شکست کا انتقام کیونکر لیا۔ سانگ ست زتین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ قبل خاں کا جانشین اس کا فرزند تربان بہادر ہوا۔ دی میلا نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن تربان کا نام اُس نے پردانی لکھا ہے۔ ابوالغازی خاں نے بھی یہی لکھا ہے کہ قبل خاں کی موت پر اُس کا بیٹا تربان مغلوں کا خان مانا گیا۔ قتولہ خاں کے متعلق یہ مشکل کہ درحقیقت اس کا درجہ کیا تھا اُن بیانات کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا جو قن کی سلطنت سے لڑائیوں کے متعلق ہوئے ہیں۔ قن کی سلطنت سے مغلوں کی لڑائیاں اور ذرائع سے بھی ثابت ہیں۔ مثلاً دی میلا کی کتاب میں ۱۱۴۷ء کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ قن کی سلطنت میں اور مغلوں میں لڑائیاں ابھی تک جاری ہیں۔ اور قالان کے فرزند جنگ ہو نولانگ نے جس کا ملک مغلوں کے ملک کی سرحد سے ملا ہوا ہے اپنے باپ کی وفات پر قن کا ساتھ چھوڑ دیا اور مغلوں سے جا ملا ہے۔ یہ بات مغلوں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی اور سپہ سالار ادچو جو پائن لنگ سے واپسی کے بعد مغلوں کے مقابلے کو بھیجا گیا تھا مجبور ہوا کہ مغلوں سے مصالحت کرے۔ اور ۲۷ قلعوں کو جو دریائے سی پنگ ہو سے شمال میں تھے مغلوں کے حوالے کر دے اور کچھ مواشی۔ بھیڑیں اور غلہ سالانہ بھیجنے کا وعدہ کرے۔ ادچو نے یہ بھی چاہا کہ مغلوں کے سردار کو بادشاہ کا درجہ مع مونگ فو کوئی ونگ کے خطاب کے دیا جائے۔ لیکن سردار مغل نے اس خطاب کے لینے سے انکار کر دیا اور خود اپنا لقب تسودان ونگی یعنی مغلوں کی عظیم الشان

سلطنت کا بادشاہ رکھا۔

خاندان قن کی تاریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ ۱۱۳۵ء و ۱۱۴۷ء میں منگکو نے بغاوت اختیار کی اور کثرت سے ختائی اور چینی لڑکے اور لڑکیاں یا تو لڑائیوں میں گرفتار کرنی شروع کیں۔ یا اس خیال سے پکڑیں کہ زرِ فدیہ وصول کر کے ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ یہ لڑکے مغلوں میں پرورش پا کر ان میں مل گئے اور مغلوں ہی کی طرح پکی ہوئی غذا کھانے لگے اور وہ ایک بڑی قوم نامنگو کوئی ہو گئے یعنی مغلوں کی ایک عظیم الشان سلطنت کے وارث ہوئے۔ ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مغلوں نے چنگیز خاں سے کچھ پہلے ہی بہت کچھ قوت حاصل کر لی تھی۔

ترباں خاں کی بیوی کا نام سانگ ست زنبن نے سابچن مرل خاتک لکھا ہے۔ مورخ اردمان نے یہ نام سنی گل خوجین تحریر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ قبیلہ برغوت کی عورت تھی۔ اس بیوی سے ترباں بہادر کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام (۱) بیسوگائی بہادر (۲) نیکون تائشی (۳) منگدو چینان اور (۴) داریتی اچگین تھے۔ ان بیٹوں میں بیسوگائی بہت مشہور ہوا اور وہ باپ کا جانشین ہوا۔

سانگ ست زنبن نے قصہ لکھا ہے کہ ایک دن بیسوگائی اپنے دو بھائیوں کے ساتھ شکار کھیل رہا تھا اور برف پر ایک سفید خرگوش پنجوں کے نشان دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے یہ لوگ ایک اگاڑی کی لیکھ پر ہو لیے۔ حتیٰ کہ وہ ایک جگہ پہنچے جہاں ایک عورت کا خیمہ نصب تھا۔ اس عورت کو دیکھتے ہی کہا کہ یہ ایک بڑے بہادر لڑکے کی ماں ہو گی۔ اس کے بعد بیسوگائی کو معلوم ہوا کہ وہ عورت اوگیلین ایکی (یعنی قوموں کی ماں) ہے اور یہ بھی دریافت ہوا کہ وہ یکی بلاتو کی بیوی ہے۔ یکی بلاتو تاتاری تھا اور اس وقت اپنی بیوی کو ساتھ لیے ہوئے اپنے گھر جا رہا تھا۔ جب یہ اجنبی لوگ اس کے خیمہ کے قریب پہنچے تو اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ تم ان تین آدمیوں میں سب سے بڑے کی نیت کو نہیں دیکھتے؟

اسی اثنا میں یہ تینوں خیمے کے بالکل قریب آ گئے۔ جس پر عورت کا شوہر یکی بلاتو ان کو دیکھتے ہی بھاگا۔ اب ان تینوں نے نہ تو خیمے کو لوٹا اور نہ اندر کی کوئی چیز لی۔ صرف اوگیلین ایکی کو لے کر بھاگے۔ اوگیلین نے رونا پیٹنا بند نہ کیا۔ یہاں تک کہ تینوں بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے بھائی داریتی اچگین نے اوگیلین سے کہا کہ اب تک تم نے تین تو دریا عبور کیے ہیں اور تین سلسلے پہاڑوں کے پیچھے چھوڑے ہیں۔ کسی آدمی کا ہمارے تعاقب میں آنا ممکن نہیں۔ تمہاری چیخیں کوئی نہیں سن سکتا۔ یہ سن کر اوگیلین خاموش ہو گئی۔ بیسوگائی نے اوگیلین کو اپنی بیوی بنایا۔

مورخ دی میلا لکھتا ہے کہ بیسوگائی کے زمانہ سرداری میں مغل کم و بیش چین کے حکمراں خاندانوں کے محکوم تھے۔ بیسوگائی پہلا سردار تھا جس نے ان حکمراں خاندانوں سے آزادی حاصل کی۔

۱۱۶۲ء میں بیسوگائی ایک بڑا لشکر لے کر تاتاریوں سے لڑنے چلا۔ اور اس نے تاتاریوں کا ملک فتح کر لیا۔ ملک کو غارت کیا اور تاتاریوں کے دو سرداروں تموجن اربکہ اور کور بوغا کو گرفتار کر کے گھر واپس آیا۔ جب یہاں آیا تو اس کی بیوی اوگیلین کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس وجہ سے گھر والوں نے اس بچے کا نام تاتار کے گرفتار خان کے نام پر تموجن رکھ دیا۔

اس لڑکے کی پیدائش مقام دیلیگون بلداغا میں دریائے اونان کے قریب ہوئی۔ یہ مقام اسی نام سے اب تک مشہور

ہے۔ دریائے اونان اُس سلسلۂ جبال سے نکلا ہے جسے مورخ برنان خلدون کہتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی چوٹیاں متبرک سمجھی جاتی ہیں اور لوگ اُن کے لیے قربانیاں کرتے ہیں۔ اور اُن کو روحیں سمجھ کر مغلوں پر خاص طور سے نگراں اور محافظ سمجھا جاتا ہے۔ پہاڑوں کی یہ چوٹیاں اُسی طرح واجب التعظیم سمجھی جاتی ہیں جس طرح منچوریا کے لوگ منچوریا کے پہاڑوں کو مقدس سمجھتے ہیں۔

اب ہم پھر اپنا قصہ شروع کرتے ہیں۔ ابتدائی مورخوں کی تحریروں کے مطابق جن کا تتبع ڈی لاکروائی نے کیا ہے تموجن کا زائچہ قراچار نوئیان کے باپ نے جو تیمور کا جد اعلیٰ تھا۔ تیار کیا تھا۔ اور اس زائچہ میں تموجن کی زندگی خون خرابہ سے پُر دکھائی۔ تموجن کے علاوہ یسوکائی بہادر کے تین لڑکے اولگیین سے اور بھی تھے جن کے نام جوچی قار۔ خچشکن اور تمیگوا ایچکین تھے۔ دو اور بیویوں سے بیٹی کے نام قوا با غائی اور دوفاشمی تھے دو لڑکے بیکتر اور بلگتائی تھے۔ بعض تاریخ سے ظاہر ہے کہ یسوکائی کو مغل قوم کے تمام قبیلے جن کو نیرون اور درلگین میں شمار کیا جاتا تھا۔ اپنا سردار مان کر اُس کی اطاعت کرتے تھے۔ یسوکائی کے ماتحت چالیس ہزار افراد تھے۔ مگر یہ اُس وسیع سلطنت کے مقابلہ میں خفیف ابتدا تھی جو یسوکائی کے فرزند تموجن نے آگے چل کر قائم کی۔

ونگ خان نے جو قرایت کا سردار تھا یسوکائی سے مدد مانگی، کیونکہ اُس کو اُس کے چچا گور خان نے تخت حکومت سے ہٹا دیا تھا۔ ونگ خان نے سلطنت سے محروم ہو کر یسوکائی سے مدد مانگی۔ یسوکائی نے ونگ خان کی مدد کر کے گور خان پر حملہ کیا اور اُس کو تنگوت کی طرف بھگا دیا جس کے بعد اُس نے ونگ خان کو تخت پر بحال کر دیا جس پر ونگ خان نے ٹوپی اتار کر اپنے اس محسن کے ساتھ ہمیشہ دوستی اور محبت رکھنے کی قسم کھائی اور اُس کی خیر خواہی اور وفاداری کا پختہ وعدہ کیا۔ اور مغلوں کی اصطلاح میں وہ یسوکائی کا انده ہو گیا۔

یسوکائی ۱۱۷۵ء میں مرگیا۔ سانانگ سٹ سیتن نے اُس کی موت کا واقعہ یہ لکھا ہے کہ تاتاریوں نے اُسے دھوکے سے مار ڈالا۔ ایک دن اپنے خیمے میں اُسے دعوت کے بہانے بلایا اور کھانے میں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

یسوکائی کا جانشین تموجن ہوا جس نے چنگیز خان کے نام سے تمام دنیا میں شہرت پائی۔ اُس کی تاریخ ہماری کتاب کے آئندہ باب کا موضوع ہے۔

مکاتیب

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱)

بنام حبیب الرحمٰن صاحب شروانی

جناب!

والا نامہ پہنچا۔ میں نہایت ممنون ہوں کہ جناب نے "اُردو" کو اس غور اور شغف سے ملاحظہ فرمایا اور اس کے معائب پر مطلع کیا۔ یہ جناب کی عین ہمدردی ہے اور حقیقت میں اس کی ضرورت ہے کہ جو نقص نظر آئے اس سے مطلع کر دیا جائے۔ اصلاح کی یہی ایک صورت ہے۔ ٹائپ کے متعلق جناب کی رائے درست ہے۔ میں نے ہندوستان کے مختلف اُردو کے ٹائپ بہم پہنچائے اور بہت غور کے بعد یہ ٹائپ انتخاب کیا اس سے بہتر یہاں کوئی ٹائپ دستیاب نہیں ہو سکتا۔ نستعلیق کا ٹائپ تیار ہو رہا ہے جس وقت وہ تیار ہو گیا تو انشاءاللہ استعمال کیا جائے گا لیکن چھپائی کی جو صفائی ٹائپ میں آتی ہے وہ لیتھو میں نہیں آسکتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اکثر صاحبوں نے اس تبدیلِ ہیئت اور ٹائپ پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اور مجھے مبارک باد کے خط لکھے ہیں جن میں سے بعض ایسے حضرات بھی ہیں جن کی ساری عمر تالیف و تصنیف، مختلف رسالوں اور اخباروں کی اڈیٹری اور مطبع کے نظام میں گزری ہے لیکن پرچہ اس سے بہتر چھپے گا۔ کاغذ گزشتہ نمبروں سے بہتر ہے۔ شاید جناب نے غور نہیں فرمایا۔ اب اُردو کے لیے خاص کاغذ تیار کیا گیا ہے اور جنوری کا نمبر اسی پر طبع ہوگا۔ امید ہے کہ جناب اسے پسند فرمائیں گے۔

عظمت اللہ خاں صاحب کی نظم کے متعلق آپ کی رائے بہت سخت ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون انوکھا ہے۔ ہم لوگ ان چیزوں کے عادی نہیں۔ پہلی نظر میں ایسا مغالطہ ہونا کچھ بعید نہیں۔ ہم لوگ اپنے عادات و خصائل میں برہمن ہو گئے ہیں۔ خاص طبقے کے سوا بنی نوع انسان کے باقی طبقے ہمارے نزدیک اچھوت اور ناقابلِ التفات ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو ان بیسواؤں سے بہتر ہیں جن پر یہ نظم لکھی گئی ہے۔ ہم نے اپنے گرد طرح طرح کی ٹٹیاں کھڑی کر رکھی ہیں کہیں جاہ و ثروت کی، کہیں علم و فضل کی، کہیں قوت و حکمت کی اور کہیں نسب و شرافت کی اور ان کی آڑ میں وہ وہ شکار کھیلتے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر سب سے بے حیا رنڈیاں بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے خلوت کدوں سے ایسے مقدس مآب بن کر نکلتے ہیں کہ گویا حضرت بایزید بسطامی اپنے حجرے سے باہر آ رہے ہیں۔ کیا خوب فرمایا ہے ؎

شخصے بہ زنِ فاحشہ گفتہ مستی — کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم — تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

اس دھوکے میں ہم اپنے آپ کو نیک سمجھنے لگتے ہیں اور نیکی کا غرور ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ان بے پناہ گناہگاروں کو جو ریا کی باڑ اپنے گرد کھڑی نہیں کر سکتے، لائقِ التفات سمجھیں۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا ان کے دل نہیں ہیں؟ کیا وہ جذبات نہیں رکھتے؟ پھر اگر کوئی شاعر ان کے جذبات کو بیان کرتا ہے تو کیا بُرا کرتا ہے؟ اور شاعر ہی کو اس کا حق ہے۔ مجھے حضرت عیسےٰ کا وہ قول جو ہر نیک و بد کو یاد رکھنا چاہیے کبھی نہیں بھولے گا جو آپ نے اس وقت فرمایا تھا جبکہ یہودی ایک زانیہ کو بستی سے باہر سنگسار کرنے کے لیے لائے تھے۔ اتفاق سے حضرت مسیحؑ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بلکتی ہوئی ان کی طرف دوڑی اور پناہ کی طالب ہوئی۔ حضرت نے یہودیوں سے جو عورت کو سنگسار کرنے آئے تھے فرمایا کہ تم میں سے پہلے وہ شخص پتھر مارنے کو اٹھائے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ یہ سن کر سب سن ہو گئے اور کسی کا ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ یہ تھی اس شخص کی تعلیم جو خدا کا نبی تھا اور معصوم تھا مگر ہم جو سراپا گناہوں میں آلودہ ہیں دوسرے کی ذری سی خطا بھی معاف کرنی نہیں چاہتے۔ یہ گناہگار کا خاصا ہے اور اس پر پاکیٔ نیکی کا وہ غرور ہے کہ خطاکار کی صورت دیکھنی تو درکنار اس کا دردِ دل بھی سننا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ ہم یہودی بھی ہیں اور برہمن بھی۔ ہمارے دل اور خیال اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ ان میں رواداری کی گنجائش نہیں رہی۔ نہ مذہب میں نہ ادب میں۔

مولانا! اس نظم میں ایک لفظ بھی تو فحش نہیں۔ ہاں! ایک راہ گم کردہ بدنصیب عورت کے جذبات ہیں جسے حالات اور اتفاقات نے جن پر اسے قدرت نہ تھی اس رستے پر لا ڈالا، اور جس نظر سے وہ دنیا کو دیکھتی ہے اس کا بیان ہے اور اس کی زندگی دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہے۔

اگرچہ میں سخن فہم اور سخن سنج نہیں ہوں مگر میں نے بھی اُردو فارسی شاعری کا کچھ کچھ مطالعہ کیا ہے۔ خیر اوروں کا تو کیا نام لوں، شیخ سعدی، ملا جامی، امیر خسرو، مولانا روم کا کلام بھی کبھی کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ پاک نفس بزرگ تھے۔ ان کی شان میں کچھ کہنا گستاخی ہے لیکن ان کے طفیل میں کم سے کم اتنا ضرور سمجھنے لگا ہوں کہ فحش کسے کہتے ہیں۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے چند ہی سال ہوئے نواب اسحٰق خاں مرحوم کی کوشش و سرپرستی سے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مرتب ہوا اور معتدبہ حصہ چھپا بھی۔ اس میں ایک مثنوی خضر خاں دیول دیوی کی بھی ہے۔ اسے غالباً جناب ہی نے اڈٹ فرمایا تھا۔ خوب اڈٹ کیا ہے اور بہت عمدہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کی داد دی ہے۔ اس مثنوی میں حضرت امیر نے دو جگہ شبِ زفاف کی تصویر کھینچی ہے۔ جناب نے نہ وہ مقامات خارج کیے اور نہ انھیں اپنے مقدمے میں حیا سوز فرمایا۔ پھر ہم کس منہ سے اس نظم کو حیا سوز کہہ سکتے ہیں جس میں ایک بیسوا اپنے جذباتِ دل کا اظہار کرتی ہے اس میں کم سے کم حسرت و عبرت تو ہے یہاں تو یہ بھی نہیں ؎

دیدۂ بد بیں بپوشاں اے کریمِ عیب پوش
از دلیری ہا کہ من در کنجِ خلوت می کنم

میں یہ الزام کے طور پر نہیں کہتا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ایسے فحش لٹریچر اور خاص کر فحش شاعری میں پرورش پائی ہے

کہ فحش و غیر فحش میں امتیاز باقی نہیں رہا اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم فحش کو اخلاق اور اخلاق کو فحش خیال کر بیٹھتے ہیں۔ انتہا ہے کہ ہمارے ہاں کے مقدس بزرگوں نے نہایت حیا سوز اور فحش قصوں سے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی نتیجے نکالے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی میں یورپ میں بڑے بڑے ادیب، شاعر اور ڈراما نویس ہوئے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی کوئی شخص ٹالسٹائی کی ٹکر کا نہیں ہوا ہے۔ بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر کا سر اس کے سامنے جھک جاتا ہے تمام عالم میں اس کا کلام پڑھا جاتا اور اس کا ادب کیا جاتا ہے۔ وہ ایک زبردست اعلیٰ درجہ کا ادیب ہی نہیں بلکہ مصلح اخلاق اور مصلح بنی نوع انسان بھی ہے۔ اس کی سب سے بہتر کتاب ایک میسوا کے متعلق ہے جس میں اس نے اس کے جذبات اور کیرکٹر کو دکھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب ہے کہ کسی لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں اور ہر نوجوان اور طالب علم اور ہر صاحب ذوق کو پڑھنی چاہیے۔

نظیر اکبر آبادی ہمارے ہاں کا ایسا شاعر ہے جس کا رنگ سب سے الگ ہے۔ ہمارے شاعروں اور صاحبِ ذوق سخن فہموں نے اسے کبھی شاعر نہیں مانا اور عجب بات یہ ہے کہ اکبر تو لسان الغیب خیال کیے جائیں اور نظیر شاعر بھی نہ سمجھا جائے۔ اب کہیں انگریزوں کے طفیل سے وہ شاعر سمجھا جانے لگا ہے۔ اس نے بہت کچھ لکھا ہے اور بہت سی عجیب و غریب نظمیں لکھی ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ اردو میں ان کی نظیر نہیں۔ انہی میں سے ایک نظم آدمی پر ہے جو پڑھنے کے قابل ہے اور اس کا آخری مصرعہ یاد رکھنے کے لائق۔

اور سب سے جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں تو ہمارے ادب اور اخلاق میں کس قدر وسعت ہو جائے۔

مجھے تعجب ہے کہ آپ نے اس مضمون سے فردوسی کی تکفیر کہاں سے پیدا کر لی۔ صاحبِ مضمون اسے مذہبی شخص اور یکا خدا پرست اور موحد کہتا ہے پھر ایسا شخص کافر کیونکر ہو سکتا ہے البتہ یہ اس کا خیال ہے کہ فردوسی پرجوش مسلمان نہ تھا۔ یہ اس کا ذاتی خیال ہے۔ ان خیالات سے فردوسی کی تکفیر ثابت نہیں ہوتی۔ ان معاملات میں کوئی شخص آزادی رائے کو نہیں روک سکتا۔ اگر اظہارِ رائے پر اس قسم کی سخت قیود لگا دی جائیں تو تحقیق کا رستہ بند ہو جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ (یادش بخیر) مولوی صفی الدین صاحب کے ساتھ یہ رسم اٹھ گئی لیکن معلوم ہوا کہ ابھی بہت سے صفی الدین ہم میں موجود ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ صدر الصدوری کے عہدے کے ساتھ آپ میں تنگ دلی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس قسم کا اثر نامعلوم طور پر ہوتا ہے اور شاید آپ محسوس نہیں فرماتے۔ علاوہ اس کے اگر اس مضمون میں تکفیر کا کوئی شائبہ پایا بھی جاتا ہے تو کہاں یہ تکفیر اور کہاں مولوی کی تکفیر۔ اس میں وہ ڈنک نہیں جو اُس میں ہے اور یہی اصل چیز ہے۔

یہ مضمون میں نے اس لیے بھی شائع کیا ہے کہ جنوری کے نمبر میں ایک اور مضمون فردوسی کے مذہب پر شائع ہونے والا ہے جسے آپ پسند فرمائیں گے ․․․․․․․․․

(۲)

بنام احسن مارہروی

حیدرآباد (دکن) ۱۶ مئی ۱۹۱۰ء

مکرم و معظم بندہ!

تسلیم۔ آپ کا محبت نامہ آج پہنچا جس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کے نام نامی اور آپ کے رسالہ سے خوب واقف ہوں اور میں آپ کی اور آپ کی محنت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ آپ جو خدمت اُردو زبان کی فرما رہے ہیں وہ آپ ہی کا حق ہے اور ہر طرح قابلِ قدر اور قابلِ شکریہ ہے۔

کئی سال ہوئے میں نے اُردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی تھی مگر یونہی پڑی رہی۔ اب میں نے اس پر نظرِ ثانی کی اور یہاں کے ایک مطبع نے اس کے چھاپنے کا تہیہ کیا۔ قریباً پانچ جز کی کاپیاں لکھی جا چکی تھیں کہ سکرٹری اُردو کانفرنس کا نامہ پہنچا کہ اس کتاب کی اشاعت حیدرآباد میں ملتوی رکھی جائے۔ کانفرنس اپنی طرف سے شائع کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ سکرٹری صاحب کے ارشاد پر اس کی کاپیاں چھپوانا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب کانفرنس والوں کا اختیار ہے جس طرح چاہیں چھپوائیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے آپ سے عربی مجموعے کی تذکیر و تانیث کے متعلق رائے طلب کی تھی وہ خط انھوں نے میری ہی تحریک سے لکھا تھا اور اس چھیڑ کی ابتدا بھی محض اتفاقی طور سے میری ہی طرف سے ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ شبیر دکن کے اڈیٹر میرے دوست ہیں۔ ان کی فرمائش سے میں نے حضرت جلیل کی کتاب پر ریویو لکھا تھا۔ انھوں نے اس کے نقاد (جس نام سے دکن ریویو میں لکھا گیا تھا) بغیر اجازت کے لکھ دیا۔ اس کا انھوں نے جواب دیا۔ پھر دونوں طرف سے خوب بحث ہوئی۔ اب وہی بحث ایک صاحب نے پھر زمیندار میں چھیڑ دی ہے جو ۸ مئی کے پرچے میں شائع ہوئی۔

اس میں ایک سوال انھوں نے یہ بھی چھیڑا ہے کہ اس جملہ میں کہ "مجھ خاکسار نے کہا" مجھ باوجود ضمیر مفعولی ہونے کے صورت فاعلی میں کس لیے آیا؟ اس استفسار کا جواب میں نے اسی روز بھیج دیا تھا غالباً اس نمبر میں شائع ہو۔ غرض اس لکھنے سے یہ ہے کہ آپ کی قدر میرے دل میں اس قدر ہے کہ میں نے آپ کی رائے طلب کی گو وہ دوسرے کے واسطے سے تھی۔ اس کا شکریہ میں اب ادا کرتا ہوں۔

میری کوئی کتاب یا رسالہ علیحدہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ مختلف مضامین دکن ریویو وغیرہ میں کبھی کبھی لکھے ہیں یا بعض کتابوں کے مقدمے اور دیباچے، ورنہ میں ضرور خدمتِ والا میں بھیجتا۔ آپ کا رسالہ ابھی پہنچا جس کا شکریہ قبول ہو۔ میں حتی الامکان اس کی ترقی میں کوشش کروں گا اور جس قسم کی خدمت مجھ سے ہو سکی میں اس کے بجا لانے میں کبھی دریغ نہ کروں گا۔ کیا اچھا ہو اگر آپ کا رسالہ اُردو کانفرنس کا آرگن قرار دے دیا جائے۔ انجمن اُردو حیدرآباد دکن کی طرف ابھی دو کتابیں چھپی ہیں، جلدیں بندھ رہی ہیں تیار ہونے پر آپ کی خدمت میں بغرض ریویو بھیجوں گا۔ ایک مبادی سائنس دوسری معرکہ مذہب و سائنس ترجمہ مولوی ظفر علی خاں صاحب۔

(۳)

بنام سید افتخار عالم صاحب

اورنگ آباد۔ ۲۶ جنوری

افتخار الہند والعجم مدفیوضہ

تسلیم۔ حضرت آپ شکر کیجئے کہ اسی ایک لفظ پر ٹل گئی۔ پیٹھ پیچھے برا کہنا میرا شعار نہیں لیکن اگر آپ کانفرنس میں تشریف لاتے تو یہ دیکھتے کہ میں کیسی کھری کھری آپ کو سناتا اور جی بھر کے رسوا کرتا۔ وہ تو خدا کو آپ کی عزت رکھنی تھی کہ آپ نہ آئے مگر میرے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ رپورٹ ختم ہونے کے بعد آپ کے "دلی" دوست آئے اور لگے کہنے کہ واہ! افتخار عالم نے تو فارسی کی کتاب کا ترجمہ کر دیا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے ایک ایسی ڈانٹ بتائی کہ بچہ یاد ہی کرے گا۔ اللہ رے حسد۔ اس رسوائی پر بھی تو لوگ حسد کرتے ہیں۔ اب تو آپ کا بھرا کھل گیا ہے اگر ہمدرد یا زمیندار کو معلوم ہو گیا تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ آپ تو شاعروں سے گھبراتے تھے کہ مشاعرے میں کھچے کھچے پھرتے تھے مگر میں ان حضرات (صاحبان ہمدرد و زمیندار) سے پناہ مانگتا ہوں۔ مارے خطوں اور تاروں اور تقاضوں کے ناک میں دم کر دیں گے۔ آپ کی نظموں میں مولانا نذیر احمد مرحوم کی نظموں کا مزا آتا ہے۔ خوب! کیا آپ مجھ سے کانفرنس کی رسوائی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں جو میرا فوٹو طلب کرتے ہیں۔ من خوب می شناسم۔ آپ عبد الناظر کے داؤ میں نہیں آئے تو بھلا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے داؤ میں آ جاؤں گا۔ کس مردود کے پاس فوٹو ہے اور کس نے کھنچوایا اور کھنچوا بھی تو کس برتے پر۔ حضرت مجھے تو معاف ہی فرمائیے۔ بی بلی بخشو چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔ اب آپ نواب اسحٰق خاں کی صحبت بابرکت کا فیض اٹھائیے انشاء اللہ پورے ولی ہو جائیں گے۔ ان کا فوٹو کیوں نہیں لیتے جو شاندار بھی ہو اور توندار بھی ہو۔ کہتے ہیں کہ آج کل بڑا آدمی بننے کے لیے توند شرط ہے۔ یہاں آپ کی خدمت کے لیے ہر طرح حاضر ہوں اور یقین رکھیے کہ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو گا کبھی دریغ نہ کروں گا۔ افسوس اگر آپ یہ کتاب اس وقت لکھتے جب نواب عماد الملک بہادر مشیر المہام تھے تو کوئی نہ کوئی داؤ چلتا۔ اب وہ خدمت سے علیحدہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہیں اور افسوس کہ اس ریاست میں کوئی قدرداں نہیں۔ کس کے آگے جا کے روئیے۔ مگر انشاء اللہ پھر بھی دیدہ خواہد شد۔ خدا کا شکر کہ لڑکی کا مزاج درست ہو گیا اور آپ خیر و عافیت سے ہیں اور عازم اسحٰق کدہ ہیں۔ اب کی برسات میں اورنگ آباد آئیے اور ہم غریبوں کو بھی اپنی صحبت سے مستفید فرمائیے۔ کیا اس کے مستحق صرف نواب اسحٰق خاں ہی ہیں۔ بس باقی پھر۔

میں نے سنا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ماڈل اسکول لاہور آپ کے ہم وطن ہیں۔ براہ کرم ان کے نام ایک سفارشی خط عنایت فرمائیے میں وہاں اپنے بھانجے کو داخل کرنا چاہتا ہوں۔ فقط!

بندہ

عبدالحق

(۴)

بنام احسن مارہروی

حیدرآباد (دکن) ۲۲ ستمبر

مخدوم و مکرم بندہ!

تسلیم۔ آپ کے خط کا میں اب تک جواب نہ دے سکا جس کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے کیجیے کے متعلق جو تحقیق لکھی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا نیا ناول ماہ ملک جو میرے پاس آیا، میں نے اس میں متعدد جگہ کیجیے سے کیونکر لکھا دیکھا ہے۔ بہرحال جب فصیح الملک نے فرما دیا ہے تو اس میں گنجائش چون و چرا کی نہیں ہے۔ میں نے اپنی گرامر میں جہاں کیجیے پر بحث کی ہے وہاں نوٹ میں آپ کی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ میری رائے فصیح الملک کی بابت یہ ہے کہ آپ اسے عام مضامین کا جولانگاہ نہ بنائیے بلکہ اسے خاص زبان کی تحقیق اور بحث کے لیے مخصوص رکھیے۔ یہی تخصیص اس کی خوبی اور قدر کا باعث ہوگی۔ عام مضامین کے پرچے ملک میں بہتیرے ہیں لیکن زبان کی تحقیق کے مباحث کے لیے کوئی خاص پرچہ نہیں ہے۔ یہ کام صرف فصیح الملک ہی کو انجام دینا چاہیے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک اپیل بالالتماس تمام ان حضرات کی خدمت میں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں چھپوا کر تقسیم کیجیے اور اس کے مقاصد بہ وضاحت لکھ کر ان سے امداد طلب کیجیے۔ امداد یہی کہ خریدار بہم پہنچائے جائیں۔ نواب فصیح الملک مرحوم کے شاگردوں کو خاص کر اس رسالے کی طرف متوجہ کر لینا چاہیے۔ کچھ انی آل انڈیا اردو کانفرنس کا آرگن بنا لیجیے اور سال کی تمام کارروائیاں اس میں چھاپیے اور کانفرنس کے ذریعہ سے یہ طے کیجیے کہ ممبران کانفرنس کو یہ پرچہ کسی قدر رعایت کے ساتھ دیا جائے گا۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اس خیال کو ایک مضمون میں ادا کر کے آپ کے پاس بھیجوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالے میں درج فرما دیں۔ ماثر الکرام بہت دن ہوئے چھپ چکی، میں نے پبلشر سے کہہ دیا تھا غالباً انہوں نے آپ کی خدمت میں بھیج دی ہوگی فقط!

آپ کا نیازمند: عبدالحق!

(۵)

بنام پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی مرحوم

اورنگ آباد (دکن) ۲۸ جون ۱۹۲۹ء

مخدوم و مکرم بندہ!

تسلیم۔ دونوں غزلیں پہنچیں۔ اس لطف خاص اور یاد آوری کا تہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ردیف اور قافیے ہی کے اعتبار سے انہیں غزلیں کہہ سکتے ہیں ورنہ نہایت عمدہ مسلسل نظمیں ہیں۔ آپ نے غضب کیا کہ غزل گوئی کو ایک اور رستہ سمجھا دیا۔ اب کے میرا ارادہ کوئٹے جانے کا تھا سب انتظام بھی کر لیا تھا مگر دو ایک کام ایسے آپڑے کہ میرا یہاں سے کہیں جانا ممکن نہ تھا۔

دونوں نظمیں چھپنے کے لیے دے دی ہیں جولائی کے نمبر میں شائع ہوں گی۔ نیازمند، عبدالحق

(۶)

حیدرآباد (دکن) ۱۲ / اپریل ۱۹۳۸ء

شفیق و مکرم و مخدوم بندہ!

تسلیم۔ معافی چاہتا ہوں کہ بہت دنوں کے بعد یہ عریضہ آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ کچھ روز ناگپور، الہ آباد، پٹنہ وغیرہ کے سفر میں صرف ہوئے اور آنے کے بعد ایسا مصروف رہا کہ آپ کو لکھنے کی نوبت نہ آئی۔

اب میں ۱۴ / اپریل کو کلکتے جا رہا ہوں۔ وہاں بنگالیوں سے اُردو کی اشاعت وغیرہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ وہاں چند روز قیام کر کے سیانگ چلا جاؤں گا۔ یہ مقام نہایت پُرفضا ہے۔ اگر آپ بھی تشریف لائیں تو زہے سعادت۔ وہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ دارجیلنگ بھی قریب ہے اور ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ آپ کی صحت کو بھی فائدہ ہوگا۔

اڑھائی سو ڈرافٹ بذریعہ سنٹرل بنک بھیج رہا ہوں اس میں ۱۵۰ جنگ بیتی کے اور ۱۰۰ لغت کی نظر ثانی کے۔

یہاں کا معاملہ طے ہو گیا۔ نظام گورنمنٹ نے پینتالیس ہزار سالانہ چھ برس کے لیے بطور امداد منظور کیے ہیں۔ اب میں ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے شروع میں دلّی چلا جاؤں گا۔ آپ کو وہاں آ کر میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ فی الحال کرایہ کا مکان تلاش کر رہا ہوں۔

اگر آپ سیانگ آ جائیں تو بہت ہی اچھا ہو۔

جواب کا منتظر : عبدالحق

(۷)

دریا گنج، دہلی۔ ۲۱ / جولائی ۱۹۴۶ء

مخدوم و محترم!

آداب۔ ایک مہینے کے بعد پرسوں حیدرآباد سے واپس آیا۔ وہاں انجمن کی عمارت کے لیے امداد کی درخواست لے کر گیا تھا۔ حالات ایسے ناسازگار رہے کہ کچھ کر نہ سکا اور اب تو ہمارے مہربان صدرِ اعظم ہو کر آ رہے ہیں۔ حالات کا انتظار کر رہا ہوں، اگر کوئی صورت نظر آئی تو ایک کوشش پھر کروں گا۔

راستے میں ایک دن کے لیے بھوپال بھی ٹھہر گیا تھا۔ وہاں کے صاحبانِ اقتدار نے یہ رائے دی کہ امداد کے متعلق ایک خط سر تیج بہادر سپرو سے نواب صاحب کے نام لکھوا کر بھیج دو، اس کے آنے پر پوری تائید کی کوشش کی جائے گی۔ اس لیے ۶ / اگست کو الہ آباد جاؤں گا۔

آپ کا خط جو میری غیر حاضری میں آیا تھا مجھے اب ملا۔ اس میں آپ نے اپنے نزلہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ امید ہے کہ اب قریبِ صحت ہوگی۔ ازراہِ کرم مفصل کیفیت سے مطلع فرمائیے۔

نیازمند:

عبدالحق

(۸)

دریا گنج، دہلی - ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء

مخدوم و مکرم مدظلہ!

تسلیم - بہت انتظار کے بعد کل آپ کا گرامی نامہ ملا - الہ آباد گیا تھا - سر تیج بہادر سپرو سے نواب صاحب بھوپال کے نام خط لکھوا کر بھجوا دیا - اس ہفتے عبدالرحمن صدیقی کلکتہ سے آ گئے تھے - پرسوں میں نے بھوپال بھیجا ہے کہ وزرائے متعلقہ اور نواب صاحب سے مل کر اس کارروائی کی منظوری کی کوئی صورت نکالیں - دیکھئے کیا ہوتا ہے - صدیقی صاحب آئیں تو آپ کو اطلاع دوں گا کہ کیا ہوا؟

اس سے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے آخر ستمبر یا شروع اکتوبر میں دہلی آنے کا ارادہ فرما لیا ہے - انشاء اللہ اس وقت تک کامل صحت ہو جائے گی اور ہمیں سالہا سال آپ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا -

خادم: عبدالحق

سپرو صاحب کی صحت اچھی نہیں - گھٹنوں میں درد اور تلووں میں جلن رہتی ہے - اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہیں آدمی اٹھاتا بٹھاتا ہے - ویسے بالکل تندرست ہیں - یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس اور صدمہ ہوا -

(۹)

دریا گنج، دہلی - ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۶ء

مخدوم و محترم زاد عنایتہ!

تسلیم - گرامی نامہ پہنچا - پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی - خدا کرے ڈاکٹر ٹیکی کی جون میں ہو اور دلی آنے کی اجازت دے دے - میں نے وہی کیا ہے جو آپ نے لکھا ہے - عرضداشت سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے ہے - اب وہ ایک خط سر کو بھی لکھنے والے ہیں - میں نے اس معاملے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا اور نہ کچھ کرنے کا ارادہ ہے - سالانہ امداد بند کرنا چاہتا ہے شوق سے بند کر دے - اللہ مالک ہے - اب آپ تشریف لائیں گے تو سب حال زبانی عرض کروں گا -

۱۹ر ستمبر کو کانپور جا رہا ہوں - حلیم کالج میں یوم اردو ہے - حافظ صدیق اس کے صدر ہیں - پرنسپل نے امید دلائی ہے کہ اس جلسے میں کوشش کی جائے گی کہ حافظ جی اپنا وعدہ ایفا کریں - اگرچہ امید کم ہے لیکن جاؤں گا شاید قسمت یاوری کرے -

۲۴ر ستمبر کو حیدر آباد سندھ جا رہا ہوں - اردو کانفرنس ہے - کاش آپ کی طبیعت اچھی ہوتی تو آپ کو ساتھ لے چلتا - وہاں کے بعض اصحاب نے امداد کا قطعی وعدہ کیا ہے -

موجودہ حالات میں فی الحال روپیہ مہیا کرنے کے لیے بعض ایسی ہی صورت اختیار کرنی پڑیں گی - حیدر آباد اور کراچی میں آٹھ دس روز لگ جائیں گے -

نیازمند:

عبدالحق

(۱۰)

۱- دریا گنج، دہلی۔ ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۴۶ء

مخدوم و مکرم!

تسلیم۔ گرامی نامہ پہنچا۔ میں خط لکھنے والا ہی تھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کب تشریف لائیں گے۔ رفیق نے پرسوں مجھ سے کہا کہ آپ آج کل تشریف لانے والے ہیں۔ آپ کے ڈاکٹر غیر معمولی محتاط معلوم ہوتے ہیں۔ بات اپریل پر جا پڑی۔ اپریل بہت دور ہے۔ ہم سب خوش تھے کہ آپ اس مہینے آ جائیں گے مگر اس خط سے اتنی ہی مایوس ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو کامل صحت عطا فرمائے۔

پرسوں کانپور جا رہا ہوں۔ وہاں ۲۳؍ کو اُردو کانفرنس ہے۔ حافظ محمد صدیق نے پندرہ ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہی اس کانفرنس کے صدر ہوں گے۔ دیکھیے وعدہ وفا کرتے ہیں یا نہیں۔

کراچی کی کانفرنس اچھی رہی۔ اچھی اس اعتبار سے کہ جو کام وہاں چاہتے تھے وہ انجام پا گئے۔ عمارت فنڈ کے لیے بھی اچھی رقم ملنے کی توقع ہے۔

حیدرآباد میں ...... انتقام پر تُلا ہوا ہے اور بہانے ڈھونڈھ رہا ہے۔

کل ہی نہال احمد صاحب کا خط آیا۔ آپ کا حال دریافت کیا ہے۔ آج ان کو لکھ رہا ہوں۔

باقی حالات بدستور ہیں۔

نیازمند: عبدالحق

(۱۱)

۱- دریا گنج، دہلی۔ ۳؍ نومبر ۱۹۴۶ء

مخدوم بندہ نوازا

ابھی محمود احمد اور حسن شاہ (فرزندان محمد عمر) کا خط آیا کہ "صاحبزادہ محمد عمر ۳۰؍ اکتوبر کو بوقت صبح پانچ بجے اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔" جسے پڑھ کر مجھے سخت قلق ہوا اور آپ کو اس خبر سے رنج و ملال ہوگا۔ بہت خوب آدمی تھے۔ اُردو کے بڑے حامی اور اچھے مؤلف۔ آپ کے خاص عقیدتمندوں اور قدر دانوں میں سے تھے۔ ان کے فرزندوں کو آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا اس لیے مجھے لکھا ہے کہ آپ کو اطلاع کر دوں۔

خادم: عبدالحق

(۱۲)

۱- دریا گنج، دہلی۔ ۲۹؍ نومبر ۱۹۴۶ء

مخدوم بندہ مدظلہٗ!

تسلیم۔ میں حیدرآباد چلا گیا تھا۔ واپس ہوئے تین روز ہوئے۔ عنایت نامہ ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی حالت رو بہ صحت

ہے۔ حیدرآباد کے حالات اچھے نہیں۔ صاحب انتقام پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ فوراً امداد بند کر دیں لیکن وہ ایسی پابندیاں اور شرائط عائد کر دیں گے جو ناقابلِ قبول ہوں جس کا مطلب یہی ہوگا کہ امداد بند کر دی جائے۔ وہ انجمن پر تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کرنے والے ہیں اور اس میں ایسے اشخاص رکھیں گے جو ان کے منشا کو پورا کریں۔

گورنمنٹ ہند میں امداد کی درخواست پیش کی تھی۔ اس کی حالت بھی امید افزا نہیں معلوم ہوتی۔ سر جان سارجنٹ رخصت پر ہیں وہ ہوتے تو کامیابی کی توقع تھی۔ اب توقع کم ہے۔ انجمن سب کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔

سپرو صاحب کو کیا لکھوں۔ بار بار انھیں زحمت دیتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھیں گے تو...... فرما دیں گے میں امداد بند کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس کی اصلاح چاہتا ہوں۔ آپ یہاں ہوتے یا آپ کی صحت اچھی ہوتی تو آپ سے درخواست کرتا کہ الہ آباد جا کر سپرو صاحب سے ملتے اور ان سے لکھواتے۔ کم سے کم (اگر ممکن ہو) تو ایک خط تو ان کو لکھ بھیجیے۔

صدیقی صاحب کو بھی لکھتا ہوں کہ وہ ان سے ملیں۔

اب ایک تمنا ہے کہ خدا آپ کو کامل صحت عطا فرمائے اور آپ پھر یہاں آ جائیں۔

خادم: عبدالحق

(۱۳)

۱۔ دریا گنج، دہلی۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۴۶ء

مخدوم بندہ مدظلہٗ!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ سر تیج بہادر سپرو نے سر...... کو دو خط لکھے۔ بہت دنوں کے بعد جو جواب دیا وہ بہت معمولی اور ناقابلِ اطمینان تھا۔ میں کل الہ آباد جا رہا ہوں تاکہ سر تیج بہادر کو سب معاملہ سمجھا دوں۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔

اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ موسم سرما کے بعد دہلی تشریف لے آئیں گے۔ ہاشمی صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی بہت بہت سلام کہتے ہیں۔

نیازمند: عبدالحق

(۱۴)

بنام غلام رسول مہرؔ صاحب

انجمن ترقی اردو (ہند) ٹیلیفون: ۶۲۹۰

۱۔ دریا گنج، دہلی۔ ۲ر اپریل ۱۹۴۲ء

شفیق و مہربانِ من!

تسلیم۔ میں آپ کے عنایت نامے کا جواب اس سے قبل نہ لکھ سکا اس لیے کہ میں سخت پریشان تھا۔ دو سال ہوئے نئی دہلی کی ڈیویلپمنٹ کمیٹی نے ہمارے لیے زمین کی سفارش کی تھی۔ اب اتنی مدت کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا نے منظوری دی تو موجودہ چیف کمشنر نے مخالفت کرنی شروع کی۔ میں اس سے ملا، بہت کچھ سر مارا مگر وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا ۳۱ر مارچ کو بورڈ کے اجلاس میں یہ معاملہ پیش ہونے والا تھا۔ میں دن برابر صبح سے شام تک مارا مارا پھرتا رہا، کیا بتاؤں کہ

کن کن سے ملا اور کیسے کیسے لوگوں کی خوشامد کی۔ نیند حرام ہوگئی تھی۔ نواب لیاقت حیات کے ذریعے سر سکندر کو فون کرایا کہ وہ چیف کمشنر کو سمجھائیں (یہ شخص پنجاب سے آیا ہے اور غالباً سر سکندر کا سیکرٹری رہ چکا ہے) سر سکندر نے، خدا ان کا بھلا کرے، فوراً اسے فون کیا اور یہاں تک کہا کہ میں کوئی عذر سننے کے لیے تیار نہیں ہوں، یہ زمین انجمن کو ملنی چاہیے۔ اس نے اس کا اظہار بورڈ میں بھی کیا۔ تمام ممبروں نے ہماری تائید کی اور اس کی کچھ نہ چلی۔ غرض بورڈ نے منظوری دے دی۔ چار روز کے بعد کل شب ٹھیک کی نیند آئی۔ یہ سمجھیے کہ گھوڑے بیچ کے سویا۔ اب آخری منظوری کے لیے یہ معاملہ گورنمنٹ آف انڈیا میں جائے گا۔ میں سر سکندر کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔

راشدی اور ان کے بھائی کو میں اپنے مکان پر اٹھا لایا تھا۔ آج صبح الہ آباد گئے ہیں وہاں سے آنے کے بعد وہ لاہور جائیں گے۔ انھیں بڑی بڑی امیدیں ہیں خدا کرے پوری ہوں۔

چار روز ہوئے آذر صاحب وعدہ کر گئے تھے کہ کل غالب والی مسل بھیج دوں گا، اب تک نہیں بھیجی۔ فون کرتا ہوں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ میں خود پریشان تھا اس لیے ان کی تلاش کی کوئی کوشش نہ کر سکا اب انشاء اللہ ضرور لے کر بھیج دوں گا۔ یہ شخص وعدے کرتا ہے اور یہ وعدے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ میری حماقت کہ میں نے مسل ان کے حوالے کر دی۔ خانۂ مروت برباد۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے۔

نیازمند: عبدالحق

---

(۱۵)

بنام غلام رسول مہر صاحب

۱۰۰ دریا گنج، دہلی۔ ۱۶ر جون ۱۹۴۲ء

شفیق و مہربان بندہ!

تسلیم۔ عنایت نامہ اور مسل پہنچی۔ بہت شکر گزار ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اس پر ایک مفصل نوٹ تحریر فرمائیں۔ میں وہ نوٹ آپ ہی کے نام سے اس مسل کے ساتھ شائع کر دوں گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ نوٹ مجھے ایک ہفتے میں مل جائے؟[3] اس کی خاطر میں نے اب تک جولائی کے مضامین چھپنے کے لیے نہیں دیے۔ میں چاہتا ہوں کہ جولائی کے نمبر میں سب سے اوّل یہی ہو۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر میں اسے آئندہ نمبر (یعنی اکتوبر) کے لیے رکھ چھوڑوں گا۔

امید ہے کہ آج راشدی آگئے ہوں گے۔ خدا انھیں خیر و عافیت سے رکھے۔ میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔

آپ اس بے بنیاد افواہ کا خیال نہ فرمائیں[4] یہ حاسدوں کا کام ہے۔ جن صاحب کا آپ نے نام لیا ہے سب سے پہلے

---

[1] سید علی محمد راشدی سابق وزیر پاکستان اور ان کے بھائی سید حسام الدین راشدی [2] اس سے مراد ہے غالب کے مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی کی مسل [3] میں نے اس پر ایک مفصل مضمون لکھ دیا تھا جو رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔

[4] بعض اصحاب نے یہاں پروپیگنڈا کیا تھا کہ مولانا نے گلاب سنگھ اینڈ سنز سے روپیہ لے کر انجمن ترقی اردو کا سارا طباعتی کام ان کے حوالے کر دیا ہے۔

انھوں نے مجھے یہ رائے دی تھی کہ گلاب سنگھ کے سوا کسی دوسرے سے معاملہ نہ کروں۔ کچھ دن ہوئے دلّی میں ملاقات ہوئی تو اس پر اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

میری اردو لغات کی طبع کا انتظام حیدرآباد میں ہو گیا ہے آج کل اس میں مصروف ہوں اور مطلق فرصت نہیں۔ ایک ہفتہ بعد پہلی جلد مکمل کر کے لے جاؤں گا۔ اس کے علاوہ انجمن کی امداد کے متعلق تگ و دو کرنی ہے۔ ہمارا معاہدہ ختم ہونے کو ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ دوامی ہو جائے۔ وہاں بھی ایک جماعت انجمن کی سخت مخالفت کر رہی ہے۔ غرض یہ کہ یہاں تو ہے ہی وہاں بھی جہاد کی ضرورت ہے۔

اس خط کا جواب مجھے جلد عنایت فرمایا جائے۔

نیازمند: عبدالحق

(۱۶)

بنام غلام رسول مہر صاحب

۱۔ دریا گنج، دہلی۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۴۲ء

شفیقِ مکرم!

نامۂ مہر پہنچا۔ ممنون فرمایا۔ کچھ مضائقہ نہیں، آپ دو تین روز بعد بھیج سکتے ہیں۔ حاشا وکلّا آپ کی نسبت یہ بدگمانی خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ ایک مسل کیا چیز ہے میرا سارا کتب خانہ آپ کے لیے حاضر ہے۔

سر سکندر نے میرے خط کا فوراً جواب دیا اور کامل اطمینان دلایا ہے کہ اُردو کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچے گا اور وہ بدستور پنجاب میں ذریعۂ تعلیم رہے گی اور ہم اس پالیسی سے ہرگز نہیں ہٹ سکتے۔ اخباروں میں جو افواہیں چھپ رہی ہیں یہ مفسدوں کی شرانگیزی ہے۔ مجھے اس سے بہت اطمینان ہوا۔

آج ۱۲ بجے ہمارے دوست آتے ہوں گے ان سے کہہ کر اور تاکید کر کے مرحوم سیٹھ صاحب کی موعودہ رقم دلوا دیجیے۔ انجمن پر اور خود میری ذات پر آپ کا یہ مزید احسان ہوگا۔

کل مولوی محمد علی قصوری تشریف لائے، فرماتے تھے کہ لاہور میں یہ خبر مشہور ہو رہی ہے اور اعلیٰ حلقوں میں (مثلاً میاں عبدالحی، ہاشمی وغیرہ کے ہاں) کہ گلاب سنگھ نے عبدالحق کو پچاس ہزار کی رشوت دی ہے یعنی انجمن کو نہیں میری ذات کو۔ کاش وہ اتنی رقم دیتا!! اور میں اس مہینے انجمن کی عمارت کھڑی کر دیتا۔ حاسدوں کو بات بنانی بھی نہیں آتی۔ سچ کے مقابلے میں جھوٹ کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔

ہمارے دوست "م ر" آ گئے ہوں تو ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجیے۔ اسے وہ سلام روستائی نہ خیال کریں، اگرچہ اس میں ایک پہلو اس کا بھی ہے۔

ہمارے پیر بے نظیر نے تنگ کر رکھا ہے۔ ایک ہی آدمی ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

بندۂ مہر: عبدالحق

(۱۷)

بنام ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جامعہ دہلی)

بنجارہ روڈ حیدرآباد (دکن) ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۲ء

شفیقی و مکرمی!

تسلیم۔ میں ابھی مدراس سے واپس آیا ہوں۔ میں وہاں کے بورڈ آف سٹڈیز کا ممبر ہوں۔ یہ رکنیت میں نے اس شرط سے قبول کی تھی کہ مجھے مدراس جانے کی زحمت نہ دی جائے۔ مجھے اس شہر سے قلبی بغض ہے۔ یونیورسٹی اُردو فارسی کا نصاب از سرِ نو مرتب کرنا چاہتی تھی۔ ایک سال سے ان کا تقاضا تھا اس لیے اب کے چلا گیا مگر اس ضمن میں ایک بہت اچھا کام یہ ہو گیا کہ میں نے وہاں جا کر اُردو اکاڈمی کی بنیاد ڈال دی۔ یہ آپ کی یا الہ آباد کی سی اکاڈمی نہ ہوگی۔ کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا کام مدراس سے بہتر دوسرے مقامات پر ہو سکتا ہے وہاں اس کا بڑا مقصد یہ ہوگا کہ اُردو زبان کی اشاعت و ترویج میں کوشش کی جائے اور جو لوگ اردو نہیں جانتے انھیں اُردو پڑھانے کا اور جو اُردو جانتے ہیں ان کے لیے اُردو زبان کے مطالعہ کا کام کیا جائے۔ میں نے اس کی بنیاد بہت مستحکم طور پر قائم کر دی ہے اور ایک دو ہفتے کے بعد کام شروع ہو جائے گا اور میں وقتاً فوقتاً اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔

وہاں سے ابھی واپس آیا ہوں۔ آپ کا خط ملا۔ میں نے بنک کو دو سو روپیہ ذاکر حسین خاں صاحب کے نام بھیجنے کے لیے لکھ دیا ہے۔ میں چار سو ہی بھیجتا لیکن جامعہ پریس کے بار بار خط آ رہے تھے انھیں روپیہ کی شدید ضرورت ہے۔ پانسو روپیہ خاں صاحب کے نام بھجوا دیئے۔

حسن امام صاحب کا خط آیا ہے۔ وہ جنوری میں کسی تاریخ کو پٹنہ میں ملیں گے۔ اب مجھے اپنا پروگرام اس کے لحاظ سے بنانا پڑے گا۔ میں اسی ہفتے آپ کو علی گڑھ پہنچنے کی تاریخ سے اطلاع دوں گا۔ آپ براہِ کرم اس تاریخ کو علی گڑھ آ جائیں اور سبطین صاحب کو بھی ساتھ لے آئیں۔

نیازمند: عبدالحق

P کے باقی اوراق بذریعہ رجسٹری الگ مرسل ہیں۔

بہ خط پنسل) میں کل یعنی ۱۵؍دسمبر کو علی گڑھ جا رہا ہوں اور چار روز وہاں رہوں گا۔ آپ ضرور تشریف لائیے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بھی ہوں گے۔

(۱۸)

نام ڈاکٹر عابد حسین صاحب

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) ۱۲؍مئی ۱۹۳۴ء

مشفقی و مکرمی زاد لطفہٗ!

تسلیم۔ ۵ اور P کے مسودے پہنچ گئے جن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک عرض آپ سے یہ ہے کہ S کا مسودہ جس قدر

آپ دیکھتے جائیں وہاں اپنی نگرانی میں کسی صاحب سے صاف لکھواتے جائیں، اس کی جو اجرت ہوگی وہ میں دے دوں گا۔ بات یہ ہے کہ مسودہ پہلے ٹائپ کرانا یا صاف لکھوانا پڑتا ہے پھر میں خود اس کی نظرِ ثانی کرتا ہوں اور اصل کتاب سے مقابلہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد مطبع میں بھیجا جاتا ہے۔ اس وقت طبع کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ ٹائپ رائٹر والا ساتھ نہیں دے سکتا اس لیے دو آدمی میں نے صاف لکھنے پر رکھے ہیں۔ آپ اگر نظرِ ثانی کے ساتھ ساتھ صاف بھی لکھواتے جائیں تو ہمارے کام میں بہت سہولت ہو جائے گی۔ امید ہے کہ وہاں کوئی آدمی مل جائے گا۔ خوش خط ہونے کی ضرورت نہیں —— ہو تو کافی ہے لیکن صاف ہونے کے بعد ایک نظر آپ ضرور ڈال لیں ورنہ کاتبوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کچھ کا کچھ لکھ دیتے ہیں۔

نیاز مند: عبدالحق

غلام محمد خاں صاحب اور ان کے احباب کی مراد پوری ہوگئی کہ سید راس مسعود نے استعفا دے دیا۔ بہت اچھا کیا ورنہ معلوم یہ لوگ کیا کیا خرابیاں اور فساد برپا کرتے۔ ابتدا سے اس کی کھچڑی پک رہی تھی۔ سب سے بڑا رنج ان صاحبوں کو یہ تھا کہ جس شخص کو یہ رجسٹرار بنانا چاہتے تھے وہ نہ ہو سکا۔ اب ان کو موقع ہے کہ یونیورسٹی پر قبضہ کر لیں ——

عبدالحق

(۱۹)

نام ڈاکٹر عابد حسین صاحب

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)، یکم جون ۱۹۳۴ء

مشفقی و مکرمی!

تسلیم۔ معلوم نہیں آپ کی بیوی کی علالت کا کیا حال ہے۔ میں اورنگ آباد میں صرف ڈکشنری کی خاطر بیٹھا ہوا ہوں۔ کچھ حصے کی میں نے نظرِ ثانی کی ہے اور باقی کی زیرِ نظر ہے۔ مجھے عجلت اس لیے ہے کہ مجھے تین چار مہینے میں پورا کام ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے آنے سے کام کی رفتار تیز ہوگئی ہے اور میں نے کام کو اپنے ذمے پر ڈال دیا ہے کہ اگر نظرِ ثانی کیے ہوئے اجزا وقت پر ملتے رہے تو کام تین مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ جلد ضرورت اس لیے ہے کہ نظرِ ثانی کیے ہوئے اجزا کمپوزیٹروں کو نہیں دے سکتے ان میں بہت کانٹ چھانٹ ہوتی ہے۔ انھیں ٹائپ کرانا پڑتا ہے اس کے بعد اصل سے مقابلہ کر کے تصحیح کرنی پڑتی ہے اور پھر میں اس کی نظرِ ثانی کرتا ہوں۔ اس کے بعد کمپوزیٹر کو دیے جاتے ہیں۔ اس میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ فی الحال میرے خیال میں یہ بات آئی ہے کہ آپ S کا نصف حصہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو بھیج دیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد نظرِ ثانی کر کے بھیج دیں گے۔ ان کا پتہ یہ ہے:

دودو منزل سندیلہ

باقی نصف آپ چند روز کے بعد جب آپ کو اطمینانِ خاطر نصیب ہو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا اس لیے آپ فوراً نصف حصہ ڈاکٹر صدیقی کو بھیج دیجیے، میں انھیں لکھے دیتا ہوں۔

عبدالحق

(۲۰)

بنام مالک رام

کراچی ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء

شفیقِ مکرم زاد لطفہٗ!

تسلیم۔ عنایت نامہ دلّی سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا۔ اس یاد آوری اور ہمدردی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ دلّی میں ہمارا دفتر اور میرا ذاتی سامان لٹ گیا۔ سفر میں میرے ساتھ جو بستر اور چند جوڑے کپڑوں کے تھے وہی رہ گئے۔ میں اتفاق سے بچ گیا۔ حیدر آباد سے دلّی جا رہا تھا۔ بھوپال کے اسٹیشن پر شعیب قریشی صاحب وزیر بھوپال نے مجھے نہایت اصرار کے ساتھ روک لیا اور کہا کہ دلّی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں۔ اگر وہ روک نہ لیتے تو میں اس روز پہنچتا جو قتلِ عام کا دن تھا۔ کیفی صاحب اور ہاشمی صاحب کے قتل کی خبریں مشہور ہو گئی تھیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ زندہ و سلامت ہیں۔ ایک بستی میں پڑے ہیں اور دوسرے رام پور میں۔ انجمن کے دوسرے ملازمین غارت گری اور قتل کے ایام میں کسی نہ کسی طرح سراسیمہ اور پریشان حال جان سلامت لے کر بھاگ گئے۔ ایک بڈھا کاتب اور اس کے بیوی بچے جو رہ گئے تھے وہیں قتل کر دیے گئے۔

اور تو سب کچھ لٹ گیا لیکن کتب خانے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا البتہ میرے کچھ مسودے اور لغتِ اردو کے مسودے بہت کچھ تلف ہو گئے۔ اکتوبر کا اردو چھپ کر شائع ہوا تھا لیکن بہت سے لوگوں کو نہیں پہنچا کیونکہ اس زمانے میں ڈاک کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ اب میں دلّی پہنچ کر بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ غالباً یہ رسالے مطبع میں ملیں گے۔ وہ مطبع بھی دوسرے کے ہاتھ بک گیا ہے۔ اس وقت انجمن کے تمام کام معطل ہیں کیونکہ اس کے کارکن منتشر اور پریشان حالت میں ہیں۔ ان سب کو پھر جمع کرنے میں کچھ دن لگیں گے۔ دلّی کی حالت اب تک قابلِ اطمینان نہیں۔

خدا سے آپ کی صحت، سلامتی اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

خیر طلب، عبدالحق

(۲۱)

نئی دہلی۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۴۸ء

مکرم و کرم فرمای بندہ زاد لطفہ!

تسلیم۔ عنایت نامہ کل پہنچا۔ بہت شکر گزار ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ جولائی کا پرچہ شائع ہوا تھا۔ اکتوبر کی تو نوبت ہی نہ آئی کیونکہ ستمبر سے فساد شروع ہو گیا تھا۔ لطیفی پریس جس میں ہمارے رسالے چھپتے تھے وہ بھی بک گیا۔ ہمارے مسودے بلاک اور مسالے اور رجسٹر اسی میں پڑے رہ گئے۔ طلب کرتے ہیں تو کہتے ہیں سابق مالک کی تحریر لائیے۔

دفتر کی حالت بہت ابتر ہے۔ لٹیروں نے تباہ کر دیا۔ جگہ جگہ ردیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چن چن کر کام کے کاغذ نکال رہے ہیں۔ بعض قلمی نادر نسخے بھی ان ردیوں میں سے ملے۔ بہت سے تلف ہو گئے۔

کل علی گڑھ جا رہا ہوں۔ وہاں بعض احباب کو بلایا ہے۔ آئندہ کے پروگرام کے متعلق مشورہ کرنا ہے۔

دلی کی حالت بہت ناقابلِ اطمینان ہے۔ میں یہ کمیٹی دلی میں کرنا چاہتا تھا مگر کوئی آنے پر رضامند نہ ہوا اس لیے علی گڑھ میں کی۔

کراچی سے میں ۱۴ر جنوری کو آیا۔ وہاں بھی ابھی کام شروع نہیں ہوا۔ ہمارے کارپرداز مختلف مقامات پر پناہ گزین ہیں۔

جو مکان انجمن کے لیے کراچی میں لیا ہے اس میں پناہ گزین ہیں۔ خالی ہو تو کام چلے۔

علی گڑھ کی کمیٹی کے بعد معلوم ہوگا کہ کام کی کیا صورت ہوگی۔ اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی آپ انتظار فرمایئے۔

نیازمند، عبدالحق

(۲۲)

کراچی ۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء

شفیقِ مکرم!

تسلیم۔ آپ کا کرم نامہ دہلی لاہور کی سیر کرتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ بہت شکرگزار ہوں۔ امید کہ اب آپ صحت و عافیت کے ساتھ ہوں گے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ انجمن کو کراچی منتقل کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ تقسیم سے قبل انجمن سارے ملک میں کام کر رہی تھی۔ تقسیم کے بعد دو ملک علٰحدہ علٰحدہ ہو گئے اس لیے ناچار پاکستان کا مرکز کراچی قرار دینا پڑا۔ ہندستان کا مرکز بدستور دلی میں رہے گا۔ ہم ہندستان نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم وہاں برابر کام جاری رکھیں گے خواہ اس کے انجام دینے میں کیسی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔

کام کے تعطل کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فساد کے دوران میں انجمن کے مکان (علو دریا گنج) پر بھارت الکٹورنس کمپنی کا قبضہ ہو گیا اور صرف ایک حصہ جس میں کتب خانہ تھا عارضی طور پر ہمارے پاس رہ گیا اور اسے خالی کرا دینے کا برابر تقاضا ہوتا رہا اس لیے کام کرنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کئی سال ہوئے ہم نے حکومت ہند سے نئی دلی میں ایک قطعۂ اراضی بہ قیمت خریدا تھا۔ حکومت کی طرف سے صرف یہ شرط تھی کہ دورانِ جنگ میں اس پر انجمن مکان نہیں بنا سکتی۔ حکومت نے عارضی طور پر کچھ مکان اس زمین پر بنا لیے تھے اور یہ اعلان کیا تھا کہ بعد جنگ مسمار کر دیے جائیں گے اور زمین خالی کر دی جائے گی۔ ختمِ جنگ کے بعد حالات کچھ اور ہو گئے اور نئی حکومت کا دور آیا۔ اس وقت سے ہم برابر کوشش کرتے رہے کہ انجمن کی زمین پر جو مکانات کے پانچ بلاک تعمیر کر لیے گئے ہیں ان میں سے دو بلاک انجمن کو کرایہ پر دے دیے جائیں۔ بہت دنوں خط و کتابت ہوتی رہی۔ ذاتی طور پر ملاقاتیں بھی کیں سفارشیں بھی کرائیں۔ بہ مشکل ایک بلاک دینے پر راضی ہوئے۔ ہم نے کہا یہ ناکافی ہے دو بلاک دیے جائیں۔ اس کے لیے کوشش ہوتی رہی۔ آخر میں حکومت نے ایک بلاک بھی دینے سے انکار کر دیا اور زمین خالی کرنے کے متعلق بھی انکاری جواب ملا۔ اس کے بعد دو مہینے تک شہر میں مکان تلاش کرتے رہے لیکن کوئی مناسب مکان نہ ملا۔ اینگلو عربک کالج خالی پڑا تھا۔

اس پر فوجی قبضہ تھا۔ ہم نے آخری کوشش یہ کی کہ اس کا ایک حصہ فی الحال کرایے پر انجمن کو دے دیا جائے۔ کمیٹی نے منظور کر لیا۔ ہم نے اپنے خرچ سے اس حصے کی صفائی اور درستی کی۔ انجمن اس میں منتقل ہونے کو تھی کہ حکومت کے ایک محکمے نے رکاوٹ پیدا کر دی اور اپنا قفل لگا دیا۔ ابھی تک معاملے کی یکسوئی نہیں ہوئی۔ یہ وجہ ہے کہ وہاں کام بند ہے اس کا فیصلہ ہو جائے تو وہاں جا کر اُردو جاری کروں۔ مجھے خود اس کی بڑی فکر ہے۔

۳ر۴ر اپریل کو ہماری احمد آباد والی شاخ نے کل گجرات اُردو کانفرنس کی۔ وہاں پہنچ کر میں نے آدمی بھیج کر کیفی صاحب کو بمبئی سے احمد آباد بلا لیا اور وہاں سے ہوائی جہاز میں کراچی لے آیا۔

مارچ کے پہلے ہفتہ رام پور گیا۔ ہاشمی صاحب وہاں پناہ گزیں تھے۔ ان کو وہاں سے دلّی لے آیا اور دلّی سے کراچی یہاں کے مرکز کا افتتاح مئی کے پہلے ہفتے میں ہوگا۔ یہاں کے کاموں سے فارغ ہو کر دلّی چلا جاؤں گا۔ کیفی صاحب میرے ساتھ جائیں گے۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔

یہ مختصر کیفیت ہے جو میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں عرض کر دی ہے۔
کیفی صاحب اور ہاشمی صاحب سلام کہتے ہیں۔

خیر طلب: عبدالحق

---

(۲۳)

کراچی مل ۳۱ر مئی ۱۹۴۸ء

کرم فرما و مہربان بندہ زاد لطفہ!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے اطمینان ہوا۔ آپ کا خیال صحیح ہے کہ "آج اردو سے زیادہ بےکس اور خانماں برباد کوئی نہیں" اور اب اسے وہاں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جہاں کے لوگ اس سے بیگانہ ہیں۔ یہ بھی ایک انقلاب ہے۔

ہمارا ہفتہ وار اخبار "قومی زبان" ۲ر جون کو شائع ہو جائے گا۔ آپ کی خدمت میں بھیجوں گا، اس کی مدد فرمائیے گا۔

کیفی صاحب اب میرے پاس ہیں۔ بمبئی میں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اچھے ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔

یہاں کے کاموں سے فارغ ہو کر دلّی جاؤں گا اور "ہماری زبان" اور "اُردو" کی اشاعت کی کوشش کروں گا۔ کیفی صاحب میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے۔

اس کے بعد جولائی کے ختم پر ڈھاکہ جاؤں گا اور وہاں اردو کا مرکز قائم کروں گا۔ سب سے زیادہ مشکل کام مشرقی بنگال میں ہے۔ وہاں کے لوگ اُردو سے ناآشنا ہیں۔ ان کو اُردو سے مانوس کرنا بہت اہم کام ہے۔ جس طرح بن پڑے گا کوشش کی جائے گی۔ آپ کو سب کارگزاریوں سے اطلاع دیتا رہوں گا۔

خیر طلب: عبدالحق

(۲۴)

کراچی ۸ر جولائی ۱۹۴۸ء

شفیق مکرم زاد لطفہٗ!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچ گیا تھا لیکن اس عرصے میں بیمار ہو گیا اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دو روز سے اچھا ہوں لیکن نقاہت بہت ہے اس لیے دیر سے جواب لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اسی وجہ سے دلی بھی نہ جا سکا۔

یہاں سے انجمن نے ایک ہفتہ وار اخبار "قومی زبان" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یکم جون سے چار پرچے نکل چکے ہیں جو آپ کو بھیجتا ہوں۔ دلی جاؤں تو ہماری زبان کی اشاعت کا انتظام کروں۔

کیفی صاحب اب بالکل اچھے ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔ سید ہاشمی صاحب بھی یہیں ہیں دونوں صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ مطبوعات کا ذخیرہ جو گلاب سنگھ والوں کی تحویل میں تھا وہ خوش قسمتی سے محفوظ رہا۔

"آسودگانِ ڈھاکہ" کے متعلق ڈھاکہ کے ایک دوست کو لکھوں گا۔ اگر دستیاب ہوئی تو وہ ضرور آپ کو بھیج دیں گے۔

خیر طلب: عبدالحق

(۲۵)

کراچی ۱۷ر اگست ۱۹۴۸ء

مشفق و مکرمی زاد لطفہٗ!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ "قومی زبان" کے متعلق آپ نے جو ہدایت فرمائی ہے اس کی تعمیل کے لیے دفتر کو کہہ دیا گیا ہے۔

میں ۲۷ر اگست کو ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ وہاں حکیم صاحب کی جو جو تالیفات ملیں گی آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔

کیفی صاحب پرسوں کو براہِ لاہور دلی جا رہے ہیں۔ وہ وہاں جا کر "ہماری زبان" اور "اردو" کے ڈیکلریشن داخل کر دیں گے۔ ڈھاکہ سے آٹھ دس روز بعد میں بھی دلی پہنچ جاؤں گا اور کام از سرِ نو جاری کرنے کی کوشش کی جائے گی البتہ مالی دشواریاں اب تک حائل ہیں۔ بہرحال اپنی سی پوری کوشش کی جائے گی۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے کیفی صاحب اور ہاشمی صاحب آپ کو بہت بہت سلام کہتے ہیں۔

خیر طلب، عبدالحق

(۲۶)

دہلی ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۸

مشفق و مکرمی!

تسلیم۔ میں ۳ر اکتوبر کو یہاں آ گیا۔ جیسا کہ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا ڈھاکے جانے کا ارادہ تھا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی خرید لیے تھے لیکن عین وقت خواجہ ناظم الدین اور مولانا اکرم خاں نے لکھا کہ کچھ دنوں کے لیے سفر ملتوی رکھیے۔ اس وقت موسم خراب ہے اور یہ دونوں صاحب دوسرے کاموں میں بہت مصروف تھے، ہمیں کافی مدد نہیں دے سکتے تھے۔

آخر دلی چلا آیا۔

میرا اصل مقصد یہاں آنے کا یہ تھا کہ دلی کی انجمن کا کام باقاعدہ استقلال کے ساتھ جاری کیا جائے۔ اس سے پہلے وہاں آیا اور باوجود کوشش کے کوئی مناسب مکان نہ ملا جہاں انجمن کا دفتر اور کتب خانہ وغیرہ رکھا جا سکے۔ اب کے جو آیا تو یہاں رنگ ہی بدلا ہوا پایا۔ یہاں کے ارباب اقتدار کو یہ گوارا نہیں کہ میں یا میرے منیجر اور کارکن یہاں کام کریں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ غرض یہاں آکر عجب مشکلات میں پھنس گیا ہوں۔ آخر میں نے یہ تجویز کی کہ یہاں کی انجمن ایسے لوگوں کے سپرد کر دی جائے جن سے ہمارا کوئی تعلق نہ ہو اور اس کی از سر نو تنظیم کر دی جائے اور میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میرا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

کیفی صاحب کو میں نے کچھ دن پہلے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ لالہ سری رام مرحوم (مصنف خمخانۂ جاوید) کی کوٹھی (۷ علی پور روڈ) میں مقیم تھے۔

یہاں سے چھٹکارا ہوا اور میں صحیح سلامت یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو پھر کسی دوسری طرف کا رخ کروں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔

نیازمند: عبدالحق

---

(۲۷)

کراچی ۱۵؍ فروری ۱۹۴۹ء

مکرم و مہربان بندہ زاد لطفہٗ!

تسلیم۔ ساڑھے تین مہینے دلی رہ کر آخر جنوری میں یہاں آیا۔ ابھی آئے دو تین ہی روز ہوئے تھے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طلب پر لاہور گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دلی میں جو تکلیف اور کوفت ہوئی وہ عمر بھر نہ ہوئی تھی۔ اصحاب اختیار نہیں چاہتے کہ میں یا میرے ساتھی وہاں کام کریں ہمارے کتب خانہ پر قفل اور مہریں لگا دی ہیں اور سخت پہرا بیٹھا ہے۔ یہ بڑی طویل اور تلخ داستان ہے جو خط میں نہیں سما سکتی۔ خیر! "اردو" کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ پرانے لکھنے والوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ مسالہ جمع ہو جائے تو فوراً جاری کر دوں گا۔

افسوس قومی زبان آپ کو مسلسل نہیں ملا۔ اس میں ڈاک ہی کا قصور نہیں شاید مطبع کا بھی قصور ہے جس کے ذمے ہم نے یہ کام کر دیا ہے۔ میں دریافت کروں گا اور آئندہ مسلسل بھیجنے کے لیے تاکید کر دوں گا۔

ڈھاکے جن صاحب کو لکھا تھا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس مہینے کے آخر میں ڈھاکے جانے والا ہوں۔ مرحوم شفاء الملک کی تالیفات آپ کے لیے مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔

کیفی صاحب میرے ساتھ دلی گئے تھے ابھی وہیں ہیں۔ کچھ دنوں بعد تشریف لائیں گے۔

امید ہے کہ اب آپ کی پریشانیاں رفع ہو گئی ہوں گی۔ خدا سے طلب ہے کہ وہ آپ کو ہر قسم کی پریشانیوں سے نجات دے اور اطمینان [illegible]۔

(۲۸)

کراچی ۱۰ر اپریل ۱۹۴۹ء

مشفقی و مکرمی!

تسلیم۔ میں کل ہی مشرقی پاکستان کے دورے سے واپس آیا ہوں۔ ڈھاکے سے آپ کے لیے "آسودگانِ ڈھاکہ" کا ایک نسخہ شفاء الملک مرحوم کے فرزند سے لے کر آیا ہوں جو اب آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

کیفی صاحب ابھی دلی میں ہیں۔ چند روز اور انہیں وہاں قیام کرنا پڑے گا۔ ہمارے کتب خانہ پر قبضہ ہے۔ میں صرف اپنی ذاتی کتابیں لے آنا چاہتا تھا اس کی اجازت نہیں ملی۔ کارروائی جاری ہے اسی لیے کیفی صاحب وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس کی یکسوئی ہو گئی تو یہاں آجائیں گے۔ دلی میں ہمارا جہاز ایک گھنٹے کے لیے ٹھہرا تھا۔ کیفی صاحب آکر ملے اور بڑی محبت سے ملے۔ خدا ان کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

مشرقی پاکستان میں میرا سفر بہت اچھا رہا۔ مختلف مقامات کا دورہ کیا اور انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ ڈھاکے میں صوبے کی مرکزی شاخ قائم کی اور کام شروع ہو گیا۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

نیازمند: عبدالحق

"اُردو" ماہ جولائی سے جاری کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو اس کے لیے ضرور کچھ عنایت فرمائیے۔ ہمارے پرانے لکھنے والے سب منتشر ہو گئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر "اُردو" کی وساطت سے ملیں گے۔

(۲۹)

کراچی ۲۹ر اپریل ۱۹۴۹ء

مشفقی و مکرمی!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ کتاب (آسودگانِ ڈھاکہ) ہوائی جہاز سے نہ جا سکی اس لیے معمولی ڈاک سے رجسٹری کر کے بھیجی۔ حکیم صاحب کی اور کوئی تالیف شائع نہیں ہوئی۔

چالیس ہزار سالانہ کی منظوری انجمن ترقی اُردو کے لیے میں نے اسی زمانہ میں منظور کرائی تھی جب میں دلی میں تھا اور ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت رقم جاری نہ ہوئی۔ اب مجھے دلی چھوڑنی پڑی تو جاری ہوئی۔ اب وہاں کی انجمن کی نئی تنظیم ہوئی ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس کے صدر بنا لیے گئے ہیں اور دوسرے ارکان کا انتخاب بھی ہوا ہے۔

اُردو اب انشاء اللہ جولائی سے جاری ہو جائے گا۔ معاشیات اور سائنس کی اشاعت کے متعلق بھی فکر کر رہا ہوں۔

کیفی صاحب بخیر ہیں اور ابھی دلی ہی میں ہیں۔ ہاشمی صاحب کو مکان نہ ملا۔ بال بچے لاہور میں پڑے تھے، ناچار وہ لاہور چلے گئے۔

خیر طلب: عبدالحق

(۳۰)

کراچی ۲۷ جولائی ۱۹۴۹ء

مشفق و مکرمی!

تسلیم۔ تعجب ہے آپ کو میرا خط نہیں پہنچا۔ میں آپ کے ہر خط کا جواب لکھتا ہوں۔ میں نے اس میں لکھا تھا کہ جب میں ڈھاکہ گیا تو حکیم صاحب کے فرزند سے ملا۔ انھوں نے کہا حکیم صاحب کی کسی کتاب کا مسودہ موجود نہیں۔

یہاں 'اردو' بحال ہو گیا، اس کا پہلا نمبر جو اسی مہینے شائع ہوا ہے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ 'معاشیات' اگست میں شائع ہو جائے گا، چھپ رہا ہے۔

باوجود بے سروسامانی کے ہم نے اس سال اردو کالج بھی قائم کر دیا۔ اس میں یونیورسٹی کے مضامین اردو کے ذریعہ پڑھائے جائیں گے۔ انگریزی بحیثیت زبان کے لازمی ہو گی۔

اردو کا ایک عام کتب خانہ بھی قائم کر دیا ہے۔ کوئی دس ہزار کتابیں مختلف مقامات سے جمع کی ہیں۔

پچھلے دنوں کچھ علیل ہو گیا تھا اب اچھا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہو گا۔

خیر طلب: عبدالحق

(۳۱)

کراچی ۳۰ اگست ۱۹۴۹ء

مشفق و مکرمی!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ ایک آسودگان خاک ہیں کیا، میں پچاس برس سے یہ سنتا چلا آ رہا تھا۔ زبانی بھی فرمایا، خطوں میں بھی لکھا۔ انجمن ترقی اردو کی رپورٹوں میں بھی اس کا ذکر آیا لیکن لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ مرحوم ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کی زندہ تاریخ تھے لیکن ان چیزوں کے لکھنے میں تساہل اور کوتاہی کرتے رہے۔ ان کے لڑکوں نے جو کہا کہ ان کی تالیفات کے مسودے موجود نہیں تو ٹھیک کہا۔

آپ ضرور افلاطون کی ان تحریروں کو جو سقراط کے متعلق ہیں اردو میں منتقل کر دیجئے الگ کتاب کی صورت میں شائع کر دی جائیں گی

خیر طلب: عبدالحق

(۳۲)

کراچی ۲۴ مارچ ۱۹۵۵ء

مکرمی!

تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء وصول ہوا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کا مضمون "بابلی زبان و ادبیات" جنوری ۱۹۵۵ء کے "اردو" میں شائع ہو گیا ہے جس کے تین نسخے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ رسید سے مطلع فرمائیے گا۔

امید ہے کہ آپ جلد دوسرا مضمون بھیج کر مجھ کو ممنون فرمائیں گے۔

نیاز مند: عبدالحق

(۳۳)

کراچی ۲۲ / اپریل ۱۹۵۵ء

مکرمی!

تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲ / اپریل ۱۹۵۵ء وصول ہوا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مطبع کے مہتمم نئے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا کہ مضمون کے پانچ نسخے الگ چھپوا کر صاحبِ مضمون کو بھیجے چاہئیں اس لیے تین رسالے آپ کی خدمت میں روانہ کیے گئے تھے۔ اب مزید تین نسخے اور بھیجے جاتے ہیں۔ اس فروگزاشت کی معافی چاہتا ہوں۔

نیاز مند: عبدالحق

(۳۴)

بنام امتیاز علی عرشی صاحب

دریا گنج، دہلی ۲ / اپریل ۱۹۴۱ء

مکرمی و معظمی!

تسلیم۔ دیوان شرف جہاں قزوینی کا نسخہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر مجھے بھی ابھی نواب زادہ کا نام یاد نہیں رہا۔ دریافت کر کے اطلاع دوں گا۔ بہت ممنون ہوں کہ آپ نے دستور الفصاحت والے مضمون کے عنایت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر آپ حسبِ وعدہ مئی کے شروع میں بھیج دیں تو جولائی کے نمبر میں شائع ہو جائے گا۔ امید ہے کہ یاد دہانی کی ضرورت نہ پڑے گی۔

نیاز مند: عبدالحق

(۳۵)

دریا گنج دہلی ۲ / دسمبر ۱۹۴۱ء

مکرم بندہ!

تسلیم۔ آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ اگر تیار ہو گیا ہو تو مہربانی کر کے بھیج دیجئے۔

آپ کے کتاب خانہ میں دیوان مبتلا (اُردو) کا ایک نسخہ موجود ہے، مجھے اس کی نقل درکار ہے کیا آپ اس کی نقل کروا کر بھیج سکتے ہیں یا اس کے لیے اجازت کی ضرورت ہوگی، نقل کی جو اجرت ہوگی پیش کر دی جائے گی۔

نیاز مند: عبدالحق

(۳۶)

دریا گنج دہلی ۱۰ / دسمبر ۱۹۴۱ء

مکرمی و معظمی!

تسلیم۔ دونوں عنایت نامے اور مضمون پہنچا۔ بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے مسعود حسن صاحب رضوی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ دیوانِ مبتلا اور تذکرۂ مبتلا آپ کے پاس موجود ہیں۔ میں یہ دونوں شائع کرتا ہوں۔ رضوی صاحب کے پاس دونوں موجود ہیں مقابلے

کے لیے انھیں دوسرے نسخوں کی ضرورت ہے۔ بہرحال اگر دیوان نہیں تو تذکرہ کی نقل ہی عنایت فرمائیے، بہت ممنون ہوں گا۔

میرے پاس حاتم کے دیوان زادہ کے دو نسخے ہیں مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے ہاں اس کا بہت اچھا نسخہ ہے، کیا اس کی نقل مل سکتی ہے۔

مضمون کمپوزنگ کے بعد واپس کیا جائے گا۔ ابھی مضمون میں نے پڑھا نہیں۔ پڑھنے کے بعد اطلاع دوں گا کہ شعرا کے ناموں کی ضرورت ہے یا نہیں؟

نیازمند: عبدالحق

(۳۷)

دریا گنج، دہلی ۲۴ر مارچ ۱۹۴۲ء

مکرم و مہربان بندہ!

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ بہت شکر گزار ہوں۔ سب سے پہلے مجھے تذکرہ مبتلا کی نقل درکار ہے اگر آپ مہربانی کر کے اس کی نقل جلد بھجوا دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔

دستور الفصاحت والا مضمون چھپ گیا۔ وہ ایک دو دن میں آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔

نیازمند: عبدالحق

(۳۸)

دریا گنج، دہلی ۲۴ر فروری ۱۹۴۳ء

مکرمی!

تسلیم۔ "تذکرۂ مبتلا" کی نقل آج کی ڈاک سے موصول ہوئی۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو تکلیف فرمائی اس کے لیے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔

عبدالحق

(۳۹)

دریا گنج، دہلی ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۳ء

مکرم بندہ!

تسلیم۔ ایک صاحب نے زمیندار اخبار میں لکھا ہے کہ "شیر اللہ" نامی کتاب کا قلمی نسخہ کتاب خانہ رام پور میں ہے جس میں شیر شاہ سوری کے حالات ہیں۔ براہِ کرم مطلع فرمائیے کہ یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اور کتاب کی کیا حقیقت ہے۔

اس خط کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی کل ہند کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجتا ہوں۔ رام پور میں آپ ہی کی ایک ذات ایسی ہے جو اس کانفرنس میں شریک ہو سکتی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ضرور شرکت فرمائیں۔ یہ خاص اجلاس ہے اور خاص انتظامات کیے گئے ہیں اور اجتماع بھی بہت بڑا ہوگا۔

جواب کا منتظر

نیازمند: عبدالحق

(۴۰)

دریا گنج دہلی، ۲۷ اپریل ۱۹۴۴ء

مکرمی و معظمی!

تسلیم۔ حامل نیاز نامہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے یہ چند قلمی کتابیں جو نادر ہیں اور کتب خانۂ عالیہ ریاست رام پور میں رکھنے کے قابل ہیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بعد معائنہ ان سے معاملہ کر سکتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا

نیاز مند: عبدالحق

(۴۱)

دریا گنج، دہلی ۳ جنوری ۱۹۴۴ء

مکرمی عرشی صاحب!

تسلیم۔ آج زیدی صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ امید تو ہے کہ آپ کو ریاست کے نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی اجازت دے دیں۔

آپ کی کتاب دستور الفصاحت پر ریویو لکھا جا چکا ہے۔

اگر آپ کو اجازت مل جائے تو اپنے پہنچنے کی تاریخ سے سکرٹری مجلس استقبالیہ کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس بھنڈارہ روڈ، ناگپور سٹی کو اطلاع کر دیجیے گا۔

نیاز مند: عبدالحق

(۴۲)

دریا گنج، دہلی ۱۰ جنوری ۱۹۴۴ء

مکرم و مہربان بندہ!

تسلیم۔ آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ چیف منسٹر صاحب نے آپ کو ناگپور کانفرنس میں شرکت کی اجازت دے دی ہے۔ کانفرنس میں شرکت کی کوئی فیس نہیں البتہ وہاں کی مجلس استقبالیہ نے مشاعرے کی کچھ فیس رکھی ہے۔ آج صولت پبلک لائبریری کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا ہے۔

نیاز مند: عبدالحق

(۴۳)

دریا گنج، دہلی ۵ فروری ۱۹۴۶ء

مکرم و کرم فرمائے بندہ!

تسلیم۔ عطاء الرحمٰن حقانی صاحب میرا یہ خط لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ان کے پاس چند نادر قلمی نسخے، شاہی فرامین اور تصاویر وغیرہ ہیں جو وہ پیش کریں گے۔ یہ چیزیں آپ کے کتاب خانے کے لیے نہایت موزوں ہیں اور رکھنے کے قابل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملے میں آپ ان کی اعانت فرمائیں گے۔

نیاز مند: عبدالحق

(۴۴)

حسین منزل ابراہیم پورہ بھوپال ۷؍ جنوری ۱۹۴۹ء معرفت شیخ احمد حسین ریٹائرڈ انجینئر

مکرم و کرم فرمائے بندہ! زاد لطفہٗ

تسلیم۔ امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گے اور دستِ بُردِ زمانہ سے محفوظ۔ میں چند روز ہوئے دلّی سے یہاں اور اب یہاں سے بمبئی ہوتا کراچی واپس چلا جاؤں گا۔

یہاں ایک صاحب میرے پاس کتاب "سراج السائرین" تصنیف حضرت احمد جامؒ لائے۔ خوشخط لکھی ہوئی ہے اور کتابت ۹۹۸ھ کی ہے وہ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی قابلِ قدر کتابیں آپ ہی کے کتاب خانے میں کھپ سکتی ہیں۔ اگر آپ اسے سرکاری کتب خانے کے لیے خریدنا چاہیں تو اس پتے سے خط و کتابت فرمائیے:۔

مرزا اظفر حسین بیگ (اکاؤنٹنٹ دفتر حضور بینک سیکشن) سبزمنڈی بوبیتا پارک بھوپال

نیازمند: عبدالحق

(۴۵)

۲۰؍اگست ۱۹۵۲ء

مکرمی جناب عرشیؔ صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا کارڈ مورخہ ۱۲؍اگست پہنچا۔ آپ نے داستانِ رانی کیتکی کے منقولہ نسخے کی بابت تحریر فرمایا ہے لیکن جہاں انجمن کی بہت سی عزیز و نایاب چیزیں ضائع ہوئیں وہاں یہ بھی نذر ہوگیا۔ ممکن ہے کہ ہمارے کتب خانے کا بڑا حصہ جو وہاں رہ گیا ہے اس میں ہو۔

مخلص: عبدالحق

(۴۶)

بنام مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب

انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی۔ ۵؍اپریل ۱۹۵۴ء

مکرمی مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا خط پہنچا۔ یکم نومبر ۱۹۵۲ء کا "قومی زبان" دیکھا۔ منتظم نمائش نے بغیر کسی تحقیق کے مصنف کا نام خیر الدین لکھ دیا ہے اور سلطان ولی بہمنی کے عہد کی تصنیف قرار دی ہے۔

میں اس مثنوی کو ایڈٹ کر رہا ہوں۔ فی الحال صحیح پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کاتب بہت بدخط ہے اور املا بھی اکثر غلط ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو اس کے بعد مصنف وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں ۳۰؍اپریل سے اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ یہی وقت کام کا ہے اور جو کچھ ہو جائے غنیمت ہے۔

خیر طلب: عبدالحق

(۴۷)

انجمن ترقی اُردو پاکستان اُردو روڈ کراچی ۹ مارچ ۱۹۵۶ء

مشفقی و مکرمی!

السلام علیکم۔ آپ کا خط پہنچا۔ آپ نے عماد الملک والا مضمون پسند فرمایا، مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اہلِ حیدرآباد اسے پسند نہیں کریں گے۔

آپ سالار جنگ کے کتب خانے کی فہرست تیار کر رہے ہیں۔ آپ نے صرف مطبوعہ کتب کی فہرست کے متعلق لکھا ہے۔ شاید قلمی کتابوں کی فہرست آپ پہلے لکھ چکے ہیں۔ میں انجمن میں "قاموس اُردو کتب" تیار کرا رہا ہوں یعنی ابتدا سے اب تک جس قدر کتابیں اُردو میں ہیں ان سب کی فہرست۔ یہ قاموس پانچ چھ جلدوں میں ہوگی۔ پہلی جلد جو اس وقت لکھی جا رہی ہے "اسلامیات" پر ہے۔ اب تک اس موضوع پر دس ہزار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ آصفیہ کتب خانہ حیدرآباد کی فہرستیں میرے پاس موجود ہیں۔ اگر سالار جنگ کے کتب خانے میں اس موضوع پر کچھ ایسی کتابیں ہوں جو کتب خانہ آصفیہ میں نہیں تو براہِ کرم ان کے نام لکھ بھیجئے، بہت ممنون ہوں گا۔ ان میں جو کتابیں ہماری فہرست میں نہ ہوں گی ان کے متعلق مزید کیفیت آپ سے دریافت کروں گا۔

خالد علاؤالدین یہاں نہیں تھے۔ اب آ گئے ہیں۔ میں نے ان سے کہلا کے بھیجا تھا کہ مسودہ کا وہ حصہ بھیج دیں جس کی کاپیاں ابھی تک نہیں لکھی گئیں۔ وعدہ کیا ہے کہ تلاش کر کے بھیج دوں گا۔ اگر قطب النسا سلمہا کے پاس مسودہ ہو تو ان سے لے کر بھیج دیجئے۔ جو صفحات یہاں نہیں ہیں ان کی نقل لے کر واپس کر دیا جائے گا۔ قطب النسا نے بھی لکھا تھا اور انھوں نے مسودہ بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا پھر نہ معلوم کیوں رائے بدل گئی۔

ڈاکٹر گیان چند کی کتاب کے متعلق جو آپ لکھنا چاہتے ہیں ضرور لکھئے، میں اسے بخوشی شائع کروں گا۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کو خط کا جواب نہیں ملا۔ میں ہر خط کا جواب دیتا ہوں۔ اب یا تو میں بھول گیا یا میرا خط آپ کو نہیں پہنچا۔ بہرحال، اگر کوئی امر دریافت طلب ہو تو لکھئے فوراً جواب لکھ بھیجوں گا۔

خیر طلب: عبدالحق

(۴۸)

انجمن ترقی اُردو پاکستان اُردو روڈ کراچی ۲۳ راپریل ۱۹۵۶ء

مشفقی و مکرمی ہاشمی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا خط پہنچا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس سال ہم صرف "قاموس کتب اُردو" کی پہلی جلد شائع کرنا چاہتے ہیں جو صرف "اسلامیات" پر مشتمل ہوگی۔ اس وقت اس موضوع پر دس ہزار سے زیادہ کتابیں درج ہو چکی ہیں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر ان عنوانات کی کتابوں کی جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے فہرست ٹائپ کر کے روانہ کر دیں گے۔ ان میں امید ہے کچھ نہ کچھ کتابیں ایسی نکلیں گی جن کے نام ہمیں دستیاب نہ ہوئے ہوں۔ اگر "ادبیاتِ اُردو" کی مطبوعہ فہرست شائع ہوئی ہو تو اس کا ایک نسخہ ضرور مجھے بھیج دیا جائے۔ شاید اس میں ہمارے کام کی کوئی کتاب نکل آئے۔

آپ نے سرور جنگ، محسن الملک اور حیدری صاحب پر لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ سرور جنگ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں، محسن الملک پر لکھ چکا ہوں۔ (چند ہم عصر) البتہ حیدری صاحب پر ضرور لکھوں گا۔ فی الحال اگر فرصت ملی تو گاندھی جی اور سر تیج بہادر سپرو پر لکھنے کا ارادہ ہے۔

”قومی زبان“ آپ کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب پر ایک تبصرہ سخاوت مرزا صاحب نے بھیجا تھا جو اپریل کے نمبر میں چھپ رہا ہے اسے بھی آپ دیکھ لیجیے گا۔ حیدرآباد میں جو اُردو کانفرنس ہو رہی ہے اس کی کیفیت قومی زبان کے لیے ضرور لکھ بھیجیے گا۔

خیر طلب : عبدالحق

(۴۹)

مکرم و محترم بندہ!

تسلیم و مسنون۔ میں سخت محجوب ہوں کہ آپ کے اور حضرت امجد کے خطوط کا جواب نہ دے سکا واقعہ یہ ہے کہ کرنول سے واپس ہونے کے بعد ہی یہاں سے سلسلہ جنبانی شروع ہوئی کہ میں فی الفور علی گڑھ منتقل ہو جاؤں کیونکہ ڈاکٹر ذاکر حسین امریکہ جا رہے تھے عجیب کشمکش اور ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا وہاں جتنے کام میں نے اپنے سر لیے تھے انھیں نپٹانا اور ان کا انتظام کرنا تھا اس لیے فروری اور مارچ روا روی میں گزر گئے۔ کرنول، ترچناپلی وغیرہ دو تین دفعہ جانا پڑا اس کے علاوہ اپنی جگہ سے علٰحدہ ہونے میں سارے چارج دینے کے انتظامات میں قطعی فرصت نہ رہی۔ یہاں آنے کے بعد بہت سی اہم باتیں جو ڈاکٹر ذاکر صاحب کے جانے کے بعد رہ گئی تھیں ان کے سلسلے میں بے حد عدیم الفرصت رہا اب ذرا سی فرصت ملی ہے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ یہ حضرت امجد کو پڑھ کر سنا دیجیے اور میری معذرت کو قبول کرنے کی درخواست کیجیے۔

میں نے مدراس سے نکلتے ہوئے مولوی سید عبدالوہاب صاحب بخاری کو دس سٹ کے متعلق کہا تھا۔ پانچ سٹ کی رقم میں نے مدراس سے بھیجی تھی اور پانچ سٹ کی رقم میں نے عثمانیہ کالج کرنول کی جانب سے بھجوائی تھی اب دس سٹ کی رقم اگر ملی ہو تو انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپریل کے اواخر یا مئی کی ابتدا میں روانہ فرما دیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلہ میں ان غیر معمولی اسباب کی بنا پر جو تاخیر ہوئی اسے حضرت امجد اور آپ معاف فرمائیں گے۔

دستخط: مولوی ڈاکٹر عبدالحق (مدراس)

(۵۰)

بنام پروفیسر محمد مسلم صاحب پٹنہ

اورنگ آباد (دکن) ۱۵ر مارچ ۱۹۲۳ء

مکرمی و معظمی!

تسلیم۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ ممنون فرمایا۔ آپ ضرور اپنا مجموعہ روانہ فرما دیں۔ ہم لوگ یہاں اسے دیکھ کر اپنی رائے عرض کر دیں گے۔ یقین ہے کہ اس سے ہمیں بہت کچھ مدد ملے گی۔

رسالہ جامعہ بابت اپریل کے نمبر میں ریویو شائع ہوگا۔ تنقید شعرالعجم پر آپ بلا تکلف رائے زنی فرما سکتے ہیں۔ اس سے مقصد تحقیق ہے نہ کہ نزاع۔

یہ خط میں جلدی میں صرف آپ کے خط کی رسید میں لکھ رہا ہوں۔ اُردو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔

عبدالحق

(۵۱)

م پروفیسر محمد مسلم صاحب پٹنہ

اورنگ آباد (دکن) ۲۵ر فروری ۱۹۲۳ء

مکرمی!

تسلیم۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس کا ممنون ہوں۔ میں حیدرآباد سے پرسوں ہی واپس آیا ہوں اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی جس کی معافی چاہتا ہوں۔

افسوس ہے کہ آپ کا خط وقت پر نہ پہنچا ورنہ جو اصلاحیں آپ نے پیش فرمائی ہیں وہ میں مجلس اصطلاحات میں پیش کر دیتا۔ میرا ارادہ شروع اپریل میں ایک اور مجلس انعقاد کرنے کا ہے۔ اگر اس وقت تک آپ اپنی اصطلاحات کا مجموعہ مرتب فرمائیں تو بہت اچھا ہو تاکہ ہم سب مل کر اس پر غور کر لیں اور اس کے بعد اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

علم کیمیا کی اصطلاحات پر ایک مدت سے بحث چلی آ رہی تھی۔ میں اس پر مصر تھا کہ ان کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا جائے چنانچہ مجلس نے بالآخر اس سے اتفاق کیا لیکن میرے حیدرآباد سے چلے آنے کے بعد بعض صاحبوں کی کوشش سے یہ فیصلہ منسوخ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ کیمسٹری میں بجنسہٖ انگریزی اصطلاحات استعمال کی جائیں اور اس لیے کیمیاوی اصطلاحات وضع نہ ہو سکیں۔

میں آپ کو اپریل کی مجلس کے انعقاد سے اطلاع دوں گا۔ یہ مجلس غالباً اپریل کے ابتدا میں ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ آپ بھی اورنگ آباد چند روز کے لیے تشریف لے آئیں۔ دوسرے اصحاب بھی یہاں آنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگرچہ آپ کو زحمت ہوگی لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ طے ہو جائے گا۔

منطق کی اصطلاحات کے متعلق میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور اس مسئلہ کو بھی اسی کمیٹی میں پیش کروں گا۔

ذاکر حسین صاحب کے متعلق مجھے اب تک اطلاع نہ ملی کہ وہ جرمنی چلے گئے ہیں۔ براہ کرم ان کے پتہ سے مطلع فرمائیے مجھے ان سے کچھ کام لینا ہے۔

درسی ریڈروں کے متعلق میں نے ایک مفصل اور مبسوط تحریر گزشتہ مئی دارجیلنگ سے ذاکر حسین صاحب کے نام بھیجی تھی، معلوم نہیں وہ کیا ہوئی۔ افسوس کہ میرے پاس اس کا مسودہ بھی نہیں۔ آپ دریافت تو فرمائیں کہ وہ کہاں ہے۔

نیازمند،

عبدالحق

(۵۲)

بنام طاہر فاروقی صاحب، اسلامیہ کالج پشاور

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو اسپتال روڈ کراچی
۲۶ر فروری ۱۹۵۰ء

شفیقی و مکرمی! زاد لطفہٗ

السلام علیکم۔ کرم نامہ پہنچا جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ دوسرے اربابِ فکر سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ وہ کون سے اربابِ فکر ہیں۔ مجھے لفٹننٹ کرنل علی اختر صاحب نے کاکول میں زبانی دعوت دی اور پشاور پہنچ کر برابر اصرار کر رہے ہیں . . . . ایبٹ آباد میں بھی پشاور کے ایک دو صاحب ملے انھوں نے بھی مدعو کیا۔ سرحد کے وزیر اعظم بھی انجمن کے دفتر میں آئے، کالج کتب خانہ کا معائنہ کیا اور میرے ساتھ چائے نوش کی۔ ایبٹ آباد میں وزیرِ تعلیم اور ڈائرکٹر تعلیم سے بھی ملاقات ہوئی۔ ڈائرکٹر تعلیم (کھٹک صاحب) مجھے کئی مقامات پہلے گئے اور اپنے مدرسے دکھائے مگر اب تک سرحد والوں میں اپنے ڈھب کا کوئی آدمی نہ ملا۔

جس کمیٹی کا آپ نے ذکر کیا ہے بے شک ان میں ایک دو کے سوا اُردو کا پرجوش حامی کوئی نہیں لیکن سب اُردو کے بہی خواہ ہیں۔ ایسا ایک بھی نہیں جو رکاوٹ پیدا کرے۔ یہ کمیٹی تو صرف اپنی تجویز پیش کرے گی۔ عمل حکومت کے ہاتھوں میں ہے، کیونکہ لاکھوں کا خرچ ہے۔ یہ بہت اہم کمیٹی ہے مگر کام اسی قدر مشکل ہے۔ آپ نے اس ضمن میں . . . . کا نام لکھا ہے لاحول ولا قوۃ! ایسا نکما بے کار بے عمل آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ پنجاب کی انجمن ترقی اُردو جو میں نے لاہور میں قائم کی تھی اس کا سیکرٹری . . . . . . صاحب کو بنایا۔ اس بندۂ خدا نے باوجود میرے تاکید کرنے اور جھنجھوڑتے رہنے کے کچھ نہ کیا۔ یہ اشتہاری لوگ ہیں، کام کے نہیں۔

پاکستان میں صرف پنجاب ہی ایسا صوبہ ہے جو اُردو کو زندہ رکھے گا۔ آپ کو سندھ کا حال معلوم نہیں، اس کے مقابلے میں آپ کا صوبہ بہت غنیمت ہے۔ آپ "قومی زبان" منگائیے اور اسے پڑھا کیجیے اس میں اُردو زبان کی معلومات اور خبریں آپ کو ملیں گی۔

اپریل کے شروع میں انجمن حمایتِ اسلام کا سالانہ جلسہ ہے اس میں ایک دن "یوم اُردو" کے نام اُردو کے لیے وقف ہے، اس کی صدارت کے لیے وہاں والوں کا بہت اصرار ہے۔ وہاں جانا ہوا تو اس کے بعد پشاور کا نمبر آئے گا۔

آپ مایوس نہ ہوں۔ کام کرتے رہنا چاہیے، جو کچھ بھی ہو سکے۔ اسی طرح کرتے کرتے کچھ ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں اُردو کا مستقبل کچھ بہت اچھا نظر نہیں آتا، خصوصاً مشرقی پاکستان نے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے لیکن یاد رکھیے اُردو پھیل کے رہے گی۔ آپ لفٹیننٹ کرنل علی اختر سے ضرور ملیے۔ بہت شریف آدمی ہیں اور ہماری طرف کے ہیں۔ پلول کے ہیں ان کا پتہ یہ ہے:

ہیڈکوارٹرز (فرنٹیر) ڈویژن پشاور

سرحد میں جو با اثر اصحاب میرے ملنے والے تھے وہ سب یہاں آ گئے مثلاً عبدالرب نشتر، اورنگ زیب خاں، شاہ عالم خاں وغیرہ اور بھی کئی صاحب تھے ان کے نام بھول گیا ہوں۔

خیر طلب، عبدالحق

(۵۳)

بنام طاہر فاروقی صاحب اسلامیہ کالج پشاور

کل پاکستان انجمن ترقی اردو اسپتال روڈ کراچی
۱۸ مارچ ۱۹۵۰ء

شفیق و مکرمی!

السلام علیکم۔ آپ کا خط پہنچا۔ لاہور کی تاریخوں کی اطلاع ابھی تک موصول نہیں ہوئی۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب نے صرف اتنا لکھا تھا کہ اپریل کے شروع میں کرنے کا ارادہ ہے اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کونسی تاریخیں ہوں گی لیکن جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اپریل میں تعطیلیں ہوں گی اور اس کے بعد امتحانات تو یہ زمانہ ہمارے کام کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ آپ علی اختر صاحب سے بھی مل لیجیے اور ان کے ذریعے سے شاید دوسرے صاحبوں سے بھی ملاقات ہو جائے۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ وہاں سکریٹریٹ وغیرہ میں ممتاز عہدوں پر کون کون صاحب ہیں۔ ان کے نام معلوم ہو سکیں تو ضرور لکھیے شاید ان میں کوئی ملنے والا نکل آئے۔

کچھ دن ہوئے اسلامیہ کالج پشاور سے پروفیسر زیدی اور ایک دوسرے پروفیسر ان کے ساتھ ملنے آئے تھے۔ دونوں صاحب سائنس کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا بھی اصرار تھا کہ پشاور آؤں۔

خیر طلب: عبدالحق

---

(۵۴)

بنام طاہر فاروقی صاحب اسلامیہ کالج پشاور

انجمن ترقی اردو پاکستان اسپتال روڈ کراچی ۱
۲۲ مارچ ۱۹۵۲ء

شفیق و مکرمی زاد لطفکم!

السلام علیکم۔ میں بیس روز کراچی سے باہر رہا۔ جوبلی اور آئندہ کام کے لیے اعانت حاصل کرنے لاہور اور بہاولپور گیا تھا۔ پرسوں واپس آیا تو آپ کا عنایت نامہ ملا۔

میں سید شوکت سبزواری صاحب کو لکھنے والا تھا کہ وہ جوبلی کے اجلاس کے لیے کوئی مقالہ تحریر فرمائیں اور جوبلی کے جلسے میں شریک ہوں۔ سفر سے واپس آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سید صاحب نے اپنی عنایت سے میری درخواست قبول فرما کر مقالہ لکھ بھیجا ہے۔ میں آپ کے وائس چانسلر صاحب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ سید شوکت صاحب کو یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے جوبلی کے جلسوں میں شرکت کے لیے بھیجیں۔ اگر انھوں نے مان لیا تو فبہا ورنہ میں نے ایک دوسری تدبیر کی ہے۔ میں اورینٹ ایئرویز کے ڈائرکٹر سے بات چیت کر رہا ہوں کہ جوبلی کے مندوبین سے ایک طرف کے کرایہ کی رعایت کریں۔ وہ اس پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ ہو گیا تو ایک طرف کا کرایہ میں انجمن سے ان کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ یہاں ڈاکٹر محی الدین زور اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بھی ہوں گے۔ ہم تینوں ان سے گپ شپ کر کے آخری مرحلہ بھی طے کر دیں گے۔ ڈاکٹر عبدالستار نے جو بعض تجویزیں شوکت صاحب کے لیے لکھ کر مجھے بھیجے تھے وہ میرے پاس رکھے ہیں۔ میرا ارادہ مشرقی پاکستان جانے کا تھا اس لیے میں نے خیال کیا کہ میں خود یہ تحریریں ان کو پہنچا دوں گا اور ان سے گفتگو کر کے آخری شرط بھی پوری کر دوں گا لیکن جوبلی کے کام اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ

میرا یہاں رہنا نہایت ضروری ہے خصوصاً سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ ایسا ہے کہ وہ میرے بغیر سر نہیں ہو سکتا۔ میں جوبلی کے اجلاس میں آیندہ پنج سالہ منصوبہ پیش کرنے والا ہوں۔ یہ منصوبہ میں نے ایسا تیار کیا ہے کہ اگر انجمن کو کافی سرمایہ مل گیا تو وہ ادبی و علمی لغات سے غیر زبانوں کی محتاجی سے یکسر مستغنی ہو جائے گی۔ اس کی دو نقلیں آپ کے ملاحظہ کے لیے الگ بھیج رہا ہوں۔ ایک سید شوکت صاحب کی خدمت میں میری طرف سے پیش فرما دیجیے گا۔

میں بہت خوش ہوں کہ آپ ڈھاکے آ گئے وہاں آپ کے سے اور شوکت صاحب جیسے اصحاب کی بہت ضرورت ہے۔ آپ ہرگز افسوس نہ کیجیے اور نامساعد حالات کا مقابلہ کیجیے۔

جو تجویز میں نے شوکت صاحب کے متعلق کی ہے اگر آپ کو اس سے اتفاق ہو تو بہتر ورنہ پھر جو آپ تحریر فرمائیں گے اس کی تعمیل کی جائے گی۔

خیر طلب، عبدالحق

---

(۵۵)

بنام طاہر فاروقی صاحب اسلامیہ کالج پشاور

انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی نمبر ۱ ۲۹ نومبر ۱۹۵۲ء

مشفقی و مکرمی زاد لطفہٗ!

السلام علیکم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ عجیب بات ہے کہ آپ کے خط سے ایک روز پہلے خالد سلمہٗ آئے اور انھوں نے بیان کیا کہ طاہر صاحب پھر پشاور یونیورسٹی میں چلے گئے ہیں۔ مجھے سن کر بہت حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے، اب آپ کے خط سے پوری کیفیت معلوم ہوئی۔ علالت کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ کا خیال صحیح ہے ڈھاکے کی آب و ہوا نہایت ناقص اور مضر ہے۔ ایک ڈھاکہ کیا سارے مشرقی پاکستان کا یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد کامل شفا عطا فرمائے اور پھر ڈھاکے نہ لے جائے۔

میں پروفیسری سے برابر انکار کرتا رہا کیونکہ پہلے ہی سے کام کی اس قدر کثرت ہے کہ میں کسی دوسرے کام کے قابل نہیں رہا، لیکن جب وائس چانسلر نے یہ کہا کہ اگر آپ اعزازی پروفیسری قبول نہ کریں تو یونیورسٹی میں یہ شعبہ قائم نہ ہو سکے گا، مجبوراً کچھ دنوں کے لیے قبول کرنا پڑا۔ جن صاحب کا تقرر منظور کیا گیا تھا وہ نہیں آئے اس لیے میں پکڑا گیا۔

جوبلی کی پوری کارروائی قومی زبان میں شائع ہو گئی ہے۔ آپ کی خدمت میں بھیجنے کے لیے ہدایت کر دی ہے۔

خیر طلب، عبدالحق

---

(۵۶)

بنام محمد اظہار الحسن صاحب وکیل غازی آباد

اورنگ آباد (دکن) ۲۶ جون ۱۹۳۴ء

مکرمی!

آپ کا خط پہنچا۔ لطیفہ مغفرت اپریل نمبر میں شائع ہو گیا ہے۔ پرچہ آپ کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔

نوطرزِ مرصّع کئی بار چھپ چکی ہے۔ میرے پاس اس کے قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخے ہیں۔ میں اس وقت یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں اس لیے کہ میں حیدرآباد جا رہا ہوں۔ اس کی سنہ تصنیف کے متعلق حیدرآباد پہنچ کر اطلاع دوں گا۔

نیازمند، عبدالحق

(۵۷)

بنام سید ولی محمد فضا

نامور منزل سیف آباد (حیدرآباد دکن) ۱۹؍ مارچ ۱۹۳۷ء

مکرمی!

میں آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں۔ لکھنے پڑھنے کی ممانعت ہے۔ یہ خط بہت مشکل سے لکھ رہا ہوں اور وہ مختصر۔ زیادہ لکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہ مشہور ادیب ہوں اور نہ مستند محقق، آپ کی طرح طالبِ علم ہوں۔ بہرحال مجھ سے جو خدمت ممکن ہوگی اس کے لیے حاضر ہوں۔

۱۔ جو الفاظ آپ نے لکھے ہیں ان میں سوائے کھیل، رتھ، ادرک سب مختلف فیہ ہیں۔

یہ لفظ کھیل میں نہیں سمجھا اگر کھیل سے بازی مراد ہے تو یہ مذکر ہے اور اگر یہ کھیل ہے تو مونث۔

ادرک: مونث۔ گیند: مونث۔ رتھ: مونث۔ سانس: مذکر مونث دونوں میں لکھتا ہوں

فکر: مذکر و مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔ میں مونث کو ترجیح دیتا ہوں۔

نشوونما: مونث و مذکر (میں مونث کو ترجیح دیتا ہوں) برف: (مذکر، مونث بھی مستعمل ہے) مالا: مونث۔ گیند: مونث

۲۔ سودا کے شعر میں دستِ گل خوردہ کے وہی معنی ہیں جو آں صاحب نے فرمائے ہیں۔ یہ بہار کے قصیدے کا شعر ہے اور مبالغہ یہ ہے کہ دستِ گل خوردہ بھی شاخِ گل کی طرح نشوونما پاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت کوئی ایسی مستند ڈکشنری نہیں جس میں قدیم و جدید مل سکیں۔ نوراللغات غنیمت ہے۔

میں زیادہ نہیں لکھ سکتا، بوجہ تکلیف۔

آپ کے نام کی جگہ دستخط ہیں پورا نام پڑھا نہیں گیا۔

عبدالحق

(۵۸)

بنام سید ولی محمد فضا

انجمن ترقی اردو ہند ۲۴ ہارڈنگ ایونیو دہلی ۲۷؍ نومبر ۱۹۳۸ء

مکرم و مہربانِ من!

تسلیم۔ برندہ کہیں میرے دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم ہے البتہ برنّد تو ایک لفظ ہے جو ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے، ریشم اور سوت ملا ہوا۔ میرا کتب خانہ ابھی نہیں پہنچا۔ تحقیق کروں گا اگر کچھ سراغ لگا تو لکھ بھیجوں گا۔

کالپی ایک مقام کا نام ہے (یوپی میں) جہاں کی مصری مشہور ہے۔

آپ نے جو میرے قواعدِ اردو کے متعلق کوشش فرمائی اس کا شکر گزار ہوں۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں انجمن کی نذر کر دیتا ہوں۔ اگر یہ کتاب نصاب میں شریک ہو گئی تو انجمن کا فائدہ ہوگا۔ یہ حجم میں مصباح القواعد سے زیادہ ضخیم نہیں البتہ مطالب کے لحاظ سے بڑی ہے۔ مجھے تحریک کرنے میں تامل ہے کہیں یہ خیال نہ ہو کہ میں اپنی کتاب کے لیے کوشش کر رہا ہوں، حالانکہ اس سے میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔ البتہ انجمن کا فائدہ ہے اور یہ میں ضرور چاہتا ہوں۔ صرف و نحو اردو میں نے میٹرکیولیشن کے طلبہ کے لیے لکھی ہے جو ریاست حیدرآباد دکن کے ہائی اسکولوں کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ بھی انجمن کی ملک ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

زمانۂ حال کے زندہ شعرا کا کوئی تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

میری لغات کی تکمیل میں ابھی اور مدت درکار ہوگی۔ دو جلدیں بعد نظرِ ثانی طبع کے لیے تیار ہیں لیکن وہ صرف الف تک ہیں۔

عبدالحق

(۵۹)

بنام سید دل محمد صفا

انجمن ترقی اردو ہند

ہینڈول:۔ ایک راگ کا نام ہے۔

مرغول:۔ بالوں کی شکن، گھونگھر والے بال، مختلف معنے ہیں۔

چوڈول:۔ پالکی کی ایک قسم ہے۔

جھکول:۔ جھکولنا کے معنی ہیں پانی کو دھکیل دھکیل کر نکالنا۔ پانی میں چھلکے اڑانے کو بھی کہتے ہیں۔

۱۔ رتم:۔ چاول کا حلوا ہوتا ہے جو عورتیں خاص اللہ میاں کی نیاز کے لیے بناتی ہیں۔

۲۔ اگر کسی کے گھر میں بیری ہو اور بیر لگے ہوں تو لوگ خواہ مخواہ بیروں کے لیے پتھر ماریں گے، مطلب یہ ہے کہ جہاں دولت، علم یا کوئی اور خوبی یا کار آمد شے ہوتی ہے لوگ وہاں ٹوٹے پڑتے ہیں یا نظر رکھتے ہیں۔

کنولے:۔ سنترے، نارنگیاں: نرم، کے معنے بھی لیے جاتے ہیں۔

میوڑے:۔ میوہ کو حقارت سے کہا گیا ہے۔

سٹھورا:۔ یہ لفظ سٹھورا معلوم ہوتا ہے جو زچہ کو کھانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ایک قسم کا حلوا ہوتا ہے جس میں سونٹھ، قند وغیرہ ڈالتے ہیں۔

انگا:۔ انگرکھے کی ایک قسم ہے۔

ناچیز،
عبدالحق

(۶۰)

م سید دل محمد رضا

انجمن ترقی اردو (ادارہ منزل سیف آباد حیدرآباد دکن)

مکرمی بندہ!

سلام مسنون۔ عنایت نامہ پہنچا۔ مرسلہ استفسارات کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:۔

ص۳۴ ناؤ سنجوگ کے معنی ہیں وہ ساتھ جو ناؤ میں ہو، یعنی تھوڑی دیر کا ساتھ جیسے ریل کی ملاقات۔

ص۳۷ ام جانا کے معنے ہیں پک جانا، بھر جانا، شل ہو جانا۔ میر انیس نے ایک مرثیہ میں اس لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے پھوڑے کی شکل میں وہ حالت مراد لی جاسکتی ہے کہ جب ٹیس پیدا ہو جاتی ہے۔

ص۱۷۲ روکھن :۔ سودا لینے کے بعد بنیا یا کوئی دوکاندار جو ذرا سی مقدار کسی چیز کی اوپر سے دے دیتا ہے یعنی جنس خریدنے کے بعد اس کے علاوہ۔

ص۱۹۱ بے پیندی کے بدھنے :۔ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ڈانواں ڈول ہو اور کسی اصول پر قائم نہ ہو۔

ص۱۹ بگی چھتیسی :۔ اس لڑکی کو کہتے ہیں جو عمر میں کم مگر عقل اور باتوں میں بہت تیز ہو۔ چالاک، ہوشیار عورت کو بھی کہتے ہیں۔

کھیم کسل :۔ کھیم دراصل کشیم ہے جس کے معنے امن، خوشحالی وغیرہ ہیں۔ برہمنوں میں سلام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھیم کسل یعنی صحت و عافیت اسلامتی۔

طرز :۔ دونوں طرح مستعمل ہے۔

نقاب :۔ یہ بھی دونوں طرح مستعمل ہے۔

جلیل صاحب کی مؤلفہ کتاب اب دستیاب ہونا دشوار ہے۔

عبدالحق

---

(۶۱)

بنام جلیل قدوائی صاحب کراچی

کل پاکستان انجمن ترقی اردو اسپتال روڈ کراچی ۱

۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء

مشفقی و مکرمی!

تسلیم۔ .... صاحب بی۔ اے (علیگ) یہ خط لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ یہ بہت قابل ہوشیار اور مستعد نوجوان ہیں۔ میں انھیں طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ کام کہنے، لکھنے پڑھنے میں برق ہیں۔ آپ کے کام کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے سررشتے میں ان کے لیے کوئی گنجائش ہو تو یہ حاضر ہیں۔ میرے پاس جب کوئی ایسا ہوشیار نوجوان آتا ہے تو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ ملاکی دوڑ مسیت تک۔

خیر طلب، عبدالحق

(۶۲)

بنام جلیل قدوائی صاحب کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان اسپتال روڈ کراچی ۱

۵ر مئی ۱۹۵۳ء

مشفق و مکرمی! زاد لطفہ

تسلیم۔ عنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے زحمت فرما کر "انتخاب جدید" کا جو غلط نامہ بھیجا ہے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے خاص طور پر قاضی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ اسے چھپوا کر کتاب میں لگا دیں اور آئندہ اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے تاکہ غلط نامہ لگانے کی ضرورت نہ ہو۔

یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ آج کل آپ کی صحت اچھی نہیں۔ خدا آپ کو کامل شفا عطا فرمائے۔ دنیا میں صحت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اس میں دوا سے زیادہ احتیاط کام آتی ہے۔ خاص کر غذا کی احتیاط۔ اس کا خاص طور پر خیال رکھیے۔ کباب اور قورمے، پلاؤ اور زردے کے چٹخاروں کو خیر باد کہیے۔ یہ زمانہ اور یہ عمر اب ان چیزوں کے لیے سازگار نہیں۔ کبھی کبھی کا مضائقہ نہیں۔ والسلام!

خیر طلب: عبدالحق

---

(۶۳)

بنام صالحہ عابد حسین صاحبہ

انجمن ترقی اردو ہند ۱ دریا گنج دہلی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

عزیزی صالحہ خاتون سلمہا!

آپ کا خط پہنچا۔ میں مولانا حالی کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ کوئی نئی بات اس وقت خیال میں نہیں، علاوہ "چند ہم عصر" کے جس میں مولانا کی سیرت کا بیان ہے۔ یوم حالی منعقدہ حیدر آباد میں ایک جامع خطبہ پڑھا تھا۔ یہ رسالہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت ہماری سب کتابیں اور کاغذ بند ہیں اس لیے سنہ اور مہینے کا حوالہ نہیں لکھ سکتا۔

مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کہ آپ مولانا حالی پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ جو کام ان کے فرزند اور نواسے نہ کر سکے، قدرت آپ کے ہاتھ سے لے گی۔

خیر طلب: عبدالحق

(باقی)

تخلیق اور تخلیق کار

عبدالرحمٰن چغتائی

حسن و عشق۔ سوز و ساز۔ تپش و خلش۔ تخیل و جذبات۔ فیضان و بشارت۔ احساسات و مشاہدات یہ سب ایسے محرکات ہیں جن سے تخلیق اور تعمیر جنم لیتی ہے۔ فن اور فن کار کا وجود انہی کی تعریف و توضیح سے زندہ و تابندہ ہے۔ یہی وہ کشادہ راہیں ہیں جن پر فن کا انحصار اور قیام ہے۔ یہ تخلیق کے لیے اور تخلیق ان کے لیے جمالیاتی امکانات کی محرک ہیں۔ ایک کی مدد سے دوسرے کا وجود ہے۔ وہ منزل جہاں انسان کو فوق الفطرت ہونے کا فخر حاصل ہے یہی تو اس کی زندگی اور اسی سے تو اس کا مستقبل روشن ہے۔ فن کار اپنے کمالِ فن سے زندگی کے حقائق کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے اور یہ ملکہ اسے فن کے توسط سے حاصل ہوتا ہے۔

فن اور ادب فطری طور پر حسیات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خواہ ان کے اظہار کا طریق کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ یہ فوق الفطرت انسان ہمیشہ سے اس بات پر مستعد رہا ہے کہ اس کی فوقیت اس کی برتری دنیا کی ہر طاقت پر مسلط رہے۔ وہ اخلاق کا مظہر اور انسانیت کے مبلغ انسان کو اس تنزل سے بچاتا رہے جس سے تخلیقی قوتیں کند اور فن کا معیار اس کے اوصاف پر پورا نہ اترتا ہو۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ انسان نے آرٹ کو جمالیاتی حسن سے نہایا، سنوارا اور سلجھایا، اس کے اندر ایسے ذرائع تلاش کیے کہ حسن و عشق اور سوز و ساز کا درجہ کائنات کی ہر بلندی و پستی سے بالا نظر آتا ہے اور وہ برملا کہہ اٹھتا ہے کہ بنی نوع انسان کا خادم سب کچھ اسی کے لیے انجام دیتا ہے۔

شاعر نظمیں کہے۔ افسانہ نگار افسانے لکھے۔ ڈرامسٹ ڈرامے بنائے۔ جو کسی کا من آئے۔ جو کسی کا فن اجازت دے تخلیق کرے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان کے الفاظ آرٹسٹ کے تاثرات اور محسوسات کو چھو سکیں جس طرح انھوں نے الفاظ میں اپنے اپنے [illegible] کر بیان کیا ہے۔ آرٹسٹ کا مدعا اور اس کے اسرار خطوں اور رنگوں کے الجھاؤ اور ان کا مفہوم زندگی کے حقائق سے ان کا بناؤ اس کی تکنیک کا کرشمہ ہے۔ کہ اس کا ذہن اس کے فطری رجحانات سے متاثر تخلیق کی شکل میں ناچنے لگتا ہے۔ اور اس کا ہر کردار زندہ کردار بن جاتا ہے۔ نظم کے الفاظ سرفروشی کی تمنا پیدا کر سکتے ہیں۔ حادثے وقوع میں آ سکتے ہیں۔ افسانے اور ڈراموں کے نعرے سر دھننے پر مجبور کر سکتے ہیں لیکن آرٹسٹ

کا فن اس کے برعکس کچھ اور چاہتا ہے۔ کچھ اور دیکھتا ہے۔ انسانیت کی تکمیل فنون کی تکمیل ۔

آرٹسٹ کی تخلیق انسانی خد و خال کو اپنے کرداروں میں ڈھال دیتی ہے اور انھیں زندگی کی ان امنگوں سے بھرپور اور جلوہ افروز رکھتی ہے۔ جن سے جذبات ابھرتے ہیں اور جمالیاتی حسن فروغ پاتا ہے آرٹسٹ کو اس کا جنون ہے اور یہ جنون ہی اس کی فوقیت کا ضامن ہے۔ وہ چاہتا ہے، بغیر کسی خیر و شر کے جو وہ اپنے کرداروں کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے اپنے رنگوں، اپنے خطوں اور اپنی تکنیک سے اپنے کرداروں کو اخلاقیات کا وہ درجہ عطا کرے جسے دنیا کی تاریخ آج اور کل کے سوال کو بالائے طاق رکھ کر سمو لے۔ یہی ایک وصف اس کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ نقوش جن سے پست خیالی اور کم نظری کو سہارا ملتا ہے۔ زندگی کے تقاضوں کے منافی ہے۔ وہ کبھی آرٹسٹ کے ضمیر کی آواز کہلانے کا حق نہیں رکھتے۔ آرٹسٹ اور کردار یقینی طور پر اعلےٰ مقاصد کی رہبری چاہتے ہیں۔ جو معیارِ زندگی اور اخلاقیات کے شایانِ شان ہوں ۔

کلیسا اور آرٹسٹ وقت کی سیاسیات سے متاثر ہوتے ہیں۔ چاہے ان کے رجحانات کی کیفیات کچھ ہوں۔ بعض اوقات انہی تاثرات اور کیفیات نے انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔ اور کلیسا نے ایک ایسی کروٹ لی جس کے امکانات پہلے موجود نہ تھے۔ اگر آرٹ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو فرانس کے بڑے بڑے آرٹسٹ محض ملکی بدعنوانیوں کی وجہ سے متاثر ہوئے اور باوجود ہزار مجبوریوں کے فن کے ارتقا کی خاطر چشم پوشی نہ کر سکے۔ انہی رجحانات اور حالات نے دورِ احیا کے عظیم مصوروں کا ساتھ دیا اور انھوں نے اپنی تمام ذہانت اور دانش کو ان مذہبی امور کے لیے وقف کر دیا۔ جن سے ان کی مذہبی سرگرمیوں میں ان جذبات نے جگہ حاصل کر لی۔ کہ دیکھتے دیکھتے سارے کا سارا اٹلی ان میں ایسا رنگا گیا۔ کہ سوائے مذہبی تقدس کے اور عقیدۃً ان روایات کو قبول کرنے کے چارہ نہ رہا جن میں حضرت مسیح کی زندگی کی برتری اور ان کی پیغمبرانہ عظمت کے کوئی دوسری چیز مضمر نہ تھی۔ اور یہ ایک ایسا انقلاب تھا۔ جو ہزار سیاسی ہونے کے باوجود فن کے ارتقا کا ضامن تھا۔ یہی واقعات عرب اور عجم میں فنونِ جمیلہ کے ساتھ پیش آئے کہ مذہب کی روک تھام۔ خیر و شر کی پابندیوں کے باوجود وہاں کے فن کاروں نے ایسی ایسی تصویریں تخلیق کیں اور اپنے عقائد کا اظہار کیا جنھیں آج کی دنیا بھی قبول کرنے کو تیار نظر نہیں آتی۔ معراج کی تصویریں۔ رسولِ اکرمؐ کو براق پر سوار حضرت جبرئیل کے ہم رکاب دکھایا گیا ہے۔ پیغمبروں کے قصے جن سے ان کے فوق الفطرت ہونے پر روشنی پڑتی تھی۔ رنگدار بنائی گئیں جو آج بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ ایسے ہی اسباب پیش آتے رہے جن سے آرٹسٹ متاثر ہوتے رہے۔ تصویریں بناتے رہے اور آرٹ موافق اور ناموافق ماحول میں پھلتا پھولتا رہا۔ اس خطے نے بھی بے پناہ قوتوں سے پیغامِ حیات بن کر جب چاہا دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور اس کی فنی حیثیت روح کی بالیدگی کے بیداری کے اسباب پیدا کرتی رہی اور فن کار نے اپنی خود اعتمادی کے بھروسے پر وقت اور رجحانات کار دیا تاکہ آرٹ اور تخلیق جن کا مقصد اخلاقیات اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی ہے۔ زندگی کا سرچشمہ کہلا- ایک ایسی ہمہ گیر فضا پیدا کر سکے۔ جو تعمیرِ نو کے کام آتی رہے۔ آرٹسٹ فطرتاً عقائد کا مالک واقع ہوا

عزم کا پکا اپنے دعووں اور نظریوں پر اپنے عمل کو استوار کرکے چلتا ہے۔ وہ حاسدانہ تنقیدوں اور حملوں کی پروا نہیں کرتا اور کبھی اس بات کو ترجیح نہیں دیتا۔ کہ آرٹ جیسی قوت پراگندہ اثرات کا شکار ہو کر مقصد کو کھو دے۔ یہی اسباب ہیں جن سے وہ دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور دوسروں کو اپنے اعتماد۔ اعتقاد اور قناعت میں جگہ دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے۔ انسان کی انسانیت اور اس کی انفرادی خصوصیات کا درجہ بلند ہو کر وہ تہذیب و تمدن کے سایہ میں زندگی بسر کرتا رہے۔

آرٹ ان قوتوں کا طرہ امتیاز ہے۔ جن کی فتوحات نے ذہنی طور پر انسان کے رتبے کو بلند کرنے میں بڑے شد و مد سے مدد کی اور خون کو اجتماعی حیثیت سے گرمایا اور وہ جراثیم ختم کر ڈالے جن سے زندگی کی نشو و نما میں کوتاہی ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ تاریخ جس پر قوتوں نے انسانی ننگ و ناموس کو بھینٹ چڑھایا، ہمیشہ غلط روی کا باعث ثابت ہوئی اور بجائے انسانی رہبری کے حقیقی طور پر تہذیب و تمدن کو صدیوں پیچھے ڈال دیا اور اُن اسباب کو تقویت دی جس نے انسان کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ ہر قوم کی صحیح تاریخ چاہے وہ قوم جنگجو زندگی کی خوگر ہو اس کا سرمایہ اس کا فن ہے کیونکہ آرٹ نے ہمیشہ انسان کو اس حاسدانہ جذبے سے روکا کشت و خون سے بچایا۔ تباہی کے انجام سے آگاہ رکھا۔ اور زندگی کی رمز شناسی کو برتری دی۔

ایک آرٹسٹ جب کبھی اپنی بڑی سے بڑی خصوصیت کا اظہار چاہتا ہے۔ تو وہ اپنے فکر سے زندگی کی نئی تعبیریں نئی تعمیریں اور نئی نئی قدریں تلاش کرتا ہے تاکہ اس کے بنائے ہوئے کردار نئی نوع انسان کے خون کی قدر و منزلت کو سمجھیں اور ان ہمہ گیر شخصیتوں سے وہ جوہر تلاش کرنے میں مدد دیں جس نے ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گزر کر انسان کو اس شاہراہ پر چلنے کی صلاحیت عطا کی۔ جس میں اس کی نجات تھی۔ یہی ایک حقیقت ہے۔ کہ ہم فن کار کے بنائے ہوئے شاہکاروں میں شاہین صفت جوان اور درد آشنا دلوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ نیلی پیلی عورتوں میں بلند خیالی۔ جمالیاتی حسن اور اس کی بقا تلاش کرتے ہیں۔ بگڑے ہوئے خد و خال سے اور بے تناسب جسموں سے روح پرور نغمے سنتے ہیں۔ ایک لطافت ایک ارتعاش۔ دل گداز ولولے اُبھرتے اور بقا محسوس کرتے ہیں جو ہمارے رویں رویں میں سما جاتی ہے۔ کیونکہ فن کار کا ہر جمالی پہلو اس کی بالغ النظری کی دلیل ہے۔ اس کی تخلیق کائنات کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ وہ ارتقا کا راز دار ہے۔ اس کی انسانی قدروں کو کبھی فنا نہیں۔ آرٹسٹ ہی ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ اور سطحی چیزوں کو عمیق بنا دیتا ہے۔ عزم کو چٹان اور انسانی عظمت کو رفیع الشان اور پُرشکوہ دیکھتا ہے۔ وہ خد و خال۔ وہ مرد اور عورتیں۔ نیلے۔ پیلے۔ سیاہ فام کردار جنھیں چلتا پھرتا دیکھ پائیں۔ تو حواس باختہ ہو کر رہ جائیں۔ اس کی طرزِ نگارش انفرادیت اور تکنیک سے اس کے اندازِ اظہار سے۔ اس کے چابک دست قلم سے۔ اس کے رنگوں اور خطوں کے امتزاج سے۔ ہر پیچیدگی سے بالاتر۔ خیر و شر سے پاک۔ اس کا ہر کردار اس کی قوتِ ارادی کے معاون حسن جمالیات سے بہرہ ور نظر آتا ہے۔

اگر ہمارا ماضی ہمارے مستقبل کا درخشاں ستارہ ہے۔ ہماری روایات ہمارے حال کی ضامن ہیں۔ تو وہ قوم قوم ہے

اور جس قوم کے پاس یہ سرمایہ نہیں، وہ قوم نادار اور غلام ہے۔ روایات ہمارے اعتماد کو بلند کرتی ہیں اور ماضی متاثر کرتا ہے۔ جدوجہد کے لیے فخر سے جینے کے لیے اور اس بقا کی آرزو کے لیے جس سے حال اور مستقبل دونوں روشن ہیں۔ جس سے بڑے بڑے غیر فانی کردار، شخصیتیں سلامتی اور آزادی کی خوگر نظر آتی ہیں۔ روایات ہی نے ہمیشہ قوموں کو سہارا دیا ہے۔ وہ ہر دور میں اپنے فرائض سے سبکدوش رہی ہیں۔ چاہے اس وقت کی حکومتوں اور بادشاہتوں نے روایات بنانے والے فنکاروں پر کتنے بھی ظلم و ستم کیوں نہ ڈھائے ہوں۔ دیکھا جائے تو روایات کو ہمارے فنون میں آج بھی وہ جگہ حاصل ہے جو کل تھی۔ لیکن روایات کا استعمال اور ان سے استفادہ کرنا آرٹسٹ کی انفرادیت کا حصہ ہے۔ اور انفرادیت کو صدمہ پہنچنے نہ دینا آرٹسٹ کا اپنا فعل ہے۔

آرٹسٹ ہمیشہ ان قوتوں کا ہمنوا رہا ہے۔ جن سے انسانی اعتماد نے علم بلند کیا اور انسان کی عظمت کو زمانہ کی چیرہ دستیوں سے بچایا۔ اس کے مدعا کی مدد کی اور اس خیال سے اس کا ہاتھ بٹایا۔ کہ ضمیر کی آواز اور زیادہ بلند اور یقینی ہو جائے۔ خود اعتماد آرٹسٹ کسی تخلیق کو عملی صورت دینے کے بعد یہ نہیں سوچتا کہ اب اس کے پرکھنے والا آئے گا۔ وہ داد حاصل کرے گا۔ اعتماد ہی اس کا ہمنوا رہا ہے اور اعتماد ہی سے اس نے اپنے وجود کو تسلیم کرانے کا موقع دیا ہے۔ جہاں تک فن کی صلاحیتوں کا تعلق ہے۔ ہر وہ آرٹسٹ ایک مبصر اور مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اپنی تخلیق سے کسی بڑے انقلاب کی خبر دیتا ہے اور وہ اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ کہ اس کی جدت طرازی اور انفرادیت ماضی اور روایات پر نکتہ چینی کا موجب ٹھہری ہے۔ کتنا مبارک ہے وہ فنکار جو اپنے اعتماد اور انفرادیت پر جیتا ہے اور چاہتا ہے اس کا عطیہ ان روایات کا حصہ بن جائے۔ جن سے اس کا اور اس کی قوم کا وجود ہے۔ تعمیر نو سے زندگی مچلتی ہے۔ آرزوئیں بے قرار ہو کر نئے مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔

جب زندہ قوموں کا زندہ فن اپنے معراج پر پہنچ کر نئی کروٹ لیتا ہے۔ تو وہ تبدیلی اور کروٹ حقیقت میں اس انحطاط کے آثار بن کر ظاہر ہوتی ہے جس سے زندگی آرٹ اور سیاسیات تک کا معیار بدل جاتا ہے۔ قوم طرب و نشاط کی طرف رجوع کر لیتی ہے۔ ہوس اور ملک گیری کا جذبہ جنگ و جدل کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے تہذیب و تمدن بڑی بڑی مبہم امیدوں سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت آرٹ اور ادب اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر نئے سانچوں میں ڈھلنا شروع ہوتے ہیں اور ان کے اغراض و مقاصد بدل جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے مبصر اور نقاد اس ہیئت اور مواد کا ذکر بلند آہنگ الفاظ میں کرتے ہوئے پست خیالی اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں اتنی حس بھی نہیں رہتی کہ وہ اپنے مرض کو بھی ٹٹول سکیں۔ اس وقت رفتار زندگی کا ہر سانس تیز تیز چلتا ہے اور کبھی تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ روایات پر نکتہ چینی نہ کرنا بھی ایک بزدلانہ فعل ہے۔ اور یہ بھی کم نگاہی سے کم نہیں کہ ہمیں اپنی روایات کا احساس ہی جاتا رہے۔ اور یہی ایک سبب ہے۔ کہ ان حالات میں آرٹسٹ کا ہر فعل باوجود اکتاہٹ اور جمود کے ہر انقلابی تحریک کو لے ڈوبتا ہے۔ بے حسی اور سہل انگاری اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ نئے نئے نظریوں کا چرچا ہوتا ہے۔ ہیئت اور مواد اجنبی اجنبی نظر آتے ہیں۔ مگر اندرونی طور

پر زندگی کا سوز و ساز اور ریاضت کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ خون گدلا ہو کر وجاہت سے منہ موڑ لیتا ہے۔ تحریک میں افسردگی یا اکتاہٹ یا بے دلی بھرتی چلی جاتی ہے اور ایسے قالب اختیار کر لیتی ہے کہ اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اعتماد کھو جاتا ہے۔ حسد، کینہ، انتقام اور اختلافات تحریک کو اپنے چنگل میں لے لیتے ہیں۔ اور وہ اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ موت مسلط ہو جاتی ہے۔ فضا بدحواسی میں بدل جاتی ہے۔ جنسی لذتوں کا شکار ہوا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد شرمناک ہلاکت سے اپنے آپ کو آرٹ کی تحریک کو بچانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

آرٹ کا عروج محض سرپرستی تک ہی محدود نہیں۔ سینہ روشن، کشادہ دلی، ایثار، قربانی اور ماضی کی برکتیں اس کے لیے دوش بدوش رہی ہیں۔ آرٹسٹوں نے ان اعلیٰ اوصاف کا ہر موقع پر ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنے خلوص سے دیوتا اور دیوتا سے انسان ہونے کا ثبوت دیتا چلا آیا ہے۔ وہ ولولہ جذبات کی گہرائیوں میں اتر کر بحیثیت انسان زندگی کا سرچشمہ کہلاتا ہے۔ مشرق نے آرٹ کی سرپرستی میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اپنی تخلیق سے معیار کو بلند کیا ہے مطالعہ بنایا ہے۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا مرہونِ منت رہا ہے۔ جو اہلِ نظر اور برسرِ اقتدار تھے۔ جن کو زندگی کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔ مغلوں اور دوسرے سرپرستوں کو چھوڑ کر بدھ مت نے بھی ان خصوصیات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ جس کا ثبوت ان کے فن ان کی روایات سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ جو حقوق عبادت کے لیے راجہ اور مہاراجہ کو حاصل تھے وہ پرجا کو نصیب نہ تھے۔ اور جو پرجا چاہتی تھی۔ وہ اچھوت نہ کر سکتے تھے۔ وہ صرف اس قدر جانتے تھے ان کی دعاؤں سے ان کے کرموں کا پھل اور روزی ملتی ہے —— اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ آرٹسٹ ہمیشہ فضا اور واقعات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس نے سطحی اور بھڑکیلی چیزوں سے دھوکہ نہیں کھایا۔ اور کوشش کی کہ وہ اپنے خلوص کو بنی نوع انسان کی خدمت سے وابستہ رکھے۔ اس کے دماغی توازن نے لمحاتی خوشبوؤں کے زیر اثر بڑے بڑے شاہکاروں کو جنم دیا۔ تہذیب و تمدن کی انفرادی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ جس کا گمان خود حاکم وقت۔ دربارِ اقتدار کے ذہن میں بھی نہ آیا تھا اور کوئی جانتا نہ تھا کہ آرٹسٹ اور اس کی تخلیق کسی کے کام آئے گی اور آرٹسٹ معاشرے کا پاسباں کہلائے گا۔

آرٹسٹ کے رنگوں اور خطوں کی ہم آہنگی میں جو ہمہ گیری اور بقا مضمر ہے وہ اس کی روایات اور ماضی کی دولت ہے اور اس دولت سے لافانی مسرتیں۔ وجدان اور فیضان حاصل کرنے کے لیے بھی ہمیں اپنی روایات کو اپنانا پڑتا ہے۔ تاکہ معاشرے کی نشو و نما اپنی ضرورتوں کے مطابق اجاگر ہو سکے اور آرٹسٹ کی انانیت پیغمبرانہ انداز میں بیدار ہو کر قوم کی قوم کے لیے راہِ عمل بن جائے۔ بخشش کے دروازے کھل جائیں۔ فیضان کے وقت آرٹسٹ خود بھی اپنی تخلیق سے لمحہ دوچار نہ ہو مگر وہ جمالیاتی حسن کی دھن اور تخلیق کی پرواز میں روحانی بلندیوں پر خود سے ہم کلام رہتا ہے۔

آج سے ہزاروں سال پہلے جن آرٹسٹوں نے انسانی جاہ و جلال کی حفاظت کے لیے اپنی صلاحیتوں سے کام لیا تھا اپنے قلم کو تخلیق کے معیار کے لیے جنبش دی تھی۔ رہبری کے لیے ذرائع تلاش کیے تھے۔ وہی ذرائع آج بھی فن کے نیک و بد۔ اچھے اور برے کی پہچان کے دعویٰ دار ہیں۔ اگر کسی یونانی۔ اٹالین۔ مصری۔ ایرانی اور بدھ آرٹسٹ نے محبت کی تصویر بنائی تھی۔ تو اسے معصومیت سے تعبیر کیا گیا ہے ان کے اظہار کے طریق مختلف، خد و خال مختلف اور اعتقاد مختلف تھے

پھر بھی محبت کی ان لازوال تصویروں سے وہ حسن نمایاں ہے جو محبت کا درجہ رکھتا ہے۔ قدیم یونانی استادوں نے بڑے بڑے حسین اور لازوال مجسمے بنائے اور ان کو اپنی روایات کے مطابق بڑے بڑے ناموں سے منسوب کر دیا۔ کوئی اپالو تھا۔ کوئی کیوپڈ اور سائیکی۔ کوئی وینس اور مارکس یہ دیوتا ہی تو ہیں جن سے ان کے عقائد اور زندگی کے مدوجزر کا پتہ چلتا ہے۔ وینس کا بت انھوں نے محبت کا وہ لافانی استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جس سے عورت کا حسن تکمیل پاتا ہے۔ کہیں وہ ایک معصوم بچے سے دل بہلا رہی ہے کہیں اس کے سینے میں تیر لگا ہوا دکھایا گیا ہے۔ کہیں اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ اور کہیں وہ اپنی بھرپور جوانی کو آئینہ میں دیکھ رہی ہے۔ یہ مجسمے آج بھی ان کے کمالِ فن کی انتہا سمجھے جاتے ہیں۔ ان پر کتنی بھی کڑی نکتہ چینی کی جائے مگر ان کے فنی محاسن میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ قدیم یونانی مجسموں کا اور ان کی خوبصورتی کا معیار بدھ۔ چین اور مصر کے مجسموں سے قطعی مختلف ہے۔ وہ کتنے بھی جمالیاتی حسن سے دور اور فطری تناسب کے قریب ہوں پھر بھی ان میں وہ مقدس جذبہ کارفرما ہے جس کے زیر اثر انھیں تخلیق کیا گیا تھا۔ وہ چلتے پھرتے دیوتا تھے۔ انسانوں میں بستے تھے مگر اپنے آپ کو ان سے افضل تصور کرتے تھے۔ ان کے خدوخال کی بناوٹ جسموں کا تناسب۔ قدوقامت مقابلتاً دوسری قوموں سے سڈول، وجیہہ، خوب صورت۔ مجسموں کے سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔ یہی ایک سبب تھا کہ وہ تخیل اور جمالیاتی تناسب کو نظر انداز کرتے رہے۔ دل فریب جسموں کی پرستش کرتے رہے۔ شرم وحیا کو چھوڑ سنجیدگی کو دماغوں سے نکال، عورت کو عورت سمجھ کر اس کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ پہلے اسے ایک نام دیتے تھے پھر ایک جسم کا انتخاب کر لیتے تھے۔ جو ان کے جذبات اور تصورات کی ترجمانی کر سکتا تھا۔ ان کا بنایا ہوا وینس کا مجسمہ آج اس جدید دنیا میں کل سے بھی کہیں زیادہ سراہا جا رہا ہے۔ ان کے عروج کے زمانے میں وینس کی عام پرستش ہوتی تھی۔ ان کے زوال کے بعد صدیوں تک بڑے بڑے عظیم آرٹسٹ اس کے حسن پر طبع آزمائی کرتے رہے تصویریں بناتے رہے۔ اور یہ جذبہ آج بھی زندہ ہے۔ وینس کی مدح سرائی اور پرستش موجودہ رجحانات کے تحت برابر کی جا رہی ہے اور اس طور طریق پر کہ خود اس کے خالق کو بھی یہ معراج نصیب نہ ہوا ہوگا۔ کوئی نہیں جانتا جب وہ چلتی پھرتی عورت خوبصورت سڈول جسم والی آرٹسٹ کے انتخاب کا مرکز بنی تھی اور اس نے اس کو اپنے ماڈل کے لیے چن لیا تھا۔ صورت وسیرت میں دیوتا تھی یا کسبی تھی۔ بدکار تھی یا باعصمت تھی۔ اس کا ہر پرستار آج اس کی چھپ سے جس پر آرٹسٹ کی مہر لگی ہے۔ ہزار معنی پیدا کر لیتا ہے اور اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے اور اس کے کٹے ہوئے بازوؤں سے یہی آرزو کرتا ہے کہ وہ اس کے سر کو اٹھا کر اس سے بغلگیر ہو جائے۔ بازو نہ اس کی طرف بڑھتے ہیں نہ وہ انھیں اپنے بازوؤں میں بھینچتی ہے۔ مگر کوئی بھی اس کی ہمہ گیری سے مایوس نہیں ہوتا۔ صدیاں گزر جانے پر لاکھوں انسان اس دور میں بھی عجز و نیاز سے اس کے سامنے کھڑے اس کا منہ تکتے رہتے ہیں۔ کہ شاید اس کے منہ سے کوئی ایسا جملہ سن پائیں جو وہ سمجھ سکیں۔ ہر گھڑی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے پُروقار لبوں پر جملے۔ فقرے، الفاظ لاتی ہے۔ دہراتی ہے نظمیں پڑھتی ہے۔ مگر اپنی اس تبسم مسکراہٹ میں دبا کر اندر ہی اندر پی جاتی ہے۔ جن کا سحر ایک روشنی بن کر کائنات پر اثر انداز ہے۔ وہ کبھی افسردہ خاطر نہیں ہوتی۔ کوئی اس کے حسین جسم اور سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا۔ وہ نیک دل پاک روح

ہے۔ اس کی کتنی بھی تعریف و توضیح کی جائے۔ وہ چپ کی چپ ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہے۔ پر اس کے خالق نے اسے جی بھر کر دیکھا تھا اور سب کچھ پڑھا دیا تھا۔ جو اس کے روئیں روئیں سے عیاں ہے۔

جس طرح یونانی معبد گاہوں کی تعمیر مجسموں سے تکمیل پاتی تھی۔ انھیں آرائش سے بڑھ کر معیارِ فن کے قیام کے لیے وہاں ایستادہ کر دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا۔ یہ انسانوں کے نہیں دیوتاؤں کے مجسمے ہیں۔ انھوں نے اوتاروں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ جب کوئی خوبصورت تناسب اور سڈول جسم والی عورت سوسائٹی کی رونق بنتی تھی۔ تو ان پر آرٹسٹوں کی نگاہیں جم جاتی تھیں اور اسے اس کے کردار کے مطابق، خدوخال کی بناوٹ کی رو سے اسے ایک نام دے دیا جاتا تھا کبھی وہ وینس کبھی اسنرا کہلاتی تھی اسی طرح مردوں کے نام کرہ ڈالا جاتا تھا۔ اور ان خوب صورت جسموں کی نمائش تالابوں۔ درسگاہوں۔ ناچ گھروں۔ تھیٹروں اور ورزش کے میدانوں میں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ سب کچھ ان کے عقائد میں شامل ہوتا گیا اور زندگی کا جزو بنتا گیا۔ آرٹسٹ جس مرد یا عورت کو بطور اپنے ماڈل کے چن لیتا تھا۔ وہ دیوتا بن جاتا اور دیوتا کہلاتا تھا۔ اس کی شخصیت اس کا کردار ان کی تہذیب میں ناقابلِ فراموش درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ عریانی ان کی تہذیب کا جزو تھی۔ عریانی ان کا اخلاقی معیار تھا۔ یہی کچھ اس تہذیب نے دُنیا کو دیا ہے۔ اور اسی سے دُنیا نے ان مجسموں کو دیوتا کے لقب سے زندہ جاوید بنا دیا اور ان کی پرستش میں کبھی کوتاہی نہیں کی گئی —— اگر کوئی قوم یا تہذیب یہ چاہے کہ یہ روایاتی آرٹ یہ کلاسیکی مجسمے۔ یہ قدیم یادگاریں۔ مجرد آرٹ۔ تجریدی فن کی جگہ لے لیں۔ تو اس کا جواب بداخلاقی غیر مہذب ہونے کے علاوہ یہ بھی ہوگا۔ کہ ابھی ان جدید شاہکاروں کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوا۔ کہ دیوتاؤں اور اوتاروں کے ساتھ ان کا ذکر چھیڑا جائے۔

فنی معیار کا اندازہ آرٹسٹ کی انفرادی شخصیت سے ضرور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ روایات کی اہمیت کو نظرانداز کرنے کا سدِ باب نہیں۔ کہ ہم اپنے ماضی کا سرمایہ پسِ پشت ڈال دیں۔ اجنتا کے غاروں میں فن کاروں نے جس خلوص سے اپنی تخلیق کا اظہار اور نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ یونانیوں سے بھی کہیں زیادہ بلند نگاہی کا درجہ رکھتا ہے اور اس لافانی تخلیق میں راج کنور۔ راج رانیوں اور راجاؤں کو اونچی جگہ دی گئی ہے۔ داسیاں اور باندیاں جو ان کے حضور میں جمع ہیں پھولوں اور موتیوں کے ہار اُٹھائے ان کی شانِ امارت کو مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ بدھ کی مورتی جس کی روشنی سے یہ غار بہ تخلیق روشن ہے۔ اس کا سارا پس منظر چتر شاہی اور وہ جاہ و جلال ہے۔ جسے بدھ نے تیاگ دیا تھا جس کی کنول نما آنکھیں۔ شرابِ وحدت سے لرزتے ہوتے لب اور اس کی خنکی اس اونچے اور لافانی استھان سے سرفراز ہے جو اس کا مقام ہے یہی چین اور جاپان کے ساتھ گزری ہے۔

مسلمانوں کے فنون نے بھی اپنی جگہ آپ بنائی۔ اس کے مقاصد ہمیشہ یہی رہے ہیں کہ انسان کی انسانیت اپنی اخلاقی قوتوں سے برسرِ اقتدار ہے۔ سلطان حسین مرزا۔ شیر نوائی۔ شاہ عباس۔ بابر۔ ہمایوں۔ جہانگیر اور شاہ جہاں آرٹ کے پرستار فن کاروں کی سلامتی کے ضامن تھے۔ یہ وہ لافانی ہنر شناس اور صاحبِ نگاہ ہیں۔ جن کے دوبارہ جنم کی کوئی پیشین گوئی نہیں ملتی۔ تاج محل کی تخلیق پر بادشاہ کا خزانہ ختم ہو گیا تھا۔ ہزاروں مزدوروں کا خون پسینہ ایک ہو گیا ہوگا۔

ہزاروں ہنرمندوں کی روزی کا سامان کھل گیا تھا ۔ تاج و تخت کی سلامتی کی دعائیں ۔ بادشاہ کی سلامتی رعیت کی سلامتی تھی ۔ یہ سب کچھ جو ادھر اُدھر نظر آ رہا ہے ۔ ان نگاہوں کا پھل ہے ۔ کہ تاج محل آگرہ ۔ الحمرا ۔ اجنتا ۔ ایلورا یہ تہذیبوں کے وہ ستون ہیں ۔ جن کے بغیر حیاتِ نو کا سانس تک سنائی نہیں دے سکتا ۔ اور انسانوں کی بصیرت کسی کام نہیں آ سکتی ۔

مشرق میں کسی تحریک کو پروان چڑھنے میں صدیوں کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے ۔ تب جا کر کہیں انقلاب کی صورت نظر آتی ہے ۔ غالباً ایشیا اپنی فطری کمزوریوں کو چھپانے کے لیے اپنے عروج کے تمام اسباب بھول گیا ہے ۔ اور انحطاط کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے مغرب کو سہارا سمجھ بیٹھا ہے اور جو تحریک مغرب سے اُٹھتی ہے اپنے اندر سمو لینے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہ فرسودہ ہو کر ہم تک پہنچتی ہے اور فن کار اندھا دھند اس کی تقلید میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور بغیر اونچ نیچ سمجھے اپنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے ایسی تحریکوں کا ایسے فن کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں ۔ جن کا انھیں خود کوئی پتہ نہیں ہوتا ۔ سوائے اس کے دوسروں پر حملے کریں اور بغیر کسی فلاح و بہبود کے مطالعہ کا ثبوت دیں اور اپنی شکست کا اعتراف کریں ۔ غلامانہ ذہنیت کا اظہار کریں ۔ وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے دُنیا کو بے وقوف بناتے رہیں گے ۔ یہ اُن ترقی پسند لوگوں کا ذکر ہے جو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ آرٹ برائے زندگی کا نظریہ صحیح ہے یا آرٹ برائے آرٹ کا ۔

ہماری تنقید کا جدید باب بھی ہمارے آرٹ کے پہلو بہ پہلو مغرب کی نقالی اور مغرب پرستی ہے ۔ اور یہ اس قوم اور تمدن کا شیوہ ہے جس کے ہاں زندگی کے ارتقا کا مسئلہ صدیوں پہلے در پیش تھا ۔ اور مغربی قوموں نے ہمارے فن کاروں کے غیر فانی شاہ کار بڑے احترام سے مطالعہ کی غرض سے ان سے استفادہ کرنے کی غرض سے اپنے ہاں محفوظ کر لیے تھے ۔ اور ان کا یہ اقدام ان کی ہر تخلیق ۔ تنقیدانہ اختراع سے نمایاں ہے ۔ اور جب ہم مغرب کے تجریدی آرٹسٹوں کا ذکر بڑے طمطراق اور دعوے سے کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود ہی سیزاں ۔ مینے ۔ رینائے ۔ گوگ ۔ گوگین ۔ متیشے اور پیکاسو اپنے سے کم درجہ کے لوگوں پر تنقید کر رہے ہیں ۔ حالانکہ ان آرٹسٹوں نے یکے بعد دیگرے مشرقی آرٹسٹوں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔ اور انھوں نے جدید اور جدید تر ہوتے ہوئے بھی اپنی ہر بدعت اور روایات کو اپنی انفرادیت میں پیش کیا ہے ۔ سیزاں نے مسیح کی تصویریں بنائی ہیں ۔ گوگ نے بائبل کو پڑھا اور ان قدیم قصوں میں انسان کے درد کو تلاش کیا ۔ جس سے انسان پھلا پھولا ۔ گوگین تھاہیٹی میں مارا مارا پھرتا رہا اور ایک سیاہ فام بچے کو ماں کی گود میں دیکھ کر اسے مسیح کا لقب دے دیتا ہے اسے صلیب پر دکھاتا ہے جس نے ساری دُنیا کے گناہوں کا کفارہ خود ادا کیا تھا ۔ متیشے نے کہا اس نے اسلامی خطاطی کو اپنی مصوری کا ذریعہ بنایا ہے ۔ یہی حال اس پیکاسو کا ہے ۔ جس نے روایات کی مذمت کرتے ہوئے بھی خود کو رومن ۔ اٹالین ۔ ہسپانوی اور مصری شاہ کاروں کی پرستش میں غرق پایا ۔ الف لیلیٰ اور عمر خیام کی رباعیات تک کو نہیں چھوڑا ۔ آنگرے ۔ ڈیگے اور رینائے اپنی اعلیٰ روایات کی ترجمانی میں جاپان اور چین کی نگارش کو اپناتے رہے ۔ اس رجعت پسندی کو ایک فخر بنا لیا ۔ یہ فخر اور تعلی انھیں دوسرے ہمعصروں سے بلند کرتی ہے ۔ یہی حال جدید مغربی ادیبوں اور شاعروں کا ہے ۔ وہ لیڈا ۔ گولیٹا کے رومان میں تلاطم محسوس کرتے ہیں

ہدان کو بطور تمثیل کے اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں۔ کیوپڈ سائیکی اور وینس ان جدید شاہکاروں کے موضوع ہیں جن کے ناموں سے انھیں فیضان ہوتا ہے اور مقبول ہوتے ہیں۔ یہی حال ہمارے مغرب پرست ادیبوں اور شاعروں کا ہے۔ وہ شیریں، فرہاد اور لیلے مجنوں کے ناموں کا سہارا لے کر اپنے شاہ کاروں میں روح ڈالتے ہیں۔ یہ تمثیلیں یہ استعارے یہ موضوع ہمارے ماضی اور مستقبل کے تابندہ ستارے اور روایات ہیں۔

آرٹسٹ کی تخلیق زندگی کے نشیب فراز اور عظمتِ آدم کی مظہر ہے اور ارتقا کی حامی ہے۔ سیاست اور مذہب زندگی کی ضرورت سے الگ رہ سکتے ہیں مگر آرٹ اور اخلاقیات کو الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ زندگی کے ارتقا کا مسئلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہزاروں سال گزر جانے پر بھی اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوا کہ خدا کی خدائی اس کے سامنے ہے ہزاروں آرٹسٹوں نے اپنے شاہ کاروں سے اس دُنیا کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کا یہ جہاد زندگی کے ہر خوش آہنگ نغمے کے بلیے ہے جس میں اس کی انفرادیت جلوہ گر ہے اور یہی وہ اوصاف ہیں جس کی بنا پر آرٹسٹ کو روحانی اور دُنیاوی خوشی میسر آتی ہے اور وہ بد ذوقی کا مضحکہ اُڑاتا ہے۔ انسان کو اپنی کمزوریوں اور کم ظرفی کا احساس دلاتا ہے اور عمل کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی دنیا مطلق العنانی سے پاک ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور انسان کے درمیان سوائے ارتقا اور بلند خیالی کے دوسرا کوئی سمجھوتہ نہیں۔

وہ سفید کاغذ جو تصویر کشی اور تخلیق کا ذریعہ ہے۔ آرٹسٹ کو محبوب ہے، وہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ اپنے تخیّل سے اپنے ماضی اور روایات کو مشاہدوں میں لاتا ہے۔ غلام لڑکی اور شہزادی کو دوش بدوش دیکھتا ہے۔ مشاہدات ہی ہیں کہ اس کے سامنے صحرا اور وادیاں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ جن کو وہ پورے اعتماد سے رنگوں اور خطوں میں ڈھال دیتا ہے اور اس کی یہ سربلندی مجاہدانہ خروش کے ساتھ اس کے شعور اور ذہانت سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ رنگوں اور خطوں میں اپنے تخیّل کی تکمیل دیکھے۔ اپنے عقیدے کے مطابق اپنے شاہ کاروں میں ولولہ جذبات بھر دے۔ اس کا دماغی توازن۔ اس کا رجوع اس وقت یقیناً ہر اس حقیقت پر بھاری ہوتا ہے جو اس کی گرفت میں ہے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے لیے مواد تلاش کرے چاہے اسے کوہ و دشت۔ وادیوں اور صحراؤں سے گزر کر صدیوں پیچھے اپنی روایات کی دیکھ بھال کرکے اور ان کو ضرورت کے مطابق اپنی انفرادیت میں سمو دینا پڑے۔ سچے اور جھوٹے کی پرکھ میں اپنے اعتماد کو کام میں لانا پڑے۔ ایسی راہوں کی دیکھ بھال بھی جس سے انسانی عظمت بلند سے بلند ہو۔ اور ہم اپنے کھوئے ہوئے ذوق سے پھر مالا مال نظر آئیں اور موجودہ سیلاب کا رُخ طوفان خیز موجوں کا شور و شر پھر کبھی دکھائی نہ دے۔

مغرب کا نیا نظام نیا آدم نئی قدروں کے بل پر اپنے جینے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ کیا یہ دعویٰ اور قدریں زندگی کی کشمکش پر پوری بھی اُتر سکیں گی کیا کوئی روحانی انقلاب پیدا کر سکیں گی یا نہیں۔ اس لیے بھی کہ خود مغربیوں نے بھی اپنی موجودہ تعمیر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہی وہ مراحل اور منزلیں ہیں کہ مشرق اپنی تکمیل حیات کے لیے اپنا سرمایہ فراہم کرے۔ اپنا آرٹ اپنی عمارت تعمیر کرے۔ اپنی تخلیق کو مکان و زماں کی حصار بندی سے آزاد خود کھڑا کرے تاکہ وہ خود اور اس کا آرٹ زندہ رہ سکیں۔ یہی ایک راستہ ہے کہ مشرق ہر الجھن کو سلجھا سکے گا۔ آرٹ اپنی ضرورت کے

مطابق پیدا کر سکے گا۔ ستاروں کو چھو سکے گا۔ ان اسرار کو پا سکے گا جو زندہ قوموں کا شیوہ ہے۔

آرٹسٹ جب اپنے رنگوں اور خطوں سے اپنے جذبات کو کسی تحریک کی شکل دیتا ہے تو وہ تحریک کمال فن کا مظہر کہلاتی ہے۔ جسے عام نگاہیں اور کند ذہنیت سمجھنے اور دیکھنے سے قاصر ہیں۔ شاعر اپنی نظموں میں مصور اپنی تصویروں میں ایسے ایسے انکشافات سامنے لاتا ہے۔ ایسے مناظر اور ایسے مراحل بیان کرتا ہے جو نہ اس کے دیکھے ہوتے ہیں اور نہ اس کے اپنے بس میں ہوتے ہیں۔ اس کا خلوص بے لوث اور ولولہ انگیز ہے۔ وہ ہر اجنبیت کو اپنی انفرادیت سے روحانی اور رومانی سرمایہ بنا دیتا ہے یہ اس کی کشادہ نظری وسعت نظری کا کمال ہے۔ جب ہم ایک سیاہ فام عورت کو دیکھ پاتے ہیں تو اس کے رنگ روغن کا وہ امتیازی فرق کس طور پر ہمارے دماغوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ اور پھر جب وہی عورت وہی رنگ روپ کسی آرٹسٹ کے تخیل میں ڈھل جاتا ہے۔ تو سیاہ فام عورت اور اس کا جسم گدگدیاں پیدا کرنے لگتا ہے۔ وہ کچھ اور کا اور ہی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ فنی محاسن کا کمال ہے جس کا جواب کسی سفید قوم کے پاس بھی موجود نہیں۔

آج آرٹ کے متعلق جو لے دے جاری ہے۔ وہ اس جمالیاتی نظریہ کے تابع ہے۔ جو آج سے ہزاروں سال پہلے مصریوں نے پیدا کیا تھا اور یہ نظریہ ان دنوں آخری نظریہ تھا! اور نہ آج۔ یہ موجودہ کش مکش کسی نئی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔ جس کی تلاش جاری ہے اور جاری رہے گی۔

روایات اگر ہماری موجودہ دنیا کی متحمل نہ بھی ہوں تو آرٹسٹ بغاوت پر اتر آتا ہے۔ وہ روایات کیا وہ مذہب سے بھی بغاوت کا حامی ہے۔ وہ خود سے بھی بغاوت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ہر دور میں اقتصادی بدحالی سے اپنی فاقہ کشی سے مقابلہ کیا ہے وہ اپنے جوہروں کو اٹھانے پر کمر بستہ رہا اور اپنی تحریک کا دم بھرتا رہا اس کا جذبہ خود مختارانہ ہے، وہ زندگی کے حقوق کا ذمہ دار ہے۔ وہ دیانت دار ہے۔ اس کی پیش گوئیاں اور الہام رنگوں اور خطوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو اس کے شاہکار کہلاتے ہیں۔ اس کے عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ماضی کی تمام یادیں اُن سے وابستہ ہیں۔ اس کا جنون بنی نوع انسان کی خدمت سے کبھی محروم نہیں رہا۔

تخلیق کار نے کبھی شاعرانہ تعلی سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنے نقش و نگار اور اپنی تخلیق سے ہر دور میں پہچانا جاتا ہے، وہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کا وصف رکھتا ہے تو خود کا بھی نقاد ہے اور جب دیکھو وہ اپنے حصول میں منہمک ہے ـــ اپنی تخلیق سے زندہ اور تابندہ ہے۔ اس کی تخلیق بھی نغمے الاپتی ہے ـــ وہ ہاتھ جس نے ہمیں بنایا غیر فانی ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
آنکھ کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

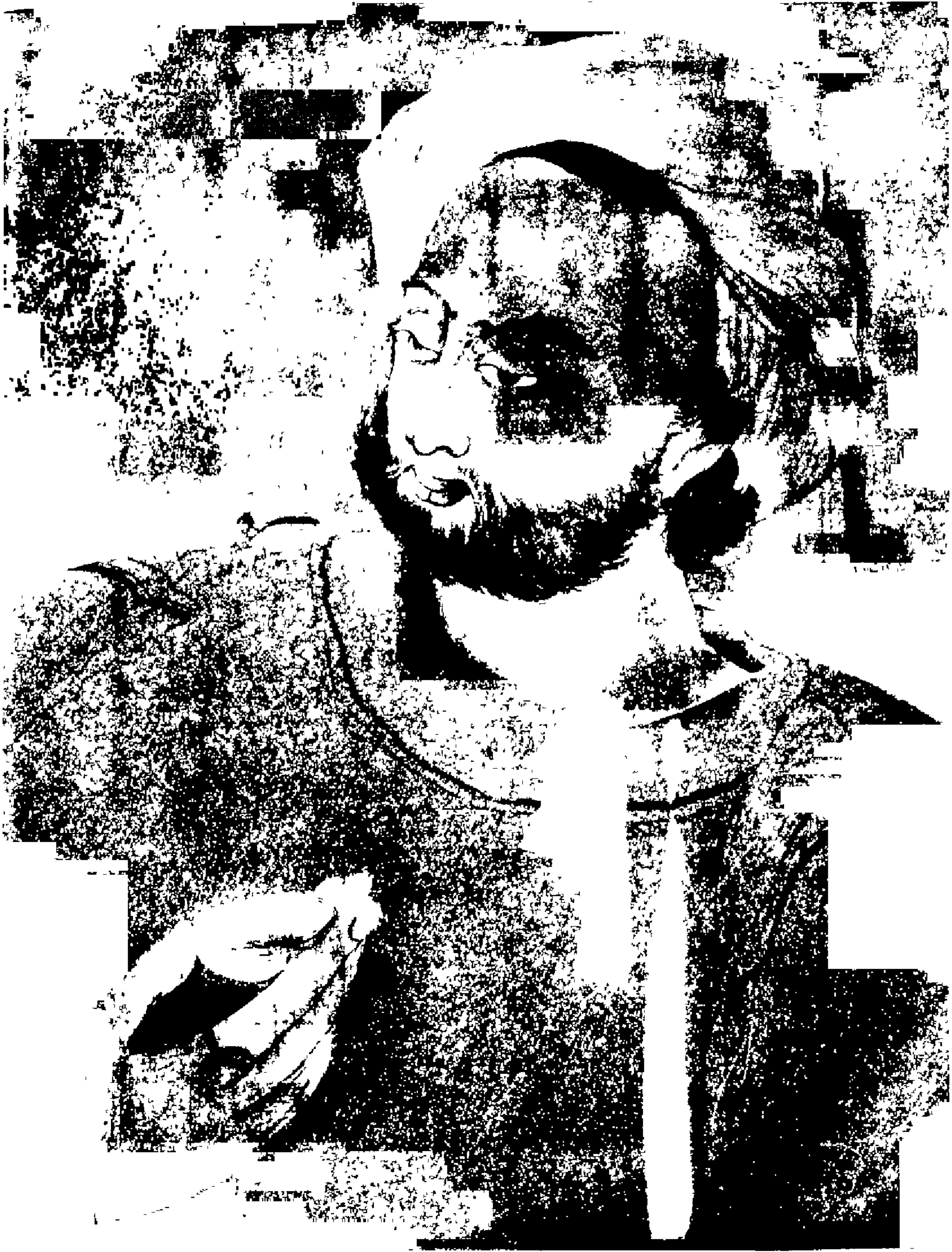

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع

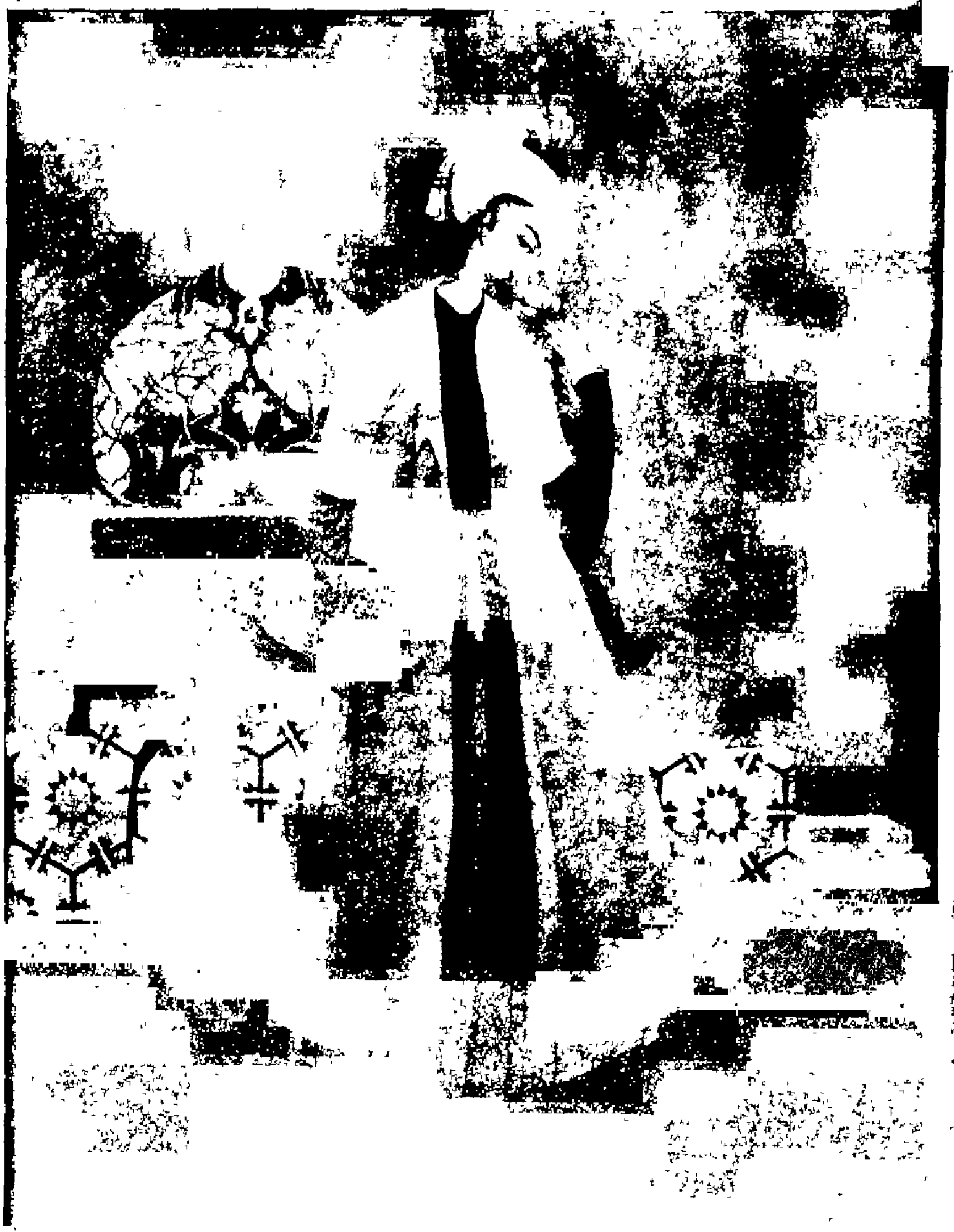

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات   عبارت کیا - اشارت کیا - ادا کیا

شاعری میں عظمتِ گناہ

ڈاکٹر اعجاز حسین

شاعری کی نفسیات پر غور کرتے وقت اس کے مزاج میں ایک ایسا عنصر بھی ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض گناہوں سے اسے خاص دلچسپی رہی ہے، ان گناہوں پر بجائے اظہارِ ندامت کے جذبۂ تفاخر و احساسِ انبساط طاری ہوتا ہے۔ اس مذاق کے اسباب تلاش کرنے میں جب ہم انسانی ذہن و شعور کی تہوں کو ٹٹولتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اپنے وجود کے ساتھ ہی متضاد خواص ساتھ لے کر آیا، خوف، شجاعت، احترام، سرکشی، اطاعت و بغاوت اور اس قسم کے ان گنت جذبات اس کے ذہن کی تشکیل میں کام آئے۔ اس کی ایک شخصیت بیک وقت کئی حیثیتوں کی نمائندہ و مظہر ہے۔ ماضی کے اس دھندلکے پر نظر ڈالیے جب وہ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، تہذیب و تمدن کی قید و بند سے آزاد تھا نہ اس کے گھر تھا نہ کھانے کا سامان، ایسی حالت میں وہ بجلی کی کڑک بادل کی گرج، ہر ایک خوفناک مظہر و عظیم منظر کے سامنے سر جھکا لیتا تھا اس کا احترام کرتا تھا کیونکہ صورتِ فرار نہ تھی، لیکن ان ہی سب آفات و واقعات میں وہ اپنے عنصر میں خوفناک سمندروں، بھیانک غاروں، سربلند پہاڑوں سے مقابلہ کرتا، ٹکر لیتا، فاتحانہ انداز سے آگے بڑھتا تھا، کبھی خوفزدہ اس سے دل، ٹھٹک بھی جاتا، کبھی قدرت سے بغاوت کر کے پہاڑ توڑتا اپنا راستہ بناتا، زندگی کے ہچکولوں میں گرتا پڑتا اس جگہ پہنچا جہاں رسائی ناممکن تھی۔

اس نے ضروریات کے سائے میں اپنے طور پر کچھ قاعدے بنائے کچھ اپنے فائدے کے لیے کچھ ساتھیوں کے۔ یہ قاعدے بنتے بگڑتے رہے۔ ہر قبیلہ اپنے فائدے اور ضرورت کے لیے دستور مرتب کر لیتا، خواہ وہ کسی کے موافق ہو یا مخالف۔ اس مخلوق نے اپنے خالق بھی بنائے۔ آسمان، زمین، آفتاب، ماہتاب، بعض درخت، کچھ جانور بھی اس کے ذہن پر جبار و قہار، رحمٰن و رحیم ہو کر مسلط ہوئے۔ غرض کہ حالی کی زبان میں ؎

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں
دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں

اس بے رنگی و بے ربطی پر پیدا کرنے والے کو رحم آگیا۔ اس نے رہنمائی کے لیے انبیا بھیجے۔ پیغمبر و ہادی دنیا میں روانہ کیے کہ اخلاق کی بنیادیں قائم کریں۔ خانہ بدوشوں کو متمدن بنائیں۔ مل جل کر رہنا سکھائیں۔ چنانچہ ان برگزیدہ ہستیوں نے

اپنے زمانے کے اعتبار سے قانون جاری کیے۔ لوگوں نے ان کی عظمت اور روحانی طاقت کا اعتراف کیا۔ ان کے فرمان کے آگے سر جھکایا مگر ہر زمانے میں ہر ہادی و پیمبر کے سب ہی معتقد نہ ہوئے۔ کچھ لوگ خلاف بھی رہے۔ انسان کے جذبے نے مخالفت و بغاوت پر بھی آمادہ کیا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے خدا اور دستور کو چھوڑنا گناہ سمجھتے رہے۔ رہنماؤں کے بتائے ہوئے راستوں کا مذاق اڑاتے رہے اور کبھی کبھی تو یہ مخالفین اپنے ہی کو خدا سمجھنے سمجھانے لگے۔ کچھ لوگ ان پر ایمان بھی لائے وہ انھیں خود ساختہ خداؤں کے جذبۂ عبودیت سے سرشار ہو کر برگزیدہ انبیاء سے جنگ کرتے رہے، موقع پا کر انھیں ہلاک بھی کر دیتے۔ غرض کہ مذہب سے انحراف و بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا رہا۔ انسان تقلید و تنقید کی دنیا آباد کرتا اپنی نوعیت و انفرادیت کا اعلان کرتا ہوا تہذیب و تمدن کی راہ طے کر رہا تھا۔ اسی میں سے کچھ خاص لوگ فن و ادب سے دلچسپی لینے لگے۔ لطافت و ذہانت، علم و شعور کی فضا میں وہ جنگ و جدل نہ رہی جو اب سے پہلے کشت و خون کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس میدان میں بجائے تلوار کے قلم سے زیادہ کام لیا گیا۔

ایک ہی مذہب کے لوگ جب اپنی مقدس کتاب کے الفاظ پر غور کرنے لگے تو تفسیر و تعبیر میں علمی اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ تنازعات کی صورت میں آنے لگے۔ تلواروں سے بھی مقابلہ ہوا اور قلم بھی خونچکاں نظر آیا۔ اسلام ہی کی مثال لے لیجیے ہر فرقہ کا ایمان قرآن شریف پر ہے۔ اس کے الہامی و ربانی کتاب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں مگر تفسیر و تعبیر میں الفاظ کے معنی اور عبارت کے مفہوم میں علمائے دین کے درمیان اتنا اختلاف ہو گیا کہ مسلمانوں کے نہ جانے کتنے فرقے ہو گئے۔ اصولِ دین میں زیادہ تر فرقے متفق الرائے رہے لیکن فروعِ دین کے اختلافات معاذ اللہ! یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی فرقے کے علماء سب جاہل و غلط گو تھے جن کی وجہ سے اختلافات رونما ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر علمائے دین صاحبِ علم و پرخلوص بزرگ تھے صرف **نظریات** و خیالات کے فرق نے کسی کو ایک راستے پر چلنے پر مائل کیا اور کسی کو دوسری طرف لے گیا۔ حسبِ استعداد و قریب قریب سبھی نے سچائی سے کام لینے کی کوشش کی لیکن مبلغ علم نے ایک ہی راستے پر چلنے کی سب کو اجازت نہ دی۔ جس کی نظر میں جو حقیقت زیادہ اہم نظر آئی اس نے اس کی تبلیغ کی فکر کی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ اسلام کس طرح پھیلا، یا اس میں رخنہ اندازی کے اسباب کیا تھے، عرض کرنا صرف یہ ہے کہ ایک ہی نبی کے ماننے والے بھی علاوہ اور باتوں کے مذہبی امور پر جھگڑتے رہے ہیں۔ منجملہ دیگر وجوہ کے اس لڑائی کی بڑی وجہ وہ خصوصیت تھی جو انسان روزِ ازل سے مختلف خواص کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ خصوصیت چاہے کتنی ہی شائستہ تہذیب ہو گئی ہو لیکن اس کا بنیادی مادّہ اب تک باقی ہے۔

اختلاف و اتفاق سے انسان کی زندگی بنی تھی، ہر شخص حسبِ ظرف ضبط و علم کی باتیں سن کر اپنی رائے قائم کرنے کا مادّہ رکھتا تھا۔ کچھ مخصوص اشخاص و صاحبِ علم و نظر بھی ان باتوں کے ماننے میں تکلّف محسوس کرتے تھے جو ان کی رائے میں صحیح نہ ہونی چاہئیں خواہ کتنے ہی پُر زور طریقہ سے کسی عالم نے پیش کی ہوں۔ یہ اندازِ فکر زبان سے گذر کر ضبطِ تحریر میں آتا رہا، شعراء و ادیب اپنے اپنے طور پر متاثر ہو کر اشعار و عبارات میں قلم بند کرتے رہے۔

شاعروں کی کاوش کو مذہب نے کبھی پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا۔ علماء، شاعروں کو گمراہ، خام خیال، ہرزہ سرا کہتے

سبب ہے، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ لوگ اپنے اظہارِ خیال میں آزاد و بے باک تھے، جذبات سے مغلوب ہو کر جو چاہتے کہہ جاتے۔ شرع و آئین کا لحاظ نہ کرتے تھے علماً اس رویہ کو خلافِ مذہب و اخلاق سمجھتے، ایک طرف تو یہ کشمکش تھی دوسری طرف تصوف نے آزاد خیالی کو اور تقویت دے دی، شاعروں کو اپنی وسیع النظری و بے باکی کے لیے ایک مذہب کی سرپرستی بھی مل گئی، وہ اپنے انوکھے خیالات کا مواد صوفیائے کرام کے اذکار و اشغال میں تلاش کر لیتے۔ تصوف کسی لحاظ سے شریعت سے ذرا الگ اپنی دنیا آباد کرنا چاہتا تھا، وہ رسوم و قیود کی پابندی اپنے حلقہ بگوشوں کے لیے ضروری نہ سمجھتا تھا، نماز روزہ کی پابندی پر سختی سے زور نہ دیتا، بلکہ ان میں سے بعض صوفیائے کرام کا کہنا تھا کہ

نمازِ عاشقاں ترکِ سجود است

تصوف کے نزدیک دیر و کعبہ، زنار و سبحہ میں کوئی فرق نہ تھا اور یہ نظریہ اہلِ شریعت کو بے حد ناگوار تھا، کم و بیش فارسی شاعری کا بھی آزاد خیالی و بے باکی میں وہی حال تھا جو عربی کا، وہاں بھی زاہد، ناصح، واعظ کا مذاق اعلانیہ اڑایا جاتا۔ متصوفیہ شاعری کی محفل میں مذہب بے رنگ اور رسوم و قیود بے معنی تھے، شعرا اپنی جرأت رندانہ پر فخر و مباہات کرتے تھے اور جو لوگ ذہنی طور پر ان سے قریب تھے، خواہ وہ شاعر یا ادیب نہ رہے ہوں مگر اس رویہ کو مستحسن سمجھ کر داد دیتے اور لطف لیتے رہے، بہ ظاہر یہ سلسلۂ خیال و جذبات نگاری ایک ایسی ادبی روایت بن گئی جو بزمِ ادب کو گرمانے کے لیے اچھا خاصا سامانِ نشاط فراہم کرتی، ان ہی ساز و سامان سے اردو شاعری نے بھی اپنی محفل سجائی۔ اردو ادب ذہنی طور پر فارسی سے بہت قریب تھا، ہیئت و مواد اس نے سب کچھ فارسی ہی سے لیا، جذبات و محسوسات میں نمایاں یگانگت رہی، شعرا کا اندازِ فکر بھی کم و بیش یکساں رہا۔ اردو کے ادیب و شاعر ابتدا میں فارسی کے اچھے عالم ہوتے، اردو کا ہر مشہور شاعر فارسی میں بھی شعر کہتا، ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ اردو شعرا فارسی والوں کی تقلید نہ کرتے، ان کی شاعری سے فائدے نہ اٹھاتے، ان کے خیالات و جذبات سے متاثر نہ ہوتے، منجملہ اور عناصر کے تصوف بھی اپنی شاعری میں وہ لائے۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر خود بھی تصوف سے متاثر تھے اس لیے اس موضوع پر خاص توجہ ہوئی۔

تصوف کی انفرادیت کی بنیاد محبت پر تھی اور غزل اپنی نشو و نما و توانائی و رعنائی کے لیے محبت ہی کو سرمایہ حیات سمجھتی تھی اس لیے بھی تصوف سے دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب کے لیے تصوف جزو لاینفک ہو گیا۔ ان لوگوں کا ذکر ہی کیا جو واقعی صوفی تھے وہ برابر اپنے اشعار میں اس موضوع پر طبع آزمائی کرتے رہے لیکن جو شعرا در حقیقت صوفی نہ تھے وہ بھی اپنے کلام میں جا بجا ایسے جذبات و خیالات لاتے جو تصوف ہی کے پروردہ ہوتے غرض کہ اس عقیدے سے وابستگی حقیقت کے علاوہ روایت بھی ہو گئی تھی ہر شاعر اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہتا خواہ تصوف سے اسے ذہنی لگاؤ ہو یا نہ ہو۔

تصوف روز بروز اپنا حلقہ اثر وسیع تر کرتا رہا اس کی گیرائی پہلے ہی سے اہلِ ظاہر کو کھل رہی تھی جب اس میں ہمہ گیری آئی تو تھا اور اہلِ ظاہر اتنا برافروختہ ہوئے کہ ان کو اسلام خطرے میں نظر آنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرح کی مخالفتیں طرفین سے شروع ہو گئیں۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اس کشمکش پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے

ہیں کہ "فقہا اور اہلِ ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے۔ ایک اہلِ باطن کے دوسرے اہلِ رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں دار پر چڑھائے گئے ہیں شکنجین بندی ہیں۔ کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلا وطن کیے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو وہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے۔ بقول شیفتہ "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا اور واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ انھوں نے ان کی قلعی کھولنی شروع کی، وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا شراب خواری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع باتیں کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا اعلانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ تم حقوقِ عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہلِ ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اس قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔"

یہاں تک پہنچ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کی شاہراہ پر نہ چلنے والے کچھ تو اس وجہ سے اپنی پرانی طرزِ عبادت نہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد سے یہ رسمِ عبودیت چلی آ رہی ہے اور کچھ اس سبب سے بھی کہ ان کی سرکشی یا ان کے لحاظ سے ان کی خودداری اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ کسی غیر کی اہمیت اتنی زیادہ مان لیں کہ اس کے فرمان پر چلنے لگیں اس کی بارگاہ میں سر جھکائیں ان کا فطری جذبہ، اختلاف و پیکار پر بھی آمادہ کر دیتا تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تصوف نے حقیقت شناسی کے بہت سے نئے دریچے کھول دیے۔ صوفیائے کرام کی دور بین نگاہوں نے ظاہری رسوم و قیود سے نکل کر اصل حقیقت کو بغیر کسی خارجی سہارے کے دیکھنا چاہا۔ اس پر اگر اہلِ ظاہر معترض ہوئے تو وہ برافروختہ ہو گئے کہ ہم لوگوں پر جن گناہوں کا اتہام ہے وہ دراصل گناہ ہی نہیں لیکن اگر یوں بھی تو اہلِ ظاہر کے گناہوں کے سامنے بے حقیقت ہیں اس لیے کہ ان کو معرفت حاصل نہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ خدا کیا ہے اس تک پہنچنا کیسے ممکن ہے۔ ہم اس کی تلاش میں سرگشتہ و حیران ہیں اس سرگشتگی و حیرانی میں اگر کچھ گناہ سرزد ہو جاتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت اس سے پوچھیے جو گناہوں کا حساب لینے والا ہے۔ ظاہر بین آنکھیں اس کی اہمیت نہیں دیکھ سکتیں۔ گویا وہ میر درد کے الفاظ میں یہ کہتے تھے کہ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہ قیاسات اس نتیجے پر پہنچا دیتے ہیں کہ بعض انسان رائے عامہ سے کیوں انحراف کرتے تھے وہ مذہبی رسوم و قیود سے بے نیازی کیوں برتتے تھے لیکن اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ گناہ پر بجائے اظہارِ ندامت کے وہ فخر و مباہات کیوں کرتے تھے۔ یہ کیوں کہتے تھے کہ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

یا اس طرح کیوں سوچتے تھے کہ ؎

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا

اس راز کو پانے کے لیے ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس طرح سوچنے اور کہنے والے اور خاص کر تصوّف سے وابستہ رہنے والے شعرا کا ذاتی خیال ایمان، گناہ اور عبادت کے بارے میں کیا تھا۔ وہ اپنی شاعری کی دنیا میں پہنچ کر اخلاق کی اعلیٰ قدروں کا معیار کیا رکھتے تھے۔ یوں تو یہ شعرا کسی خاص مذہب کے پابند تھے اور سماج میں رہ کر عبادت کے وہ رسوم بھی ادا کرتے تھے جو ان کے فرقے کے دوسرے اشخاص بجا لاتے تھے مگر جب وہ عوام و خواص سے الگ ہو کر شاعری کی فضا میں سانس لیتے تو کم از کم اتنی دیر کے لیے اپنے کو ایک دوسری شخصیت کا مالک سمجھتے ایک خاص جذب و کیف سے متاثر ہوتے تھے یہاں وہ یہ محسوس کرتے کہ عشق سے بڑھ کر کوئی شے نہیں، حصولِ عشق مقصدِ حیات ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے وفاداری کی سخت ضرورت ہے اس کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی تھی کہ کبھی کبھی اس کو ایمان کا مترادف سمجھا۔ چنانچہ مرزا غالب نے بالاعلان کہہ دیا کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے

یہ احساس ان کے ضمیر و روح کو گرما دیتا ان کی نظروں کو وہ روشنی عطا کرتا جو عام طور سے اہلِ ظاہر کو نصیب نہیں ہوتی ان کو ہر طرف عشق ہی عشق نظر آتا، کسی خاص مقام یا علامت کی قید نہ رہتی کعبہ و بت خانہ ہر جگہ وہی نور نظر آتا یہ حقیقت کوئی مفروضہ نہیں اس کا ثبوت متعدد شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً سودا کہتے ہیں ؎

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمعِ حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

وہ بت خانہ کو بھی نورِ خدا کے لیے حجاب نہیں تصور کرتے تھے کسی شے کو بھی اس کا پردہ نہیں مانتے تھے بلکہ ہر اس شے کو جو عرفِ عام میں پردہ سمجھی جاتی تھی اس کو بھی مرکزِ نور تک پہنچنے کا وسیلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ غالب نے کہہ بھی دیا ہے۔ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جب وہ اس طور سے اپنے کو راہِ عشق میں کامیاب ہوتے دیکھتے تو ان کو پھر ان کی ضرورت نہ رہ جاتی تھی کہ کسی مذہب کے رسوم و قیود یا مقررہ عبادت کی پابندی کر کے خوشنودی حاصل کریں وہ اپنے طور پر حسن یا نور سے دلچسپی لیتے اس کے تصور میں منہمک ہوتے اور اس جستجو یا انہماک کو عبادت سمجھتے خواہ وہ کسی حالت میں کسی طرح ادا ہو جائے ان کے نزدیک گناہ

صرف ایک تھا۔ کسی وقت حسن سے متاثر نہ ہونا اس کے حصول میں کوتاہی کرنا یہ سب محسوسات تھوڑی دیر کے لیے سہی، مگر متاثر ہونے والے کی روح میں اتنی بالیدگی پیدا کر دیتے تھے کہ وہ اپنی شخصیت کو ہر اس شخص سے بلند سمجھنے پر مائل ہونے جو صرف رسوم و قیود میں اُلجھ کر رہ گیا ہے جو یہ نہیں سمجھ سکا کہ روح کی غذا حسن و عشق ہے نہ کہ سبحہ و زنار کی دلچسپی یا دیر و حرم کی پاسبانی۔ ان محسوسات و نظریات کے حامل کو اہلِ ظاہر کے اعتراضات و الزامات کا وہ اثر نہیں ہو سکتا جو عام طور سے لوگوں پر ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی دھن میں منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اپنے انداز سے راہِ محبت میں قدم اُٹھاتا رہا ہے۔ زاہد، محتسب، ناصح و واعظ کی نکتہ چینیوں کو وہ سنگِ راہ سمجھ کر ٹھکراتا چلا جاتا ہے۔ اس انہماک میں اگر وہ غلطی کا مرتکب بنایا جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے یہ غلطیاں لذت کے لیے نہیں کیں بلکہ حصولِ مقصد کے لیے یہ باتیں ضروری تھیں۔ ان سے اسے توانائی، وسیع النظری اور دنیا سے بے فکری ملی۔ وہ اس طرح سوچتا ہے تب ہی تو کہتا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

وہ اپنے مقصد کے پرتو میں دیکھتا ہے کہ یہ ظاہری حالت جیسی بھی ہو زاہد و واعظ کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے وہ اس کی قدر نہیں سمجھتا وہ صرف فتوی دینا جانتا ہے دل کا ساز اور راز کے نغموں سے ناواقف ہے اس حالت یا لغزش کی قیمت صرف اہلِ نظر کو معلوم ہے اس کی قیمت خدا جانتا ہے اس لیے کہ وہ ایک بڑے مقصد کے حصول کے سلسلہ میں ہوتی ہے اور وہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو سکے بجائے خود اتنا وقیع ہے کہ جس کو عرف میں گناہ سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ بھی قابلِ قدر ہو جاتا ہے یہ احساس شاعر کو زاہد پر ہنسنے اور اپنے پر فخر محسوس کرنے پر آمادہ کرتا ہے وہ بجا طور پر سوچتا ہے کہ سالک راہِ محبت، زاہد کے موسوم کردہ گناہوں کے باوجود نفسیاتی خواہشات اور دنیاوی لذات میں اُلجھ کر نہیں رہ گیا وہ منزلِ مقصود تک پہنچا یا نہیں پہنچا مگر جہاں تک راہِ محبت میں گذرا، خلوص و استقلال کے ساتھ آئینِ محبت پر گامزن رہا اگر راہ میں کہیں لغزش بھی ہوئی ہو تو اسے لغزشِ مستانہ سمجھنا چاہیے نہ کہ زہدِ ریائی یا نفس پروری کا نمونہ۔

عظمتِ گناہ کے احساس کا راز اس تصور میں مضمر ہے جس نے شاعر سے یہ کہلایا کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" شاعر اپنے خیالات اور اپنی تخلیق کا رشتہ الہامی مدرکات سے منسلک سمجھتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی فکر ایک خاص روحانی ربط کا نتیجہ ہے اور بقول آتش؎

یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

اس احساس کے بعد اس نے فن و فکر کو مقدس و محترم سمجھا تو تعجب کیا ہے اگر یہ خیال ہوا کہ وہ اس دنیا میں ایک ایسی ہستی ہے جو عوام و خواص سے برتر ہے جس کے خیالات و اشعار کسی پیغمبر کے ارشاد کے برابر نہ سہی لیکن الہام کے قریب

ہیں، اس کی شاعری پیغمبری تو نہیں مگر جزوِ پیغمبری ضرور ہے۔ اس احساس نے اس کو ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں سے یہ نظر آیا کہ سچے شاعر کا مذہب عام مذاہب سے جدا ہے اس کی آزاد دنیا میں نزاکت، لطافت، حسن و جمال کی فرمانروائی ہے۔ رسم و رواج، سود و زیاں کے تصور کا بھی یہاں گذر نہیں، مروجہ قانون و شریعت کی پابندیاں اور لطائف اخلاقی قدریں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ بات بات پر ادنیٰ لغزش پر کفر کا فتویٰ دینے والے حقیقت امر سے ناواقف ہیں علمائے مکتبی ہمارے افعال و اعمال پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شاعری کو ہذیان اور شعراء کو غلط گو سمجھنے والا برخود غلط ہے وہ اپنے محدود علم کی فرسودہ عینک سے دل کے دریچوں اور جلوہ گاہِ حسن کو دیکھنے کی حد تک دیکھ نہیں سکتا، وہ اپنا دل و دماغ حور و جنت کے لیے وقف کر چکا اس کی طاعت بھی نمائش اور اس کا فرمان بھی دفترِ بے معنی ہے جب تک ہم ایوانِ شاعری اور دنیائے فن میں قیام پذیر نہیں ہمارے خیالات پر، ہمارے فرمودات پر اس آزاد مذہب کی چھاپ رہے گی جو ہماری مخصوص نشانی ہے۔ عام دنیا نہ ہمارا مفہوم سمجھتی ہے نہ الفاظ کے پردے اٹھا کر نفسِ مضمون کا جلوہ دیکھ سکتی ہے۔ ایسی دنیا اگر ہمارے بعض خیالات و افعال کو گناہ سمجھتی ہے تو ہم کو اپنے اس گناہ پر فخر ہے۔ ہم اس سے لطف اٹھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے، ان کا احتساب ہمارے لیے سدِ راہ کیوں ہو۔ یہی احساس افتخار و برتری اس کو آدمیوں سے کیا بعض امور میں فرشتوں اور نبیوں سے بھی اپنے کو بلند تر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ گستاخی فرشتہ بھی برداشت کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے ان کی گفتگو کو باعثِ دردِ سر سمجھ کر کہتا ہے ؎

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا (سودا)

وہ اپنے نشۂ عشق میں اتنا سرشار ہے کہ شیخ و زاہد کی انتہائی تمنا کا خواب یعنی حور کو بھی منہ نہیں لگانا چاہتا۔ ایسے ہی جذبہ کی ترجمانی اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

وہ اپنی جمالیاتی حس و سوزِ دل سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شاید اس کے ایسا راہِ محبت میں کوئی دوسرا نہ گذرا ہوگا۔ اس کے دل کی آگ جتنی بھڑک چکی ہے اور سوزِ عشق نے اس کو جو پختگی عطا کر دی ہے وہ حضرت موسیٰ کو بھی نصیب نہیں اسی لیے وہ اس برگزیدہ نبی کو بھی اس پہلو سے اپنے مقابلہ میں کمزور پا کر کہتا ہے۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
اک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا (میر)

اور ہمہ حسن سے مخاطب ہو کر نکتہ چینی کی راہ سے فرماتا ہے ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (غالب)

اس کا یہ احساسِ برتری ہی اس سے کہلاتا ہے ؎

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہونگے ؟ (مومن)

غالب کی بے نیازی کا راز اسی احساس میں پنہاں ہے جو اُن سے یہ شعر کہلاتا ہے ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

اس طرح شاعر حضرت خضر و الیاس ایسے انبیا کی اہمیت کے بعض پہلو اپنے طور پر کمزور محسوس کرتا ہے اپنی برتری کا اعلان کیا کرتا ہے۔ اگر اس اندازِ بیان و طرزِ تخیل کو کوئی شخص انبیا کی تحقیر سمجھ کر شاعر کو خاطی و گناہگار خیال کرتا ہے تو شاعر اس طرح کے سوچنے والے کی بات سن کر فخریہ انداز میں کہتا ہے ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست

ہم نے اوپر کہیں عرض کیا کہ ایک انسان کی کئی شخصیتیں ہوتی ہیں اس کلیہ سے شاعر بھی مستثنیٰ نہیں بلکہ عام انسان سے بیک وقت زیادہ شخصیتوں کا مالک ہوتا ہے چونکہ وہ زیادہ حساس و زیادہ ذہین اور زیادہ فکری صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اس لیے گوناگوں جذبات و خیالات دل و دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ ہر چیز پر مختلف زاویہ سے نظر کرتا ہے، پروازِ تخیل کی بدولت کائنات کی سیر کرتا ہوا، ہر منظر و مطالعہ سے دلچسپی لیتا، دُنیا کے بڑے بڑے لوگوں، فنون و علوم سے اپنے تصوّر میں دوچار ہوا کرتا ہے اس کا شوق بے پایاں چاہتا ہے کہ شاعر دُنیا کا سب سے عظیم و معروف فرد ہو جائے وہ علم و فضل کے لحاظ سے ہمہ دان ہو اور فنون کے اعتبار سے ہر فن کا ماہر بھی ہو۔ شاعر اپنی اس خیالی دُنیا میں ان سب مخصوص ہستیوں، علوم و فنون کو لاتا ہے جو اس کے نزدیک قابلِ قدر ہیں جو اس کے ذہن میں ایک خاص عظمت کی مالک ہیں اور پھر یہ سوچتا ہے کہ کاش میں بھی ایسا ہی عظیم شخص ہوتا اپنے جذبۂ اشتیاق کو تھوڑی دیر کے لیے حقیقت سمجھ کر وہ اپنے کو غیر معمولی انسان تصوّر کرنے لگتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی وضاحت استاد ذوق نے ایک قصیدہ میں بڑی اچھی طرح کر دی ہے ملاحظہ ہو۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے — تھا تصور میرا ہمراہ میں تصدیقِ صفت
ہو گیا علم حصولی، تھا حضوری مجھ کو — تھا مرا ذہن نہ محتاجِ حصولِ صورت
نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے، نہ تھا شکل سے کام — تھی مری فکر کو ہر شکل خطا سے عصمت
ذہن میں سب مرے حاضر صورِ علمیہ — پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیت

……

کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانند حکیم — کبھی مثلِ متکلم مجھے پاسِ ملت
کبھی کرتا تھا قدمِ چرخ کا ثابت بجہات — اور کبھی کرتا تھا باطل بسماء الشفقت
کبھی انکارِ قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل — کبھی تکرارِ تناسخ پہ مجھے سو حجت

کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم — کبھی میں کرتا تھا معلوم سے ثابت علت
کبھی میں لغو حقائق میں تھا سوفسطائی — کبھی میں معتزلی باعثِ رد رویت
کبھی میں جبری و مجبور بہ عقل و تدبیر — کبھی میں قدری و مختار بہ قدر طاقت

کبھی پیشِ نظر انجیل و زبور و توریت — کبھی مصحف میں نظر میری سر ہر آیت
کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے موبد — ژند و پاژند میں کرتے تھے میری تبعیت
کبھی یہ آگہی شاشتر و بید و پران — کر دوں ایک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

شاعر کی اس خیال آرائی کو چاہے توہم سمجھیں یا انانیت سے تعبیر کریں یا مجذوب کی بڑ خیال کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا اس طرح سوچنا اور اپنے کو سب کچھ سمجھنا غیر فطری نہ تھا ہر انسان حسبِ استعداد اس طرح کے خیالات ذہن میں لاتا ہے تاکہ اس کا ماحول بدل جائے اور واقعات کی ٹھوس حقیقت اور حادثات کی شدید تلخی جن سے آئے دن اس کا مقابلہ رہتا ہے وہ اس کی زندگی اجیرن نہ کر دیں، ان تصورات کی دل فریبی تھوڑی دیر کے لیے انسان میں امنگ پیدا کر کے اس کو مصائب و خشک واقعات سے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ شاعر جب تک تخیل کی دنیا میں رہتا ہے جذبات کا سہارا لے کر ذہن کو ہر اس نقطۂ عروج پر لے جاتا ہے جہاں بڑے سے بڑا آدمی بھی نہ پہنچ سکا ہو خواہ وہ آدمی کافر رہا ہو یا مومن تھوڑی دیر کے لیے اس نے شاعرانہ فضا میں اپنی دنیا آپ پیدا کر لی ہے۔

اس نظریہ کے لحاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر صرف تصوف و عشق ہی کی دنیا میں اپنے کو برتر نہیں سمجھتا بلکہ ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ہر معرکہ میں اپنے کو ناموروں سے بلند تر سمجھنے لگتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے — کیا بس ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

اسی قسم کا جذبہ رہا ہوگا جس نے فیضی سے کہلایا کہ —

امروز نہ شاعرم، حکیمم — دانندۂ حادث و قدیمم

ان تمام باتوں اور حقیقی شاعر کی نفسیات کا جائزہ لینے کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس جذبۂ افتخار و احساس برتری سے ادب و زندگی کو کیا فائدہ ہوا تو فی الحال ہم مفصل جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے اول تو اس لیے کہ یہ بحث بھی کافی طوالت کا باعث ہوگی اور دوسرے موجودہ موضوع سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں معلوم ہوتا لیکن مختصر طور سے یہ عرض کر دینا شاید بیجا نہ ہوگا کہ شاعر کے اس رویہ سے انسان کی وہ اہمیت سامنے آجاتی ہے جو اور طریقہ سے ممکن

نہ تھی اپنے اور اپنے اعمال پر غیر معمولی اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ راہِ حق میں کسی بھی بڑی سے بڑی ہستی سے بھی مرعوب ہونا غلط ہے۔ دوسرا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ اس اندازِ فکر سے وہ غلطیاں کم ہو گئیں جو مذہب کے اجارہ دار اپنے طور پر دنیا والوں پر عائد کرنا چاہتے تھے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ دنیا میں آزادیِ خیال کی جگہ ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی دکھائی دیئے جو اپنے دل اور دماغ سے کام لیتے ہیں، کورانہ تقلید کو گناہ سمجھتے ہیں وہ نہ واعظ کے فتووں سے ڈرتے ہیں نہ دار و رسن کی آزمائش سے۔ آج ساری جیتی جاگتی دنیا کو اس اختلاط و ارتباط کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مذاہب ایک دوسرے کے قریب آ جائیں چنانچہ بین الاقوامی سطح پر اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ ان پہلوؤں کو تلاش کیا جائے جو ایک مذہب سے دوسرے کو قریب کر دیں تاکہ یک جہتی زیادہ ہو سکے اپنے شعرا کے زیرِ بحث کارنامے کو دیکھ کر ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس بات کی دنیا کو اب جستجو ہے وہ ہمارے شاعر بہت پہلے پیش کر چکے ہیں۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ یہ جذبۂ افتخار و احساسِ برتری کی حقیقت ایک روایت بن گئی ہے جس کو بغیر سوچے سمجھے عام شعرا نے تفریحِ طبع کے لیے اختیار کر لیا۔ یہ احساس صرف سچے اور بڑے شاعروں کے دل و دماغ پر اثر انداز تھا ورنہ عام شعرا کا اس راز کو پانا ان کی دسترس سے باہر تھا وہ صرف اس لیے اس طرح لکھتے رہے کہ بزرگوں سے یہ بات چلی آئی ہے اور کچھ غیر شاعروں نے بھی ان خیالات کو سراہا۔ اس قسم کے اشعار ان شاعروں کے یہاں زیادہ تر زیبِ داستاں کے طور پر آتے رہے ہیں جیسے مے خواری کا ذکر ہر شاعر کرتا آیا ہے خواہ اس نے کبھی شراب چکھی بھی نہ ہو، شد و مد سے اظہارِ عشق کرتا رہا ہے حالانکہ اس کے دل کو ٹٹولا جائے تو کسی گوشہ میں دردِ محبت کا پتہ نہ چلے گا۔ بالکل اسی طرح کافی تعداد اپنے شعرا کی ہے جو بغیر مطالعہ و علم کے ان موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے ورنہ اس سے انکار نہیں کہ یہ محسوسات بڑے علم و خاص حقیقت و انکشاف پر مبنی تھے۔

قومی یکجہتی کا مسئلہ

[انٹرویو]

فراق گورکھپوری

شوق: فراق صاحب! قومی اتحاد اور یکجہتی کا چرچا وزیراعظم سے لے کر تمام سربرآوردہ ہستیاں کر رہی ہیں اور اخباروں میں بھی اس کا چرچا بہت ہو رہا ہے۔ اس مسئلے پر آپ قدرے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

فراق: ۔ قومی یکجہتی کا مسئلہ نیم شعوری طور پر اُسی زمانے سے ہندوستان کے حساس دماغوں میں رہا ہے جب سے ہم آزادی کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ ہزارہا برسوں سے اس حقیقت کو محسوس کیا گیا ہے کہ باشندگانِ ہند کی وحدت ایک کثرت نما وحدت (DIVERGENT UNITY) ہے۔ اب سے نصف صدی پہلے رادھا کمار مکرجی کی کتاب THE FUNDAMENTAL UNITY OF INDIA یعنی "ہند کی بنیادی وحدت" شائع ہوئی تھی جسے میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بہت غور اور اشتیاق سے پڑھا تھا اور جس کا مستقل اثر میرے فکر و احساس پر پڑا۔ ہندوستان میں خود ہندو سماج جس کی اتنی بڑی اکثریت ہے متحد بھی ہے اور منقسم بھی۔ زبان کے لحاظ سے، کھانے پینے پہننے کے لحاظ سے، رہنے سہنے کے لحاظ سے، ذہنیت کے لحاظ سے، کردار کے لحاظ سے، گھریلو اور سماجی زندگی کے داخلی اور خارجی مظاہروں اور محرکات کے لحاظ سے، حرکات و سکنات کے لحاظ سے، چال ڈھال کے لحاظ سے، جسمی ساخت و خد و خال کے لحاظ سے ہندو قوم یا ہندو سماج کئی چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹا ہوا ہے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک یا سماج ہو جس میں اتنی بڑی تعداد میں مختلف نسلیں اور ان کی اولادیں شامل ہوں۔ ہماری تاریخ و تہذیب کا یہ قابلِ قدر کارنامہ ہے کہ اتنے متنوع اور مختلف المزاج گروہوں کو کچھ بنیادی عقاید اور نظریے دے کر، سنسکرت ادب اور سنسکرت ادب سے پیدا ہونے والے عوامی زبانوں کے ادب کا مشترک ورثہ دے کر فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، رقص، بت گری، فنِ تعمیر، مصوری، رامائن اور مہابھارت کی ہمہ گیر روایتیں دے کر، بہت سے مشترکہ اخلاقی اور جذباتی خالص ہندوستانی آدرش دے کر، تہواروں، تیرتھ ستھانوں، اور ایک بہت بڑی تعداد میں عام رسوم دے کر، کائنات اور فطری مناظر سے ایک خاص خارجی اور داخلی تعلق پیدا کرکے ہماری تہذیب و تاریخ نے کثرت میں وحدت پیدا کر لی۔ یہ تمام چیزیں متحدہ قومیت کی تخلیق و تعمیر

(NATION BUILDING) میں خاص اہمیت کی حامل رہی ہیں۔

لیکن جتنی منضبط اور دور رس اور ہمہ گیر یہ تاریخی قوتیں رہی ہیں قریب قریب اتنی ہی اور کبھی کبھی اس سے زیادہ طاقتور مختلف نسلیت، مختلف خطوں یا جغرافیائی ماحول، مختلف ذات پات، مختلف زبانوں سے پیدا ہونے والی وہ قوتیں رہی ہیں جو ہماری قومی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خطرہ بن کر ہماری تاریخ کے لیے یا ہمارے سماج کے لیے ایک چیلنج کا کام کرتی رہی ہیں اور ہمارے قومی شعور یکجہتی میں انتشار پیدا کر کے تعمیری تحریکات کے خلاف تخریبی محرکات کا رول ادا کرتی رہی ہیں۔ ہم ۳۵ کروڑ ہندو اپنے کو ہندو کم سمجھتے رہے ہیں بلکہ بنگالی، آسامی، اڑیا، بہاری، پنجابی، مرہٹی، گجراتی سندھی، کنٹرا، تامل اور تیلگو زیادہ سمجھتے رہے ہیں۔ پھر تقسیم در تقسیم کے محرکات ہمیں اپنے آپ کو ہندو سمجھنے کے بجائے برہمن، چھتری، ویش، کائستھ، کھتری، بھومی ہار، اور سینکڑوں دیگر ذات پات کے افراد ماننے اور سمجھنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ ہماری متحدہ قومیت کی مٹی جگہ جگہ سے چٹخ کر رہ جاتی ہے اسی کو انگریز FISSIPEROUS TENDENCY یعنی اپنے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے یا جا بجا سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جانے کے محرکات بتاتے رہے ہیں۔

آزادی اور جمہوریت نے ہزارہا نئے موقعے، ملازمتیں، عہدے ہم ہندوستانیوں کے لیے کھول دیئے ہیں۔ آئے دن ایسی باتوں کے چرچے ہوتے رہتے ہیں کہ بنگالی بنگالیوں کو، پنجابی پنجابیوں کو، شمالی ہند والے شمالی ہندوستانیوں کو، برہمن برہمنوں کو، بنیئے بنیوں کو، کائستھ کائستھوں کو اور دیگر ذات پات والے اپنے ذات پات والوں کو ملازمتیں دیتے یا دلاتے رہتے ہیں۔ اس بات پر بہت زیادہ واویلا مچانے کی ضرورت نہیں اور یہ لعنت اسی وقت دور ہو گی جب تعلیم ملازمت اور روزگار حاصل کرنے کے موقعے ہر ہندوستانی کے لیے پیدا ہو جائیں۔ افلاس اور بے روزگاری جب تک اس ملک پر مسلط ہیں اور جب تک اتنی ملازمتیں اور اتنے روزگار پیدا نہیں ہو جاتے کہ ہر آدمی باکار اور باروزگار ہو جائے اس وقت تک فرقہ پرستی، صوبہ پرستی اور خویش پروری کی افسوسناک صورتِ حال کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کو انگریزی میں LAW OF UNIFORM DEVELOPMENT کہتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا مل کر ایک سماج بننا تو دور رہا خود ہندوؤں میں باہمی یکجہتی اور اتحاد و آہنگی، افلاس و بے روزگاری کے ہوتے ہوئے پیدا نہ ہو سکے گی۔ محض جذبات اور نعروں کی بنا پر، ہندو تمدن اور ہندو کلچر کی بنا پر، ہندوؤں میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہندوستان کو بار بار ایک نیشن کہنے سے ہندو مسلمانوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے گی۔ اگر ہندوستان کا ہر گھرانہ خوشحال ہوتا تو ملک کے دو ٹکڑے نہ ہوتے اور نہ صوبوں اور ریاستوں کو بنانے میں کشت و خون غصہ اور نفرت اور لوٹ مار کا المیہ درپیش ہوتا اور اب بھی درپیش ہے۔ خوشحالی محض مادی بہبودی کے لیے لازمی نہیں ہے بلکہ نفسیاتی اور جذباتی ہم آہنگی اور اتحاد کے لیے بھی لازمی ہے۔

ایک اور بات کا خیال آیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں اور خطوں اور جواروں کی غذائیں بہت مختلف ہیں۔ کہیں چاول نہیں کھایا جاتا صرف روٹیاں کھائی جاتی ہیں۔ کہیں روٹیاں نہیں کھائی جاتیں صرف چاول کھایا جاتا ہے۔ سبزیاں بھی مختلف مذاقوں کے مطابق بنتی ہیں۔ ہماری غذاؤں میں کوئی یکسانیت نہیں۔ یہ اختلاف سرے سے تو مٹایا نہیں جا سکتا لیکن

ہر گھر کے لیے کم یہ تعلیم دی جاسکتی ہے کہ اگر دوسرے صوبوں یا ریاستوں سے کوئی مہمان آئے تو اس بات کی پوری پوری کوشش کی جائے کہ دو ایک چیزیں اُسے کھانے پر ایسی ضرور ملیں جو اُس کے معمولاتِ زندگی میں شامل ہوں۔ اسی طرح پوشاک اور پہناوے میں بھی کافی یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔

ملک میں ہم سب کو سکول یا کالج کی بلند ترین تعلیم نہیں مل سکتی۔ لیکن ایک کام ہو سکتا ہے تقریباً ایک سو کل ہند قسم کے سکول اور کالج کھولے جاسکتے ہیں جہاں دس گیارہ برس کی عمر سے ہی ہونہار طالب علم ہر صوبے کے ساتھ ساتھ رہیں اور پڑھیں اور ان کے سرکاری وظیفے مقرر ہوں تاکہ اِن سو مرکزوں میں چھوٹے درجوں سے بی اے اور ایم اے تک ہندوستان کے مختلف حصوں کے بچے اور نوجوان ۱۲-۱۳ برس تک ساتھ رہیں اور تعلیم حاصل کریں اور انگریزی زبان اور ہندوستانی زبان سبھی سیکھ سکیں۔ غذا اور پوشاک میں یکسانیت پیدا کرنے کے موقعے حاصل کرسکیں اور جب فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان کے کسی حصے میں بسیں تو وہاں اپنے آپ کو اجنبی نہ محسوس کریں۔

ہم بھارت یا ہندوستان میں بسے ہوئے ہیں یا رہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ زندہ اور اہم حقیقت یہ ہوگی کہ ہم ۳۵ - ۴۰ کروڑ ہندوستانیوں میں ہر ایک ہندوستانی کے شعور میں پورا ہندوستان یا بھارت بس جائے اور رہنے لگے ہمیں ہندوستان کو اپنے اندر بسانا ہے جب ہندوستان ہمارے لہو میں رچ اُٹھے گا تبھی متحدہ قومیت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا ہندو سماج کے جذباتی اور فطری طور پر یا نفسیاتی طور پر یا عملی طور پر متحد ہونے کی راہ میں تحت القومیت، نسلیت، زبان، ذات پات اور ورن آشرم کی وہ طاقتیں کارگر رہی ہیں جو کسی ملک کے باشندوں کو قابلِ اطمینان حد تک اور مستقل طور پر متحد ہونے ہی نہ دیں گی۔ ہمارے قومی اتحاد کا دشمن ہمارے اندر ہی چھپا ہوا ہے۔ تخریب و تقسیم کی اور انتشار پیدا کرنے والی بلکہ باہمی تضاد و تصادم پیدا کرنے والی اِن طاقتوں کو مٹانا بہت اہم اور بہت بڑا کام ہے۔

پہلے ہندو سماج میں ایسی مضبوط تحریکوں کو کارگر بنانا ہے جو ہندو سماج کو زندہ اور ہمہ گیر طریقے پر متحد کرے اور ایسی طاقتوں کو کارگر بنانا ہے جو ہندو مسلمان سکھ (میں سکھوں کو ہندو سمجھتا ہوں) بدھسٹ عیسائی اور لامذہب اور آزاد خیال ہندوستانیوں میں ایک مشترکہ اور متحد قومیت کا اٹل جذبہ پیدا کردیں کسی غیر یا دشمن سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ آپس میں متحد ہو کر رہنے کے لیے۔

شوق :- اس کام کو انجام دینے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ کی تجویزیں کیا ہیں؟

فراق :- اِس مقصد کا حصول اور اُس کی تکمیل تدریجی طور پر ہی ممکن ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی آبادی کو اگلے سو برس تک اتنا ہی مان لیں جتنی آج ہے تو پہلا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ غربت و افلاس کو سرے سے مٹا دینا ہوگا۔ جب تک ہر خاندان خوشحال نہ ہوگا قومی یکجہتی حقیقی معنوں میں پیدا نہ ہوگی۔ محض مذہب کی بنا پر، زبان کی بنا پر، ادب کی بنا پر محض رسوم و رواج کی مدد سے قومی یکجہتی کی بنیادیں ٹھوس نہ ہوں گی۔ آج جو قیمتیں رائج ہیں اُن کے حساب سے ہر پانچ چھ مرد عورتوں بچے بچیوں کے ایک گھر یا خاندان کی آمدنی اندازاً چھ سات سو روپیہ ماہانہ ہونی چاہئیں۔ بڑی حد تک ہمارے سماج کو ایک ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ایک اشتراکی سماج کے سانچے میں ڈھلنا ہے۔ افلاس بیکاری و بے روزگاری جہالت ناخواندگی، زندگی

میں رس اور رنگ کا فقدان، ایک ویران اور اُجڑی ہوئی حالت، اقتصادی اور دیگر تردد اور فکریں جسمانی کمزوری اور سینکڑوں بیماریاں، اِن سب کو جڑ سے مٹانا پڑے گا۔ ایسا ہو جانے پر ہی روحانیت کی قدریں، علم و ادب کی دولت، فنونِ لطیفہ سے حاصل ہونے والی خیر و برکت پوری قوم کے ہاتھ لگے گی اور یہ برکتیں اور سعادتیں یکجہتی پیدا کر سکیں گی۔

خوشحالی و تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب اور فنونِ لطیفہ قومی یکجہتی کو محکم بنانے میں بہت بڑا حصہ لیں گے۔ پہلے ویدوں کے وقت سے شروع ہو کر ہزارہا سال تک ہماری زندگی اور تاریخ نے جو ادب پایا ہے، علوم و فنون کی دولت اور زندگی کی قدریں ہمیں دی ہیں ان سب کو تمام ہندو اور پھر تمام ہندوؤں مسلمانوں اور غیر ہندوؤں کا زندہ شکل میں ایک مشترکہ ورثہ بنانا ہے۔ پھر بودھ دھرم اور بدھسٹ دَور کے تہذیبی ورثہ کو تمام ہندوؤں مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں کا تہذیبی ورثہ بنانا ہے۔ مسلم دَور اور اسلام کی تہذیبی دین کو اور زندگی کی قدروں میں جو ترمیم اور اضافے مسلم دَور نے کیے اُسے بھی زندہ شکل میں ہندو مسلمان اور تمام دوسرے ہندوستانیوں کا تہذیبی ورثہ بننا ہے اور پھر انگریزوں کے آنے کے بعد یوروپ اور امریکہ جو کئی لحاظ سے دُنیا بھر کے لیے تمدن و تہذیب کی نمائندگی کرتے رہے ہیں اُسے بھی ہمیں اپنی تہذیبی وراثت بنا لینا ہے اور دنیا کے ساتھ مل کر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔

جب ہم قومی زندگی کے اتحاد اور یکجہتی و ہم آہنگی کی بات اُٹھاتے ہیں تو جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم پہلے آدمی تو بن لیں ہم جس طرح پھٹے حالوں جی رہے ہیں اس حالت کو تو دُور کر لیں پچانوے فیصدی ہندوستانیوں کی زندگی کی بے سر و سامانی تو دُور کر لیں۔ مادی، دماغی، جذباتی، اخلاقی طور پر ہماری زندگی بھرپور تو بن جائے۔ ہر ہندوستانی کی زندگی میں ایک اتحاد، یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے تب قومی یکجہتی کی باری آئے گی۔ اس سلسلہ میں تیس چالیس برس سے میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ دیہاتوں کو ہندوستان بھر سے مٹا دینا ہے اور ان کی جگہ بڑی شہر اور قصبے بسانا ہے۔ ہندوستان کے پانچ لاکھ گاؤں کو توڑ کر اور ملا کر اسّی نوّے ہزار بلکہ صرف پچاس ساٹھ ہزار زراعتی شہروں اور قصبوں میں تبدیل کر دینا ہے ہمیں فاصلوں کو مٹانا ہے اور وہ صورتِ حال پیدا کرنا ہے کہ ہندوستان کے کسی ایک سرے سے دوسرے سرے تک، کسی ایک شہر یا قصبے سے کسی دوسرے شہر یا قصبے تک ایک گھر سے ہندوستان میں بسے ہوئے اور بکھرے ہوئے کسی دوسرے گھر تک پہنچنے میں آرام سے سفر کر کے زیادہ سے زیادہ ۳۵ - ۴۰ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ ہندوستان کی ہر زبان اور اس کے ادب کو محفوظ بنا کے اور اُسے ترقی کے پورے پورے موقعے دے کر ایک نرم اور سہل ہندوستانی زبان کی ترویج و توسیع قومی یکجہتی کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ ہندوستانی اُردو اور ہندی کا سنگم ہو لیکن اس ملک کے کسی روشن مستقبل کا تصور ہم نہیں کر سکتے اگر کم از کم دو فیصدی افراد سارے ہندوستان میں اچھی طرح انگریزی زبان کی مناسب تعلیم حاصل نہ کر لیں یعنی عوامی سطح پر عوامی یکجہتی اور اتحاد ہندوستانی زبان کے ذریعہ ہو گی جسے ہم چاہیں تو ہندی کہیں لیکن خواص کی سطح پر یا بلند ترین تعلیمی سطح پر یہ ہم آہنگی اور یکجہتی انگریزی زبان کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

ہاں تو پہلے ہمیں ہندو سماج میں جو باہمی اجنبیت و مغائرت کے خلا اور خلیج حائل رہے ہیں انھیں سب ہندوؤں

کو خوشحال اور تعلیم یافتہ بنا کر پاٹتا ہے اور اس کے بعد بھی ملک اس کے ساتھ ساتھ ہی انھیں ذرائع اور ترکیبوں سے اُس خلا اور خلیج کو بھی پاٹتا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں میں حائل رہی ہیں۔ عام بدحالی نے مذہبی اختلاف کو ہمارے لیے ایک لعنت بنا دیا ہے۔ مختلف مذہبوں اور ملتوں نے اس لیے نہیں ہمارے سماج کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے ہیں کہ وہ مختلف مذہب و ملت ہیں بلکہ بدحالی کی وجہ سے اور زندگی کے انحطاط کی وجہ سے ؎

رکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

اس رکاوٹ کو مٹاتا ہے۔ زندگی کے سرچشموں کو آزادی سے بہنے دیتا ہے۔ اسی رکاوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف مذہب و ملت کے لوگوں میں اور ان کی زندگی میں سینکڑوں خارجی اور داخلی بے ضرورت اینٹھنیں پیدا ہو گئی ہیں اور گرہیں پڑ گئی ہیں۔ ہمیں ایک مشترکہ ادب کی ضرورت ہے۔ رامائن، مہابھارت، گیتا اور سنسکرت ادب کے بہت سے دوسرے شہ پاروں اور شہکاروں کو ہر ہندوستانی کی وراثت بنا دیتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں کا تعلق ہے انھیں یہ یقین دلا دیتا ہے کہ سنسکرت ادب کے ترجموں اور تالیفوں کو اپنانے سے اُن کا اسلام، اُن کا عیسائی دھرم یا جو کوئی اور مذہب انھوں نے اپنا رکھا ہے وہ کمزور نہیں پڑے گا۔ بلکہ اور مالا مال ہو جائے گا ؎

حسد سے دل اگر فسردہ ہے گھر میں تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

جس طرح بھارت کی دھرتی، یہاں کے دریا پہاڑ، یہاں کے موسم، یہاں کے پھل اور اناج، یہاں کی موسیقی اور یہاں کی دیگر تمام چیزوں پر مسلمانوں کا اور دیگر غیر ہندوؤں کا اُتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہندوؤں کا ہے۔ اُسی طرح یہاں کے ادب یہاں کے دیگر فنونِ لطیفہ اور یہاں کے تمام تہذیبی ورثہ پر مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہندوؤں کا۔ اور ان برکتوں اور اقدار کا جو جتنا اور جیسا حق ہندوؤں پر ہے اُن برکتوں اور اقدار کا وہی اُتنا اور ویسا ہی حق مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں پر ہے۔ ہندوستانی ہونے کے معنی بہت بڑے ہیں۔ ایک ہندوستانی شہری کے جو سیاسی اور سماجی حقوق ہیں اُن سے کہیں زیادہ بڑے معانی حقیقی معنوں میں ہندوستانی ہونے کے ہیں۔

اب وہ زمانہ گزر چکا ہے کہ ہم اُن محدود اور کئی لحاظ سے خطرناک معنوں میں ایک قوم بنیں جن معنوں میں انگریز، فرانسیسی، جرمن، امریکی، جاپانی اور دیگر ممالک کے باشندے ایک قوم یا ایک نیشن کہلاتے ہیں۔ آج ہندوستان یا کسی ملک میں حقیقی اور صحت مند معنوں میں اُس وقت تک ہم ایک قوم یا نیشن نہیں بن سکتے جب تک کرۂ ارض پر بسی ہوئی انسانیت کی اکھنڈ وحدت کا زندہ احساس ہمیں نہ ہو۔ شاعرِ اعظم ٹیگور نے ہمیں اتنی زیادہ اور کثیر التعداد باتیں سکھائی ہیں کہ ہم بسا اوقات یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا مرکزی اور اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے بنی نوعِ انسان کی وحدت کی تعلیم ہمیں دی ہے۔ لیکن ہمارے لیے ہماری بدحالی نے انسانیت کا درک و شعور اور انسان کی وحدت کا درک و شعور ناممکن بنا رکھا ہے۔ ع

فرصت کسے کہ تیری تمنا کرے کوئی

میں نے جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے انھیں ایک خوابِ زریں سے ٹھوس حقیقت میں منتقل کرنے کے لیے قریب قریب نصف صدی کا زمانہ درکار ہے اور نصف صدی بعد بھی اسی حالت میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جب ابھی سے وسیع پیمانے پر اور منظم طریقے پر قومی اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کا کام شروع کر دیا جائے اور اسے سرگرمی اور روشن خیالی کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ کسی مسئلہ کی پیچیدگی کو سمجھ لینا اسے سلجھانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ معاملہ محض یہ فرض کر کے کہ ہندو تو متحد ہیں ہی صرف مسلمانوں میں حب الوطنی اور یکجہتی کا جذبہ پیدا کرا کے اور ہندو تہذیب کے اقدار کو ان سے منوا کر ملکی قومی یکجہتی پیدا کی جا سکتی ہے نہیں سلجھایا جا سکتا۔ اکثریت یا حکومت کی طرف سے حکم لگا کر یا احکام جاری کر کے یا زبردستی کر کے یا کسی طرح دباؤ ڈال کر ہندو مسلمانوں میں یکجہتی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک تدریجی اور ارتقائی نشو و نما کا معاملہ ہے اسے کن فیکون کا سا معاملہ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ بلکہ جیسا اقبال نے کہا ہے یہ کن فیکون ایک مسلسل کن فیکون ہے۔ ہندوستان کو کائنات سمجھ کر ہم اقبال ہی کا یہ شعر دوہرائیں گے۔ ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

آخر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ایک قومیت اور قومی اتحاد اور یکجہتی کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا ہے وہ گذشتہ صدی دو صدی کے نظریہ و تصور قومیت سے بڑا نظریہ و تصور ہے اور اس سے کہیں زیادہ خیر و برکت کا حامل ہے کاش یہاں کے ہندو اور مسلمان اس کو سمجھنے کہ قومیت کے اسی نظریہ و تصور کو دنیا بھر میں کامیاب بنانے کے لیے ہمارے وزیر اعظم آج سب سے بڑا تاریخی فرض انجام دے رہے ہیں۔ وہ شعور و تصور انسانیت کے بڑے خاکے میں ہندوستان کی قومی یکجہتی اور اتحاد کو ایک زندہ حقیقت بنانا چاہتے ہیں۔

(نگارندہ، سمت پرکاش شوق)

رنگین کی تصانیف

عبدالقادر سروری

سعادت یار خاں رنگین کثیر التعداد تصانیف کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف کا ٹھیک طور سے اندازہ لگانا آسان کام نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف کو مجموعوں میں بانٹنے اور انھیں نئے نئے ناموں سے موسوم کرنے کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے چار دواوین کو انفرادی طور پر دیوان ریختہ، دیوان بیختہ، دیوان آمیختہ اور دیوان انگیختہ کے علحدہ علحدہ نام دیے تھے، پھر ان چاروں دیوانوں کو ملا کر ایک مجموعی نام "چہار عنصر رنگین" سے موسوم کیا تھا۔ اس میں اپنے فارسی دیوان "حدیقۂ رنگین" کو شامل کر کے ایک نیا نام "خمسۂ رنگین" دیا۔ اس کے بعد اپنی مثنوی کو "مجموعۂ رنگین" جس میں کئی زبانوں کے اشعار شامل ہیں، ملا کر مجموعے کو ایک اور نئے نام "شش جہت رنگین" سے موسوم کیا۔ "خمسۂ رنگین" اُن کے چار اُردو اور ایک فارسی دیوان کے مجموعے کا نام تھا، اس کے علاوہ یہی نام انھوں نے اپنی پانچ مثنویوں، جنگ نامہ، حکایات رنگین، نصاب ترکی[1] (نصاب رنگین[2]) نسخہ بطرز مولوی روم اور حکایات رنگین کے مجموعے کو بھی "خمسۂ رنگین" کے نام سے موسوم کیا تھا[3]۔ اس طرح سے نئی تصانیف کو پرانے مجموعوں کے ساتھ شامل کر کے وہ نئے نئے نام دیتے تھے۔ بعض ناموں میں توارد یا اختلاف بھی ہے[4]۔ اس صورت حال کے پیش نظر ان کی تصانیف کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا، ایک پیچیدہ حسابی عمل معلوم ہوتا ہے، جس میں جمع، تفریق سب کچھ شامل ہے۔

رنگین کی تصانیف کی فہرست ہم کو ایک تو بلوم ہارٹ کے کیٹلاگ میں ملتی ہے[5]۔ ان کی تعداد مجموعوں کو ملا کر (۳۲) ہے[6]۔ ان میں کچھ تکرارات شامل ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے "مجالس رنگین" کے مقدمہ میں، بلوم ہارٹ کی بنیاد پر جو فہرست تصنیفات رنگین کی دی ہے، اس میں (۳۱) شامل ہیں[7]۔ رنگین کی تصانیف کی غالباً ایک مکمل فہرست ہم کو "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ملتی ہے۔ اس فہرست کے مطابق رنگین کی چھ تصانیف کی تعداد (۵۰) ہے[8]۔ اس میں صفحہ ۳۰۷ تا ۳۱۰ پر گنائی ہوئی ساری تصانیف شامل ہیں

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص۳۰۹ [2] مجالس رنگین، دیباچہ ص۱۶ [3] دبستان ص۳۰۹ [4] ایضاً

[5] ملاحظہ ہو "اے کیٹلاگ آف ہندستانی مینو سکرپٹس ان انڈیا آفس لائبریری" صفحات ۹۴ تا ۱۱۴

[6] ص۱۷۹ تا ص۲۱۱ [7] مجالس رنگین، مقدمہ ص۱۶ [8] دبستان ص۳۰۷ تا ۳۱۰

ان کے علاوہ ایک اور تصنیف "حکایت مکالمہ فرعون وشیطان" بھی شامل ہے، جس کا تذکرہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے صفحہ ۳۵۶ پر کیا ہے۔ رنگین کی بعض اور تصانیف کے عنوان کے تحت انھوں نے "مجموعہ رنگین" اور امتحان رنگیں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں تصانیف صفحہ ۳۰۷ تا ۳۱۰ کی فہرست میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے ان تصانیف پر فرداً فرداً بحث نہیں کی ہے بلکہ صرف چند پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1] "ایک دیوان ریختی، فارسی نثر میں "مجالس رنگیں" "فرس نامہ" کے علاوہ رنگین کا مطبوعہ کلام بالکل نایاب ہے[2] لیکن انھوں نے مطبوعہ تصانیف کی فہرست لکھنی ضروری نہیں جانی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذہن سے بھی یہ چیزیں رہ گئی حالانکہ ان کی نظر ایسی باتوں پر گہری پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب علمی دنیا کے سامنے رنگین کی مطبوعہ تصانیف کی تفصیل موجود نہیں ہے۔

رنگین کی تصانیف کے مخطوطات کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں کہ "ان کی تعداد خاصی ہے[3]" رنگین کی تصانیف کی مقبولیت عام کے مدنظر یہ ہونا بھی چاہئے لیکن جہاں تک میری تلاش کا تعلق ہے، انڈیا آفس کے علاوہ رنگین کی تصانیف کی جو تعداد ہم کو مختلف کتب خانوں میں اور خاص طور ان کتب خانوں میں ملتی ہے، جن کی فہرستیں طبع ہو چکی ہیں، وہ محدود ہے۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد میں دو نسخے "فرس نامہ[4]" کے ہیں اور ایک نسخہ "رنگین نامہ[5]" کا جو "سبعہ سیارہ رنگین" کا حصہ چہارم ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد میں بھی "فرس نامہ" کے دو نسخے ہیں[6] اور ایک نسخہ دیوان ریختی کا[7] (دیوان انگیختہ)۔

ان حالات میں کتب خانہ انڈیا آفس کے بعد مجلس تحقیقات اُردو، حیدرآباد میں سب سے زیادہ تعداد تصانیف رنگین کے مخطوطات کی موجود ہے۔ ان میں سے بعض بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مصنف کی زندگی میں لکھے گئے ہیں اور انڈیا آفس کے مخزونہ رنگین کے دستخطی مخطوطوں سے پہلے کے مکتوبہ ہیں۔ زیادہ تر نسخے حق وردی بیگ خاں بہادر کی فرمائش پر لکھے گئے تھے، اور یہ ایک ہی رسم خط میں، ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

ان مخطوطات کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے، تاکہ یہ معلومات اردو کے طلبا اور محققین کی دسترس میں آجائے اور تحقیقی کام کرنے والوں کی اس سے رہبری ہو سکے :۔

(۱) گلدستہ رنگین[8]

تقطیع ۱۰¾ × ۶½ ۔ اوراق ۲۳، سطور ۱۳، کاغذ دیسی قدیم۔ خط واضح نستعلیق۔ عنوانات سرخی میں۔

رنگین نے اس مثنوی کو دو حصوں پر منقسم کیا ہے۔ ہر حصے کے عنوانات درج ذیل ہیں :۔

حصہ اول :۔ حمد، نعت، نصیحت پادشاہ جس میں پادشاہ کو نصیحت کی گئی ہے کہ خوں ریزی سے باز رہ، فعل بد سے باز رہ،

---

[1] دبستان ص۳۰۷ [2] ایضاً [3] فہرست اُردو مخطوطات۔ ج ص۳۱۲ اور ص۳۱۳

[4] فہرست اُردو مخطوطات ج ص (ملاحظہ ہو بلوم ہارڈٹ ص۲۰۵) [5] تذکرہ مخطوطات ج ۲ ص۸۵ اور ج ۴ ص۱۴۲ ملاحظہ ہو۔

[6، 7] ملاحظہ ہو تذکرہ مخطوطات۔ ج ۲ ص۶۵

[8] ص۲۲۴ کتب خانہ مجلس تحقیقات اُردو۔ حیدرآباد دکن

کل جو تو نے فعل بد کئے ان کا مظلمہ تیرے سر ہے، تاج کی لاج رکھ، محتاجوں کی مدد کر، سب یہ کہتے ہیں کہ تجھے عقل سے بہرہ نہیں۔ تیرے قبضہ میں اگرچہ شام و روم ہے، لیکن تو فعل نیک سے محروم ہے، دوست کو مت ستا۔ درحقارت خود و عبادت ہے۔ دربیان ترک کر دینا، طلب دین گریہ شب، طلب روزی زیادہ از مقدور کوشش بے جا۔ منع آرایش جسم و خواب بیہودہ۔ دربیان مے نوشی، ظلم، استمداد قول و قرار، نفس سرکش، جہان ناپائدار، منع صحبت ناجنس، مفلسی و منع بخل، خوف بیماری و امور ناچاری، ادب فقرا و منع غرور، مکر، عصیان، یاد حق و منع بدزبانی۔ پیدا کردن کمال و ترک حُبّ مال، نفرت از کفر، عشق مجازی، عشق حقیقی، مرد معشوق و منع درخاتمہ نسخہ اوّل۔

آخری اشعار ہیں:

قدر تو اس نظم کی رنگیں سے پوچھ　　اس کا رتبہ یا میاں ممکیں سے پوچھ
چار سو ہیں شعران دونوں کے زور　　غور کر میں نے کہے ہیں کیا بزور

__دوسرا حصہ (نسخہ بقول رنگین)__:۔ اس حصے میں حسب ذیل عنوانات شامل ہیں:۔

حمد و نعت، نصیحت پادشاہ، جس میں اسے نصیحت کی گئی ہے کہ شاہ راہ شریعت پر چل، خلق کو تاراج نہ کر، ناحق کی بات نہ سن، ملک گیری کی ہوس چھوڑ۔ دربیان بیوفائی دنیائے دوں، اہل دین، یاد حق، گریہ شب، عصیان، خواب، سلامت روی۔ نخوت، فکر عقبیٰ، عشق حقیقی، طاعت، شراب خواری، نفس آمارہ، شکر، مرد بسیار خوار، رزق مقدر، نادانی، باغ جہان فانی، مناجات و ختم نسخہ، گلدستہ رنگیں — اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

مانگتا ہوں کیا میں اس انشا سے داد　　چاہتا ہوں اس کی میرانشا سے داد
مثنوی گلدستۂ رنگیں ہے یہ　　نظم رنگا رنگ سے رنگیں ہے یہ
مثنوی رنگیں نے خود انشا یہ کی　　لو تجھے ارسال لے انشا یہ کی

مثنوی میں تجنیس سے ہر جگہ کام لیا گیا ہے۔

ترقیمہ حسب ذیل ہے:۔

تمام شد نسخہ گلدستہ رنگیں تصنیف سعادت یار خاں رنگیں ولد محکم الدولہ طہماس بیگ خاں بہادر، اعتقاد جنگ در صنعت تجنیس درعہد محمد اکبر شاہ پادشاہ غازی جلوس سنہ ۹ مطابق ہجری سنہ ۱۲۲۹ تمام شد۔ تاریخ نہم ذی الحجہ روز سہ شنبہ، تمت تمام شد — بخط اضعف العباد بندہ سلطان سنگھ (؟)

(۲) مثنوی باغ و بہار الموسوم مہ جبیں و نازنیں[1]

تقطیع ۱۰×۶½ انچ۔ اوراق ۸۴، سطور ۱۳، خوش خط نستعلیق۔ کاغذ قدیم دیسی۔ عنوانات سرخی میں۔

---

[1] نمبر ۲۹۲۔ کتب خانہ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن

رنگین کی یہ سب سے طویل مثنوی ہے جو ۱۲۱۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ مثنوی میر حسن کی "سحر البیان" کے جواب کے طور پر لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس مخطوطے کے ترقیمے میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حمد و نعت کے بعد حسبِ ذیل عنوانات کے تحت اشعار لکھے گئے ہیں:۔

منقبت حضرت اسد اللہ الغالب۔ ستائش پادشاہ عالم پناہ حضرت شاہ عالم پادشاہ بہادر غازی، در تعریف مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ۔ توصیف نواب عالی جناب نواب نصیب الدولہ مرزا وزیر علی خاں بہادر۔ آغاز داستان خاور شاہ پادشاہ بدر مہ جبیں۔

مثنوی پر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ "درخاتمہ ایں نسخہ گوید" کے عنوان کے تحت آخر میں جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، بھورے خاں آشفتہ، ثناء اللہ خاں فراقؔ، مہدی علی خاں عاشقؔ، مرزا سبحان قلی بیگ راغبؔ، لالہ بسنت سنگھ نشاطؔ، شاگرد رنگینؔ اور لالہ ماں سنگھ کے تاریخی قطعات خود رنگینؔ نے اپنے اشعار کے ساتھ درج کئے ہیں۔ جرأتؔ کے قطعے میں مادہ تاریخ ہے:۔ "ہے یہ بدر منیر سے بہتر" جس سے ۱۲۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔

ترقیمے کی عبارت حسبِ ذیل ہے:۔

"تمام شد کہانی مہ جبیں و ناز میں در جواب بے نظیر و بدر منیر۔ تصنیف سعادت یار خاں رنگیں پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خاں بہادر اعتقاد جنگ بتاریخ بست و ہفتم شعبان سنہ ۱۲ جلوس اکبر شاہ پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ مطابق یکم جولائی ۱۸۱۸ء روز پنجشنبہ حسب فرمائش خاں صاحب حق وردی بیگ خاں بہادر صورت اتمام یافت"

(۳) حکایت رنگیں[1]

تقطیع ۱۰ ۳/۴ × ۶ ۱/۲ انچ۔ اوراق ۲۰۔ سطور ۱۳، خوش خط نستعلیق۔ کاغذ قدیم دیسی۔

مثنوی کی تمہید میں رنگینؔ لکھتے ہیں کہ ایک دن میری طبیعت بہت بدمزہ تھی، کسی پہلو چین نہیں پڑتا تھا۔ میرے بھائی الٰہی بخش خاں نے جو جاہ و ثروت چھوڑ کر متوکل ہو گئے ہیں، مجھے بلوایا۔ میری حالت دیکھ کر، بدمزگی کا سبب پوچھا۔ میں نے احوالِ دل انھیں کہہ سنایا۔ اس پر انھوں نے ایک کہانی بیان کی اور اسے نظم کرنے کی فرمائش کی۔ یہ حکایت بدھو پھول والے کی ہے۔

ترقیمہ:۔

تمام شد نسخہ حکایت رنگیں تصنیف سعادت یار خاں رنگین پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خاں بہادر اعتقاد جنگ بتاریخ یازدہم جمادی الثانی سنہ ۱۲ اکبر شاہ پادشاہ مطابق ہجری سنہ ۱۲ھ صورت انجام یافت۔

(۴) خط بطور مثنوی[2]

تقطیع ۱۰ ۳/۴ × ۶ ۱/۲ انچ۔ اوراق ۶۔ سطور ۱۳۔ خوش خط نستعلیق۔ کاغذ دیسی قدیم۔

---

[1] کتب خانہ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن ص ۲۲۷ [2] ص ۲۲۶

یہ بڑھئی، درزی، سنار اور زاہد کی مشہور حکایت ہے۔

ترقیمہ حسب ذیل ہے:

خط لطور مثنوی تصنیف سعادت یار خاں رنگین راقمہ بندہ اعظم۔

(۵) فرس نامہ رنگین[1]

تقطیع ۱۰$\frac{۳}{۴}$ × ۶$\frac{۱}{۲}$ انچ۔ اوراق ۴۴۔ سطور ۱۳۔ خوش خط نستعلیق۔

ابتدا میں ایک فارسی دیباچہ ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور رنگین کی مشہور اور مقبول تصانیف میں سے ہے جس میں اچھے اور بُرے گھوڑوں کی پہچان اور ان کی بیماریوں اور علاج کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

(۶) تصنیف رنگین[2]۔ تصنیف ۱۲۳۹ھ

تقطیع ۷$\frac{۳}{۴}$ × ۵$\frac{۱}{۲}$ انچ۔ اوراق ۱۴۔ سطور ۱۱۔ خط واضح نستعلیق۔

رنگین کی اس مثنوی کے نسخے کمیاب ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

یا الٰہی تو مجھ کو دے توفیق   نیک توفیق ہووے میری رفیق
تا بنے مجھ سے دین کا کچھ کام   جی کو تسکین دل کو ہو آرام

آگے کہتے ہیں:۔

جی میں ہے ایسی مثنوی لکھوں ایک   پڑھ کے تعلیم جس سے ہوں بد نیک
دو سو اور سات اسکے ہوں اشعار   بیش و کم ایک بھی نہ ہو زنہار
اور اب کچھ اس میں ہووے بیاں   کہ ہوں احکام شرع جس سے عیاں
سو لکھا چاہتا ہوں یہ احوال   گوش دل سے سن اوس کو کر کے خیال
لڑکا جس روز سے کہ ہو پیدا   اور جی کر بہت وہ ہو بوڑھا
پیدا ہونے کے دن سے مرنے تک   لکھوں احوال اس کا میں یک یک

. . . .

گرچہ حیران ہوں میں اے رنگیں   پر مرے دل کو اس سے ہے تسکیں
کہ وہ میرا کریم ہے ستار   وہی کر دے گا میرا بیڑا پار
شاہ عبدالعزیز کے والد   اک رسالہ گئے ہیں لکھ بے عدد؟

. . . .

بارے مدت میں اب وہ ہاتھ آیا   شکر صد شکر سب وہ ہاتھ آیا

---

[1] کتب خانہ مجلس ترقی ادب۔ مخطوطہ ۲۲ [2] ایضاً عدد ۲۹۰

جی میں آیا کہ نظم ہو جو یہ سب   تو مرا حاصل اس سے ہو مطلب
نثر یہ نظم مجھ سے ہو جو تمام   تو سند سمجھیں اس کو خاص و عام
عملی غیبـــر یہ ہے مجھ سے   عرض ہے اے کریم یہ تجھ سے

عنوانات کی تفصیل یہ ہے :۔ در بیان شرک۔ رسومات خلق، تولد اولاد، سالگرہ۔ بسم اللہ کردن۔ آموختن نماز کودکان ختنہ، کسب حلال، نکاح، تعداد مہر، حیض، حمل، وصیت میت، حالت نزع، فوت شدن، غسل میت، تیاری جنازہ، مدفون کردن، معذرت، سوگ بیوہ، فاتحہ موت۔

اختتام کے اشعار ہیں :۔

نظم دس دن میں اس کو کر کے تمام   رکھا تصنیف رنگیں اس کا نام
اب جو تاریخ کا تجھے ہو خیال   تو تجھے کہہ سناؤں میں فی الحال
غصہ ہو کر تو مجھ سے دانت نہ پیس   سنے ہزار اور دو سو انتالیس
یہی تاریخ ہے تو شوق سے گن   گیارھویں تھی رجب کی پیر کا دن
سر کو بک بک کے مت پھرا رنگیں   فائدہ ماشنو کو کچھ بھی نہیں

. . . .

شعر کہنے کا آگے باندھ نہ ٹھاٹھ   کہ ہوئے شعر پورے دو سو ساٹھ

ترقیمہ:۔ تحریر فی التاریخ ماہ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ نبوی از دست کاتب الحروف محمد علی صاحب ولد محمد محمود صاحب ساکن خواجہ علی پیٹھ مقام فتح اللہ باد قلمی شد۔

(۷) دیوان انگیختہ

تقطیع ۸ ۳/۴ × ۵ ۳/۴ ۔ اوراق ۲۱ ۔ سطور ۱۵ ۔ خط واضح نستعلیق۔ کاغذ قدیم دیسی۔

دیوان انگیختہ ریختی پر مشتمل ہے۔ رنگین کو بعض وقت ریختی کا موجد کہا جاتا ہے، لیکن اس سے پہلے دکن میں کئی ریختی گو شعرا گزر چکے ہیں۔ دیوان انگیختہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ رنگین کا ایک بسیط دیباچہ بھی ہے، جس میں اس دیوان کی ترتیب کا سبب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

> "یہ نامہ سیاہ اکثر عرس شیطان کا کہ عبارت جس سے تماش بینی خانگیوں کی ہے کیا کرتا تھا اور اس قوم میں ہر ایک وضع کی تقدیر پر دھیان دھرتا تھا۔ ہر گاہ چند مدت جو اس وضع پر اوقات بسر ہوئی تو اس عاصی کو ان کی اصطلاح محاورہ سے بہت سی خبر ہوئی۔ پس واسطے خوشی اون ہی اشخاص نہ عام بلکہ خاص کی بولیوں کو اون کی زبان میں اس بے زبان ہیچمدان نے موزوں کر کے دیوان چھوٹا ترتیب دیا۔"

دیباچہ کا بڑا حصہ ریختی لغت پر مشتمل ہے، جو بہت اہم ہے۔

دیوان میں ترقیمہ نہیں ہے۔

دیوان نوا[1]

قاضی عبدالودود

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں نوا کا ترجمہ: "شیخ ظہور[2]، نوا... ساکن بداؤن، پسر مولوی ولی اللہ[3] جوان خوش فکر و سنجیدہ وضع شاگرد میاں بقاء اللہ۔ میگوید کہ از حضور مرزا جہاندار شاہ.. بخطاب خوش فکر خانی عزّ امتیاز یافتہ۔ فکر شعر.. ہندی و فارسی.. میکند، امّا قصیدہ را بسیار بمتانت و پختگی بسرانجام میرساند۔ معہذا طرز نظم قصیدہ اش بسبب اندراج لغات عربی و فارسی از ابنای زمان جداست... الحق کہ درین کار ہر کہ با او در افتادہ شکست فاحشہ خوردہ۔ بسبب دوستی کہ میان من و میان بقاء اللہ بایہ برادر بیت فقیر را عمو میگوید۔"

خاتمۂ دستور الفصاحت میں نوا کا ترجمہ: "خوش فکر خاں نوا شاگرد.. بقاست۔ مولدش بداؤں، و خود در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ این ہم مثل استاد خود قصیدہ گوست۔ وقتیکہ در لکھنؤ بود باجرأت و شاگردانش نزاع کلی داشتہ، اکثر در کلام خود کنایہ باو مینمود، و یک مرتبہ در مشاعرۂ مولوی مجیب اللہ و یک بار در مشاعرہ سید مہر اللہ خان، غیور کہ مقابلہ او ظاہرا با نجبن مرثیہ گو و مرزا علی لطف و مرزا مغل سبقت و بباطن با جرأت شدہ بود بہ ہمہ ہا غالب آمدہ شکست فاش دادہ، و ہجوہائے رکیک بر روی ہر یک در مجمع کثیر خواندہ، حتّٰی ہمہ بزرگاران دشمن او شدہ خواستند کہ او را.. بکشند، مشارٌالیہ نیز ازیں معنی خبر یافتہ، و باوجود تنہائی مطلق بہ وانیکہ و مستعد جنگ بزبان سنان و تیغ زبان ہر دو بود۔ بالآخر محمد عاشق تصوّر[4] واسطہ گردیدہ با.. سبقت داد سبب ملاقات شد و بظاہر نزاع موقوف ماند.. زبان گزندہ دارد۔ با راقم نہایت دوست بودہ۔ از چند سال مفقود الخبر است، بعضی گویند کہ عزم زیارت عتبات عالیات نمودہ از راہ ایران رفتہ با قہرمان آنجا ملازمت حاصل کردہ یکی از مقربان درگاہ شد، و بعضی گویند کہ از انجام رخصت شدہ

---

[1] اس مضمون میں دیوان کا جزئی تعارف کرایا گیا ہے، اس کا تکملہ آئندہ لکھا جائے گا۔ [2] مکمل نام ظہور اللہ

[3] تذکرۂ ہندی کے بعض نسخ میں "یافتہ" کے بعد یہ عبارت ہے "اگرچہ در خوش فکریش شک نیست، اما فقیر ازیں مقدمہ کما ینبغی آگاہی ندارد" دیوان اُردو کے دو قطعوں میں خوش فکر خاں آیا ہے:

نوا جلتی نہیں ہے آنکھ اپنی کسی شاعر سے   اگر سچ پوچھیے تو خوش فکر خاں صاحب ہی ڈرتے ہیں (کذا)
مست ہیں کیف نگاہ یار سے خوش فکر خاں   چھیڑیو ان کو نہ کوئی آج متوالے ہیں یہ

[4] مصدر؟

بزیارت رفت ۔۔"

شوق کے تکملۃ الشعرا[1] (نسخۂ رامپور) میں نوا کا نام شیخ ظہور اللہ اور خطاب خوش فکر خاں مرقوم ہے۔ شوق نے انھیں قصیدہ گوئی میں یکتائے زمان" لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کا دیوان ہندی اتمام کو پہنچ چکا ہے۔ تاریخ فرخ آباد مصنفہ ولی اللہ میں علمائے لکھنؤ سے تحصیل علم، شاہ ایران فتح علی قجر سے سعدی ہند کا خطاب پانے اور وارد فرخ آباد ہونے کا ذکر ہے۔ حکیم وحید اللہ کی مختصر سیر ہندوستان[2] میں ہے کہ ظہور اللہ خاں نوا ابن مولوی دلیل اللہ صدیقی مصنف کے "بزرگان یک جدی" سے تھے، حج و زیارت کے لیے گئے تھے، اور شاہ ایران نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ واپسی کے بعد بوساطت راجہ چندو لال فولاد جنگ ابن نظام علی خاں والیٔ حیدرآباد کی خدمت میں پہنچے بسنہ ۱۲۴۰ھ میں بمقام بدایوں وفات پائی۔

آب حیات میں ہے کہ جرأت کا، نوا سے کسی معاملے میں بگاڑ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ان کی ہجو میں ایک ترجیع بند[3] لکھا۔ جس کا شعر ترجیع یہ ہے:

ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلجڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

خان موصوف (نوا) نے بھی بہت کچھ کہا مگر اس نے شہرت نہیں پائی، چنانچہ ان کے ترجیع بند[4] کا فی الحال یہی ایک شعر یاد ہے:

رات کو کہنے لگا جورو کے منہ پہ ہاتھ پھیر
قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر"

دیوان نوا کا صرف ایک نسخہ میرے علم میں ہے اور یہ چند سال قبل میری تحریک پر کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ نے رحمت قطبی صاحب (دہلی) سے خریدا تھا۔ یہ فارسی و اردو دونوں زبانوں کے اشعار پر مشتمل ہے۔ اشعار اردو کے آخر میں کاتب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بحذف بعض عبارات درج ذیل ہے:

بفضلہ تعالیٰ آج کہ ۔۔ ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۳ء ۔۔ روز سہ شنبہ ہے یہ دیوان اور قصائد اردو من تصنیف ۔۔ ظہور اللہ ۔۔ نوا متوطن بدایوں کہ بتلاش و دقت تمام ہاتھ آیا تھا، اختتام ہوا۔ بخط شیو پرشاد کشنہ ولد بہادر سنگھ نسیم

ہر چند کلام اردو کا بھی بہت تھا، الا ان کی حیات میں دیوان جمع نہ ہوا[5]، اس واسطے تلف گیا۔ بعضے ناحق شناس ان

---

[1] یہ نادر تاریخ فرخ آباد میری نظر سے گزر چکی ہے، لیکن اس مضمون میں عبارات و مطالب حواشی خاتمۂ دستور الفصاحت سے ماخوذ ہیں۔ [2] ماخوذ از حواشی مذکور۔

[3] مسدس ہے، کلیات جرأت کے بکثرت نسخوں میں میری نظر سے گزرا ہے بعض مطبوعہ مجموعوں میں بھی شامل ہے۔

[4] یہ بھی مسدس، ایک مطبوعہ مجموعے میں ہے اس کا نام اس وقت یاد نہیں، کسی صاحب نے اسے دیکھا ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔

[5] شوق کا بیان اس سے متفاوت ہے۔

کے کلام کو اپنے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ اب تھوڑے دن سے قربان حسن خاں.. نبیرہ ان کے کہ علم و ہنر، خلق و مروت میں یکتا ہیں، مستعد ترتیب کتب مصنفۂ جناب ممدوح کے ہوئے ہیں اور بہ محنت تمام دیوان فارسی و شاہنامہ و لیلیٰ مجنوں و زلیخا تصنیف ان کی مرتب کی۔ اور یہ دیوان اردو کا ہے جس قدر ہاتھ آیا ان کی توجہ سے ہم نے نقل کیا" ورق ۳۰۵۔

کمل اور نامکمل غزلوں کے اشعار اور فردیات کی مجموعی تعداد ۳۴۴ ہے۔ ان میں سے چند جو مختلف نقطہ ہائے نظر سے منتخب ہوئے ہیں ذیل میں مرقوم ہیں۔ ان کی بعض غزلیں اور متفرق اشعار ایک زمانے میں خاصی شہرت رکھتے تھے لیکن بحیثیت مجموعی انھیں ایک کامیاب غزل گو نہیں کہا جا سکتا:

تیر پہ تیر یار کا سینے میں شب گذار تھا — رخنۂ زخم ہر خدنگ دیدۂ انتظار تھا
میں خنجر قاتل کا ممنون ہوا بارے — تسمہ نہ رہا باقی وہ کام کیا جس کا
بیمار محبت کا اکسیر نہیں درماں — ہے کشتہ ترا یارو خوبان بنارس کا
مٹی نہیں ہے گریباں سے دست کی پرخاش — ہنوز باقی ہے الجھیڑا چند تاروں کا
عجب طرح کا یہ منصب ہے حصول کیونکر ہو کار اپنا — نہ مجھ تک آتا ہے وہ ستمگر نہ اس تلک ہے گذار اپنا
تجھے ہے لازم کہ رحم کر تو غریب و بیکس ہوں بینوا ہوں — کہ تیری خاطر میں چھوڑ آیا ہزار منزل دیار اپنا
مسلماں ہو کے کفر کہ آپ کے قدموں پہ دھرتے ہیں — بتو لو اور کیا کہتے ہو سجدہ تم کو کرتے ہیں
یہ مسکی چولی اکھڑی جبینی کپڑے ملگجے کیوں ہیں — ہم آغوشی سے غیروں کی اگر صاحب مکرتے ہیں
سانس سینے میں کھٹکتی ہے ہماری پھانس سے — کیا ہی زوروں پر چڑھی ہے ناتوانی ان دنوں
نغمۂ اقلیم سخن میں دھاک ہے میری نوا — نامزد ہے سکۂ صاحبقرانی ان دنوں
نہ زمیں کے نہ آسماں کے ہیں — تیرے عشاق یہ کہاں کے ہیں
لکھنؤ کے ہیں شوخ سب خونریز — ترچھے نکلے ہیں ٹیڑھے بانکے ہیں
خصم نواب کو دوں وادی برہوت میں ڈال — ریت چاٹا کرے جوں ریگ کی ملکی مکّھی
شیخ جی نام کنول گٹوں کا سن پائیں اگر — گر کے تالاب میں بن جائیں کنول کی کمّھی
کس درجہ بیکلی ہوئی اٹھتے ہی یار کے — کیا کیا گھمنڈ تھے ہمیں صبر و قرار کے
واحسرتا کہ پہنچے جو ہیں تا سواد شہر — بولا یہ ساربان سے یہ دل پکار کے
او نامراد ناقۂ لیلیٰ نہیں ہے یہ — آتا ہے کس امید پہ پیچھے قطار کے
ٹپکے ہے خوں ٹھہر ٹھہر سینے کے ہر خراش سے — چھیڑ دو اس کو ہمدمو نوک قلمتراش سے
اس اوج تک تو سیل سرشک اپنا جا چڑھا — جس میں کہ ابر جوں کف دریا بہا پھرا
نکلا ہے مدتوں[1] کا یا پیام یاس لاتا ہے — الٰہی خیر کیجو نامہ بر کچھ سست آتا ہے

---

[1] تذکروں میں "منزلوں" اور یہی بہتر۔

حاجت تیغ دکھاں ہے سخت جانوں کے لیے
قتل کو میرے ذرا ابرو پہ بل درکار ہے
پہنچے کب صحن چمن تک ہم اسیروں کی نگاہ
اب رسائی جن کی تا چاک قفس دشوار ہے
خیال کیوں کے نہ جائے میرے سینے سے
جدا ہوا ہے کہیں نقش بھی نگینے سے
سیل سرشک اپنا ٹک سر باوج مارے
طوفان نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے

مجھ سے کب تک[1] اس دل صد چاک کا پیوند ہو
اب یہ دیوانہ الٰہی خاک کا پیوند ہو
جو میرے قتل کی تدبیر بے تقصیر ہوتی ہے
نگاہ پاک کی شاید یہی تاثیر ہوتی ہے
اگر ہے پاس رسوائی تو کر ضبط نفس اے دل
جہاں غنچے سے بو نکلی تو پھر تشہیر ہوتی ہے

کیا خطا مجھ سے ہوئی ہے کہ مجھے دیکھ تری
ناک دھوں سکڑی ہوئی تیوری چڑھی[2] رہتی ہے
اٹھانے کو نہ میرے پھر کسی نے آستیں پکڑی[3]
برنگ نقش پا اس در پہ جب میں نے زمیں پکڑی

کٹاتی ہے غرور سرکشی مغرور کی گردن
اٹھایا شمع نے جب سر فلک نے دور کی گردن
سحر[4] نامہ لکھا تھا یار کو میں اس توقع پر
کہ دیکھوں گا جواب نامہ لاتے شام قاصد کو

---

[1] خوش معرکۂ زیبا میں بنام بقا [2] قرانی کمرڑا ایڑھی وغیرہ۔ [3] اس زمین کے ۱۰ شعر ہیں۔ [4] یہ قطعہ ہے کل ۶ شعر۔

شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین خاں دہلوی

مختار الدین احمد آرزو

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۸۶۳ء میں عربی کے مددگار پروفیسر اور بعد کو پروفیسر مقرر ہوئے۔ کالج ٹوٹ جانے پر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ پھر شمس العلماء کا خطاب اور ایل۔ ایل۔ ڈی کا اعزاز پایا۔ بسی دارا پور کے جاگیردار کے خاندان سے تھے چنانچہ آج بھی اُن کے گھرانے کے لوگ بسی والے کہلاتے ہیں۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاؔ ان کا تخلص تھا، مگر جہاں تک دریافت ہو سکا یہی اطلاع ملی کہ مولوی صاحب شعر کہتے ہی نہ تھے، ممکن ہے ابتدا میں شعر کہتے ہوں بعد کو چھوڑ دیا ہو۔ حج کو گئے تھے وہیں وفات پائی۔ سنہ وفات غالباً ۱۹۰۶ء ہے۔[1]

مولوی صاحب کے والد کا نام محمد بخش تھا اور وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالب نے انھیں نبیرۂ نواب سابق بسی دارا پور لکھا ہے۔ ۱۸۶۸ء تک دہلی کالج میں عربی کے استاد تھے۔ پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ پروفیسر بعد کو ہوئے۔ ایڈنبرا یونیورسٹی سے انھیں ایل، ایل، ڈی کی اعزازی ڈگری سر ولیم میور کی تحریک پر ملی تھی۔

امین الدین پٹیالوی مصنف قاطع القاطع کے خلاف جو مرزا غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا تھا، اس میں وہ مرزا کے خلاف اور امین الدین کی طرف سے گواہی دینے آئے تھے اور سارے قابل اعتراض فقروں اور لفظوں کے ایسے نرم معنی پہنا دیئے تھے جو اُن جیسے عالم آدمی کے شایانِ شان کسی طرح نہ تھا۔ مسٹر اوبرین کے اجلاس میں ان کا اظہار ۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوا تھا۔ ۱۲ مارچ بروز سہ شنبہ کو پھر پیشی ہوئی۔ جس میں کسی نے حاکم کے کان میں یہ ڈال دیا کہ معزز ترین آدمی ہیں، انھیں اجلاس میں کرسی ملنی چاہئے۔ مجسٹریٹ نے اپنے بازو پر ایک کرسی رکھوا دی اور اس پر انھیں بٹھایا۔ اس زمانہ میں ایک انگریزی اخبار مفصلائٹ شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں مجسٹریٹ کے اس رویہ کے خلاف ایک مراسلہ شائع ہوا تھا۔[3] مراسلہ نگار کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن بہ ظاہر وہ مرزا غالب کا کوئی طرفدار معلوم ہوتا ہے۔ مفصلائٹ کا نامہ نگار لکھتا ہے۔[4]

---

[1] ہندوستانی (الٰہ آباد) شمارہ ۴ ص ۱۳۲

[2] ڈاکٹر سید سجاد نے دہلی یونیورسٹی لکھا ہے جو قرین صواب نہیں۔

[3] غالب کے مقدمہ کے سلسلہ میں ۳ مارچ ۶۸ء کو مسٹر اوبرین کے اجلاس میں جو اظہار انھوں نے دیا تھا وہ دیکھا جائے۔

[4] دیکھئے غالب کے متعلق ایک انگریزی خط مطبوعہ اخبار مفصلائٹ ۱۸۶۸ء از ڈاکٹر سید محمد سجاد۔ اُردو (اکتوبر ۱۹۳۹ء)

> "سخت حیران و پریشان ہوں کہ مجسٹریٹ نے کس بنا پر مولوی ضیاء الدین کو کرسی دی؛ اس رعایت سے مرزا غالب کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ وہ سوسائٹی میں بڑے معزز ہیں، گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اوپر کے درجہ میں بٹھایا گیا۔ نیز ہندوستانی عدالتوں کے قوانین اور دستور کا مجھے علم ہے، کوئی خواہ کتنا ہی معزز ہو، لیکن گواہی لیتے وقت اُسے بیٹھنے کی اجازت کبھی نہیں دی گئی۔"

خیر مجسٹریٹ کی یہ کارروائی اور تعظیم غلط سہی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب کا سوسائٹی میں کیا اعزاز تھا اور اس سے ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی صاحب کی زندگی کے اور حالات اس وقت معلوم نہ ہو سکے۔ مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں:—

> "جامع مسجد کے قریب ایک رہٹ کا کنواں تھا۔ شاہجہاں کے وقت میں پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا، اس سے جامع کے حوض میں پانی جاتا تھا۔ اس محلہ میں خان بہادر شمس العلماء مولوی شیخ ضیاء الدین خاں صاحب ایل، ایل، ڈی کا دولت خانہ ہے۔ منشی ذکاء اللہ مولوی نذیر احمد اور یہ دلی کالج کے نامی گرامی طلباء میں تھے۔ ایک ہی ساتھ پڑھے اور سب کے سب شمس العلماء ہو کر چکے۔ ضیاء الدین اور مولوی نذیر احمد دونوں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ایل، ایل ڈی ہوئے۔ شیخ صاحب کا انتقال پہلے ہوا باقی دو صاحب آگے پیچھے تھوڑے ہی فرق سے مر گئے۔ شیخ صاحب دروغہ شیخ محمد بخش ساکن موضع بسی تحصیل دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ آپ ان کے منجھلے صاحبزادے تھے، قسم دہلی کے بعد جب انگریزی فوج دلی میں داخل ہوئی تو وہ اپنے مکان ہی میں تھے۔ قضائے کردگار اجل گولی کی شکل میں آئی یہ خاندان گورنمنٹ کا خوفزدہ تھا۔
>
> مولوی صاحب مولوی مملوک علی نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے اور مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور سے بھی فارسی تحصیل کی تھی ایام غدر میں دہلی کالج میں مدرس ہوئے۔ چندے نارمل اسکول میں پڑھاتے رہے پھر اسی کالج میں عربی کے مدرس ہو گئے۔ ۱۸۷۷ء میں کالج ٹوٹا تو بلحاظ اپنی اعلیٰ قابلیت کے اکسٹرا اسسٹنٹ ہوئے۔ اختتام مدت پر پنشن لے لی۔ بڑے بھاری آدب وقت تھے۔ چونکہ ساری عمر رشتۂ تعلیم میں صرف ہوئے۔ پڑھانے ہی کی دُھن رہی تصنیف و تالیف کئی چھوڑیں۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے۔"

(بشیر احمد؛ واقعات دار الحکومت دہلی۔ ج ۲۔ ص ۱۷۹۔ طبع ۱۹۱۹ء)

مولوی صاحب کے تاہل کی زندگی اور ان کی اولاد کے متعلق بہت کم معلوم ہے، خود ایک خط میں لکھتے ہیں[1] "آپ جانتے

---

[1] انشائے اردو۔ حصہ دوم ۸۹، اس پر تاریخ درج نہیں، لیکن ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہیں کہ میں اس وجہ سے کہ اب تک مقابل وکیل کھڑا نہیں ہوا، ایسے معاملوں میں بالکل نا اہل اور ناتجربہ کار ہوں: مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ان کے ایک بیٹے انعام الدین کی ملاقات کا حال مجھے بتایا تھا۔ ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ فقہ کی ایک کتاب بھی انھوں نے تصنیف کی تھی۔ پرانی کتابیں بیچنے کا کام کرتے تھے اور سید شاہ سلیمان کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ ایک بار کچھ قانون کی کتابیں ان کے پاس فروخت کرنے آئے تھے۔ ملاقات کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال کے قریب ہوگی۔ سال وفات اگر ۱۹۱۵ء صحیح ہے تو انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ غالب نے جو انھیں خط لکھا ہے اس میں انھیں مسلم علمائے عرب و عجم لکھا ہے، اگر ان کی عمر غالب سے کم بھی مان لی جائے تو اس وقت پچاس سال سے کیا کم ہوگی، اس لحاظ سے ۱۸۱۵ء کے لگ بھگ ان کا سال ولادت ہونا چاہیئے۔

غالب سے تعلقات

مولوی ضیاءالدین مرزا غالب کے مکتوب الیہوں میں تھے اور ایک زمانہ میں دونوں کے بڑے اچھے تعلقات تھے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تعلقات کی ابتدا کب ہوئی، قیام دہلی کی بنا پر خیال ہوتا ہے، کہ مراسم قدیم ہوں گے۔ گو غالب کے خطوں کے مجموعے ان تعلقات کے متعلق قطعاً خاموش ہیں۔ مولوی صاحب کے قیام دہلی کے زمانہ میں خط و کتابت زیادہ نہیں ہوئی ہوگی۔ ممکن ہے ایک آدھ رقعہ ایک دوسرے کو لکھ دیتے ہوں۔ مولوی صاحب کے کسی خط کا جو انھوں نے غالب کے نام لکھا ہو پتہ نہیں چلتا، لیکن خوش قسمتی سے مرزا غالب کے دو خط ان کے نام موجود ہیں جو انھوں نے مولوی صاحب کو لکھے ہیں، پہلے خط پر جو بہت طویل ہے تاریخ تحریر درج نہیں لیکن اس قدر تیقن ہے کہ یہ ۱۸۶۲ء کے بعد اور ۱۸۶۴ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس میں استفتا کا ذکر ہے، جو سوالات عبدالکریم کے آخر میں ہے، جو ۱۸۶۴ء سے پہلے چھپ چکا تھا۔ مرزا نے استفتا کے ساتھ یہ طویل خط انھیں اپنے مسلک کی وضاحت میں لکھا تھا، وہ چاہتے تھے کہ مولوی صاحب بھی اس استفتا پر دستخط کر دیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ یہ استفتا سوالات عبدالکریم میں موجود ہے اور سعادت علی، نصیرالدین، لطیف حسین، نجف علی اور دوسرے حکما کے جوابات اور ان کے دستخط موجود ہیں، لیکن ضیاءالدین صاحب کی کوئی تحریر موجود نہیں۔ ظاہراً انھیں مرزا کا نقطۂ نظر صحیح معلوم نہ ہوا۔

دوسرا رقعہ ۲۷ر فروری ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ قاطع برہان کا جھگڑا زور پکڑ چکا تھا۔ مرزا خواہش مند تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ انھوں نے غالب کے مرسلہ استفتا پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن مرزا ان کی طرف سے قطعاً مایوس اب بھی نہیں ہوئے تھے، اور ان کے دل میں امید کی ننھی سی قندیل اب بھی روشن تھی۔ انھوں نے مولوی صاحب کو ہم خیال بنانے کی ایک اور کوشش کی وہ اُن کے مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ دہلی کے بڑے معزز ہونے کے ساتھ بڑے حکام رس بھی تھے۔ اور انگریز حاکموں کے یہاں ان کا بڑا رسوخ تھا۔ وہ اگر مرزا کی طرف سے ان کے مقدمہ میں گواہ بن کر چلے جاتے ہیں تو اس کا اثر مقدمہ پر کیا پڑتا ہے۔ غالب اس سے ناواقف نہ تھے۔ غالب کا رقعہ پڑھیے اور دیکھیے اس سے

کس قدر بے تابی کا اظہار ہوتا ہے[1]

جناب مولوی صاحب کرم ازشما وکی ازما
اچھوں کے ساتھ سب بھلائی کرتے ہیں۔ بروں کے ساتھ نیکی کرنی جواں مردی ہے، اگر پانچ
نہ ہوتا تو فوراً آپ کے پاس پہنچتا، اب متوقع ہوں کہ آج اس وقت یا اور وقت مگر آج ہی
تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں۔ شام تک چشم براہ رہوں گا۔

عنایت کا طالب
غالب ۲۷ فروری ۱۸۶۶ء

معلوم نہیں وہ مرزا سے ملنے آئے یا نہیں اور گفتگو کس حد تک کامیاب رہی۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مرزا نے جو ان سے امیدیں لگا رکھی تھیں وہ سراسر سراب ثابت ہوئیں۔ اور یہی نہیں کہ انھوں نے ساتھ نہ دیا، بلکہ انھوں نے فریق مخالف کی حمایت کی اور کھلے اجلاس میں مرزا کی مخالفت میں گواہی دی۔ مقدمہ ۲۳ مارچ کو ختم ہوا جس کے دس گیارہ ماہ بعد مرزا کا انتقال ہوگیا۔ ان دونوں کے تعلقات کی پھر تجدید ہوئی یا نہیں، موجود مواد میں اس کا جواب ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا ہے۔

تصانیف

شمس العلماء کی تصانیف کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، اور وہ کچھ زیادہ ———— مشہور بھی نہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں[2]: "افسوس کہ ان کی یادگار رسوائے رسوم ہند کے پہلے حصے کے کوئی اور نہیں پائی جاتی" لیکن اس میں بھی استاد کا کمال کہیں کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ راقم کو اب تک ان کی جن تصانیف کا پتہ چل سکا ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ترجمہ مسلم الادب۔ مسلم الادب پنجاب یونیورسٹی کا عربی کورس ہے جس کا طالب علموں کے لیے مولوی صاحب نے ترجمہ کیا ہے اس میں عربی محاورات کی کچھ کتابوں کے انتخابات ہیں۔ اس میں حدیقه الافراح لازالة الانراح اسیں ۵۴ حکائتیں اور الف لیلہ ولیلۃ کی اہم نقلیں ہیں۔ یہ کتاب غالباً کہیں شائع نہیں ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں موجود ہے[3]۔

(۲) انشائے اُردو حصہ اوّل[4] سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔

---

[1] یہ رقعہ غالب کے رقعات میں سے کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ اس لیے یہاں نقل کیا گیا ہے۔ غالب کا اصل رقعہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس موجود ہے۔ ان کی عنایت سے راقم نے اس کا عکس غالب نمبر میں شائع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ص ۵۲

[2] مرحوم دہلی کالج۔ رسالہ اُردو ص ۱۰۰

[3] اوراق ۱۵، تقطیع ½۷" × ۱۲"۔ اس نسخہ کی اطلاع مجھے ابرار حسین فاروقی ایم، اے سے ملی۔ اس اطلاع کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

[4] صفحات ۶۰، تقطیع ½۷" × ۱۲"، سطور فی صفحہ ۱۵

"افسرانِ فوج کے درجہ ادنیٰ کے امتحان کے واسطے عمدۃ الملک نواب معلی القاب وائسرائے و گورنر جنرل صاحب بہادر اقلیم ہند کے ارشاد سے مولوی ضیاء الدین خاں پروفیسر عربی دہلی کالج نے اس کتاب کی تہذیب و تصحیح کی شیخ احمد کے اہتمام سے مطبع فیضِ احمدی میں چھپی ۱۸۶۲ء عیسوی"

انشائے اُردو۔ حصہ دوم سرورق پر پہلی کتاب کے ——— اس کتاب میں کچھ اردو رقعات بھی ہیں۔ کچھ اصلی اور کچھ فرضی بالکل مطابق، وہی مطبع ہے اور وہی سال طباعت۔ فرق یہ ہے کہ یہ کتاب افسرانِ فوج کے درجۂ اعلیٰ کے واسطے لکھی گئی ہے۔ کتاب بہت حد تک صحیح چھپی ہے اور بعض الفاظ کی کتابت میں ضبطِ اعراب کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت دہلی میں ہوئی ہے اور تعجب نہیں کہ تصحیح وغیرہ کا اہتمام خود مولف کی نگرانی میں ہوتا ہو۔ اُردو املا سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیے اس ایڈیشن کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ضبطِ اعراب کی بعض مثالیں رضی الدّولہ، کلکتے، مُیَسّر، مُحَمّدؐ، اِرسال، علی الاِتّصال اور مَغرُور، فی الجملہ انشار اُردو میں بیشتر رقعات ہیں، رقعہ نویسوں کے نام درج نہیں۔ رقعات اور کچھ اور تحریروں کے علاوہ دہلی کے کمشنر کرنیل جارج ولیم ہملٹن صاحب بہادر[۱] کے نام ایک خط اور مرقع و مبسم سپاس نامہ بھی درج ہیں جو صاحب مذکور کے پاس دہلی سے لندن بھیجا گیا تھا، اس کے علاوہ ایک اور طویل خط ہے جس کا مکتوب الیہ نامعلوم ہے، یہ چیزیں خود مرتب کتاب کی لکھی ہوئی ہیں۔ رقعات کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ان میں کچھ غلام امام شہید اکبرآبادی، رجب علی بیگ سرور لکھنوی، اور میرزا غالبؔ کے بھی لکھے ہوئے ہیں۔

میرزا غالب کے ۱۱ مکتوب اس کتاب میں درج ہیں۔ مکتوب اوّل کے علاوہ سب چھپ چکے ہیں اور خطوط غالب میں موجود ہیں۔ انشار اُردو میری رائے میں پہلا مجموعہ ہے جس میں غالب کے خطوط ملتے ہیں۔

یہ مجموعہ خود غالب کی عودِ ہندی پر مقدم ہے اس لیے کہ عود کی طباعت ۱۸۶۸ء میں ہوئی اور یہ مجموعہ انشار اُردو ۱۸۶۲ء میں چھپ چکا تھا۔

غالب کے یہ خطوط انشار اُردو کے علاوہ اس انتخاب میں بھی پائے جاتے ہیں، جو میرزا غالب نے مرزا منکلوڈ کی فرمائش پر ترتیب دیے تھے اور جس کا نہایت خوشخط قلمی نسخہ مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے پاس موجود ہے، اس کا نام رقعاتِ غالب ہے اور اس میں دیباچہ و خاتمہ ہیں نے علیگڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع کر دیا ہے۔

قیاس غالب بلکہ یقین ہے کہ مولوی صاحب نے یہ مکتوب مرزا غالب کے مرتب کردہ رسالے ہی سے لیے ہیں۔ اس لیے کہ انشا کی ترتیب کے وقت نہ تو عودِ ہندی شائع ہوئی تھی اور نہ کوئی ایسا مجموعہ جس میں مرزا کے خطوط موجود ہوں۔

انشار اُردو کا پیش نظر نسخہ معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب کے پاس رہ چکا ہے۔ سرخ روشنائی سے کہیں حواشی یا ترمیمیں موجود ہیں، ان ترمیموں کی نوعیت ایسی ہے کہ خود مصنف ہی ان کا مجاز ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی یہ کتاب مقبول ہوئی، کتب خانہ جامعہ علیگڑھ میں انشائے اُردو کے دونوں حصے موجود ہیں۔ یہ لاہور کے مطبع سرکاری ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ غالباً دوسرا ایڈیشن ہے۔

---

[۱] کرنل ہملٹن "دہلی سوسائٹی" کے بانیوں میں سے تھے بہت دن تک وہ سوسائٹی کے پیٹرن رہے تھے، اس دور کے اکثر اعلیٰ انگریز حکام کی طرح ہملٹن کو بھی ہندوستان کی زبان اور ادب سے دلچسپی تھی، چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک ذخیرہ ہملٹن کے قلمی نسخوں کا بھی محفوظ ہے (احوالِ غالب)

(۴) رسوم ہند۔ اس کتاب کا پہلا حصہ مولوی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے دوسرے حصوں کی تکمیل نہ کر سکے۔ میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔

(۵) ضیائے شمسی۔ انھوں نے دیوان حافظ کی ایک شرح بھی لکھنی شروع کی تھی جس کا نام "ضیائے شمسی" رکھا تھا لیکن اسی زمانہ میں افسران فوج کے امتحان کے واسطے کتابیں مرتب کرنے لگ گئے اور پتہ نہ چلا کہ شرح دیوان مکمل کر سکے یا نہیں۔

شاعری

مولوی صاحب کو شاعر کہنا تو شاید زیادہ صحیح نہ ہو، یہ ضرور ہے کہ وہ طبع موزوں رکھتے تھے اور بوقت ضرورت اشعار موزوں کر لیا کرتے تھے، ڈاکٹر صدیقی تحریر فرماتے ہیں "وہ شعر کہتے ہی نہ تھے، ممکن ہے ابتدا میں شعر کہتے ہوں" نہیں شعر تو وہ آخر عمر تک کہتے رہے ہوں گے لیکن ایسے شعر کہ جن کا عدم و وجود برابر ہے۔ ان کی کتاب انشائے اردو کے علاوہ اور کہیں ان کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان اشعار سے ان کی شاعری کا اندازہ لگا لیجئے۔ عالم وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں اور غالب کے لفظوں میں مسلّم عرب و عجم ہی سہی، لیکن ان کی شاعری کا جو نمونہ ملتا ہے اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت معمولی درجہ کے شاعر تھے۔

کرنیل ہیملٹن کمشنر دہلی کو جو سپاسنامہ انھوں نے پیش کیا ہے اس میں یہ دو شعر ملتے ہیں ؎

آفتاب اس کے آگے ہے تاریک   کہتے ہیں لوگ جس کو ہیملٹن
علم اس کا ضیا پہ روشن ہے   نور جلیوں میں اس کے ہے ملٹن

ایک دوسری جگہ ؎

ضیا اب مختصر کر اپنی تحریر   دعا پر ختم کر یہ ساری تقریر

نثر نویسی

وہ غالب کے معاصر سہی، لیکن غالب والی بات ان کی نثر میں موجود نہیں ان کے خطوط میں تازگی نہیں اور ان کی نثر پھیکی اور بے جان ہے اور تصانیف کا حال معلوم نہیں لیکن انشائے اردو کی وہ نثریں جو صراحتاً ان کی لکھی ہوئی ہیں اور جن کے آخر میں ان کے نام درج ہیں وہ پیشِ نظر ہیں۔ ان نثروں میں متناسب اور مترادف لفظوں اور صنعت تجنیس کی بھرمار ہے، یہ نہیں کہ اتفاق سے زمانہ کی عام روش کے مطابق کچھ ترکیبیں ان کے قلم سے نکل پڑی ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے قصداً یہ تکلف کیا ہے اور زحمت فرمائی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان نثروں کے ذیلی حاشیہ میں ان صنعتوں کی طرف قارئین کی توجہ بار بار منعطف فرمائی ہے۔ بعض فقرے ملاحظہ ہوں[1]:

---

[1] عبارت بین المعکفین ہر جگہ مولوی صاحب کی ہی ہیں۔

۱۔ خط کی ابتدا میں جو ظاہری تحریریں ہوتی ہیں، ان کو یک قلم چھوڑتا ہوں۔ ص ۸۳ (خط، تحریر، قلم، مناسب لفظ ہیں۔

۲۔ فکر و اندیشہ سر سے یکسر دور ہوا۔ ص ۸۴ (سر اور یکسر تجنیس ہے)

۳۔ یہ اردو عبارت اپنے پاس رکھئے اور زبان کا مزہ چکھئے۔ (ص ۸۴۔ اس فقرے میں زبان، مزہ چکھئے، متناسب لفظ ہیں)

۴۔ ان کی اولاد علم و ہنر کے نتائج میں یکتا ہوئی۔ ص ۸۵ (اولاد اور نتائج مرادف لفظ ہیں)

۵۔ ماضی کا کیا ذکر اور مستقبل کا کیا فکر، حال کی دلیں مفقود ہے۔ ص ۸۵ (ماضی، مستقبل، حال متناسب لفظ ہیں)

۶۔ باد نخوت سے برباد ہوئے۔ ص ۸۶ (باد اور برباد میں تجنیس ہے)

۷۔ فتح و ظفر جب تک اس کے نام پر نہ ہو نیزہ ہرگز قلم نہ ہو۔ ص ۸۷ (اس جگہ رقم، نیزہ، قلم متناسب لفظ ہیں)

۸۔ جب تک زمین پر چتر گردوں سایہ گستر رہے اور اجرام آسمانی سے ہفت اقلیم منور رہے۔ ہندوستان و انگلستان کی فرمانروا وکٹوریہ کا سایہ ہمیلٹن کے سر پر رہے اور اس کے فروغ قدردانی سے ضیاء کا درجہ شمس و قمر سے برتر رہے۔ ص ۸۸ (چتر، گردوں، سایہ، اجرام، آسمانی سے ہفت تعلیم، ہندوستان، انگلستان میں بھی تناسب ہے)

۹۔ جس کے وصال سے دل کو آرام و تسکین ہوئی ہو گی اس کے وصال سے طبیعت حزیں و غمگیں ہوتی ہو گی۔ ص ۸۹ (پہلے وصال سے ملنا اور دوسرے سے وصال بحق یعنی مرنا مراد ہے)

۱۰۔ میں اب تک متاہل و کدخدا نہیں ہوا۔ ایسے معاملوں میں نا اہل ہوں، اگر کوئی بے محل بات زبان سے نکل گئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔ ص ۹۰ (متاہل، کدخدا، معاملہ، اہل، محل، خواستگار متناسب لفظ ہیں)

صنائع و بدائع کی بھرمار سے قطع نظر، بہت سے فقرے زائد اور بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان و محاوروں پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی ہے، ایک جگہ یتیم بے پر، صف ۵ لکھا ہے، ہر جگہ کے بیے جدھر تدھر صف ۱۵ نکالنے کی جگہ قلمی اور مالیدے کے نقالوے صف ۱۴ روانی اور صفائی کی جگہ روانگی استعمال کیا ہے) روانگی سے تر تر بولتا ہے صف ۱۶۔ ایک جگہ لکھا ہے آپ کو اس ضعیفی میں بھی ایسے ایسے داغ لگے، داغ لگنا تو عیب لگنے کو کہتے ہیں، یہاں داغ اٹھانا پڑے، ہونا چاہئے دہلی کے حال میں لکھتے ہیں "آراستگی میں گلی کوچے تک صاف جھاڑے جھٹکے" ص ۱۵ گلی کوچوں کے لیے تو جھاڑنا اور بہارنا بولتے ہیں۔ جھاڑنا۔ جھٹکنا۔ بچھونا وغیرہ کے لیے ہوتا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں سے اگر قطع نظر کیا جائے تو مجموعی طور پر ان کے رقعے اور دوسری نثریں قابل مطالعہ ہیں۔ بعض رقعات تو بہت اچھے ہیں اور نہایت لطف دے جاتے ہیں۔ ذیل کے چار رقعے ملاحظہ فرمائیں۔ زبان کس قدر صاف ہے اور مطالب کتنے واضح، یہ بھی دیکھئے کہ جب دیپ چند اکبر بیگ برادر ہرگوبند، استاد کریم بخش کی کتنی اچھی تصویر ان سطروں میں کھینچ دی ہے:۔

> آپ کے فرمانے کے موافق منشی دیپ چند کا حال لکھتا ہوں۔ میں نے تو ان کو بڑھاپے کی حالت میں دیکھا تھا، وہ بڑے سنجیدہ آدمی تھے اور فارسی زبان، تو ان کو ایسی آتی تھی کہ

شاید ہندوؤں میں اب کوئی ان کے برابر نہیں ہے، اور نہ نکلے گا وہ فارسی زبان میں ایسی رنگین عبارت لکھتے تھے کہ جس کا جواب نہیں۔ علاوہ اس کے منشی دیپ چند خوشنویس بھی پہلے درجے کے تھے، بیچارے اوسط قد کے آدمی تھے اور بہت کم گو اکثر منہ پر رومال رکھتے تھے، اگر کوئی انجان آدمی ان کو دیکھتا تھا کہ یہ اس قدر لیاقت کے آدمی ہیں۔ مجھ عاصی پر بڑی شفقت فرماتے تھے، خدا ان کو بخشے۔ (انشائے اردو حصہ اول ص ۲۱-۳۲)

اکبر بیگ تو بڑے بھلے آدمی ہیں۔ میں شام کو دریبے میں آپ سے ملا ہی تھا۔ ذرا ہی آگے بڑھا ہوں گا۔ کہ سامنے سے حضرت نمودار ہوئے دیکھتا کیا ہوں کہ جناب کے ہاتھ میں رومال ہے، اور ڈاڑھی چڑھی ہوئی ہے، آنکھوں میں سرمہ دیا ہوا ہے۔ پان کی گلوری منہ میں ہے۔ تن زیب کا انگرکھا زیب تن ہے، دو قدم کے فاصلہ پر ملازم خدمت میں رواں ہے، ٹاٹ بافی جوتا پیر میں چڑھا ہوا ہے ادھر ادھر تاکتے جھانکتے چلے آتے ہیں مجھ کو دیکھتے ہی ذرا کنیائے۔ مگر سلام علیک ہوئی۔ اتنا تو میں نے ضرور کہہ دیا پتھر پڑیں تمہاری عقل پر اور خاک پڑے تمہاری اس گز بھر ڈاڑھی پر۔ (ص ۳۶-۳۷)

کیا تم بھی اپنے بھائی ہرگوبند کی طرح باولے بن گئے۔ باولے کے سر کیا سینگ ہیں جو باولے پن کا کام کرے وہی باولا ہے، دن بھر تو چھت پر چڑھے کبوتر اڑاتے ہو۔ اور رات کو انھیں کبوتروں کا کبوتر بازوں میں جا کر چرچا کرتے ہو۔ تمھیں اور بھی کوئی دنیا کا کام ہے۔ بھائی ذرا تو ہوش پکڑو۔ تم کب تک کبوتر اڑاتے رہو گے۔ یہ دن تمہارے واہی تباہی پھرنے کے اور کھیل کود کے نہیں ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ تمہارا باپ ڈپٹی کلکٹر ہے۔ اچھے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھو اچھے کام سیکھو۔ اپنی لیاقت کو بڑھاؤ۔ دیکھیں پھر تمھیں کون برا کہتا ہے۔ لڑکپن میں ہم نے بھی سب کھیل کھیلے ہیں مگر کسی کھیل میں پھنسے نہیں۔ تم تو کبوتروں میں ایسے مصروف ہوئے کہ شاید خواب میں بھی کبوتر ہی نظر آتے ہوں گے۔ خیر اب تک کھیلے جو کھیلے مگر آئندہ سے سنجیدگی اختیار کرو۔ (ص ۵۳)

بیٹا! میں اپنے استاد کا حال تم کو لکھتا ہوں، سنو میرے استاد کا نام کریم بخش تھا، وہ دہلی میں ایک مدت سے آ رہے تھے مگر اصلی وطن ان کا جالندھر تھا، میری قلم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں ان کی زبان دانی اور فضیلت کا حال لکھوں۔ ان کو فن معما میں اتنا دخل تھا کہ ایک شعر میں تین سو ساٹھ نام نکالتے تھے۔ ذرا غور تو کرو۔ وہ کیسے قابل آدمی تھے۔ یہ عاصی ۷، ۸ برس ان کی شاگردی میں رہا اور فارسی زبان کی بڑی بڑی کتابیں ان سے پڑھیں مگر سچ مانو میں اُن کے درجے کو نہیں پہچانتا، بیٹا، وہ فارسی

زبان کے چٹلے تھے، اگر میں ان کے پڑھانے لڑکے کو خاقانی کی مانند بتاؤں تو لوگ یہی کہیں گے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے تشبیہ دی ہے۔ (ص ۶۵)

علمی خطوط لکھنے میں بھی بند نہ تھے۔ شاگرد نے مولوی صاحب سے استفسار کیا ہے کہ نورچشمی کا لفظ مرد کو بھی لکھنا چاہئے یا نہیں۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> نورچشمی کے لفظ پر آگے بھی بحث ہو چکی ہے۔ مرزا محمد حسن قتیل کا قول یہ ہے کہ مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں۔ کس واسطے کہ ی اس میں یائے نسبت ہے یعنی وہ اور جو منسوب ہے آنکھ کی طرف خواہ یائے متکلم ہے، یعنی میری آنکھ کی روشنی، اور یہ جو بعضے لوگ اس کو یائے تانیث جیسا بیٹا یا بیٹی اور پوتا اور پوتی میں ہے سمجھ کر صرف عورت کے واسطے درست جانتے ہیں، سو غلط ہے، اور کسی بزرگ کا کلام یہ ہے کہ نورچشمی میں سوائے یائے تانیث اور کوئی ی نہیں ہو سکتی۔ کس واسطے کہ نورچشم فارسی کا لفظ ہے یائے متکلم اور یائے تانیث کی ترکیب اس کے ساتھ کیونکر درست ہوگی اس کا جواب مرزا قتیل لکھتے ہیں کہ عجمیوں نے فارسی کے الفاظ میں بہت تصرفات کئے ہیں جیسے مُرغن اور مُلَبَّب اور ذوالخورشیدیں وغیرہ، پھر یائے متکلم خواہ نسبت کی ترتیب میں کیا قباحت لازم آتی ہے، اور اگر ایسی ترکیب نادرست سمجھی جائے تو قبلہ گاہی کا لفظ چاہئے کہ ماں کے سوا باپ کو کہنا کبھی درست نہ ہو۔ اور کسی استاد کا شعر ہے جو سند کے طور پر لکھا ہے ؎
>
> نویسد نورچشمی آفتاب آں صفحۂ رو را
> مہ نو قبلہ گاہی گوید اک محراب ابرو را
>
> اور مرزا قتیل کا قول مدلل معلوم ہوتا ہے (انشائے اردو، حصہ دوم ص ۱)

ایک اور طویل خط ملاحظہ فرمائیں جس میں مکتوب الیہ کی بیوی کے مرنے پر تعزیت کے کلمات کہے ہیں اور پھر اردو محاورے کی بحث چھیڑ دی ہے، مولوی صاحب چونکہ مکتوب نگار کی حیثیت سے اس مضمون میں پہلی مرتبہ پیش کئے جا رہے ہیں اور یوں بھی ان کی تصانیف مشہور نہیں اس لیے راقم نے طویل اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اب مکتوب ملاحظہ ہو:۔

> شفقت نامہ پہنچا، مضمون معلوم ہوا۔ آپ کی خانہ ویرانی کا حال معلوم ہوا، خیر رضائے مولیٰ از ہمہ اولیٰ مرض موت لاعلاج ہے اس میں سب کو مبتلا ہونا ہے مگر ہاں آگے پیچھے کا رونا ہے سو اتنی بات کے واسطے جزع فزع کرنا اپنے تئیں سب طرف سے کھونا ہے۔ عوام کا قول ہے کہ بیوی کا مرنا ایسا ہے جیسے کہنی کی چوٹ، ادھر جھلجھلاہٹ ہوئی ادھر سہلایا۔ اچھی ہو گئی۔ مگر عوام کی گفتگو کا کیا اعتماد...... انسان پر یہ جو حادثہ واقع ہو صبر و شکر سے سہنا چاہئے اور ہر طرح سے راضی برضائے خدا رہنا چاہئے۔
>
> آپ نے جو دریافت کیا ہے کہ تم کھا لیجئو۔ اردو کے محاورے میں بولتے ہیں یا نہیں اس کا

جواب سنئے ہاں صاحب بولتے ہیں مگر ہوڈل پول (یہ دو قصبوں کے نام ہیں) کے لوگ دہلی کی زبان دانوں کا ہرگز یہ کلام نہیں۔ ایسے فقروں کا ان کی زبان پر نام نہیں۔ بھلا مجھے بھی تو بتا دیجئے کہ آپ سے ایسے فقرے کون بولا کرتا ہے۔ اگر کوئی حضرات دہلی میں سے ہیں یہ مثل اس پر صادق آتی ہے بارہ برس دہلی میں رہے اور بھاڑ جھوکا۔ اور اگر کہیں باہر کا ہے تو اعتراض کا مقام نہیں۔ بلکہ یہ کلام اُس سے غنیمت ہے تو بہ تو بہ غنیمت کیوں کہوں کمال فصاحت و بلاغت کا درجہ سمجھنا چاہیئے۔ خیر اس سے کیا بحث ہے صحیح قاعدہ یہ ہے کہ لفظ "تم" لفظ لیجو، کے ساتھ جمع نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کی ضمیر میں اس قسم کے امر کے صیغوں کے ساتھ مل کر اس طرح بولے جاتے ہیں تو کھا لیجو، تم کھا لینا، آپ کھا لیجئے گا۔

حضرت آپ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کلام میں بڑی گفتگو ہو رہی ہے یخط کے جواب پر اس امر کا فیصلہ موقوف ہے اس واسطے آپ سے کہتا ہوں کہ ہر ملک کی رفتار گفتار دستار علیحدہ ہے اور کوئی اپنی چھاچھ کو کھٹا نہیں کہتا۔۔۔۔۔ مناسب یہی ہے کہ آپ کسی کے سر نہ ہوں۔ مانا کہ آپ کے مباحثے کا وہ انفصال ہو گیا۔ مگر کہاں تک زبان کا بندوبست کیجئے گا۔ ہر شہر میں جا نہیں سکتے۔ ہر شخص کو قاعدہ بتا نہیں سکتے۔ ہر پڑھنے والے کو روک نہیں سکتے۔ ہر بولنے والے کو ٹوک نہیں سکتے۔ مثل مشہور ہے مارتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے۔ بولتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔

اس مقام پر ایک گزرا ہوا لطیفہ لکھنے کو جی چاہتا ہے ایک شخص کہیں باہر سے میری ملاقات کو آئے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اپنی نظم و نثر سناتے رہے۔ میری سنتے رہے۔ اس کے بعد دہلی محاوروں کی تعریف کرنے لگے اور یہاں کی شائستگی کلام اور شستگی زبان کی توصیف کرنے لگے۔ پھر شاید دل میں یہ سمائی کہ جب تک چوں و چرا نہ نکالوں گا نظر میں کیونکر جچوں گا۔ آخر سوچ سوچ کر بولے کہ دہلی کی زبان دانوں نے مفعول پر لفظ کے تئیں لانا چھوڑ دیا لفظ کو بہت بولتے ہیں۔ مثلاً کتاب کو، اس کو، تم کو، ہم کو اور حقیقت میں یہی کلمہ فصیح ہے۔ مگر کیا سبب ہے کہ اپنے تئیں نبھائے جاتے ہیں اور یہ لفظ کہیں نہ کہیں بولے جاتے ہیں۔ اگر اس کی جگہ آپ کو کہیں تو کیا شان گھٹ جائے۔ میں یہ گفتگو سن کر ان کی دل شکنی کے لحاظ سے اس وقت کے کلام میں اپنے تئیں کی جگہ آپ کو بولنے لگا۔ اور اپنا عجز ان کے سامنے بیان کرنے لگا۔ کہ حضرت مجھے کیا آتا ہے۔ میں تو "آپ کو" کمال نالائق اور بیوقوف جانتا ہوں آپ کو گدھے سے بدتر خیال کرتا ہوں یہ کہتا جاتا تھا۔ اور خود بخود دل میں کہتا جاتا تھا کہ یہ کیا کلمہ زبان سے نکال رہا ہوں۔ مگر کیا کروں ناچار تھا۔ اگر اپنے تئیں بولتا ہوں تو پہلا اعتراض جدا قائم رہتا

ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ دوسری بیوقوفی ثابت ہوتی ہے کہ سمجھانے سے بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ خود ہی قائل ہو گئے کہ ایسے مقاموں میں آپ کو بولنا نامناسب بلکہ محض غلط ہے، اور اپنے تئیں بجا اور صحیح غرض زبان کا معاملہ بہت نازک ہے، اس میں زبان درازی اور زیادہ گویائی کیا ضرور ہے۔

ان دنوں میں افسران فوج کے امتحان کے واسطے جو کتابیں مرتب ہوتی ہیں، میں سرکار کے ایما سے اُن میں مصروف ہوں اس باعث سے شمس الدین محمد حافظ کے دیوان کی شرح کہ میں نے اس کا نام ضیائے شمسی رکھا ہے ناکامل رہ گئی۔ انشاء اللہ جس وقت اس کام سے فارغ ہونگا اس وقت شرح ہے اور میں ہوں۔

فقط ضیاء

(انشائے اُردو حصّہ دوم ص ۸۹-۹۳)

(۱)

لالا صاحب مہرباںؒ! سلامت رہو

ماہ نومبر ۱۸۶۲ء کی بیسویں تاریخ سرکار کی طرف سے گوشت ترکاری کا ٹھیکہ نیلام ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خریدار بہت کم ہیں، مسلمانوں میں تو سکت نہیں، ہندو پرہیز کرتے ہیں۔ ٹھیکہ بہت کفایت سے ہاتھ آجاوے گا پھر تو بڑے فائدے ہوں گے۔ بچت خوب رہے گی۔ تم کو اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھ اکیلے سے بندوبست نہیں ہو سکے گا۔ ایک پتّی کے تم ساجھی ہو جاؤ تو کام بن جاوے، ہم تم مل کر بندوبست جیسا چاہیں کر لیں گے، یہ بات کچھ نہیں کہ گوشت کا ٹھیکہ ہے۔ ہم کو اس میں کیا کام پڑیگا، نوکر چاکر، قلی بکیری بہتیرے کام کرنے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہاتھ نرا حساب دیکھ لینا ہے، آپ اس کا جواب جیسی مرضی ہو جلد لکھ بھیجو۔ فقط

(۲)

لالہ صاحب مہربان سلامت

آپ کا خط گوشت ترکاری کے ٹھیکے میں ساجھے کرنے کے لیے پہنچا، میری رائے میں یہ ٹھیکہ مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں اب بچت بہت ہے یہ بات آپنے سچ فرمائی کہ اس کو نوکر چاکر بھگتا دیں گے، پر یہ تو سوچو کہ ہم ہندو جنم ہیں ہم کو ایسے کام سے الگ رہنا چاہیے، کیونکہ جب یہ حال برادری کے لوگ سنیں گے تو ترنت ذات میں سے نکال دیں گے، حقہ پانی بند کر دیں گے، کوئی بات نہ پوچھے گا، جس کے پاس جاؤ گے دُور دُور، پرے پرے کرے گا، زندگی دوبھر ہو جائے گی، کاروبار بند ہو جاویں گے، شادی، غم، موت، حیات کا کوئی ساتھی نہ ہوگا، بیٹا، بیٹی کا لین دین چھوڑ دیں۔ ناک میں دم آجاوے گا پھر اس حالت میں روپیہ پیسہ ہوا بھی تو کس کام کا۔ میں ساجھی نہیں ہوتا اور نہ تم کو صلاح دیتا ہوں، آپ کو اپنا اختیار ہے۔ اگر نری ترکاری کا ٹھیکہ ہو تو کیا مضائقہ ہے۔

فقط

(۳)

نواب نامدار سلامت

آپ کا خط گھوڑوں کی طلب میں پہنچا اور اس حقیر کو سرفراز فرمایا۔ فدوی نے خط کے پہنچتے ہی ہرکارے تلاش کے لیے بھیجے۔

---

[1] انشائے اردو کے چند اور قدیم رقعات

چنانچہ چار گھوڑے بست خاص، اصیل بے عیب ہزار روپے کو ایک جگہ سے ہاتھ آئے اور ان کو حضور عالی میں ارسال کیا۔ اور بیس اور دو سپاہی ان کے ساتھ کر دیئے۔ امید کہ جس وقت وے حضور میں پہنچیں، اس وقت سرکار کے منشیوں کو حکم ہووے کہ ان کی رسید فدوی کو لکھیں۔

زیادہ حد ادب

(۴)

غریبوں کے پالنے والے! دام اقبالہ

فدوی جیون خاں آداب تسلیمات بجا لا کر عرض کرتا ہے کہ حضور کا فرمانِ عالیشان جو خزانے کے مقدمے میں اس حقیر کے نام صادر ہوا تھا، بندے نے اس کے پہنچتے ہی چھبیس لاکھ رُپے چھکڑوں میں لاد کر کے سپاہی، پیادے، چوکی پہرے کے لیے اس کے ساتھ کر بعض معتمد نوکروں کے سنگ اس مہینے کی چوتھی تاریخ حضور عالی میں ارسال کیا۔

ستارہ اقبال کا نت چمکتا رہے۔

(۵)

فرزند سعادتمند میرے خدا تعالیٰ تمھیں توفیق نیک دیوے

بعد دعا کہ معلوم کرو یہاں سب خورد و بزرگ چنگے ہیں اور لیل و نہار تمھاری خیر و خوبی چاہتے ہیں۔

بھکاری داس پٹواری تمھارے پاس آتا ہے اُسے ایک ہزار انسٹھ روپے سوا آنہ آمدنی سے محصول محل دریبہ بلدیے کی ایک مہینے کے عرصہ میں بلا عذر دے کر رسید لو۔ آئندہ بموجب اسی دستاویز کے یہ رقم حساب محل مذکور کے وضع محسوب و مجرا ہووے گی

بجو قوال کو مطابق سندِ حضور کی عوض سے تحصیل موضع شکارپور کی ایک رپیا یومیہ سابق سے جاری تھا شاید عمل میں بہاری داس کاشتکار کے وہ روزینہ موقوف ہوا، اب تم برس کو نو مہینے کی لیکھے سے شروع سال سن بارہ سے چھتیس فصلی سے اسے اجرا کر دو۔

مدت ہوئی کہ تم نے جمع خرچ پرگنے گودل امرآباد اور سرکار سہری گڑھ کا نہیں بھجوایا۔ چاہئے کہ یہ خط دیکھتے ہی حساب کتاب دونوں کا صاف کر کے، سانڈنی سوار کے ہاتھ روانہ کرو اور اسباب میں توقف جائز نہ سمجھو۔

خان صاحب والاشان دوران خان بہادر دو تین کمال شیر کی اپنی گھوڑی ڈھیٹھ کرے کو طلب کئے ہیں۔ تم اپنے تعلقے کے زمینداروں پر حکم کرو تا وے شتاب پیدا کر دیں۔ جب ہم دست ہوں تب بھجوا دو۔

زیادہ عمر دراز ہووے!

مثنویاتِ رنگین

ڈاکٹر گیان چند

رنگین کی تصانیف میں سب سے بڑی تعداد مثنویوں کے مجموعوں کی ہے۔ گو ان میں سے بیشتر ادبی اعتبار سے قابلِ قدر نہیں۔ خوش قسمتی سے یہ سب انڈیا آفس میں موجود ہیں اور خود رنگین کے ہاتھ کی تحریر ہیں۔ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف کو مختلف مجموعوں میں ترتیب دیا۔ بعض اوقات ایک کتاب کو پہلے ایک مجموعہ میں رکھا اور کچھ عرصہ بعد دوسرے مجموعے میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ ان کی مختلف کتابوں میں ان مجموعوں کی ترتیب۔ گروہ بندی اور عنوانات میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی مختلف لڑیوں کو ترتیب سے سلجھا کر آراستہ کرنا بھول بھلیاں میں راستہ ڈھونڈھ نکالنے سے کم نہیں۔ رنگین نے اپنی بیشتر مثنویوں کے اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے لیکن یہ ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ وہ اپنی تصانیف میں اضافہ بھی کرتے رہے جس کی وجہ سے ایک ہی مثنوی کے مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد میں کمی بیشی پائی جاتی ہے۔

ان کی مثنویوں کی تعداد میں کوئی قطعیت نہیں۔ کیونکہ ان کے اکثر مجموعوں میں کئی مثنویاں ہیں جن میں بعض اوقات یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مثنوی ہے کہ کئی مثنویاں۔ انکی تصانیف کی تفصیل انڈیا آفس اردو مخطوطات کی فہرست میں بھی ہے۔ اور ڈاکٹر صابر علی خاں کے تحقیقی مقالے "سعادت[1] یار خاں رنگین" میں بھی۔ رنگین کی اُردو مثنویوں کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) فرس نامہ۔ ایک ہزار شعر

(۲) مثنوی دل پذیر۔ دو ہزار شعر

ان کا مجموعہ نورتن دواوین۔ قصائد اور نثر پر مشتمل ہے لیکن اس کے بعض دواوین میں چند مثنویاں بھی موجود ہیں جو ذیل میں ۳ سے ۵ تک درج کی جاتی ہیں:۔

(۳) مثنوی اوّل[2] بطورِ خط بنام بی فرخندہ طوائف ۷۳ شعر۔ شامل دیوان ریختہ

(۴) مثنوی دوم[3] " " " ۷۴ شعر " "

(۵) اشعار چند[4] بطور مثنوی دیوان ریختہ میں

---

[1] سعادت یار خاں رنگین ص ۴۷۱ تا ص ۴۷۴

[2] ایضاً ص ۲۲۴

[3] ایضاً ص ۲۲۷

[4] ایضاً ص ۵۰۸

(۶) نہایت فحش مثنوی[5] الہ آباد کے صوبہ دار گمپت رائے کے بیٹے راجہ مداری لعل کی ہجو میں۔ شامل دیوان آمیختہ

(۷) مثنوی سیر باغ۔ دیوانِ انگیختہ یعنی دیوانِ ریختی میں۔

(۸) نامۂ زنانی۔ دیوانِ انگیختہ یعنی دیوانِ ریختی میں۔

(۹) مثنوی نیرنگِ رنگیں[6] در ہندی بطرزِ میر حسن۔ ایک ہزار شعر۔ ۱۰ تا ۱۲ تین حکایات پوربیوں کے بارے میں مجموعۂ رنگیں میں۔

ذیل میں ان کی مثنویوں کے مجموعے ششِ جہتِ رنگین کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

(۱۳) ایجادِ رنگیں یا موجدِ رنگیں	۱۲۰۰ شعر		ششِ جہتِ رنگیں
(۱۴) عجائبِ رنگیں در ظرافت و ہزل۔ ۳۲ حکایات	۵۰۰ شعر	شنائے رنگیں یا عجائب و غرائبِ رنگیں ۱۰۰۰ شعر	
(۱۵) غرائبِ رنگیں در تصوف۔ ۲۲ حکایات	۵۰۰ شعر		
(۱۶) شہر آشوبِ رنگیں	۲۰۰ شعر	مثلثِ رنگیں ۶۰۰ شعر	
(۱۷) مثلہائے رنگیں یا کہاوتہائے رنگیں یا داستانِ رنگیں	۲۰۰ شعر		
(۱۸) حکایاتِ رنگیں	۲۰۰ شعر		
(۱۹) مربعِ رنگیں یا چار چمنِ رنگیں۔ ۴۴ حکایات در معاد در معاش۔ در ظرافت در تصوف		۱۰۰۰ شعر	
(۲۰) اپنے بھائی خدا یار خاں کے نام خط	۱۶۳ شعر	مخمسِ رنگیں یا پنجۂ رنگیں ۷۰۰ شعر	
(۲۱) عباد اللہ پسر تاجرِ اصفہان کا قصہ	۱۴۶ شعر		
(۲۲) چھکو طوائف کی ہجو	۱۹۸ شعر		
(۲۳) الٰہی بخش معروف کو خط	۶۱ شعر		
(۲۴) پیرزنِ میوات کی کہانی			
(۲۵) دلی میں کسی شخص کے نام خط		مسدسِ رنگین یا گلدستۂ رنگیں ۵۰۰ شعر	
(۲۶) اسی شخص کو دوسرا خط موسومہ بہ مثنوی چار باغ	۱۶۸ شعر		
(۲۷) نامہ بہ لالہ بسنت سنگھ نشاط دہلوی			
(۲۸) نامہ بہ حکیم محمد اشرف دلی			
(۲۹) نامہ بہ خواجہ محمود بنارس			
(۳۰) نامہ بہ مرزا محمد ابراہیم بنارس			

---

[5] سعادت یار خاں رنگیں ص ۲۳۱

[6] ششِ جہتِ رنگیں از تمکین سروری صاحب۔ رسالہ اردو جنوری سنہ ۵۲ء

ڈاکٹر تحسین سروری کے پاس شش جہتِ رنگیں کا ایک مخطوطہ ہے جس میں مندرجہ بالا ترتیب ہے۔ بلوم ہارٹ نے بھی ترتیب سے درج کیا ہے لیکن ڈاکٹر صابر علی خاں نے اپنے مقالہ میں صفحہ ۱۵۲، اور ص ۲۷۴ پر مندرجہ بالا ابتدائی چھ مثنویوں ں ۱۳۱ تا ۱۵۱ ہی کا نام شش جہتِ رنگیں قرار دیا ہے لیکن ص ۱۳۱ پر مثلثِ رنگیں۔ چار چمنِ رنگیں اور بہجۂ رنگیں کو ص ۲۰۲ پر رچمنِ رنگیں عرف مرحِ رنگیں —— کو اور ص ۲۱۶ پر مسدسِ رنگیں کو شش جہتِ رنگیں کا جزو مانتے ہیں جس سے معلوم ہے کہ ہماری فہرست ہی صحیح ہے۔

ان کے علاوہ دو مجموعے خمسۂ رنگیں اور سبع سیارۂ رنگیں ہیں۔ خمسہ اور سبع سیارہ کے چار چار حصے اردو مثنوی پر تل ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ ان کے جو اجزا اردو مثنوی کے سوا کچھ اور ہیں۔ انھیں قوسین میں یا گیا ہے

(۳۱) جنگ نامۂ رنگیں سنہ ۱۲۴۵ھ		خمسۂ رنگیں
(۳۲) دلی کے بدھو گل فروش کی داستانِ عشق	۵۰۰ شعر	
(۳۳) نصابِ رنگیں یا نصابِ ترکی (چوتھا جزو۔ فارسی نظم)	۵۰۰ شعر	
(۳۴) حکایاتِ رنگیں	۵۰۰ شعر	
(۳۵) تصنیفِ رنگیں		سبع سیارۂ رنگیں
(۳۶) گلدستۂ رنگیں (تیسرا جزو بہجۂ رنگیں۔ رباعیات) (چوتھا جزو رنگیں نامہ۔ غزلیات	۴۰۰ شعر	
(۳۷) ساقی نامہ رنگیں (چھٹا جزو تجربۂ رنگیں اردو نثر)		
(۳۸) کلامِ رنگیں ۔ ۱۱ حکایات		

ڈاکٹر بلوم ہارٹ نے ایک اور مجموعے پنجۂ رنگیں کا ذکر کیا ہے جس کی محض دو مثنویوں کے نام اور تفصیلات درج ہیں۔ ٹر صابر علی خاں کے مقالے میں ان دونوں مثنویوں کا ذکر نہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(۳۹) نظمِ رنگیں۔ سنہ ۱۲۲۰ھ ۱۰۰ لطیفے۔ پنجۂ رنگیں کا چوتھا جزو۔ ابتدا

حمد کے قابل نہیں میری زباں ۔ حمد مجھ سے ہو سکے کیونکر بیاں

(۴۰) داستانِ رنگیں۔ سوداگرِ گجرات آغا عزیز کی کہانی۔ باندہ میں رنگیں کے کسی دوست نے یہ قصہ سنایا۔ رنگیں اسے ۲۱ دن میں سنہ ۱۲۳۳ھ میں نظم کر دیا۔ یہ پنجۂ رنگیں کا پانچواں جزو ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:-

حمد اس کی میں کروں کیونکر رقم   حمد لکھ سکتے نہیں لوح و قلم

ان کے علاوہ ذیل کی نظمیں بھی مثنویاں ہیں۔

(۴۱) قوت الایمان۔ ۱۱۰۰ اشعار کی مذہبی مثنوی سنہ ۱۲۴۳ھ

(۴۲) ترجمۂ قصیدہ غوثیہ۔ سنہ ۱۲۵۰ھ شیخ عبدالقادر جیلانی کی عربی نظم کا ترجمہ۔ بلوم ہارٹ نے اس کے اشعار کی تعداد ۲۹ لکھی ہے اور ڈاکٹر صابر علی خاں[1] نے ۱۱۰۔

(۴۳) ترجمۂ بانت سعاد۔ سنہ ۱۲۵۰ھ کعب ابن ظہیر کے مشہور عربی قصیدے کا ترجمہ بلوم ہارٹ کے مطابق ۵۹ شعر اور ڈاکٹر صابر علی خاں کے بقول ۱۶۰ شعر ہیں۔ امتحانِ رنگیں میں رنگیں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے ۱۱ بحروں میں ۴۲ مثنویاں نظم کیں جن میں تقریباً ۲۰ ہزار شعر ہیں۔ مندرجہ بالا فہرست میں پنجابی، پوربی اور دوسری زبانوں کی مثنویاں شامل نہیں کی گئیں لیکن جہاں تک اردو مثنویوں کا تعلق ہے۔ مندرجہ بالا فہرست جامع معلوم ہوتی ہے۔ ان میں کوئی ۱۴ ہزار اشعار ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کے سری رام سیکشن میں رنگین کا قلمی کلیات ہے۔ جس میں ۱۴ مختصر مثنویاں ہیں۔ ہجو مکان، ہجو سراپا، ہجو زیور وغیرہ۔ مخطوطہ کے مرتب نے انھیں علیحدہ مثنویوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ چھکو طوائف کی ہجو (مخمسِ رنگیں کا تیسرا جزو) کے اجزا ہیں۔ واضح ہو کہ یہ نام نہاد کلیات رنگین کے بہت تھوڑے کلام پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر صابر علی خاں نے رنگیں کی تمام مثنویوں کو غیر مطبوعہ[2] قرار دیا ہے۔ لیکن دراصل ان کی حسب ذیل مثنویاں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) ایجادِ رنگیں۔

(۲، ۳) ریختی کی مثنویاں سیر باغ اور نامۂ زناخی رنگین انشا نامی کتاب میں شائع ہوئی ہیں۔

(۴) عجائب و غرائبِ رنگیں کا ایک انتخاب مظہر العجائب کے نام سے سنہ ۱۲۶۲ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(۵) مستزادِ رنگیں ڈاکٹر تحسین سروری نے سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی میں شائع کی۔ اس کی ایک مثنوی چہار باغ سنہ ۱۲۶۶ھ میں علیحدہ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۶) تصنیف رنگین یا فوائد اسلام (سبع سیارہ کا جزو) سنہ ۱۲۶۱ھ میں ایجادِ رنگین کے ساتھ ایک ہی جلد میں شائع ہوئی۔

(۷) گلدستۂ رنگین سبع سیارہ کی دوسری مثنوی ہے جس کے ہر شعر میں صنعت تجنیس ہے۔ اسے مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے شائع کیا۔

(۸) فرس نامہ کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کی ترتیب کی دو منازلِ ارتقا میں نقشِ اول سنہ ۱۲۱۰ھ میں ظہور میں آیا اور اس میں سات سو اشعار ہیں۔ نقشِ ثانی سنہ ۱۲۲۲ھ میں مکمل ہوا اور ایک ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ دونوں قسم کے کئی مخطوطات ملتے ہیں۔

رنگین کی مثنویوں کے اس انبار میں صرف ایک ایسا جواہر پارہ ہے جو نظر کو خیرہ کر کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بقیہ مثنویوں کو دوسرا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں اسی جواہر ریزہ کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] سعادت یار خاں رنگین ص ۳۸۶

[2] ایضاً ص ۴۷۱

مثنوی دلِ پذیر

یہ اُردو کی چند بہترین داستانی مثنویوں میں سے ہے لیکن یہ جتنی بلند پایہ ہے اتنی ہی گمنام ہے۔ اس مثنوی کا نام "قصۂ مہ جبیں و نازنین زرائی سری نگر مشہور ہے۔ حسرت موہانی اس کے بارے میں یہ لکھتے ہیں۔

[1] رنگین کے ثبوتِ کمال کے دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی مثنوی دل پذیر اپنے زمانہ کی تمام اُردو مثنویوں سے بہتر ہے۔ زبان اس کی نہایت صاف اور ستھری ہے اور حکایت بھی دلچسپ ہے اور ترکیب و نگارش ایسی بے تکلف کہ اس زمانے کے تمام بڑے بڑے شعرا نے یک زبان ہو کر اس کی تعریف کی ہے۔ ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ آشفتہؔ شاگردِ میر محمدی مائلؔ۔ قتیلؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاؔ اور جرأتؔ وغیرہ کے تعریفی قطعات آخر میں درج ہیں چنانچہ جرأت کا مصرع ہے۔

ع ہے یہ بدرِ منیر سے بہتر

رنگین نے ہر داستان کی ابتدا میں اس کے اشعار کی تعداد لکھ دی ہے۔

ایک سو پانچ دن میں ہے یہ کہی — روز و شب تھی تلاش اس کی رہی
شعر ہیں دو ہزار اس کے تمام — اور ہے دلپذیر اس کا نام

جرأت نے تاریخ کہی ؎

کہی تاریخ یہ قسم کھا کر — "ہے یہ بدرِ منیر سے بہتر"
۱۲۱۳ھ

مثنوی کی ابتدا میں شاہ عالم۔ مرزا سلیمان شکوہ اور نواب وزیر علی خاں کی مدح ہے۔ مصنف یہ نظم وزیر علی خاں کے حضور میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ وزیر علی ۲۹ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ کو تخت پر بیٹھے اور ۳ شعبان ۱۲۱۲ھ کو معزول ہو گئے اور اسی دن سعادت علی خاں مسند نشین ہو گئے۔ مثنوی میں وزیر علی خاں کو حاکمِ وقت دکھایا گیا ہے حالانکہ تاریخ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے۔ ہوا یوں ہو گا کہ رنگین نے اواخرِ ۱۲۱۲ھ میں مثنوی کا آغاز کیا اور حاکمِ وقت وزیر علی کی مدح لکھی۔ ساڑھے تین مہینے میں مثنوی پایۂ تکمیل کو پہنچی تو ۱۲۱۳ھ کا اوائل تھا۔ مثنوی کی تاریخ ۱۲۱۳ھ ٹھہری۔ اس وقت وزیر علی معزول ہو چکے تھے۔

اس مثنوی کے تین نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور اسٹیٹ لائبریری رامپور میں۔ رامپور کا نسخہ بڑا صاف اور خوشخط ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۲۱ھ میں دلّی میں ہوئی۔ اس کے آخر میں لکھا ہے

'بدستخطِ مصنفِ مذکور تحریر یافت'

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا نسخہ ہے۔ مثنوی کا قصہ رائج الوقت مثنویوں سے زیادہ پیچیدہ اور دلچسپ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔
خاور شاہ یلغار کا بادشاہ تھا۔ ستر سال کی عمر تک اس کے اولاد نہیں ہوئی۔ نجومیوں نے کہا تھا تمہاری بیوی کے بطن سے

---

[1] رنگین از حسرت۔ اُردوئے معلیٰ فروری ۱۹۱۰ء

ہوگا لیکن ۱۴ سال تک تصویر یا کاغذ اس کی نظروں کے سامنے نہ آنے پائے۔ کیونکہ وہ کسی کی تصویر دیکھ کر عاشق ہوگا۔ بادشاہ مشوش ہوا۔ اس کے وزیر روشن رائے نے کہا کہ حق شناس نامی دو صد سالہ درویش سے رجوع کرنا چاہیے۔ درویش نے بتایا کہ کوہ قاف کے پاس مرغزار میں ایک حصارِ سحر ہے۔ اس میں پریاں قید ہیں۔ میں تجھے اسم اعظم سکھاتا ہوں تو حصار میں بیٹھ کر اسم اعظم پڑھنا۔ قلعہ گر جائے گا اور کوئی پری ہاتھ لگ جائے گی۔"

بادشاہ نے دوسرے وزیر عاقل کو انتظامِ مملکت کے لیے چھوڑا اور خود روشن رائے وزیر اور حق شناس درویش کو لے کر پیدل چل دیا۔ کچھ دنوں بعد ایک پہاڑ پر ایک مقفل گنبد نظر آیا۔ بادشاہ نے اسم اعظم کے زور سے قفل کھولا۔ اندر ایک قفس میں ایک قمری تھی۔ بادشاہ نے اسم اعظم دم کرکے قفس کھولا۔ قمری نکل کر پرواز کر گئی۔ فوراً کچھ دیو دوڑتے آئے لیکن بادشاہ اور اس کے رفقا جلد ہی باہر نکل گئے اور ایک حصار کھینچ کر اس میں بیٹھ کر اسم اعظم کا ورد کرنے لگے۔ قلعۂ سحر کی مالک ساحرہ اور دیووں نے انھیں ڈرانا چاہا لیکن بے سود۔ اسم اعظم کی تاثیر سے قلعۂ سحر کے کچھ برج گر پڑے۔ آخر ساحرہ نے صلح کر لی اور وہ قمری یعنی پریوں کی شہزادی مہ لقا ان کے حوالے کر دی۔ یہ مہ لقا کو لے کر واپس چلے۔ راستے ہی میں خاور شاہ اور مہ لقا سے شہزادہ مہ جبیں پیدا ہوا۔

نجومیوں کے مطابق کاغذ سے خدشہ ہونے کے باعث شہزادہ کو پڑھایا لکھایا نہیں گیا۔ جب وہ ۱۴ سال کا ہوا، تو بادشاہ نے تخت اس کے حوالے کر دیا۔ روشن رائے کا لڑکا دانشور وزیر ہو گیا۔ سوءِ اتفاق سے ایک تاجر نے ایک پری لقا کی تصویر شہزادہ کو دکھائی۔ شہزادہ اس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ سلطنت کو چھوڑ کر دانشور وزیر کی معیت میں تلاشِ محبوب کی مہم پر نکلا۔ جب یہ کافور دیس میں پہنچے تو وہاں کی ماہرِ سحر رانی شہزادہ پر فریفتہ ہو گئی۔ شہزادہ کے رضامند نہ ہونے پر اس نے اسے مینڈھا بنا دیا۔ دانشور نے رانی کی دایہ کی منت سماجت کی۔ دایہ کا دل پسیج گیا۔ ایک رات اس نے ایک سحر پڑھا۔ ہوا پر ایک شجر اڑا جا رہا تھا وہ رک گیا۔ اس پر مہارانی نامی ایک نازنیں بیٹھی تھی۔ شجر کے ٹھہرائے جانے پر اوّل وہ ناراض ہوئی لیکن دایہ نے اس کی خوشامد کرکے شہزادہ کا ماجرا بیان کیا۔ مہارانی فنِ سحر میں کامل تھی۔ اس نے شہزادہ کو آدمی بنا دیا۔ اور اسے اور وزیر زادہ کو شجر پر بٹھا کر پرواز کی۔

مہارانی منتر کے زور سے روزانہ جادو کا درخت منگاتی تھی اور اس پر بیٹھ کر آدھی رات کو اپنے محبوب والیٔ اجین راجہ پرمتی راج کے پاس جاتی اور دن نکلنے سے پہلے واپس آجایا کرتی تھی۔ یہ کارواں اجین کے پاس اترا۔ رانی نے شہزادہ کو منہ بولا بھائی بنا لیا۔ اسے شجر بلانے کا منتر سکھایا اور اپنے چند زیورات دے کر وداع کیا۔ یہ دونوں جگہ جگہ کی سیر کرتے بنارس پہنچے وہاں ایک دوکان کھول لی اور دکان میں وہ تصویر لگا دی۔ ایک دن ایک شخص نے تصویر دیکھ کر کہا کہ یہ سری نگر کی رانی نازنیں ہے۔ اسے مرد سے نفرت اور راگ سے رغبت ہے۔ اس کے شہر میں مرد کا نام نہیں۔

دونوں سری نگر پہنچے۔ زنانہ لباس پہن کر وہاں کے بہترین باغ دل کشا میں داخل ہوئے اور رات بھر وہیں مقیم رہے۔ صبح کو شہزادی کی کنیزیں پھول چننے آئیں۔ اس وقت شہزادے اور دانشور نے اس خوبی سے نے نوازی کی کہ کنیزیں بے ہوش ہو گئیں۔ دوپہر کو پھول لے کر پلٹیں تو رانی بڑی خفا ہوئی۔ انھوں نے حقیقت بیان کی۔ دونوں کو بلایا گیا۔ شہزادے نے اپنا نام نورنائی

اور وزیر نے بی فضیلت بتایا۔ اگلے دن ہولی تھی۔ قلعہ کے اوپر شہزادی تین چار ہزار عورتوں کے ساتھ موجود تھی۔ نیچے وزیرزادی بہروپ بدلے تین چار ہزار عورتیں ہاتھیوں پر سوار کھڑی تھیں۔ فریقین میں خوب رنگ۔ گلال وغیرہ کے مقابلے ہوئے۔ رات کو دربار میں چراغاں کیا گیا۔ باغ میں محفل ہوئی۔ دو گھڑی رات رہے رانی نے نور بائی کا گانا سنا۔ گانے سے خوش ہو کر کہا جو چاہے مانگ لو۔ شہزادے نے مردوں سے نفرت کی وجہ پوچھی۔ رانی نے کہا "میں پہلے جنم میں قمری تھی۔ میرا نر میرے ساتھ تھا۔ ایک مرتبہ بن میں آگ لگ گئی۔ نر مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تب سے مجھے مردوں سے نفرت ہو گئی" اس کے بعد رانی نے نور بائی کو بہت سا مال و زر انعام میں دیا۔ دونوں پھر روز رہ کر ایک رات پچھلے سے فرار ہو گئے۔

بنارس آکر انھوں نے پانسو ہتھیار بند ۲۰ سالہ نوجوان ساتھ لیے اور سری نگر پہنچے۔ شہر کے باہر سب زنانہ لباس پہن کر منتشر ہو گئے اور شہر میں داخل ہو کر ایک مکان میں جمع ہو گئے۔ آدھی رات کو باغ میں پہنچے اور پہرہ داروں کو مار کر اندر داخل ہوئے۔ صبح کو وزیرزادی کی کمان میں دستہ آیا۔ مردوں نے دستہ کو شکست دی۔ شہزادہ باغ میں ایک علیحدہ مکان میں نقاب ڈالے بیٹھا تھا۔ رانی بذاتِ خود صلح کے لیے حاضر ہوئی۔ وزیر نے کہا "حضور کو عورتوں سے نفرت ہے۔" رانی نے شہزادے کے پاس جا کر نفرت کی وجہ پوچھی۔ شہزادے نے تصنع سے وہی قصہ الٹ کر سنا دیا یعنی اس میں یہ ترمیم کی کہ مجھے مادہ قمری آتش زدگی میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ رانی کو حیرت ہوئی۔ اس نے اپنا ماجرا سنایا۔ معلوم ہوا ازل سے دونوں کا سنجوگ ہو چکا تھا۔ شہزادے نے شادی کے لیے یہ شرط رکھی کہ رانی اسلام قبول کرے۔ رانی اپنے تمام رفقا سمیت مسلمان ہو گئی۔ شہزادہ اور رانی کا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد وزیر اور وزیرزادی کی شادی ہوئی۔ پھر روزانہ سپاہ کے ایک جوان کی شادی رچائی جاتی۔ آخر میں شہزادے نے منتر سے پیڑ منگایا اور اس پر چڑھ کر نازنین کو لے کر اپنے شہر واپس ہو گیا۔

مروجہ داستانوں سے اس قصے کی علیحدگی اور تنوع نمایاں ہے۔ دوسری مثنویوں کی ابتدا میں یہ لکھنے کے بعد کہ بادشاہ کے اولاد نہ تھی اگلا جملہ یہی ہوتا تھا کہ اس کے بیٹا پیدا ہوا لیکن رنگین نے ہیرو کی ولادت کے لیے بھی ایک بڑی مہم سر کرائی۔ جو ہیرو انسان اور پری کے میل سے پیدا ہو گا وہ کتنا حسین ہو گا۔ کالو دیس۔ اجین، بنارس اور سری نگر وغیرہ کا ذکر کر کے مصنف قصے کو ہندوستان کی سرزمین پر لے آیا ہے اور ان مقامات کی خصوصیات بیان کیے بغیر ملکی فضا پیدا کر دی ہے۔

پریوں کے تخت۔ اڑن کھٹولے یا اڑنے والے غالیچہ کی بجائے منتر سے اڑنے والا درخت پیدا کرنا رنگین کے تخیل کی خوشگوار جدت ظاہر کرتا ہے لیکن یہ نیا خیال نہیں۔ قدیم سنسکرت ادب میں اس کا جا بجا ذکر ہے۔ ہتوپدیش کی دوسری کتھا کی چوتھی ذیلی کہانی میں۔ کتھا سرت ساگر میں اور بیتال پچیسی کی گیارھویں کہانی کے لیے سمندر کی تہ سے ایک پیڑ سطح آب پر آتا ہے اور راجہ اس پر بیٹھ کر پاتال لوک کو جاتا ہے۔

رانی کا مرد سے نفرت کرنا اور فاختہ کا واقعہ طوطی نامہ کی ایک حکایت سے لیا گیا ہے۔ اس وقت تک اردو طوطا کہانی نہیں لکھی گئی تھی اس لیے رنگین کا ماخذ فارسی طوطی نامہ کی شاہِ چین اور شہزادیٔ روم کی کہانی ہے۔ وہاں بھی بادشاہ شہزادیٔ روم کو اپنی تدبیر سے حاصل کرتا ہے۔ کہانی میں کچھ اختلاف ہے لیکن طریقہ یہی ہے۔ غرض اس مثنوی کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں مروجہ فارسی داستانوں کی نسبت جدت اور تازگی ہے۔

اور حسرت کی رائے درج کی جاچکی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے بعد شمالی ہند کی بہترین داستانی مثنوی ہے۔

اس مثنوی میں ہیرو کا کردار جاذب توجہ ہے۔ وہ حسین ہونے کے علاوہ بڑا ذی فہم اور باعمل انسان ہے۔ وہ ہر مشکل کا صحیح حل سوچ سکتا ہے اور اسے حسن عمل سے سرانجام دیتا ہے۔ بیش بہا اشیاء کی دکان پر تصویر لگا کر شہزادی کا سراغ لگانا۔ نور بائی بن کر رانی سے مردوں کی نفرت کا راز معلوم کر لینا۔ جوانوں کو زنانہ لباس میں لے جاکر فوج کشی کرنا اور عورتوں سے نفرت کا ڈھونگ رچا کر شہزادی کو رزم کرنا، اس کی ذکاوت اور سیاست گری کے ثبوت ہیں۔ جوانوں کو منتشر کر کے شہر میں داخل کرنا۔ ایک مکان میں جمع ہونا اور پھر باغ پر دھاوا بولنا کسی فوجی جنرل کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اردو کی اکثر مثنویوں کے اکثر ہیرو اوسط درجے کی صلاحیتوں والے ہوتے ہیں لیکن مثنوی دلپذیر کا ہیرو اپنے جاندار کردار کے باعث گلزارِ نسیم کے تاج الملوک کا ہم عناں ہے۔

اس شاعرانہ مثنوی میں مختلف قسم کے حسین بیانات ہیں۔ باغ کا سماں۔ رانی کا ہولی کھیلنا۔ محفل آرائی۔ شادی کے جشن کے مرقعے سب بڑی تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ بزم شبی اور جشن ہولی کے بیان میں رنگین نے بڑا زور دکھایا ہے۔ ساتھ ہی زبان نہایت رواں اور شستہ ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگا۔ تصویر دیکھ کر شہزادہ غش ہوتا ہے تو کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں

کوئی بولا کہ کیوڑا لاؤ   کوئی بولا گلاب منگواؤ
گھس کے صندل کوئی سنگھانے لگا   بید مشک آ کوئی پلانے لگا
پانی منہ پر کوئی چھڑکتا تھا   کوئی فراش کو جھڑکتا تھا

شہزادہ جب کافور دیس کی رانی سے راضی نہیں ہوتا تو وہ اسے یہ پیغام بھیجتی ہے۔

ساحرہ کا طیش آمیز لہجہ ملاحظہ ہو ؎

اور جو وہ راہ پر نہ آوے گا   تو پھر اپنا کیا ہی پاوے گا
قسم اب مجھ کو کلوا پیر کی ہے   آن اس اپنے سانچے بیر کی ہے
اور سونا چماری کی سوگند   سالہا اس کو میں رکھوں گی بند
ناک میں میری جان آئی ہے   مجھے ابلیس ہی کی دہائی ہے
جو نہ مانے گا وہ کہا تیرا   تو سہے گا بہت ستم میرا

کالا مینڈھا اسے بناؤں گی
انگلیوں پر غرض نچاؤں گی

سری نگر کے باغ دلکشا کا مرتبہ اور رنگین کی علوئے تخئیل دیکھئے۔

تھی جو گرد اس کے چار دیواری   کی تھی اس طرح اس کی تیاری
لاکھ ہا من کرنڈ پسوا کر   کیوڑے سے پھر اس کو گندھوا کر
اس کی اینٹیں غرض بنھائی تھیں   صرف صندل ہی میں پکائی تھیں

عود میں موتیوں کو تھا ابھرنا   پیراں کا پکا یا تھا جڑنا
سُرخ یاقوت پیس کر باریک   کی تھی سرخی یہ اس کی خاطر ٹھیک

باغ کے در کی چوکھٹیں مونگے کی۔ سردلیں سونے کی۔ دُرِّ نجف کے کواڑ اور ان پر صدف کا پچّا تھا۔ مبالغہ یقیناً ہے لیکن تخیل کی زرخیزی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر زر و جواہر کی یہ افراط تصنّع ہے تو باغ کے اندر کا خوشگوار منظر ملاحظہ کیجئے۔

پھول وہ جن کی ہے جہاں میں نمود   سو وہ اس باغ میں تھے سب موجود
تھا چمن کوئی نسترن سے بھرا   اور تھا کوئی یاسمن سے بھرا
موتیا رائے بیل داؤدی   تھی کہیں زرد اور کہیں اودی
ایک سمت آبشار کا تھا وہ شور   ایک رُخ کوکتے تھے ابر میں مور
نعرہ بھرتی تھی اک طرف بلبل   ایک سُو کر رہی تھی قمری غل

رنگین کا بیان سادہ ہے۔ استعارہ، مبالغہ یا تخیل کی موشگافی کو بروئے کار نہیں لائے۔ باغ میں ہندوستانی اور ایرانی دونوں اجزا مخلوط ہیں۔ لیکن اس مثنوی کا بہترین بیان ہولی کی رنگا رنگی و سرمستی کا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یوں غرض آئی بہرہ ور ہے اِدھر   یہاں کھڑی نازنین ہے کوٹھے پر
چلتی ہے دو طرف سے پچکاری   مینہ برستا ہے رنگ کا بھاری
بادل آتے ہیں گھر گلال کے لال   کچھ کسی کو نہیں کسی کا خیال
ہاتھ میں جس کے وہاں ہزارا ہے   ایک عالم کو اس نے مارا ہے
مٹھی چلتی ہے زور کی جوں تیر   اُڑ رہا ہے گلال اور عبیر

محفلِ شبی میں شہزادی زعفرانی لباس پہنتی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستانی عورتوں کے قدیم لباس کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔

پہنا شبنم کا لہنگا کلیوں دار   زعفرانی جو تھا سیا تیار
ساری کلیوں پر اس کی تھا گوٹا   اور نیفہ روپہری ناس کا تھا
اوپر اس کے بنت لگائی تھی   لہر دونوں طرف سے لائی تھی

جشنِ ہولی میں رات کو بعض عورتیں بہروپ بنا کر آئی تھیں۔

جی میں اپنے سمجھ کوئی اچھا   پہن آئی تھی پوت کا لچھا
بائی منکا کسی نے پاؤں میں ڈال   تھا کیا اور چیز کا نہ خیال
وہ جو تھی کانچ کی بڑی سمرن   لی تھی سو کان میں کسی نے پہن
وہ جو بنیاں تھیں لیلےٰ و مجنوں   اصل سے نقل ان کی تھی افزوں
اور ہی سوانگ کوئی لائی تھی   کہ فرنگی وہ بن کے آئی تھی

مثنوی کے آخر میں شہزادے کے ساتھی شہزادے سے مراجعتِ وطن کی درخواست کرتے ہیں۔

بندوبست اپنا کیجئے پھر کر نیک نامی یہ لیجئے پھر کر
سلطنت کو سنبھالئے صاحب اور رعیت کو پالئے صاحب

کیا مندرجہ بالا دو شعروں کی زبان ایسی نہیں جیسی نواب مرزا شوق کی مثنویوں کی ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ یہ مثنوی اٹھارویں صدی میں لکھی گئی یعنی سحر البیان سے محض چودہ سال بعد وجود میں آئی لیکن جہاں تک متروکات اور زبان کی فرسودگی کا سوال ہے۔ یہ سحر البیان سے کم از کم پچاس برس آگے ہے۔ اس میں متروکات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس مثنوی کا حسن ہولی اور محفل شب کے بے پناہ اور مفصل بیانات۔ اس کی سادہ پرکاری اور اس کی شستہ زبان میں ہے۔ اس نظم میں کمی ہے تو یہ کہ شدتِ احساس اور وارداتِ قلبی کے بیانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ گدازِ قلب اور سعادت یار خاں رنگین وہ ضدین ہیں جن کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔

رنگین کی مثنویوں میں یہی مثنوی اعلیٰ درجے کی ہے لیکن صرف اسی مثنوی کی بدولت رنگین اُردو کے اچھے مثنوی نگاروں میں جگہ پا جاتے ہیں۔ جس قابلِ قدر مثنوی کا مصنف کے ہاتھ کا دیدہ زیب نسخہ موجود ہو۔ اسے منظرِ عام سے اوجھل رہنے دینا اُردو اداروں کی کتنی بڑی غفلت ہے۔

عظمت اللہ خان

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

طرزِ مثنوی کا پرستار

جدید دور کا ایک اہم رجحان گیت کی مقبولیت ہے۔ گیت یا دوہے اُردو میں نئی چیز نہیں مگر متاخرین کے زمانے تک یہ محض تفریحِ طبع کے لیے لکھے جاتے تھے اور انھیں کوئی ادبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اُردو میں گیت کی باقاعدہ ابتدا دوسری جنگِ عظیم کے بعد محمد عظمت اللہ خاں کی شاعری سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کے اثر سے ہندوستانی ادب میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور انگریزی ادب کے مطالعے سے ہماری شاعری میں ملکی اور قومی احساس گہرا ہونے لگا تھا۔ حالی کی آواز آہستہ آہستہ نیا جادو جگانے لگی تھی۔ اُردو نئی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مغربی شعر و ادب سے استفادے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی قدیم عوامی روایتوں کا بھی از سرِ نو جائزہ لینے لگی تھی۔ چنانچہ ان حالات میں ہمارے شاعروں کا گیت کی طرف متوجہ ہونا ناگزیر تھا۔ اُردو میں اس رجحان کے امام محمد عظمت اللہ خاں ہیں۔ حالی کے بعد محمد عظمت اللہ خاں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نئے تقاضوں کو سمجھنے پر زور دیا۔ حالی نے فرسودہ روش سے ہٹ کر اُردو میں دیسی الفاظ کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ محمد عظمت اللہ خاں نے گیت کی روایت کو فروغ دے کر اُردو شاعری میں عوامی احساس کو ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی۔ حالی اصلاح پسند تھے، یہی غزل کے خلاف آواز اٹھانے کے باوجود انھوں نے "شاہدۂ حق کی گفتگو" کے لیے روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھا تھا۔ اس کے برعکس عظمت اللہ خاں بت شکن تھے۔ نئے طرز کی شاعری کے لیے زمین صاف کرنے میں انھوں نے نسبتاً زیادہ سختی سے کام لیا۔ وہ ہندی اور انگریزی ادب کے رمز شناس تھے اور اُردو میں ان دونوں کی خوبیاں لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اُردو شاعری کے نقائص پر سنجیدگی سے غور کیا اور انھیں دور کرنے کے لیے بنیادی تبدیلیوں کی دعوت دی۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے رسالہ اُردو میں ایک مضمون لکھا۔ اس میں اردو شاعری کے معائب سے بحث کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا "سب سے بڑا عیب جو ہماری شاعری کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے وہ ریزہ خیالی ہے۔ مسلسل نظم کا لکھنا ایک ایسی بات ہے جو ہمارے شعرا کے لیے ایک کٹھن کام ہے...... غزل کی دنیا میں تو تسلسل ایک طرح کا جرم ہے۔ ردیف اور قافیہ کی یکسانیت کے سوا بہ لحاظِ معنی ایک شعر کو دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہوتا اور اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہر شعر اپنے رنگ میں نرالا اور دوسرے شعروں سے جداگانہ ہے۔ ہماری شاعری محض قافیہ پیمائی ہے اور اس قافیہ پیمائی کے

رواج کا سہرا غزل کے سر ہے:

ان کا سب سے بڑا اعتراض غزل کی ریزہ خیالی اور قافیہ کے استبداد پر تھا جس کی وجہ سے شاعر مربوط طور پر سوچ ہی نہیں سکتا چنانچہ اصلاح کی تجویز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سب سے پہلی اصلاح اب یہ ہونی چاہیے کہ شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوائی جائے اس بات کو عام تسلیم کر دیا جائے کہ شاعری قافیہ کے اشارے پر نہیں چلے گی بلکہ شاعر کے ارادہ اور خیال کی ضرورتوں کے آگے قافیہ کو سر خم کرنا پڑے گا۔ یہ مانا کہ قافیہ یوں تو شاعری اور خصوصاً اردو شاعری کے لیے ایک فطری شے ہے۔ ترنم کے پیدا کرنے کے خیال کو ڈھالنے کے لیے قافیہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قافیہ شاعری کی سرزمین پر کوس لمن الملک بجائے اور خیال کا گلا گھونٹ ڈالے اس سے خیال کی آزادی اور نشوونما کو جو صدمہ پہنچا اور اردو شاعری جس حد تک بے جان ہوئی، اس کا ثبوت ہمارے شعرا کی غزلوں سے بھرے ہوئے محض لفظی طلسمات والے دیوان ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار دی جائے:

قافیے کی جکڑ بندی سے بچنے کے لیے انھوں نے اردو شاعری کے مروجہ اوزان میں بنیادی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مروجہ عروض اردو شاعری کی راہ ترقی میں سنگِ گراں ہے۔ اردو کی بحریں یہاں کی آب و ہوا اور "اردو کی آریائی طبیعت" کے مطابق نہیں ہیں۔ عظمت اللہ خاں جدید دور کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ خیال کی راہ سے قافیہ کے کانٹے نکالنے کے لیے اور شاعری کی فطری نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اردو عروض میں لچک پیدا کی جائے، ترنم کے نئے نئے سانچے بنائے جائیں اور شاعر کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ اپنے مزاج اور موضوع کی ضرورتوں کی بنا پر ان میں مناسب تصرفات کرتا رہے۔ اس بنیادی تبدیلی کے لیے انھوں نے جو اصول وضع کیے ان میں پہلا اصول یہ تھا کہ اردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل پر رکھی جائے مگر ہندی عروض میں قدامت پسندی نے جو ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے، اس سے بچتے ہوئے صالح عناصر کو قبول کیا جائے اور انگریزی عروض سے بھی مناسب استفادہ کیا جائے۔ عظمت اللہ خاں کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے صرف اصول پیش نہیں کیے بلکہ ان پر خود عمل کر کے بھی دکھایا۔ انھوں نے زحافات کے دائروں اور چکروں سے بچنے کے لیے پنگل کے طریقۂ آوازشماری کو اپنایا اور مروجہ بحروں کی سہل اور سائنٹیفک تقطیع کے ونک انداز اختیار کر کے اردو کے نئے عروض کی مثالیں پیش کیں۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت مجتہد کی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی ترقی و توسیع کے لیے پُرخلوص کوشش کر کے غیر معمولی مثال قائم کی۔ وہ صحیح معنوں میں اردو کے "باغی" شاعر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی فنی کاوشوں کا اعتبار اور امتیاز آج بھی مسلّم ہے لیکن جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے اس طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے چنانچہ زیرِ نظر مضمون کا مقصد یہی ہے کہ عظمت اللہ خاں کی شعرگوئی کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے رنگِ سخن سے بحث کی جائے۔

عظمت اللہ خاں کے گیتوں کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے۔ حسن و عشق کی گھاتیں اور معاملاتیں شعر و ادب کا ازلی و ابدی موضوع ہیں۔ قدیم ہندی، اردو گیتوں میں بھی سب سے زیادہ توجہ شرنگار رس پر صرف کی گئی ہے۔ بظاہر عظمت اللہ خاں نے لوک گیتوں کی قدیم روایت سے رشتہ جوڑا ہے لیکن یہ رشتہ رسمی نہیں۔ یہاں بھی ان کی باغیانہ شان برقرار ہے۔ انھوں نے عشق و محبت کو اپنی شاعری کا مرکزی موضوع تو بنایا لیکن عشق و عاشقی کے ان پامال پہلوؤں کو جو گیتوں میں صدیوں سے پیش کیے جاتے رہے تھے، چھوا تک نہیں۔ پنگھٹ کی رنگین فضائیں، گاگریں چھلکاتی ہوئی دوشیزائیں، جمنا کا کنارا، گوکل کی گلیاں، بنسری کی تانیں، نایکہ کی تڑپ اور برہ اور ملن کا سوز و ساز ان کے گیتوں میں ڈھونڈے سے بھی

نہیں ملتا۔ وہ آسان راہوں پر چلنے کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے ہندوستانی دیومالا سے استفادہ کیا نہ قدیم نقش و نگار کی پابندی کی۔ قدیم گیت کاروں نے عشق کو فطرت کی آغوش میں، کھلی فضا اور جھومتی بہاروں کے پس منظر میں پیش کیا تھا۔ عظمت اللہ خاں نے اس کے برعکس عشق کی سادگی اور سونے پن کو گھر کے ماحول میں محسوس کیا۔ پہلا اندازِ بیان شاعرانہ اور دوسرا نسبتاً غیر شاعرانہ ہے لیکن روایت سے بغاوت نے عظمت اللہ خاں کو اسی پر مجبور کیا۔ ان کے بیشتر گیت گھر کے ذکر سے شروع ہوتے ہیں اور ان میں گھریلو بُو باس ملتی ہے۔ گھر کے ماحول میں جن واقعات اور تجربات کا روز سامنا ہوتا ہے، عظمت اللہ خاں انہی سے اپنی شاعری کا رنگ و آہنگ حاصل کرتے تھے۔ ان کے گیتوں میں گھر کی چاردیواری میں رہنے والی ہندوستانی عورت کے جذبات اور اشغال کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ وہ گھر کے کام کاج، بہنوں بھائیوں کی محبت، بچپن کے کھیل کود، ہلکے پھلکے ذکر کہ، عنفوانِ شباب کی رنگینی، نوعمر محبت اور میٹھے میٹھے ارمانوں کو ایسی صداقت، صفائی اور سہولت سے بیان کرتے ہیں، گویا آپ بیتی سنا رہے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کے گیتوں کو خانگی یادوں کے کاروان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یادوں کی یہ پرچھائیاں گھر کے مانوس ماحول اور بچپن کے کھلنڈرے پن سے شروع ہو کر شباب کی منزل تک پہنچتی ہیں لیکن یہاں حقائق کی تیز روشنی میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔

"تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

تھے پڑوسی ہم پہ یہ حال تھا
کہ گھروں میں کھڑکی بنائی تھی
تھے عزیز ہم یہ خیال تھا
کوئی شے نہ ہم میں پرائی تھی
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس زمانے میں بھلے برے کی تمیز نہ تھی۔ کبھی روٹھتے تھے، کبھی منتے تھے۔ سارا وقت چھیڑوں اور چہلوں میں گزرتا تھا۔ گڑیا کی شادی ہوتی تھی، دھوم دھام سے برات جاتی تھی اور:

یونہی کھیل کھیل میں جب کبھی
کوئی دولہا بنتا دلہن کوئی
مری تم ہمیشہ بنیں بنی
بہت اس پہ اڑتی تھی گو ہنسی
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

لیکن محبت کے یہ سہانے دن بہت جلد ہوا ہو گئے۔ پڑھائی کے خیال نے سب کچھ بھلا دیا اور جب جوانی دیوانی کے زینے سے شادی کی منزل تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ دونوں کی راہیں جدا تھیں۔ ماضی کے دریچے سے یاد کی کرنیں رہ رہ کر جھلکنے لگیں:

مجھے اب پڑھائی نے دی نجات   گئی آنے بیاہ کی عقل بھی
مجھے یاد آئی پرانی بات   وہ تمھاری بھولی سی شکل بھی
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

عظمت اللہ خاں کے بیشتر گیتوں میں "نظر بہ گزشتہ" کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان میں کمار پنے کے معصوم جذبات کی مہک بسی ہے۔ "محبت کا یاں کوئی کھیل نہ تھا" اور "دام میں یاں نہ آیئے" کا رنگ بھی یہی ہے۔ "مرے حسن کے لیے کیوں مرے" میں یادوں کی دھڑکن سینے کی پھانس بن کے رہ گئی ہے۔ اس میں ایک معصوم دوشیزہ کے کچلے ہوئے جذبات بیان کیے گئے ہیں جو بیاہتا کے عالم میں اپنے ایک ہجولی پیا کو یاد کر کے لڑکپن ہی میں اسے دل دے بیٹھی ہے۔

نہ بھلے کی تھی نہ برے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمہیں عشق کا یہ جو دھیان تھا تمہیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
نہیں جینے تھے تمہیں یوں مرے

نہ تھا اس جہان میں آسرا، مری جان تھی یہ جہان تھا
مرے سکھ تمہیں، تمہیں چین تھے، تمہیں چاہ ہے یہ گمان تھا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
نہیں جینے تھے تمہیں یوں مرے

مری چاہ کی مرادیں سب، جو طلب کیا وہ تمہیں دیا!
جوں ہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
نہیں جینے تھے تمہیں یوں مرے

اور اس طرح محبت کی یہ دنیا اجڑ گئی مگر لڑکپن کا پیار بھی کیا شے ہے۔ دوشیزہ یادوں کو سینے سے لگائے زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

تمہیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی
مگر آرزو یہ ضرور تھی تمہیں دیکھ لیتی کبھی کبھی!
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
نہیں جینے تھے تمہیں یوں مرے

جیسا کہ اس گیت سے ظاہر ہے یہ "یادوں کے کارواں" زندگی کی بیتی باتوں اور بے مہریوں سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ یادیں فقط تلخ ہی نہیں، سہانی بھی ہوتی ہیں لیکن طربیہ پہلو کی عکاسی میں انشا آفرینی کے وہ مواقع حاصل نہیں جو حزنیہ پہلو کی ترجمانی میں میسر آتے ہیں عظمت اللہ خاں اس نکتے سے باخبر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گیتوں کی لے اکثر و بیشتر حزنیہ ہی رکھی ہے۔ وہ بچپن کے کھلنڈرے ساتھیوں، ان کے کھیل کود اور قہقہوں کو تو نہایت شوخ رنگوں میں پیش کرتے ہیں لیکن اس کے بعد لڑکپن کی منزل سے گزرتے ہوئے شباب کی پُربہار وادی میں قدم رکھتے ہی محبت کے سفینے کو بے وفائی کی چٹان پر پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اس طرح ابتدائی حصے کی طربیہ فضا کے تضاد سے

وہ خاتمے کے المیہ کو زیادہ دردناک بنا لیتے ہیں اور یوں ان کے گیتوں میں "درد و داغ، سوز و ساز اور جستجو و آرزو" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے بعض کامیاب گیت بنیادی طور پر حزنیہ ہیں اور عنفوانِ شباب کے اسی المیے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اوپر جس گیت کی مثال پیش کی گئی ہے، اس کی ابتدا ایک الھڑ دوشیزہ کے رومانی جذبات سے ہوتی تھی۔ ان کے ایک اور گیت "دام میں یاں نہ آئیے" میں بھی واقعات کا سلسلہ ایک نوجوان کی معصومانہ محبت سے شروع ہوتا ہے:

اک تو شباب اور پھر اس کا نشہ نیا نیا
حسن پرست آنکھ تھی، من مرا پاک صاف تھا
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے
جو رکھوں میں پا پڑی، دل کو مرے لبھا لیا
بیوہ سہی سہاگ کا ایک برس نہیں ملا
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

محبت کی پینگیں یہاں تک بڑھیں کہ:

من کو مرے جگا دیا، پہلا سبق پڑھا دیا
جھینپ جھجک مری مٹی، مرد مجھے بنا دیا
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

غرض زمین سے آسمان تک مسرت اور محبت کی دھنک چھائی ہوئی نظر آنے لگی:

آنکھوں میں جگمگا اٹھے، یہ ہی زمین آسماں
حسن بھری تھی دھوپ چھاؤں، عیش بھرا تھا سب جہاں
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے
سُکھ کی ترنگ دُکھ میں تھی، دُکھ کی تھی سُکھ میں چاشنی
زیست کی کیمیا ملی جان مرنے کی موج تھی
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عظمت اللہ کے گیتوں میں نوجوانی کی محبت کے سرچشمے عموماً فریقِ ثانی کی بے وفائی سے خاک ریز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی محبوبہ ایک "رئیس کبرسن" سے شادی کر لیتی ہے اور خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں:

روح میں ایک زلزلہ دل سے مرے اٹھا دھواں
دھوپ سیاہ پڑ گئی، تیرہ و تار تھا جہاں!
دام میں یاں نہ آئیے، دل نہ یہاں لگائیے

یہ محرومی عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں موجِ تہ نشیں کی حیثیت رکھتی ہے: "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" ان کا

مشہور گیت ہے۔ اس کا المناک انجام اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے۔ لڑکپن کی چھیڑ چھاڑ، نوجوانی کے شوخ جذبات اور ان کا گہری مایوسی میں تبدیل ہو جانا عظمت اللہ خاں کے گیتوں کا محبوب PATTERN ہے، جس کی پابندی اس گیت میں بھی کی گئی ہے چنانچہ یہاں بھی محبت کی تان بے وفائی اور ناکامی پر ٹوٹتی ہے۔ اس میں ایک یتیم لڑکی جو اپنے بچپن کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ یادوں کے جھروکے سے بیتے ہوئے دنوں کی طرف دیکھتی ہے:

میں ننھی ننھی سی جان غریب بڑی
کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی
مری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

لیکن باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے تایا کے گھر پلنے بڑھنے لگی۔ یہیں تایا کے بیٹے سے انس پیدا ہوا اور دل کی آرزوؤں میں محبت کا رنگ آنے لگا:

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا
مرا دھیان، کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا
مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا
مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا
مری بھولی سی آنکھوں کے تارے بنے

دلوں کی یہ لاگ بڑھی تو مذاق مذاق میں سب اسے دلہن کہنے لگے:

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے
سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دلہن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے
کئی بار کہا "مری پیاری دلہن"

تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں دونوں ساتھ ساتھ رہے لیکن لڑکا بڑا ہوا تو اسے باہر بھیجا گیا جہاں اس نے محنت سے کام لیا اور تعلیم کے باقی مدارج کامیابی سے طے کیے۔ اچھے عہدے پر فائز ہوا۔ شہر واپس آیا تو چاروں طرف سے شادی کے پیام بھیجے جانے لگے:

مرے تایا تھے سچے زمانہ شناس

گیا ٹوٹ ساجی گئی ٹوٹ وہ آس
مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

اور وہ اندر ہی اندر غم سے گھلنے لگی۔ اس کے لیے بر کی تلاش ہوئی۔ ایک جگہ رشتہ طے ہو گیا لیکن وہ تو پہلے ہی محبت کے ہاتھوں جسم و جان کا سودا کر چکی تھی۔ بالآخر بستر مرگ پر پڑ گئی:

مرا آخری وقت ہے آن لگا
کوئی اور تمھاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان لگا
نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری دلہن

مجھے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا
مرے جی کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا
مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

ابھی تک محمد عظمت اللہ خاں کے ان گیتوں کا ذکر کیا گیا جن میں تمنا ناکامیاب اور تمنا بے قرار رہتی ہے۔ لیکن انھوں نے بعض گیتوں میں تمنا کی سرشاری اور آرزوؤں کی آسودگی کی عکاسی بھی ہے اور گھر گرہستی کے مرقع بھی کھینچے ہیں۔ ہم نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ عظمت اللہ خاں حسن و عشق کی جلوہ سامانیوں کو گھر کی فضا میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ بچپن کی بے فکری اور لڑکپن کی لاابالی زندگی کے علاوہ انھوں نے میاں بیوی کے میل ملاپ اور خانہ داری کی دلچسپیوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ "بالی بیبی سے" "پہلا آمنا سامنا" اور "پیارا پیارا گھر اپنا" میں آرزوؤں کی کلیاں سر جوڑ کے مسکراتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بچے گھر میں ہیں اور سلیقہ شعار سگھڑ بیوی ایثار و وفا کی پتلی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے پُرلطف گیت "برسات کی رات دکن میں" ہے۔ اس میں برسات کی رات میں گھر کے باہر اور اندر کا نقشہ بڑی صداقت سے کھینچا ہے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا ہے۔ بادل گرجتا ہے اور مینہ زور سے برسنے لگتا ہے۔ بچے اوندھے سیدھے ادھر ادھر سو جاتے ہیں اور بیوی جلدی سے کام سمیٹنے لگتی ہے:

نیند جو آئی وقت سے پہلے
پھول سے بالک انکھڑیاں موندے
سو گئے بے سدھ اوندھے سیدھے
جلدی جلدی گھر کا بکھیڑا
سندر چترا نے نبٹایا
اک اک کا بچھونا بچھایا

پان بنایا، کھایا کھلایا
زور کا آیا نیند کا تریڑا

اس کے بعد:

ہونے لگیں پھر گھر کی باتیں
بچوں کی، دن بھر کی باتیں
اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں
اک آدھ کوئی ضروری بات
خرچ اٹھانے کی کچھ باتیں!
لینے دلانے کی کچھ باتیں
پاس بلانے کی کچھ باتیں
باتیں مزے کی رات

باہر بارش اودھم مچاتی ہے۔ پرنالے میں پانی فراٹے لینے لگتا ہے۔ ایک طرف ٹپکے کی ٹپ ٹپ ہے، دوسری طرف سے بوچھاڑ اندر آ رہی ہے:

اُلٹی گویا جل کی چھلنی
اک تالاب بنا ہے آنگن
بلبلے کرتے برق کا درشن
بھیگی بھیگی پون کی خنکی
بچوں کو اڑھائی ہے دُلائی
اب نیند کی ہے راج دہائی
کیا ہی بھلی سانس کی گرمائی
جسم کی گرمی، اچھی اُن کی

میاں بیوی دونوں مل کر دُکھ سُکھ بانٹتے ہیں اور ایک دوسرے کا پیار اور ہمدردی پا کر دن بھر کے بکھیڑوں کو بھول جاتے ہیں:

دن مردانا کام میں گزرے
من کی محنت ہاتھ کے دھندے
تانبے کے سکے یا ہُن برسے
سُکھ کی ہوں یا دُکھ کی باتیں
گھر میں بالک آبادی ہو
چاہنے والی گھر والی ہو

ہنسی خوشی گزرے جاتی ہو
یوں ہی برسیں برسات کی راتیں

گھریلو ماحول کی عکاسی عظمت اللہ خاں کا پسندیدہ موضوع ہے لیکن ان کی شاعری کے بارے میں یہ بات غور طلب ہے کہ وہ چونکہ زندگی کے المیہ سے زیادہ متاثر تھے، اکثر و بیشتر گھریلو زندگی کے انھیں واقعات کو لیتے ہیں جہاں محبت شادی سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ شادی کے بعد کامیاب اور کامران زندگی کے مرقعے انھوں نے نسبتاً کم کھینچے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا ذیلی رجحان تو ہے غالب رجحان نہیں۔ ان کے گیتوں کا اصلی رنگ وہی حزنیہ لے ہے جس میں محبت پنپ نہیں پاتی اور یادوں کے سہارے بھولی بسری خوشیوں کی تلاش جاری رہتی ہے۔ انھوں نے "پیا پیارا گھر اپنا" "پہلا آمنا سامنا" "گھر کی زینت" "برسات کی رات" "دکن میں" وغیرہ گھر گرہستی کے طربیہ پہلو کے بارے میں چند گیت لکھے ہیں لیکن وہ اس کوچے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے۔ پھر یہ کہ ان کے اکثر طربیہ گیت اس کیف و اثر سے بھی خالی ہیں جو ان کے حزنیہ گیتوں میں ملتا ہے۔ یہ گیت کچھ پھیکے پھیکے اور سپاٹ سے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں الفاظ و معنی بھی ہم رشتہ نہیں ہو سکے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔

محمد عظمت اللہ خاں کی دوسری اہم خصوصیت ان کی واقعہ نگاری ہے۔ ہم نے ان کے گیتوں کو "یادوں کے کارواں" کہا ہے اس لحاظ سے ان کی بنیاد جذبات پر ہونا چاہیے لیکن انھیں غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یادوں کا سہارا لینے کے باوجود عظمت اللہ خاں جذبات نگاری کی طرف نہیں بلکہ واقعہ نگاری کی طرف مائل تھے۔

واقعہ نگاری سے ان کی فطری مناسبت کا ذکر کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ معیار کی وضاحت کر دی جائے جو عظمت اللہ خاں کے پیش نظر تھا اور جس کے مطابق وہ اپنی شاعری کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی ادب کے ادا شناس تھے اور انگریزی شاعری میں بھی "لی رک" پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"اردو میں لی رک شاعری کی بڑی کمی ہے اور لی رک جانِ شاعری ہے۔ لی رک کی دو زبردست خصوصیتیں ہیں۔ لی رک کا ترنم انتہائی ہونا چاہیے، یہاں تک کہ موسیقی سے جا بھڑے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ لی رک نظم کا لفظ لفظ احساس میں ڈوبا ہوا اور جذبات کی بجلی سے تھرتھراتا ہو۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ان کی شاعری ان شرائط کو پورا کرتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ لی رک کی کسوٹی پر ان کی صرف چند نظمیں مثلاً "موہنی مورت" "من موہن پن" "آندھرا دیس کی پتری" یا براؤننگ اور ورڈز ورتھ کے بعض تراجم پورے اترتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کا رنگ لی رک سے مناسبت نہیں رکھتا۔ کہنے کو تو وہ اپنے گیتوں کو لی رک ہی کہتے تھے لیکن نہ تو ان کی شاعری کا لفظ لفظ احساس میں ڈوبا ہوا ہے "اور نہ" جذبات کی بجلی سے تھرتھراتا ہے۔" انھوں نے نئے عروض میں اتنی لچک تو پیدا کر لی کہ شاعر پریشان گوئی سے بچ جائے اور تسلسل کا خون نہ ہو لیکن ابھی ان کی کوششیں ابتدائی منزل میں تھیں اور وہ خود اپنے وضع کیے ہوئے عروض پر اتنے حاوی نہیں ہوئے تھے کہ نیا عروض جذبات کے وفور اور احساس کی فراوانی کا پورا پورا ساتھ دے سکے۔ ان کے ہاں خیال کا واقعاتی تسلسل تو ہے لیکن تخیل کی لپک اور احساس کے کوندے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیت کہتے ہوئے یا تو ماترائیں گنتے رہ جاتے تھے یا تسلسل قائم کرنے میں لگے رہتے ہوں گے اور جذبے کا چڑھا ہوا دریا اتر جاتا ہوگا۔ عروضی باریکیوں میں سر کھپانا اور نظم میں خیال کے

تسلسل کو قائم رکھنا دونوں منطقی کام ہیں جن کا زیادہ تعلق عقلی قوتوں سے ہے۔ جذبے کی بات دوسری ہے۔ اس میں آگ کی لپیٹ اور بجلی کی سی تڑپ ہوتی ہے جو پہلے اپنی حیثیت کو منواتی ہے اور بعد میں عروضی سانچوں کا نام پوچھتی ہے۔ عظمت اللہ خاں کے ہاں جو فطری ضبط و تحمل اور ٹھہراؤ ہے وہ جذبے کی شاعری سے میل نہیں کھاتا۔ ان کے ہاں جذبہ بڑا نرم اور دھیما ہو کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ مجموعی حیثیت سے ان کی شاعری میں شدتِ احساس اور وفورِ جذبات کا فقدان ہے لیکن یہ بات بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں کہ خیال کے تسلسل پہ اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

گیت دراصل جذبے کی زبان ہے اور اس میں دلکشی آتی ہے، جذبہ و تخیل کی سرشاری سے، لیکن عظمت اللہ خاں نے جذبہ و تخیل کی سرمستی سے ہٹ کر گیت کہے ہیں۔ فارم کے اعتبار سے تو انھیں گیت کہا جا سکتا ہے مگر معنوی طور پہ ان میں جذبات کا وہ جوش اور وہ فور نہیں ملتا جو گیت سے مخصوص ہے۔ یہ عظمت اللہ خاں کی شاعری کا خاصا دلچسپ اور اہم پہلو ہے اور اس کا راز بھی ان کی نفسیات میں تلاش کرنا ہوگا۔ وہ غزل کی ریزہ خیالی کو شاعری کے حق میں سمِ قاتل سمجھتے تھے اور غزل کی گردن بے تکلف مار دینے کے قائل تھے۔ غزل کے تصنع اور قافیے کی قیود نے انھیں گیت کی طرف مائل تو کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مربوط اسلوبِ بیان کی تلاش انھیں غیر شعوری طور پر مثنوی کے قریب لے گئی۔

عظمت اللہ خاں غزل کی پریشان گوئی کے خلاف تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو شاعری کے بیانیہ اصناف انھیں یکسر ناپسند تھے۔ اپنے مضامین میں انھوں نے مسدس اور مثنوی کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے البتہ انھیں اس بات سے رنج تھا کہ ہمارے شاعروں کو غزل کی کچھ ایسی "لت" پڑ گئی ہے کہ مثنوی اور مسدس کا لطف بھی غارت ہو گیا ہے:

> "آپ اُردو کی مثنویاں اٹھا لیجیے اور وہاں بھی ہر بیت جداگانہ اور مستقل نظر آئے گی۔ بیچ میں ابیات کو اڑا دیجیے تو بھی مضمون کی شاید ہی کوئی کڑی کم ہو۔"

اسی طرح مسدس کے بارے میں بھی ان کی گل افشانیِ گفتار ملاحظہ طلب ہے:

> "یہی حال ایک اور صنفِ سخن مسدس کا ہے جس سے ہمارے شعرا نے مسلسل گوئی کا کام لینا چاہا ہے۔ ہر بند بجائے خود ایک پورا ٹکڑا ہوتا ہے اور اس قسم کے ٹکڑوں کو گھڑ گھڑا کے ایک دوسرے سے یکجا کر دیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے میں خیال کا بہاؤ موہوم سا برائے نام ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر بند میں پہلے چار مصرعے لیجیے۔ ان میں آپ ہر مصرع کو بجائے خود ایک ایک علاحدہ ٹکڑا پائیں گے اور ٹیپ تو عموماً ایک جداگانہ شے ہوتی ہی ہے۔ اگر مسدس کے ہر بند میں سے بعض مصرعے جو محض قافیہ پیمائی کی غرض سے لکھے جاتے ہیں، نکال دیے جائیں تو شمہ برابر بھی کسی خیال کی کڑی کے ٹوٹنے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔"

اُردو شاعری کے بیانیہ سرمایے سے اس بے اطمینانی کے باوجود وہ ایک جگہ میر حسن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ "واقعی شاعر تھے"۔ مثنوی سحر البیان سے سراپا کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہیں: "اس تصویر میں نری ایک چوکھٹے والی بے جان سی تصویر نہ پائیں گے بلکہ اس میں چلت پھرت آپ کو ملے گی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ مثنوی کے مربوط اشعار کی طرف ان کا دل کھنچتا

تھا۔ وہ اُردو کی سوجا صنا منگی سے اپنی بغاوت کا کتنا ہی اعلان کریں، یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان کی شاعرانہ تربیت کا پہلا نقش اُردو شاعری کے مطالعے کے زیرِ اثر ہی بنا ہوگا۔ شعوری سطح پر وہ غزل سے متنفر تھے لیکن ان کی طبیعت کا واقعاتی انداز انھیں تحت شعوری طور پہ مثنوی کی طرف لے گیا چنانچہ ایک جگہ باتوں باتوں میں دل کا چور یوں ظاہر ہوگیا ہے،

> "بند دو مصرعوں کا ہو تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی دقت ہی نہیں ہوگی۔ قافیہ کا وجود دوسرے کی طرح دو مصرعوں سے ہی ہو سکتا ہے لہٰذا سب میں چھوٹا بند بیت ہے اور مثنوی گویا ابیات کی ایک لڑی ہوتی ہے۔ مثنوی بڑے کام کی چیز ہے اور اگر بکھری بکھری لڑیں نہ ہوں، مصرعے اور ابیات خیال کے بہاؤ کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہوتے جائیں تو مثنوی شاعری کی ایک کارآمد صنف ہو جاتی ہے اور نظم میں قصے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی سانچا نہیں۔"

کلاسیکی شاعری کے مخالف اور غزل کی گردن مار دینے کا فتویٰ صادر فرمانے والے ایک شاعر کے قلم سے مثنوی کے حضور میں یہ خراج عقیدت اہمیت سے خالی نہیں۔ شعوری سطح پر عظمت اللہ خاں نے مثنوی کے فارم کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غیر محسوس طور پر ان کا دل مثنوی ہی کی طرف کھینچتا تھا چنانچہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ عظمت اللہ خاں کے بیشتر گیت واقعہ نگاری کے اعتبار سے کیوں مثنوی کے انداز کی یاد دلاتے ہیں۔ انھیں فارم کے اعتبار سے تو گیت کہہ سکتے ہیں لیکن فضا ان میں مثنوی ہی کی ملتی ہے اور واقعات کا اندازِ بیان بھی بالکل مثنوی کا سا ہے اس لیے ان گیتوں کو مثنوی نما گیت کہنا زیادہ مناسب ہے۔ چھوٹے پیمانے پر وہی مثنوی کی سی بات، ویسا ہی واقعات کا ارتقا، کڑی سے کڑی ملی ہوئی اور بالآخر انجام۔ ان کے گیتوں کی روح میں اتر کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض جذبات کے سہارے شاعری نہیں کرتے۔ نہ ہی گیت ان کے قریب حسین اور شیریں الفاظ کے اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ وہ گیت کی بنیاد کسی خیال، کسی حقیقت یا کسی واقعہ پہ رکھتے ہیں اور اسے الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے اس بات پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں کہ گیت کے ہر بند میں ایک اندرونی ربط قائم ہو جائے اور ہر مصرع کے ساتھ ساتھ مرکزی خیال کا ارتقا ہو چنانچہ وہی سامنے کی بات جو عام طور پر ہماری توجہ کا مرکز نہیں بنتی، گیت کے بولوں میں ڈھل کر کہانی کی طرح دل کھینچتی ہے اور زندگی کی کسی بھولی ہوئی سچائی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

غرض عظمت اللہ خاں تخیل کے پروں سے نہیں اڑتے، تعقل کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی، خامی اس لیے کہ ان کے گیتوں میں جذبات کی فراوانی اور تخیل کی بے پایانی و بلندی نہیں اور خوبی اس لیے کہ وہ زمین سے قریب رہتے ہیں اور حقائق کی ترجمانی میں صداقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ خود کو جذبات کے حوالے کر کے گمراہ ہوتے ہیں نہ بے راہ بلکہ اپنے گیتوں کی عمارت واقعات کی ٹھوس بنیاد پر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مثنوی کی طرح واقعات ایک کے بعد ایک سامنے آتے ہیں اور ان کے تدریجی ارتقا سے گیت اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ ان کے کسی گیت کو لیجیے، بیانیہ ہو یا غیر بیانیہ، عاشقانہ ہو یا غیر عاشقانہ، اس کا تانا بانا واقعات ہی سے تیار کیا ہوا ملے گا۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" "تمھیں یاد ہیں وہ دن بھی" "مرے عمر کے لیے کیوں مرے" "دام میں یاں نہ آئیے" "پہلا آمنا سامنا" "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" ان سب گیتوں کا ڈھانچہ اسی انداز کا ہے ان میں کوئی کہانی بیان نہیں کی گئی۔ فقط یادوں کی دنیا آباد ہے لیکن واقعات کی بنیادوں پر! اور پھر واقعات کو بھی اس خوبی سے ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے کہ گیت میں قصے کہانی کا لطف آنے لگتا ہے۔ اگر ان گیتوں میں سے کسی کی ایک کڑی بھی ہٹا لیجیے تو سارا ڈھانچہ کمزور ہو جائے گا

عظمت اللہ خاں واقعات کی جھلکیوں کو نہایت مربوط طور پر پیش کرتے ہیں اور ان کے اس گزری ہوئی زندگی کی تصویریں ایک کے بعد ایک اس طرح سامنے آتی ہیں کہ ماضی کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

مثنوی سے میل کھاتا ہوا یہ اندازِ بیان بنیادی طور پر قصّے کہانیوں یا لوک روایتوں کے لیے موزوں ہے۔ افسوس ہے کہ عظمت اللہ خاں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ انھوں نے اپنے فقط ایک گیت میں، غالباً اتفاقیہ طور پر ایک تاریخی لوک روایت کو موضوع بنایا ہے اور چونکہ قصہ کہانی کا موضوع ان کے واقعہ نگاری کے فطری میلان اور اندازِ بیان سے گہری مطابقت رکھتا ہے، یہ گیت فارم اور تاثر کے اعتبار سے ان کا بہترین گیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا عنوان ہے "پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی" اس میں واقعات کے ربط و تسلسل کے علاوہ خلوص کی گہرائی، مصرعوں کی موسیقی اور الفاظ کا ترنم بھی قابلِ غور ہے اور ان سب خوبیوں نے مل کر اسے ادبی حسن کاری کا عمدہ نمونہ بنا دیا ہے۔ اس کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے:

کامنی کومل تھی تو

حسن رسیلا ترا

کوکتی کوئل تھی تو

شبد سُریلا ترا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

اس کے بعد روپ متی کے حسن و جمال اور باز بہادر سے اس کے سچے عشق کا تذکرہ ہے:

عشق کی دیوی تھی تو

شعر میں یکتا تھی تو

حسن کی پتلی تھی تو

اک کویتا تھی تو

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

عشق و عاشقی کی آغوش میں سات برس عیش و آرام سے گزرے:

خوب تھی قسمت تری

سات برس عیش تھے

شعر و سخن موسیقی

حسن حکومت مزے

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

لیکن گردشِ دوراں کی ایک ٹھوکر سے جامِ مسرت چور چور ہو گیا۔ دکھ کی گھڑی سر پہ آپہنچی اور:

اکبری لشکر کی موج

ایسی اُمڈ آئی تھی

باز بہادر کی فوج
بکھری پیٹی کاٹی سی
ہیبت کی ماری سستی شاعرہ روپا متی
باز بہادر ترا
جان بچا اڑگیا
آنچ میں ڈالا گیا
تیرا دل باوفا
ہیبت کی ماری سستی شاعرہ روپا متی

شکست و تباہی کے اس ناگہانی طوفان میں روپ متی نے جان قربان کرنا منظور کیا لیکن عفت و عصمت پر حرف نہ آنے دیا۔

باز بہادر کا تھا
تیرا جو دل ہو چکا
اور کسی کا بھلا
ہو سکے ممکن نہ تھا
ہیبت کی ماری سستی شاعرہ روپا متی
اک طرف تھی وفا
اک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان کی
ہیبت کی ماری سستی شاعرہ روپا متی

اور یوں اس نے اپنی ثابت قدمی، جانبازی اور قربانی سے عشق کی ایسی شمع فروزاں کی جسے وقت کا کوئی جھونکا کبھی بجھا نہ سکے گا۔

چاہ کا اپنی دیا
ایسا دیا ہے جلا
اور بھی دے گا جلا
سانس اسے وقت کا
ہیبت کی ماری سستی شاعرہ روپا متی

واقعہ نگاری کا یہ رنگ ان کی منظر کشی میں بھی نمایاں ہے۔ فطری مظاہر سے متعلق انھوں نے چند ہی گیت لکھے ہیں۔ یہ "پہلی صبح"، "برسات کی رات دکن میں" اور "برکھا رت کا پہلا مینہ" ان سب میں وہ اپنے دوسرے بیانیہ گیتوں کی طرح موضوع سے درجہ بدرجہ

پر وہ اٹھاتے ہیں۔ قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہیں اور اس طرح مختلف پرچھائیوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہوئے پوری تصویر پیش کرتے ہیں۔ "برکھا رُت کا پہلا مینہ" میں سب سے پہلے بادلوں کے امڈ آنے کا سماں دکھایا ہے۔ حبس کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی اور دم گھٹ رہا تھا کہ بجلی چمکی اور بادل کی گرج سے زمین آسمان گونج اٹھے۔ اس کے بعد مینہ کے پہلے چھینٹے کا استقبال کیا ہے جس کے ساتھ ساتھ "پون کا جھکڑ" اور "مینہ کا تڑتڑا" شروع ہو گیا۔ پانی نہایت زور سے دھائیں دھائیں پڑنے لگا اور آسمان دھواں دھار ہو گیا۔ پرندے درختوں پر دبک کے بیٹھ رہے۔ بعض نے چونچیں پروں میں چھپا لیں۔ مویشی سمٹنے سکڑنے لگے۔ پانی کا سمندر لہریں لینے لگا۔ آگے کے بند میں بتایا ہے کہ بادل دم لے لے کر برسا اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کا زور ٹوٹ گیا۔ یہاں سے بارش کے بعد کا منظر شروع ہوتا ہے ہلکی ہلکی بوندوں میں "ملائم پون" اترا کے چلنے لگی۔ چکنے چکنے پتوں پر پانی کے قطرے موتی سے ڈھلکنے لگے۔ طبیعت میں طراوت آئی اور پرندے بھی کودنے پھدکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں بادل پھٹ گیا اور آسمان میں بادلوں کے ٹکڑے تیرنے لگے۔ آخر میں ڈوبتے سورج کے بادلوں سے جھانکنے کا منظر بیان کیا ہے۔ شعاعوں سے جِلا پا کر ان میں آگ سی لگ گئی۔ پھننگوں پر سنہری دھوپ چمکنے لگی۔ نیلا امبر، ہنستا سورج اور مسکراتی زمین مل جل کر قدرت کا ایک سہانا روپ پیش کرنے لگے۔

اس گیت میں مناظر کی جھلکیوں کو نہایت مربوط اور منضبط طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی ترتیب اور تسلسل میں ایک اندرونی ہم آہنگی ہے۔ عظمت اللہ خاں کے عاشقانہ گیتوں میں تو مثنوی کا واقعاتی رنگ ہے ہی لیکن ان کے قدرتی مظاہر سے متعلق گیت بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں بھی کڑی سے کڑی ملی ہوتی ہے اور اگر ایک بھی بند کو آگے پیچھے کر دیا جائے تو ساری تصویر بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ان کے ایک اور مختصر گیت "صبح" کو لیجیے۔ اس میں بھی واقعہ نگاری کا یہی انداز ملے گا۔ ابتدائی بند ملاحظہ ہو:

بھور بھئی ہے صبح کی دلہن
نے سیج پہ لی ہے انگڑائی
بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن
وہ سر کی تاروں کی ڈلائی
رات کے کالے بالوں میں سے   چاند سی صورت وہ مسکرائی

اس کے بعد ملے جلے اندھیارے اُجالے کی یہ تصویر دیکھیے:

ایک سفیدی دھوپ سی پھیلی
کچھ بند ہے کچھ آنکھ کھلی ہے
اندھیارے اجالے کی پہیلی!
پرکاش میں کالونس گھلی ہے
تازی تازی ستھری ستھری   روشنی گویا اوس دھلی ہے

پربھات کی اس منزل پر روشنی کی کرنیں افق پہ اپنا جال بننے لگیں:

سورج دولہا نے کروٹ لی
سمندر کو کچھ دور جو پایا

اور گھلاوٹ شوبھا دیکھی
اپنا سنہری ہاتھ بڑھایا
کرنوں میں لپٹا پتلی کی طرح آنکھ میں اپنی اس کو بسایا

اس کے بعد اندھیرے کے غائب ہونے اور سورج کے نکلنے کا سماں ہے:

سر پہ رکھ کر پیر اندھیرا
بھاگا جدھر کو سینگ سمایا
کونے کونے لیا بسیرا
اور ہوا نے گل یہ کھلایا
کرنوں کی گرہ کھول کھلا کر اک، رنگ کا سیلاب بہایا
وہ بال سنہری لہرائے
سورج نے صورت دکھلائی
وہ پرکاش کے طوفان آئے
نور میں جگتی ساری نہائی
نور کی لہریں، رنگ کی لہریں، بول اٹھی ہے منہ سے خدائی

مظاہر فطرت کی منظر کشی کے اعتبار سے یہ ان کا نہایت کامیاب گیت ہے۔ چند ہی الفاظ میں انھوں نے صبح کے منظر کو ندرتی انداز میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ بھور کی کیفیت، رات کی پھیکی سیاہی، ہلکی ہلکی سفیدی، اوشا کی رنگت، کرنوں کی جھلک، آفتاب کا طلوع، ان سارے مراحل کو انھوں نے اس ربط سے بیان کیا ہے گویا کوئی افسانہ سنا رہے ہوں عظمت اللہ خاں مناظر کی تصویر کشی میں بھی اپنا قلم جذبات کے ہاتھ میں نہیں دیتے بلکہ نہایت ضبط سے اپنے موضوع کے مختلف درجے متعین کر لیتے ہیں اور اس کے بعد ان کی تہذیب و تنظیم کرتے ہوئے مختلف جھلکیوں کو ایک لڑی میں پرو کر گیت کا ہار تیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی منظر کشی میں بھی ایک منطقی ربط ملتا ہے اور گیت کا تسلسل شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کے رنگِ سخن کو ذہن نشین کر لینے کے بعد ان کی کردار نگاری کا تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ انھوں نے متوسط طبقے کے خانگی دکھ سکھ کے ترانے گائے اور اپنے موضوعات زیادہ تر گھریلو ماحول سے اخذ کیے چنانچہ یہی بات ہے کہ ان کے گیتوں کے کردار بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اکثر و بیشتر یہ کوئی یتیم اور بے سہارا لڑکی ہوتی ہے مثال کے طور پر "مرے جی کے لیے کیوں مرے" کا مرکزی کردار ایک غریب لڑکی ہے جو اپنے بارے میں کہتی ہے:

نہ تھا اس جہان میں آسرا
مری جان تھی یہ جہان تھا

"دام میں یاں نہ آیئے" کی ہیروئن ایک نوعمر بیوہ ہے۔ "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے" میں بھی ایک ایسی دکھیاری کے جذبات

بیان کیے گئے ہیں جو بچپن ہی میں ماں باپ کی آغوشِ محبت سے محروم ہو گئیں۔ اسی طرح "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" میں بھی مرکزی کردار ایک یتیم لڑکی ہے جو باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد تایا کے گھر میں پروان چڑھتی ہے۔ ان کرداروں کی نفسیات عنفوانِ شباب کی ہے۔ یہ اپنی معصومیت اور رعنائی سادگی کی وجہ سے بہت جلد دل دے بیٹھتے ہیں اور پھر اپنی محبت کو کل کائنات کا خلاصہ سمجھنے لگتے ہیں لیکن بالآخر ناکامی ہوتی ہے اور ساری دنیا اجڑی اجڑی سی نظر آنے لگتی ہے۔ عظمت اللہ خاں کے ان کرداروں میں خود ان کی اپنی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے چند گیتوں میں نوشادی شدہ میاں بیوی کے مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عظمت اللہ خاں کی شاعرانہ کائنات حسن و عشق کے ابتدائی مرحلوں ہی سے عبارت تھی۔ وہ خود جوانی ہی میں ہم سے رخصت ہو گئے اور ان کے گیتوں میں بچپن سے نوجوانی تک کا تنوع ملتا ہے۔ ان کا ذہن زندگی کی وسعت اور اس کے کلی تصور کے ادراک سے قاصر تھا۔ انھوں نے اپنے لیے سماج کا ایک گوشہ چنا لیکن ان کے کردار اس سماجی گوشے کے تمام پہلوؤں کی بھی عکاسی نہیں کرتے۔ وہ بچپن یا جوانی کی یک رنگی تصویریں ہیں۔ بھرپور زندگی کے امکانات اس کی کشمکش اور اس کی پیچیدگیاں ان سے بہت دور رہیں۔

عظمت اللہ خاں کی کردار نگاری کے بارے میں دوسری اہم بات ان کی عینیت پسندی ہے۔ اگر مصنف کے کرداروں کا اس کی اپنی شخصیت سے کوئی علاقہ ہو سکتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عظمت اللہ خاں خود بھی عینیت پسند تھے۔ گو انھوں نے اپنے ایک گیت "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے" میں زندگی کا حقیقت پسند نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ایک لڑکی جو بچپن میں یتیم ہو گئی تھی حالات کے زیرِ اثر آ کر طوائف بنتی ہے۔ اسے احساس ہے کہ وہ ایسی "آج" ہے جس کی "کل" نہیں ہے لیکن وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہے۔ اس نے حالات سے مفاہمت کر لی ہے اور وہ زندگی کے رنج و غم اور ناہمواریوں پر زیرِ لب مسکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے لیکن عظمت اللہ خاں کے شاعرانہ سرمایے میں یہ اپنی قسم کا واحد گیت ہے اور طوائف کا کردار ان کا نمائندہ کردار نہیں۔ کردار نگاری میں ان کا حاوی رجحان عینیت پسندی ہی کا ہے جس کی تصدیق ان کے بیشتر گیتوں سے ہو جاتی ہے۔ ان کے کردار محبت کی شمع سے نہاں خانۂ دل کو روشن رکھتے ہیں۔ محبت ان کے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ وہ اس کی خاطر اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں لیکن راہِ عشق سے انحراف نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی مصالحت کے لیے بھی تیار نہیں اور بالآخر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ یہ قربانی اعلیٰ ترین مقاصد یعنی عصمت پروری اور پاکدامنی کے لیے ہو سکتی ہے جیسا کہ روپ متی اور باز بہادر کے گیت میں، ورنہ اکثر و بیشتر یہ نوجوانی کی معصوم مسرتوں اور موہوم امیدوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

عظمت اللہ خاں کے کردار بڑی خوشی سے خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں۔ سوزِ عشق سے وہ اندر ہی اندر جلتے رہتے ہیں لیکن بھولی بسری محبت کی یادوں کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور انھیں نشاطِ روح سمجھتے ہیں۔ "مرے حسن کے لیے کیوں مرے" کی ہیروئن محبت میں ناکامی کے بعد اپنے دل کی چوٹ سہلاتے ہوئے کہتی ہے:

مرا پاش پاش یہ دل ہوا   مری چاہ کا وہ دیا بجھا
مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا   نہیں اب بھی وہ کسی اور کا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے نہیں جینے دیتے تمھیں لوگ تھے

وہ تقدیر کی قائل ہے اور ناکامی پر بھی اپنے "عاشقِ صادق" کو ان الفاظ سے یاد کرتی ہے:

مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا   تمہیں دے سکوں کوئی بد دعا
وہ ہوا جو ملنے پہ تھا لکھا   مرے دل سے آئے گی یہ صدا
مرے عشق کے یہ کیوں مزے نہیں لینے تھے تمہیں یوں مزے

”دام میں یاں نہ آئیے“ میں محبوبہ اپنی مجبوریوں کی بنا پر ایک ”رئیسِ کبیر“ سے شادی کر لیتی ہے اور اپنے قدیم عاشق سے بھی تعلقات برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ شادی کے باوجود وہ دراصل اسی کی ہے لیکن عاشق کہتا ہے:

مجھ سے کہا کہ ”کیا ہوا اب بھی ہوں تم پہ میں فدا“
”عیش مزے وہی رہیں، وہ ہی رہے معاملا“
دام میں یاں نہ آئیے دل نہ یہاں لگائیے
سنتے ہی جی میں آئی یہ، گھونٹ دوں بے وفا گلا
خون کے گھونٹ پی کے میں واں سے چلا یہ کہہ چلا
دام میں یاں نہ آئیے دل نہ یہاں لگائیے
جان ملی ہے اس لیے، دکھ میں اسے کھلائیے
عمر ہوا ہے کچھ نہیں، سانس میں بس اڑائیے
دام میں یاں نہ آئیے دل نہ یہاں لگائیے

”تمہیں یاد ہیں وہ دن بھی“ کے مرکزی کردار میں بھی یہی مثالیت ملتی ہے۔ شادی کے وقت میاں بیوی میں گہری محبت تھی لیکن بعد میں اولاد نہ ہونے کی وجہ سے پہلا سا ربط باقی نہ رہا۔ بیوی کی مرضی سے شوہر نے دوسرے نکاح کی ٹھانی۔ بیوی نے خود اپنی سوت پسند کی۔ گھر گرہستی سے دل ہٹا یا۔ خدا سے لو لگائی۔ میاں کے بچے ہوئے۔ گھر آباد ہوا مگر میاں کا دل پہلی بیوی ہی کا رہا۔ وہ دونوں بچے دوست بن گئے اور اس رفاقت کے سامنے سارا جہاں ہیچ نظر آنے لگا۔ ملاحظہ ہو:

ہوئے مجھ کو بال بچے، مرا دل رہا تمھارا
بنے ہم وہ دوست بچے کہ جہاں ہے ہیچ سارا
مری آتما تمھاری مری آتما کی پیاری
یہ کھلا نکاح اپنا، کہیں اب ہوا ہے پیاری
یہ نہیں بدن کا تپنا، یہ ہے برقِ روح ساری
مرا دن بھی رین تم ہو مرا اصلی چین تم ہو

انسانی فطرت کی یہ سلامت روی اور سادگی عظمت اللہ خاں کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔ ”مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا“ ۔ ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس میں بھی مرکزی کردار اسی انداز کا ہے۔ ہیروئن اپنے تایا کے بیٹے سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے خوابوں کی تکمیل نہیں ہوتی اور اس لڑکے کا بیاہ کسی امیر گھرانے میں ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے لبوں پر اُف نہیں آتی:

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نہ خبر
مری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی
بنی جان پہ اپنی کی اُف نہ مگر
مرے واسطے بر کی تلاش ہوئی

وہ اسی غم میں اندر ہی اندر گھلنے لگتی ہے اور موت کی منزل کے قریب پہنچ کر یہی کہتی ہے :

مرا آخری وقت ہے آن لگا
کوئی اور تمہاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان لگا
نہ بنی پہ رہی ہوں تمہاری دلہن

غرض یہ کہ عظمت اللہ خاں کے کردار فرشتہ خصلت ہیں۔ وہ روح کی گہرائیوں تک بے ریا اور بے لوث ہیں۔ وہ محبت کی موہوم امید کے سہارے زندگی کی مسرتوں کو ٹھکرا سکتے ہیں اور زندگی کی بڑی سے بڑی نعمت بھی انھیں محبت کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

عظمت اللہ خاں اُردو شاعروں کی عام ڈگر سے ہٹے ہوتے ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ فنی اجتہاد کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری فکر و خیال کی سطح پر بھی متاثر کرتی ہے۔ کرداروں کی عینیت پسندی، گھر گرہستی کی عکاسی، مثنوی کی سی داخلی فضا، واقعات کے بیان میں ربط و تسلسل اور ماضی کی ہلکی گہری پرچھائیاں ان کے گیتوں سے مخصوص ہیں۔ ابھی ان کے فن پہ بہار آئی ہی تھی کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اگر ان کی ادبی زندگی اتنی مختصر نہ ہوتی تو ان کی پیش کردہ روایتوں کے اثرات اردو شاعری پر کتنے دُور رس اور ہمہ گیر ہوتے۔ انھوں نے باقاعدہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ شاعری شروع کی اور ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان سات آٹھ برسوں میں انھوں نے جو "سریلے بول" سنائے ان کی اہمیت تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی۔ عوامی عنصر اردو میں عظمت اللہ خاں سے پہلے بھی موجود تھا لیکن انھوں نے اسے نئی زندگی دی۔ انھوں نے اُردو شاعری کو قافیہ آرائی سے بچانے کی پُرخلوص کوشش کی اور مضامین کی رنگا رنگی، خیال کے تسلسل اور اوزان و بحور کے آزادانہ استعمال پر زور دیا۔ گو اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں وہ ہر نئی راہ چلنے والے کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہو گئے اور ان کے کئی گیت خود ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے، انھوں نے برج کو چھوڑ کر کھڑی بولی کا لہجہ اپنایا جس میں وہ رس اور جھنکار نہیں جو گیت کو سنگیت سے قریب کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے گیتوں کے بعض کامیاب نمونے بھی پیش کیے جو اُردو شاعری میں بنیادی اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گیتوں میں خاص نوعیت کے عروضی اور معنوی تجربوں کی جس روایت کا آغاز عظمت اللہ خاں کی شاعری سے ہوا، بعد میں اس کا سلسلہ قائم نہ رہا۔ وہ عربی، فارسی اور اُردو کے علاوہ ہندی، بنگالی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی دسترس رکھتے تھے، عروض اور پنگل سے گہرے طور پر واقف تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تخلیقی صلاحیت اور شاعرانہ بصیرت کے بھی مالک تھے۔ افسوس کہ پینتیس برس گذر جانے کے بعد بھی اُردو گیت کی دنیا میں ایسا جامع الصفات شاعر پھر پیدا نہیں ہوا۔

خان آرزو

اور اُن کا تذکرہ مجمع النفائس

راز یزدانی

نام :- سراج الدین علی - آرزو تخلص مشہور خان آرزو
والد کا نام :- حسام الدین حسامی
تاریخ پیدائش :- سنہ ۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء
مقام پیدائش :- اکبر آباد آگرہ
تاریخ رحلت :- سنہ ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء
مقام رحلت :- فیض آباد (یو-پی)
مقام تدفین :- شاہجہان آباد دہلی

> "خان آرزو کو اُردو زبان پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔"
>
> (آبِ حیات ص ۱۲۱)

آبِ حیات کے مولانا محمد حسین آزاد کے متعلق اہل تحقیق کا یہ کہنا کتنا ہی سچ کیوں نہ ہو کہ اس تذکرے کا انداز بیان داستان سرایانہ اور فسانہ نویسانہ ہے اور یہ حقیقت بھی اکثر و بیشتر سچ ہو کہ آبِ حیات میں بجائے صحیح تاریخ نویسی کے سُنے سُنائے قصوں اور بڑی بوڑھیوں کی روایتوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے لیکن خان آرزو کے متعلق اس کا متذکرہ بالا اقتباس ایسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا جھٹلانا سورج کو آئینہ دکھانا یا دن کی روشنی میں دیا جلانے کے مرادف ہے۔ آج کے متعلق تو مشکل سے کہا جا سکتا ہے کیونکہ آج علم کی قدروں میں جو اضافہ ہوا ہے آج کے اہل علم جہاں پہنچ چکے ہیں علم کی وہ سرحدیں سچ مچ ستاروں کا دامن چھو رہی ہیں۔ - یا چھونے والی ہیں لیکن اپنے عہد میں خان آرزو کو امام المتاخرین کہا اور مانا جاتا تھا۔ دربار دہلی میں محمد شاہ نے انھیں ملک الشعرا بنایا اور اس وقت کے مشہور اہل علم نے اپنی کتابیں ان کے سامنے حک و اضافہ کے لیے پیش کیں۔ چنانچہ بہار عجم جیسے مستند لغت کے حاشیوں پر ان کی اصلاح اور اضافے اس بات کا زندہ ثبوت ہیں مثلاً مخطوطہ بہار عجم صفحہ نمبر ۱۴ کے حاشیہ پر لفظ زیب کے متعلق تحریر ہے۔ "فقیر آرزو می گوید کہ ایں تفرقہ محض بے جا است ..... الخ ..... یا صفحہ ۳۴۱ پر" لابہ "کے متعلق حاشیہ پر لکھا ہے "شاید لعب معرب ایں باشد" لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ علمی افضلیت اور یہ درجہ کمال خان آرزو کے اپنے زور بازو کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ بچپن میں ان کے والد شیخ حسام الدین حسامی کا انتقال ہو گیا تو نہ کوئی ان کا تربیت کرنے والا رہا۔ نہ غریب ماں کا معاون

اور خبر گیر۔ خان آرزو نے ان تلخ حالات اور غم دوران کا جس پامردی سے مقابلہ کیا اور سونے کی طرح وقت کی بے رحم بھٹی میں تپ تپ کے کندن بنے ہیں ابتدائی تربیت کی تفصیل تو ہمارے سامنے نہیں لیکن چشم تصور سے اُن مشکلات و مصائب کا اندازہ وہ قیاساً ہی سہی ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ایک بے یار و مددگار بیوہ ماں کا بے یار و مددگار بیٹا کن کن ہفت خوانوں اور دشوار گذار مرحلوں سے گزر کر اس قابل بنا ہو گا کہ اپنے اہل علم معاصرین میں امام المتاخرین کہا جا سکے، دربار محمد شاہ کا ملک الشعرا بنا لیا جائے اور آج تک علمی طبقوں میں احتراماً خان آرزو لکھا جاتا ہو۔ خان آرزو کے والد شیخ حسام الدین حسامی فارسی کے شاعر تھے، لیکن فوجی ہونے کی وجہ سے شعر کہنے کو اپنے منصب سپہ گری کے خلاف جانتے تھے گویا شعر کہتے تھے مگر کسی کو سناتے نہ تھے۔ خان آرزو کے لڑکپن میں جب ان کے والد زندہ تھے تو رات کو وہ خان آرزو کو فارسی کے اچھے شعر یاد کراتے۔ اس طرح شعر کی طرف خان آرزو کی رغبت سن شعور سے پہلے ہی ہو گئی جو والد کی موت کے بعد بھی قائم رہی۔ اس کے بعد تذکرے یہ لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ خان آرزو کی ابتدائی تعلیم قلعہ گوالیار ہی میں ہوئی۔ شیخ حسام الدین عالمگیر کی فوج میں منصب دار تھے، ان کی موت پر خان آرزو نے تحصیل علم بھی کی اور والدہ کی خبر گیری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ سترہ اٹھارہ برس اسی طرح گذر گئے اس کے بعد عالمگیر کی فوج میں ملازمت کر کے خان آرزو دکن گئے اور وہاں ۹ مہینے فوجی خدمت انجام دے کر واپس ہوئے سنہ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں خان آرزو دہلی آئے۔ اس سے پہلے وہ گوالیار میں وقائع نویسی کی خدمت پر مامور تھے جو غالباً فوجی خدمت کے بعد ملی تھی۔ خان آرزو کا دہلی آنا فرخ سیر کے زمانہ میں ہوا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی آ کر وہ انندرام مخلص، اپنے دوست شاگرد اور تقریباً ہم عصر کی کوشش سے دربار شاہی میں بار پا گئے۔ یہاں انھوں نے بڑے بڑے پُر آشوب واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خاندان شاہی کی خانہ جنگیاں اور شہریاروں کے بھائیوں کو ہوسِ شہریاری میں ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھا گویا وہ اس پُر آشوب عہد کی ایک زندہ تاریخ بن گئے۔

محمد شاہ کے عہد میں وہ درباری شاعر اور ملک الشعرا بنے، یہ زمانہ فراغت کا تھا مگر حملۂ نادری کے بعد جو آرزو کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور دہلی تاراج ہوئی۔ پورے شہر سے فراغت رخصت ہو گئی اور پورا شہر ویرانی اور بے اطمینانی کا مظہر بن گیا۔ اس وقت تک خان آرزو مؤتمن الدولہ نواب اسحاق خان شوشتری کے رہین کرم ہو چکے تھے لیکن یہ خاندان بھی دہلی کی تباہ کاریوں سے گھبرا چکا تھا۔ نواب وزیر اودھ یعنی شجاع الدولہ کے نکاح میں امۃ الزہرہ بیگم نواب اسحاق خان کی بیٹی تھیں اس لیے نجم الدولہ اور سالار جنگ دونوں بھائی دہلی چھوڑ کے فیض آباد چلے گئے جو اس زمانہ میں اودھ کی تخت گاہ تھا خان آرزو نے بھی اپنے مربیوں کا ساتھ دیا اور فیض آباد آ گئے۔

اس جگہ تذکرہ نگاروں کی ایک عام غلطی کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے۔ اودھ کے ہر آنے والے کو یہی لکھا جاتا ہے کہ وہ دہلی سے چلا تو لکھنؤ پہنچا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس عہد میں لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہ تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد سات برس تک آصف الدولہ بھی فیض آباد ہی میں رہے۔ ان کی روک ٹوک۔ بندشوں اور پابندیوں سے گھبرا کے فیض آباد سے نکلے اور لکھنؤ آ بیٹھے آصف الدولہ سنہ ۱۱۸۸ھ میں نواب وزیر اودھ بنے تھے اس حساب سے ان کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کا واقعہ ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں خان آرزو کا انتقال کر جانا یقینی ہے کیونکہ ان کا انتقال سنہ ۱۱۶۹ھ میں بتایا جاتا ہے جس میں کوئی اختلاف

نہیں لہذا خانِ آرزو کا لکھنؤ کی بود و باش اختیار کرنا غلط ہے البتہ سالار جنگ کی ہم رکابی میں ان کا فیض آباد آنا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ سالار جنگ کی سفارش پر شجاع الدولہ نے ان کے تین سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیے لیکن وہ اس فراغت کی زندگی سے زیادہ عرصہ تمتع نہ کر سکے اور ۱۱۶۹ھ میں جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ مرتے وقت خان آرزو نے وصیت کی تھی کہ میری لاش دہلی لے جا کر دفنائی جائے۔ چنانچہ فیض آباد میں ایک معین مدت کے لیے سپردِ خاک کئے گئے اور وہ مدت گزر جانے کے بعد ان کی میت دہلی لا کر دفنائی گئی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے تذکروں میں ۱۱۸۰ھ سے پہلے جن بڑے شاعروں کا لکھنؤ آنا تحریر ہے وہ لکھنؤ نہیں درحقیقت فیض آباد گئے ہیں۔ سودا بھی دہلی سے فرخ آباد اور فرخ آباد سے اول فیض آباد آئے۔ اس کے بعد آصف الدولہ کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ یہی حال میر ضاحک اور اُن کے مشہور بیٹے اور باپ سے زیادہ مشہور شاعر میر حسن کا ہے۔

خان آرزو کے اُستاد، ہم عصر اور شاگرد

خان آرزو نے میر عبد الصمد سخن سے اصلاح لی اور میر عبد الجلیل بلگرامی اور بیدل کے تصرفات کی قدر کرنے والوں میں پیش پیش ہے۔ والہ داغستانی۔ آزاد خوشگو (شاگرد بھی تھے) ثابت (میر محمد افضل) اور سعد اللہ گلشن (شاگرد ہی تھے) اور آنند رام مخلص۔ آرزو کے ہم عصر تھے۔ اُردو کے شاعروں میں میر تقی شاہ مبارک آبرو وغیرہ آرزو کے شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں۔

پرانے تذکروں اور کتابوں میں خان آرزو کی حسبِ ذیل تصنیفات کا پتہ چلتا ہے.......... ان تصنیفات کے مخطوطے کسی نہ کسی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ خان آرزو کے فارسی دیوانوں کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) دیوان آرزو۔ اس میں غزلیات۔ قصائد اور مثنویات کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی موجود ہیں۔ (۲) دیوان آرزو جواب دیوان شفیعائے اثر شیرازی (۳) دیوان آرزو جواب دیوان سلیم (۴) دیوان آرزو جواب دیوان فغانی (۵) دیوانِ آرزو دوم درحقیقت یہ کلیاتِ نظم آرزو کا ایک حصہ ہے اور اس آخر عمر تک کا کلام ہے۔ تعداد صفحات ۱۵۴ (۶) دیوانِ آرزو جواب دیوانِ کمال خجند کا یہ نامکمل ہے صرف ردیف دال تک۔

مثنویات:۔ شور عشق۔ جوش و خروش۔ مہر و ماہ۔ عالم آب اور ایک نامکمل مثنوی۔ یہ سب مثنویاں علی الترتیب محمود و ایاز زلالی نوعی سلیم اور ساقی نامہ ظہوری کے جواب میں ہیں۔

لغات میں سراج اللغات (اُردو کا پہلا لغت) چراغ ہدایت۔ نوادر الالفاظ۔ علم اللغۃ میں مثمر۔ یہ کتاب موجودہ دور میں لسانیات کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔

شرحیں:۔ خیابان شرح گلستان سعدی۔ شرح سکندر نامہ۔ اس کا نام شگوفہ زار ہے۔ شرح قصائد عرفی۔ شرح گل کشتی۔ یہ شرح مثنوی میر نجات کی شرح ہے۔ سراج وہاج۔ اس میں حافظ شیرازی کے ایک شعر پر بحث ہے اور طاہری۔ شاری۔ ماہر اور عزت کے بیان کئے ہوئے معنے پر نقد و تبصرہ ہے۔

فن نقد:۔ (۱) تنبیہ الغافلین۔ حزیں کے اشعار پر اعتراضات

(۲) سراج منیر۔ کارنامۂ منیر لاہوری کا رد

محاکمہ:۔ داد سخن۔ اس میں شیدا اور قدسی کے مناقشے پر محاکمہ ہے۔ اسی رسالے میں وہ طویل بحث ہے کہ زباندانی میں ہندوستانی ایرانیوں کے برابر ہو سکتے ہیں۔

بلاغت:۔ عطیہ کبریٰ (علم بیان) موہبت عظمٰے (علم معانی)

قواعد زبان:۔ معیار الاخصار۔ زداحیلۂ قواعد۔ اس میں غیر متعارف فارسی مصادر اور ان کے مشتقات ہیں:۔

مکاتیب:۔ پیام شوق۔ رقعات آرزو

تذکرہ:۔ مجمع النفائس۔

رسائل: (۱) آداب عشق، گلزار خیال فصل بہار اور ہولی کی تعریف میں۔ (۲) آبروئے سخن، حوض و فوارہ و تاک کی تعریف میں۔ (۳) خطبات۔ اس میں دیباچے بھی ہیں۔ (۴) ماخوذ از معاصر۔ مرتبہ حضور سہائے انور

خان آرزو کے ناقابل فراموش کارنامے

یوں تو خان آرزو نے بہت سے کام کیے ہیں لیکن ان کے دو کارنامے ایسے ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا اور یہ کارنامے ان کی ہر تصنیف کی روح اور اصل اصول تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔

پہلا کارنامہ ایرانیوں کی بے جا برتری کا انسداد

ہوش سنبھالتے ہی خان آرزو نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی عام ادبی ذہنیت پر ایرانیوں کی بے جا برتری کا شدید احساس حاوی ہے۔ جس نے ہندوستانیوں کی اپنی ذہانت اور تخلیق کی قوت کے چشمے خشک کر دیے ہیں اور اب ہندوستانیوں کے پلے کچھ نہیں صرف ایرانیوں کی کورانہ تقلید کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ چیز لسانیات کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ جب ایک ملک میں کسی دوسرے ملک کی زبان غلبہ پاتی ہے تو اس ملک کے اہل زبان کا یہ حق کسی طرح نہیں چھینا جا سکتا کہ معاشرہ کی اہم ضرورتوں کے مطابق ایسے الفاظ کو اس برتر زبان میں داخل کر لیا جائے جن کے بغیر عوام کی زندگی ویران ہو جانے کا اندیشہ ہو مثلاً پان کہ فارسی زبان اس لفظ کی ان لطافتوں سے عاری ہے جو پان کے تصور سے ہمارے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کا ترجمہ برگ تنبول کر لیا جائے تو یہ ترجمہ لفظی حیثیت سے تو درست ہو گا مگر ترجمہ کے پہلے حصہ یعنی برگ کے لفظ میں ہریالی کچے پن اور تلخی کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ پان کے پکے پن کے باوجود اس میں پنہاں لطافت کا گلا گھونٹ دیتا ہے اس لیے پان کے لفظ ہی کو اس کی اصلی صورت میں فارسی کے اندر داخل کرنے کا حق ہندوستان کو ملنا چاہیے اور کسی بھی ایرانی کے لیے ہندوستانی کا یہ حق اتنا ہی مسلّم ہو جتنا کسی دوسرے فارسی کے لفظ پر کسی ایرانی کا حق۔ بدقسمتی سے خان آرزو نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ اس حق کے خلاف تھا اور ادب پر ایرانیوں کی برتری کا قائل۔ محمد شاہ کے زمانے تک خان آرزو اس احساس کو عام کرنے سے بچتے رہے اور صرف خواص مثلاً آنند رام مخلص وغیرہ ہی ان کے ان خیالات سے متاثر ہوئے لیکن محمد شاہ کے دربار کا ملک الشعرا ہوتے ہی انھوں نے اول اول آنند رام مخلص کے ذریعے اور پھر خود اس قسم کے خیالات کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ چنانچہ مثمر میں انھوں نے صاف صاف لکھا ہے "تصرف صاحب

قدردانانِ ہندو در فارسی چرا جائز نہ باشد" اس حق کو منوانے کے لیے خانِ آرزو کو بڑے پاپڑ بیلنا پڑے لیکن وہ ایک آہنی اور مضبوط ستون کی طرح اپنی جگہ اڑے رہے اور ایرانیوں سے "صاحب قدردانانِ ہند" کے اس حق کو منوا کے چھوڑا۔ اسی حق کے لیے ان کو شیخ علی حزیں سے برسرِپیکار ہونا پڑا۔ شیخ علی حزیں اسی زمانہ کے بڑے ٹھسّے کے شاعر تھے جو ہندوستان کے بڑے سے بڑے عالم فاضل کو اپنے ایرانی ہونے کی وجہ سے ہیچ سمجھتے تھے۔ سودا کے متعلق ان کا یہ فقرہ غالباً سب کو یاد ہوگا کہ "در پوچ گویانِ ہند بد نیستی" ظاہر ہے کہ اس "انا پرست شاعر" سے خان آرزو کی ملاقات کیونکر خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ خان آرزو نے شیخ علی حزیں سے ملاقات تو کی لیکن اس پہلی اور آخری ملاقات کا نتیجہ ہے خان آرزو کا رسالہ "تنبیہ الغافلین" جس میں انھوں نے شیخ حزیں کے کلام پر چار سو سے زیادہ اعتراض کئے اور ایسے اعتراض تھے کہ والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ "ریاض الشعرا" میں بیشتر کو نقل کر کے ان کو صحیح قرار دیا ہے اس کے بعد خان آرزو کے ہر رسالے میں اس قسم کے ذکر پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عوام کو ایرانیوں کی برتری کے بے جا ہونے اور "تعرف صاحب قدردانانِ ہند" کے جائز ہونے کا احساس ہو گیا۔

خان آرزو کے اعتراضات کو اس لیے محض اعتراض نہیں کہا جا سکتا کہ ایرانیوں پر جو بے جا اعتراض کئے جاتے ہیں — خان آرزو ان کا ذکر کر کے ان کا رد بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حاجی جعفر خاں تبریزی۔ ذوقی داغستانی۔ عماد الدین فقیہ کرمانی۔ کمال خجندی۔ میرزا بلگرامی اور محمد حسین رضوان وغیرہ کے ساتھ کافی انصاف کیا ہے۔

خان آرزو کا دوسرا کارنامہ مجمع النفائس

خان آرزو کا دوسرا کارنامہ جسے نہ اردو ادب فراموش کر سکتا ہے نہ فارسی ادب بھلا سکتا ہے۔ ان کا تذکرہ مجمع النفائس ہے۔ کہنے کو تو یہ تذکرہ ہے مگر یہی تذکرہ وہ تذکرہ ہے جو محض شاعروں کے ذکر اور ان کے کلام پر ہی اکتفا نہیں کر سکتا بلکہ تذکرہ نویسی کی محدود حدوں کو آگے بڑھاتا نظر آتا ہے جو بات دوسرے بڑے بڑے تذکروں میں نہیں۔ مثلاً کلمات الشعرا۔ تحفہ سامی۔ تذکرہ طاہر۔ تذکرہ خوشگو۔ خزانہ عامرہ۔ سروِ آزاد۔ یدِ بیضا اور ریاض الشعرا وغیرہ اس تنقیدی پہلو سے معرا ہیں اور ان تذکروں میں وہ افادیت یا افادی پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مجمع النفائس کی روحِ رواں ہے۔

اس لحاظ سے مجمع النفائس تذکرے سے کہیں زیادہ نقد کی کتاب ہو گیا ہے اور خان آرزو کی انصاف پسند طبیعت کو دیکھ کر داد دینا پڑتی ہے کہ وہ تنقید میں عدل کرنے کی کوشش کرتے ہیں دھاندلی نہیں کرتے اور جگہ جگہ بے جا اعتراضات کو رد کرتے جاتے ہیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نقد کا پہلو معاندانہ نہیں بلکہ عاجزانہ ہے اور ہمیشہ "حقیر یا فقیر آرزو گوید" سے شروع ہوتا ہے۔ اس تذکرے کی ایک اور خوبی خان آرزو کا انوکھا اندازِ بیان ہے۔ خان آرزو نے اس کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ ان کا اسلوبِ بیان پھیکا نہ پڑنے پائے اور قاری کو اس کا مطالعہ ناگوار نہ ہو۔ اس کے لیے انھوں نے یہ التزام کیا ہے کہ تقریباً ہر شاعر کے ذکر میں اس کے لطائف بیان ضرور کئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں تذکرہ مطالعہ کرنے والے کے سر پر ایک "بارِ بے جا" کی طرح سوار نہیں ہوتا بلکہ وہ شعرا کی حکایاتِ دلچسپ اور لطائف و ظرائفِ گوناگوں میں محو ہو کر دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔

تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ خان آرزو عالمگیر کے ساتھ دکن گئے۔ واپسی پر

بہادر شاہ عالمگیر ثانی اور فرخ سیر وغیرہ کی خانہ جنگیاں دیکھیں اور محمد شاہ کے دربار میں ملک الشعراء رہے۔ اس لیے وہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کا چشم دید حال بھی بیان کرتے ہیں اور اپنے سے پہلے دور کے لیے اکبر نامہ، واقعات بابری، مآثر رحیمی وغیرہ سے وہ جا بجا حوالے پیش کرتے ہیں اس لیے مجمع النفائس کی حیثیت شعراء کے حال سے بڑھ کر سوسائٹی کی تاریخ کی سی بھی ہے اور یہی اس تذکرے کی وہ سب سے بڑی خوبی ہے جو اس کو دوسرے تذکروں سے ممتاز اور بالاتر بناتی ہے اور اسی خوبی سے تذکرہ نویسوں پر تذکرہ نویسی کے لیے جدید حدوں کی راہ کھلتی ہے۔

خان آرزو کا تذکرہ مجمع النفائس اور اس کی مفصل کیفیت

خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس کا مفصل ذکر دستور الفصاحت کے مرتب اور محشی جناب عرشی رامپوری نے دستور الفصاحت کے ماخذوں میں کیا ہے۔ یہ ذکر دیباچہ مصحح میں صفحہ ۳۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے میں ۱۴۸۵ شعرا کا ذکر ہے بدیں تفصیل کہ

الف کے ۱۵۱، ب کے ۵۶، ت کے ۲۷، ث کے ۷، ج کے ۴۲۔ ح کے ۶۳، خ کے ۳۹،
د کے ۳۴، ذ کے ۹، ر کے ۸۲، ز کے ۲۲، س کے ۸۱، ش کے ۹۸، ص کے ۸۳، ض کے ۱۹،
ط کے ۳۲، ظ کے ۹، ع کے ۱۶۸، غ کے ۳۱، ف کے ۸۲، ق کے ۳۲، ک کے ۴۳۔ گ کا ۱،
ل کے ۱۵، م کے ۹۴، ن کے ۹۸، واو کے ۳۶، ہ کے ۲۲، اور ی کے ۱۹۔ (۱۴۸۵)

مصنف کے دیباچہ کے بعد سب سے پہلے ابا یزید بسطامی کا ذکر ہے اور سب سے آخر میں محمد اشرف یکتا کا۔

اس تذکرے کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

> "اما بعد میگوید فقیر با بے زبانی خود گرم گفتگو۔ سراج الدین علی آرزو کہ از طباشیر صبح طفلی تا آلائکہ آفتاب زرد پیری است شوق تمام و محبت، لا کلام بخواندن اشعار فارسیہ دارد و خویش را از فدائیان حسن سخن می شمارد۔"

اس کے بعد لکھا ہے کہ تب مجھے اشعار یاد نہیں رہتے تھے ایک دوست سے ذکر کیا انھوں نے ایک موٹی سی بیاض (سفینۂ ضخیم) مجھے دی اور مجھ سے اصرار کیا کہ اب جو اشعار آپ کو پسند ہوں اس پر لکھ لیں۔ میں نے پہلے یہ بات یوں ہی کہہ دی تھی لیکن اب بات کا پاس ضروری ہو گیا اور انتخاب شروع کیا یہاں تک کہ سو دیوان متاخرین اور متوسطین کے کہ ان میں سے بعض میں چالیس ہزار شعر تھے اور بعض میں ۵۰۰ سے زیادہ۔ انتخاب میں آئے اور لکھے گئے۔ اسی زمانہ میں خیال آیا کہ ان شعراء کے کچھ حالات لکھے جائیں تو نامناسب نہ ہوگا اس لیے میں نے بعض تذکرے جیسے تقی اوحدی نصیر آبادی کا کلمات الشعراء، تحفہ سامی وغیرہ دیکھے اور ان میں جن حالات کا لکھنا مناسب سمجھا لکھ دیا۔" پھر کہتا ہے:-

> چون اصل غرض نوشتن اشعار دل پسند خود است و نوشتن حالات معی لہذا در تحقیق آں چنداں
> فکر نہ کشیدہ و در تلاش آں چنداں نہ دویدہ۔"

اس کے بعد چنداں نہ دویدہ کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس زمانہ میں مشاغل کی کثرت تھی اور اس کام میں شیخ مبارک محی الدین کے علاوہ میرا کوئی معاون نہیں تھا چنانچہ صفحہ ۲۴۰ پر ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شیخ مبارک محی الدین خمیر مایۂ نوشتن این تذکرہ است۔ اسی دیباچہ میں تذکرے کی تاریخ اختتام کے متعلق لکھا ہے کہ

بیدار تخلصے از تلامذہ فقیر تاریخ اختتام این تذکرہ چنیں گفتہ

این تذکرۂ سخنوران گیہاں   بے مثل چون نوشت سراج الدین خاں
بیدار بہ آرزو چنیں کرد رقم   گلزار خیال اہل معنے جان

چونکہ چوتھے مصرع کے اعداد ۱۱۶۴ھ نکلتے ہیں اس لیے ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰-۵۱ء) میں اس کا اختتام ہونا چاہئے بعض حالات سے پتہ چلتا ہے کہ خان آرزو نے تین سال تک جابجا ترمیم کی ہے یہاں تک کہ خان آرزو محرم ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں فیض آباد چلے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات کی ایزادی اس تذکرے میں دوسروں نے بھی کی ہے مثلاً میر تقی میر کا حال صفحہ ۷۹۵

میر محمد تقی المتخلص بہ میرؔ۔ مولودش مستقر الخلافہ اکبرآباد است۔ در اوّل مشق اشعار ریختہ بزبان اردو شعر بست بطرز شعر فارسی توغل بسیار نمودہ چنانچہ شہرۂ آفاق است و بعد ازاں بگفتن اشعار فارسی بطرز خاص گرویدہ قبول خاطر ارباب سخن و دانایاں این فن گشت طبیعتش بمضامین تازہ و غیر مبتذل معنی پرداز است و اشعار او بلطافت ادا و انداز از بسکہ مناسب و طبع ثاقب یافتہ در ابتدائے مشق شعر رتبہ سخن را بپایۂ انتہا رسیدہ از چند سال بجناب معالی القاب خدایگان زمان قدردان خردمنداں کان مروت و حیا دریائے ہمت و سخا مظہر عنایات الٰہی گنجور اسرار دانش و آگاہی جوان بخت فرد پیر بسیار بخش کم پذیر کریم باذل رحیم صاحب دل محیط جود و کرم راگرامی در عمدۃ الملک مہاراجہ بہادر کہ آفتاب ابد فروغ اقبالش بر ملت شرف مترقی ہموارہ مصاعد دولت و ترقی و دولت اجلالش ہر روز در تزاید باد۔ کامیاب فراواں فیوضات و بہرہ اندوز انواع احسان و پرداخت و احوال بفر اقبال میگزارد۔ مہاراجہ مستغنی التوصیف از اہتشام صبح دولت و کامرانی بہ بسیاری اشغال امور مملکت و جہانبانی کہ در عہد فرخندہ عہد فردوس آرامگاہ و بعد ازاں مدد زمان خلافت و اعوانِ سلطنت احمد شاہ بادشاہ مربع نشین چار بالش دیوانی و خالصہ شریفۂ دیوانی ...... انقضائے وادئی زمان و زمن و ازاں بارگہ کوکب اقبال شان پیوستہ صاعد معاعد اجلالت رتبہ عالی مرتبہ تا ثبالوزا و کامروائے نامداران عالم و صاحب سیف و قلم شدند و بے اغراق تکلف کہ نام نامیش در عرصۂ شش جہت بجہانداری جہاں نیک نامی مشتہر و صیت اخلاق خوش اشفاق دلکش آنجناب در بلاد ربع مسکون مشہور تر۔ بنا بر کثرت امور مملکت و قلت فرصت بتلاش شعر توجہ نفرمودند لیکن کمالات سخندانی و معمہ یابی بدیہہ و خوبی ذہن رسا و رفعت طبیعت عالی نابد الوصف است دفترہا باید کہ تحریر نماید.... ازاں تقلم می آید

> کہ روزے از صحن چمن وخیابان گلشن باخیال صاد جان خرامش کنان بدائیۂ از بہارستان خاطر عاطر
> ایں گل مصراعے سر زد۔ چوں غنچہ سر بگریبان عقدہ مولشیم۔ باآنکہ اکثرے بتلاش مصرعہ دوم فکر کردند
> خوب میسر نیامد میر مصرعہ ثانی را باینکہ بہم در تقابل مرتبہ مصرع اول دوم است بہتر رسانید
> کشاد کار ندانم چہ آورد بیتم۔ ہرچند میر دیوان مختصر دارد غزلہاے دردمندانہ و عاشقانہ میگوید۔

گویا یہ تقریب تھی میر کی دربار عمدۃ الملک راجہ ناگرمل میں رسائی کی۔ راجہ ناگرمل کو عالمگیر ثانی کے عہد میں نائب وزیر بنایا گیا تھا۔ مولوی قدرت اللہ شوق نے جام جہاں نما میں اس کو صاف کیا ہے لکھتے ہیں (صفحہ الف ۴۵)

> "ناگرمل در عہد محمد شاہ خدمت خالصہ و دیوانی داشت و در عہد احمد شاہ دیوانی تن ہم براں فزید شد۔"

ان امور سے عرشی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس طرح میر کا حال شعبان ۱۱۶۷ ہجری (جون ۱۷۵۴ء) کے بعد لکھا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:۔

> "لیکن یہ امر واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۶ھ و ۱۱۶۷ھ کے سابق الذکر دونوں واقعات اور میر تقی کا حال میری رائے میں اصل نسخہ کے حاشیوں پر بڑھائے گئے ہوں گے۔ بعد میں اس نسخہ کے کاتب نے ان کو متن میں شامل کر لیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے دونوں امور کے ساتھ الفاظ منہ عفی عنہ کاتب نے متن میں نقل کر دیے ہیں جو ہمیشہ ملحقات کے حاشیوں پر لکھے جاتے ہیں۔ میر کا حال اگرچہ متن میں اس لفظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے مگر یہ ۳-۴ ورق متن کے خط سے مختلف عمدہ نستعلیق خط میں کسی دوسرے نے لکھے ہیں۔ اس خط کے لکھے ہوئے اشعار اور لفظ کتاب کے دوسرے حاشیوں پر بھی جا بجا نظر آتے ہیں جس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ یہ کتاب کے مصحح کا خط ہے۔ میر کا حال وغیرہ پہلے کاتب نے نہیں لکھا تھا۔ مصحح نے نئے اوراق داخل کر کے۔ وہ مصرعہ جو سابق شاعر کا آئندہ صفحہ پر تھا۔ اس کی چھیل کر میر کے حال کے شروع میں لکھ دی ہے اور اس طرح آخری صفحہ پر جگہ نہ رہنے کے باعث کچھ میر کے شعر حاشیہ پر بھی لکھے ہیں۔"

میں اس میں اتنی ایزادی اور کر سکتا ہوں کہ اصل نسخہ میں جو شعرا کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے دی گئی ہے اس میں بھی شاہ سعد اللہ گلشن کا نام اور میر کا نام حاشیہ پر لکھا گیا ہے محمد لاہوری کے بعد اصل میں صادبنا کے۔ اس سے بھی عرشی صاحب کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی جس شخص نے راجہ ناگرمل کو پیش کرنے کے لیے اس نسخہ کی نقل کی ہے وہ اگر اس سے معصوم ہے تو کسی دوسرے نے جس کے خط کے حاشئے اس نسخہ میں جا بجا موجود ہیں میم کے حرف کو ختم ہوتا دیکھ کر اور یہ محسوس کر کے کہ میر تقی میر کا حال نہیں ہے۔ آخری شاعر محمد لاہوری کا ایک مصرعہ چھیل کے میر کے حالات بڑھا دیے لیکن ابتدائی فہرست پہلے لکھی جا چکی تھی اس میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ محمد لاہوری کے بعد صادبنا کے حاشیہ پر میر صاحب کا نام لکھ دیا جائے۔

اس نسخہ کو جس کا دستور الفصاحت کے دیباچہ میں حوالہ دیا گیا ہے خاتمہ کے بیان کے مطابق ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں میر تقی میر کے مربی مہاراجہ ناگرمل عمدۃ الملک بہادر کے لیے جسپت رائے کھتری نے کو ہیر میں نقل کیا ہے۔ یہ بقول عرشی صاحب ۲۲ × ۱۸ سائز پر ہے۔ اس میں ایک ہزار بیالیس صفحات یا ۵۲۱ ورق ہیں اور ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ خان آرزو کے انتقال کے بعد جو ۱۱۶۹ھ کا واقعہ ہے نقل ہوا ہے اور اس میں ایزادی اس سے بھی بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایزادی نقل کے بعد ہوئی ہے اور یہ قطعی نہیں کہا جا سکتا کہ ایزادی عمدۃ الملک کے ایما سے ہوئی ہے یا اختلاف خط کی وجہ سے بعد میں بہرحال یہ نسخہ جس نسخہ کی بھی نقل ہو اس میں میر صاحب کے حالات کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور رجب ۱۱۷۰ھ کے لکھے ہوئے نسخہ میں میر صاحب کے حالات بڑھائے گئے تو اصل نسخہ میں جو خان آرزو کی موجودگی میں لکھا گیا ہوگا میر صاحب کے حالات کیونکر تسلیم کئے جا سکتے ہیں البتہ ۱۱۷۰ھ کے بعد عمدۃ الملک راجہ ناگرمل کے نسخہ سے جو نسخے تیار ہوئے ہوں گے ان کے متن میں میر کے حالات ضرور ہوں گے موجودہ نسخہ میں بھی میر صاحب کے حالات سے کہیں راجہ ناگرمل کی تعریف مقصود تحریر نظر آتی ہے۔ میر صاحب کا حال تو صرف اتنا ہے کہ انھوں نے راجہ کے مصرعہ پر چست مصرعہ لگا دیا جو راجہ کو پسند آیا اور میر صاحب مورد الطاف ہو گئے۔ اس نسخہ کی عام طرز تحریر کا نمونہ یہ ہے :-

> قاضی مسیح اللہ حبشی از افاضل نامدار و عالمے متورع بود چنانکہ روزے در مجلس سلطان یعقوب ایلچیاں مصر و شام حاضر بودند و سلطان جشن عظیم نمودہ جملہ امرا و ارکان فراخور حالت تقطیع کردہ بودند و سلطان جامہ زرد و زپوشیدہ بر مسند جلال نشستہ با ایلچیاں در صحبت بود کہ ناگاہ قاضی مذکور حاضر شد و سلطان را از پوشیدن جامۂ زرد و زمنع نمود و سلطان ہمہ وقت آن جامہ را بدل نمود و از صمیم قلب بمتابعت شرع در آمد و قاضی را دعائے خیر کرد رحمۃ اللہ تعالےٰ آخر بعد از وفات سلطان یعقوب بعضے از امرائے او قاضی را بکفر متہم نمودہ بدرجہ شہادت رسانید و قعٔ ہذا یوم الجمعہ ۱۱۷۹ھ ...... صفحہ ۵۹۱

اس نسخہ کا مسطر ۱۱ سطری ہے۔ کاغذ قدیم یعنی بانس کا ہے۔ نسخہ اچھی حالت میں ہے۔

مجمع النفائس نسخہ بانکی پور

بانکی پور کے کتاب خانہ میں بھی مجمع النفائس کا ایک قلمی نسخہ نمبر ۱۰۱۱ ہے۔ معارف بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء معارف بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء میں بانکی پور کے اس نسخہ پر لکھنؤ یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے اسکالر جناب اقبال [illegible] کا ایک تحقیقی مقالہ شائع ہوا تھا۔ اب تک تو اقبال انصاری صاحب مدت سے ڈاکٹر محمد اقبال انصاری ہو چکے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس مقالے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دستور الفصاحت میں جس نسخے کا ذکر ہے یہ نسخہ اس نسخے سے زیادہ ضخیم اور اس لیے اس نسخہ سے بعد کا ہے۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں ۵۴ شاعروں کا ذکر ہے جو بایزید بسطامی سے شروع ہو کر محمد ماہ صداقت پر ختم ہو گیا ہے۔ دوسری جلد ملا صہبائی سے شروع ہو کر محمد اثر منو یکتا پر ختم

ہوجاتی ہے اور اس میں ۸۹۴ شاعروں کا ذکر ہے اس طرح دو جلدوں میں ۱۷۴۵ شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ غالباً سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اسپرنگر نے مجمع النفائس کا جو نسخہ دیکھا تھا اس میں شاعروں کی تعداد ۱۴۱۹ تھی۔ رامپور کے نسخہ میں بڑھ کر ۱۴۸۵ ہوگئی اور بانکی پور کے کتاب خانہ میں ۱۷۴۵ اشعرا کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے بانکی پور والے نسخہ میں رامپور کے نسخہ سے زیادہ اور بقدر ۲۵۰ شعرا کے زیادہ شاعروں کا ذکر ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ نسخہ رامپور کے نسخہ سے بعد کو نقل ہوا ہے کیونکہ اس میں رامپور کے نسخہ سے زیادہ ترمیم ہے۔ باقی کیفیات مشترک ہیں جو میں اسی مقالے میں کسی دوسری جگہ عرض کر چکا ہوں۔

خان آرزو اور میر تقی میر سے سوئے مزاجی

یہ جاننے کے لیے کہ خان آرزو اور میر میں کیونکر سوئے مزاجی پیدا ہوئی۔ اس کے اسباب کیا تھے اور کون خطا پر تھا، ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا پڑے گی۔ جب تک صرف میر کا تذکرہ نکات الشعرا ہمارے سامنے تھا۔ ہم نہ اس سوئے مزاجی سے واقف تھے نہ ہمیں اس کے اسباب و علل کی تلاش تھی۔ کیونکہ میر نے اپنے تذکرے میں خانِ آرزو کے متعلق جو اظہار خیال کیا تھا وہ ان الفاظ میں تھا۔ (نکات الشعرا صفحہ ۳)

> ”آب و رنگ باغ نکتہ دانی۔ چمن آرائے گلزار معانی۔ متصرفِ ملک نورطلب بلاغت۔ پہلوان شاعر عرصۂ فصاحت۔ چراغ دودمان صفائے گفتگو (کہ چراغش روشن باد) سراج الدین علی خان آرزو (سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً) شاعر زبردست۔ قادر سخن۔ عالم فاضل تاحال ہمچو ایشان بہندوستان جنت نشان بہم نہ رسید بلکہ بحث در ایران می زود۔ شہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق۔ صاحب تصنیفات۔ دہ پانزدہ کتب رسالہ و دیوان و مثنویات۔ حاصل کمالات اوشان از سترۂ بیان است۔ ہمہ استادان مضبوط فنِ ریختہ شاگردان بزرگوار اند۔“

اسی تذکرہ نکات الشعرا میں مرزا معز فطرت کا حال لکھتے ہوئے میر نے خان آرزو کو ”استاد و پیر و مرشد بندہ“ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ کئی تذکرہ نگاروں نے میر کے حال میں میر کو خان آرزو کا شاگرد اور ان کا تربیت یافتہ کہا ہے مثلاً مخزن نکات ذکر میر میں کہا گیا ہے۔

> ”درخدمت خان آرزو کہ خالوئے او بود لختے [illegible] آمدو حسنے —— الخ صفحہ ۴۰-۴۱

> ”گلشن ہند“[1] صفحہ [illegible] میر کے ذکر میں
>
> ”پرورش انھوں نے شاہجہاں آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔“

---

[1] گلشن ہند کو مارکوئیس آف ویلزلی کے عہد میں مرزا علی لطف نے علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرے گلزار ابراہیم سے جان گلگرسٹ کی فرمائش پر مناسب اضافوں کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔

شمیم سخن صفحہ ۱۲۱ پر میر کے ذکر میں لکھتا ہے :۔

میر تخلص ہمشیر زادہ و شاگرد سراج الدین علی خان آرزو۔"

اسی طرح مرداں علی خان مبتلا کے تذکرہ گلشن سخن میں ۸۴ (ب) پر میر تقی میر کے ذکر کے تحت

"میر تقی میر، شاگرد سراج الدین علی خاں آرزوست ....."

میر کے ذکر میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو میں کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۵۰ پر صاف صاف تحریر ہے "برادر زادہ سراج الدین علی خان آرزو و ہم از شاگردان اوست" اور اسی کی پابندی اردو کے سب سے آخری اور سب سے بہتر تذکرے "گل رعنا" میں کی گئی ہے۔ اس میں بھی صفحہ ۱۵۰ پر ذکر میر میں لکھا ہے

"جو کچھ بھی ہو۔ میر نے خان آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی"

گویا ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۹ء تک جو "گل رعنا" کی تیسری اشاعت کی تاریخ ہے اُردو ادب میں کسی کو شاید ہی معلوم ہو کہ خان آرزو اور میر میں سوئے مزاجی یا کوئی کشیدگی تھی۔ لگ بھگ ۱۹۲۶ء تک میر کو خان آرزو کا تربیت یافتہ اور ان کا ابتدائی شاگرد مانا جاتا رہا لیکن ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ "بابائے اُردو" نے ذکر میر کے عنوان سے "میر کی آپ بیتی" کو فارسی زبان اور اپنے حاشیوں اور مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کیا۔ یہ تو زیادہ صحیح نہیں کہ اس سے قبل اُردو کے خواص کی نظر اس کشیدگی پر نہیں تھی لیکن "میر اور آرزو" کے کشیدہ تعلقات کا مسئلہ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والے عوام کی نظر کے سامنے نہ تھا لیکن "ذکر میر" کی اشاعت کے بعد یہ ادب اردو کا عوامی مسئلہ بن گیا لیکن اس واقعہ پر نظر ڈالنے سے قبل میر اور آرزو کا رشتہ بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے میر کے والد کا نام تھا سید محمد علی جنھیں ان کی عبادت اور ان کے زہد کی وجہ سے میر محمد متقی بھی کہا جاتا تھا۔ ان محمد علی نے دو نکاح کئے تھے پہلا نکاح سراج الدین علی خان کی بہن سے اور ان کی موت کے بعد میر تقی کی والدہ مرحومہ سے۔ پہلی بیوی سے جو آرزو کی بہن تھیں دو لڑکے ہوئے، حافظ محمد حسن اور محمد محسن اور دوسری بیوی سے بھی جو میر کی والدہ تھیں دو لڑکے ہوئے، ایک میر محمد تقی دوسرے محمد رضی۔ بس یہ حقیقت ہے سراج الدین علی خان آرزو سے اور میر سے رشتہ کی اب میر کو ان کا برادر زادہ کہہ لیجئے یا خواہر زادہ حقیقت یہ ہے کہ وہ میر کی سوتیلی اور مرحومہ ماں کے بھائی تھے۔

"ذکر میر" میں آرزو کے متعلق جو کچھ ہے وہ فارسی میں ہے قارئین کی سہولت کے خیال سے اس کا اُردو ترجمہ اپنا کیا ہوا نہیں بلکہ محترم نثار احمد صاحب فاروقی کا کیا ہوا ان کی موقر کتاب "میر کی آپ بیتی" سے نقل کرتا ہوں۔ یہ ترجمہ میر کی آپ بیتی میں صفحہ ۹۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۶ پر ختم ہوتا ہے ــــ

> مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچا (والدہ کے انتقال پر بھائیوں سے سوئے مزاجی کے بعد۔ راز) اور بڑے بھائی کے (اپنے متعلق۔ راز) ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا احسان اٹھایا یعنی کچھ دنوں ان کے ساتھ رہا اور شہر کے لوگوں سے کچھ کتابیں پڑھیں (یہاں اساتذہ کا ذکر مفصلاً نہیں کیا گیا ہے۔ راز) پھر جب اس قابل بن گیا کہ کسی کا صحیح مخاطب بن سکوں تو بھائی کا خط ماموں کے نام پہنچا کہ میر تقی فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنا چاہئے بلکہ دوستی

> کے پردے میں کام تمام کردینا چاہیئے"۔ وہ عزیز پکے دنیادار تھے۔ اپنے بھانجے کی عداوت دیکھکر میرا بُرا چاہنے لگے۔ اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارتے اور نظر بچ کر رہتا تو اول فول بکتے۔ ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے۔ میں کیا بیان کروں کہ اُن سے کیا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کہ کیا رنج اٹھائے ہیں۔ ہر چند صبر و ضبط کرتا اور لاکھ احتیاج ہو ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا تھا مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان کی ایذا دہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علاحدہ دفتر درکار ہے۔ میرا دُکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔ مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی"۔

اپنے اس پاگل پن کی تفصیل بھی خود میرؔ نے اپنے سابقہ بیان کے متصل الاتصال لکھ دی ہے جو عجیب و غریب ہے اور اس سے میرؔ کے اعصاب کی کشیدگی ظاہر ہوتی ہے اپنے پاگل پن کے بعد کی کیفیت جو یقیناً انھوں نے دوسروں سے سُنی ہو گی۔ میرؔ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> جس کوٹھری میں مَیں رہتا تھا اس کا دروازہ بند کر لیتا اور ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا چاند نکلتا تو میرے لیے قیامت ہوتی تھی۔ اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دھلاتے وقت دایہ "مہتاب، چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا لیکن نہ اس طرح کہ دیوانگی کی حد تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دُور بھاگنے لگیں۔
>
> چاندنی رات میں ایک حسین پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا۔ جدھر بھی نگاہ اٹھتی تھی اسی رشکِ قمر پر پڑتی، جس طرف دیکھتا اُسی غیرت حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورق تصویر ہو گئے تھے یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے کبھی سیرگاہ دل میں محو خرام۔
>
> اگر گل مہتاب پہ نظر پڑ جاتی تو جان اور بیقرار ہو جاتی ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی۔ صبح اس کی جدائی میں وحشت۔ جب سفیدہ سحر نمودار ہوتا۔ دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا۔ تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس (شکل مہتابی) کی یاد میں خون روتا۔ میں دیوانہ دست کی مانند منہ میں کف بھرا ہوا۔ ہاتھ میں پتھر لیے گرتا پڑتا اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔
>
> چار مہینے تک وہ گل شب افروز نئے نئے انداز دکھاتا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا۔ ناگاہ موسم بہار آیا تو جنون کے داغ اور بھی ہرے ہو گئے۔ میں ایسا ہو گیا جیسے کوئی آسیب زدہ اور مطلق کسی کام کا نہ رہا۔ وہ خیالی صورت ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اس کی

> مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں۔ لوگ مجھ سے بھاگنے لگے اور مجھے بند کر دیا۔ فخر الدین خاں کی بیوی نے جو درویش (والد) کی مرید تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں۔ میرے علاج میں بہت روپیہ خرچ کیا۔ ملاؤں سیانوں نے جھاڑ پھونک کی طبیبوں نے فصد کھولی۔ بارے طبیب ان کا تیر نشانے پر بیٹھا۔

اس اقتباس کو "ذکر میر" میں پڑھنے کے بعد مجھے کتاب کے مقدمہ میں (صفحہ ۹) پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کے لکھے ہوئے ان الفاظ پر تعجب آمیز افسوس ہوتا ہے۔ یہ تو میں کہنا نہیں چاہتا کہ "بابائے اُردو" اس کے بعد میر کی صحیح حالت کو نہ سمجھے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انھوں نے غور و تعمق سے کوئی کام نہیں لیا اور روا روی میں لکھ دیا کہ ——

> "ایک معاملہ البتہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میر صاحب نے تذکرے میں اپنے (سوتیلے) ماموں سراج الدین علی خاں کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے اور مرزا معز فطرت کے حال میں "استاد و پیر و مرشد بندہ" کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے لیکن ذکر میر میں انھوں نے خان آرزو کی بدسلوکی بے مروتی اور دل آزاری کی ایک ایسی درد انگیز داستان لکھی ہے کہ جسے پڑھ کر نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے ان دو متضاد بیانات کو پڑھ کر آدمی گومگو میں پڑ جاتا ہے۔
>
> میرا خیال ہے کہ تذکرہ عام کتاب تھی جو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جانے والا تھا اور ذکر میر آپ بیتی ہے جس میں اپنے حالات بے کم و کاست بیان کر دیے ہیں گویا ایک قسم کا روزنامچہ ہے۔ تذکرے کو انھوں نے تذکرے کی حد تک رکھا اور اس میں ذاتی حالات اور خانگی قضیوں کا نام تک نہیں آنے دیا۔ اس میں میر صاحب کی سلامت طبع اور سلامت ذوق کا پتہ چلتا ہے"۔

اگر یہ دلیل صحیح ہے اور کوئی وقعت رکھتی ہے تو ذکر میر کی اشاعت سے دو غلطیاں لازم آتی ہیں۔ ایک میر صاحب کی دوسری ذکر میر کی اشاعت کرنے والوں کی۔ میر صاحب کی غلطی تو یہ کہ اگر انھوں نے اسے محض ذاتی روزنامچہ کی صورت میں لکھا تھا اور مطلب اس سے صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا تو سلامت طبع اور سلامت ذوق دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ضائع کر دیا جاتا تاکہ میر صاحب کی موت کے بعد ان ناگفتہ بہ حالات کو جاننے کا کوئی ذریعہ ان لوگوں کے ہاتھ کبھی نہ آتا جن سے ان حالات کو چھپانا مقصود تھا اور دوسری غلطی ذکر میر کی اشاعت کرنے والوں کی یہ ہے کہ انھوں نے ان حالات کو عام کر دیا جن کو جناب میر۔ اپنی سلامت طبع اور سلامت ذوق کی وجہ سے عام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے حیرت ہے کہ یوم پرسش میں اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔ میر صاحب کی سلامت طبع یا سلامت ذوق پر یا ان حالات کی اشاعت کرنے والے کی غیر سلامتی طبع اور ناسلامتی ذوق پر۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ جس کے بعد "بابائے اُردو" نے خود اپنے قلم سے اپنی ذات کو اخلاقی طور پر ایک جرأت رندانہ اور شوق فضول کا مجرم بنا لیا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے میر کے پورے کلام۔ میر کی ناہمواری حالات "ذکر میر" کا بغور مطالعہ اور میر کے زمانہ میں معاشرے کے جو عام رجحانات تھے اُن سے باخبری ضروری ہے۔

میر کے پورے کلام علی الخصوص ان کی مثنویات کے بغور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک شدید قسم کی "ماورائیت" ان پر طاری تھی۔

یہاں تک کہ وہ ایک مور (یعنی طاؤس) سے ایک عورت کا عشق اور مرگ طاؤس کے بعد اس کی چتا کی آگ میں جل مرنے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی حال ان کی دیگر مثنویوں کا ہے۔ منازل عشق اور مراحل محبت۔ کیف فراق اور ہجر و وصال کے بیان میں یہ ماورائیت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ اس کے بغیر میر اپنی مثنویوں میں وہ تاثر پیدا ہی نہیں کر سکتے تھے جو بحالت موجودہ ان میں پایا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میر کی اُردو شاعری میں اس زمانے کی عام روش کے خلاف تخلیقی عناصر بھی کہیں نہ کہیں ملتے ہیں۔ گویا انھوں نے فارسی شاعری کی عام تقلیدی روش سے کہیں کہیں گریز کرکے تخلیقی مواد بھی اپنے قارئین کو دیا ہے۔ مگر اسلوب بیان میں وہ ٹھیٹ قسم کے مقلد ہی نظر آتے ہیں۔ بہرحال ان کی عظمت سے انکار مقصود نہیں۔ کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اور علی الخصوص مثنویوں میں تاثر ماورائی عنصر سے زیادہ پیدا ہوتا ہے اور یہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ میر کے خیالات پر ماورائیت کا اعتقاد حاوی تھا۔

اب رہا "ذکر میر" تو اس کے ابتدائی صفحات کے ہی بغور مطالعہ سے اس ماورائیت پر اُن کے پورے اعتقاد کا پتہ چل جاتا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ میر کے والد مرحوم اور ان کے منہ بولے چچا کے ذکر اور مسائل تصوف کے لحاظ سے "تذکرۃ الاولیا" قسم کی چیز بنا ہوا ہے اور ہم آسانی سے اس کو ذکر میر کی جگہ "کرامات اسلاف میر" کہہ سکتے ہیں اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ غلط ہے جس طرح میرے دوست نثار احمد صاحب فاروقی نے میر کی آپ بیتی کے مقدمہ میں صفحہ ۱۲ پر یہ دلیل لاکر کہ میر ۱۲ برس کے تھے جب ان کے والد کی رحلت ہوئی لہٰذا یہ واقعات اس وقت کے ہو سکتے ہیں جب اُن کی عمر ۷-۸ سال سے زیادہ نہ ہی ہو گی۔ پھر ان واقعات کو جو ۷-۸ سال کی عمر میں گزرے ہوں۔ کوئی شخص اپنی عمر کے آخری حصہ میں کس طرح من و عن بیان کر سکتا ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

"میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں" ص ۲۱

میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ان واقعات کو میر کے اپنے ذہن کی اختراع نہ مانا جائے اور "فخرالدین خاں کی بیوہ" کی طرح بزرگوں سے سنی ہوئی بات سمجھ لیا جائے تو میر نے جس انداز سے ان کو پیش کیا ہے اس سے بقول منٹو کے اپنے بزرگوں کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگنے کی کوشش کے ساتھ میر کی ذہنی ماورائیت کا اظہار ان سے ضرور ہوتا ہے۔

پھر جس انداز میں انھوں نے اپنے جنون کا حال بیان کیا ہے جس کے ترجمے کی ذمہ داری بھی میں نے اپنے اوپر نہیں لی وہ بھی چغلی کھاتا ہے کہ میر کے ذہن پر ایک شدید قسم کی ماورائیت طاری تھی۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے، اور اسے پاگل کے طریقہ علاج کے اصول کے طور پر مانا جاتا ہے جس سے معالج کا مطلع ہونا ضروری ہوتا ہے کہ پاگل ہو جانے والے کا ذہن پاگل ہونے سے پہلے کن لائنوں پر سوچ رہا تھا۔ اور کس قسم کے سوچ بچار کی شدت سے دیوانگی تک نوبت پہنچی۔ بلکہ اسے یوں کہنا چاہیئے کہ حالتِ دیوانگی میں جو خیالات انسان کے ذہن پر حاوی ہو کر اس کے توازن کو کھو دیتے ہیں وہ نتیجہ ہوتے ہیں دیوانگی سے قبل کے خیالات کی شدت کا، اور ان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ دیوانگی سے قبل دیوانہ ہونے والے کی ذہنی رو کس طرف جا رہی تھی۔ ایک بار پھر پڑھیے اور کسی طرح ہو سکے تو انکار کر دیجئے کہ دیوانہ ہونے سے قبل ان کے ذہن کی رو میں ماورایت کی شدت نہیں تھی۔

اب ذرا میر کے زمانے کے عام معاشرے کے عام رجحانات کا جائزہ بھی لیجئے۔ کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ میر کے زمانہ میں زوال پذیر قومی حالات نے ماورائیت اعتقاد کو عام نہیں کر دیا تھا۔ جادو۔ ٹونے۔ ملا سیانوں کی جھاڑ پھونک سوتیلے رشتہ داروں کی بے رحمی کا اعتقاد یہ سب باتیں آج کے روشن زمانے میں بھی پائی جاتی ہیں تو میر کے زمانہ میں ان کا نقطہ عروج کیا ہو گا؟ اس کا اندازہ کرتے ہوئے ایک بار

پھر ذکر میر میں سراج الدین علی خاں کی بے رحمیوں کی لرزہ خیز داستان پڑھیئے تو آپ کو خان آرزو کی کوئی قابل ذکر خطا ہی نظر نہ آئے گی۔ ایک میر جیسے ماورائیت پر اعتقاد رکھنے والے کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے سوتیلے بھائی نے اپنے حقیقی ماموں کو میرے متعلق جو خط لکھا ہے اس میں اس مفہوم کے الفاظ ہیں کہ "میر تقی میر فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیئے۔" اور یہ اس حالت میں کہ آگرہ سے دوبارہ دہلی آنے میں اس کے بھائیوں کی شکر رنجی بھی شامل ہو۔ اور سوسائٹی میں جادو۔ ٹونے اور سوتیلے کیا حقیقی بھائیوں اور ان کے رشتہ داروں کی طرف سے نہ صرف دیوانہ بنا دینے کے بلکہ زہر خورانی کے حالات اور چشم دید قسم کے فرضی واقعات کی بھرمار ہو تو اس کی ذہنی رو بہک جائے گی یا نہیں اور وہ اپنے سوتیلے ماموں سے احتیاط برتنے لگے گا یا نہیں؟ ایک نوجوان کی یہ غیر ضروری احتیاط۔ اس کے سوتیلے ماموں کو جو اس کا استاد بھی ہو (اس کا ایک عملی ثبوت میں ابھی پیش کروں گا) اس کی نگرانی اور تفتیش حالات پر مجبور کر دے گی یا نہیں، پھر وہ اس نگرانی سے اور زیادہ بیزار ہو تو یہ نگرانی اور زیادہ سخت ہو جائے گی یا نہیں؟ اس موقع پہ سراج الدین علی خاں کی پاکیزگی اور معصومیت کی ایک زبردست دلیل میرے پاس یہ ہے کہ جب میر دیوانے مشہور ہو گئے تھے اور لوگوں نے انھیں کوٹھری میں بند کر دیا تھا تو یہ موقع سراج الدین علی خاں کے لیے بڑا اچھا تھا، وہ چاہتے تو کسی حیلے سے میر کا کام تمام کر دیتے تو دنیا آج اس کے سوا کچھ نہ جانتی ہوتی کہ سراج الدین علی خان آرزو کا ایک سوتیلا بھانجا میر تقی نام تھا جو عین عالم شباب میں دیوانہ ہو کر مر گیا لیکن اس کے خلاف میر کی سختی سے دیکھ بھال اور ایک رشتہ دار عورت کو ان کے علاج کی اجازت یہ سب ظاہر کرتے ہیں کہ خان آرزو کا ارادہ میر کو نقصان پہنچانے کا نہ تھا بلکہ وہ اپنے عزیز شاگرد کی جان بچانا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں خان صاحب کا ہاتھ تنگ ہو اور وہ میر صاحب کے علاج میں کوئی معتد بہ رقم نہ صرف کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فخر الدین خاں کی بیوہ نے غلط فہمی سے خان آرزو کو میر کا دوست نہ سمجھا ہو اور میر صاحب کے صحیح ہو جانے پر خان آرزو کی شفقت کو غلط معنے میں ان کے ذہن نشین کرا دیا ہو کیونکہ ٹونے اور جادو وغیرہ کے معاملے میں عورتیں ہمیشہ مردوں سے زیادہ خوش فہم رہی ہیں۔ بہرحال یہ وجوہ ہو سکتے ہیں خان آرزو سے میر صاحب کی پوشیدہ ناراضگی کے لیے۔ اس موقع پر کچھ باتیں اور بھی خیال میں رکھنے کی ہیں۔ خان آرزو کا تذکرہ مجمع النفائس ختم ہوتا ہے ۱۱۶۴ھ/۵۱-۱۷۵۰ء میں اور ان کا انتقال ہوتا ہے ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء میں اور میر کا ذکر شروع کرتے ہیں ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء سے کچھ پہلے۔ گویا خان آرزو کے انتقال کو تقریباً ۱۶ برس گزرنے کے بعد۔ میں دستور الفصاحت والے مجمع النفائس کے ذکر میں ظاہر کر چکا ہوں کہ میر صاحب کا ذکر اصل تذکرے میں بڑھایا گیا ہے اس کا رنج بھی میر صاحب کی زود انتقام اور مشتعل مزاج کو ہوا ہوگا۔ اہل ادب کی یہ عام روش رہی ہے کہ اکثر اساتذہ اپنے اساتذہ سے باغی اور منکر رہے ہیں۔ خود میر صاحب نے اپنے دوسرے استاد امروہوی کی اصلاح کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ صائب کا شعر مشہور ہے ؎

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادئی
رتبۂ شاگردی من نیست استاد مرا

دیکھئے کتنا زیادہ پاس ادب ہے کہ خاموش رہنے کا امتیاز بھی حاصل کر لیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میرا استاد تو میری شاگردی کے لائق بھی نہیں۔ بہرحال یہ وجوہ ہیں میر صاحب کے لیے خان آرزو کی استادی سے منحرف ہونے کے۔ خان آرزو میر صاحب کی تردید کے لیے موجود نہ تھے اس لیے جو شخص استاد و پیر و مرشد بندہ تھا۔ وہ دنیا دار جفا جو ستم پسند۔ دیوانہ بنا دینے والا اور جان لینے کی کوشش

کرنے والا ہو گیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ اتنے لرزہ خیز الفاظ لکھنے کے بعد بھی وہ اپنے دعوے کی دلیل میں کوئی واقعاتی دلیل نہیں لاتے اور یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ ان مظالم کو تحریر کرنے کے لیے ایک جداگانہ دفتر درکار ہے۔ کیا ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے میر صاحب کا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں اور اس قابل نہیں کہ اسے میر صاحب کی ناہمواریٔ حالات، ان کی حد سے بڑھی ہوئی ماورائیت پرستی، ان کی اعصابی کشیدگی جسے ان کی نازک مزاجی کہا جاتا ہے اور ان کے معاشرے کی پیدا کردہ جادو وغیرہ اور سوتیلے رشتہ داروں کے ظلم ناروا کی رعایات کا نتیجہ سمجھا جائے۔

اب میں میر صاحب کی شاگردی کا ایک واقعاتی ثبوت دے کر جس کا میں وعدہ کر چکا ہوں اس بحث کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

خان آرزو نے جن الفاظ کے متعلق اپنی کتابوں میں دعوے کیا ہے کہ فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع وغیرہ میں ان کا ذکر نہیں آیا یا، میر صاحب کے کلام میں وہ الفاظ پائے جاتے ہیں اور اس کثرت سے کہ غالباً عیارستان میں میرے محترم قاضی عبدالودود صاحب نے اس پر حیرت ظاہر کی ہے۔

مومن کے ناقدین

ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صدیقی

مومن کے زمانہ کو آج ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ اس عرصہ میں ہمارے اہلِ قلم نے عام طور پر مومن کی طرف سے بے اعتنائی برتی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کی تمام اصناف میں ان کی قادر الکلامی، فارسی نظم و نثر پر بے پناہ قدرت، نازک خیالی، اُس دور کی تحریکاتِ مذہبی و ملی سے وابستگی، دینی شغف اور علمی تبحر جو اُن کے یہاں ملتا ہے بہ حیثیتِ مجموعی اُس دَور میں کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ ممکن ہے میرے اس دعویٰ میں لوگوں کو عقیدت کا جذبہ زیادہ نظر آئے، مگر امرِ واقع یہ ہے کہ اُردو شاعری نے جینیس (GENIUS) کم پیدا کیے ہیں اور مومن اُن چند لوگوں میں سے تھے جو جینیس کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مومن کے اس علمی تبحر اور شاعرانہ کمالات کو دیکھتے ہوئے ضرورت تو اس بات کی تھی کہ اُن کے نام سے ایک اکیڈمی قایم ہوتی۔ مگر مدتوں اُن کی طرف توجہ بھی نہیں کی گئی۔ شکر ہے کہ تھوڑے عرصے سے ہمارے اہلِ ملک کو خیال پیدا ہوا کہ کچھ تو "تلافیٔ مافات" ہونا چاہیے چنانچہ حال ہی میں راقم الحروف نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اپنا مقالہ دہلی یونیورسٹی میں پیش کیا ہے جس کا موضوع "مومن کی حیات اور شاعری" ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان سے بھی دو دلچسپ کتابیں مومن پر شائع ہوئی ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب "مومن اور مطالعہ مومن" اردو دنیا کراچی کی طرف سے اور دوسری کتاب "مومن" کلب علی فائق نے مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے شائع کی ہے۔ ہمارے اس مقالہ کا موضوع دراصل یہی دونوں کتابیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں حضرات تحقیق اور علم و ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور متعدد تذکروں (قلمی و مطبوعہ) کی داخلی اور خارجی شہادتوں سے انھوں نے اپنی تصنیف کو سنجیدہ اور پُر وقار بنا دیا ہے۔ تاہم یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ متعدد جگہ تحقیق میں ان اصحاب نے سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر عبادت نے جس طرح غیر ضروری اور اُکتا دینے والی طوالت سے کتاب کو "وزنی" بنانا چاہا ہے اس سے مایوسی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کثرتِ اغلاط کے ساتھ ساتھ خود اپنی بات کی تردید اُن کے یہاں موجود ہے۔ کتاب تو ضرور قدرۃً تقریباً سوا پانچ سو صفحات پر پھیل گئی ہے لیکن اگر وہ انھیں واقعات کا تجزیہ کر کے اختصار کے ساتھ کتاب کو پیش کرتے تو اس کی افادیت بڑھ جاتی۔ ہم ان دونوں کتابوں کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد جن نتائج پر پہنچے ہیں اُن کا نفسیاتی اور تنقیدی تحلیل کے ساتھ تجزیہ کرنے، اور اُن دعوؤں کو جو اِن کتابوں میں کیے گئے ہیں سامنے رکھ کر تحقیق اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے مسئلہ مومن کی قومیت کا پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ جستجو کے باوجود کوئی ایسی سند نہ مل سکی جس کی بنا پر اُن کو سید یا پٹھان ثابت کیا جا سکتا۔ مومن کے نام کے ساتھ "خان" کا شامل ہونا اُن کے پٹھان ہونے کی کسی طرح دلیل نہیں ہو سکتا۔ عبادت صاحب نے مومن کے نواسے عبدالحی انصاری کے حوالے سے مومن کو پٹھان لکھا ہے [1] اس بارے میں نہ کوئی دلیل انصاری صاحب نے پیش کی ہے اور نہ عبادت صاحب نے۔ اگر محض قرابت کی بنا پر انصاری صاحب کا بیان مان لیا جائے تو عرش گیاوی کا قول بھی مستند سمجھا جانا چاہیے جو مومن کے دوسرے نواسے ناصر حبیب کے حوالے سے اُن کو سادات میں شمار کرتے ہیں [2]

عبادت صاحب نے ایک دلچسپ بات یہ بھی لکھی ہے کہ "مومن کی مثنویاں ان کی آپ بیتی نہیں ہیں [3]" مومن کی حیاتِ معاشقہ کے سلسلہ میں تقریباً تمام تذکرے خاموش ہیں۔ صرف اُن کے 'صاحب جی' کے تعلق کا اظہار تقریباً ہر تذکرہ میں ضرور موجود ہے مگر تفصیل وہاں بھی مفقود ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے مآخذ ان کی مثنویاں اور خطوط ہی ہیں اور یہ بھی کچھ پردہ داری کے انداز میں لکھے گئے ہیں جن سے یہ معلومات تو فراہم نہیں ہوتیں کہ کون کون "نازنینانِ قمر جلال" اُن کی محبت کا مرکز رہیں۔ تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کی ہر مثنوی اُن کے عشق کی اک داستان ہے۔" شروع کی چھ مثنویاں جن کے نام تاریخی ہیں عشقیہ ہیں اور جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں [4]۔ صرف یہی نہیں بلکہ واضح طور پر مومن نے لکھ دیا ہے۔

اس شہر میں ایک نوجواں تھا　　عشاق میں شہرۂ جہاں تھا
تھا نام تو مومن اور دین کفر　　جانِ محوِ بتاں و دل نشیں کفر

(قصۂ غم)

کتنے برس ہم شمارۂ افلاک　　کہ ہوا پائمال صورت خاک
ہائے بچپن میں دل کا آجانا　　کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا

(شکایتِ ستم)

نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا　　کہ مجھے چارہ گری نے مارا
ہو گیا نبض شناسی سے جنوں　　سنو حالِ دلِ دیوانہ کہوں

(قولِ غمیں)

غرض ہر مثنوی میں ایسی مثالیں کثرت سے دستیاب ہو جائیں گی جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہر مثنوی مومن کے عشق ہی کی ایک داستان ہے۔ البتہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مومن کی چھٹی مثنوی "آہ و زاریٔ مظلوم" اُن کے پچھلے عشق کی داستان

---

[1] عبادت ص ۱۵　[2] حیات مومن عرش گیاوی ص ۳۵　نام کے بارے میں فائق نے جن تذکروں کے حوالے سے "میر محمد مومن خاں" بتایا ہے یہ نام اُن تذکروں میں موجود نہیں ہے۔ فائق ص ۱۱۵　[3] عبادت صفحہ ۲۴　[4] مقدمہ دیوان مومن ص ۴۵ مرتبہ پروفیسر ضیار احمد بدایونی۔

نہیں بلکہ گزشتہ روداد ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس کا سبب بجز اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بالاکوٹ کے حادثہ سے متاثر ہو کر مومنؔ عشقیات سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد عبادت صاحب کے ان اقوال پر نظر ڈالیے تو تعجب ہوتا ہے کہ "یہ مثنویاں ان کی آپ بیتی تو نہیں ہیں زیبِ داستان کے لیے بھی انھوں نے بہت کچھ کہا ہے[۱]" "یہ واقعات تمام و کمال صحیح نہیں ہیں[۲]" ان دعووں میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارے دعوے بے دلیل ہیں۔

اسی سلسلہ میں عبادت صاحب کو دوسری غلط فہمی "صاحب جی" کے بارے میں ہوئی ہے۔ وہ ان کے وطن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "امۃ الفاطمہ صاحب جی کا تعلق خاندانِ دہلی سے تھا[۳]" یہ دعویٰ پہلی مرتبہ عبادت صاحب کے یہاں ملتا ہے۔ ورنہ تمام تذکرہ نویس اُن کی آمد، دہلی کے باہر سے مانتے ہیں[۴]۔ اور اکثر نے اُن کو لکھنوی مانا ہے۔ یہ ذکر تو تذکروں کا تھا۔ خود داخلی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔ صاحب جی کی آمد دہلی میں اس انداز سے ہوتی ہے:۔

لطف اس طرح کے جب پانے لگے   پھر تو ہر روز وہاں جانے لگے
ایک چندے یہی اوقات رہی   روز پہروں کی ملاقات رہی
واں ہر اک طرح بہلتا تھا دل   کہ ہوئی اُس میں بلا اک نازل
کہیں باہر سے کوئی واں آیا   میرے بیٹھے ہی وہ مہمان آیا

یہ مہمان امۃ الفاطمہ بیگم المتخلص بہ صاحب جی، تھیں۔ صاحب جی اپنے علاج کے سلسلہ میں دہلی میں مقیم رہیں۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا قیام دہلی میں سال بھر رہا۔ مومنؔ کے کلیات میں جو مرثیہ ہے عبادت صاحب کا خیال ہے کہ وہ صاحب جی کی وفات پر لکھا گیا ہے۔ . . . . "افسوس ہے اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ یہ مرثیہ مومنؔ نے کس کی وفات پر لکھا ہے (مومنؔ کے نواسہ عبدالحی انصاری صاحب نے مومنؔ کے جو حالات راقم الحروف کو لکھ کر بھیجے ہیں اُن میں یہ لکھا ہے کہ "پہلی بیوی کے مرنے پر نوحہ لکھا ہے جو کہ اُن کے دیوان میں موجود ہے" لیکن یہ بات کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ حاشیہ) بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ یہ کسی ایسے محبوب کا مرثیہ ہے جس کو مومنؔ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی ہی کا مرثیہ ہو۔ مومنؔ کی مثنوی قولِ غمگیں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب جی نے خودکشی کی۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ بدنامی کے خیال اور رسوائی کے ڈر سے صاحب جی نے ضرور خودکشی کی ہوگی، اور اس سانحہ نے مومنؔ کی دنیا کو اُجاڑ دیا ہوگا۔ جیسا کہ اس مرثیہ سے ظاہر ہے[۵]۔"

اس اقتباس سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مومنؔ نے مرثیہ کس کے لیے لکھا۔ کیا صاحب جی نے خودکشی کی۔ راقم الحروف کی رائے میں عبادت صاحب اور عبدالحی صاحب دونوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ یہ مرثیہ نہ صاحب جی کے مرنے پر ہے اور نہ مومنؔ کی پہلی بیوی کی وفات پر ہے۔ اس لیے کہ صاحب جی کے انتقال کی تاریخ تو کجا اُن کے انتقال کی خبر سے بھی تذکرے خاموش ہیں۔

[۱-۲] عبادت ص ۴۲-۴۴ [۳] عبادت ص ۵۳ [۴] ملاحظہ ہو شمیم سخن ص ۱۸ نیز بہارستان ناز ص ۶۲ گلشن ناز اور گلشن بے خار ص ۱۲۳ [۵] عبادت ص ۶۰

گلشنِ بے خار (۱۲۵۰ھ) میں تحریر ہے: "سالہا ست کہ باز بہ لکھنؤ رفت" گلشنِ ناز (۱۲۹۲ھ) میں ہے "اب نہیں معلوم یہ رنڈی زندہ ہے یا مرگئی" اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صاحب جی نے خودکشی کی اور مومن نے اُن کا مرثیہ لکھا۔ مزید ستم یہ ہے کہ صاحب کی خودکشی کا سببِ خوفِ رسوائی بتایا گیا ہے حالانکہ متفق طور پر تذکرہ نویسوں نے اس کو ایک "عفت ناآشنا" عورت بیان کیا ہے۔ عبدالحی صاحب کے قول کی تردید عبادت نے خود کردی ہے۔ مگر کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ حالانکہ مرثیہ کا عنوان غمازی کر رہا ہے کہ کسی معشوقۂ دلجو کی مفارقت پر لکھا ہے "معشوقہ حور ملک شیم نعلتی وصالہا فی جنت النعیم" اور پہلی بیوی سے اُن کے رابطہ کا حال یہ تھا کہ شادی کی تاریخ لکھتے ہیں:۔

چہ خوش ایں واقعہ را گفت اسیرے تاریخ
مرغ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد (۱۲۳۹ھ)

اپنے ایک خط میں غلام ضامن کرم کو لکھتے ہیں:۔

"خدا را بہ جہنم افتادن مومن باعثِ شادی و سرور نبود و کسے بذلت و خواری بقریہ وہ در دنیا مشہور نگردیدہ۔ دو سہ ماہ کہ بہ نادانی و سادہ دلی مرتکب جریمۂ بہ نا اطلاع ساختن گردیدم۔ از ہیچکس جز ملامت و نفرین نشنیدم[1]"

خود غور کیجیے کہ جس بیوی کے بارے میں مومن کی یہ رائے ہو اور جس سے کنارہ کشی کرکے مومن کو دوسری شادی کرنا پڑی ہو اس کی وفات پر مومن اس معرکہ کا مرثیہ لکھیں جو خلوص اور جذبات کی شدت سے بھرپور ہو۔ یہ ہرگز قرینِ قیاس نہیں۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ کس کی وفات پر لکھا گیا ہے۔ مومن کی تمام مثنویات میں صرف ایک محبوبہ کی وفات کا سراغ ملتا ہے[2]

گئی جنت میں بسکہ ایسی حور
ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور
رشک سے خضر پائمال ہوا
ملک الموت سے وصال ہوا

یہ صدمہ مومن کے لیے جانکاہ تھا۔ مثنوی کا انداز بتاتا ہے کہ نوجوانی کی ناتجربہ کاری کے عہد کی یہ محبت واقعی اور سچی تھی۔ مرثیہ کے خلوص اور تیور کو دیکھیے مگر اسی کے ساتھ مرثیہ کی ناپختگی بتا رہی ہے کہ یہ ان کا ابتدائی رنگ ہے۔ عبادت صاحب کو غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ ان کا خیال ہے کہ مومن کی کسی محبوبہ کے مرنے کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چناں چہ عشق کی ناکامی ہی نہیں ہے محبوب کی موت بھی ہے جس کے بارے میں ایک مرثیہ بھی انھوں نے لکھا ہے۔ یہ مرثیہ ان کے کلام میں موجود ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومن کو اپنے محبوب کی موت کا غم بھی اٹھانا پڑا تھا[3]۔ اگرچہ اس کا ذکر کسی تذکرے میں موجود نہیں ہے۔ کسی اور ذریعہ سے بھی محبوب کا مرنا ثابت نہیں ہوتا[4]"

یہی سبب ہے کہ عبادت صاحب نے اس مرثیہ کو صاحب جی سے منسوب کر دیا حالانکہ اگر وہ ان کی پہلی مثنوی "شکایتِ ستم" کا بغور مطالعہ کرتے تو یہ بات صاف ہو جاتی کہ مرنے والی محبوبہ صاحب جی نہیں بلکہ محبوبہ اوّل ہے جس نے اُن کو

---

[1] انشائے مومن

[2] مثنوی شکایتِ ستم (۱۲۳۱ھ)

[3] کلام میں مرثیہ کی موجودگی سے محبوب کی موت کا غم ثابت کرنا قابلِ غور ہے

[4] عبادت ص ۵۹

"آداب عشق" سے آگاہی بخشی۔ صاحب کے سلسلہ میں عبادت صاحب نے ایک قصہ بھی "مثنوی قولِ غمیں" کے حوالے سے لکھ دیا کہ مومن عشقِ محبوب میں جنگل جنگل پھرتے رہے اور جان دے دی۔ احباب نے ہمدردی کی اور نعش کو درِ محبوب تک پہنچا دیا اور وہ (محبوبہ) اس عالم کو دیکھ کر کوٹھے سے گر پڑی اور گرتے ہی مر گئی[1]" موصوف اگر مثنوی قولِ غمیں پر بغور نظر ڈالتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ

ایک دن جمع کیے محرمِ راز   ہر طرح ہر کوئی افسانہ طراز
کوئی مشغولِ حکایاتِ کہن   ذکرِ شیریں سے شکر ریزِ سخن
حالِ فرہاد سے سرگرمِ بیان   خونچکاں حرف و شرر ریزِ زباں

اور انہی قصوں اور حکایتوں کے درمیان کسی نے یہ واقعہ بھی سنا دیا جس کا حاصل وہ تھا جس کو عبادت صاحب نے معاشقۂ مومن و صاحب سے منسوب کر دیا۔ عبادت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"انھوں نے جتنے عشق بھی کیے ان میں سے ایک میں بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی اس لیے عشق و عاشقی کے ساتھ ایک احساسِ ناکامی ان کی زندگی میں بہت نمایاں ہے۔"[2]

مومن کا عشق کے سلسلہ میں ناکام ہونا اور پھر اس ناکامی کا احساس ان کی زندگی میں نمایاں ہونا یہ دونوں باتیں عجیب ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مومن کا عشق مجازی تھا اور اس میں بھی بوالہوسی کا پہلو غالب تھا اس لیے ان کا ہمیشہ مسلک یہ رہا کہ

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری   واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا
آئے غزال چشم سدا میرے دام میں   صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا

ان کے یہاں عشق میں ناکامی کیلنڈر کے بدل دینے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور اس ناکامی کو انھوں نے اپنی زندگی یا شاعری کا مزاج تو کبھی بننے ہی نہیں دیا۔ مومن کی شاعری کو قنوطیت اور یاسیت سے بھرپور کہنا تو بڑی بات ہے ان کی شاعری کے مزاج میں احساسِ ناکامی بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ اتفاقی طور پر غم کی کھٹک جس سے کوئی (خصوصاً ایک ذکی الحس شاعر) خالی نہیں ہوتا۔ دوسری بات ہے اس کو "شاعری کا مزاج" نہیں کہہ سکتے۔ وہ ذہنی طور پر ایک رجائیت پسند شاعر ہیں اور یہی ان کی شاعری کا عام مسلک رہا ہے۔

اسی طرح مومن کی محبوبہ کا مسلک شیعی ثابت کرنے کے لیے جو دو شعر عبادت صاحب نے دیئے ہیں وہ خالصتاً غزل کے شعر ہیں۔ انھوں نے محض "اہلِ عزا۔ سینہ کوبی۔ علم اور شہدا" کی رعایت سے ان کو صاحب جی کی مسلک کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر   یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ
سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے   کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

ظاہر ہے کہ اہلِ عزا سے مراد وہ لوگ ہیں جو غمِ مومن میں سوگوار ہیں اور شہدا سے مراد عشاق ہیں۔

مومن کی اولاد کے بارے میں عبادت صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے صرف ایک لڑکی محمدی بیگم تھیں۔ حالانکہ محمدی بیگم کے

---

[1] عبادت ص ۵۰   [2] عبادت ص ۴۵

علاوہ ایک صاحبزادی اور بھی تھیں جو جلد وفات پاگئیں[۵۰]۔ مومن نے قطعۂ وفات لکھا ہے۔

رفت لختِ جگرم زیرِ زمیں　　چنع بر خاک نشاندم امروز
در غمِ فاطمہ سلطان بیگم　　صحبتِ فاطمہ خواندم امروز
تا بجایش رواں شد دی شب　　جان بستاں برخ فشاندم امروز
۵۴　۱۲۱۱　= ۱۲۶۵ھ

مومن کی تعلیم کے سلسلہ میں عبادت صاحب تحریر کرتے ہیں۔ "مومن کو شروع ہی سے صحیح تعلیم کا ماحول ملا۔ ان کی تعلیم کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں ہوا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ ہی سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادے کا موقع ملا[۵۱]۔ حالانکہ امر واقع اس کے برعکس ہے۔ مومن نے تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی۔ البتہ لڑکپن میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظوں میں وہ ضرور شریک ہوئے ہیں اور استفادہ کیا ہے۔ فی الحال صرف دو شہادتیں کافی ہیں۔

> "بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہٖ اسی طرح ادا کر دیتے[۵۲]۔"

عبدالحی گل رعنا میں تحریر کرتے ہیں —

> "جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ سے عربی کی کتابیں پڑھیں"[۵۳]

مومن کی عربی استعداد کے بارے میں کریم الدین نے لکھا ہے کہ "حال استعداد ان کا یہ ہے کہ عربی میں شرح ملا تک اور فارسی خوب جانتے ہیں۔" لیکن امر واقع یہ ہے کہ وہ عربی میں ایک منتہی کا درجہ رکھتے تھے جیسا کہ ان کی انشائے مومن سے ثابت ہے۔ مومن کی علمیت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ جب شاہ اسمٰعیل نے "تقویۃ الایمان" لکھی تو خاص خاص لوگوں کو جمع کیا جن میں سید صاحب، مولانا عبدالحی، شاہ محمد اسحٰق، مولانا یعقوب، عبداللہ خاں اور مومن خاں تھے۔ شاہ اسمٰعیل نے وہ کتاب لوگوں کے سامنے پیش کی اور کہا کہ مجھے احساس ہے کہ اس کتاب کا لب و لہجہ سخت ہو گیا ہے اور الفاظ میں شدت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے ضرور شورش ہو گی۔ اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ چاک کر دیا جائے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا۔" اس کی اشاعت ضرور کی جائے گی مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم کر دی جائے۔ اس پر مولانا عبدالحی۔

---

[۵۰] فائق نے دو لڑکیوں کے علاوہ ایک دختر کا وجود او ر ثابت کیا ہے۔ مجھے اس کا سراغ نہ مل سکا۔ فائق ص ۵ میرے برادرِ بزرگ حبیب احمد صدیقی نے بیگم ضیائے عباس ہاشمی صاحب کے حوالے سے (جو محمدی بیگم کی نواسی اختر النسا کی لڑکی ہیں) تحریر فرمایا ہے کہ مومن کا مشہور قطعہ ع نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے .... الخ محمدی بیگم کی تاریخ پیدائش پر نہیں بلکہ کسی دوسری لڑکی کی پیدائش پر لکھا تھا۔ [۵۱] عبادت ص ۱۰۵

[۵۲] آب حیات ص ۴۱۳ [۵۳] گل رعنا ص ۲۹۸

شاہ اسحٰق، حمید اللہ خاں اور مومن نے مخالفت کی کہ ترمیم کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بحث و مباحثہ کے بعد طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے [۱]

مومن کی شادی کا مسئلہ بھی معرضِ بحث میں ہے۔ عام طور سے لوگوں کے علم میں صرف اس قدر ہے کہ ان کی شادی خاندانِ درد میں ہوئی تھی۔ انشائے مومن کا احسان ہے کہ اس سے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اس سے قبل بھی ان کی ایک شادی ہو چکی تھی۔ مگر آپس کے اختلافات اور طبائع کے بُعد نے بہت جلد مومن کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ خدا جانے ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔ مومن اپنی رنگین مزاجی اور نازک مزاجی کے باعث ایک دیہاتی اور غیر تربیت یافتہ لڑکی سے نباہ نہ کر سکے یا لڑکی ان کی بے راہ روی کو برداشت نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ مومن کا خط ملاحظہ ہو۔

"چوں از جہلائے نابکار رنجہا کشیدہ ام و بہ پیوستن دہاقین بد اطوار مصیبت ہا دیدہ ام سرِ آں
دارم کہ با ہمچو عالی خاندان فلک شکوہے وصلت نمایم [۲]"

عبادت صاحب نے مومن کی پہلی شادی کا زمانہ ان کے والد کے انتقال کے بعد (۱۲۴۱ھ) مانا ہے[۳]۔ اور یہی غلطی کلب علی فائق نے بھی کی ہے[۴]۔ فائق نے ایک غلطی یہ کی کہ مومن کے قطعۂ تاریخ کے مادہ کو ۱۲۳۹ھ کی بجائے ۱۲۴۵ھ قرار دیا ہے اور اس قطعہ کو ان کی دوسری شادی سے منسوب کر دیا۔ قطعہ تاریخ کا آخری شعر یہ تھا۔

چہ خوش ایں واقعہ را گفت اسیرے تاریخ مرغِ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد
۱۲۴۰ ۲۴۹ ۹۹۹ ۲۴۰ ۱۲۳۹ھ

ڈاکٹر عبادت نے کلب علی فائق کے اس قول کو ایمان بالغیب کی طرح تسلیم کر کے بجنسہٖ نقل کر دیا۔ اب سوال صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ اس مادہ تاریخ کو ان کی پہلی شادی سے منسوب کریں یا دوسری سے۔ راقم الحروف کی رائے میں چند بنیادی سوال اٹھتے ہیں۔ جن کی بنا پر اس کو پہلی شادی کا قطعۂ تاریخ تسلیم کیا جائے گا۔

۱ - انشائے مومن میں سرد ہند والی شادی کے بے جوڑ ہونے کا شدت سے ذکر ہے اور اس اکتاہٹ کا اظہار ان کے اس قطعہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ قطعہ شادی کا ہے مگر وہ اس کو اپنے لیے ایک زبردست قید خیال کر رہے تھے۔

۲ - احمد نصیر خاں مومن کی دوسری شادی کے بعد سب سے بڑی اولاد ہیں اور ان کا سنہ پیدایش ۱۲۴۷ھ ہے[۵] اگر مادۂ تاریخ دوسری شادی کا مان لیں تو گویا احمد نصیر شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔

اسی طرح مومن کی سیرت اور معاش کے بارے میں بھی بڑے دلچسپ انکشافات رونما ہوئے ہیں۔ کچھ تو عبادت صاحب کے ذہن کی تخلیق ہیں اور کچھ ایسی متضاد شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ مہارا جہ کپورتھلہ کے دربار میں ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار کی پیشکش کو ٹھکرا دینا کہ یہی تنخواہ ایک گویّے کی بھی ہے دراصل ایک بہانہ تھا۔ حقیقت یہ ہے

---

[۱] سیرت سید احمد شہید - ابوالحسن علی ندوی [۲] انشائے مومن [۳] عبادت ص ۴۶ [۴] فائق ص ۹۱
[۵] اصغر علی خاں اصغر نے قطعہ تاریخ لکھا۔ جس کا مادہ برآمد ہوا "روئے الہام سے کہا کہ بڑھا - ابنِ شاعر پہ لفظ لاثانی (۱۲۴۷ھ)

کہ وہ ملازمت کی پابندیوں سے گھبراتے تھے[1]۔ اسی طرح دہلی کالج میں سو روپیہ تنخواہ طلب کرنا ایک خوبصورت بہانہ تھا ورنہ سبب وہی پابندیوں سے آزاد رہنا تھا[2]۔ یہ درست ہے کہ مومن کی آزاد طبیعت اپنے کو علائقِ دنیاوی کا پابند دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی اور وہ کسی ایسی جگہ جانا ہرگز نہیں چاہتے تھے جہاں ان کو اپنی خودداری کا سودا کرنا پڑے۔ بایں ہمہ ان دونوں جگہوں پر ان کا عذر کرنا محض آزاد رہنے کی غرض سے نہیں ہو سکتا ان کو صاف انکار کرنے میں کس کی مروت مانع تھی۔ ہمیں کوئی تحقیقی ثبوت ایسا دستیاب نہیں ہو سکا جس کی بنا پر یہ کہہ سکیں کہ یہ عذر واقعی تھا یا وہی حقیقت تھی جس کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

مومن کے ذرائع آمدنی کے سلسلہ میں عبادت صاحب نے ستم یہ کیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں:-

> „ مومن کے نواسے عبدالحی صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے یہاں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ جانتے آتے رہتے تھے کبھی کوئی انعام بھی مل جاتا تھا۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے اس زمانہ میں بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے قلعہ میں انھوں نے شعر و سخن کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ شعر کی محفلیں جمتی تھیں مومن بھی اس میں شریک ہوتے ہوں گے اور قلعہ سے انعام و اکرام کچھ کچھ مل جاتا ہوگا۔ لیکن کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بہرحال مومن کی معاش کے یہی ذرائع تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ ان کے لیے ناکافی تھی لیکن وہ اس میں بھی امیروں کی طرح رہتے اور گزر بسر کرتے تھے[3]

جہاں تک مومن کے قلعہ سے تعلق کا سوال ہے اس کا ثبوت نہ کسی تاریخ میں ملتا ہے۔ اور نہ کسی تذکرے میں۔ محض عبدالحی کے بیان پر اس کو تسلیم کرنا (ان کی روایت عام طور سے ضعیف ہے) کہاں تک درست ہے۔ پھر مومن کے مزاج سے یہ بات ہم آہنگ نہیں کہ وہ کاسۂ گدائی لے کر قلعہ معلّٰی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوں۔ جب کہ مومن کو یہ مواقع میسر تھے کہ وہ اپنے آپ کو ٹونک۔ رام پور اور کپورتھلہ کے درباروں سے وابستہ کر سکیں۔ مگر ان کی خودداری نے کسی در کی جبیں سائی کی اجازت نہ دی پھر وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں کیوں جاتے۔ وزیر شاہ سے اُن کا یہ اندازِ تخاطب ملاحظہ ہو۔

مومن آیا ہے بزم میں تیری　　صحبتِ آدمی مبارک ہو
تہنیت خوانِ کامیابی ہے　　صلۂ دوستی مبارک ہو

راجہ اجیت سنگھ اور نواب صاحب ٹونک کی مدح میں جو قصیدے انھوں نے لکھے ہیں۔ ان کا انداز یہ بتا رہا ہے کہ مومن کچھ بھی ہوں مگر درباری شاعر کبھی نہیں ہو سکتے۔ پھر ایسے شخص سے یہ توقع کہ وہ بہادر شاہ کی مدح میں رطب اللسان ہو کر انعام و اکرام حاصل کرتا ہوگا محض قیاس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پھر اگر یہ قیاس کر بھی لیا جائے تو کوئی 'قطعہ' رباعی' وغیرہ تو بادشاہ وقت کی مدح میں کہی ہوتی اور اس کا سراغ اُن کے کلیات میں ملتا۔ دوسری جگہ عبادت صاحب اپنی بات کی تردید ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں —

> „ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر شعر کہتے تھے۔ اور ساری زندگی ان کا یہی

---

[1] عبادت ص ۷۷ [2] عبادت ص ۸۰ [3] عبادت ص ۸۲ - ۸۴

اندازِ بادہ کبھی قلعہ نہیں گئے[1] "

ع   ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے

مومن کی زندگی اور طرزِ بود و ماند کے بارے میں فیصلہ کرنا دشوار ہے ان کی جو تصویر فرحت اللہ بیگ نے کھینچی ہے اس سے ان کی امارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انشائے مومن کے بعض خطوط سے جو انھوں نے حکیم احسن اللہ خان کو لکھے ہیں۔ ان کی پریشان حالی کا پتہ چلتا ہے۔ فائق نے بھی ان کی زندگی عسرت کی لکھی ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ مومن کی زندگی امیرانہ تو نہ رہی ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ خودداری کے باعث انھوں نے اس محدود آمدنی پر جو انھیں وظیفہ کے طور پہ مل رہی تھی۔ قناعت کرلی ہو۔ عبادت صاحب کو ان کی امیرانہ زندگی کا جس وجہ سے شبہ ہوا وہ خود اُن کی زبان سے سنئے ——

> " مومن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے اعلیٰ و ارفع ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں شیفتہ نے اس کو دودمانِ گرامی اور خاندانِ نامی کہا ہے[2] "

" دودمانِ گرامی " اور " خاندانِ نامی " کا اشارا مومن کے حسب و نسب سے متعلق ہے۔ اس کو ان کی دولت و امارت پر محمول کرنا سراسر غلط فہمی ہے۔

ایک جگہ مومن کی شخصیت کے بارے میں بڑا دلچسپ بیان ملتا ہے وہ فرماتے ہیں :۔

> " وہ حفظِ مراتب کو بڑی اہمیت دیتے تھے انھیں اپنی بڑائی کا احساس تھا۔ اسی لیے دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو افضل و برتر سمجھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے غالب کی طرح اس کا اظہار اپنے اشعار میں نہیں کیا ہے[3]۔ "

اس قول کو ذہن میں رکھتے ہوئے موصوف کا دوسرا بیان ملاحظہ ہو :۔

> مومن کی شخصیت میں عجز و انکسار کے عناصر بھی موجود تھے اپنے آپ کو نمایاں کرکے پیش کرنا انھیں پسند نہیں تھا[4]۔ "

آپ اگر ان کے اس قول کی بھی تردید ان کی زبان سے سننا چاہتے ہیں تو سنئے ——

> " اس صورتِ حال نے ان کے یہاں ایک برتری کا احساس پیدا کیا اور وہ دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بلند و برتر سمجھنے لگے۔ اسی لیے ان کے یہاں کہیں کہیں اس کا اظہار بھی ہوگیا ہے[2]۔ "

غالباً عبادت صاحب خود یہ طے نہیں کر پائے ہیں کہ مومن کے یہاں اُن دونوں متضاد اوصاف میں سے کونسا وصف نمایاں ہے۔ درحقیقت مومن کو اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ اس احساس نے ان کے اندر خودی اور خودداری کو پیدا کیا۔ یہی انا کا وہ احساس ہے جو ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کی یہ جھلک ان کی پوری شاعری پر حاوی ہے۔

---

[1] عبادت، ص ۲ ۔ [2] ایضاً، ص ۹ ۔ [3] عبادت، ص ۹۵ ۔

ان کی شاعری میں اس قسم کے اشارے بکثرت ملتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان کے یہاں عجز و انکسار ہے یا انھوں نے غالب کی طرح اس تفاخر کا اظہار نہیں کیا کسی طرح درست نہیں ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ورنہ ان کے کلیات میں تقریباً ہر جگہ یہی خصوصیت کارفرما نظر آئے گی۔

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج   دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو
رشکِ دامانِ جواہر اور لکھی ہے غزل   جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے
رواں فزائی سحرِ حلال مومن سے   رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیے
ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر   مومن نے اس زمیں کو مسجد بنا دیا

وہ خردمند ہوں کہ ہے مجھے   عقلِ اول حکیمِ لاثانی
ہیں روش دانِ حکمِ برجیسی   ہیں ادا فہمِ سیرِ کیوانی

شاعرِ بے نظیر ہوں سحر بیان دبیر ہوں   دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحرِ حلال سے مرے جادوئے سامری خجل   طورِ کلیم اوجِ فکر نورِ خدا فسونگری

البتہ یہ پہلو افسوسناک اور تاریک ہے کہ وہ خودستائی کے ساتھ دوسروں کی تنقیص پر بھی اُتر آتے ہیں۔ مثلاً:

ہیں یہ سگانِ جیفہ خوار مغزِ سخن سے بے نصیب   کافرِ استخواں پرست طرفہ سگی و کافری
یار مومن سے بھی ہیں مدعیِ طبعِ رواں   واہ افکارِ تر اور مغز یابس کے
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو   جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

پھر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ سرزمینِ دلی پر بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو کسی سے بڑا نہ سمجھا[1]”

اسی ضمن میں عبادت صاحب لکھتے ہیں ـــ

> ”یہ تعلی یوں تو عجیب نہیں کیوں کہ اردو شاعری میں تو اس کی اچھی خاصی مضبوط روایت ملتی ہے لیکن مومن کی شخصیت میں تعلی کا یہ پہلو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ دوسرے ان کا یہ مزاج بھی نہیں تھا کہ وہ خود اپنی تعریف کریں یا دوسروں سے اپنی تعریف کرائیں[2]۔“

معلوم نہیں ڈاکٹر عبادت کس مومن کا ذکر کر رہے ہیں۔ جس مومن سے ہم واقف ہیں اس کی شخصیت میں تعلی کا پہلو

---

[1] عبادت ص ۲۲   [2] عبادت ص ۱۵۵

قطعاً عجیب نہیں۔ اگر مومن پیشہ ور ادیب یا شاعر ہوتے تو اُن سے تعلی کا اظہار باعثِ حیرت ہوسکتا تھا مگر جو شخص "تحسین سخن فہم" کو اپنا مبلغ خیال کرتا ہو اور درباروں کو نگاہِ کج ادائی سے دیکھتا ہو پھر اس کو اپنی اہمیت اور کمال کا احساس بھی ہو تو اس کی شاعری میں تعلی اور انا کا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

جس قسم کے تضادِ بیان کا ذکر اوپر گزرا اس قسم کی مثالیں "مطالعۂ مومن" میں حضرت سید احمد رائے بریلوی کے ذکر میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً

> "اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کا شہرہ تھا۔ مولانا سید احمد بریلوی کے دل میں اُن سے ملنے اور فیض حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی چنانچہ وہ اسی مقصد سے دلی روانہ ہوئے۔ دلی پہنچے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے انھیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادرؒ کے پاس بھیجا جو ان دنوں اکبرآبادی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ صاحب سے انھوں نے مختلف علوم پڑھے۔ قرآن کا مطالعہ بھی کیا[1]۔"

> "مولانا سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا...... قوم کی اخلاقی اور روحانی قباحتوں کو انھوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا[2]۔"

پھر اپنے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "شاہ عبدالقادرؒ کے شاگردِ خاص مولانا سید احمد بریلویؒ بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے۔ ان کی زندگی جہاد کے منصوبے بنانے اور کافروں سے لڑنے میں گزر گئی۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کرسکے[3]۔"

ان متضاد بیانوں کو پڑھیے اور پھر غور فرمایئے کہ سید صاحب تصنیف و تالیف کی طرف کیونکر توجہ کرسکتے تھے جبکہ وہ اُمّی تھے۔ معلوم نہیں عبادت صاحب کا ان کی کن تصانیف کی طرف اشارا ہے۔ اسی طرح سید صاحب کو بار بار اپنے وقت کا عالم باعمل بنانا تعجب خیز ہے[4]۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان کے زمانہ میں شیعہ سُنّی اختلافات بڑے زوروں پر تھے۔ آپ نے مسائل پر عربی میں کتابیں لکھیں۔ ان میں تحفۂ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے۔" واضح رہے کہ یہ کتاب عربی میں نہیں فارسی میں ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مومن کا طرزِ عمل مذہب اور رومانیت کے مابین کیا رہا ہے۔ ظاہری نظر سے دیکھنے والوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ وہ ایک نہایت غیر ذمہ دار اور مذہب سے شغف نہ رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی رومانیت نے

---

[1] عبادت ص ۲۱۱

[2] عبادت ص ۲۲۳

[3] عبادت ص ۲۱۰

[4] عبادت ص ۴۲ - ۵۹ - ۲۱۳

کسی لمحہ بھی یہ سوچنے نہ دیا کہ وہ عاشق ہونے کے علاوہ ایک مسلمان بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان پر جذباتیت کا الزام بھی عاید کیا گیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں ——

> "کچھ عرصہ تک تو وہ اس مذہبی ماحول سے دلچسپی لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر عشق و ہوس کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ اور مذہب کو تقریباً بھلا دیتے ہیں[1]۔"

> "مومن کے دیندار ہونے میں تو کسی کافر ہی کو شبہ ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ دینداری ان کے رومانی اور شاعرانہ مزاج پر غالب نہ آسکی۔ ان کے یہاں بیک وقت ان دونوں کا سلسلہ جاری رہا[2]۔"

> "مومن نے جوانی کا زمانہ اگرچہ لہو و لعب میں گزارا لیکن جلد اس سے توبہ کر لی۔ اس میں کچھ تو ان کی ناکامیٔ عشق کو دخل ہوگا اور کچھ اس زمانے کے علمی عملی اور دینی ماحول کے اثر سے بھی وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہوئے ہوں گے[3]۔"

عبادت صاحب کے پہلے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر فنا فی العشق ہو گئے۔ دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جذبہ تو برقرار رہتا ہے مگر غالب عنصر رومانیت کا ہے اور تیسرے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی کا زمانہ لہو و لعب میں گزار کر مذہب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض ناقدین واقعات پر مبالغہ اور رنگ آمیزی کا ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ حقیقت روپوش ہو جاتی ہے حالانکہ ناقد کا فرض نہایت نازک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر عبادت کے ان تینوں بیانات میں مبالغہ موجود ہے۔ مومن میں کافی مذہبیت تھی اور انھوں نے اپنے کسی عہد میں بھی مذہب کو خیرباد نہیں کہا البتہ انھوں نے عشق و عاشقی سے جلد توبہ کی۔ ان کے تائب ہونے کا زمانہ ان کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب ان کی عمر نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہمارے اس دعوے کے چند ثبوت ہیں۔ سب سے پہلے کریم الدین کا بیان سنیئے ——

> "ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو و لعب دنیا میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر بھی کہنا چھوڑ دیا...... اب پابند نماز روزہ کے بہ نسبت سابق کے بہت ہیں[4]۔"

مومن اپنے مذہب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی زندگی میں کچھ آزاد روی بھی رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی سیرت میں ایک دلچسپ تضاد نظر آتا ہے۔ اگر وہ ایک طرف رند شاہد باز اور صاحب جی جیسی بہت سی کافر اداؤں کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے تو دوسری طرف شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ ارادت کے ایک سرگرم رکن بھی تھے۔ اگر ایک طرف حسن و عشق کی

---

[1] عبادت ص ۱۲۶

[2] عبادت ص ۱۴۳

[3] عبادت ص ۴۷

[4] طبقات الشعرائے ہند ص ۴۴۵

راہ میں اپنے آپ کو فنا کیے ہوئے تھے تو دوسری طرف جذبۂ جہاد بھی دل میں موجیں مار رہا تھا۔ ان کی شب بتکدے میں گزرتی تھی تو دن خانقاہ میں۔ دراصل اسی تضاد میں ان کی شخصیت کا نکھار ہے۔ وہ مذہب سے بیگانہ تو کسی دور میں بھی نہیں رہے البتہ تائب اس زمانہ میں ہوئے جب ۱۲۴۲ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت جب سید صاحب جہاد کی تیاری میں مشغول تھے اور مومن اپنی جہادیہ مثنوی میں افضل سے افضل تر عبادت (شہادت) کی تمنا کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں "حنین مغموم" ۱۲۴۴ء (ان کے پانچویں عشق کی داستان) بھی دہرائی جا رہی تھی۔ البتہ ۱۲۴۶ھ میں جب بالاکوٹ کا سانحہ پیش آتا ہے تو مومن "عشق بتاں سے تائب ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ مومن کی آخری مثنوی "آہ و زاری مظلوم" کے اختتام کا زمانہ ۱۲۴۶ھ ہے۔ اس کے بعد کوئی عشقیہ مثنوی نہیں ملتی۔ گویا ان کے داستانِ عشق کا سلسلہ ۱۲۲۴ھ سے ۱۲۴۶ھ تک پھیلا ہوا ہے۔

کتاب مذکور میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک ترکیب بڑی شد و مد سے استعمال کی ہے "طبقاتی احساس" اس سے غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ مومن کا شعور اس کشمکش سے واقف تھا جو چھوٹے اور بڑے، امیر و غریب اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان تھی۔ بلکہ وہ طبقاتی کشمکش سے آگے بڑھ کر مومن کے یہاں "سیاسی شعور" کے متلاشی ہیں۔ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ ایک تغزل پسند شاعر سے سیاسی اور طبقاتی شعور کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ پھر اس جاگیردارانہ دور میں جب "شہنشاہِ عالم و عالمیان" کا زمانہ ہو سیاسی کشمکش کا مطالعہ آج کی عینک سے کرنا کسی طرح درست نہیں۔ عبادت صاحب نے طبقاتی احساس کی جو تاویل اس شعر میں کی ہے وہ اور بھی مضحکہ خیز ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

صفحہ ۲۸۷ سے ۲۸۹ تک ایک طویل انتخاب اشعار ہے جن کا سلسلہ عبادت صاحب مومن کے طبقاتی یا سیاسی شعور سے جوڑتے ہیں۔ دراصل ان کا تعلق نہ سیاست سے ہے اور نہ طبقاتی کشمکش سے بلکہ وہ ایک مخصوص قسم کی سیاسی، سماجی، معاشی انحطاط کی تصویر ہے۔ مومن چونکہ ایک حساس انسان ہیں اور وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ بڑے غائر نگاہ سے کر رہے تھے اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان سے بیگانہ وار گزر جاتے۔ عبادت صاحب نے اس موقع پہ انتخابِ اشعار میں بھی غلطی کی۔ بعض ایسے اشعار بھی اس ذیل میں شامل کر دیے جن کا تعلق خالصتہً غزل سے تھا مثلاً نمونۂ از خروارے

یادِ ایامِ وصلِ یار افسوس   دہر کے انقلاب نے مارا
دکھا دوں گا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو   ہلا دوں گا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو
اے گردشِ زمانہ کبھی تو تغیر آئے   حسرت مجھے قبول اگر اس قدر نہ ہو
جلا جگر تپِ غم سے پھڑکنے جان لگی   الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی

ڈاکٹر صاحب موصوف نے جس طرح اشعار بالا کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اسی طرح بعض جگہ اور بھی وہ مومن کے اشعار کے استعمال میں دھوکا کھا گئے۔ جس کی وجہ سے شعر کی روح مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ محض شعر کا مطلب بیان کرنا یا اس میں نئے معنی پیدا کرنا

شارح کی خوبی نہیں ہے بلکہ شعر سے پہلے شاعر کی روح اور مزاج کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے کسی عشقیہ شعر کو سیاست کے معنی پہنانا یا کسی شاعر کی عظمت کو منوانے کے لیے خواہ مخواہ اس کے یہاں سیاسی شعور کا انکشاف کرنا ایک ذمہ دار نقاد کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ نواب حامد علی خاں کو جب قلمدانِ وزارت سپرد ہوا تو مومن نے قطعۂ تاریخ لکھا جس کے دو شعر ہیں :۔

مومن آیا ہے بزم میں تیری　　صحبتِ آدمی مبارک ہو
تہنیت خوانِ کامیابی ہے　　صلۂ دوستی مبارک ہو[1]

ان اشعار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے :۔

"یہاں صحبتِ آدمی اور صلۂ دوستی کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کے نزدیک آدمی ہونا بہت بڑی خوبی ہے اور دوستی بذاتِ خود ایک بہت بڑا انعام ہے۔ مومن اسی آدمی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی فطرت کا مطالعہ ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے[2]"

مومن کا ایک شعر ہے :۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک چارہ گر محبوب کو شبِ فراق میں زحمت دے کر عاشق کی تباہ حالی کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عاشق کو یہ تجویز اس خیال سے پسند نہیں کہ اس طرح محبوب کو پریشانی سے دوچار ہونا پڑے گا[3] لیکن موصوف نے شعر کے اصل حسن پر توجہ نہیں کی۔ عاشق چارہ گر کو منع ضرور کر رہا ہے۔ لیکن محبوب کے پاسِ خاطر سے یا غمِ ہجر کی بدحواسی میں یہ بھول جاتا ہے کہ جب وہ قدم رنجہ کرے گا تو شبِ ہجر کی تباہ کاری خود ہی رخصت ہو جائے گی۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جس نے شعر میں خاص حسن پیدا کر دیا ہے۔

مرقع دہلی کے بعض اقتباسات کا ترجمہ کرنے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔ مرقع دہلی میں ہے ——

"ایں طبقہ ہر جا از امراے رنگین خبرمی یابد برعایت دلخواہ در کمند رفاقت خود می اندازد و از ہر طرف او سادہ رُوئے بیامش می رسد بہ دام احسانش می کشد[4]"

"ہر شخ کہ با ایں مجمع مربوط نیست از حلیہ اعتبار عاطل مخلش دار العیار شاہدان است و بزمش محک امتحان گل رخان نقد قرضہ حسن تا بہ دار الضرب بزمش رجوع نہ کند کامل عیار نیست[5]"

اس عبارت کے ترجمہ میں ڈاکٹر صاحب نے "سادہ رو" اور "گل رخاں" کا ترجمہ حسین عورت سے کیا ہے۔ حالانکہ مصنف کی

---

[1] عرفی کا شعر ملاحظہ ہو:

ہر چہ داری ودہی گرچہ بمعنی صلہ است　　صلۂ دوستی اش باد نہ مدح و نہ غزل

[2] عبادت ص ۱۱۲　[3] عبادت ص ۳۷۲　[۴-۵] عبادت ص ۱۹۷-۱۹۹

مراد یہاں بھی حسین لڑکوں سے ہے۔

اس کے علاوہ بعض جگہ جزوی غلطیاں نظر آتی ہیں جو غالباً ڈاکٹر صاحب کی نظر سے اوجھل ہوگئیں۔ مثلاً مومن کا مبدع اور مشعر طرزِ تحریر نمایاں ہے[1]" مشعر کا استعمال یہاں غلط ہے۔ مشعر کے معنی ظاہر کرنے والے کے ہیں۔ اسی طرح "تظلّم" کے معنی "ظلم" کے لیے ہیں حالانکہ اس کے معنی فریاد کے ہیں[2]" مومن نے ان اشعار میں صرف محبوب کی شوخی، اس کے تظلّم، اس کے ناز و انداز ہی کا نقشہ نہیں کھینچا ہے[3]" اسی طرح انھوں نے مومن کی مثنویات کے شروع میں فارسی کے متفرق دو شعروں کو قطعہ کہا ہے[4] ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انھوں نے جو طویل فہرست مومن کی غزلوں کے مطلعوں کی دی ہے۔ ان کے علاوہ اور غزلیں نہیں ملتیں — راقم الحروف جب مومن پر کام کر رہا تھا تو بعض غزلیں غیر مطبوعہ دستیاب ہوئی تھیں جن کے مطلعے یہ ہیں —

کوچہ میں بستر آپ کے شام اور کا ہوا ۔۔۔ اپنا جو تھا مقام مقام اور کا ہوا
سینہ سے منفعل ہے کھڑا تیر کھینچ کر ۔۔۔ ایک آہ مر گیا ہے جو نخچیر کھینچ کر
غم کو ہم سے ربط ہے مدت سے ہم کو غم سے ربط ۔۔۔ ہم انھی سے ربط رکھتے ہیں جو رکھے ہم سے ربط
لوگ کیا جانیں ہیں سوزِ شمع و پروانے کا حظ ۔۔۔ کوئی پوچھے میرے جی سے ہائے جل جانے کا حظ
ترے دردِ ہجر میں کب تلک پڑیں تڑپیں آٹھ پہر تلک ۔۔۔ دمِ صبح سے سرِ شب تلک سے لے کے سحر تلک
کسے ہے کون رکھو مرہم زنگار پر رکھو ۔۔۔ نہیں رکھتے تو خنجر ہی دلِ افگار پر رکھو

یہ غزلیں دیوانِ مومن قلمی (غالباً اصلاحی مؤلف) کتب خانہ رامپور سے دستیاب ہوئیں۔

آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ مومن کے واقعات زندگی حاصل کرنے کے لیے وہ ایک صاحب کے "الطاف و کرم" کے شکر گزار رہیں۔ ان صاحب کا نام بربنائے مصلحت آزاد نے نہیں بتایا۔ الطاف و کرم سے لوگوں کا الطاف حسین حالی کی طرف خیال گیا غالباً یہی شبہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذہن میں بھی یقین کی صورت میں پیدا ہوا[5]۔ کاش ڈاکٹر صاحب اپنا ماخذ بھی بتا دیتے تو لوگوں

---

[1] عبادت ص ۳۰۸

[2] اسی قسم کا لطیفہ شاہ نصیر کا بھی مشہور ہے کہ ایک شعر میں شاہ نصیر نے "تظلّم" بجائے "ظلم" باندھ دیا تھا۔ اس پر مشاعرہ میں گرفت ہوئی تو انھوں نے سند میں محتشم کاشی کا یہ شعر پڑھا۔

آلِ نبی چو دست تظلّم بر آورند
ارکانِ عرش را بہ تزلزل در آورند ۔۔۔ (آبِ حیات)

[3] عبادت ص ۳۵۲

[4] عبادت ص ۲۵۸ - ۲۸۶

[5] عبادت ص ۴۴

کو آئندہ کام کرنے میں شاید کچھ سہولت ہوتی۔

اس کتاب میں دو کمزوریوں کا احساس اور بھی شدت سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک طرف یہ بات کہ مومن کا مزاج عالمانہ نہیں تھا پانچ صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے[1] مومن نے غزل کے علاوہ دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس حقیقت کی تائید میں جس پر رائے عامہ کے اتفاق کے ساتھ کلیاتِ مومن کا وجود کافی ہے متعدد تذکروں کے حوالے دئے ہیں[2] مومن کا دیوان عام طور سے بازار میں دستیاب ہو جاتا ہے۔ مگر عبادت صاحب نے صفحات کو بڑھانے کے لیے تمام دیوان کے مطلعوں کی فہرست دی ہے[3] ایک طرف یہ طولِ بیان اور دوسری طرف اختصار کا یہ حال کہ بہت سے اہم مباحث کو فراموش کر دیا۔ مثلاً مومن کے مذہب کے بارے میں کوئی تفصیلی بحث نہیں ملتی جبکہ آج تک موافق اور مخالف رائیں موجود ہیں۔ اردو غزل پر بھی ان کی بحث نامکمل ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ موجودہ تنقید کی روشنی میں مومن کی غزل کا نفسیاتی تجزیہ کرتے۔ اور ان خصوصیات کی طرف کچھ اشارہ کرتے جن سے مومن کی انفرادیت کا تعین کیا جا سکتا۔ ان سب کی بجائے ڈاکٹر صاحب نے دس صفحات میں کلامِ مومن کی محض شرح کر دی ہے[4] اس سے زیادہ ستم یہ کیا کہ اصنافِ سخن میں مومن کی غزل اور مثنویات کو تو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ مگر دوسری اصناف جن میں مومن ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ صاحبِ موصوف نے بالکل نظرانداز کر دیں۔ جن میں قصیدہ اور قطعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غرض یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس کتاب میں اکثر جگہ افراط و تفریط کے شکار ہو گئے ہیں۔

ہم عبادت صاحب کی کتاب "مطالعۂ مومن" پر کافی تفصیل سے بحث کر چکے۔ مومن پر جس دوسری اہم تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کلب علی فائق کی کتاب "مومن" ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع، ترتیب اور استدلال و انتخاب کے اعتبار سے زیادہ قابلِ قدر اور لائقِ توجہ ہے۔ تاہم اس کتاب میں بھی بعض جگہ فاضل مرتب سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

فائق صاحب نے نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے مومن کو حنفی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[5]۔ ان کے استدلال کا مدار ذیل کے پوائنٹس پر ہے۔

۱۔ مومن کے شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان سے نسبت رکھتے تھے اور خاندان مذکور کے افراد تقلید اور حنفیت سے وابستہ تھے۔

۲۔ مومن کے تعلقات اپنے عہد کے دہلی کے حنفی بزرگوں (مثلاً آزردہ، شیفتہ اور فضل حق) سے استوار تھے۔

۳۔ وہ رباعیات جو ان کے اردو دیوان میں مقلدین حضرات کے خلاف ملتی ہیں، قدیم نسخوں میں نہیں ملتیں اس لیے الحاقی ہیں۔

ہمارے خیال میں وہ بنیاد جس پر عمارت کھڑی کی گئی ہے زیادہ پائدار نہیں ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کو خدا نے علم و اجتہاد اور رشد و ہدایت میں جو مرتبہ اور مقبولیت میں جو درجہ عطا کیا ہے، اس کی مثال ہندوستان کے علمی خانوادوں میں ملنا مشکل ہے

---

[1] عبادت ص ۱۰۶ تا ۱۱۰

[2] عبادت ص ۳۱

[3] عبادت ص ۳۶۴ تا ۳۸۲

[4] عبادت ص ۳۳۷ تا ۳۴۷

[5] فائق۔ دیکھو بحث ۴۳ تا ۵۸

اسی کے ساتھ ان کی تصنیفات میں کچھ ایسی دل کشی ہے کہ اہلِ سنت کا ہر فرقہ ان تحریروں سے مطمئن ہے۔ حضرات اہلِ حدیث ہوں یا مقلدین دیوبندی ہوں یا فرنگی محلی۔ بریلوی ہوں یا بدایونی سب شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور فرزندوں کا ذکر ادب و احترام سے کرتے ہیں ورنہ کیوں جانیے مولانا اسمٰعیل رح اور مولانا فضل حق میں کس قدر مذہبی آویزش رہی ہے۔ مگر شاہ عبدالعزیز رح کے توسل سے ان میں سے کوئی منحرف نہیں ہے۔ محض حنفی اکابر سے تعلقات کا ہونا کسی شخص کے حنفی ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ بنیادی تعلقات میں اگر یہ رواداری اور وسیع المشربی نہ برتی جائے تو انسانی زندگی میں کوئی سماجی حیثیت باقی نہ رہے۔ تذکروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہی حقیقت کارفرما نظر آئے گی۔ خود مومن کے تعلقات مرزا غالب۔ مولانا فضل حق۔ مولانا آزردہ۔ شاہ اسمٰعیل، نواب شیفتہ، حکیم سکھانند رقم۔ نواب وزیر الدولہ اور نواب محمد سعید خاں وغیرہ سے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک مخصوص عقیدہ، مسلک اور مذہب کا ماننے والا تھا۔ ایک طرف وہ شیعوں پر طنز و تعریض کا کوئی پہلو باقی نہیں رکھتے اور دوسری طرف غالب سے خصوصی تعلقات کا یہ حال تھا کہ آج کے تعلقاتِ دوستی میں اس کا خیال بھی نہیں آسکتا۔ مومن کے مرنے پر یہ غالب ہی کی تو رباعی تھی ۔۔

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر   خونابہ بہ رُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مومن تقلیدِ شخصی کے مخالف اور عمل بالحدیث کے قائل تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

اربابِ حدیث کا فرمان بر ہوں   تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبولِ روایتِ ائمہ، نہ قیاس   یعنی کہ فقط مُطیعِ پیغمبر ہوں

ہے بسکہ محبتِ رسولِ مختارؐ   مذہب کو میں سوچتا ہوں لیکن ہر بار
آتا ہے قیاس میں حق اہلِ حدیث   ہر چند قیاس سے نہیں ہے سروکار

یہی نہیں بلکہ وہ نہایت شوخی سے فقہ حنفی پر چوٹ کرتے ہیں :۔

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار   پر تو یہ ہے از بسکہ ہوا ہیں بیمار
مے بہرِ دوا پینے کو مفتی سے حضور   تقلیدِ ابو حنیفہ کا ہے اقرار

اور اس کے بعد نہایت نازیبا اور توہین آمیز الفاظ سے مقلدوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

یہ کچھ وہ سنت نہ طریقِ توحید   پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی سے یعنے   حیوان ہیں حقیقت میں بر اہلِ تقلید

تقلید تو شاید اصحاب حدیث کی نظر میں فسق فی العمل کی حد سے آگے نہیں بڑھتی لیکن صوفیانہ عقائد خصوصاً وحدت الوجود کو وہ حضرات فسق فی الاعتقاد اور الحاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ مومن کے یہاں یہ نقطۂ نظر واضح طور پر ملتا ہے۔

مومن یہ اثر سیہ مستی کا نہ ہو   اندیشہ کبھی بلند و پستی کا نہ ہو
توحید وجودی میں جو ہے کیفیت   ڈرتا ہوں کہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

اب رہا رباعیات کے الحاقی ہونے کا سوال تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ مومن کے کلام میں کمی بیشی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ مصطفیٰ خاں شیفتہ دیباچہ کلیات مومن میں فرماتے ہیں ——

> "پس فراوان جستجو و ہزاران تگاپو اندکے از بسیار بدست آورد۔ حیف کہ بسیار تلف گردید
> و شکر کہ اندک ہم بہم رسید[1]"

عبدالرحمن آہی لکھتے ہیں :۔

> "از اول تا آخر بامید تصحیح و تقریر بہ نہج ترتیب خویش بہ پیشگاہ مصنف بر
> خواندم۔ چناں چہ پارہ را بہ زیور اصلاح و حلیہ تہذیب آراستند و پارہ بحال خود گذاشتند[2]"

کلیاتِ مومن کے بعض قلمی نسخوں میں قصائد سرے سے موجود نہیں اور بعض میں مثنویات غائب ہیں۔ اس دلیل سے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ قصائد اور مثنویات بھی الحاقی ہیں۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں[3]۔ پھر غزلیات میں ان اشعار دں کو کیا کہیے۔ جن سے ان کے مسلک کا اظہار ہوتا ہے۔

مرا جوہر ہو سرتا پا صفائے مہر پیغمبر مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم
منہ کو مومن سے چھپانا کافر یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

اسی طرح ان کے جوشِ عقیدت میں عبادت بریلوی کی طرح فائق رامپوری نے جذباتیت اور ہنگامی جوش و خروش سے تعبیر کیا، اور اپنے دعوے کے ثبوت میں اس امر پہ زور دیا ہے کہ اس وقت جبکہ تحریکِ جہاد جاری تھی مومن جہاد میں عملی حصہ لینے کی بجائے دادِ عیش دے رہے تھے ۔

ہمارے خیال میں ان پر یہ الزام لگانا بڑا ظلم ہے۔ ایک شخص کسی مقصد یا مسلک سے وابستگی کا اظہار کرتا ہے، اس کے رہنماؤں اور ہوا خواہوں سے عقیدت اور محبت کا اعلان کرتا ہے ۔ اس کے مخالفوں کو گمراہ اور کافر تک قرار دینے سے نہیں چوکتا۔ اور آپ کہتے ہیں کہ وہ جذباتی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مومن مدتوں آزادانہ زندگی بسر کرتے رہے اور عملاً جہاد میں حصہ نہیں لے سکے۔ لیکن اس بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو جہاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس زمانہ میں سینکڑوں اہلِ حدیث ہوں گے جن کو جہاد میں عملاً شریک ہونے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ پھر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو دینی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی برتتے ہیں۔

---

[1] کلیات مومن نول کشور (دیباچہ) ص ۶ [2] ایضاً (خاتمہ) ص ۴۲۱
[3] دیوان مومن (قلمی) ۱۸۴۸ء مملوکہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی (غزلیات ہیں)
کلیات مومن (قلمی) ۱۸۳۴ء مخزونہ آزاد لائبریری علیگڑھ (غزلیات و مثنویات ہیں)
کلیات مومن (مطبوعہ) ۱۸۴۶ء مملوکہ جناب وقار رضوی (اس میں مثنویات نہیں ہیں)

کیا اس دلیل کی رُو سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج کر دیئے جائیں گے۔ ارتکابِ معصیت کی بنا پر کسی شخص کو خارج از اسلام کرنا مسلک اہلِ سنت کے خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں مومنؔ کی ایک رباعی سنیئے:۔

یہ چند منافق سراپا بدعت ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
بتلاتے ہیں بد عشقی امام حق کو گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت

مومنؔ کے علمِ طب کے بارے میں بھی فاضل مصنف کو شبہ ہے۔ طب میں کمال بہم پہنچنا بھی محتاجِ ثبوت ہے۔ اور اس کے ثبوت میں آثار الصنادید کا حوالہ دیتے ہیں کہ سرسید نے زمرۂ حکما میں ان کا نام نہیں لکھا ہے[۱]

یہ ضرور ہے کہ سرسید نے زمرۂ اطبا میں ان کا نام نہیں لکھا اور یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ شہرت پا گئے ہوں۔ دراصل انسان صرف زندگی کے ایک شعبہ میں شہرت پاتا ہے اور باقی صلاحیتیں خواہ وہ کسی بھی درجے کی ہوں کسی ایک صلاحیت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہی مومنؔ کے ساتھ ہوا کہ وہ مختلف علوم میں یکتائے روزگار تھے۔ مگر ان کی شاعری کے سامنے باقی کمالات دب کر رہ گئے۔ مولانا فضل حق کا یہ قول اس پر دال ہے:۔

> "مومنؔ بھیڑیا ہے جسے اپنی قوت کی خبر نہیں۔ اگر وہ عشق و عاشقی کے قصوں کو چھوڑ کر علمی مشغلہ علمِ طب و علمِ نجوم میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی[۲]"

مومنؔ کے علمِ طب و علومِ نجوم کے بارے میں تذکرہ نویسوں کی رائے کیا ہے چند اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

- "علمِ تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے[۳]"
- "حکیم محمد مومن خاں اب دلی میں بہترین شاعر اور اچھے طبیب ہیں[۴]"
- "حکیم مومن خاں فرزند حکیم غلام نبی خاں دہلوی در طب یدِ طولیٰ داشت و در نجوم پایہ والا[۵]
- علاوہ ایں فن در طب دستگاہ وافر داشت[۶]"
- "حکیم اس پائے کا کہ بو علی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے، پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پاسکے[۷]"

داخلی شہادتوں کی ضرورت ہو تو مومنؔ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل نظارہ رُخِ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالجِ مبطون تو قابضِ ارواح کرے دعائے رواجِ طریقِ جالینوس

---

[۱] فائق ص ۱۱۶

[۲] مقدمہ دیوان مومن از مرتبہ حضرت ضیاء احمد بدایونی ص ۲۵

[۳] سخن شعرا نساخ ص ۴۲۷

[۴] یادگار شعرا اشپرنگر

[۵] طور کلیم نور الحسن ص ۹۷

[۶] بزم سخن سید علی حسن ص ۱۰۸

[۷] گلدستۂ نازنیناں، کریم الدین

میرے سینہ کے صفحہ میں ہے رقم   علم دانا دلانِ یونانی
مجھ تلک پہنچے ہیں اب و جد سے   ورثۂ نکتہ ہائے لقمانی

مومن کی سیرت کے بارے میں موصوف کو بعض جگہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ——

"قصیدہ گوئی کو مومن عیب جانتے تھے یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہے۔ راجا جیت سنگھ کی تعریف میں ادائے شکر گزاری میں قصیدہ لکھنا اہم نہ سہی لیکن نواب وزیرالدولہ کی مدح میں قصیدہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے[1]"

موصوف نے شاید قصیدہ کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ نواب صاحب کے اور مومن کے تعلقات نواب صاحب کے قیام دہلی کے زمانہ سے ہو چکے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی رپورٹ "جائزہ زبانِ اردو" میں تحریر ہے۔

"شاعروں میں ذوق، مومن، عارف اور غالب وغیرہ سے ان کی صحبتیں رہیں۔ مومن سے تو بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک مرتبہ قلعہ کے مشاعرہ میں مومن خاں سے ان کی ملاقات ہوگئی اور ہمیشہ وضعداری کے ساتھ اس دوستی کو نواب صاحب مرحوم نے نبھایا[2]"

جب نواب صاحب نے حج کا ارادہ کیا تو انھوں نے مولوی کرم اللہ کو کچھ روپیہ دے کر مومن کے پاس روانہ کیا کہ وہ بھی اس حج میں ان کے شریک رہیں۔

کرم اللہ نام و ذات ان کی
مظہرِ لطف ہائے یزدانی

غالباً مومن اس زمانہ میں اپنی بے راہ رویوں میں پڑے تھے۔ اس لیے معذرت کے طور پر قصیدہ لکھ کر پیغامبر کو واپس کر دیا[3]۔ ان دونوں کی طبعی مناسبت کا ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرت سید احمد شہید رح کے معتقدین میں سے تھے۔ ریاست اور امارت کے باوجود نواب صاحب اپنے آپ کو سید صاحب کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ مومن نے نواب وزیرالدولہ کی مدح میں قصیدہ کسی ذاتی منفعت کے خیال سے لکھا ہوگا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔

معترض نے مومن کے قطعہ کا مفہوم بھی غلط لیا۔ مومن کا قطعہ ہے:۔

پادشاہا باین متاع قلیل   مدح چوں از منے چرا خواہی
دیگراں دیگر اند من دیگر   ہرچہ از بوم از ہما خواہی

فائق صاحب کا خیال یہ ہے کہ "اے بادشاہ میں متاعِ قلیل کیا قبول کروں اور اس متاعِ قلیل پر میں توصیف کیوں کروں[4]

---

[1] فائق ص ۱۲۲
[2] جائزہ زبانِ اردو ص ۱۴۰

[3] ممکن ہے کہ نواب صاحب نے حج کا ارادہ کیا ہو مگر وہ گئے نہیں۔ یہ زمانہ ۱۸۴۴ء کا تھا بیاض قلمی صاحبزادہ عبدالحمید (نیشنل ارکائیوز دہلی)۔

[4] فاروق ص ۱۱۵

حالانکہ مومنؔ کا مقصد یہ ہے کہ اسے بادشاہ تیری سلطنت خود ایک متاعِ قلیل ہے تو اس متاعِ قلیل پر کیا مدح کروں۔ اسی طرح مومنؔ کے ایک فارسی خط کے مفہوم کے سمجھنے میں بھی فائقؔ صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

چوں معاملہ با کنیزانِ گرامی نسبت از ہمہ بیش تر دارم۔ حیرانم تہمت بدمعاملگی
بخویشتن بر زبانِ قلم چرا رفت۔"

فائقؔ صاحب نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ مومنؔ کو کسی کنیز کے ساتھ متہم کیا گیا ہے اور وہ اس کی صفائی پیش کر دیے ہیں[۱] حالانکہ کسی رقم یا وعدہ کی بدمعاملگی کا ذکر ہے۔ ان کی عیاشی کا تذکرہ نہیں ہے۔

مومن کے شاگردوں کے سلسلہ میں فائقؔ صاحب کی تلاش قابلِ داد ہے۔ انھوں نے اڑتیس تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے ر اس طویل فہرست میں چند اور ناموں کا اضافہ کرلیں تو فہرست زیادہ مکمل ہو جائے گی۔

(۱) تسکینؔ مظفر بیگ[۲] (۲) غمگینؔ میر عبداللہ[۳] (۳) سبحوؔ غلام محمد[۴] (۴) ملاکؔ محمد حسین زیدی[۵]

البتہ شاگردانِ مومنؔ میں شیخ علی بخش بیمارؔ کا ذکر تحقیق طلب ہے —— مومنؔ کی شاگردی کا ذکر صرف ر مومنؔ نمبر کے ایک مضمون نگار نے کیا ہے۔ نیز عرشؔ نے حیاتِ مومنؔ میں ان کو مومنؔ کا شاگرد بتایا ہے۔ اوّل الذکر نے جناب ز فتحپوری کے حوالہ سے نظام شاہ کے تذکرہ میں ان کو شاگردِ مومنؔ کہا ہے اور عرشؔ کا ماخذ بھی تذکرہ نظام شاہ رامپوری ہے[۶] قم الحروف نے اس تذکرہ کی تلاش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ نیازؔ صاحب کی خدمت میں درخواست کی۔ مگر جواب سے محروم رہا۔ کسی سرے تذکرہ میں شاگردانِ مومنؔ میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔ اس لیے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بیمارؔ کو کس طرح شاگردِ مومنؔ مانا جائے۔

فائقؔ ص ۱۰۷

گلدستہ بہارِ سخن بابت ستمبر، اکتوبر ۱۸۸۸ء میں ان کی دو غزلیں طبع ہوئی تھیں۔ یہ گلدستہ کسی ذخیرہ میں دستیاب ہوا تھا۔ مگر سرورق نہ ہونے کے باعث پتہ نہ چل سکا کہ اس کا ایڈیٹر کون تھا۔ یہ معلومات نیز ان کی دو غزلیں حضرت تمکینؔ کاظمی مرحوم نے راقم الحروف کو بھجوائی تھیں۔ گلدستہ بھجوانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مگر بیماری اور موت نے اجازت نہ دی۔ خمخانۂ جاوید میں اس قدر لکھا ہے کہ میر حسین تسکینؔ اور مظفر بیگ تسکینؔ شاید ایک ہی شخصیت ہیں۔ مگر اس باب میں صاحبِ خمخانۂ جاوید کو غلط فہمی ہوئی ہے

انتخاب یادگار ص ۲۷۱۔ طورِ کلیم ص ۷۵۔ سخن شعرا ص ۳۵۲۔ بزمِ سخن ص ۸۹۔ گلستانِ سخن ص ۳۸۱

خمخانۂ جاوید ص ۲۶۲

میخانۂ درد ناصر نذیر فراقؔ ص ۲۳۰ تا ۲۳۲

اگر تذکرہ نظام رامپوری دستیاب ہو جائے تو اس کی صداقت کی مہر حضرت عرشیؔ رامپوری یا قاضی عبدالودود صاحب سے لگوانا ہوگی۔

ادبی تنقید کے مسائل

خلیل الرحمن اعظمی

دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں تنقید نے علم و ادب کی ایک اہم شاخ اور ایک علیحدہ فن کی حیثیت سے اپنی جگہ پیدا کر لی ہے۔ ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم جو ادب کو محض تفریح، دل بہلاوے اور وقت گزاری کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اسے انسانی تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین مظاہر میں شمار کرتا ہے وہ تنقید سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ایک زمانے تک یہ خیال عام تھا اور بعض لوگ اب بھی اسی طرح سوچتے ہیں کہ شعر و ادب کی تخلیق ایک پُر اسرار الہامی قوت کے زیرِ اثر ہوتی ہے جو عقل و شعور کی گرفت سے باہر ہے۔ اس پر منطق و استدلال کا حربہ استعمال کرنا اس کی لطافت کو زائل کرنا ہے۔ ادب کو ایک زمانے تک جادو اور ٹونے ٹوٹکے کی قسم کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ شاعروں کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا۔ عربی زبان کی مشہور کہاوت ہے: "الشاعر کالمجنون"۔۔۔ یہاں مجنون اپنے لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی جس شخص پر جن یا آسیب کا سایہ ہو۔ انسانی علم نے جہاں کائنات کے اور سربستہ رازوں کا پردہ فاش کیا اور فطرت کے بے شمار عقدوں کو حل کیا وہاں شعر و ادب کے پیچیدہ تخلیقی عمل کی گرہیں بھی کھولیں اور اسے اپنے شعور کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ادب زندگی کی عکاسی یا آئینہ داری کرتا ہے یا ادب کا مقصد تنقیدِ حیات ہے، اس قسم کے فقرے اب اس قدر پیش پا افتادہ ہو چکے ہیں جس طرح یہ کہنا کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ زمین کے گول ہونے کی بات جس شخص نے پہلی بار کہی تھی اس کے اس خیال کو اپنے زمانے میں کفر و الحاد سے تعبیر کر کے اسے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

ادب اور مادی زندگی کے پیچ در پیچ رشتوں کو سمجھنے کی کوشش، مادی زندگی ہی کی طرح ادب کو بھی جامد اور اٹل ماننے کے بجائے متحرک اور ارتقا پذیر سمجھنا، مادی زندگی ہی کی طرح ادب میں مثبت و منفی قوتوں کے تصادم و پیکار کے جدلیاتی عمل کو پہچاننے اور اس سے شعوری طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی فہم و بصیرت کو استعمال کرنے کا نام تنقید ہے۔ مڈلٹن مرے کا کہنا ہے کہ "جس طرح زندگی کا شعور و احساس فن ہے اسی طرح فن کا شعور و احساس تنقید ہے"۔ یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر شعر و ادب محض تک بندی یا قافیہ پیمائی، محض لفظی بازی گری، ذہنی عیاشی یا بیکاری کا مشغلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باحواس اور سنجیدہ شخص کا سنجیدہ عمل ہے تو ہر تخلیقی عمل کے ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی کام کرتا ہے اور سب سے پہلے شاعر اور ادیب کی اپنی ذات میں ایک نقاد چھپا بیٹھا رہتا ہے۔ ٹی، ایس، ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نظم یا نثر کی کوئی تصنیف جب وجود میں آتی ہے

تو وجود میں آنے سے قبل مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ لکھنے والا ایک موضوع منتخب کرتا ہے، زندگی کے بے شمار مظاہر احساسات اور تجربات میں سے چند کو چنتا ہے، پھر ان کی ترکیب و تعمیر کرتا ہے۔ اس میں ترمیم و تنسیخ، حک و اصلاح اور تراش خراش کرتا رہتا ہے، اپنے مسودے کو بار بار دیکھتا اور اسے ایک خاص معیار اور سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ کتنی ہی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کے بعد یہ تحریر اس قابل ہوتی ہے کہ خود فنکار کا دل اس سے مطمئن ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ ادیب کا یہ تمام عمل اس کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔ اس لیے بار بار اُس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اعلیٰ، وقیع، زندہ اور پائدار ادب کی تخلیق وہی ادیب کر سکتا ہے جو اعلیٰ درجے کے تنقیدی شعور کا بھی مالک ہو۔ خود رو قسم کے ادیب و شاعر جنھیں زندگی سے کوئی سنجیدہ لگاؤ نہیں، جو مظاہر حیات کی پرکھ یا بصیرت نہیں رکھتے اور نہ جنھیں اپنے تجربات و احساسات کی تعمیر و تنظیم کا سلیقہ اور ہُنر آتا ہے اور نہ ہی وہ اس ہُنر کے لیے مشقت اور ریاض کرتے ہیں ان کا ادب بھی ویسا ہی حقیر، ناکارہ اور ناپائدار ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے تنقیدی ادب کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات چھپی نہیں ہے کہ ادبی تنقید کا خاصا بڑا حصہ ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو خود بھی تخلیقی ادیب تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین، خطبوں، دیباچوں اور خطوں میں ادبی تخلیق کے متعلق جو بصیرت افروز رائیں دی ہیں یا اپنے تجربات بیان کئے ہیں ان سے شعر و ادب کے ارتقا میں بڑی مدد ملی ہے۔

یہاں آکر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور یہی دراصل فساد کی جڑ بھی ہے کہ جو شخص خود ادیب و شاعر ہے جیسے شعر افسانہ، ناول، ڈراما یا کسی تخلیقی صنف ادب کا ذاتی تجربہ ہے اس پر تو بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے تنقیدی خیالات کو قابل اعتنا سمجھا جا سکتا ہے لیکن جو شخص خود ادب کی تخلیق نہیں کرتا اور نہ اسے ان تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس سے ایک تخلیقی فنکار گزرتا ہے وہ کیسے ان مسائل کو سمجھ سکتا اور ان پر کوئی حکم لگا سکتا ہے؟ اس طرح کا سوال اٹھانے والے ایسے ادیب کے وجود کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں جو "نقادِ محض" ہو بلکہ بعض لوگ تو ایسے نقادوں کو ادیب ہی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو ادب میں بے جا مداخلت کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ادبی تخلیق کا اپنے آپ کو اہل نہ پاکر یا ادب کے میدان میں ناکام ہو کر تنقید کی طرف رُخ کرتے ہیں ان کی حیثیت طفیلی کی سی ہے۔ یہ ادیبوں کے بل بوتے پر نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اس کی تخلیقات کو مقبول بنانے کے لیے ایسے مضامین لکھتے ہیں جس سے ان کے ممدوح کا اشتہار ہو یا کسی کی نکتہ چینی اور مخالفت کر کے اس کے کارناموں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی تصور کے ماتحت بہت سے ادیبوں نے نقادوں کے نام پر لعنت بھیجی ہے۔ کسی نے انھیں ادبی جونک کہا، کسی نے انھیں ان مکھیوں سے تشبیہ دی جو گھوڑوں کے اوپر بیٹھتی، انھیں پریشان کرتی اور کام کرنے سے روکتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک نقاد کا وجود ادب کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم "نقادِ محض" کے متعلق کچھ اور کہیں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تنقید کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر تنقید نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر تنقیدی تحریر معیاری اور معتبر کہی جا سکتی ہے، جس طرح شاعری یا ادب کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر شاعری یا ادب نہیں کہی جا سکتی۔ شاعری جب اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو محض کلام موزوں ہو کر رہ جاتی ہے یا لفظوں کا کرتب،

افسانہ اور ناول جب اپنے منصب سے گر جاتا ہے تو محض نثر کا ایک بے جان ٹکڑا ہوتا ہے یا پھر پمفلٹ بازی، کوک شاستر اور محض دل لگی کی چیز۔ اسی طرح تنقید جب اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو مدح سرائی، پروپیگنڈہ، نکتہ چینی، تنقیص اور خوردہ گیری ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس طرح شاعروں میں متشاعر اور ادیبوں میں جعلی ادیب ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح نقادوں کی صف میں بھی مفتی و مبلغ اور ادبی بہروپئے مل سکتے ہیں جہاں تک نکتہ چینی، مخالفت اور کسی ادیب کی ادبی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کا سوال ہے وہ ہمیشہ "نقادِ محض" ہی کی جانب سے نہیں ہوتی۔ خود شاعروں، ادیبوں اور تخلیقی فنکاروں میں معاصرانہ چشمکیں رہی ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو فنی اور دبستانی ہوتے ہیں اور کبھی ذاتی۔ اُردو ادب کا ہر طالب علم میرؔ و سوداؔ، انشاؔ و مصحفیؔ، آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ، غالبؔ و ذوقؔ، امیرؔ و داغؔ کے ادبی معرکوں اور ان کی معاصرانہ رقابتوں اور چشمکوں سے واقف ہے۔ ان جھگڑوں میں کس بے چارے نقاد کا ہاتھ تھا؟

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ جو شخص خود ادیب و شاعر نہیں وہ ادب کے مسائل کو کیسے سمجھ سکتا ہے اور کس طرح اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتا ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فنِ لطیف کی طرف وہی شخص مائل ہوتا ہے جو حسِ لطیف رکھتا ہو۔ ابن رشیق کے قول کے مطابق ایسا شخص بھی اپنے اندر تخلیقی جوہر رکھتا ہے۔ ادب کے قاری کے اندر اگر یہ حسِ لطیف اور تخلیقی جوہر نہ ہو تو اس کے لیے ادب بے مصرف چیز ہے۔ یہ حس اور جوہر بھی جامد اور اٹل نہیں بلکہ متحرک اور ترقی پذیر ہے اور اس میں برابر نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ پہلے زمانے میں شاعر کے لیے یہ لازمی شرط تھی کہ وہ پیدائشی موزونیت پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اچھے شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتا رہے اور اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہو، تاکہ اس کی حسِ لطیف اور اس کے اندر کا تخلیقی جوہر جلا پاتے رہیں۔ پرانے اساتذہ کسی شاعر کو اس وقت تک شاگرد بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے جب تک اسے منتخب اور بہترین اشعار خاصی تعداد میں یاد نہ ہوں کیونکہ ان کا خیال تھا جب تک اس کے ذہن کی اس طور پر تربیت نہ ہو اسے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ کلام کا فرق نہیں معلوم ہو سکتا۔ یہ حسِ لطیف اور تخلیقی جوہر ہی وہ مشترک چیز ہے جس کی بنا پر شعر یا ادب پارہ اپنے اندر ایک وسیع اور عالمگیر حلقۂ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاعر خود شعر کہتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا، ناول، افسانہ، ڈرامہ یا ادب کا کوئی اور نمونہ ادیب کے علاوہ دوسرے شخص کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا۔ یہی نہیں بلکہ ایک شاعر کا شعر دوسرے شاعر کے لیے اور ایک ادیب کی تحریر دوسرے ادیب کے لیے بیکار ہوتی۔ جن شاعروں یا ادیبوں نے ہزاروں برس پہلے اپنے تجربات و مشاہدات کو ادبی صورت دی آج کے انسان کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔

ادیب اور نقاد میں اسی قسم کا فرق ہے جس طرح کا فرق شاعر اور نثر نگار میں ہوتا ہے۔ شاعر اور نثر نگار دونوں تخلیقی جوہر رکھتے ہیں لیکن ان کی افتادِ طبع مختلف ہوتی ہے۔ شاعر میں تخیل اور جذبے کا عنصر نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور وہ تخیلی اور ترکیبی ذہن رکھتا ہے۔ نثر نگار میں عقل و استدلال کا عنصر نسبتاً حاوی ہوتا ہے اور اس کا ذہن تعمیری اور تجزیاتی ہوتا ہے۔ دونوں تخلیقی ذہن رکھتے ہیں لیکن افتادِ طبع مختلف ہونے کی وجہ سے اپنے تجربات و احساسات کے اظہار کے لیے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ انھیں عناصر کی کمی بیشی سے خود شاعر اور نثر نگار کی تخلیقات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ شاعر پر جب تخیل اور جذبے کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی تو اس کا کلام موزوں ہونے کے باوجود نثر کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے اور نثر نگار پر جب تخیل اور

جذبے کا غلبہ ہو جاتا ہے اور عقل و استدلال کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے تو اس کی نثر شاعرانہ ہو جاتی ہے۔ پھر شاعر اور نثر نگار بھی تخلیقی جوہر رکھنے کے باوجود چوبیس گھنٹے شاعر اور ادیب نہیں ہوتے۔ تخلیقی جوہر عام طور پر دبا ہوا یا سویا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جب پورے طور پر بیدار یا متحرک ہوتا ہے تو ادب پارہ وجود میں آتا ہے یا کوئی شعر اور نثری تحریر مکمل تخلیق بنتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ شاعر کا ہر شعر یکساں نہیں ہوتا اور نثر نگار کی ہر تحریر اپنے اندر تاثیر نہیں رکھتی۔ کیا سبب ہے کہ بعض شاعر ہمیشہ شعر نہیں کہہ پاتے، ایک خاص منزل پر پہنچ کر ان پر شعر نازل ہونا بند ہو جاتا ہے یا ان کی شاعری انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک ادیب اپنی زندگی میں چند شاہکار لکھنے کے بعد خاموش ہو جاتا ہے یا پھر اس طرح کی تخلیق پر قادر نہیں ہوتا۔

یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ تخلیقی جوہر اور حسِ لطیف شاعر اور نثر نگار دونوں میں مشترک ہے افتادِ طبع کا فرق ان کو مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے، اگر ہم عام نثر نگار اور نقاد کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ دونوں بعض مشترک عناصر رکھتے ہیں اور بعض اعتبار سے دونوں کی شخصیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ عام ادیب یا نثر نگار زندگی کا شعور و احساس رکھتا ہے لیکن اس شعور و احساس کو کسی تخلیقی پیکر میں براہ راست منتقل کرنے کے بجائے ادب پارے اور زندگی کے شعور و احساس میں جو پیچیدہ رشتہ ہے اس کی نوعیت و ماہیت کا ادراک حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ ادراک بھی ایک طرح کا تخلیقی عمل ہے اور اس کے وسیلے سے جو ایک نئی تخلیق وجود میں آتی ہے اس میں لکھنے والے (نقاد) کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اعلیٰ درجے کی تنقید بھی اعلیٰ درجے کی تخلیقی نثر ہوتی ہے اور ہر اچھا تنقید نگار اچھا نثر نگار بھی ہوتا ہے۔

جس طرح شاعر اور ادیب کی ایک شخصیت ہوتی ہے، وہ چند تصورات پر ایمان رکھتا ہے اور اسی اعتبار سے وہ زندگی کے مظاہر سے دلچسپی رکھتا ہے اور اس کے متعلق اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے اسی طرح تنقید نگار بھی اپنی ایک شخصیت اور اپنا ایک زاویۂ نظر رکھتا ہے۔ جس طرح ادیبوں اور شاعروں کی بہت سی قسمیں ہیں اسی طرح نقادوں کی بھی۔ ادیبوں اور شاعروں کے فرقے میں کوئی مذہب و اخلاق کی طرف مائل ہے تو کوئی حسن و محبت کی طرف متوجہ، کوئی رومانی ہے تو کوئی حقیقت پسند، کسی کے یہاں نشاطیہ لے ہے تو کوئی قنوطیت کا اسیر، کسی کو اجتماعیت کا غم ستاتا ہے تو کوئی انفرادیت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کوئی سیاست کو قدرِ اعلیٰ سمجھتا ہے تو کوئی جنس کو۔ غرض شاعری اور ادب میں شخصیتوں کے فرق سے جو رنگا رنگی اور بوقلمونی نقادوں میں بھی ملتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنقید کے بھی بہت سے دبستان ہیں۔ رومانی تنقید، داخلی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، سماجی تنقید، عمرانی تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، فنی تنقید، تاریخی تنقید، تشریحی تنقید، تجزیاتی تنقید جیسی بہت سی اصطلاحیں سننے میں آتی ہیں۔ ہر تنقید کے اپنے حدود ہیں اور اسی اعتبار سے وہ مفید یا غیر مفید ہو سکتی ہے۔ مختلف دبستانوں کے نقاد اپنی تنقید کو جامع و معتبر اور دوسری قسم کی تنقید کو غلط کہتے ہیں۔ ادبی دبستانوں کی طرح تنقیدی دبستانوں میں بھی آویزش و پیکار رہی ہے اسی لیے دورِ حاضر میں بعض لوگوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی اس طرح کی تنقید ہو جو ہر زمانے کے ادب کو اور ہر نوعیت کے ادیب کو پرکھنے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے میں کام آسکے۔ جو ہر طرح جامع، مکمل اور ہمہ گیر ہو۔ جو کسی نوعیت کے ادب کی نہ بے جا طرفداری اور وکالت کرے اور نہ اس کے ساتھ بے انصافی برتے۔ ایسے ادیبوں کا خیال ہے کہ ویسی تنقید صحیح معنوں میں تنقید ہوگی اور اسے ادبی تنقید یا سائنٹفک تنقید کہہ سکیں گے۔ اس خیال کا علمبردار آئی۔ اے۔ رچرڈس ہے۔

رچرڈسن کا کہنا ہے کہ تنقید کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ ادبی قدروں کا تعین کرے۔ مختلف زمانے کے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ کے سب سے پہلے یہ بات طے کی جائے کہ کونسی چیز ادب ہے اور کونسی چیز ادب نہیں ہے؟ یا پھر مختلف اصناف، اسالیب، ہیئتوں اور اظہار کے پیرایوں کی ساخت، ان کی نوعیت اور ان میں تبدیلی و ارتقا کے عمل کو سمجھا جائے اور ان کا اس طرح تجزیہ کیا جائے کہ کچھ واضح اصول مقرر کئے جا سکیں۔ اس نظریے کے مطابق وہ نقاد سے بہت سے مطالبے کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ ادیب بننا نسبتاً سہل ہے لیکن نقاد بننا مشکل۔ اس لیے کہ ادیب ایک خاص موضوع، ایک خاص نظریہ، زندگی کے ایک یا چند تجربات، ایک مخصوص اسلوب، ہیئت یا پیرایۂ اظہار کے حدود میں رہ کر کامیاب ادب کی تخلیق کر سکتا ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ وہ اپنے مواد کو تخلیقی مراحل سے گزار کر ایک مناسب صورت میں منتقل کر دے لیکن نقاد کو ان حدود اور دائروں سے نکل کر ہر طرح کے ادب، ہر طرح کے اسلوب، ہر طرح کے نظریے اور ہر زمانے کی تاریخ، ہر دور کی تہذیب و معاشرت اور اس کی روح کو سمجھنا ہے۔ پھر ادب کے عالمگیر اصولوں کے علاوہ اپنی زبان کے مخصوص مزاج، اس کے اسالیب کی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے عوامل و محرکات کا پتہ لگانے کی ضرورت ہے۔ ان شرائط کو پورا کرنے کے بعد ہی ایک نقاد اخلاقی، نظریاتی یا صنفی اور تکنیکی تعصبات سے بلند ہو کر ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے اور ان پر حکم لگانے کا اہل ہو سکتا ہے۔

اُردو میں اس طرح کی سائنٹفک تنقید کے علمبردار کلیم الدین احمد ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" کا آغاز ان فقروں سے کیا ہے:۔

"اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ——

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے　　کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

(یا)

ہر چند کہ ہم نے چھان مارا　　جغرافیۂ وجود سارا
کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی　　لیکن نہ خبر ملی کمر کی

اس طرح نگاہِ جستجو جغرافیۂ اُردو کی سیر کر کے مایوس واپس آتی ہے لیکن تنقید کے جلوے سے مسرور نہیں ہوتی۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اُردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں تو پھر اُردو تنقید پر کئی سو صفحوں کی کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض زیادہ وزنی نہیں اس لیے کہ کلیم الدین کا خیال ہے کہ تنقید کے نام پر جو کچھ اُردو میں لکھا جا رہا ہے یا اب تک اس کے جو دبستان ہمارے یہاں مروج رہے ہیں وہ محدود معنوں میں ہی تنقید کہے جا سکتے ہیں۔ صحیح یا سائنٹفک تنقید جیسی وہ چاہتے ہیں کچھ اور ہی نوعیت کی ہوگی اور اسی کو ادبی تنقید کہہ سکیں گے۔ اب یہ الگ مسئلہ ہے کہ خود کلیم الدین بھی اس نوع کی تنقید کے اہل ہیں یا نہیں۔ کیونکہ "اُردو شاعری پر ایک نظر" میں اُردو شاعروں کا محاکمہ کرتے ہوئے موصوف نے اُردو زبان کے مزاج، اس کی تاریخی تبدیلیوں اور اُردو شاعری کی اصناف کے عوامل اور محرکات کا کچھ لحاظ نہیں رکھا۔ کہیں کہیں تو ان کے یہاں اس حسِ لطیف کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے جو ہر ادیب و نقاد بلکہ ادب کے ہر قاری کے لیے شرطِ اولین ہے۔

اُردو کے تنقیدی سرمائے کے بارے میں کلیم صاحب نے جو بات کہی ہے اس میں رچرڈس کے ہی خیالات کی بازگشت ہے۔ رچرڈس نے اپنی کتاب "ادبی تنقید کے اصول" کا مقدمہ لکھتے ہوئے ساری دنیا کی تنقید پر یہی رائے دی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

> "کچھ اٹکل پچو باتیں، کچھ پند و نصائح، کچھ بے ربط خیالات، بھڑکیلے اقتباسات،
> شاعرانہ لفاظی اور قیاس آرائی، زیادہ تر مفروضات اور کہیں کہیں سچے خیالات،
> کہیں تشریح و توضیح اور کہیں تبلیغ و اشتہار اور کہیں نکتہ چینی اور حرف گیری بس اسی
> قسم کی کچھ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام تنقید ہے۔"

رچرڈس نے جس معیاری اور مثالی تنقید کا تصور پیش کیا ہے وہ خود انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں محض ایک خوش آئند خواب کی حیثیت رکھتی ہے اور اُردو میں تو اس طرح کے نقادوں کی آمد ابھی بہت دیر کی بات ہے اس لیے کہ اُردو میں رہی سہی جو بھی تنقید تھی وہ اس وقت ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔

۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ہمارے یہاں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ یہ تحریک زبان و ادب میں جو تبدیلیاں اپنے ساتھ لائی اُس نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس دور کے نوجوانوں کی بغاوت بے معنی یا غیر فطری نہ تھی اس کے پیچھے سماجی عوامل اور محرکات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ساری بے اعتدالیوں کے باوجود ہمارے ادب کو بعض اعتبار سے فائدہ پہنچا۔ رومانی اور خیالی ادب کی جگہ ایسے ادب نے لے لی جو انسانی مسائل سے آنکھیں چار کر سکتا تھا، افسانے اور ناول میں مواد اور تکنیک کے اعتبار سے ایک جدید شعور پیدا ہوا اور مغربی ادب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے امکانات سامنے آئے۔ شاعری میں اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے تازگی پیدا ہوئی۔ نفسیات کا علم گہرا ہوا، جنس کے بارے میں ہمارا رویہ تبدیل ہوا۔ غرض کہ اس دور کا ادب اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے ہمارے قدیم ادب سے الگ ہے بلکہ اس جدید ادب سے بھی الگ ہے جو سرسید اور حالی کے دور میں شروع ہوا۔ لیکن نئے ادب کی یہ تحریک جو بعد میں دو گروہوں میں بٹ گئی صالح اور متوازن تنقید سے محروم رہی۔ اس دور میں جو نقاد سامنے آئے انھوں نے ان تحریکوں کے مبلغ، وکیل اور مدافعت کرنے والے کا منصب سنبھال لیا۔ تنقید آہستہ آہستہ ادبی اور تخلیقی خصوصیات کو کھونے لگی اور یہ کاروبار ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا جنھوں نے اسے پیشہ ورانہ حیثیت دے دی۔ اس دور میں دو قسم کی تنقیدوں کو فروغ ہوا۔ ترقی پسند یا مارکسی تنقید اور نفسیاتی یا تکنیکی تنقید۔ ترقی پسند تنقید نے پہلے ماضی کے سارے ادب سے روگردانی کی اور اسے جاگیردارانہ سماج کی یادگار بتایا۔ اسے میر و غالب کی شاعری قنوطی نظر آنے لگی، اقبال اور ٹیگور رجعت پسند اور بیمار ادب کے علمبردار سمجھے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُن شعراء میں انقلابی رجحانات تلاش کئے جانے لگے۔ ان نقادوں میں ادب اور غیر ادب کی پہچان اور اس کے تخلیقی عنصر کی پرکھ کا کوئی سلیقہ نہ تھا اس لیے میر و غالب کے وقیع اور جاندار اشعار کو چھوڑ کر بعض رسمی اور روایتی اشعار کی بنیاد پر ان کے سماجی شعور کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ تخلیقی شعور کے فقدان کی وجہ سے ان نقادوں نے ہم عصر ادب سے بھی موضوعات کی فہرست بنانے کا کام شروع کیا اور اسے ادبی مرتبے کے تعین کے لیے کسوٹی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تنقید نے نااہل ادیبوں اور متشاعروں کو زیادہ اہمیت دے دی اور حقیقی شاعر اور ادیب نظر انداز ہونے لگے۔ صحت مند اور

غیر صحت مند، مریضانہ مداخلت، بے لاگ خارجیت، سماجی شعور، بین الاقوامی شعور، طبقاتی کشمکش اور حقیقت نگاری وغیرہ کی اصطلاحات بھی میکانکی طور پر استعمال کی جانے لگیں۔ ان اصطلاحات سے متعلق یا تو مضامین نہیں لکھے گئے یا جو لکھے گئے وہ بے حد اُلجھے ہوئے تھے اور انھیں نقادوں کے قلم سے جو عملی تنقید یا جائزے سامنے آتے تھے وہ اس اُلجھن میں اور اضافہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند ادب کے نام پر ہنگامی، صحافتی اور ہیجانی افسانوں، نظموں یا منظوم تقریروں کی پیداوار کثرت سے ہونے لگی۔ اپنے دور میں ان تحریروں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی مقبولیت کی بنا پر نقادوں نے بھی دل کھول کر انھیں سراہا لیکن وقت گزرنے پر جب اس طرح کے ادب کا طلسم ٹوٹ گیا تو ادیبوں پر اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ ادب کے میدان کو چھوڑ کر بھاگنے لگے — دوسری طرف نقادوں کو ایسی شرم دامنگیر ہوئی کہ ہم عصر ادب کے مسائل پر لکھنے لکھانے سے انھوں نے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

نفسیاتی اور تکنیکی تنقید اگرچہ اتنی ہنگامہ خیز ثابت نہیں ہوئی اور نہ ہی اسے اس طرح پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس نوعیت کی تنقید نے ابھی تک ہمارے ادب کو مثبت طور پر متاثر نہیں کیا ہے۔ نفسیاتی تنقید کے بیشتر علمبردار بھی ادب سے کم اور نفسیات کے اصولوں سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فرائڈ، اڈلر اور ژونگ کے دیے ہوئے فارمولے تو ضرور سیکھ لیے لیکن یہ ہر کس و ناکس پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جدید افسانہ اور جدید نظم میں سے ایسی چیزوں کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کرنا جو تخلیقی ادب کا وقیع یا قابل قدر نمونہ نہیں ہیں۔ اور ان کو پیش نظر رکھ کر خواہ مخواہ فنکار کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے کی کوشش ایک طرح سے تضیع اوقات بن کر رہ جاتی ہے۔ ویسے اس تنقید کے بعض اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے مواد اور ہیئت کے تخلیقی تعلق کو دیکھنے کے بجائے ہیئت کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر آزاد نظم یا ایسی تجرباتی نظم زیادہ قابل توجہ قرار پائی جو کسی تجربے، احساس یا تخلیقی عمل سے وجود میں نہیں آئی بلکہ محض ظاہری سانچے کی پابند ہے۔ فرانسیسی، انگریزی یا امریکی شاعروں کی نظموں کا اُردو کے بعض ایسے شاعروں نے بھی چربہ اُڑانے کی کوشش کی جن میں بنیادی شعریت کا فقدان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظم اور آزاد شاعری کو برگ و بار لانے کا پورے طور پر موقع نہ مل سکا اور متشاعروں کی نظموں نے اس کی طرف سے پڑھنے والوں میں ایک تعصب پیدا کر دیا ہے۔

جدید اُردو ادب میں جو افراط و تفریط پیدا ہوئی اس کا سبب ہمارے یہاں کی تنقیدوں کا یک رُخا پن ہے۔ جدید تنقید کے سرمایے میں بعض اچھے مضامین مل جاتے ہیں لیکن یہ دور متوازن اور ہمہ گیر شخصیت رکھنے والے نقادوں سے خالی رہا۔ اگر ایسی شخصیتیں ہمارے درمیان موجود تھیں تو انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورے طور پر کام نہ لیا۔ پرانے نقاد نئے ادبی تقاضوں کو نہ سمجھ سکے اس لیے یا تو وہ نئے ادب کی مخالفت کرتے رہے یا خاموش رہے۔ ان میں سے بعض نئی اصناف اور ہیئتوں کا شعور نہیں رکھتے تھے اور اس معاملے میں اتنے قدامت پسند تھے کہ ہر نئی چیز کو مغرب زدگی سے تعبیر کرتے تھے، بعض جنس یا سیاست کو ادب کے لیے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے۔ غرض ان کی اپنی کمزوریاں اور ان کے اپنے حدود تھے اور وہ نئے ادب سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں لیکن وہ نئے نقاد بھی ہمیں کچھ زیادہ نہ دے سکے جو اس کام کے اہل تھے۔ ان حضرات نے اپنے مختصر تنقیدی مضامین میں جدید ادبی و تنقیدی اصطلاحات اور تصورات پر اشاروں کنایوں میں گفتگو کی یا پھر ہمعصر ادیبوں کی تصانیف پر دیباچے

اور پیش لفظ لکھ لکھ کر ان کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ اس طریقِ کار نے انھیں بھرپور تنقیدی کارنامے پیش کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ نئے ادب کے منفی عناصر غالب آتے گئے اور ان حضرات کی تنقیدیں اور بھی سمٹتی چلی گئیں اور اب یہ لوگ ہمارے لیے تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ سال دو سال میں کوئی مختصر تحریر اُن کے قلم سے نکل جائے تو اسے دعائیہ اور کلمۂ خیر سمجھیے۔ اس لیے کہ اس میں بڑی بصیرت افروز باتیں ہوتی ہیں جن سے ان حضرات کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن بقول مظفر علی سید "یہ حضرات سب کچھ پڑھتے ہیں سوائے آج کے اُردو ادب کے"

اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت تنقید کے نام سے بازار میں ایسی چیزیں آرہی ہیں جو مدرسانہ یا مکتبی قسم کی ہیں۔ امدادی کتب تیار کرنے والوں یا امتحان پاس کرنے والے طالب علموں کے لیے مضامین لکھنے والوں کو بھی اب تنقید نگار کہا جانے لگا ہے۔ یہ حالت اس لیے اور بھی تشویشناک معلوم ہوتی ہے کہ ادبی رسائل بھی اس قسم کی تنقیدوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان مضامین سے کلاس نوٹس کی بُو آتی ہے۔ یہ پچھلی تنقیدوں کو ہی الٹ پلٹ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ہم عصر ادب پر قلم اٹھاتے ہیں تو فہرست سازی، کھتونی اور مردم شماری یا اقتباسات نقل کرنے سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہی سبب ہے کہ اس طرح کی تنقیدیں اچھی نثر کا نمونہ بھی نہیں ہوتیں۔ ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ آج انھیں ادیبوں کے زمرے میں شمار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بعض رسالوں میں ادبی مسائل پر بحثیں چلتی ہیں جو بہت جلد ذاتی ہو جاتی ہیں اور تو تو میں میں کے اندر تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ اسی طرح کے مضامین کو اب تنقید سمجھنے لگے ہیں۔

غرض کہ اُردو میں اس وقت نقاد کا لفظ ہنسنے ہنسانے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ نئے ادیبوں میں سے بعض کبھی کبھی تنقیدی مضمون لکھتے ہیں اور ان میں بڑی توانائی ہوتی ہے لیکن موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسے ادیب بھی اپنے آپ کو نقاد کہلوانا پسند نہیں کرتے اور نہ تنقید کو اپنے ادبی مشاغل میں کوئی مستقل جگہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ کبھی کبھی کوئی اچھی کتاب یا ترشا ترشایا مضمون نظر آجاتا ہے تو آس بندھتی ہے کہ شاید اب صالح تنقید اُردو میں پیدا ہو رہی ہے لیکن اس سے قبل کہ لکھنے والا آج کے ادبی مسائل پر توجہ کرے طومار نویسوں کے لگائے ہوئے انبار میں وہ کتاب، وہ مضمون اور وہ نام گم ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور شاعر اور ادیب نئے مسائل اور آج کی پیچیدگیوں کو اپنے طور پر سمجھنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت اسے نہ نقاد کی رہبری حاصل ہے اور نہ اس کی رفاقت۔

اُردو کی زبان کا آغاز

سہیل بخاری

اس خیال سے کہ شاید بعض اصحاب کو عنوانِ مقالہ کی ترکیب ہی نامانوس نظر آئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ "اردو کی زبان" سے ہماری وہی قومی زبان مراد ہے جسے ہم آج اُردو یا اُردو زبان یا زبانِ اُردو کہتے ہیں اور زبانِ اُردو فارسی کا مرکبِ اضافی ہے جس کا ترجمہ ہماری بول چال کے مطابق اُردو کی زبان ہی ہو سکتا ہے۔ خود میر امّن دہلوی نے اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچے میں کئی جگہ یہی ترجمہ کیا ہے مثلاً "حقیقت اُردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے" یا "تب زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔"

اُردو یا اُردوئے معلّی کے متعلق اب تک مختلف کتبِ تاریخ کے حوالوں سے بہت کچھ کہا جا چکا ہے کہ ان الفاظ سے شاہی فرودگاہ یا چھاؤنی مراد ہوتی ہے جیسا کہ میر امّن "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھتے ہیں "آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔" ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عہدِ شاہجہانی میں اُردو یا اُردوئے معلّی دہلی کے ایک مخصوص علاقے کو کہتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر میر امّن لکھتے ہیں "تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلّی خطاب دیا۔" سراج الدین علی خاں آرزو دہلی کے اسی علاقے میں بود و باش رکھتے تھے جیسا کہ وہ خود نوادر الالفاظ (مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۱ء) کے صفحہ ۲۱۴ پر رقم طراز ہیں "لیکن چنیں معلوم نیست کہ لغت کجاست ما مردم کہ از اہلِ ہندیم و در اُردوئے معلّی باشیم نشنیدہ ایم۔"

اس لحاظ سے ہماری زبان وہ ہے جو دہلی کے ایک مخصوص علاقے میں بولی جاتی تھی جس میں آرزو جیسے جگت اُستاد اور دوسرے ادیب و شاعر بستے تھے۔ حکیم احمد علی یکتاؔ نے اپنی کتاب دستور الفصاحت اور انشاؔ نے دریائے لطافت میں صاف لکھ دیا ہے کہ یہ زبان دہلی میں عام طور پر رائج نہیں تھی بلکہ مخصوص محلوں اور گھرانوں میں بولی جاتی تھی چنانچہ ان شواہد سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ شاہجہانی میں دہلی کا ایک خاص علاقہ اُردو یا اُردوئے معلّی کہلاتا تھا جس میں عام زبانِ دہلوی سے مختلف ایک اور زبان رائج تھی جسے عام زبان سے متمیز کرنے کے لیے زبانِ اُردو یا زبانِ اُردوئے معلّی کہنے لگے اور

اسی فارسی ترکیب کا ترجمہ زیب عنوان مقالہ کیا گیا ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات اور بھی کہتا چلوں۔ ڈاکٹر مسعود حسن خان نے اپنی کتاب "تاریخ زبان اردو" میں ریہل کھنڈ کی زبان کو معیاری قرار دیا ہے۔ مجھے اس وقت اس نظریئے پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مدِ نظر ہے کہ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل سراج الدین علی خان آرزو (متوفی سنہ ۱۱۶۹ھ) جنہیں شعرائے متقدمین میں نمایاں مقام حاصل ہے اپنی کتاب نوادر الالفاظ میں ٹکسالی اردو کے متعلق اپنا قطعی فیصلہ سناتے ہیں۔ وہ لفظ گانڈر کے سلسلے میں لکھتے ہیں "آنچہ زبان زدِ مردم گوالیار و اکبر آباد کہ افصح السنہ ہندا ست کہ ہے باشد" ڈاکٹر سید عبداللہ بھی نوادر الالفاظ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں "خان آرزو کے زمانے کی فصیح زبان اور بعد کی ٹکسالی زبان کا فرق اگر دیکھنا منظور ہو تو نوادر الالفاظ کے ان الفاظ کی فہرست بنا لیجئے جو فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں نہیں ملتے۔ آرزو کے زمانے میں اور ان کے بعد زبان کی اصلاح اور حذف و ترک کا جو سلسلہ شروع ہوا اور کم و بیش آج تک جاری ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوادر کے بیسیوں الفاظ جنہیں آرزو نے فصیح قرار دیا تھا زبان کے ذخیرے سے نکل گئے ہیں"۔

معیاری زبان میں اس انقلاب کے آنے کی وجہ یہ ہے کہ سیاست کا مرکز آگرے سے اول دہلی کو اور بعد ازاں لکھنؤ کو منتقل ہو گیا تھا چنانچہ آگے چل کر دہلی و لکھنؤ کی سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر لوگ زبان کی سند بھی وہیں سے لینے لگے اور یہ بھول گئے کہ ٹکسالی اردو صرف اکبر آباد کی ہے جس کے اجڑنے پر ہی دہلی کا اردوئے معلی آباد ہوا تھا۔ منشی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگِ آصفیہ نے اپنے ایک مضمون "زبان کی تمیز اور اس کا فرق" میں اسی رجحان کی ترجمانی کی ہے کہ "جو شہر کسی بادشاہ کا مدت تک دار الحکومت رہا ہوگا اس کی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کی جائے گی اور ہر ایک مصنف یا شاعر یا فصیح اس شہر کی زبان کو قابلِ سند اور تقلید سمجھ کر وہاں کے باشندوں کی پیروی کریگا اور جو وہ شہر کسی نواب یا وزیر یا رئیس یا جاگیردار کی گدی ہوگی اس کا چنداں اعتبار نہیں کیا جائے گا گو وہ شہر کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے"۔ چنانچہ ایسے ہی خیالات نے استنادِ زبانِ اردو کے متعلق لوگوں کی توجہ آگرے سے ہٹا کر اول دہلی اور پھر لکھنؤ کی طرف منعطف کرائی ہے۔ آج اکبر آباد اور دہلی و لکھنؤ کی زبان میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ دہلوی اردو میں رفتہ رفتہ ہریانی اور لکھنوی اردو میں آہستہ آہستہ اودھی کے اثرات نفوذ پاتے چلے گئے لیکن اکبر آبادی اردو میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اپنی جگہ بالکل اسی طرح بولی جا رہی ہے جس طرح آرزو کے زمانے میں بولی جاتی تھی چنانچہ نوادر الالفاظ کے کثیر التعداد الفاظ جو زبان کے ذخیرے سے نکل گئے اور فرہنگِ آصفیہ میں نہیں ملتے آج بھی اکبر آبادی اردو میں بے تکان بولے سمجھے جاتے ہیں۔

بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اسی زبان کے آغاز کی طرف آتا ہوں جسے عام طور پر عہدِ شاہجہانی کی پیداوار بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ شاہجہان سنہ ۱۶۴۷ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا ہے اس لیے اردو یا اردوئے معلی کا سنگِ بنیاد اسی سن میں رکھا گیا ہوگا چنانچہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری زبان عہدِ شاہجہانی کی اسی بھاؤنی میں پیدا ہوئی ہے ان کے خیال کے مطابق بھی اس کی داغ بیل سنہ ۱۶۴۷ء سے قبل نہیں پڑ سکتی تھی لیکن سترھویں صدی عیسوی کے

اواخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہمیں اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد نظر آنے لگتی ہے بلکہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تو عہدِ شاہجہانی ہی کے چندر بھان برہمن کی غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے" کو اُردو کی پہلی غزل کہتے ہیں چنانچہ جب اس مفروضے کو اس حقیقت کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہ خیال جو زبان کی پیدائش سے ادب کی شروعات تک کے زمانے کو یوں چشم زدن میں طے کرا دیتا ہے حد درجہ مضحکہ انگیز نظر آنے لگتا ہے کیونکہ زبان کبھی اس تیزی سے نہیں بنتی جس تیزی سے ٹکسال میں سکّے ڈھالے جاتے ہیں۔

اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق آج تک جتنے نظریے دیسی اور بدیسی محققین نے پیش کئے ہیں (اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے)، ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ ہماری زبان ان غیر ملکیوں کی بدولت پیدا ہوئی ہے جنھوں نے تاریخ کے کسی نہ کسی عہد میں سرزمینِ ہند کو اپنے ورود سے نوازا ہے یعنی یہاں پہنچنے پر جب ان کا سابقہ مقامی باشندوں سے پڑا تو ان کی آبائی زبان نے یہاں کی مقامی بولیوں سے مل کر ایک تیسری زبان کو جنم دیا جسے ہم آج اُردو کہتے ہیں اور یا پھر تنہا انھیں کی زبان سے یہ زبان از خود یوں پیدا ہو گئی جیسے عام قانونِ قدرت کے مطابق ایک نسل سے دوسری نسل جنم لیتی رہتی ہے۔

ان تمام نظریات کو آسانی کے ساتھ تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سامی، مسلم آریائی اور آریائی۔ چونکہ ہند جنوبی سے عرب سوداگروں کے تجارتی تعلقات قبل ظہورِ اسلام ہی سے استوار ہو چکے تھے اور اس علاقے میں ان کی آمد و رفت عرصہ دراز تک قائم رہی لہٰذا سامی نظریے کی رو سے عربی اور دکن کی مقامی بولی کی آمیزش سے جو زبان پیدا ہوئی اسے اُردو کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مدعی مولانا نصیر الدین ہاشمی ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا دوسرا نظریہ مولانا سلیمان ندوی کا ہے کہ محمد بن قاسم اور اس کے ہمراہیوں نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا تھا لہٰذا ان کا خیال ہے کہ ان لوگوں کی عربی نے سندھ کی مقامی بولی سے مل کر اُردو کی داغ بیل ڈالی۔ مسلم آریائی درجے میں صرف حافظ محمود شیرانی کا نظریہ شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے باعث ایرانی مسلمان پہلے پہل پنجاب میں آباد ہوئے جہاں ان کی مادری زبان فارسی اور پنجاب کی مقامی زبان کے میل ملاپ سے اُردو زبان وجود میں آئی۔ ان تینوں محققین میں سے مولانا سلیمان ندوی تو اُردوئے قدیم کا کوئی نمونہ ہی پیش نہیں کرتے البتہ مولانا ہاشمی اور حافظ شیرانی دونوں کے دونوں دکنی ادب کو اردوئے قدیم بتاتے ہیں اور ایک نمونے سے دو نظریے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

دراصل مندرجہ بالا سامی اور مسلم آریائی دونوں نظریات ایک ہی نقطۂ نظر کی پیداوار ہیں جس کے مطابق اُردو کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے کے لگ بھگ ہوتا ہے لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو زبانوں کے میل سے دنیا میں آج تک کبھی اور کہیں کوئی ایسی زبان پیدا نہیں ہو سکی جو اُردو کی طرح مکمل، منضبط، جامع اور توانا ہو اور اُردو ہی کی طرح لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے والی بھی ہو۔ اس کے باوجود اگر حاکم و محکوم کی کاروباری سہولت کی خاطر ہندوستان کی دیسی اور مسلمانوں کی بدیسی بولیوں کے میل ملاپ سے مغربی ہندوستان میں کسی تیسری زبان کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہی ہو گیا تھا تو پھر جب مسلمان ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں بھی بطور فاتح پہنچے تھے وہاں اُردو جیسی ہی کوئی اور زبان کیوں پیدا نہیں ہوئی حالانکہ حاکم و محکوم کے تعلقات وہاں بھی قائم ہوئے تھے اور ان کی زبانوں میں بھی اسی قدر اختلاف ملتا تھا۔

ان نظریات کی حمایت میں جس دکنی ادب کو اردوئے قدیم کا نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے متعلق بھی چند معروضات ضروری ہیں۔

(۱) دکن میں مسلمانوں کی آمد کو آٹھویں صدی عیسوی کے بعد تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور دکنی ادب کو پندرھویں صدی عیسوی سے قبل نہیں لے جا سکتے۔ یوں دونوں تاریخوں کے درمیان چھ سو سال کی طویل مدت بالکل خالی گزر جاتی ہے جس کا کوئی لسانی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں دکن کے مسلم تاجروں اور درویشوں وغیرہ کی آمد اور دکنی ادب کے آغاز میں براہ راست کوئی منطقی یا تاریخی تعلق قائم نہیں ہوتا اور اسی لیے اس ادب کو ان کے لسانی اثرات کا نتیجہ بھی نہیں مانا جا سکتا۔

(۲) جیسا کہ حافظ محمود شیرانی کا اصرار ہے تاریخی شواہد سے یہ تو ثابت ہے کہ سلاطین دہلی کی فتوحات کے ساتھ ساتھ لسانی لہریں دکن کی طرف جاتی رہی ہیں اور لسانی تجزیہ بھی یہ بتاتا ہے کہ دکنی ادب میں ہند شمالی کی پنجابی اور ہریانی کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لیے دکنی ادب پنجابی اور ہریانی سے بہت قریب ہے لیکن پنجابی اور ہریانی کے ساتھ ساتھ دکنی ادب بھی اردو سے بنیادی طور پر اتنا ہی مختلف ہے جتنی مختلف کوئی دو آزاد زبانیں ہو سکتی ہیں (دیکھیے میرا مقالہ "اردو کے قدیم" مطبوعہ "نقوش" لاہور بابت ماہ اکتوبر ۶۲ء) اور جبکہ لسانی تجزیے کی رو سے دکنی ادب کو اردوئے قدیم ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا تو اس کی بنیاد پر آغاز اردو کا جو نظریہ بھی تعمیر کیا جائیگا درست نہیں ہوگا۔

(۳) ہندوستان کی دو معاصر زبانوں میں اتنا اختلاف نہیں ملتا جتنا چینی اور عربی یا یونانی اور منڈ ویشی میں۔ ایسی صورت میں اگر ان کے اشتقاق کی بنیاد صرف ان کی مشابہت پر ہی رکھی جائیگی تو کوئی سی بھی دو ہمسایہ زبانوں کو بڑی آسانی سے ماں بیٹی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن لسانیات میں دو زبانوں کے بنیادی اختلافات بھی ان کی مشابہت سے کچھ کم اہم نہیں ہوتے اس لیے بعض محققین کا محض جزوی مشابہت کی بنا پر دو زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ قائم کر دینا درست نہیں ہے۔

(۴) اردو کی معاصر زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس قدر بنیادی اور طوفانی انقلاب کا ثبوت نہیں ملتا جو اسے قدیم و جدید کے ایسے ہی دو حصوں میں تقسیم کر دے جیسے دو حصے اردو والے اردو زبان کے ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لیے قدیم اردو اور جدید اردو کی یہ مفروضہ تقسیم قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

(۵) دکنی ادب کو اس لیے بھی اردوئے قدیم نہیں مانا جا سکتا کہ اس کے عہد سے بہت پہلے مرہٹہ دیس کے شاعروں ـــــ نام دیو اور گیانیشور (معاصر حضرت امیر خسرو) کے یہاں اسی اردو کے نمونے ملتے ہیں جو آج بولی جا رہی ہے جبکہ دکنی ادب آج اردو کے بڑے بڑے عالموں کی سمجھ میں بھی پوری طرح نہیں آتا۔ اس کے علاوہ آج کی اردو کے جلوے عہد اکبری کے شاعروں اور نثر نگاروں کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ دیوناگری لپی میں قلم بند ہونے کے باعث یہ نمونے عام اردو داں طبقے کی نگاہوں سے ابھی تک اوجھل رہے ہیں لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ آج کی اردو کا سراغ دکنی ادب سے بھی بہت پہلے مل جاتا ہے۔

ان حضرات کے علاوہ جن کے نظریات کا اوپر ذکر کیا گیا محققین کی ایک بہت بڑی جماعت اردو کے آغاز کو ظہورِ اسلام سے بہت پہلے ورودِ آریہ کے وقت تک لے جاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اردو ایک آریائی زبان ہے جو ہندوستان کی ایک قدیم زبان پراکرت سے نکلی ہے اور پراکرت یا تو سنسکرت سے ابھری ہے یا اس کی کسی ایسی معاصر بولی سے مشتق ہوئی ہے جو سنسکرت کی ہی طرح خالص آریائی تھی کیونکہ آریہ ہندوستان میں بدفعات آئے تھے اور مختلف بولیاں بولتے ہوئے داخل ہوئے تھے جو سب کی سب قدیم ایرانی زبان کی بیٹیاں تھیں۔ یہ خالص آریائی نظریہ ہے۔

اس خیال کی ابتدا تیسری صدی عیسوی سے ہوئی جبکہ وررو چی نے پراکرت زبان کی پہلی گرامر "پراکرت پرکاش" لکھی اور ایک آزاد زبان کے قواعد لکھنے کے بجائے ایسے اصول وضع کیے جن کی مدد سے ریاضی کی سی قطعیت کے ساتھ سنسکرت کے حروف بدل بدل کر پراکرت کے الفاظ ڈھالے جا سکیں۔ اس کے مقلدین میں چنڈ، ہیم چندر، سنگھ راجا، مارکنڈے اور لکشمی دھر کے نام نمایاں ہیں اور زمانۂ حال کے محققین کا سربراہ انیسویں صدی عیسوی کا مستشرق جان بیمز ہے جس کے ہم خیالوں میں گریرسن، پلیٹس، کیلاگ اور سنیتی کمار چٹرجی وغیرہ بہت سوں کے نام آتے ہیں۔

دوسری طرف مستشرقین آریوں کی قدیم زبان سنسکرت کو قدیم ہند یورپی کی ایک شاخ بتاتے ہیں اور قدیم ہند یورپی زبان سنسکرت کی طرح ایرانی کی بھی ماں ہے لیکن ان لوگوں سے بھی بہت پہلے سراج الدین علی خاں آرزو نے نوادر الالفاظ میں جابجا یہ اشارہ کیا ہے کہ سنسکرت اور فارسی اصلاً ایک ہیں اور اسے "توافق لسانین" کا نام دیا ہے اور آرزو ہی کی صدائے بازگشت ماضی قریب میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب سخندانِ پارس میں بھی سنائی دیتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جس طرح ایک زمانے میں اردو کو فارسی کی بیٹی سمجھا اور کہا جاتا تھا اسی طرح آج اسے سنسکرت کی گود میں ڈال دیا گیا ہے لیکن اس آریائی نظریے کی تردید میں بھی چند معروضات قابلِ غور ہیں۔

(۱) برصغیر پاک و ہند کی موجودہ معاصر زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر واضح اور بنیادی اختلافات رکھتی ہیں کہ انھیں کسی ایک ماخذ سے مشتق نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں تنہا سنسکرت کو ان سب کا واحد مشترک سرچشمہ ماننا درست نہیں ہے۔

(۲) اگر تمام موجودہ زبانیں آریائی ہیں تو ایرانی سے انھیں مکمل طور پر مشابہ ہونا چاہیے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی اور قدیم ایرانی زبان میں بہت سے بنیادی اختلافات ملتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

(ا) ہندوستانی میں قدیم ایرانی کی مندرجہ ذیل آوازیں نہیں ملتیں۔

مفرد: خ، ز، ژ، حلقی ش، فمی ش، غ، ف، و، ہ، ی، رری -

مرکب: خو یا ہو، زن، خش، تر، در، ست، سپ، شک، فش وغیرہ

(ب) قدیم ایرانی میں مندرجہ ذیل ہندوستانی آوازیں نہیں ملتیں۔

ں، ٹ، ڈ، ڑ، ن -
مہاپران - کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، ڑھ، تھ، دھ، رھ، لھ، مھ، نھ، پھ، بھ -

(ج) ہندوستانی تشدید قدیم ایرانی زبان کے لیے بالکل غیر ہے

(د) قدیم ایرانی میں صرف خارجی سندھی پائی جاتی ہے یعنی دو الفاظ کے ملنے پر آخری اور پہلے صرف علت کا ادغام ہو جاتا ہے لیکن ہندوستانی میں داخلی سندھی کا بھی چلن ہے -

(ہ) قدیم ایرانی الفاظ میں دو حروف علت یکے بعد دیگرے نہیں آسکتے تھے لیکن ہندوستانی الفاظ میں مسلسل پانچ پانچ حروف علت تک مل جاتے ہیں بلکہ بعض بعض الفاظ میں تو حروف علت کے سوا حرف صحیح آنا بھی نہیں ہے -

(و) قدیم ایرانی میں اس کے نام نہاد مہاپران (خ، غ، ف) نہ ایک رکن کے دونوں جانب آسکتے تھے نہ ایک لفظ کے آخر اور دوسرے لفظ کی ابتدا میں جمع ہو سکتے تھے لیکن ہندوستانی میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے -

(ز) ایک ہندوستانی لفظ میں زیادہ سے زیادہ تین رکن ہوتے ہیں اس لیے سندھی کی صورت میں حروف علت کو مختصر کر کے ارکان کی تعداد گھٹا دی جاتی ہے لیکن قدیم ایرانی میں یہ قید نہیں تھی -

(ح) قدیم ایرانی میں تین عدد واحد، تثنیہ اور جمع پائے جاتے تھے لیکن ہندوستانی تثنیہ سے بالکل خالی ہے جس میں عہد قدیم سے آج تک کبھی اور کہیں تثنیہ کا سراغ نہیں ملتا -

(ط) قدیم ایرانی میں اسما کی دو تصریفیں ہوتی تھیں اور ہندوستانی میں صرف ایک ہوتی ہے -

(ی) قدیم ایرانی میں صفت کے تین درجے (تفضیل نفسی، تفضیل بعض اور تفضیل کل) ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں صفت کے درجے کا تصور ہی نہیں ہے -

(ک) قدیم ایرانی افعال میں دو پد (سنسکرت کے آتمنے پد اور پرسمے پد) ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے -

(ل) قدیم ایرانی فعل میں پانچ زمانے ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں صرف تین زمانے ہوتے ہیں -

(م) قدیم ایرانی میں فعل کی بہت سی گردانیں رائج تھیں لیکن ہندوستانی میں صرف ایک ہی گردان ہوتی ہے -

(ن) ان تمام باتوں کے علاوہ قدیم ایرانی اور ہندوستانی کے ضمائر، عوامل، اسما، افعال، سوابق اور لواحق وغیرہ قطعی جدا جدا ہیں -

ان بنیادی اختلافات کی موجودگی میں ہند و پاک کی موجودہ زبانوں کو آریائی تسلیم نہیں کیا جا سکتا -

(۳) پراکرت کے گرامر نویسوں نے اپنے ہر اصول میں مستثنیات دیئے ہیں یعنی انھوں نے ایک اصول کی رو سے چند سنسکرت الفاظ کو پراکرت میں ڈھال دیا لیکن ان کے ساتھ ہی پراکرت کے کچھ ایسے الفاظ بھی لکھ دیئے جن پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا - اب اگر ان کے عقیدے کے مطابق تمام پراکرتیں سنسکرت سے ہی ڈھالی گئی ہیں تو یہ مستثنیات کیونکہ

اور کہاں سے آ گئے ؟

(۴) پراکرت کے تمام گرامر نویس لفظ کی تین قسمیں بتلاتے ہیں۔ تت سم، تدبھو اور دیسی۔ ان میں تت سم وہ الفاظ ہیں جو صرف سنسکرت میں بولے جاتے ہیں۔ تدبھو وہ الفاظ ہیں جو سنسکرت کے تت سم الفاظ سے بگڑ کر بنے ہیں اور کتابی پراکرت میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ پراکرت میں دیسی الفاظ بھی ملتے ہیں جو سنسکرت کے لیے قطعی غیر ہیں۔ چنانچہ یہ گرامر نویس اپنی اپنی کتابوں میں جا بجا دیسی الفاظ کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ ہیم چندر اور دھن پال نے "دیسی نام مالا" اور "پائیا لچھی" کے نام سے دیسی الفاظ کی دو مستقل فرہنگیں بھی تحریر کر دی ہیں۔ اب آریائی نظریے کے حامیوں کے ذمے اس سوال کا جواب باقی ہے کہ اگر پراکرتیں سنسکرت سے ہی پیدا ہوئی ہیں تو یہ الفاظ جو سنسکرت کے لیے غیر ہیں پراکرت زبانوں میں کہاں سے آ گئے ؟

(۵) تمام محققین متفق ہیں کہ ویدک زبان سے ہی سنسکرت زبان تراشی گئی ہے اور سنسکرت میں ویدک اسما پر بہت کچھ اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اسما ویدک کے مادوں سے نہیں بنے ہیں۔ میں تمام محققین سے پوچھتا ہوں کہ اگر ہند شمالی میں کوئی دیسی یعنی دراوڑی زبان باقی نہیں رہی تھی تو پھر سنسکرت اسما کی یہ بڑھی ہوئی تعداد کن زبانوں سے مستعار لی گئی ہے ؟

(۶) زبان کی فطرت یہ ہے کہ جب تک اس کے بولنے والوں میں دو نفر بھی بچ رہیں گے وہ اس علاقے سے کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے مان لیا جائے کہ آریوں کی آمد پر ہند شمالی میں جو دراوڑی زبانیں بولی جا رہی تھیں وہ بالکل فنا ہو گئیں اور ان کی جگہ صرف ایک ویدک زبان (سنسکرت کی قدیم شکل) ملک کے طول و عرض میں رائج ہو گئی کیونکہ نہ عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ فاتحین مفتوحین کو بالکل نیست و نابود کر دیتے ہیں اور نہ تاریخ ہند سے ہی ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ آریوں نے ہند کے قدیم باسیوں کو تہ تیغ کر کے ہند شمالی کو ان سے بالکل پاک کر دیا تھا۔

(۷) اگر قدیم ایرانی اور ویدک (ویدوں کی زبان) اصلاً ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے کے قالب میں مکمل طور پر ڈھل جانا چاہیے لیکن جب تک رگ وید کے کسی پورے بھجن کو کاملاً اوستا کی زبان میں منتقل نہیں کیا جاتا دونوں زبانوں کی جزوی مشابہت پر محققین کا یہ دعوے کہ دونوں میں مکمل مماثلت ہے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

(۸) اگر ویدک اور قدیم ایرانی مماثل زبانیں ہیں تو اوستائی گرامر کی مدد سے آج تک رگ وید کی مکمل تشریح کیوں نہیں ہو سکی اور مستشرقین اپنی کوششوں کے باوجود اس کے کافی حصے کو سمجھنے سے قاصر کیوں رہ گئے ؟

مندرجہ بالا اعتراضات اور معروضات کی روشنی میں نہ صرف اردو بلکہ برصغیر پاک و بھارت کی کسی موجودہ زبان کو بھی آریائی تسلیم نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس صورت میں کہ خود رگ وید میں فارسی الفاظ کے پہلو بہ پہلو مختلف ہندوستانی زبانوں کے ہزاروں الفاظ موجود ہیں ہم ویدک کال میں اردو کا وجود تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ اس مقام پر آریائی نظریے کے مدعی یہ کہہ سکتے ہیں کہ رگ وید میں اردو الفاظ کی موجودگی سے اردو کا ویدک زبان سے اشتقاق ثابت ہوتا ہے لیکن میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا

کہ آمعدادر سابرانی زبان کے بنیادی (صوتی، صرفی اور نحوی) اختلافات کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا رگ وید میں ان زبانوں کی مخصوص آوازوں کو چھوڑ کر جن کے لیے خاص اصول برتے گئے ہیں، تمام مشترک آوازوں کو قلم بند کرنے کے لیے یکساں اصول کام میں لائے گئے ہیں چنانچہ ایک طرف رگ وید میں اگر اردو الفاظ کا وجود اس کو ویدک زبان سے مشتق ثابت کرنے کے لیے کافی سمجھا جا سکتا ہے تو دوسری طرف اسی اصول کی روشنی میں ویدک سے ایرانی زبان کا اشتقاق بھی لازم آتا ہے اور یہ بات تاریخی و لسانی دونوں اعتبار سے نہایت مضحکہ انگیز ہوگی اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ اردو اپنی معاصر زبانوں کی طرح آریوں کی آمد سے قبل بھی ہندوستان میں رائج تھی یہی وجہ ہے کہ ایرانی الفاظ کے ساتھ ساتھ جہاں دوسری رائج الوقت دیسی زبانوں کے الفاظ حروف بدل بدل کر رگ وید کے بھجنوں میں داخل کئے گئے وہاں اردو الفاظ کو بھی ان میں بار مل گیا۔

رگ وید ایک ایسی کتاب ہے جس کی تشریح کی کوششیں ہزاروں سال سے ہوتی چلی آ رہی ہیں لیکن آج تک اس کی مکمل اور صحیح تشریح نہیں ہو پائی ہے۔ اس سلسلے میں دیسی شارح یاسک منی (تقریباً ۵۰۰ ق م) کا نام سرفہرست آتا ہے جس نے رگ وید کے چند اجزا کی شرح لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یاسک ہی رگ وید کا پہلا شارح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی شرح سے چند دوسرے شارحین کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں جو اس سے پیشتر گزر چکے ہیں لیکن ان کی تشریحات زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں البتہ ان کے متعلق تھوڑی بہت معلومات ہم کو یاسک کی شرح ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں سے کونس نامی ایک شارح نے تو رگ وید کو بالکل ہی مہمل قرار دے دیا ہے اور مہملات رگ وید کی مثال میں چند الفاظ بھی لکھے ہیں جیسے اُمیک، یادوگمن، جاریائی، کانُکا، وغیرہ۔ یاسک نے اپنی شرح میں رگ وید کے اہمال سے تو انکار کیا ہے البتہ ایسا ایک لفظ کے اشتقاق میں کتنی ہی متبادل تجویزیں پیش کرنے کے بعد اسے بھی کچھ الفاظ کا مطلب سمجھنے میں اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا اور کونس کے مہملات کی فہرست میں چند اور الفاظ مثلاً دَروی ہُومی، دَرَنتی، دَمونا، جاشیہ، آٹنار، جاگرہ دک وغیرہ کا اضافہ کرتے ہی بنا۔ نارسائی اور کم فہمی کا یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک برابر جاری ہے جو دیسی اور بدیسی شارحین کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

تشریح رگ وید میں ان دقتوں اور دشواریوں کے دو خاص اسباب ہیں۔ اول یہ کہ اس ایک کتاب میں دو سو سے اوپر شاعروں کے بھجن شامل ہیں اور یہ شعرا ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے بسنے والے تھے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایک ہی خاندان کی تین تین پشتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان و زمان کے اس تفاوت کے ساتھ انھوں نے اپنے بھجنوں میں ایرانی زبان کے علاوہ اپنے اپنے علاقوں کی رائج الوقت زبانیں بھی استعمال کی ہیں اور یوں رگ وید میں اتنی زبانوں کے نمونے جمع ہو گئے ہیں کہ اس کا مکمل طور پر سمجھ لینا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین جگہ جگہ اٹکتے اور قدم قدم پر لڑکھڑاتے ہیں اور آخر میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم فلاں لفظ، فلاں مرکب، فلاں پد اور فلاں سوکت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

دیسی شارحین ویدک زبان کو دیو بانی ماننے کے باعث کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکے کہ اس پاک اور مقدس زبان میں آریوں کی آبائی زبان قدیم ایرانی کے ساتھ ساتھ ان شودروں کی ناپاک اور اپ بھرنشٹ زبانوں کا پٹ بھی شامل ہو سکتا ہے

جن کے کانوں میں اسی رگ وید کے الفاظ سن لینے پر گرم کر کے سیسہ پلا دیا جاتا تھا اور مستشرقین بھی مفروضہ قدیم ہند یورپی زبان سے اپنے فطری تعلق خاطر کی بنا پر رگ وید کے وہی جزو پہ اس لیے اچھی طرح دھیان نہیں دے سکے کہ یورپی زبانوں پر یونانی و لاطینی کے اثرات کے باعث انھیں ویدک زبان کے صرف اسی جزو سے زیادہ دلچسپی رہی جو ان یورپی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے غرض رگ وید کی تشریح میں اس کی لسانی بوقلمونی ہمیشہ سے سد راہ رہی ہے جس سے بعض بعض مقامات پر یہ الجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دو زبانوں کے ہم آواز لفظوں کو دیکھ کر ان کے اشتقاق اور معنوی اختلاف کے باوجود بعض محققین ایک زبان کو دوسری سے مشتق سمجھنے لگتے ہیں بلکہ اس الجھن میں ہمیشہ پراکرت ہی کو سنسکرت سے مستخرج کیا جاتا ہے یعنی محققین کی کم فہمی کا نزلہ ہمیشہ ہندوستانی (دراوڑی) زبان پر گرتا ہے۔

مثال کے طور پر بعض لوگ "ہم" (پراکرت اَھم) کو سنسکرت "اَہَم" (معنی مَیں) سے یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ سنسکرت لفظ کا الف گر گیا ہے (حالانکہ سنسکرت لفظ "اہم" کا تلفظ اوستا میں "ازم" اور فارسی قدیم میں "اَدَم" ہوتا ہے) اور پھر وہ ضرورت اور وہ وجہ بھی نہیں بتاتے جو اس کے سقوط کا جواز ہو سکے اس لیے کہ اردو ہندی والے لفظوں کے ابتدائی الف کا تلفظ بالکل اسی سہولت کے ساتھ کرتے چلے آ رہے ہیں جس آسانی سے درمیانی یا آخری الف کو بولتے رہتے ہیں یعنی وہ لوگ ابتدائی الف کے تلفظ پر پوری طرح قادر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مسلمہ امر ہے کہ زبانوں سے آوازیں اس طرح کبھی نہیں اڑتیں جس طرح کاغذ سے حرف مٹائے، اڑائے، کاٹے یا بگاڑے جاتے ہیں لیکن یہ لوگ جس آسانی سے سنسکرت لفظوں کے حروف گرا کر اردو ہندی لفظ بنا لیتے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک انسانوں کی زبانیں کاغذی صفحات سے زیادہ نہیں کہ ان پر سے جب چاہا حرف چھیل دیا۔

رگ وید کی تشریح کی دشواری کا دوسرا سبب اس کی کتابت کا وہ اصول ہے جسے لسانیات میں تبادل حروف کا نام دیا گیا ہے اور یہ سبب پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بعض اوقات رگ وید میں دو مختلف التلفظ اور مختلف المعنی الفاظ ایک ہی مکتوبی شکل میں نظر آتے ہیں مثلاً اس میں ایک لفظ "دکش" ملتا ہے جس کا ایک مقام پر ایرانی تلفظ "دش" (عبادت گزار) ہے اور دوسرے مقام پر ہندوستانی تلفظ لاکھ (سو ہزار) ہے۔ اب یہ بات کہ کسی مقام پر یہ لفظ اردو کا ہے یا فارسی کا اور اس کا صحیح صحیح تلفظ کیا ہے صرف سیاق و سباق کو دیکھ کر ہی طے کی جا سکتی ہے یا مثلاً ایک مقام پر ویدک "مرگ" جسے کلاسیکی سنسکرت میں عام طور پر ہرن کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے فارسی لفظ "مرغ" (اسی سے مرغزار بنا ہے) کی مکتوبی شکل ہے لیکن دوسرے مقام پر فارسی لفظ "مرگ" (موت) کی۔ اب شارحین کی بے بسی دیکھیے کہ موت کے مفہوم میں جہاں اس کے خوف کا بیان ہوا ہے وہ لوگ "مرگ" کے معنی "شیر" لکھ کر تشریح کی خانہ پری کر دیتے ہیں چنانچہ "مرگون بھیمو کچرو گرشٹھا" کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اے اندر دیوتا! تو مرگ (شیر) کی طرح بھیم (خوفناک) ہے، کچر (بدراہ) ہے اور گر (پہاڑ) + شٹھا (ستھا۔ رہنے والا) یعنی پہاڑ کا باسی ہے۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایک ہی لفظ کے دو مقامات پر دو مکتوبی روپ نظر آتے ہیں مثلاً لفظ "اوک" (گھر) کہ دوسرے مقام پر "اَدَس" لکھا ہوا ہے "اَدَسا یسنواں" (اوکاتے اسپاں)۔ اے اندر! گھوڑوں کو گھر میں کر کے یا "اَدَساَ"

پدَوَستے دَورمرل" (راہ کلے پرورے دَور مرل)۔ لے دَورگھر کی پرورش کے سبب مہربانی کرنا عطا شو شجان (بڑھتا ہوا) لہ دوسرے مقام پر "نونجان" کے روپ میں دکھائی پڑتا ہے یا تو کم (تخم) اور تو چم یا شوشتہ (= اوستا سوشت = فارسی جدید زادشت بمعنی نوی) اور یوشتہ یا یگش (= فارسی ذکش بمعنی عبادت کرنا) اور دوکش یا اشم (= پراکرت اتھ بمعنی پانی) اور ماتھہ یا ہنبد (پارہ) اور پرگو یا یُوتی (دوشی - دوشیزہ) اور یوشا (دوشا) یا ترج (توڑنا) اور تج وغیرہ

غرض ان دشواریوں کے پیش نظر رگ وید کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے متن پر غور کیا جائے اور سیاق و سباق کی مدد سے الفاظ کے تلفظ اور اشتقاق کا سراغ لگایا جائے۔ جب تک اس کے ایک ایک لفظ کو اس کے اپنے مقام پر نہیں دیکھا جائے گا ہم اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اس لیے ذیل میں چند اردو الفاظ کے مقابل میں ویدک الفاظ سوکت کے حوالے سمیت پیش کیے جاتے ہیں تاکہ متن پڑھ کر میرے خیال کی تائید یا تردید میں آسانی ہو۔

(۱) رگ وید میں اردو کے بعض الفاظ کی نشاندہی محض حرف ر (ری) سے کی گئی ہے یعنی اس حرف کو صرف یہ دکھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ لفظ خالص دراوڑی ہے کیونکہ تلفظ میں اس کی آواز بالکل نہیں نکلتی مثلاً

اردو	رگ وید	سوکت (منڈل، انواک اور سوکت کے نمبر)
ناپتے	نرپتے	۱-۱۵-۹
کپڑے	کرپتے	۱-۱۶-۸
آٹھا	ورتھا	۱-۱۱-۶، ۱-۱۴-۸
گھنا	گھرنا	۱-۱۰-۲
گھنے	گھرنے	۱-۲۰-۵
گھنی	گھرنی	۲-۳۳-۶
گھنیر (گھنیری)	گھرنیر	۶-۱۶-۳۸
بکری	ورشنی	۱-۳-۳

ایرانی الفاظ میں ر (ری) ایرانی ر کی قائم مقام ہے مثلاً ویدک مرگ = ایرانی مرغ (ہرن) اور مرگ (موت)۔
ویدک سرکم = ایرانی چرخم (چکر - گھیرا - دائرہ) = لاطینی CIRCUM = یونانی KIRKON
ویدک نرتی = فارسی نرد (سیڑھی) وغیرہ۔

(۲) اردو کے مہاپران بعض بعض مقامات پر ویدک الپ پران سے لکھے گئے ہیں مثلاً

بھ = ویدک و	بھکنا (قدیم بھکھنا بمعنی کھانا)	ورشنا	۱-۱۶-۳
	بھاپ (بھپھ)	ورپس	۱-۱۱-۷
بھ = ویدک م	سنبھال (قدیم سمھال)	سمارت (سنبھالتا ہے)	۱-۱۰-۴، ۱-۲۱-۶
بھ = ویدک پ	بھانسا (پھندا)	پاشا	۱-۶-۱، ۲-۲۷-۱۶

	پھانٹا (منقسم)	پھانجم	۱۰ - ۱۳۵ - ۳
	پھیپھڑا	پپھڑو	۱ - ۱۰ - ۱
	پھرسا (ایک ہتھیار)	پرشو	۷ - ۱۰۴ - ۲۱
	پھول	پُرت	۱ - ۱ - ۳ ، ۱ - ۴ - ۶ ، ۱ - ۲۰ - ۲
ٹھ = ویدک ت	(اَ) ٹھنڈا	اَتندرا (جو ٹھنڈا نہ ہو)	۸ - ۲ - ۱۸ ، ۱ - ۱۲ - ۸
تھ = ویدک ت	تھرتھرانا	ترترتی (تھرتھراتا ہے)	۶ - ۴۷ - ۱۷
کھ = ویدک ک	بکھ (بکھرنا)	وکرت	۱ - ۱۶۴ - ۱۵
	کھیل	کریل	۴ - ۴ - ۹
ڑھ = ویدک ر	چڑھاؤ	چراو	۷ - ۸۸ - ۳
	چڑھ	چرنتی (چڑھتی ہیں)	۴ - ۵۱ - ۸
بھ = ویدک پ	بھر (بھرنا)	پرن	۱ - ۱۸ - ۴

اسی طرح ایرانی کے حروف خ، غ اور ف جنھیں مستشرقین قدیم ہند یورپی کے مہاپران کہتے ہیں رگ وید میں الپ پرانوں سے تحریر ہوئے ہیں مثلاً

	ایرانی	رگ وید	سوکت
خ = ویدک ک	خُمب (خُم)	کمبھ	۱ - ۱۷ - ۲ ، ۱ - ۱۶ - ۱۰
	خاستہ (اٹھا ہوا)	کاشٹھا	۱ - ۸ - ۲
	خرامیم (ہم چلیں)	کرامیم	۱ - ۱۰۵ - ۶
	خرام (چل)	کرام (ددھ)	۱۰ - ۱۰۱ - ۱
	خرد (عقل)	کرتو	۱ - ۶۸ - ۹ و ۱۰
	خردمند	کرتومنت	۱ - ۲۴ - ۴
خ = ویدک س	خواجہ	سوآیو	۱ - ۱۲ - ۸
	خواجہ	سوآدھیو	۱ - ۴ - ۵
	خواہر	سوسارم	۱۰ - ۱۲۷ - ۳
	خوئید (پسینہ)	سوئید	۱ - ۱۴ - ۲
	خور (خورشید)	سور	۱ - ۱۴ - ۸
	غار (کاشانہ)	سارم	۱۰ - ۱۴ - ۱۱
	خون	سون (بیٹا)	۱۰ - ۱۴۲ - ۱ ، ۴ - ۱۱ - ۹

	خدا	سودھا	۱-۱۴۷-۲، ۱۰-۱۲۹-۵
خ = ویدک شش	خُشک	شُشک	۴-۴-۴، ۲-۱۳-۶
	ساغم داخی (ہم آواز ہوکر)	ساکم واشی	۱-۸-۲
غ = ویدک گ	بَغ (دیوتا)	بھگم	۱-۸۹-۳
	بُرغ (جُوا)	یُگ	۱۰-۱۰۱-۳
	مرغ (ہرنی)	مرگ	۱-۱۰۵-۷
غ = ویدک ہ	دوغ (دودہنا)	دُہ	۸-۸-۸
	داغ (جلانا)	دَہ	۱۰-۱۰۳-۱۲
	میغ (بادل)	مہ	
	آروغ (ڈکار-چڑھنا)	آرُہ	۱-۱۰-۲
ف = ویدک پ	درفش (جھنڈا)	درپسا	۱-۴-۳
	فرخو (بہت سی شاخوں والا درخت)	پرسو	۲-۱۳-۷
	فرشتہ	پرشٹھا	۶-۷۲-۳
	نیغنہ (نیچے گرایا ہوا)	نیپگنا	۱۰-۳۴-۵، ۱۰-۳۴-۹
	فشنگ (خوبصورت)	پسنگ	۱-۲۴-۲

(۳) اردو کے مہاپرانوں کو رگ وید میں الپ پران پر صفیریوں اور ی کے اضافے سے بھی لکھا گیا ہے مثلاً

	اردو	رگ وید	سوکت
سس	ہم (قدیم اسمہ)	اَسم	۱-۴-۶
	نہا (قدیم نھنا-نہانا)	سناتو (نہانے والا)	۱-۱۵-۱۱
	ٹھیراؤ (مضبوط-دیرپا)	ستھراد	۱-۸-۳
	تھن	ستن	۱-۲۳-۵
فمی شش	بھٹی	بھرشٹی	۱-۱۳-۷
	لاٹھی (یشٹی)	رشٹی	۱-۷-۱
	نکھر (نکھرنا)	نشکرت	۱-۱-۲، ۱-۴-۳
	بکھر (بکھرنا)	وشکرت	۱-۷-۴، ۱-۱-۲
حلقی شش	چھن {قدیم چھنہ۔ جمع کرنا۔ اسی سے لفظ چھنال بنا ہے}	ششن	۱-۱۰۵-۸

	اردو	رگ وید	سوکت
	ٹھنڈا	شچندر۔ شچندرا	۱-۲۳-۱، ۱-۲۲-۱، ۱-۶-۳۴
	آشا	درشتا	۱-۱۰-۱
	ساتھی (سنگتی)	سشتپی	۱-۱۶-۵
	چھوڑ (چھوڑنا)	شچوت	۱-۱۴-۳
ی	مچھ (مچھلی)	متسیہ	
	جُھجّھ (لڑائی)	بدھیہ	۱-۱۰-۲

(۴) اردو کے مہاپرانوں کو ویدک میں مفرد صفیریوں سے بھی لکھا گیا ہے مثلاً

کھ = س	بھک (بھکنا۔ کھانا)	بھَسَت (کھاتی ہیں)	۴-۵-۴
جھ = س	سمجھنے	سماسنے	۱-۲۲-۸
کھ = کش	سیکھ	سیاکش	۷-۶۰-۱۱
	بھک (قدیم بھکھنا۔ کھانا)	بھکش	۱-۱۶-۵، ۷-۹۸-۹
	بھیک (قدیم بھیکھ۔ مانگنا)	بھکش	۱-۲۳-۷
	لاکھوں	دکشم	۱-۱۴-۷
چھ = کش	چھرا	کشرا	۱-۲۳-۲
	پرکھ (قدیم پچھ۔ پاس۔ لحاظ)	پرکش	۱-۱۱-۶
جھ = کش	ان جھاڑ (بے خار)	انرکشر	۱-۸-۶، ۱-۴۱-۴، ۱-۴-۵
	جھڑنا	کشرن	۱-۱۷-۱
کھ = بھی ش	بھیک (قدیم بھیکھ)	بھشیام (میں مانگوں)	۱-۱۵-۱۲
	سکھانا	سورشاتا	۱-۱۴-۷، ۹-۳۳-۴
	بھکنا (کھانا)	ودشنا	۱-۱۶-۳
چھ = ش	چھڑیاں	شدیام	۱-۲۱-۹
	بچھڑا	باشرا	۱-۷-۲

(۵) اردو کے مہاپرانوں کو ویدک کی دیوناگری لپی میں الپ پرانوں پہ ہائے ہوز کے اضافے سے بھی ظاہر کیا گیا ہے مثلاً

گھ = گ + ہ	گھر	گرہ	۵-۱۱-۴
	گھڑیا (کٹھالی)	گرہیا	۱-۱۸-۵

جھ = ج + ہ	جھوم (جھومنا)	جُہُوم	۱-۲-۱
	جھو (زبان)	جُہُو	۱-۴-۱
	جھیل	جِہیل	۱-۶-۲
بھ = ب + ہ	جیبھ (زبان)	جِہوم	۴-۵۰-۱
	بھرت (نام ہے)	ورہَت	
مھ = م + ہ	ہیں (قدیم مھیں - اَندر)	مَہی	۱-۲۱-۱۷
	ہمیں (قدیم امھیں)	اِہمیم	۱-۹-۲
دھ = د + ہ	اِدھر	اِہدر	۱-۹-۲

(۶) اُردو کے مہاپران رگ وید میں دوسرے مہاپرانوں سے بھی لکھے گئے ہیں مثلاً

تھ = دھ	ساتھی (سنگی)	سدھری	۱-۱۶-۳
	اَن تھک	اَن دھَس	۱-۳-۲، ۱-۳۵-۶، ۱-۱۰-۴
مھ = م + بھ	چوم (قدیم چومھ)	شُنبھ	۱-۲۱-۱
	سنبھالنا (قدیم سمھالنا)	سمبھرا	۸-۵۵-۵
	سنبھل (قدیم سمھل)	سنبھرت	۱-۱۰-۳
	تھم (قدیم تھمھ)	ستبھ	۲-۱۲-۲
	کھم (قدیم کھمھ)	سکبھ	۱-۱۶۰-۴

(۷) اُردو کے مہاپرانوں پر رگ وید میں جو کچھ بیتی ہے اس کا کچھ اندازہ مندرجہ بالا مثالوں سے ہو جاتا ہے لیکن ایرانی زبان میں خ، غ، ف کے علاوہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے دوسرے مہاپرانوں کے فقدان کے باعث اس قسم کی مثالیں نہیں مل سکتیں۔ البتہ رگ وید میں اس کے برعکس تمام زبانوں کے الپ پرانوں کو بھی بعض بعض مقامات پر مہاپرانوں سے تحریر کیا گیا ہے چنانچہ اس باب میں اردو اور فارسی دونوں کے الفاظ کے ساتھ رگ وید میں یکساں سلوک ہوا ہے اس کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱)	اردو	رگ وید	سوکت
	برت (ججمان کا گھر)	وِدتھ	
د = دھ	دِیے	دھے وِ	۳-۵۴-۱۸، ۱-۱۸-۳، ۱-۵۴-۱۸
ل = دھ	باولا	ماوردھ	۱-۲۳-۹، ۱-۲۱-۱
ل = دھ	بلبلانا	وَدوَدھان	۱-۱۰-۲
ل = شٹھ	منگل (بہبود)	منہشٹم	۱-۱۰-۱

ل = شٹھ	بیل	وہشٹھا، وہشٹھان	۱ - ۱۸-۱،۱-۲۰-۱
ل = دھ	جَل (خرام)	ددھ (کرام)	۱ - ۱۰۱ - ۱۰
د = دھ	داکھ (منقیٰ)	دھاسم	۱ - ۲۱-۱ ،۵ - ۱۱-۱
(ب)	ایرانی	رگ وید	سوکت
د = دھ	سپرد	سپردھ	۱۴ - ۵۵ - ۸
	داغ	دھکش (جلادسے)	۴ - ۴ - ۴
	داوار	دادھار	۶ و ۵ - ۶۷ - ۱
	گردو (لڑھکتا ہے)	گردھد	۴ - ۳۴ - ۱۰
	دَم (پھونکنا)	دھمنتو (پھونکنے والے)	۱ - ۱۴ - ۱
	درماں	دھرماں	۱ - ۴ - ۱
د = تھ	بید	وِیتھ	۷ - ۱۶ - ۱
ت = تھ	ستنا (ستاون۔ کھڑا ہونا)	ستھا	
	ستور (بیل)	ستھورم	۴ - ۱۰ - ۱
ت = ٹھ	ستنا (ستاوان)	شٹھا	
	خاستہ	کاشٹھا	۲ - ۸ - ۱
ب = بھ	آب (چمک)	آبھا	۷ - ۹ - ۱
	بَغ	بھگ	۳ - ۴۳ - ۱۰
	ابر	ابھر	۶ - ۱۳ - ۱
	خُمب (خُم)	کمبھ	۱۰ - ۱۶-۱ ،۲-۱۷-۱
	براز (چمکنا)	بھراج	۴ - ۳۵ - ۱
	برگ	بھرگ	۱۰ - ۶۲ - ۳
	ببر	ببھرو (باوامی)	۴ - ۳۳ - ۲
	ببرد (وہ لے جاتا ہے)	ببھرتی	۲ - ۱۰۲ - ۱

یہ مقام ان محققین کے لیے قابلِ غور ہے جن کے خیال کے مطابق ہماری بھاشائیں سنسکرت سے حروف بدل بدل کر تراشی گئی ہیں۔ ایرانی زبان میں مہاپرانوں کے فقدان کے باوجود رگ وید میں ایرانی الفاظ کو بھی مہاپرانوں سے تحریر کیا گیا ہے جس سے اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ویدک زبان کی وہ آوازیں جو آج عام طور پر مراد لی جاتی ہیں قطعی غلط اور ناقابلِ اعتبار ہیں اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن زبانوں اور آوازوں کو اس میں قلم بند کیا گیا ہے وہ اس کی تصنیف کے زمانے

میں پیشتر سے رائج تھیں اس لیے ویدک زبان یا اس کی بیٹی کلاسیکی سنسکرت سے کسی دیسی یا بدیسی یعنی ہندوستانی یا ایرانی زبان کا اشتقاق درست نہیں مانا جا سکتا۔

(۸) اُردو کے لمی حروف ویدک میں دندانی سے لکھے گئے ہیں مثلاً

اُردو	رگ وید	سوکت
مونڈھ (سر)	موردھانم	۴ - ۲ - ۶
چڑھیں	شردھیم	۱ - ۱۷ - ۴
چڑھائے	شردھائے	۱ - ۱۶ - ۶
اٹھا	ورتھا	۱ - ۱۱ - ۶
بیٹھا	ویدھا	۱ - ۱۱ - ۲ ، ۱ - ۲۱ - ۱۷
"	ویدھو	۱ - ۲۳ - ۵
بٹھانا	ودھاتی (وہ بٹھاتا ہے)	۱ - ۱۷ - ۵
گھٹا (بادل)	گھرتا	۱ - ۲۳ - ۳ ، ۷ - ۶۰ - ۳
بٹ (بل)	ورت	۴ - ۳۰ - ۲
کپٹ (کینہ)	سمپرچ	۲ - ۳۵ - ۶
پھیپھڑا	پپیرُو	۱ - ۱۰ - ۱
چھپٹ (چھپر)	شَل	۱ - ۱۶۴ - ۱۵ ، ۱ - ۱۲۸ - ۵
لٹایا	رنچاییا	۱ - ۱۵ - ۱۲
اٹا (بالاخانہ)	اَچا	۱ - ۱۶ - ۳ ، ۱ - ۱۵ - ۱۱
سٹا (نزدیک)	سَچا	۴ - ۵ - ۱۱ ، ۴ - ۳۲ - ۳
مُڑ (مڑنا)	مُچ	۳ - ۴۱ - ۸
سانٹھی انڈا (انڈے کا سانٹھی)	سدھریَنچا (سدھری + انچا)	۱ - ۱۶ - ۳
	سوپچم (س + اپچم = اچھے انڈے والا)	۶ - ۱۵ - ۱۰
ڈر	در	۱ - ۱۰ - ۳
ڈول	درون	۱۰ - ۱۰۱ - ۷
ٹھنڈا	شچندر	۱ - ۶ - ۴
گھوڑا	گھورم	۲ - ۱۲ - ۵
	گھورانام (گھوڑوں کا)	۱ - ۲۳ - ۵

سونڈ	شُوندَہ	۶ - ۵۷ - ۶
شکرا	شُشمر	۱۰ - ۱۰۱ - ۸
اکڑا	اکرت	۱ - ۱۱ - ۷
بڑھو	وردھو	۶ - ۴۴ - ۱۰ ، ۱ - ۲ - ۸
بے پڑھا	وشش پردھسو	۱ - ۲۳ - ۹

ایرانی میں ہماری زبانوں کی طرح فمی حروف بھی غائب ہیں اس لیے اس زبان سے اس قسم کی مثالیں نہیں مل سکتیں لیکن رگ وید میں صرف یہی نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس دندانی حروف کو بھی خواہ مخواہ جابجا فمی بنا دیا گیا ہے اور اس باب میں اردو اور فارسی زبان کی کوئی تخصیص نہیں ہے چنانچہ رگ وید کے دیسی الفاظ میں ٹ، ڈ اور ل کا تبادل عام ملتا ہے جیسے بڈ = بیلے، کاٹ = کال، دٹ = بل، مرڈ = مرل وغیرہ اور ایرانی الفاظ میں حرف ز فمی بن جاتا ہے جیسے اپاس اور اپاٹ یا راج اور راٹ وغیرہ۔ ذیل میں دونوں زبانوں سے مزید چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(ا)	اردو	رگ وید	سوکت
	منگل	منہشتم	۲ - ۱۰ - ۱
	بیل	ورشٹھا، وہشٹھان	۱ - ۲۰ - ۱ ، ۱ - ۱۸ - ۱

(ب)	ایرانی	رگ وید	سوکت
	مُشت	مُشٹی	۱ - ۳ - ۱
	زادشت (فوری)	شوشٹھم	۱ - ۱۳ - ۱۱ ، ۱ - ۱۳ - ۴
	«	بوشٹھم	۱ - ۱۸۹ - ۴ ، ۱ - ۶ - ۳
	است (ہے)	اشٹ	۱۰ - ۱۲۶ - ۱
	فرشتہ	پرشٹھا	۶ - ۷۲ - ۳

(۹) ان مثالوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ رگ وید میں دیسی اور بدیسی دونوں زبانوں کے الفاظ کو حروف بدل کر تحریر کیا گیا ہے کیونکہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اس میں ہندوستانی آوازیں تو بدستور قائم رکھی گئی ہوں اور صرف ایرانی الفاظ کے حرف بدل دیئے گئے ہوں۔ اب میں ایسے ہی کچھ اور تبادل پیش کرتا ہوں جو اردو اور ایرانی الفاظ کی کتابت میں مشترک ملتے ہیں یہ الفاظ میرے اس خیال کو مزید تقویت بخشتے ہیں کہ ویدک میں رائج الوقت دراوڑی اور ایرانی زبانوں کے الفاظ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

ل = ویدک د	اردو	رگ وید	سوکت
	بھلا (قدیم بھلاّ - اچھا)	بھدرا	۱ - ۹ - ۵
	لاکھوں	دکشم	۱ - ۱۴ - ۴ ، ۱ - ۲۰ - ۱ ، ۱ - ۱۴ - ۷

کھرپی	دکش پتی	۱-۱۵-۲
ایرانی		
رسالہ (فوج)	رشادا	۱-۱۳-۴
رسالک	رشادس	۱-۸-۴
ل = ویدک ت اردو		
چانول	چاروت	۱-۲۲-۶
چیلی	چیتی	۱-۱۴-۸
چیلا	چیتا	۱-۱۵-۷
اکیلی	اچیتی	۱-۱۶-۸
پھول	پرت	۱-۱-۳، ۱-۴-۶
کونپل	سوپنیا	۱-۱۰-۴، ۱-۱۲-۷
ساون جل	سموت سر	۱-۱۶-۵، ۱-۲۱-۱
ایرانی		
سال (برس)	ساتم	۱-۲۳-۱۱
”	سات	ہندی نرکت نیگھنٹک کانڈ صلا گوبند پریس کلکتہ ۱۹۱۵ء
ل = ویدک دھ اردو		
بلاؤ	ودھاو	۱-۲۱-۱
باولے	وادردھے	۱-۱۰-۲، ۱-۳-۸
ایرانی		
لرز (لرزیدن)	دھرج	۱-۲۳-۱
لرزان	دھرشمان	۱-۱۰-۲
ل = ویدک ن اردو		
لٹایا	رنجایا	۱-۱۵-۱۲
پل (رہنا)	پن	۱-۱۳-۱۱
ایرانی ارل	ارن (سمندر)	۱-۱-۳
ر = ویدک ن اردو		
گھرا	گھنم	۱۰-۱۲۹-۱

اردو	سر (کنڈا)	ترن (سکند)	۱-۲۲-۶، ۱-۲۳-۷
	بکری	پرشنی	۱-۸۵-۲
	بکرا	ورشنو	۱-۷-۲
	بکرے	ورشنے	۱-۱۱-۷
	بکری	ورشنی	۱-۳-۳
	بھر (بھرنا)	پرن	۱-۱۸-۴
ایرانی	ادورا	اُرنَم (شترغ)	۱-۲-۹، ۱-۹-۶
	راستی	ناستیا (دیوتا)	۱-۱۷-۱، ۱-۷-۴
	گور	کشون	۱-۱۲-۱

ک = ویدک س اردو

اَجکڑا (جو جکڑا ہوا نہ ہو)	اَجَسر (بے روک)	۲-۲۵-۸، ۱-۱۸۹-۴، ۱۰-۱۸۵-۳
پھسکڑا (پھیلاؤ)	پرسرسرے (پھیلا)	۲-۳۵-۵
کال (وقت)	سار	۱-۲۱-۱
ان تھک	اَن وَکس	۱-۱۳-۹، ۱-۱۴-۱
کونپل	سوپتیا	۱-۱۰-۴، ۱-۱۲-۷

ایرانی

کنیزک	کنی نیس	۶-۸۹-۶
بے باکاں	وِداساں	۱-۲۳-۹
کہسار	سوسارو	۱-۱۲-۷
آہک	آیس	۱-۱۳-۷

گ = ویدک ی اردو

	گونج (گونجنا)	یُنج	۱-۲-۳
	بگلا (ایک پرند)	ویونا	۱-۲۲-۶، ۱-۱۴-۸
ایرانی	گونی (تھیلا)	یونی (رحم مادر)	۱-۲۱-۱
	تیزگام	تویش یاما	۱-۲۳-۲
	گام	یام	۱-۲۳-۴
	نگار	رنیان	۱-۲۲-۸

= ویدک ی

اردو		
جد کدھوں (جب کبھی)	یدہ چدھوم	۱-۱۴-۳
بکا	ویزیہ	۱-۱۵-۱۰
چڑھ (جب)	یدّھ	۱-۸-۲
جا (جانا)	یا	
گج پھاڑ (ہاتھی کو پھاڑنے والا)	گبتّی بھانو	۱-۱۴-۷

ایرانی		
جادو داں	یاتو دھانم	۷-۱۰۴-۲۴
جَو (غلہ)	یَو	۱-۱۷-۲
جام	یام	۱-۲۳-۸، ۱-۲۴-۱
جَلد (جلدی)	یَندھ	۱-۱۸-۱
جوان	یُوانا	۶-۹۲-۵، ۱-۱۹-۵
خواجہ	سواآیو	۱-۱۲-۸

ویدک ش

اردو		
سُور (بیر)	شُور	۱-۱۱-۶
سُونا (خالی۔سنسان)	شُوسنے	۱۰-۳۷-۶
سنگات (سانڈھ)	شرنگاد	۱-۲۱-۱
سونڈ	شونر	۶-۵۷-۶
پھرسا	پرشو	۷-۱۰۴-۲۱
پھانسا	پاشا	۱-۶-۱، ۲-۲۷-۱۶

ایرانی		
رسی (رسّی)	رشن	۱-۲۲-۶
سر	شِر	۱-۱۷-۲
سرد	شرد	۶-۴۷-۱۷
آسمان	اشمن	۲-۱۲-۲

= دھ بک ت

اردو		
اساوری	رتناوری	۱-۱۶۰-۱

سر (کنڈا)	ترن (سکند)	۱-۲۲-۹
سرکنڈا	ترنسکند	۱-۲۳-۷
ایرانی		
پسر	پتر	۱۰-۱۴-۷
س = ویدک چ اردو		
چمک	سنش	۸-۸-۳۸-۲ (دیسی تقسیم کے مطابق)
ایرانی چمن	سمن	۱-۹-۵
چرخ	سرکم	۸-۸-۳۸-۲ (دیسی تقسیم کے مطابق)
چانہ (جبڑا)	سانو	۱-۳-۳، ۱-۱۱-۵
پچھ	پچسم	۱-۲۲-۵، ۱-۴-۳
چھتی	سوستی	۱-۱۴-۵
برچم	پرسیم	ہندی نرکت نیگھنٹک کانڈ حصہ اول ص ۹۲ کلکتہ ۱۹۱۵
ر = ویدک د اردو		
بھرن (بارش کی)	وردن	۱-۲۱-۱
برت (ججمان کا گھر)	ودتھ	۱-۱۱-۷
ایرانی		
پرورسے	پروستے (پرورش کے لیے)	۸-۸-۲۷-۱ (دیسی تقسیم کے مطابق)
ب = ویدک پ اردو		
بکری	پرشنی	۱-۸۵-۲
بوا (چہرے والا)	پپوشے (چہرے کے لیے)	۱-۱۱-۷، ۱-۲۱-۲، ۱-۶۰-۲
ایرانی		
آب	آپ (اوستا آپ)	
بر (اوپر)	پری	۱-۱۱-۷
شب	کشپ	۱-۹-۱

رگ وید کے مندرجہ بالا الفاظ کی تعداد اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ آریوں نے اپنی آبائی زبان (قدیم ایرانی) کے الفاظ کے پہلو بہ پہلو ہماری زبان کے بھی بہت سے الفاظ اپنے بھجنوں میں داخل کر لیے ہیں لیکن ان کو کتابت کے خاص اصولوں کے تحت قلم بند کیا ہے جس کے باعث ظاہر بیں نگاہیں ان تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی لسانیات کے

ققین اسلئے اس زبان (ویدک سنسکرت) کی مکتوبی شکلوں سے ہماری بھاشا (بول چال کی زبان) کی آوازیں مشتق کرنے کی ی لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں ۔

رگ وید ہندوستان کی وہ قدیم ترین اور آریوں کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے چنانچہ اس میں اُردو الفاظ وجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان ویدک کال کے بھی پہلے سے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام میں آ رہی ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بول چال کی آوازوں میں ہزاروں سال سے آج تک زیر زبر پیش کا بھی ق نہیں آیا ہے اور اس طرح اُردو کے ماخذ اور اشتقاق سے متعلق اب تک کی تمام غلط فہمیاں زائل اور تمام نظریات خود باطل ہو جاتے ہیں ۔

کسی زبان کا اشتقاق دکھانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ کا تجزیہ کرکے ان مادوں کا سراغ یا جائے جن سے مختلف الفاظ بنائے گئے ہیں لیکن اُردو زبان کے محققین جب اس کا اشتقاق دکھانے بیٹھتے ہیں تو ہر دو لفظ کے مقابل سنسکرت زبان کا کوئی نہ کوئی لفظ پیش کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے اشتقاق کا حق ادا ہو گیا ورآنحالیکہ ں قسم کی کوشش کا ہماری زبان کے اشتقاق سے نہیں بلکہ اس کی تاریخ سے تعلق ہے یعنی اس بات سے صرف یہ ثابت جا سکتا ہے کہ ہماری زبان آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے جس کے الفاظ سے مشابہ الفاظ اس برصغیر کی ایک قدیم ن سنسکرت میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ میں نے بھی اُردو الفاظ کے مقابل میں جو رگ وید کے الفاظ سطور بالا میں ش کئے ہیں اس سے یہی ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہماری زبان نہایت طویل العمر ہے اور اس کی تاریخ ہندوستان میں ریوں کی آمد سے قبل تک پہنچی ہے لیکن جو لوگ اُردو زبان کے اشتقاق پر کام کرنا چاہتے ہیں انھیں لازم ہے کہ وہ اپنے ہن کو سنسکرت کے طلسم سے نکال کر اُردو الفاظ کا تجزیہ کریں اور اس کے مادوں، سابقوں اور لاحقوں وغیرہ کا آزادانہ ر پر سراغ لگائیں کہ اُردو کا اشتقاق ابھی تک تحقیق کا منتظر ہے ۔

تحقیقاتِ امیر مینائیؒ

(خطوط کی روشنی میں)

کسریٰ منہاس

امیر مینائیؒ اُنیسویں صدی کے آخر میں استادی کے اس مرتبے پر فائز تھے۔ جن سے طالبانِ فن ہر روز شعر و سخن کے متعلق ان کے خیالات سے استفادہ کرنا عین سعادت خیال کرتے تھے۔ الٰہیات۔ فلسفہ۔ عربی۔ فارسی اور اُردو شاعری کے اصول۔ زبان دانی اور دوسرے متعلقہ شعبہ ہائے علم و فن پر ان کو وہ دست گاہ حاصل تھی کہ ان سے مشورہ کرنا کتب خانوں میں بیٹھ کر موٹی موٹی اور خشک کتابوں کے ذریعہ معلومات حاصل کرنے سے کہیں زیادہ مفید سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے سلسلے کے شعرا بلکہ دُور و نزدیک کے تشنہ کامانِ علم و فن ان سے مسلسل خط و کتابت رکھتے تھے۔ یہ دَور وہ تھا جب ہندوستان میں اسلامی علوم کے سرچشمے ابھی خشک نہ ہوئے تھے اور خال خال ایسی ہستیاں اس گئے گزرے زمانے میں بھی موجود تھیں کہ جن کی بات کو سند کا درجہ حاصل تھا۔ پھر اس کے بعد ایک ایسا دور آیا۔ جس کے متعلق حسرتؔ موہانی کہتے ہیں ؎

حسرتؔ یہ دورِ جہل ہے دولت کو ہے فروغ
اب ہم سے قدر دانیٔ علم و عمل گئی

ہندوستان کے گوشے گوشے سے اہلِ ضرورت امیرؔ کے نام مسلسل خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ اور ان کے خطوں کے ذریعے استفسارات کرتے رہتے تھے۔ امیرؔ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے علم کے مطابق ہر استفسار کرنے والے کی تشفی کر دیتے تھے۔ غرض کہ امیر مینائیؒ کے خطوط وہ ذخیرے ہیں جن میں علم و فن کے جواہر پارے محفوظ ہیں۔

امیرؔ ایک صاحبِ سلسلہ استاد تھے۔ لکھنؤ اور لکھنؤ سے باہر ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ خود ان کے شاگردوں میں سے اکثر ایسے بلند مرتبہ اساتذۂ فن ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی میں اُردو شاعری کو جتنا انھوں نے چمکایا ہے۔ دوسرے شعرا نہ چمکا سکے۔ ان میں سے جلیلؔ مانکپوری۔ ریاضؔ خیرآبادی۔ وسیمؔ خیرآبادی۔ دلؔ شاہجہانپوری۔ زاہدؔ سہارنپوری۔ کوثرؔ خیرآبادی۔ مضطرؔ خیرآبادی۔ قرارؔ شاہجہانپوری۔ جگرؔ بسوانی۔ شوقؔ قدوائی۔ حکیم برہمؔ۔ حفیظؔ جونپوری۔ نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رامپور۔ عبدالحلیم شررؔ۔ احسن اللہ خاں ثاقبؔ۔ آہؔ امیٹھوی۔ شفقؔ عمادپوری۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ اور نواب صفدر علی خان صفدرؔ رامپوری۔ خود اپنی جگہ بڑے مرتبے کے استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے صاحبزادوں میں منشی محمد احمد صریرؔ مینائی اور منشی لطیف احمد صاحب اخترؔ مینائی نے اُردو زبان کی بڑی

خدمت کی۔ بلاخوف تردد یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ معاصرینِ امیر مینائی میں سے کوئی ایسا نہیں گزرا ہے جس کے شاگردوں کو شاگردانِ امیر کے مقابلے پر رکھا جا سکے۔ جہاں استاد نواب مرزا خاں داغ کتنے ہی نامور کیوں نہ سہی۔ علم و فن کے معاملے میں امیر کے ہم پلہ نہ تھے۔ داغ کے شاگردوں میں سے بھی کوئی شہرت کے اس مقام تک نہیں پہنچا جس پر امام الفن جلیل اور لسان الملک ریاض فائز تھے۔ یہی حال منشی امیر اللہ تسلیم اور ان کے تلامذہ کا ہے۔ جلال مرحوم بہت بڑے شاعر اور زبان داں تھے۔ مگر ان کے شاگردوں میں سے کوئی بھی اس منصبِ کمال تک نہیں پہنچا۔ غرض کہ امیر کی حیثیت اپنے معاصروں میں سب سے جداگانہ تھی۔ وہ خود بڑے پائے کے عالم تھے۔ اور ان کے سلسلے کے شعرا بھی علم و فن میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔

امیر کا طریقۂ اصلاح یہ تھا کہ ان کے غیر مقامی شاگرد ڈاک کے ذریعے انھیں اپنا کلام ارسال کرتے تھے۔ اور امیر ڈاک کے ذریعے حک و اصلاح کے بعد یہ کلام واپس بھیج دیتے تھے۔ یہ طریقہ کچھ امیر ہی سے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ اصلاحِ سخن کا یہ مروجہ طریقہ تھا۔ امیر کی اصلاحوں میں جو خصوصیت انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ تھی کہ وہ محض اصلاحِ شعر ہی پر قناعت نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ ہر خط میں کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ بھی درج کر دیتے تھے کہ جس سے شاگرد کی علمیت میں اضافہ ہوتا تھا۔ کوئی لفظ یا کوئی محاورہ غلط ہے تو کیوں غلط ہے جس کی بنا پر اس کی اصلاح کی گئی۔ اصلاح کے سلسلے میں وضاحت کے طور پہ جو نکات پیدا ہوتے تھے۔ ان کی تشریح بھی کر دی جاتی تھی کہ ایسا ہے تو کیوں ہے؟ برخلاف اس کے دوسرے اساتذہ عموماً ایک لفظ کاٹ کر دوسرا لفظ یا ایک مصرع کو بدل کر دوسرا مصرع لکھ دینے پر قناعت کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک بھی ہوتا رہا ہے کہ اپنی طرف سے دو چار شعر عطیہ کے طور پر اضافہ کر دیے یا شاگرد کے کمزور اشعار قلم زد کر دیے۔ اس طریقۂ اصلاح سے ظاہر ہے کہ شاگرد کی معلومات میں کوئی اضافہ ہونا ممکن نہیں۔ امیر کا طریقہ فی الحقیقت عالمانہ تھا جس سے شاگرد خود رفتہ رفتہ ایک صاحبِ نظر شاعر بن جاتا تھا۔ امیر کے علاوہ یہ خوبی اگر دیکھی گئی ہے تو مرزا غالب کی اصلاحات میں ہے۔ غالب کے وہ خطوط جو ان کے شاگردوں کے نام ہیں۔ علمی و فنی نکات سے معمور ہیں۔ جا بجا انھوں نے وجہِ اصلاح بیان کی ہے۔ یہاں یہ فرق یاد رکھنے کے لائق ہے کہ امیر و داغ جتنے کثیر التلامذہ تھے، اتنے غالب نہ تھے۔ آخر میں جب احسن مارہروی حیدرآباد (دکن) میں حضرت فصیح الملک کے معتمد کے طور پر مقیم تھے داغ نے بھی امیر کے طریقے کو اپنایا اور زبان و محاورہ کے معاملے میں اپنے شاگردوں کو خطوط کے ذریعے ہدایات کیں۔ طریقہ یہ تھا کہ احسن مارہروی اپنے قلم سے بیرونی شاگردانِ داغ کو جوابات لکھتے تھے۔ اور حضرت داغ بتاتے جاتے تھے کہ اس شعر کو یوں بدل دو۔ اور اس محاورے کی یوں تشریح کر دو۔ برخلاف اس کے حضرت امیر مینائی کا طریقۂ اصلاح مدت العمر یہی رہا۔ اور جو کام داغ نے چند برس کیا۔ امیر اس میں عمر بھر مصروف رہے۔

موجودہ زمانے میں استادی شاگردی کا طریقہ معدوم ہو چکا ہے۔ اور یہ تصوّر پھیلتا جا رہا ہے کہ فنِ شعر کے متعلق چند ابتدائی کتابیں ہی پڑھ لینا کافی ہے۔ اوّل تو اردو میں ابھی تک اس قسم کی علمی و فنی کتابیں لکھی ہی نہیں گئیں۔ اور اگر چند رسائل اس قسم کے لکھے بھی گئے تو وہ محض ابتدائی ہیں۔ اور ان کا بھی حاصل کرنا آسان نہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ ہر مبتدی شاعر کے مسائل دوسرے مبتدی شاعر سے ایک حد تک مختلف ہوتے ہیں اور اس قسم کے نوآموز شعرا کے لیے عام علمی و فنی کتب یکساں مفید نہیں ہو سکتیں۔ ان کتابوں کی حیثیت پیٹنٹ دواؤں کی سی ہے۔ جس طرح مریض پیٹنٹ دواؤں کے ذریعہ اپنا علاج خود

نہیں کر سکتے۔ بلکہ انھیں حاذق اطبا کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے جو حسبِ ضرورت نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی طرح نو آموز شعرا کو بھی ہر مسئلے میں استاد کا خصوصی مشورہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ قدیم زمانے سے یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ شاگرد مسائلِ شعر و سخن میں استاد سے مشورے کا طالب ہوتا ہے۔ اور استاد ہر شاگرد کی انفرادی ضروریات۔ اس کے مزاج۔ اس کی علمیت اور ذوق کے مطابق اس کو مشورہ دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے خط و کتابت کی سہولتیں اتنی عام نہ تھیں۔ جو بعد کو ہوئیں۔ نتیجہ یہ کہ اصلاح و مشورات کا سلسلہ محض مقامی ہوتا تھا۔ بیرونی شعرا کو یہ آسانی نہ تھی کہ باقاعدہ طور پر خط و کتابت کے ذریعہ اساتذہ سے اصلاح و مشورہ لے سکے۔ ان دنوں اساتذہ میں انھیں شعرا کا شمار تھا۔ جو زبان کے کسی مرکز سے منسلک تھے۔ خواہ وہ دہلی ہو یا لکھنؤ۔ ہمارے سامنے مومنؔ، ذوقؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، آتشؔ وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں۔ جن کے بیشتر شاگرد مقامی تھے۔ غالبؔ کے آخری دور میں خط و کتابت عام ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد رسائل و جرائد نکلنے شروع ہو گئے۔ ان گلدستوں میں طرحی غزلیں شائع ہونے لگیں۔ جن کو دیکھ کر بیرونی مقامات کے شعرا کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ نامور اساتذۂ فن سے استفادہ کریں۔ زبان سیکھیں اور گلدستوں میں اپنا کلام چھپائیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ چنانچہ شاگردانِ امیرؔ و داغؔ کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے محدودے چند ہیں۔ باقی بیرونی مقامات سے متعلق ہیں۔ بیرونی شعرا کے لیے زبان و محاورہ کا صحیح استعمال اگر ممکن تھا تو صرف خط و کتابت ہی کے ذریعے۔ یہی وجہ تھی کہ امیرؔ و داغؔ کے خطوط اُردو شاعری کی تاریخ میں اتنی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ اگر یہ خطوط ایک مخصوص طریقے سے مرتب کئے جائیں تو اصولِ شعر کی تدریس ان کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ قدر خطوط امیرؔ مینائی کے ہیں۔ جس صورت میں یہ خطوط ہمارے سامنے ہیں۔ اس میں عموماً ایک ہی خط میں مختلف النوع مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً ایک ہی خط میں ایک مسئلہ زبان کا۔ ایک دہلی یا لکھنؤ کے محاورے کا۔ ایک مسئلہ تذکیر و تانیث کا اور ایک عروض کا ہونا۔ عین ممکن ہے۔ اس لیے کہ جواب لکھتے وقت صاحبِ مکتوب کے سامنے کئی مسائل ہوتے تھے لیکن آج ان خطوط کے اجزا کو اگر مختلف عنوانات کے تحت درج کیا جائے تو ان مختلف مسائل پر اتنی قابلِ قدر معلومات موجود ہے کہ بلاشبہ ان خطوط کو دوسرے اساتذہ کے خطوط پر فضیلت حاصل ہے۔

حضرت امیرؔ ملک کے اکابر شعرا میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی استعداد مسلّمہ تھی۔ جس کی تصریح کی ضرورت نہیں۔ امیر اللغات[1]۔ سرمۂ بصیرت[2]۔ رسالہ بحث اعداد حروف تہجی[3] کی ترتیب میں علم و ادب کی جو خدمات انھوں نے انجام دی۔

---

[1] امیر اللغات حصہ اول و دوم (لغات الف محدودہ و مقصودہ) حصہ سوم (لغات بائے عربی) غیر مطبوعہ۔ اگرچہ یہ لغت ناتمام ہے لیکن جس قدر موجود ہے بڑا ہی کار آمد ہے۔

[2] سرمۂ بصیرت۔ یہ بھی لغت ہے۔ اس میں عربی۔ فارسی اور اُردو کے ان الفاظ سے بحث کی گئی ہے جو غلط مستعمل ہیں یا مختلف فیہ۔ یہ لغت بھی غیر مطبوعہ ہے۔

[3] رسالہ بحث اعداد حروف تہجی۔ یہ رسالہ تاریخ گوئی سے متعلق ہے جن حروف کے اعداد میں اختلاف ہے، ان کی تحقیق پیش کی گئی ہے۔ یہ رسالہ بھی ابھی شائع نہیں ہوا۔ ورنہ ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو جاتی۔

اس مقالے میں ان پر تبصرہ کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ مقامی تلامذۂ امیر نے جو ان سے زبانی استفسارات کئے۔ ان کی نشان دہی بھی اس مضمون میں شامل نہیں۔ ہم امیر مینائیؒ کی علمی و فنی خدمات کا مختصر سا جائزہ لے کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ملتو باقی ادب میں تحقیقات امیر کا کیا پایہ ہے؟ یہاں ہم صرف ان خطوط سے بحث کریں گے جو انھوں نے اپنے غیر مقامی شاگردوں کو لکھے اور ان کے استفسارات کے جواب بھیجے۔ خطوط میں سے بھی صرف اس عبارت کو لیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ بیشتر خطوط "مکاتیب امیر مینائی" مرتبہ احسن اللہ خاں صاحب ثاقب۔ "مرقع ادب" مرتبہ صفدر مرزا پوری۔ نقوش لاہور (مکاتیب نمبر) اور "صہبائے مینائی" از آفتاب احمد صدیقی سے انتخاب کئے ہیں۔ فقط ان ہی خطوط کا متن پیش کیا ہے۔ جن میں علمی۔ ادبی اور فنی تحقیقات کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر ہم ان خطوط میں تحقیقات امیر مینائی کا تجزیہ کریں تو مندرجہ ذیل عنوانات مرتب ہوتے ہیں: ۔

عروض

"بحر متقارب کی تخصیص نہیں۔ ہر بحر سالم میں تسبیغ کراہت سے خالی نہیں۔ محقق نصیر الدین طوسی نے معیار الاشعار میں اس کی تصریح کی ہے اور یہی محقق بحر متقارب میں یہ شعر ؎

بیالا نگارا چو آزادہ سروی   ولیکن برخسار مانند گلنار

لکھ کر کہتے ہیں۔ "و این ناپسندیدہ است چہ حرف آخر از دائرہ بیرون ست" اور متقارب مزاحف میں اہل فارس اور اہل اردو نے تسبیغ کا استعمال کیا ہے۔ اور اس کو کسی نے مکروہ نہیں جانا۔ حافظ ؎

گر تیغ بارد در کوے آں ماہ
گردن نہادیم الحمد للہ

تقطیع مصرع اول، فعلن فعولن فعلن فعولان۔ تقطیع مصرع ثانی، فعلن فعولان فعلن فعولان۔ میر ؎

اب حال اپنا اس کے ہے دلخواہ
کیا پوچھتے ہو الحمد اللہ

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں   ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں

میری رائے میں یہ سالم ہے نہ مسبغ۔ (خط بنام حکیم برہم ایڈیٹر مشرق)"

(۱) عروض وہ علم ہے جس میں نظم کی درستی کے قواعد مذکور ہوں۔ اس میں بحروں اور ان کے ارکان و زحافات[1] کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس خط میں حضرت امیر نے تسبیغ کا ذکر کیا ہے۔ تسبیغ ایک زحاف کا نام ہے۔ عروضیوں نے اکتالیس زحافات بتائے ہیں۔ اردو کے مشہور زحافات بیس ہیں۔ ان میں سے ایک تسبیغ بھی ہے۔ تسبیغ جب سبب خفیف رکن کے آخر میں واقع ہو تو اس کے متحرک و ساکن کے درمیان الف بڑھا دینے کا نام ہے۔ مثلاً فاعلاتن بحر رمل کا ایک رکن ہے۔ اس میں "تن" سبب خفیف ہے۔ جب "تن" کی تَ اور نَ کے درمیان الف بڑھا دیا گیا تو "تن" سے "تان" بن گیا۔ اب یہ رکن "فاعلاتان"

---

[1] زحاف شعر کے ارکان میں تغیر واقع ہونے کو کہتے ہیں خواہ حرکت جاتی رہے یا حرف محذوف ہو جائے یا کچھ زائد۔

ہو گیا۔ اسی طرح "فعولن" سے "فعولان" اور "مفاعیلن" سے "مفاعیلان" بنالیتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تسبیغ ہمیشہ اس رکن میں آتا ہے جو مصرع کے آخر ہو۔ یعنی عروض[1] و ضرب[2] میں۔

(۲) — "[سید بخنی میں عدیم المثل] سید بخنی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیئے۔ ترکیب فارسی ہے۔ اگرچہ بعض اساتذۂ اُردو کے کلام میں سند ملتی ہے مگر کیا ضرور ہے۔ (خط بنام عابد علی کوثر خیرآبادی)"

حضرت امیرؔ نے ترکیب فارسی میں یائے تحتانی کے سقوط کو معیوب فرمایا ہے۔ جس سے احتراز لازم ہے۔ البتہ شعرا یائے تحتانی ہندی کو گرانا معیوب نہیں سمجھتے ؎

ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے سارے جھگڑوں کا
زبان تیغ سے پیغام دوصفائی کا (امیرؔ)

"سارے" کی یائے تحتانی دبتی ہے۔

دُھوم تھی ان کی لن ترانی کی کیا کہیں ہم سے سامنا نہ ہوا (امیرؔ)

"کی" کی یائے تحتانی گر رہی ہے۔

(۳) — "الف کا گرنا جائز نہیں۔ ہندی کا الف جو آخر میں ہو وہ گرتا ہے۔ بعض شعرا نے جو ایسا کیا ہے۔ وہ قابلِ استناد نہیں کیونکہ اساتذہ کی طرف سے وہ ہمیشہ موردِ ایرادات رہے ہیں (خط بنام زاہدؔ سہارنپوری)

الف ہندی یہ الفاظ ہندیہ کے آخر اور مصرع کے درمیاں واقع ہوتا ہے۔ اس الف کے ماقبل ہمیشہ فتحہ ہوتا ہے جب الف گرتا ہے تو فتحہ بحال رہتا ہے۔ ؏

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے (ناسخؔ)

اتنا کا الف ودم گرا ہے۔ (کہ اتن فعُوْلُ) (فرما فِعْلُنْ)[3]

؏ اندھیرا چھایا ہے تاریک آج دُنیا ہے

اس مصرع میں (رہ سے رچا = مفاعِلُن) (یہ تاری = فَعِلاتن) اس میں "اندھیرا" اور "چھایا" کا الف ہندی شاعر نے گرا دیا ہے اور اس کا گرانا جائز ہے۔ عیب میں داخل نہیں۔ اسی طرح الف وصل کا گرانا بھی جائز ہے جیسے امیرؔ مرحوم کا ایک شعر ہے

میکدے میں کہیں پڑے ہوں گے!
شب جمعہ ہے آج امیرؔ کہاں

جیسے امیر کا الف (ہ اآج می = مفاعلن)

---

[1] عروض مصرع اولیٰ کے رکن آخر کو کہتے ہیں۔

[2] ضرب مصرع ثانی کے رکن آخر کو کہتے ہیں۔

[3] قواعد العروض از قدر بلگرامی ص ۴۳

اعراب

(۱) "قرن بفتحتین صحیح ہے۔ انوری ؎

دو قرن از کرمت بر دو جہاں برگ و نوا
تو چہ دانی کہ جہاں بتو چہ بے برگ و نواست

(خط بنام حکیم برہم)"

(۲) "(مدفن) بکسر فا لغتہً صحیح ہے۔ پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے۔ اچھا نہ معلوم ہو تو نہ کہئے۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا۔ خلد آشیاں نے موزوں کیا تھا۔ بہت چرچا رہا۔ مگر جیت انھیں کی تھی۔ کہ لفظ صحیح ہے (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

(۳) "چپقلش۔ بمعنی جنگ شمشیر۔ غیاث میں بفتحہ لام ہے۔ اور اردو میں بکسر لام ہے انبوہ کے معنوں میں۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

(۴) "زکریا بفتحتین و کسر را و تشدید یا ہے۔ اس میں کوئی تغیر اب تک نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ "ذکریا" ذال سے بالکسر لکھتے ہیں اور سکون ثانی و تخفیف یا کے ساتھ بولتے ہیں، محض غلط ہے۔ خواہ دہلی والے ہوں یا لکھنؤ والے۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۵) "نوش کا قافیہ خوب کہا۔ سبحان اللہ! خورد و نوش مستعمل ہے۔ فقط نوش اس محل پر زبان نہیں ہے اور کوئی عیب نہیں۔ مضمون اچھا ہے اور معناً درست ہے لہذا رہنے دیا[1] (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۶) "نشئے میں ی سے پہلے ہمزہ مقررہ چاہئے۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

نشا بفتح اول و سکون ثانی و ہمزہ و اینکہ بعد خط مستقیم خط کج منحنی نویسند بے جا است و اگر بالفرض نویسند با بالائے خطِ مستقیم نویسند تا اشارت شود کہ خطِ مستقیم دریں جا الف نیست بلکہ ہمزہ است و ایں لفظ را بر وزن سرائے گفتن غلط است و بصورت نشّہ نوشتن ہم خطا است (فرہنگ انندراج ص ۱۷۵ طبع لکھنؤ)

نشا اور نشئے کو عام شعرا فاع کے وزن پر کہہ رہے ہیں مثلاً

ع نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

لیکن اس کا استعمال جس طرح ناسخ نے کیا ہے وہ صحیح ہے۔

ع نشا ہے مجھ کو بادۂ خم غدیر کا

اور نشئے کی سند حضرت ریاض کا یہ شعر ؎

---

[1] حضرت زاہد کا یہ شعر مشاطۂ سخن (جلد اول) از صفدر مرزا پوری کے صفحہ ۵۹ پر اس طرح درج ہے ؎

روزی گر سے پھولوں کی پہنچی ہے اسے گھر   ہے میرے آبلوں کا لہو نوشِ نقشِ پا

نشے سے جھکی پڑتی تھی یوں بھی تری آنکھیں
چھیڑوں سے مری بوجھ بڑھا اور حیا کا

چند الفاظ کا محلِ استعمال

(۱) "مایقرا کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے جیسے کہیں فلاں شخص مایقرء ہے خوشنویس نہیں۔ اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نے نہیں سُنا۔ (خط بنام حکیم برہم)"

(۲) "(گھڑنا) اور (گڑھنا) دونوں صحیح ہے۔ مگر (گڑھنا) شعرا کے کلام میں نہیں پایا۔ فصحائے لکھنؤ (گھڑنا) کو ترجیح دیتے ہیں۔ رشک مرحوم نے جب گھڑی نہیں اور جڑی نہیں طرح کی تھی۔ تو مجھے یاد آتا ہے کہ شعرا نے گھڑی نہیں بھی ان معنوں میں کہا تھا رشک مرحوم کا یہ شعر ہے ؎

ڈھلے ہوئے ہیں سانچے میں یہ بھی بدن کی طرح
ہرگز سنار نے ترے زیور گھڑے نہیں

اور جیڑے بمعنی تنہا البتہ میں نے لکھنؤ میں فصحا سے نہیں سُنا اور کلام میں بھی نہیں دیکھا۔ (خط بنام عابد علی کوثر خیرآبادی)

گڑھنا کی مثال امانتؔ لکھنوی کا یہ مصرع ہے۔ ع

گھر میں زرگر کے گڑھے جاتے ہیں واں سونے کے طوق

اہل دہلی صرف گھڑنا بولتے اور لکھتے ہیں۔ فصیح الملک کا ایک شعر ہے ؎

سلسلہ بات کا بگڑتا ہے   نامہ بر بات جی سے گھڑتا ہے   (داغؔ)

(۳) "(مہیں) میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو۔ مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نہیں گزرا۔ حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت اسیرؔ مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا۔ اور میں نے بھی اسے دیکھا تو سوائے اپنے سہوِ نظر کے اور کیا کہا جائے۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

جس طرح تم ہی کو تمہیں۔ اور ہم ہی کو ہمیں کہتے ہیں۔ اسی طرح اس قیاس پر (میں ہی) کو بھی مہیں کہنا چاہئے۔ لیکن یہ لفظ تمہیں اور ہمیں کے مقابلے میں غیر فصیح ہے۔ اور کم مستعمل ہے۔ البتہ حضرت جلالؔ لکھنوی نے اسے استعمال کیا ہے ؎

جلایا کئے وہ شبِ وصل بھی   مہیں رات بھر شمعِ محفل رہا   (جلالؔ)

(۴) "قدس۔ الفاظ مثلثہ میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ عام نہیں ہے۔ بلکہ جس قدر اساتذہ نے تصرف کر لیا۔ اسی قدر جائز ہے۔ اور خواجہ نصیرؔ مرحوم کا کلام استناد کے لیے کافی نہیں ہے۔ قادر سخنانِ فارس نے کہا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ معہذا خواجہ نصیرؔ نے (قدس) بمعنی پاک نہیں کہا ہے۔ بلکہ قدس ایک شہر کا نام تھا۔ وہاں کے دشت کو کہا ہے۔ ع

اھد وحشی نے ترے دشتِ قدس کی تیلیاں

(خط بنام ناہدؔ سہارنپوری)"

(۵) "قرار بمعنی اقرار عربی فارسی میں نہیں ملتا۔ بغیر واؤ عطف قول قرار[1] کو جس طرح آپ نے اردو کر لیا ہے۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۶) "(دلیل) لفظ عربی ہے۔ (دمامیل) اس کی جمع ہے۔ (دنبل) صحیح نہیں۔ آپ کے قلم سے کسی جگہ یوں نہیں نکلا۔ لہذا اطلاعاً لکھ دیا۔"

پھر دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"(دنبل) کا فارسی میں صحیح ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ آپ نے جن لغات کا یعنی ہفت قلزم۔ تتمہ برہان قاطع کا حوالہ دیا ہے۔ میں بھی ان میں انشاء اللہ تعالیٰ دیکھوں گا۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

دمّل اور دنبل دونوں طرح سے لغت میں آیا ہے۔

(۷) "لفظ (ساگا) کی اصل (ساگھا) بمعنی جنگ و جدل ہے۔ میر تقی مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین و متاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔"

(۸) "(بھاکا) اصل میں (بھاشا) ہے۔ اور ہندی میں "شا" اور "کھا" کا بدلا ہوتا ہے۔ اُردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر بھاکا اور بکمتر بھاشا مستعمل ہے۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۹) "(آری) میرے نزدیک ہندی ہے۔ اس لیے عاری زچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں عین سے لکھنا خلاف اصول ہے۔ ہندی میں عین کہاں۔

(۱۰) (مسالا) معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا ہند ہے۔ جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی محل استعمال ہندیوں کے ہاں بھی ہے۔ عمارت کے لیے چونا سرخی وغیرہ۔ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گوٹا، پٹھا، بنت، کناری۔ کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ، بال دھونے کا مسالا، محرم کا مسالا، مسالے کا تیل۔ دلّی والے اصل کی طرف جاتے ہیں۔ مگر چونکہ زبانوں میں مصالح نہیں ہے۔ یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا۔ گرم مصالح ہو گیا۔ کرتی میں مصالحہ کم پڑا۔ اب کے محرم کا مصالحہ ہم کو نہیں ملا۔

اس لیے میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جس طرح مسالا بولتے ہیں اسی طرح لکھا جائے۔ اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے جیسا رشک نے اپنی لغت میں لکھا ہے۔

مسالا۔ میم مفتوح سین مہملہ و لام بالف کشیدہ ضروریات ہر چیز باشد کہ بدان ضرورت ضروریات رونق و لذت آن چیز شود و ظاہر ایں لغت از مصالح باشد۔

---

[1] مشاطۂ سخن (جلد اول) از صفدر مرزا پوری کے صفحہ ۶۳ پر یہ شعر اس طرح ملتا ہے ؎

تری بات کا بتِ بے وفا کوئی کیسے یقین کرے بھلا
کبھی اس سے وعدہ وعید ہے کبھی اس سے قول قرار ہے

اور اسی کی تقلید جلالؔ نے بھی اپنے لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے ؎

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحتِ دل پر
جو دیکھے آپ کے موباف کا مسالا سانپ

کالا سانپ اور پالا سانپ زمین ہے اور جانؔ صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں یہی بول چال تھی ؎

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا

(خط بنام مولوی نور الحسن صاحب مؤلف نور اللغات)"

(۱۱) "آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری رائے یہ ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں آنچل کہنا چاہیئے۔ اور قبا۔ عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں میں دامن کہنا چاہیئے۔ مگر شعر مبحوث عنہ کی تصحیح یوں ہو سکتی ہے کہ شعرا نے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے۔ چنانچہ اس کو میں نے امیر اللغات میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اور یہ دو شعر سند کے بھی آنچل کے لغت میں درج کئے ہیں ؎

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں میرؔ دریا کا اس کا پھیر ہے (میرؔ)
دھیاں دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ صبح نے منہ پہ لیا دامن شب کا آنچل (نسیمؔ)

(خط بنام قاضی محمد خلیل صاحب حیرانؔ رئیس بریلی)"

(۱۲) "کسر بفتحتین اردو ہے اور اس طرح مستعمل ہے۔ جس طرح داغؔ[1] نے کہا ہے "ایک آنچ کی کسر رہ گئی" "تھوڑی کسر باقی ہے۔" بے تکلف زبان ہے۔ کسر بفتح اول و سکون ثانی عربی ہے۔ جو بمعنی شکستن ہے۔ جیسے "کسرِ شان" "کسرِ نفس" وہ اس جگہ مستعمل نہیں ہے۔ جس جگہ بحث کی گئی ہے اور نہ اس کے معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ بہر کیف "کسر" اپنے مقام پر صحیح اور بول چال میں داخل ہے۔ (خط بنام منشی بشیر احمد خاں رئیس ملیح آباد)"

(۱۳) "(کیجئے) بحرؔ نے جو ایک شعر میں ؎

اب مجھ سے التیام کی باتیں نہ کیجئے
دل تم سے پھٹ گیا جگر افگار ہو گیا

مصرع اولیٰ میں کیجئے کے ساتھ خطاب کیا ہے اور دوسرے مصرع میں تم سے۔ یہ بحرؔ[2] پر موقوف نہیں۔ بلکہ اس زمانے تک اکثر

---

[1] اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا (داغؔ)
اب فلک درپئے آزار ہے کیوں کیا کسر تم نے اٹھا رکھی ہے (تسلیمؔ)

[2] شیخ امداد علی بحرؔ شاگرد ناسخؔ۔ محاورات اور ہندی الفاظ کو حسن کے ساتھ نظم کرتے تھے۔ بڑے پائے کے استاد تھے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں وفات پائی۔

معاصرین بحر جن کا شمار اساتذہ میں ہے۔ اس کے تارک نہ تھے۔ ان کے بعد متاخرین نے اس اختلافِ خطابات سے احتراز کیا۔ میں بھی انھیں تارکین میں سے ہوں۔ (خط بنام حکیم برہم)

اساتذۂ لکھنؤ ہی پر منحصر نہیں، شعرائے دہلی کے ہاں بھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مومنؔ دہلوی کا ایک مقطع ہے۔ ؎

مومنؔ "تم" اور عشق بتاں اے بندہ پرور خیر ہے
یہ ذکر اور منہ "آپ کا" صاحب خدا کا نام لو

(۱۴) "(خانۂ کعبہ) کا ترجمہ کعبہ کا گھر بالکل مستعمل نہیں ہے۔ نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے، ترکیب توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے۔ پھر کعبے کا گھر کیونکر دُرست ہوگا۔ آپ کسی سے لڑیئے نہیں اور سمجھئے کہ غلط ہے۔ ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر۔ اگر کوئی آپ سے پوچھتا ہے تو سمجھا دیجئے کہ میرا تو یہ خیال ہے۔ پھر وہ تاویلات کرے تو چُپ ہو رہیئے۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

(۱۵) "(باہم دگر) کی صحت میں کلام ہے۔ بایک دیگر ہو سکتا ہے۔ یا محض "ہمدگر" چاہیئے لکھنے۔ (خط بنام ناہدؔ سہارنپوری)"

تذکیر و تانیث

مذکر اور مونث کی ہیں بحثیں　　بڑا جھگڑا ہے یہ اُردو زبان میں　　(جلیلؔ)

(۱) "ایجاد مذکر ہے۔ سند کے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں۔ اور جابجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سُنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغؔ کا قول ہے کہ دلّی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں کہیں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ نسیمؔ دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارک بادِ مرگ
یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گُلستاں میں　　راتوں کو گیا ہے صیاد گلستاں میں　　(میرؔ)

اگرچہ اس شعر میں "ایجاد[1]" کا لفظ جس صورت سے آیا ہے وہ سند کے لیے پورے طور پر کافی نہیں ہو سکتا۔ مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے۔ اور ثقات کو بھی اسی طرح پڑھتے سُنا ہے۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

(۲) "(دشنام) زیادہ مونث ہے۔ مگر ایک جگہ ظفرؔ نے مذکر کہا ہے۔ فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے ؎

کسی نے جو حیدرؑ کو دشنام دی　　تو گویا پیمبرؐ کو دشنام دی　　(ناسخؔ)

---

[1] اے سحرؔ شعر بہت تم نے نیا کر کے کہا　　قوت آخذہ کے حصّہ میں ایجاد آیا　　(سحرؔ)

بارہا میں گیا ہوں نزدِ امام   کبھی مجھکو نہ دی کوئی دشنام   (ناسخ)

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے
خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہمکو
کاہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے   (ظفر)

(۳) "تو کی تذکیر و تانیث ہی کیا ؛ مگر جس محلِ استعمال کی رُو سے آپ پوچھتے ہیں۔ اس جگہ تو یہی کہیں گے کہ "اُس نے مجھے تُو کہا" لیکن اس سے تذکیر و تانیث تو کی نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ اس جگہ لفظ "لفظ" مقدر ہوتا ہے۔ جیسے اس نے مجھے عورت کہا۔ دیکھئے عورت قطعی مونث ہے۔ وقس علی ہذا۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۴) "مشتری ستارہ مذکر یا مونث ؛ واضح ہو کہ یہ ستارہ مونث ہے اور جہاں کہیں سخندانوں اور سخنوروں نے استعمال بتذکیر کیا ہے۔ وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے جس کو مشتری سے تشبیہہ دی ہے۔ جیسے ناسخ کے اس مطلع پر ؎

بُلبل ہوں بوستانِ جناب امیرؑ کا
روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

ان کے شاگرد رشید مرزا محمد رضا برقؔ نے جو مصرعے لگائے ہیں۔ اس میں قمری کو جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں بتذکیر استعمال کیا ہے تو بات یہی ہے کہ قمری کا مقصود نہیں ہے وہ تضمین یہ ہے ؎

پروانہ ہوں ازل سے سراجِ منیر کا   قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمنِ بے نظیر کا   بلبل ہوں بوستان جناب امیرؑ کا

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مُشتری کا لفظ آئے گا وہاں مشتری سے دولہا ہی مقصود ہو گا۔ جیسے قمری سے برقؔ کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے۔ زیادہ آپ سے ذکی اور فہمیدہ سخنور کو لکھنے کی حاجت نہیں۔ اگر تتبع کلام اساتذہ سے آپ کوئی سند مشتری کوکب کی تذکیر پائیے تو مجھے بھی لکھئے۔ تمام ہوئی یہ بحث۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

زبان و محاورہ

مضمون تازہ ہو کہ نہ تازہ ہو اے جلیلؔ   ایسا کہو کہ حرف نہ آئے زبان پر   (جلیلؔ)
ہاتھ میں سب کے ہے اُردوئے معلیٰ کا نشاں   منہ میں رکھتے ہیں زباں اسلئے ہیں اہلِ زباں   (مصحفی لکھنوی)

(۱) "(موتی کی لڑی[1]) کی سند آپ نے ایسی دی ہے کہ اب میں اس پر کچھ کلام نہیں کر سکتا۔ جنھوں نے مجکو منع کیا تھا جب انھیں کے ہاں موجود ہے تو مجھے کیا تامل ہے۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)

---

[1] اپنی تری موتی کی لڑی سے جو لڑی آنکھ   توڑے گی اب اے جان نہ اشکوں کی جھڑی آنکھ   (ناسخ)

(۲) "بھاتا[1] پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

(۳) "کھائے پھرتے ادھار ہم بھی ہیں۔ محاورہ معنی کا نہیں اور بندش بھی تعقید سے خالی نہیں۔ "کھائے پھرتے" ادھر اور "ہیں" اُدھر اور بیچ میں "ادھار ہم بھی" خوشنما نہیں۔ چاہیے رہنے دو۔ (خط بنام کوثر خیرآبادی)"

"ادھار دینا" اور "ادھار کھانا" محاورہ ہے۔ "ادھار کھائے ہوئے ہیں" "ادھار کھائے بیٹھے ہیں" سے زیادہ زبانوں پر ہے۔ کسی کا شعر ہے ؎

خرید لیں کسی یوسف کی جان بیچ کے آج
اسی پہ حضرت دل ہیں ادھار کھائے ہوئے

(۴) "(ڈھونڈھتا ہے) کی جگہ (ڈھونڈھے ہے) اب زبان نہیں ہے۔ قدما کہتے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۵) "(راہ باٹ) اردو میں راہ باٹ تو کوئی بولتا بھی ہے۔ فقط باٹ بمعنی انتظار تو زرا[2] بھی مستعمل نہیں ہے۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

باٹ ہندی ہے۔ لوہے پتھر یا پیتل کے وہ ٹکڑے جن سے ترازو یا کانٹے میں تولتے ہیں۔ گنجفہ اور تاش کے پتوں کی تقسیم کو بھی کہتے ہیں۔ راہ باٹ۔ باٹ کا روڑا۔ باٹ مارنا مستعمل ہے۔

(۶) "باٹ دیکھنا۔ راہ دیکھنے کے معنی میں فصحائے لکھنؤ و دہلی کی زبان نہیں۔ میر کا کہنا اس وقت سند نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت بولتے ہوں گے۔ اب کوئی نہیں بولتا۔ اور مخزن المحاورات چرنجی لال کا کیا اعتبار۔ اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہوئے ملیں گے۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ بہرحال (باٹ دیکھنا) کسی طرح صحیح نہیں۔ میں بھی آپ سے متفق ہوں۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

(۷) "(دامن نکلنا) (گریباں نکلنا) آستیں نکلنا ہر ایک صحیح ہے۔ (خط بنام دل شاہجہانپوری) کسی کا شعر ہے ؎"

گریباں کو میں روکوں یا سنبھالوں اپنے دامن کو
بڑی مشکل تو یہ ہے ساتھ ہی دونوں نکلتے ہیں

جنوں کے جوش میں دامن گریباں سے یہ کہتا ہے کہ دیکھیں تم نکلتے ہو کہ پہلے ہم نکلتے ہیں (جلیل)

وہ کیا پردے سے نکلے پیرہن کو جس کے غیرت ہو
ہوا چیں بر جبیں دامن جو دیکھی آستیں نکلی (امیر مینائی)

---

[1] بھا گئی کونسی وہ بات بتوں کی ورنہ نہ کمر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں (ناسخ)
متاخرین شعرائے لکھنؤ نے اس لفظ کا استعمال ترک کر دیا ہے (نور اللغات جلد اوّل ص ۶۶۵ طبع لکھنؤ)

[2] حضرت امیر "زرا" زے سے لکھتے تھے ذال سے نہیں۔

نون کا استعمال

"اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں۔ (خط بنام زاہد سہارنپوری)"

نظمِ اُردو میں شعرا نے نون کے استعمال کے چند قاعدے مقرر کئے ہیں۔

(۱) گلشن۔ مدفن۔ چلمن۔ زن۔ جن۔ من۔ بن۔ چمن۔ وطن۔ یہ وہ نون ہیں جو کبھی غنہ نہیں آتے۔ ان کے ماقبل حروفِ علت (ا۔ واو۔ ی) نہیں۔ تقطیع میں شمار ہوتے ہیں۔ اور زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔

(۲) وہ نون جو ناک میں بولا جاتا ہے۔ اور کبھی زبان پر نہیں آتا "نون غنہ" کہلاتا ہے۔ ایسا نون تقطیع میں نہیں لیا جاتا۔ جیسے ہاں۔ کہاں۔ وہیں۔ دھواں۔ کنواں۔ آنسو۔ رانڈ۔ سانڈ۔ بوند۔ مونگ۔ مانگ وغیرہ یا علامتِ واحد متکلم آؤں۔ جاؤں۔ کھاؤں۔ علامت جمع متکلم۔ کھائیں۔ لائیں یا علامت جمع مونث گھوڑیاں۔ روٹیاں۔ ساریاں یا علامت جمع مذکر مونث کی آنکھوں۔ شہروں۔ یہ نون جن لفظوں میں آتا ہے۔ اس کے ماقبل یا مابعد حرف علت ضرور ہوتا ہے۔ اس کا شمار تقطیع میں نہیں۔

(۳) وہ عربی فارسی الفاظ کا نون جو آخر لفظ میں حرف علت کے بعد آتا ہے اور ترکیب اضافی فارسی یا ترکیب عطف فارسی ہوتا ہے۔ اس کو بھی غنہ لکھنا چاہیئے۔ اس کا شمار بھی تقطیع میں نہیں۔ جیسے ؏

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے (غالب)
دورِ ساغر میں سبو پیرِ مغاں بن بیٹھا (امیر)
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی (اقبال)
خار دامن میں چبھتے ہیں گل و ریحاں کے عوض (جلیل)

حضرت امیر نے جو زاہد سہارنپوری کو اعلان نون کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ اس کی مثالیں اوپر دے دی گئی ہیں۔ ایک دفعہ اس مصرع پر

"فخرِ ہندوستان ہے گویا"

یہ اعتراض کیا گیا تھا۔ چنانچہ صفدر مرزا پوری مرحوم نے حضرت جلیل سے اس کے متعلق استفسار کیا کہ کیا "فخرِ ہندوستان" میں ہندوستان کے نون کا اعلان درست ہے یا معیوب۔ حضرت جلیل نے ان کو لکھا تھا۔ "اعتراض صحیح ہے۔ ہندوستان میں نون کا اعلان نہ چاہیئے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ اضافت فارسی آگئی ہے۔ اسی طرح واوِ عطف کے آجانے سے بھی اعلان نون ناجائز ہو جاتا ہے۔" (مرقع ادب از صفدر مرزا پوری جلد اوّل ص ۵۹)

لیکن کسی لفظ میں حرفِ علت (ی) واقع ہو۔ اور اس کے ماقبل فتح ہو تو اعلان جائز ہے۔ جیسے ؎

مالک کیا ہے تو نے جسے مشرقین کا
پروردگار واسطہ خونِ حسینؑ کا

(۴) اگر الفاظ عربی بہ ترکیب اضافی عربی ہوں تو نون کو بہ اعلان نظم کرنا بہتر ہے۔ جیسے عظیم الشان۔ فصیح البیان وغیرہ

کیونکہ عربی میں نون غنہ نہیں ہے۔

(۵) فارسی کے وہ تمام الفاظ جن کے درمیان نون ہے۔ اور ماقبل اور مابعد کوئی حرف علت نہیں۔ ہمیشہ بہ اعلان نظم کیئے جائیں گے۔ جیسے سکندر۔ سوگند۔ جنبانیدن۔ خندیدن وغیرہ۔ اسی طرح جن الفاظ کے ماقبل الف وصل متحرک آجائے۔ اور حرفِ نون درمیان میں واقع ہو۔ اعلان سے استعمال کئے جائیں گے۔ جیسے اندر۔ انجام۔ انجیل۔ اندیشہ۔ دن۔ (کلمہ تشبیہہ) وندادنہ ینابیع۔ ینگ وغیرہ۔

(۶) فارسی و عربی کے وہ اسما جن کے آخر میں نون ہے اور ماقبل کوئی حرفِ علت بھی ہے۔ اور وہ بغیر ترکیب اضافی و توصیفی ہیں تو ان پر اختیار ہے۔ چاہے نون غنّہ سے یا اعلانِ نون سے نظم کریں۔ لیکن خاندانِ امیر کے شعرا ایسے نون کو بہ اعلان نظم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جو الفاظ سہ حرفی ہیں وہ ضرور بہ اعلان استعمال کرنا چاہیئں۔ خون۔ آن۔ بان۔ جان وغیرہ کو بہ اعلان نظم کریں۔ جب ترکیب اضافی یا توصیفی نہ ہو۔ آسمان۔ مدفون۔ قانون۔ مخزون۔ قائلین ایسے الفاظ پر اختیار ہے چاہے اعلان سے نظم کریں یا اخفائے نون سے۔ حروف فارسی و جمع فارسی بہ اخفائے نون (غنّہ) نظم ہوں گے جیسے چناں چنیں خموشاں شاہاں۔ درختاں وغیرہ۔

(۷) وہ نون غنّہ جس کے بعد (ب) ہوتا ہے۔ اور وہ نون میم سے بدل جاتا ہے۔ تقطیع میں محسوب ہوتا ہے۔ جیسے انبہ۔ منبع۔ تنبول۔ سنبھالنا وغیرہ۔

(۸) وہ نون غنہ جو مشدد ہوتا ہے۔ اور لفظ کے درمیان میں آتا ہے۔ اس کے ماقبل کوئی حرف علت نہیں ہوتا۔ اور مابعد (گ) ہوتا ہے۔ ایسا نون شمار میں آتا ہے۔ اس کو بہ اخفا نظم کرنا معیوب ہے مثلاً رنگ۔ جھنگ۔ بھنگ۔ جنگ۔ پتنگ وغیرہ۔

(۹) نون مخلوط ہندی تقطیع میں نہیں لیا جاتا۔ جیسے مینہ۔ منہ۔ مہندی وغیرہ۔

(۱۰) ایک نون ہندی الفاظ کے درمیان آتا ہے۔ اور اس کے پہلے کوئی حرف علت نہیں ہوتا وہ تقطیع سے خارج ہے جیسے اونچ۔ سانچ۔ پانچ وغیرہ۔

(۱۱) ایسے مرکبات جیسے دیں دار۔ ایماں دار۔ احساں مند۔ احساں فراموش۔ فارسی میں بہ اخفائے نون نظم ہوں گے۔

(۱۲) چند الفاظ خاندان۔ جانور۔ خانماں وغیرہ بہ اعلان نون آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان خانہ اور دان سے مرکب ہے۔ اس ترکیب میں ہائے ہوز ساکت ہوگئی۔ اسی طرح جانور۔ جانہ اور ور سے مرکب ہے اور خانماں۔ خانہ اور ماں سے مرکب ہے۔ ان میں ہائے ہوز ساکت ہوگئی۔

تاریخ گوئی

(۱) "میں نے اب یہی مشرب اختیار کر لیا ہے کہ

(آئی اور آئے) (گئی اور گئے) سب میں دوہری (ی) خیال کی جائے۔ اور ہمزہ ۲ عدد لیے جائیں۔ پہلے میرا خیال تھا۔ کہ

"آئے" میں دس عدد اور "آئی" میں بیس عدد شمار کئے جائیں۔ مگر اب بعض وجوہ سے یائے معروف و یائے مجہول دونوں کے بیس عدد قرار دیے ہیں۔ اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے تو آپ بھی اختیار کیجئے۔ اور جلالؔ نے "آئی" میں دس عدد نہیں لیے۔ بلکہ بیس عدد لیے ہیں۔ البتہ بوسے میں (ی) نہیں لکھا ہے۔ واؤ کو اضافت دی ہے۔ چنانچہ دیوان میں بھی بغیر (ی) کے چھپوایا ہے۔ اور "افادۂ تاریخ" میں بھی اس سے بحث کی ہے۔ مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ (خط بنام مولوی نعیم الحق صاحب آزاد شیخپوری)"

"آئی" کے عدد اکیس لیے جاتے ہیں اور یہ درست ہے۔ جو مؤرخ آئی کے گیارہ عدد لیتے ہیں ان کا مشرب ضعیف ہے۔ البتہ "آئے" کی قیمت عددی کے متعلق اساتذہ کے دو مسلک ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ جب "آئے" بروزن فاع ہو تو اس کے گیارہ عدد لیے جائیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ جب "آئے" بروزن فعلن ہو تو اس کے اکیس عدد لیے جائیں اور ایسی یائے مجہول شوشہ دار لکھی جائے۔ اس بنا پر کہ تاریخ میں حروفِ مکتوبی معتبر ہیں۔

لیکن اصولی بحث یہ ہے کہ اردو زبان کے اشعار میں بیشتر بلکہ تمام تر عروض میں فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ اور فارسی زبان میں یائے مجہول اگر بلا اشباع ہو تو وہ فاع کے وزن پر ہوتی ہے۔ اگر بہ اشباع ہو تو فعلن کے وزن پر۔ مگر ان دونوں صورتوں میں یائے مجہول بلا اشباع بروزن فاع اور یائے مجہول بہ اشباع بروزن فعلن ایک ہی طرح لکھی جاتی ہیں۔ اشباعی حالت میں صرف اسے کھینچ کر پڑھتے ہیں اور بس۔ لہٰذا وہی قاعدۂ اشباع اردو الفاظ میں جاری رہے گا۔ یائے مجہول بلا اشباع اور بہ اشباع کو ان مثالوں میں سمجھئے۔ مثلاً

پائے مرا لنگ نیست

یہاں پائے میں یائے مجہول بلا اشباع بروزن فاع — اور

بجائے بزرگاں نشستن خطاست

اس مصرع میں بجائے کے آخر یائے مجہول بہ اشباع ہے۔ اور بجائے (فعولن) کے وزن پر ہے۔ لیکن یہ اشباع صرف تلفظ میں ظاہر ہوگا۔ یعنی کسرہ کھینچ کر پڑھا جائے گا۔ (کوئی مکتوبی علامت) شوشہ وغیرہ یائے مذکورہ پر نہ دیا جائے گا اور مشبع و غیر مشبع دونوں یائیں ایک ہی طرح لکھی جائیں گی۔

چنانچہ اردو میں بھی اسی کا تتبع کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ مصادر اردو سے علامت مصدر کے حذف کرنے کے بعد صیغہ واحد امر حاضر بنتا ہے اور اس پر یائے مجہول بڑھا دینے سے صیغہ واحد غائب اور واحد حاضر مضارع بن جاتے ہیں۔ جیسے مصدر آنا سے (نا) علامت مصدر دور کرنے کے بعد (آ) صیغہ واحد امر حاضر بن جائے گا۔ اور جب اس پر یائے مجہول بڑھائی جائے۔ تو صیغہ مضارع واحد غائب اور واحد حاضر دونوں بن جائیں گے۔ متقدمین یائے مجہول کے پہلے مضارع میں (واو) بھی بڑھا دیتے تھے۔ اور (آئے) کو (آوے) لکھتے تھے۔ مگر متاخرین میں قطعاً متروک ہے۔ ممکن ہے جو لوگ یائے مجہول مشبع پر شوشہ لگاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ہو کہ وہی (واو) ی کی صورت بدل کر دوسری (ی) کے لباس میں نمودار ہوا ہے۔ مگر یہ توجیہہ بالکل ضعیف اور ناقابل قبول ہے۔ درحقیقت اشباع کسرہ پر ان کو دوسری (ی) کا دھوکا ہوتا ہے۔

حضرت امیرؔ نے مذکورہ خط جس میں (آئے) کے اکیس عدد لینے کا حکم فرمایا ہے۔ مولوی نعیم الحق صاحب کو ۱۲؍اپریل ۱۸۹۴ء کو لکھا تھا۔ اس وقت ۱۳۱۱ھ تھا حضرت امیرؔ کی جس قدر تاریخیں ہمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں یائے مجہول مشبع اور غیر مشبع دونوں کے دس عدد شمار کئے گئے ہیں۔

(امیرؔ مینائی)	؏ گل کھلائے یہ داغ نے کیسے	(۱۲۹۶)	یائے مجہول مشبع
(״)	؏ قمر دو آئے ہیں برج شرف میں	(۱۳۱۱)	یائے مجہول غیر مشبع
(״)	؏ پائے گا یہ قبول کا خلعت	(۱۳۰۸)	״ ״ ״

جانشین امیرؔ مینائی حضرت جلیلؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ سے میں نے ایک دفعہ استفسار کیا کہ حضرت فصیح الملک نے "پائے" کے (۱۳) عدد اس تاریخ میں لیے ہیں۔

؏ قصرِ عالی پائے جنت میں امیرؔ (۱۳۱۸)

اور آپ نے اس تاریخ میں ؏

گھڑی توڑا بٹن سونے کے اپنے شاہ سے پائے (۱۹۱۲)

"پائے" کے (۲۳) عدد محسوب فرمائے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے تحریر فرمایا کہ پائے کے عدد دو طرح سے فن جمل میں لیے جاتے ہیں۔ اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ جب (پائے) بروزن (فاع) ہو تو یائے مجہول کو بغیر شوشے کے کتابت کر کے (۱۳) عدد محسوب کرنا چاہئے۔ اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جب (پائے) بروزن (فعلن) ہو تو یائے مجہول کو شوشے دار لکھ کر یائے مجہول کے شوشے پر ہمزہ بھی لکھنا چاہئے۔ اس صورت میں اس کے عدد (۲۳) ہوں گے۔

اسی طرح حضرت وسیمؔ خیرآبادی ارشد تلامذہ حضرت امیرؔ مینائی کی ایک تاریخ ہے۔ ؏

لب تسنیم کوثر آئے آئے (۱۳۴۰)

اس مصرع میں دوسرا (آئے) فعلن کے وزن پر ہے۔ لیکن اس کے بھی گیارہ عدد لیے گئے ہیں اکیس نہیں حضرت جلالؔ نے افادۂ تاریخ میں آئے کے گیارہ عدد لینے کا حکم فرمایا ہے۔ منیرؔ شکوہ آبادی (آئے) کے گیارہ عدد لیتے ہیں۔ ؏

اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے (۱۲۸۲)

کثرت رائے اسی قول کی موئید ہے کہ (آئے) کے گیارہ عدد شمار کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کبھی کوئی سخت ضرورت اس قسم کی پڑ جائے کہ کوئی عمدہ مادہ تاریخ یائے مجہول مشبع کے مبلغ عدد شمار کرنے سے کسی اُردو لفظ میں پورا ہوتا ہو۔ تو ایسی حالت میں یائے مجہول مشبع کو اُردو لفظ میں شوشہ دار لکھنا بکراہت جائز سمجھا جائے گا۔ اور اسے گویا (POETICAL LICENCS) سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ بربنائے قواعد صرفی یائے مجہول کے بحالت اشباع بیس عدد قواعد تاریخ گوئی کے خلاف ہے۔

مضمون چونکہ طویل ہو گیا ہے۔ اس لیے آخر میں اتنا عرض کر دوں کہ پرانے رنگ کے نام لیوا اب گنتی کے رہ گئے ہیں اور جو ہیں۔ انھیں بھی کوئی پوچھتا نہیں۔ اُردو شاعری کا موجودہ دور پرانے نظریات کی روشنی میں بے راہروی کا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ اب نہ تو زبان کے مرکز باقی ہیں اور نہ اُستادی شاگردی کا سلسلہ۔ اب یہ عالم ہے کہ جو جس طرح چاہے کہتا ہے۔

اور اگر کوئی معترض ہو تو یہ جواب دیتا ہے "کہ میں اسے یوں ہی جائز سمجھتا ہوں اور ہمیں اب قدما کی تقلید کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ دَور انفرادی آزادی کا دَور ہے" نہ صرف یہ کہ اُردو زبان اپنے مراکز سے کٹ گئی ہے۔ بلکہ شعر و ادب کے مرکز بھی اساتذہ سے یکسر خالی ہیں۔ چنانچہ وہ ادبی روایات جن کے علمبردار ہمارے قدیم اساتذۂ فن تھے یا تو ختم ہو چکے ہیں یا دم توڑ رہے ہیں۔ اور نہ کوئی کسی کی سند کو مانے گا۔ ابھی تک یہ موقع حاصل ہے کہ اہل فکر و نظر اس بڑھتی ہوئی بے راہروی کے سدِ باب کا طریقہ سوچیں۔ عظیم شاعری بغیر روایات کے نہیں ہو سکتی۔ ہماری شاعری کے زوال کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم قدما سے استناد کرنا ترک کرتے جا رہے ہیں۔ اس مضمون کا محرک یہی سبب ہوا۔ ہماری خواہش تھی کہ اساتذہ کا طریقہ مستند اہل نظر کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ پچھلے دَور کے اساتذہ فن نکاتِ شعر و سخن کی ترویج یوں کیا کرتے تھے۔

وقت کے ساتھ زندگی اور ادب کا رِشتہ

پروفیسر یوسف جمال انصاری

انگریز شاعر کپلنگ نے کہا تھا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور یہ دونوں مل نہیں سکتے۔"[1] اس مقولے پر مدتوں گرما گرم بحث ہو چکی ہے۔ بلکہ مشرقی مفکر اس پر خاصی لے دے کر چکے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کپلنگ مغربی استعمار کا علمبردار تھا۔ اس لیے مشرق و مغرب کا امتیاز در اصل مشرق کی مذمت اور مغرب کی توصیف پر مبنی ہے۔ حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ شاعر کا مقصد نہ توصیف ہے نہ مذمت۔ وہ صرف ایک بنیادی فرق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے سوچنے کا ڈھنگ اہلِ مشرق سے مختلف ہے۔ چنانچہ اپنے طرزِ فکر کے اعتبار سے مشرق مشرق رہے گا اور مغرب مغرب۔ اُن دونوں میں طرزِ فکر کی ہم آہنگی ممکن نہیں۔ مشرق و مغرب میں جہاں اور بہت سے امتیازات کئے جاسکتے ہیں۔ وہاں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ وقت کے متعلق ہم لوگوں کا اندازِ فکر یورپی اقوام کے اندازِ فکر سے مختلف ہے۔ یہ اختلاف کوئی موجودہ زمانے کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور شاید ہمیشہ رہے۔

یورپ کی ساری ترقی کا دارومدار اہلِ یورپ کے احساسِ وقت پر مبنی ہے۔ ایشیائی اقوام وقت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں مشرقی لسفہ روحانیات کی بنیاد ہمیشگی پر ہے اور وقت کی مثال مشرقی ذہن میں دائرے کے طور پر آتی ہے۔ گویا وقت ایک چکر کا نام ہے جو گزرنے کے باوجود بھی نہیں گزرتا۔ یعنی بظاہر تو حرکت اور تسلسل دونوں موجود رہتے ہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اس سے پہلے ہوا تھا۔ ہم ایک نقطے سے روانہ ہو کر چکر پورا کرنے کے بعد اُسی نقطے پر جا پہنچتے ہیں۔ اور یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس خیال کا عکس ہمارے مذاہب اور ہمارے درسہ ہائے فلسفہ و تصوّف میں بار بار ملتا ہے۔ مثلاً ایک مقولہ ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ واقعات کا ایک طرز (PATTERN) ہے۔ ہر تاریخی دَور اس طرز سے مطابقت کرتا ہے۔ اور جس قسم کے واقعات کا تسلسل گزشتہ دَور میں ہوا تھا۔ ویسا ہی آئندہ دَور میں بھی ہوگا۔ زندگی ایک چکّر کا نام ہے۔ چنانچہ حسرت موہانی کا شعر ہے ؎

ہے انتہائے شوق بھی اک ابتدائے عشق
پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

اریخی واقعات ایک دائرے کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے ؎

---

[1] بقول اقبال ؎

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ   وہاں بدلتا ہے لمحہ لمحہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

حسرت موہانی نے بھی اپنے شعر میں وہی بات کہنی چاہی ہے۔ جس کا اظہار اقبال نے فلسفیانہ انداز سے کیا ہے۔ غرض یہ کہ نہ صرف انفرادی زندگی بلکہ تاریخی ادوار بھی مشرقی ذہن میں دائرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اب ہم مشرقی مذاہب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہندومت اور بدھ دھرم میں آواگون یا تناسخ کا تصور بھی دائرے ہی کے مانند ہے۔ آواگون ایک چکر ہے۔ جسم تو جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ مگر روح نیا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ پھر وہی پیدائش زندگی اور موت۔ پھر ایک بار جسم خاک ہو گیا۔ پھر روح کو دوبارہ دنیا میں آنا پڑا۔ یہ ایک تسلسل ہے جو قائم رہتا ہے۔ غرض کہ زندگی ایک دائرہ ہے۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مگر صورت وہی قائم رہتی ہے۔ بایں ہمہ یہ سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ زندگی کا سفر اس چکر کے مانند ہے۔ جو کولہو کا بیل لگاتا ہے۔ زندگی کا سفر دائرے کی صورت میں سہی۔ مگر ہر دائرہ پچھلے دائرے سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ غالباً اس کی صحیح مثال وہ پہاڑی چکردار راستے ہیں۔ جن میں میلوں سفر کرنے کے بعد اگر ہم دیکھیں کہ ہم نے اپنے سفر میں کتنی ترقی کی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند گز اوپر پہنچ گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر دائرے پر دائرہ بناتے چلے جانا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی کو جا لینا ہمارے سفر کی منزل ہے۔ سب سے نیچے کا دائرہ اس صورت میں سب سے بڑا ہوگا۔ پھر بتدریج ہر دائرہ مختصر ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے پہنچتے دائرہ سمٹ کر ایک نقطہ ہی رہ جائے گا۔ آواگون اسی قسم کے چکروں کا ایک تسلسل ہے۔ نروان یا مکتی اس وقت حاصل ہوتی ہے۔ جب روح ذاتِ الٰہی میں جذب ہو جاتی ہے۔ الغرض ہندی الاصل مذاہب میں زندگی یعنی وقت کا تصور ایک دائرے کی شکل میں ہونا مسلّم ہے۔

فنا اور بقا کے تصورات بھی احساس وقت ہی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیشگی اس ذات کو حاصل ہے۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور موت اس ذات میں واصل ہو جانے کا نام ہے۔ چنانچہ مر کر فانی انسان کو بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ تصور ہندی الاصل مذاہب کا نہیں۔ یہ ایک خالص سامی الاصل تصور ہے۔ جس پر نصرانیت، مسیحیت اور اسلام کی بنیاد ہے۔ یہاں زندگی دائروں کے تسلسل کا نام نہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سامی الاصل مذاہب میں وقت کا شعور آریائی مذاہب سے کہیں زیادہ ہے۔ ازل اور ابد ایک سیدھی لکیر کے دو نقطہ ہائے آغاز و انجام ہیں۔ زندگی ازل سے چل کر ابد تک پہنچے گی۔ آغاز میں بھی بقا کا تصور موجود ہے اور انجام میں بھی۔ اور ان دونوں کے درمیان زندگی کا سفر ہے۔ دائرے کی صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وقت کے عمل میں تدریجی ارتقا موجود نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں بھی وقت مطلقاً ساقط نہ تھا۔ زندگی صرف ایک ہی دائرے کے چاروں طرف گردش کا نام نہیں تھا۔ بلکہ دائرے پہ دائرہ اور ہر دائرہ دوسرے دائرے سے ملتا ہوا۔ لیکن ذرا مختلف ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ دائرے مختصر ہوتے ہوئے ایک نقطے پر ختم ہو جاتے تھے۔ دائروں کا یہ تسلسل ایک ہی طراز پر مبنی سہی۔ پھر بھی وقت کا تصور قطعی طور پر جامد نہ تھا۔ بلکہ متحرک تھا۔ مگر سامی الاصل مذاہب میں مثال کے طور پر نصرانیت، مسیحیت اور اسلام میں زندگی کو وقت کے دائرے سے تشبیہ نہیں دی گئی ہے۔ یہاں وقت ایک سیدھی لکیر ہے۔ ہمارے دور کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

(رباعی)

گو میرا وجود ہے میانِ عدمین — مجھ سے رہتی ہے روحِ عالم بے چین
کہتا ہوں جو "یا غفور" ہنگامِ صباح — ہل چل ہوتی ہے درمیانِ قطبین!

یعنی ہستیٔ انسانی کی دونوں جانب عدم ہے۔ اور زندگی کا سفر ان دونوں نقطہ ہائے تصور کے درمیان جاری ہے۔ آپ چاہیں تو عدمین کو بقا سے تشبیہہ دے لیں۔ اور صبحِ ازل اور شامِ ابد کہہ کر پکاریں۔ البتہ سامی الاصل مذاہب کے پیرو ماضی اور مستقبل دونوں پر جتنا ایمان رکھتے ہیں اتنا شاید زمانۂ حال پر نہیں رکھتے۔ یہ غالباً ہمارے روحانی تخیّل کا آئینہ دار ہے۔ مذہبی طرزِ فکر میں خوابِ جنت بھی موجود ہے اور آخرت بھی۔ لیکن جب تک انسان دنیا میں رہتا ہے، امتحان و ابتلا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ غالباً اسی تصور کا یہ اثر ہے کہ ہم لوگ زمانۂ حال کی پروا نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں کہ دو دن کی زندگی ہے، بہرحال گزر ہی جائے گی۔ اس طرزِ فکر نے ہم کو زمانۂ حال کے شعور سے ایک حد تک بیگانہ کر دیا ہے۔ نصرانیت اور مسیحیت میں وقت کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی اسلام میں ہے۔ مردِ مومن کے لیے دنیا کوئی قابلِ ترک چیز نہیں۔ مردِ مومن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے ہاتھ میں دنیا۔ اگر ہم اپنی زندگی رضائے الٰہی کے مطابق بسر کریں تو دنیا کوئی قابلِ ترک یا قابلِ خوف مقام نہیں ہے۔ زندگی اگر رضائے الٰہی کے مطابق ڈھالی جائے تو وہ بامقصد ہو جاتی ہے اور اس کا ہر لمحہ قدر و قیمت سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ نصرانیت اور مسیحیت کے مقابلے میں اسلام نے وقت کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ ورنہ مسیحیت جس کی بنیاد گناہِ اوّلین پر ہے۔ وقت اور زندگی دونوں کو قابلِ ترک گردانتی ہے۔

اب ہم تصوف کے نقطۂ نظر سے وقت کے مسئلے پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ تصوّف میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ اسلامی تصوف پر بھی ہندی اور عجمی اثرات کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ تصوف کو اسلامی تاریخ کے ان ادوار ہی میں ہردلعزیزی حاصل ہوئی جب اسلامی سلطنت روبہ انحطاط تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوّف میں زوال آمادگی کے رجحانات پیدا ہو گئے۔ اور تصوف دنیاوی زندگی اور احساسِ وقت سے فرار کا ایک ذریعہ بن گیا۔ وقت دراصل ایک ارتقا کا نام ہے اور تصوف ایک انحطاط کا نتیجہ۔ چنانچہ صوفیوں کی باطنی تعلیمات آریائی مذاہب کی تعلیمات سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ مثلاً یہ کہ دنیا مایہ کا جال ہے۔ بےخودی، خودی سے بہتر ہے۔ معاشرتی اور شہری ذمہ داریاں دنیاداری کی طرف ترغیب دیتی ہیں۔ روحانی ارتقا کے لیے عزلت گزینی۔ گوشہ نشینی۔ گیان دھیان۔ خانقاہ اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں لگے رہنا ضروری ہے۔ خود مسیحیت پر بھی ویدانت کی بعض تعلیمات کا اثر نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے غالباً یورپین اقوام کا آریہ نسل سے متعلق ہونا ہے۔ علاوہ ازیں قدیم یونانی فلسفے پر ہندی طرزِ فکر کا گہرا اثر تھا۔ افلاطون کی تعلیمات میں ہندو مت کی تعلیمات کا پرتو پایا جاتا ہے۔ اور جب مسیحیت یورپ میں پھولی پھلی تو اس نے افلاطونیت کا اثر قبول کیا۔ اور ایک افلاطون ہی پر کیا منحصر ہے۔ یونانی طرزِ فکر میں عموماً جو عناصر ترکیب پا گئے تھے۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح مسیحی فلسفے میں بھی راہ پالی۔ اس طرح اسلامی تصوف پر جو ہندی، ایرانی، یونانی اور مسیحی اثرات پڑے انھوں نے ہمارے صوفیا کو وقت کی قدر و قیمت سے بیگانہ بنا لیا۔ اور زندگی کو قابلِ لحاظ چیز نہ سمجھا گیا۔ اس صورت میں اگر صوفیا کی تعلیم زندگی سے گریز اور وقت سے بے نیاز ہونا سکھائے تو مقامِ حیرت نہیں۔

وقت کے متعلق ایک مشہور قول ہے کہ زمانے کو بُرا نہ کہو اس لیے کہ زمانہ خدا ہے۔ بہرحال اگر یہ کہا جائے کہ وقت شیونِ الٰہی میں سے ہے تو غالباً محتاط اہلِ فکر کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہوگا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے زندگی کو بامقصد

---

[1] سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات (اقبالؔ)

قرار دیا ہے۔ اور اسلامی تعلیمات سے کہیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ زندگی کوئی آنسوؤں کی وادی ہے (جیسا کہ مسیحی عقیدہ ہے) یا دنیا مایہ ہے (جیسا کہ ہندو کا عقیدہ ہے) اسلام نے آخرِ زندگی کو بامقصد قرار دیا ہی ہے۔ مسیحیت نے بھی کم از کم خیر و شر کے درمیان تمیز کرنا سکھایا ہے چنانچہ عزلت گزینی اور خانقاہیت کے باوجود مسیحی طرزِ فکر میں حق و باطل کی تفریق موجود ہے اور ریاضت اور مجاہدے کے ذریعے خدا تک پہنچنے کا راستہ متعین کیا گیا ہے۔ ویدانتی طرزِ فکر میں خیر و شر کا یہ امتیاز واضح طور پر موجود نہیں۔ ان کے ہاں زندگی بہرحال قابلِ ترک ہے جتنے دن انسان جئے گا۔ اتنے ہی زیادہ گناہوں کا وہ مرتکب ہوگا۔ کرم کا فلسفہ یہ ہے کہ جیسا کرے گا ویسا بھرنے کے لیے وہ پھر دنیا میں آئے گا۔ چنانچہ گیتا میں سری کرشن جی نے یہ تلقین کی ہے کہ اچھے برے کو نہ دیکھیں۔ روح امر ہے۔ اس لیے اگر اپنے دوست کو یا دشمن کو قتل کر دو گے تو وہ دوست یا دشمن کوئی مر نہ جائے گا۔ مرنے والی چیز صرف جسم ہے۔ البتہ سری کرشن جی نے ہمہ اوست کا فلسفہ گیتا کے ذریعے سے ضرور اہلِ علم تک پہنچایا۔ نیکی اور آزادی کی تعلیم بھی دی۔ لیکن مقسوم پر اتنا زور دیا کہ نیکی اور بدی انسان کے لیے اختیاری نہیں۔ مہابھارت کی یدھ اور سانحۂ کربلا کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو قدیم ہندی اور اسلامی نقطہ ہائے نظر کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ مہابھارت میں بھی وہی صورت تھی جو کربلا میں تھی۔ یعنی جو لوگ اہلِ حق کہلاتے تھے وہ ان لوگوں سے جنگ آزما تھے۔ جو ان کے قریبی عزیز تھے۔ لیکن باطل پر قائم تھے۔ کرشن جی نے اہلِ حق کو یہ تلقین کی کہ باطل کے پرستاروں کا خون بہانے سے احتراز نہ کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا، جو تم ہو وہ ہی وہ ہیں۔ تم میں بھی اس نور کا پرتو ہے جس نور کا پرتو ان میں ہے اس طرح خیر و شر کے امتیازات بڑی حد تک مٹ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگرچہ کربلا میں بھی جنابِ حسینؓ کے مقابل وہ لوگ تھے جن میں سے بعض ان کے قرابت دار بھی تھے اور جنابِ حسینؓ نے بھی یہ کہا کہ اس وقت قرابت داری کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ حق پہ کون ہے۔ لیکن جنابِ حسینؓ نے حق و باطل اور خیر و شر کو واضح طور پر ایک دوسرے سے الگ اور ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اسلام نے زندگی کا ایک واضح اور متعین مقصد پیش کیا ہے۔ زندگی رضائے الٰہی کے لیے ہے۔ اقبال نے مردِ مومن یا قلندر کو مرکبِ ایام ہونے کی بجائے راکبِ ایام بنایا ہے۔ ایمان وہ ہے جو وقت کو فتح کر لے۔

یورپ کی مادی ترقی ہرگز ممکن نہ ہوتی۔ اگر اسلامی فلسفہ اہلِ یورپ تک نہ پہنچ چکا ہوتا۔ قدیم اہلِ ہند کے ساتھ بڑی قباحت یہ رہی ہے کہ انھیں تاریخ پر عبور نہ تھا۔ تاریخ ان کے نزدیک چند اساطیر کا مجموعہ تھی۔ جب تک تاریخی شعور نہ ہو، نہ زندگی بامقصد ہو سکتی ہے نہ اجتماعی ترقی ممکن ہے۔ ہندوستان میں تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں نے شروع کیا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا نام ابنِ خلدون کا ہے۔ جس نے تاریخ کا فلسفہ پہلی بار دنیا میں پیش کیا۔ ہندوستان کے مسلمان مورخین پر ابن خلدون کا اثر شروع ہی سے رہا ہے اقبال بھی ابن خلدون کے خوشہ چیں رہے ہیں چنانچہ "شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر" کا سبق اقبال نے ابنِ خلدون ہی سے حاصل کیا۔ ابنِ خلدون نے تاریخ کے ادوار کی صورت میں دیکھا اور چند نتائج مرتب کئے۔ جن سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ "تقدیرِ امم" کیا ہے اور قوموں کا عروج و زوال کس طرح رونما ہوتا ہے۔ تاریخ کا فن اصل میں وقت کے بہاؤ کو قلم بند کرنے کا دوسرا نام ہے جب تک تاریخ کا شعور نہ ہو، اجتماعی ارتقا کا حصول ممکن نہیں۔ تاریخ دانی مسلمانوں سے اہلِ یورپ نے سیکھی۔ اور انھوں نے یورپین اقوام کی اجتماعی زندگی اور ان کے عروج و زوال کے اسباب پر غور و فکر کیا۔

انسانی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ انسانی ترقی کی رفتار عالمِ فطرت کے ارتقا [illegible] سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ اگر

انسان فطرت سے ہم آہنگ رہتا۔ اور انسانی ترقی ارتقائے فطرت کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم فطرت کو ایک مخالف قوت قرار دیتے۔ یہ فلسفہ ہم کو مشہور انگریز ناول نگار ٹامس ہارڈی (THOMAS HARDY) نے دیا ہے۔ انگریز سائنسدان اور فلسفی ڈارون (DARWIN) نے انیسویں صدی کے وسط میں ایک انقلاب انگیز و اثر آفریں فلسفہ پیش کیا جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان بھی منجملہ دیگر حیوانات کے ایک حیوان ہے۔ انسان کوئی آسمانی مخلوق نہیں جو کسی گناہ کی پاداش میں زمین پر بھیج دیا گیا۔ بلکہ وہ بھی زمین ہی کی مخلوق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان نے دوسرے حیوان کی نسبت زیادہ ترقی کر لی ہے۔ ہارڈی نے اس خیال کو اپنی تصنیفات میں مرکزی حیثیت دے کر انسانی زندگی کا المیہ قرار دیا۔ ارتقا کا عمل تمام کائنات میں ایک ساتھ جاری ہے۔ اب اگر مخلوقات میں سے کوئی ایک مخلوق اس تیزی کے ساتھ ترقی کرے کہ ساری کائنات پیچھے رہ جائے۔ اور وہ خود آگے بڑھ جائے تو ایسی مخلوق کائنات کے ساتھ اپنی ہم آہنگی قائم نہ رکھ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ جہاں کہیں اسے ٹھوکر لگے گی وہ یہی سمجھے گی کہ ساری دنیا میرے خلاف ہے۔ زمین اور آسمان میرے دشمن ہیں۔ فطرت ایک اندھے کی لاٹھی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے خیالات ہمیں ہارڈی کے ناولوں اور نظموں میں ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر انسانی ترقی عالم فطرت کے ارتقا کے ساتھ ہم آہنگ رہتی، تو آج ہم اسی حالت میں ہوتے۔ جس میں دوسرے جانور اور چوپائے ہیں۔ اس صورت میں شاید ہم کو یہ محسوس کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ وقت کیا ہے؟ اور زندگی کس چیز کا نام ہے؟ ہم اپنی جبلی ضروریات پورا کرنے ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقت کا احساس انسانیت کے ارتقا کے لیے انتہائی ضروری بلکہ بنیادی ہے۔ یوں تو عالم فطرت میں بھی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لاکھوں برس پہلے جہاں سمندر تھے۔ آج وہاں وادیاں، پہاڑ اور ریگستان ہیں۔ اور اسی طرح جہاں آج خشکی ہے، وہاں سمندر بہتے تھے۔ دنیا کا جغرافیہ رفتہ رفتہ اور بڑی آہستگی کے ساتھ بدلتا جاتا ہے۔ البتہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی زلزلہ آیا۔ اور خشکی میں پانی اُبل پڑا لیکن ایسی تبدیلیاں شاذ ہی ہوتی ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ کوئی سو دو سو یا ہزار دو ہزار برس میں اتنا نہیں بدل جاتا کہ اس فرق کا آسانی سے احساس کیا جا سکے۔ اب ہم انسانوں کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں گے۔ ہماری اجتماعی زندگی اس سُرعت کے ساتھ بدل رہی ہے کہ عالم فطرت اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب سے چند صدی پیشتر یعنی قرونِ وسطیٰ میں رہن سہن کا کچھ اور ہی ڈھنگ تھا۔ پھر چند در چند ایجادات اس قسم کی ہوئیں کہ جاگیردارانہ نظام کی جگہ صنعتی نظام نے لے لی۔ کارخانے جاری ہو گئے۔ ریلیں چلنے لگیں۔ لوہے اور کوئلے جن خطوں میں موجود تھے، وہاں ترقی کی رفتار دوسرے خطوں سے زیادہ تیز ہو گئی۔ رفتہ رفتہ برقی قوت کا استعمال انسان کو معلوم ہو گیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایٹمی ایجادات ہونے لگیں اور دورِ حاضر کو ایٹمی دَور کہا جانے لگا۔ ہوائی جہازوں کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ آواز سے بھی تیز تر ہوائی جہاز بنائے جا رہے ہیں۔ فاصلے مٹ گئے۔ اس لیے ہم نے وقت پر فتح پا لی۔ اب ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں پہلے سے کہیں کم وقت صرف ہوتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ ایک برِاعظم سے دوسرے برِاعظم تک پہنچنے میں صرف چند گھنٹے لگتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ گھنٹے منٹوں میں بدل جائیں اور ہم چند ثانیوں میں بڑے سے بڑا فاصلہ طے کر لیں۔ ابھی سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ یہ وسیع و عریض دنیا مختصر ہو گئی ہے اور وقت انسان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہ بے مثال ترقی وقت کے احساس ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور قدیم یونانی اساطیر میں وقت ایک نگل جانے والا دیوتا تھا۔ بالفاظِ دیگر وقت

انسان کا دشمن تھا۔ یونانی اساطیر میں سے ایک روایت یہ ملتی ہے کہ وقت ایک انتقامی طاقت کا نام ہے۔ وقت کی تین دیویاں آئیں۔ ایک کا تعلق انسان کی پیدائش سے ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک دھاگا اپنے گچھے میں سے کھول دیتی ہے۔ اس کی دوسری بہن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے جو اس دھاگے کو ناپتی رہتی ہے۔ تیسری بہن کا تعلق انسان کی موت سے ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک قینچی ہے۔ اور وہ دھاگے کو کاٹ دیتی ہے۔ یہ دیویاں تقدیر کی دیویاں ہیں۔ لیکن در اصل یہ منتقم طاقتیں ہیں۔ اس روایت سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آسمانی قوتیں ہمیں مٹانے کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ یونانی اساطیر ہی میں ہمیں یہ خیال بھی ملتا ہے کہ وقت ہی انسان کو جنم دیتا ہے اور وقت ہی اسے نگل جاتا ہے۔ یعنی وقت کا تعلق فنا سے ہے نہ کہ بقا سے۔ یورپ کی موجودہ ترقی کو دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ وقت کے متعلق اہلِ یورپ کے خیالات کس طرح بدلے ہیں۔ آج کی دنیا میں وقت نہ تو کوئی نگل جانے والی قوت ہے نہ تقدیر کی منتقم دیوی۔ آج وقت انسان کا مددگار ہے۔ ایک اور طریق سے سوچا جائے تو وقت انسان کا مفتوح ہے۔ یعنی اہلِ یورپ بھی اُسی نتیجے پر پہنچے جس تک اسلامی طرزِ فکر ہمیں پہنچاتی ہے۔ اور اس کا حوالہ اقبال کی اس تشبیہ میں موجود ہے کہ مردِ مومن یا قلندر وقت کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے۔ البتہ یورپ کی ساری ترقی محض مادی ہے۔ مردِ مومن کے لیے وقت کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے رضائے الٰہی کے بموجب صرف کرے اور امرِ الٰہی کے بموجب جو لمحہ صرف کیا جاتا ہے وہ جاوداں ہو جاتا ہے۔ بقول حالی ؎

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اس کے برعکس اہلِ یورپ نے ارتقا سے مراد صرف مادی ترقی لی۔ یعنی جسمانی اور روحانی زندگی کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت تباہی کے غار کے دہانے پر کھڑی ہے۔ نہ معلوم کب کوئی تباہ کن جنگ چھڑ جائے۔ اور انسانی زندگی تو کیا چیز ہے۔ یہ کرۂ زمین ہی مٹ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی تباہ کن جنگ کے بغیر ہی سائنسی ایجادات کے سلسلے میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہو جائے یا ہم نظامِ شمسی کے توازن کو بگاڑ دیں جس کی وجہ سے کائنات تباہ ہو جائے۔ اگر وقت کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے اور وقت کو انسانی بہبود پر صرف کیا جائے تو وقت ہمارے لیے بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

یورپ کی اجتماعی زندگی میں کئی انقلاب آئے۔[1] سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں نہ صرف معاشی اور سائنسی انقلاب رونما ہوئے۔ بلکہ صنعتی اور مشینی انقلاب آئے۔ جنھوں نے اجتماعی اور انفرادی زندگی دونوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ احساس اور اقدار کی دنیا میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ وقت جس کا مصرف قدیم یونانیوں کے نزدیک ابدی حقائق پر غور و فکر کرنا تھا۔ اور جس کا مصرف قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کے زیرِ ہدایت روحانی ارتقا اور خدا شناسی ہو گیا تھا۔ اب صرف روپیہ کمانا زر و مال اکٹھا کرنا اور اشیائے صرف کی

---

[1] اس کے برخلاف مشرق میں ابدیت کا تصور بدستور کار فرما ہے ؎

میں بھی لافانی ہوں مثل وجہ ربِ ذوالجلال — دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو
وقت کے ہاتھوں پہ روشن شمع [illegible] شعلہ — [illegible] رات کو

تخلیق بن کر رہ گیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ وقت ہی "سرمایہ" ہے۔ گویا ہم وقت کو سرمائے کی ترازو میں تولتے ہیں۔ اس مادی دور میں وقت کو کامیاب طریقے پر صرف کرنا یہ ہے کہ اس وقت کے دوران میں ہم نے کیا کچھ پیدا کیا۔ ہمارے کارخانوں میں کتنی چیزیں تیار ہوئیں۔ ہماری پیداوار نے کتنی منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے بنکوں میں کتنے روپے کا اضافہ ہوا۔ اس طرح لحظہ بہ لحظہ ہم اپنی ترقی کو ناپتے ہیں۔ اس طرزِ فکر کا انجام یہ ہے کہ انسانی زندگی بھی خرید و فروخت کی ایک چیز بن کر رہ گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے مزدور باہم مل کر کتنے وقت میں کتنی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ اس پیداوار کے مطابق ہم ان مزدوروں کو اُجرت دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ کام اور وقت کا ہے۔ یعنی کتنے وقت میں کتنا کام سرانجام دیا گیا۔ پچھلے دَور میں جب غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی تو یہی دیکھا جاتا تھا کہ ان غلاموں سے کتنا کام لیا جا سکتا ہے۔ آج اگرچہ جمہوریت اور آزادی کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے۔ لیکن یورپ کی معاشرت میں جو اقدار کار فرما ہیں، ان میں بڑی قدر یہی ہے کہ مزدور کتنا کام کرتے ہیں۔ اور اس کام کی قیمت بازار میں کیا لگتی ہے؟ چنانچہ مزدور اور غلام میں دراصل کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ اعلےٰ روحانی اقدار یکسر فراموش کی جا چکی ہیں۔ ان کی بجائے مقداری پیمانے رائج ہو گئے ہیں۔ یعنی ایک مقررہ وقت میں کام کی جو مقدار حاصل کی جائے اسی کے مطابق کام کرنے والوں کو اُجرت دی جائے۔ اس طرح انسانی زندگی مشینی ہو کر رہ گئی ہے۔ کارخانے داروں کے نزدیک مزدور بھی کل پُرزے ہیں۔ جن کے احساسات سے کارخانہ دار کو کوئی تعلق نہیں۔ اس کو تعلق اگر ہے تو مزدوروں کے کام کی مقدار سے ہے۔ اس طرح وقت اپنی جگہ ایک قدر بن کر رہ گیا ہے۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک معنی میں وقت سُکڑ گیا ہے۔ جب زیادہ سے زیادہ کام تھوڑے سے تھوڑے وقت میں انجام دیا جائے گا تو یہی محسوس ہو گا کہ کام پھیل گیا ہے اور وقت سُکڑ گیا ہے۔ اسی طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلے طے کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں وقت کے اس طرح سُکڑ جانے سے یہ احساس غالب ہو گیا ہے کہ ساری دنیا ایک بڑا گاؤں ہے۔ مختلف برِاعظم اس کے حصّے ہیں۔ اور ممالک محلے۔ جو کچھ افریقہ یا امریکہ میں ہوتا ہے، اس سے ہم پاکستان میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پہلے یہ عالم تھا کہ ایک ملک میں جو کچھ رونما ہو، دوسرے ملک تک اس کی خبر پہنچنے کے لیے وقت درکار ہوتا تھا۔ بلکہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک بھی خبریں ایک عرصے میں پہنچتی تھیں۔ فاصلے اور وقت پر انسان کو جو عبور حاصل ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی بنا پر زمانۂ حال کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم ایک ہی لمحے میں ساری دنیا کے حالات سے خبردار رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک خراب نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ ہم اپنے ماضی اور مستقبل دونوں سے آزاد اور بے نیاز ہو گئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ حال ہماری توجہ کا مرکز و محور ہے۔ ماضی کے متعلق کچھ ایسا احساس ہوتا ہے گویا وہ ہماری نسل کی کہانی نہیں ہے۔ کسی اور ہی مخلوق کا تذکرہ ہے جس سے ہمیں کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ مستقبل کے بارے میں یقین کے ساتھ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی متعین منزل نہیں ہے۔ اپنے آباؤ اجداد سے ہمیں کوئی دلچسپی اگر ہے تو برائے نام ہے۔ یعنی ہم تاریخی ادوار سے بے نیاز صرف 'زمانۂ حال میں محو'، بلکہ ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اپنے ہی آپ میں مست ہے۔ اقبال نے ایک بار شکوہ کیا تھا۔ کہ فرنگ نہ تو خود بین ہے نہ خدا بین اور نہ جہاں بین ہے۔ کم از کم خود بینی اور خدا بینی سے موجودہ نسل کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ جہاں بینی کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں ہمارا رویّہ یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ تاریخ میں سے ہم بعض درخشاں لمحات کو چُن لیتے ہیں۔ یہاں یہ

یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ الگ الگ اور بکھرے ہوئے درخشاں لمحات کے ذخیرے کا نام نہیں ہے۔ تاریخ تو ایک مسلسل عمل ہے۔ تاریخ کو اگر ادوار کی صورت میں سوچا جائے۔ تب بھی تاریخی ادوار ایک مسلسل ارتقا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ نسل تاریخ کو ایک مسلسل ارتقائی عمل تسلیم نہیں کرتی۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے ماضی سے بے خبر نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ اس طرح اگرچہ بظاہر ہمیں تمام کائنات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ لیکن ہم اپنے ذوق کے مطابق چیزیں منتخب کر لیتے ہیں۔ اور انھیں کے ساتھ ہمارا لگاؤ قائم ہوتا ہے۔ خبروں میں ہم ایسی خبروں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں جن میں ہیجان انگیزی ہو۔ اس لیے کہ ہماری توجہ تمام کائنات پر یکساں نہیں ہو سکتی۔

دورِ حاضر میں انفرادی طور پر بھی ہمارا احساس پچھلے ادوار کے انسانوں سے مختلف ہے۔ آج کل انسان پچھلی روایات سے غیر متعلق ہو کر اپنی آزادی کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اپنی قوم یا اپنے اجداد کے کارناموں سے قطعاً بے تعلق ہو جائیں۔ خاندانی زندگی تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ ماں باپ اور بھائی بہن کی محبت، بیوی بچوں اور دوسرے اعزا کی ذمہ داری رفتہ رفتہ بے معنی الفاظ بنتے جا رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم محبت، اطاعت، ذمہ داری اور اسی قسم کی پرانی اقدار پر زور دیں تو ہماری انفرادی آزادی کا تصور مجروح ہوتا ہے۔ افرادِ خاندان کا آج کل یہ حال ہے کہ شوہر ایک جگہ ملازم ہے اور بیوی دوسری جگہ۔ بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں۔ بہت چھوٹے بچوں کو دایہ کی نگہداشت میں دے دیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات شوہر اور بیوی کی ملازمت مختلف نوعیت کی ہونے کی بنا پر ہفتوں گزر جاتے ہیں۔ اور انھیں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ بچے شفقتِ پدری اور محبتِ مادری سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی بچے آگے چل کر جب اپنے ماں باپ کے متعلق سوچیں گے تو شفقت و محبت کا کوئی لمحہ انھیں یاد نہ آ سکے گا۔ اس طرح خاندان مربوط نہیں رہ سکتا اور اس کا شیرازہ بکھر جانا لازمی ہے۔ خاندان یا کنبے کے افراد میں ربط و یک جہتی نہ ہونے کی وجہ سے انفرادی زندگی مایوسی اور محرومی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ ماضی کی طرف دیکھنے کو رجعت پسندی اور مستقبل سے آس لگانے کو روحانیت قرار دیا جانے لگا ہے۔ پھر کیا تعجب کہ ہمیں اپنی زندگیاں بے معنی نظر آنے لگی ہیں۔ ہم انفرادی طور پر بھی صرف لمحۂ حال ہی میں مست ہیں۔ غرض کہ موجودہ معاشرے اور تہذیبِ حاضر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نسل کی اجتماعی اور انفرادی زندگی صرف لمحۂ حال کی پرستش کا نام ہے اقدر ہے تو صرف اُس لمحۂ حال ہی کی جس میں ہم کوئی ایسا کام کریں۔ جسے دفعت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور جسے دولت کی ترازو پر تولا جا سکے۔ یعنی کتنا کام کیا۔ اور اس سے کیا حاصل ہوا۔ یہ طرزِ فکر جو پہلے یورپ سے مخصوص تھا۔ اب عالمگیر ہوتا جا رہا ہے۔ مشرقی ممالک جن میں قدیم اقدار کارفرما تھیں۔ اب اپنی قدامت سے شرمندہ ہیں۔ اور اپنے کو پسماندہ تصور کر کے اہلِ یورپ کی تقلید کو ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام دنیا صنعتی ترقی کی طرف مائل ہے اور جہاں صنعتی ترقی کم ہوئی ہے۔ زندگی کی دوڑ میں وہ ملک اتنا ہی پسماندہ تصور کیا جاتا ہے۔

غرضکہ وقت کا تعلق اجتماعی زندگی اور کلچر سے اتنا اہم ہے کہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ خود وقت اپنی نوعیت سے کیا ہے؟ اس پر غور کیا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق مختلف نظریات ہونے ممکن نہیں۔ وقت کی اصلیت پر کوئی قطعی حکم لگانا مشکل ہوگا۔ ایک بار کسی نے مشہور صوفی و عارف سینٹ آگسٹین سے پوچھا کہ "وقت کیا ہے"؟ انھوں نے جواب دیا کہ "اگر پوچھو گے تو میں نہیں بتا سکوں گا"۔ یعنی وقت کا احساس و ادراک ممکن ہے۔ وقت کی تعریف ممکن نہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وقت ایک طرزِ احساس کا نام ہے یا یوں

کہہ سکتے کہ تغیر و تبدل اور تسلسل کو ناپنے کا ذریعہ۔ بظاہر ایک وقت وہ بھی ہے۔ جسے ہم گھڑی گھنٹوں سے ناپتے ہیں۔ دنوں ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ جنتری اور گھڑی کے ذریعے سے جانا جاتا ہے۔ ہم اسے سائنسی یا طبیعاتی وقت کہہ سکتے ہیں لیکن یہ وقت اُس وقت سے مختلف ہے جسے ہم اپنے احساس کے ذریعے سے جانتے ہیں۔ اس طرح گویا بیک وقت کم از کم دو وقت موجود ہیں۔ ایک وہ جو گھڑی اور جنتری کے ذریعے ناپا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو احساس کے ذریعے ناپا جا سکتا ہے۔ پہلے کو خارجی اور دوسرے کو داخلی کہہ سکتے ہیں۔ فن کی دنیا میں جس وقت کا راج ہے۔ وہ داخلی وقت ہے۔ یعنی چیزوں کے گزرنے تغیر پذیر ہونے یا مسلسل ہونے کا احساس۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ گھنٹوں گزر گئے لیکن گھڑی دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چند منٹ بھی نہیں گزرے۔ عموماً خوشی کے لمحات بہت جلد گزرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف انتظار یا تکلیف کے لمحات بہت طویل محسوس کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ بات انفرادی احساس کی ہوتی ہے۔ خوشی کے لمحوں میں یہ عجیب وصف ہے کہ اگرچہ وہ بہت جلد گزر جاتے ہیں۔ لیکن پلٹ کر دیکھیے اور یاد کیجیے تو ان پر سوچنے میں ایک طویل عرصہ صرف ہوتا ہے۔ مثلاً ہم اپنے کسی عزیز دوست سے چند گھنٹوں کے واسطے ملاقات کریں تو وہ چند گھنٹے ایسا محسوس ہوگا کہ چند منٹ تھے۔ پھر ہم جب یاد کریں کہ ان چند گھنٹوں میں ہم نے کیا باتیں کیں اور کیا واقعات پیش آئے، تو یاد کرنے کا وقت پھیل کر کئی ہفتے بن جاتا ہے۔ انتظار اور تکلیف کے وقت جو کچھ ہوتا ہے، وہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی چند گھنٹے کا انتظار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہفتوں پر مشتمل تھا۔ پھر جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ان چند گھنٹوں میں کیا پیش آیا تو کچھ یاد نہیں آتا اور جو کچھ پیش آیا ہو۔ اُسے یاد کرنے کے لیے چند منٹ کافی ہوتے ہیں۔ طبیعاتی یا سائنسی وقت کا حال اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ اسے ہم احساس کے پیمانے سے ناپتے۔ بلکہ گھڑی اور جنتری کے ذریعے ناپتے ہیں۔ یہاں طبائع کا اختلاف بھی قابلِ لحاظ ہے۔ یعنی سوچنے اور تصورات کی دنیا میں غرق رہنے والے کے لیے گھڑیاں اور جنتریاں سب بے معنی ہیں۔ اس کی طبیعت روحانی ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کو ذاتی اور داخلی نقطۂ نظر سے سوچتا ہے۔ اس کیلئے وقت صرف ایک احساس کا نام ہے۔ اس کے برخلاف ایسے افراد جو عملی زندگی بسر کرتے ہوں وقت کو گھڑی اور جنتری ہی کے ذریعے ناپتے ہیں۔ عملی دنیا میں روحانیت کا گزر نہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک وقت کی قدر وہ کام متعین کرتا ہے جو اس وقت میں کیا گیا۔ نہ کہ محض انفرادی احساس۔ مشرقی طبائع رومان پسند ہوتے ہیں۔ موجودہ یورپ عمل پسند ہے۔

وقت کا تعلق ادب کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ موسیقی اور شاعری کا تصور وقت کے بغیر ممکن نہیں۔ چھاپے کی ایجاد سے پہلے شاعر اپنے کلام کو سامعین تک پہنچاتا تھا۔ شاعری کیونکہ بیان کی محتاج ہے۔ اس لیے شعر الفاظ مسلسل کا نام ہے۔ ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ اور ایک مصرع کے بعد دوسرا مصرع۔ بتدریج سامعین کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ ہر تدریجی عمل کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی حال موسیقی کا ہے۔ مغنی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ بتدریج کرتا ہے اور اس کے لیے اس کو وقت کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے مصوری اور بت تراشی میں وقت کی اہمیت نہیں۔ تصویر کے پردے پر جتنی چیزیں موجود ہوں انھیں بیک نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ شاعری اور وقت کا باہمی تعلق مسلّم ہے۔ شاعری کو ہم نے فنِ ادب کا نمائندہ شعبہ قرار دیا ہے۔ ورنہ دراصل یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ادب اور وقت میں ایک گہرا باہمی ربط ہے۔ کہانی کہنے کا شغل ابتدائے انسانیت سے انسانوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ تہذیب سے پہلے کے ادوار میں بھی ہم آسانی کے ساتھ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ہمارے اجداد دن میں شکار کرتے ہوں گے یا پھل توڑتے ہوں گے۔

یعنی غذا کا سامان مہیا کرنے ہوں گے۔ لیکن ہر کہانی شروع اسی طرح ہوتی ہے کہ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ" یا "کسی زمانے میں ایسا ہوا کہ" یعنی بنیادی طور پر کہانی کہنے میں وقت یا عہد یا دَور یا اس کے مترادفات کا استعمال ناگزیر ہے۔ وقت کے بغیر کہانی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ کہانیوں سے قطع نظر دنیا کی عظیم ترین شاعری یعنی رزمیہ و بیانیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے۔ تو ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رزمیہ اور بیانیہ شاعری وقت کے تصور کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طرح ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ادب یا شاعری کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اُسے سامعین تک پہنچانے کا ذریعہ وقت کے علاوہ کوئی نہیں۔ دوسرے یہ کہ کہانی سنانے یا قصص نگاری یا ناول نویسی میں یا رزمیہ اور بیانیہ شاعری میں وقت کا تصور ایک لازمی عنصر ہے۔ تمثیلی ادب میں دوہرے وقت کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ڈرامہ جو ہیرو یا دوسرے کرداروں کی زندگی کے پانچ سال پر محیط ہو۔ اس کو اسٹیج پر پیش کرنے میں پانچ گھنٹے یا کم و بیش صرف ہوتے ہیں۔ یہی حال کہانی یا ناول کا ہے۔ ایک وقت تو وہ ہوتا ہے۔ جو کہانی یا ناول یا ڈرامہ یا نظم کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اور دوسرا وقت وہ عرصہ ہوتا ہے۔ جس میں سامعین یا حاضرین تک وہ قصہ کہانی پہنچے۔ مثلاً ایک ناول جسے ہم نے ایک ہفتے میں پڑھا کسی ایسے شخص کی زندگی پیش کرتا ہے۔ جس کی پیدائش سے لے کر موت تک کا حال مثال کے طور پر پچاس برس کا عرصہ۔ اس ناول کے ذریعے پیش کیا گیا۔ اس طرح اس ناول میں یا کسی خاص ڈرامہ میں دوہرے وقت کا اصول کارفرما ہونا ناگزیر ہے۔ ورنہ ایک پوری زندگی کا حال چند گھنٹوں میں یا چند ہفتوں میں بھی سامعین یا قارئین تک کیونکر پہنچایا جا سکتا ہے۔

وقت کے مسئلے نے اہلِ فکر کو عموماً اور ادبا کو خصوصاً متاثر کیا ہے۔ وقت کے بہاؤ، خدا اور روح کی ہمیشگی۔ زندگیوں اور چیزوں کا گزر جانا۔ انفرادی یا اجتماعی زندگی میں ہر لحظہ تغیر و تبدل کا رونما ہونا اور اسی قسم کے مسائل ادب میں سموئے ہوئے ہیں۔ مثلاً وقت کو دریا سے تشبیہ دینا۔ حسن و شباب کو ہوا سے۔ زندگی کو دن اور موت کو رات سے مثال دینا ایک عام بات ہے۔ وقت کے ہاتھوں انسان کی بے بسی ادب کا ایک محبوب موضوع ہے۔ صنعتی ترقی کے دَور میں خاندانی زندگی کی تباہی۔ فردِ واحد کا احساسِ تنہائی و نامحرومی موجودہ ادب کے چند اہم موضوعات ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا تعلق وقت تک ساتھ ظاہر ہے۔

ڈاکٹر زورؔ صاحب

محمد اکبر الدین صدیقی

۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کی صبح اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ ڈاکٹر زورؔ صاحب کے بارے میں خبر ملی کہ وہ ۲۴ ستمبر کو ساڑھے آٹھ بجے شب سری نگر میں اچانک قلب پر حملہ ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

ڈاکٹر زور صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح کہ وہ رجائیت پسند تھے۔ مایوسی، بےکسی اور بےبسی کے الفاظ ان کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ انہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو اس سلیقے سے کر دکھایا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ گویا ڈاکٹر زورؔ صاحب مجسم عمل تھے۔ لوگ ۲۴ گھنٹے کا پروگرام بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کا پروگرام بنالیا تھا اور کام کئے چلے جارہے تھے۔ کہ کہیں سفینۂ حیات ساحل پر نہ آ لگے۔ یہ آج کل کی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ابتدا ہی سے یہ بات ان کی فطرت میں داخل تھی۔

میں بچہ تھا۔ ۸-۹ سال کا اور ڈاکٹر صاحب ۱۸-۱۹ سال کے ہوں گے۔ حیدرآباد کے ایک قدیم محلے شاہ گنج میں آبدارخانہ بشیرالدولہ سے پیچھے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ ان کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ جو ۱۲-۱۴ فٹ لمبا اور ۸-۹ فٹ چوڑا تھا درمیان میں ایک میز اور اس کے ساتھ ایک کرسی لگی ہوتی، پانچ چھ الماریاں کتابوں سے بھری دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ ۱۰-۵ تصویریں بھی ادھر اُدھر آویزاں تھیں۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوتے اور مختلف رسالے زبان۔ شباب اُردو۔ نگار۔ مخزن۔ تحفہ وغیرہ۔ یہ ڈاکٹر زور صاحب کی طالب علمی کا دور تھا۔ وہ ابھی گریجویٹ نہیں ہوئے تھے، لیکن اتنی زیادہ کتابیں جمع کرلی تھیں۔ اور اتنے رسائل میں مضامین لکھ کر نام آوری حاصل کرلی تھی۔ صرف مضامین ہی نہیں بلکہ نظمیں بھی۔ یہ نظمیں شعرائے عثمانیہ مرتبہ عبدالقیوم خاں باقی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ میں اس کمرے سے نچلی منزل میں اپنے والدین کے ساتھ بحیثیت ایک مہمان کے ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک مہینے کے قیام کے دوران میں نے انھیں کبھی گپ شپ اڑاتے، دوست، احباب میں وقت ضائع کرتے یا دن میں سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی کمرے میں پہنچا تو یا تو مطالعے میں مصروف نظر آئے یا لکھتے ہوئے۔ دسترخوان پر بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خوردن برائے زیستن پر عمل پیرا ہیں۔ جسمی تو انتہائی نحیف۔ دبلے پتلے۔ جو شیروانی پہنتے، ڈھیلی معلوم ہوتی۔ لیکن آواز میں گھن گرج تھی۔ طنطنہ تھا۔ رعب تھا۔

میرے والد کا وہ بڑا احترام کرتے اور ان سے اکثر فارسی شعرا اور حالیؔ اور سرسیّد وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی۔ یہ سب گفتگو میری سمجھ سے باہر ہوتی ناموں کے سوا اور کچھ پلّے نہ پڑتا۔ وہ کبھی افسانے سناتے اور کبھی نظمیں۔ مہینہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ ہم لوگ

واپس ہوگئے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب کی کتاب "روحِ تنقید" اور پھر "طلسمِ تقدیر" اور "فسانۂ تازیانہ" والد کے نام آئی۔ روحِ تنقید تو میرے لیے بیکار سی کتاب تھی۔ البتہ طلسمِ تقدیر اور فسانۂ تازیانہ کو دو تین بار پڑھا۔ سبب یہ کہ قصہ دلچسپ تھا اور ایک دیکھے بھالے شخص کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو اس میں حسن ہی حسن نظر آیا۔ قبح کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات تھی۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب گریجویٹ ہوگئے تھے۔ اس کے بعد رسالوں میں مضامین آتے رہے۔ سن ۱۹۲۷ء میں تنقیدی مقالات شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایم اے کی ڈگری ملی اور معلوم ہوا کہ وہ لندن جا رہے ہیں اور تین سال رہ کر ڈاکٹر ہوں گے۔ ان دنوں میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں حیدرآباد آیا تو سن ۱۹۲۹ء میں یعنی دو ہی سال بعد ڈاکٹر صاحب لندن سے واپس ہوئے اور تین مہینے کے اندر اندر لگاتار کام کر کے "اردو شہ پارے" شائع کی اور لندن واپس چلے گئے۔

ایسی مثالیں تو مل جائیں گی کہ کسی نے تین سال کی تعلیم کو دو سال میں مکمل کر لیا اور ڈگری حاصل کر لی۔ لیکن ایسی مثال ابھی تک ایک بھی نہ ملی کہ ایک طالب علم تین سال کے لئے لندن جائے دو سال میں ڈگری لے اور ہندوستان آکر تین مہینے میں بڑے سائز کے ساڑھے تین سو صفحات سے زائد کی کتاب تصویروں وغیرہ سے مزین چھاپے اور پھر الٹے پاؤں لندن واپس ہو کر تعلیم کی تکمیل کرے۔ اردو شہ پارے تاریخ دکنی ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اتنی گراں مایہ کتاب اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مصنف کو دکنی زبان کا ماہر اور ادیب بنا دیا ہے۔ سن ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب ماہرِ لسانیات بن کر لوٹے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈری پر تقرر ہوا۔ ان کی انگریزی کتاب ہندوستانی صوتیات اسی سال شائع ہوئی۔ جس سے اردو لسانیات کا ایک نیا باب کھلا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند اور نوجوان ساتھیوں نے جن میں سے چند نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی، ایک علمی انجمن قائم کی جس کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں۔ مضامین پڑھے جاتے اور ان پر تنقید کی جاتی۔ ان نوجوانوں میں میر خاں (میر نواز جنگ) ڈاکٹر مظہر علی خاں مسلم۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ڈاکٹر سیادت علی خاں۔ یٰسین علی خاں انجینئر۔ پروفیسر محمد علی خاں۔ پروفیسر سید محمد۔ عبدالرحمٰن شریف۔ عبدالرزاق راشد اور عمر یافعی شریک تھے۔ اس وقت حیدرآباد میں چند ایسے مقتدر حضرات بھی تھے جنہیں ان نوجوانوں کا اس طرح جمع ہونا اور علمی مباحثے کرنا پسند نہ آیا اور انہوں نے سر اکبر حیدری صدر المہام وقت سے ان کی شکایت کر دی کہ چند نوجوانوں نے ایک سیاسی انجمن بنائی ہے اور ریاست کے نظم و نسق کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ ان کا فوراً ہی تدارک نہ ہوا تو یہ ریاست کو لے ڈوبیں گے۔ حیدری صاحب نے سب کو فرداً فرداً جائے پر بلایا اور افہام و تفہیم کی۔ یہ انجمن برخواست ہوگئی۔ لیکن اس وقت ان نوجوانوں کو پتہ چلا کہ

ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اور ہمیں اپنے علمی کاموں کو تیز تر کرنے کے لئے کھلے بندوں کام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند ساتھیوں کے تعاون سے سن ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کیا جس کے حسب ذیل مقاصد تھے،

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور حفاظت۔

۲۔ سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ ملک کے نوجوانوں میں انشاء پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

۴۔ عوام میں [illegible]

۵۔ اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

۶۔ تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔

۷۔ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں۔ اور جس کا ایک حصہ ان کے لئے وقف رہے گا۔

ڈاکٹر زور صاحب نے ایک انجمن کو جو محدود وسائل اور گنجائش میں کام کر رہی تھی ٹوٹتے ہوئے دیکھا لیکن ان ہی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے علی الاعلان ایک بہت بڑے ادارے کے قیام کا اعلان کیا، جس کی بعد میں بارہ شاخیں بنائیں اور رفتہ رفتہ ان میں ایسے لوگوں کو بھی شریک کر لیا جو ان کے مخالف تھے۔ حتیٰ کہ حیدری صاحب خود ادارے کے سرپرست بن گئے۔ ان کے دل میں جو شبہات تھے دور ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

جب ادارے کا قیام عمل میں آگیا تو لوگوں نے بھی سمجھا اور ہم میں سے چند طلبا نے بھی کہ ادارے کا قیام ہوا کوئی کام۔ ذاتی مفادات ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ اور ہوشیار لوگ استحصال کے مختلف طریقے سوچتے ہیں۔ رقم جمع ہو گی۔ معتمد اور موسسین ادارہ کی کتابیں شائع ہوں گی۔ طلبا ین کو چھوڑ دیا جائے گا۔ استحصال اور جلبِ منفعت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن جب میر حسن اور مخدوم محی الدین کا ڈراما "ہوش کے ناخن" ادارے ی پہلی کتاب کے طور پر شائع ہوا تو ہم میں سے کتنوں کی گردنیں ندامت سے خم اور جبینیں عرقِ انفعال سے تر ہو گئیں۔ یہ کتاب پروفیسر عبدالرحمٰن خان سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام پر معنون تھی۔ جن کی موت پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی موت سے چند دن قبل لکھا تھا کہ:

> "وہ جامعہ کے ایک ایسے مزدور ثابت ہوئے جس کو عمارت کی تکمیل کے بعد ہی برخاست کر دیا جاتا ہے۔"

یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا۔ اپنے استادِ مشفق کی بارگاہ میں ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے بانیوں کے شاگردوں نے لکھی اور بانیوں کے استاد کے نام معنون ہوئی۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس کا دیباچہ لکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ——

> "اس سلسلے کی اشاعت و طباعت ممنونِ منت ہے بعض احباب کے مالی ایثار کی جنہوں نے ازراہِ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپے کا عطیہ عنایت کیا اور اس سلسلے کی بنیاد ڈالی۔ جو ممکن ہے کہ آج حقیر نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمام بڑے کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں۔"

سن ۱۹۳۴ء کی بات کو آج آپ سن ۱۹۶۲ء میں کسوٹی پر پرکھئے۔ ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے بنی ہوئی ادارے کی حسین و جمیل عمارت اور اس میں لاکھوں روپوں کا لاقیمت ذخیرہ جو اردو اور صرف اردو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان اس کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔ ادارے کی دو نہیں، چار نہیں بلکہ بارہ شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کے ارکین اور معتمدین الگ الگ تھے لیکن ہر بات کا فیصلہ ڈاکٹر صاحب پر چھوڑ دیا جاتا تھا اس لئے کہ فیصلہ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل۔ ڈاکٹر صاحب مشکل سے مشکل فیصلہ کر لے اور ان کو جن طریقوں سے عملی جامہ پہناتے وہ انہیں کا حوصلہ تھا انہیں کا دل گردہ تھا، کوئی دوسرا اس کا عشرِ عشیر بھی کرے تو اس کا پتا پانی ہو جائے۔ مخالفین رشک نہیں بلکہ حسد کے مارے ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے، کانٹے بچھاتے، پتھر نہیں بلکہ تودے کے تودے کھڑے

کر دیتے۔ لیکن وہ ایک ایسا سیلاب تھا کہ سب کو بہائے جاتا اور حاسد منہ تکتا رہ جاتا۔ عمل ہی میں ان کا یہ حال نہ تھا۔ وہ اپنے زورِ قلم سے بھی ہر شخص کو شکست دے دیتے۔ نہ کوئی ان کے برابر محنت کر سکتا نہ لکھ پڑھ سکتا۔ اس کی مثال سنیئے:

سن ۱۹۳۵ء میں "مرقعِ سخن" کی اشاعت کا فیصلہ ہوا۔ طے یہ پایا کہ دورِ آصفیہ کے سو شعراء کا تذکرہ لکھا جائے۔ لیکن عملی دشواری کے سبب پچھتر شعرا منتخب کئے گئے۔ پہلی جلد کے لئے پچیس اور دوسری کے لئے پچاس۔ شعرا کو انہوں نے اپنے دو احباب اور تینتیس طلبہ میں تقسیم کر دیا۔ پھر کالج میں جہاں اور جس سے مڈبھیڑ ہوئی تو انہوں نے پوچھا ——

"مضمون لائے؟" اور ایسے شدید تقاضے کئے کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر تمام مضامین وصول ہو گئے۔ اب مضامین پر تنقید شروع ہوئی۔ ہر ہر مضمون کی نوک پلک درست کی جانے لگی۔ کسی کو دوبارہ لکھ کر لانے کا حکم ہوا اور فوری تعمیل کی تاکید۔ تقاضوں میں کہیں نرمی برتی گئی کہیں گرمی۔ کسی کو گرمی سے پسورتا دیکھا تو پیٹھ تھپک کر اتنی حوصلہ افزائی کر دی کہ اس کی شکایت کا گلہ رندھ گیا۔

وہ پڑھانے سے زیادہ کام لینے میں استاد تھے۔ انہیں کام لینے کے ایسے ایسے گُر یاد تھے کہ اگر وہ سر سید کے معاصر ہوتے اور انہیں مل جاتے تو شاید سر سید ایک لمحے کے لئے بھی انہیں جدا نہ کرتے۔ کس سے کیا کام لینا چاہئے وہ بہت جلد تاڑ جاتے تھے اور اس سے وہ کام لیتے۔ ان کے کام کرنے والوں میں لادو بیل کی طرح کام کرنے والے بھی تھے اور ہرن کی طرح پھرتیلے بھی۔ وہ خود اس سے بڑھ کر پھرتیلے تھے۔ اگر ان میں اتنی چلت پھرت نہ ہوتی تو وہ اردو دنیا کے لئے اتنا بڑا کارنامہ نہ چھوڑتے۔ ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ علمی کام بھی رکا ہوا نہ تھا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب زیرِ ترتیب رہتی۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ خود ان کی ایک کتاب پریس میں ہے۔ دوسری کاتب لکھ رہا ہے تیسری کاتب کے انتظار میں ہے اور چوتھی زیرِ ترتیب۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ دو دو کتابوں کی ترتیب کا کام ایک ساتھ چل رہا ہے۔ چنانچہ شعرا کے کلام کے انتخابات اسی طرح تیار ہوئے۔ اور یہ سب یعنی "متاعِ سخن"، "کیفِ سخن"، "بادۂ سخن" ایک ہی سال ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے۔

شامتِ اعمال کہ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں اپنے خاندان کے بزرگوں اور علما کے حالات لکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے "لاؤ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔" ایک دو مضامین کے مسودے ساتھ تھے حوالے کر دیئے۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کتاب کب تک مکمل ہوگی۔

"دو مہینے!"

"جب تک تو قیامت آجائے گی۔"

"میں اس سے پہلے پیش کر دوں گا۔"

ایک مہینہ گزر گیا لیکن کام کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دن فرمانے لگے "چلو میرے ساتھ اور کتاب مکمل کر دو۔" میں ہاسٹل جا کر پلندہ اٹھا لایا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رفعت منزل پہنچ گیا۔ کھا پی کر وہ ادھر اپنی میز پر ڈٹ گئے ادھر میں نے ایک چھوٹی سی میز کرسی سنبھالی۔ دس بجے، گیارہ بجے، بارہ بجے، غنودگی طاری ہوئی۔ آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر اٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ صبح جلد اٹھوں گا اور کام پر جُٹ جاؤں گا۔ لیکن صبح جب اُٹھا ہوں تو ڈاکٹر صاحب اپنی میز سے لگے صفحے کالے کر رہے ہیں۔ ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھوں۔ دس دن ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر ہی رہا۔ یونیورسٹی ان کے ساتھ آتا جاتا رہا اور کتاب ختم کر کے حوالے کی۔ لیکن دس دن میں ایک رات بھی انہیں سوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ میرے بعد سوتے اور مجھ سے پہلے اٹھ جاتے۔ دن گزرتے گئے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے پروگرام میں سونے کے لئے وقت نکال لیا۔ جلد سوتے سویرے اٹھتے۔ دوپہر میں کچھ دیر بعد قیلولہ ضروری ہو گیا

تھا۔ اور یہ پابندیاں انہوں نے کچھ تو اپنی صحت اور کچھ اپنے جگری دوست، ہم جماعت اور فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ کے اصرار پر اور ان کی خاطر سے اپنے اوپر عاید کرلی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب طالب علمی کے دور میں پروفیسر وحید الدین سلیم کی نگرانی میں مجلۂ عثمانیہ نکالنے کے محرک اور پھر ایک سیڑھی بن چکے تھے۔ انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے سہ ماہی ترجمان مجلۂ طیلسانیین کی ادارت کی تھی، اب اپنا ادارہ قائم کرنے کے بعد وہ رسالہ کیسے نہ نکالتے۔ چنانچہ انھوں نے دو نوجوانوں صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش اور خواجہ حمید الدین شاہد کو منتخب کیا۔ ان کی کاوشوں سے جنوری سن ۱۹۳۸ء سے "سب رس" جاری ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس کے بعد "بچوں کا سب رس" نکلا اور پھر "سب رس معلومات" بھی۔ سب کے ایڈیٹر الگ الگ تھے لیکن نگران ایک۔ مجلسِ ادارت بدلتی رہی لیکن اب موت نے نگران کو چھین لیا۔ سن ۱۹۴۰ء تک اضلاع و قصبات میں ادارے کی ستر سے زیادہ شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اشاعتِ اردو کی غرض سے اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ملازم درجۂ چہارم سررشتۂ آبکاری اور افواج باقاعدہ کے لئے اس کا ابتدائی امتحان لازمی کروادیا۔ شرکت کرنے والے امیدواروں کی تعداد سیکڑوں سے ہزاروں تک پہنچی اور اس طرح سیکڑوں اور ہزاروں کو اردو داں بنا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہر کس و ناکس سے اپنے کاموں میں تعاون کرانے کا جو ملکہ تھا اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سن ۱۹۴۴ء میں یہاں ایک بڑی شاندار اور کل ہند اردو کانگرس منعقد ہوئی۔ اس قدر شاندار کانگرس ہندوستان میں اردو کے بارے میں شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ انتظام سب کچھ ڈاکٹر صاحب کے ذمے تھا، لیکن انھوں نے بڑے بڑے نوابوں، جاگیرداروں اور عہدہ داروں کا تعاون حاصل کیا۔ نواب ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ ان کے شاگرد تھے۔ ان سے کہہ کر بشیر باغ پیلس میں باہر سے آنے والے ذی مرتبت ارکان کے قیام کا انتظام کیا۔ بشیر باغ پیلس وہ قصر ہے جس کی زیارت بھی کسی کو نصیب نہ ہوتی تھی۔ اور ایسے قصر میں اردو کے امیرانِ کارواں نے قیام کیا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں پنجاب سے سر شیخ عبدالقادر، دہلی سے برجموہن دتاتریہ کیفی، علی گڑھ سے رشید احمد صدیقی اور مدراس سے افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق۔ تین تو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ رشید احمد صدیقی (خدا انہیں طویل عمر دے) اس کی تصدیق کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب کا کمال تو یہی تھا کہ رشید احمد صدیقی جیسے گھر گھسنے قسم کے آدمی کو انھوں نے حیدرآباد کھینچ بلایا۔ بابائے اردو تو یہیں تھے۔ غرض کہ حیدرآباد کی سرزمین اردو کے ان روشن ستاروں سے آسمان بن گئی تھی۔

ان سب کی خدمت کے لئے شاگردوں کا ایک جمِ غفیر کھڑا کر دیا تھا۔ جنگ کا زمانہ۔ پٹرول پر راشن، لیکن مہمانوں کے لئے موٹریں حاضر تھیں۔ حکومت سے کانگرس کے لئے پٹرول کے کوپن بھی حاصل کرلئے تھے۔ گویا اس وقت پٹرول بھی جوئے شیر سے کم نہ تھا۔ اور بے تیشے کا کوہ کن ساری دشواریوں پر قابو پاتا چلا جا رہا تھا۔

اب تک ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ حکومت کی کوئی امداد نہ تھی۔ کتابوں کی فروخت اور "سب رس" ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ یا پھر کچھ امتحانات سے مل جاتا تھا۔ ادارے کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا ڈرائنگ روم تھا۔ کام بڑھتا گیا۔ دفتر بھی پھیلتا گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے بنگلے سے متصل ایک چھوٹی سی عمارت جس میں پانچ کمرے اور ایک ہال تھا تعمیر کی اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔ اس سے پہلے اور بعد بڑی بڑی شخصیتوں نے ادارے کا معائنہ کیا تھا اور خوب خوب داد دی تھی۔ جب غلام محمد

وزیر فنانس حیدرآباد (جو بعد کو گورنر جنرل پاکستان) نے ادارے کا معائنہ کیا تو فرمایا ---

”زور صاحب جی چاہتا ہے کہ آپ کو خزانۂ عامرہ لے چلوں اور کہوں کہ جتنا روپیہ لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔“

اس کے بعد ہی انہوں نے ادارے کے لئے کافی رقم منظور کی جس کا سلسلہ کمی و بیشی کے ساتھ ابھی تک جاری ہے۔ حکومت آندھرا پردیش بھی جس نے ہندوستان میں اردو کے متعلق وسیع القلبی اور بالغ نظری سے کام لیا ہے ادارے کو گرانٹ دے رہی ہے۔ اس امداد کے بعد سے ادارے کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے اور کام کرنے والوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔

انسائیکلوپیڈیا کا کام بہت اہم تھا۔ علماء کے تعاون سے ایک جلد تیار ہو گئی۔ نمونے کے ستر صفحے چھپ گئے۔ لیکن جنگ، گرانی کاغذ کی قلت اور درآمد کی مسدودی نے کمر توڑ دی اور وہ کام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

ڈاکٹر حفیظ سید پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی نے خط لکھا کہ مجھے شاہ نعمت اللہ ولی کے مزار پر جو کتبہ ہے اس کے چربے کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں سن ۱۰۰۰ھ میں انتقال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کاغذ کا ایک تختہ ساتھ لیا۔ مجھے ساتھ بیٹھ جانے کا حکم ملا۔ اور ہم قلعۂ گولکنڈہ کے شمالی حصے میں نہایت خراب رستے سے ہوتے ہوئے ایک جگہ رکے۔ کچھ دور پیدل گئے، جہاں ایک چوکھنڈی نظر آئی۔ اندر مزار پر سنگِ سیاہ کا نہایت شاندار کتبہ لگا ہے۔ اس کا چربہ لیا۔ روضے کے خادموں سے گفتگو ہوئی۔ شاہ صاحب کی زندگی کے حالات خادموں سے بیان کئے۔ خادم دم بخود اور دنگ کہ ہم خدمت کرنے کے باوجود لا علم اور یہ لندن پلٹ ڈاکٹر صاحب درگاہ کی جزئیات سے واقف۔ کس نے کب، اور کیوں بنائی۔ صاحبِ مزار نے کیا کیا کتابیں لکھیں اور اب ان کی کون سی کتاب مرتب ہو رہی ہے۔

سن ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہوئے لیکن جامعہ عثمانیہ سے نکل کر اس کے نئے ملحقہ قائم کردہ دارالعلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے جائزہ حاصل کیا۔ انہیں اس کا افسوس تھا کہ اس سے ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی، کیونکہ اب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا سے ان کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اور سارا کام انہیں کو انجام دینا پڑے گا۔ ان کا خیال صحیح نکلا۔ وہ یونیورسٹی کیمپس سے باہر ہوگئے اور وہاں علمی ذوق کو مہمیز کرنے اور شوق کو تازیانہ لگانے والا کوئی نہ رہا۔ البتہ انھیں اس کالج میں آنے سے سہولتیں زیادہ حاصل ہوئیں اور ادارے کے کاموں کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ ان کے بہت سے شاگرد لیکچرار بن کر ان کے پاس پہنچے، اور انھوں نے ان سے خوب ہی کام لیا۔ اب طلبا کی بجائے وہ لیکچراروں ہی سے زیادہ کام لینے لگے۔ اگر کوئی پہلو تہی کرتا تو بری طرح اس کی خبر لیتے۔ عہدہ دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ بزرگ اور استاد کی حیثیت سے۔ اور کبھی نرمی پہ آجاتے تو لیکچرار بھی میاں اور بابا کی صف میں کھڑے نظر آتے۔ اور غصہ آتا تو بے وقوف، نامعقول اور نالائق بن جاتے۔ اور ان گالیوں کو شربت کا گھونٹ سمجھتے۔ کتنی شیرینی تھی ان لبوں میں جو پان کی لالی سے ہمیشہ سرخ رہتے۔

سن ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی نے دارالعلوم کالج کو چادر گھاٹ کالج سے موسوم کیا اور مقام بھی بدل دیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کو کچھ فرصت ملی، سکون ملا۔ اندرون شہر کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر آئے۔ تذکرہ مخطوطات کی دوسری تا پانچویں جلدیں۔ داستانِ ادبِ حیدرآباد پھر فرخندہ بنیاد حیدرآباد یہیں لکھی۔ لکھنے کا یہ حال تھا کہ لوگ آرہے ہیں، باتیں ہو رہی ہیں۔ سامنے کچھ کتابیں اور مخطوطے کھلے ہیں، باند

پانوں کا پاکٹ دھرا ہے۔ ایک پان نکالتے ہیں کھاتے ہیں۔ قلم بھی چلتا ہے۔ منہ بھی چلتا ہے اور زبان بھی چلتی ہے۔ لوگوں سے بھی باتیں ہوتی ہیں اور ٹیلیفون پر بھی اور تذکرۂ اردو مخطوطات جیسی اہم کتاب لکھی جاتی ہے۔ ان سب پر مستزاد دفتر کی مثلوں اور کودی کھاتوں پر بھی دستخطوں کا کام جاری ہے — ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ایک وقت میں ایک کام کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہر شخص ان کی طرح چوکھا وار کرتا رہے۔ اتنی ہمت کوئی اور کہاں سے لاتا۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کی اس رفتار کو دیکھ کر لوگ ہیبت کھا جاتے اور انگشت بدنداں ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد زعم قادری الرفاعی نے انتقال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی تدفین کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں رود موسیٰ کی طغیانی میں ان کے جد امجد سید شاہ عنایت اللہ غرق ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک بڑا قطعۂ اراضی خریدا اور والد کی قبر پر شاندار گنبد تعمیر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ ایک بہن اور ایک چھوٹے بھائی جلال الدین قادری اس گنبد میں آسودہ ہیں۔ وہ خود بھی یہیں رہنا چاہتے تھے لیکن گردشِ روزگار نے موقع نہ دیا اور یہاں سے ہزاروں میل دور سری نگر کے ایک شہرِ خموشاں "خانیار شریف" کے ایک گوشے میں جگہ پائی۔ اس گنبد سے متصل ڈاکٹر صاحب نے ایک خانقاہ تعمیر کی جس کا نام "خانقاہ عنایت اللہی" رکھا۔ اس میں ایک کتب خانۂ اسلامیات قائم کیا جس میں مطبوعات کے علاوہ فنِ تصوف پر مخطوطات کی بھی کافی تعداد محفوظ ہے۔ پھر اپنے بڑے صاحبزادے سید شاہ تقی الدین قادری کو اپنے والد مرحوم کی جگہ سجادہ نشین بنا دیا۔ ہر سال دھوم سے عرس ہوتا۔ قوالی کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ طرحی مشاعرے ہوتے اور تین دن بزرگانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین کی صحبت میں گزرتے۔

حکومت حیدرآباد، حکومت آندھرا پردیش بن گئی۔ لسانی بنیاد پر حیدرآباد کے تین ٹکڑے ہوئے۔ اس کو مدراس سے کچھ ملا اور میسور سے کچھ اور۔ حیدرآباد سے مدھیہ پردیش کو کچھ ملا اور بمبئی کو کچھ۔ لوگ واویلا مچا رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ کوئی نئی تقسیم نہیں بلکہ اصولی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ ماہر لسانیات داد نہ دیں تو اور کون دے گا۔

دیکھو طنز صحیح نہیں، اگر تمہیں تاریخ سے واقفیت ہو تو یہ بھی یاد ہوگا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کی حدود یہی تھیں اور موجودہ آندھرا پردیش کا پورا علاقہ اس کے زیرنگیں تھا۔ آج لسانی بنیادوں پر تقسیم میں اسی کی روح کارفرما ہے۔ چلو آؤ، اس کا عرس منائیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی جے۔

لیجئے یوم قلی منانے میں ڈاکٹر صاحب تن من دھن سے لگ گئے۔ اور ساتھیوں کی پرسکون زندگی میں ہل چل ڈال دی۔ گورنر سے لے کر ایک عام آدمی تک قلی قطب شاہ کا کلمہ پڑھنے لگا۔ سالار جنگ اسٹیٹ کے سیکرٹری عبدالوہاب صاحب سے کہا قلی قطب شاہ کا شاہی جلوس نکلے گا۔ نوبت نقارے ہوں گے۔ نشان کا ہاتھی ہوگا۔ ماہی مراتب ہوں گے۔ نقیب اور چوبدار ہوں گے۔ پھر قلی قطب شاہ کی جگہ ہاتھی پر صندل کی کشتی ہوگی۔ ہاتھیوں پر شاہی جھولیں ہوں گی۔ گھنٹیاں ہوں گی۔ سارا ساز و سامان ہوگا۔ پھر پالکی، نالکی، میانہ، ہوادار، بوچہ، رتھ اور بنڈیاں ہوں گی۔ غرض کہ جلوس کی ساری تفصیل سمجھا دی اور انہیں انچارج بنا دیا۔ وقتاً فوقتاً دیکھتے رہے کہ ہدایتوں پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں۔ گورنر صاحب سے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر جلسہ ہوگا۔ آپ صدارت کریں گے۔ میئر بلدیہ اور وزراء سے کہا کہ آپ لوگ جلوس کی قیادت کریں گے۔

اس سے بڑھ کر ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ قلعہ کا چپہ چپہ عوام کو بتلانے کے لئے گائیڈز کی تربیتی جماعت قائم کی۔ تاریخی پس منظر کے لکچرز پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے دیئے اور ادبی حالات پر ڈاکٹر صاحب نے۔ اور اس تربیتی جماعت کو قلعہ کا ایک ایک چپہ بتلاتے پھرے۔

دیکھئے! ہم اب قلعہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کمان میں تالی بجایئے تو بالاحصار پر سنیئے۔ آگے بڑھئے تو سیدھے ہاتھ پر نگینہ باغ تھا۔ وہ اس نیم کے درخت کے نیچے عبدالرزاق لاری اپنے گھوڑے سے گر کر بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ سامنے اس باؤلی سے جو نل نظر آرہے ہیں ان سے پانی اوپر لے جایا جاتا تھا۔ بائیں طرف یہ محل ہیں۔ یہ ابراہیم قطب شاہ کا محل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ یہاں پیدا ہوا۔ بھاگ متی اس کمرے میں رہتی تھی۔ وہ اس دیول میں پوجا کرتی اور قلی قطب شاہ اس سے لگی ہوئی اس مسجد میں نماز پڑھتا تھا۔ یہ محلات سے متصل دوسری باولی ہے۔ جب اورنگزیب کی فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو ابوالحسن تانا شاہ کی حرم سرا سے سیکڑوں عورتیں نکل کر اس میں کود گئیں ـــــ غرض ایک ایک اینٹ کی تاریخ اس طرح سمجھاتے گویا قلی قطب الملک سے ابوالحسن تانا شاہ تک کا سارا زمانہ انھوں نے دیکھا تھا۔ اس اعتماد کے ساتھ میں نے کسی کو پڑھاتے بھی نہیں دیکھا۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ ادارے کے کارنامے حکومت کی نظر میں وقیع ہوگئے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے امداد مانگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ہمایوں کبیر ادارے کے بارے میں سن چکے تھے، مرکز سے امداد دینے میں انہیں تامل نہ ہوا۔

عمارت بننی شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کے پاؤں میں گردش پرکار آگئی۔ اپنے گھر سے ادارے کی عمارت تک دن بھر میں بیسیوں چکر ہو جاتے ۔

اینٹ بھگاؤ۔ چونا باریک پیسو۔ ریت برابر ناپو۔ گولا لگا کر دیکھو اینٹ باہر نہ نکلے۔ معماروں کو ہدایت دیتے کبھی اردو میں کبھی تلنگی میں اور کبھی اوورسیر کو انگریزی میں۔

خدا خدا کرکے عمارت بنی اور آرائش کی باری آئی۔ دن رات سوچ رہے ہیں کہ کون سی چیز کیسی ہو۔ فیاض الدین صاحب سے مشورے ہو رہے ہیں۔ دلدار حسین صاحب سے تبادلہ خیال ہو رہا ہے۔ عبدالرحمٰن شریف صاحب سے رائے لی جا رہی ہے اور سب کی رائے کا خلاصہ بنا کر عمل کر رہے ہیں۔ طغرے لگانے اور میوزیم سجانے کی باری آئی تو نواب عنایت جنگ بہادر کو زحمت دی۔ نواب صاحب تشریف لائے مسلسل چار پانچ گھنٹے بیٹھے۔ جی بھر کے باتیں ہوئیں مشورے ہوئے۔ پھر تاریخ دہرائی اور ایوان سجنے لگا۔ ایوان کے اکثر و بیشتر نوادر خواہ وہ ہتھیار ہوں یا مواریہ، طغرے ہوں یا مخطوطات۔ نواب صاحب ہی کا عطیہ ہیں۔

افتتاح کے لئے بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر کے نام قرعہ پڑا کیونکہ عمارت کی تعمیر میں حکومت کشمیر کی امداد کا بھی دخل تھا۔ وہ آئے۔ بڑی شان سے افتتاح ہوا اور اردو کی ایک شاندار عمارت عالم وجود میں آگئی۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کے لئے اردو ہال کی تعمیر شروع ہوئی۔ بعضوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اردو ہال بن رہا ہے اور آپ بھی ایوان بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر دس ہال اور دس ایوان بن جائیں تو میں کہوں گا کہ گیارھواں ہال اور ایوان بننا چاہئے۔ اردو سے یہ عشق تھا ڈاکٹر صاحب کو۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی اردو میں بھی موجود ہوتے اور ہندی پرچار سبھا میں بھی۔ مہاراشٹرا منڈل میں بھی نظر آتے اور آندھرا سرسوتی پریشد میں بھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان اداروں کی تقریبیں ڈاکٹر صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ اور ڈاکٹر صاحب ادارے میں سب اداروں کے عہدیداروں کو مدعو کرتے ۔

ڈاکٹر صاحب کچھ اچھے مقرر نہ تھے لیکن ان کی شہرت ان کے کام اور ان کی مقبولیت نے بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انھیں کہیں جلسوں کی صدارت، یونینوں کے افتتاح اور مشاعروں کی صدارت کے لئے بلاتے۔ صرف مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی۔ ڈاکٹر صاحب کسی کی درخواست شاذ ہی رد کرتے، اس کا فائدہ انہیں یہ ہوا کہ اچھے مقرر بن گئے۔ تقریر کا انداز نہایت شگفتہ اور دلآویز ہوتا۔ بعض موقعوں پر ایسی دلکش تقریریں کی ہیں کہ بایدو شاید ہی ایسی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو۔ اس سلسلے میں وہ بمبئی، ناگپور، برہان پور، کرنول، اورنگ آباد اور بیدر وغیرہ بھی گئے تھے۔

چالیس پینتالیس سال کے نظر آنے والے زور صاحب ایک دم پچپن سال کے ہو کر وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو گئے۔ خیال ہوا کہ اب

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ادارۂ ادبیات اردو پر پوری توجہ صرف کریں گے لیکن کشمیر سے پروفیسری کی پیش کش ہوئی اور ساتھ ہی بخشی صاحب وزیراعظم کشمیر کا تقاضا۔ کچھ خانگی اور کچھ سرکاری باتیں۔ حیدرآباد میں خبر چھپی کہ ڈاکٹر صاحب کشمیر کی پروفیسری قبول کر رہے ہیں کوئی کتا پیسے کی خاطر جا رہے ہیں۔ جاننے والے کہتے وہاں بھی ادارہ قائم کرنا اور اردو کا گڑھ بنانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض شاگردوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ کو حیدرآباد نہیں چھوڑنا چاہئے۔ جب کہ آزاد اور اردو کے اداروں کے دو کام آپ کے ذمے ہیں۔ اردو کی خدمت کا جذبہ آخر انھیں کشمیر لے گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سری نگر میں اورینٹل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شرکت کے لئے لکھا۔ ڈاکٹر شریف النساء، مولوی غلام رسول، پروفیسر سید محمد اور میں نے ان کی دعوت پر شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے مہمان رہے۔ یونیورسٹی سے واپس ہوتے ہوئے ڈاکٹر شریف النساء سے کہا کہ تم کلیم پر کام کر رہی ہو چلو اس کی قبر کی زیارت کر لو۔ پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے اصحاب عفہ پہنچے جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے اسی عنوان پر اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ چبوترہ نہایت بلند، جو اب چو طرف سے گر گیا ہے۔ اس پر چڑھنا مشکل لیکن ڈاکٹر صاحب کے ذوقِ جستجو کے مقابلے میں ہر کوہ، کاہ اور ہر مشکل سہل، گویا اس قفلِ ابجد کا کھولنا ڈاکٹر صاحب ہی جانتے تھے۔ اگر انھیں مہلت ملتی تو وہ سری نگر کے بھی ایسے ہی مورخ بن جاتے جیسے گولکنڈے کے تھے۔

وہ خود بہت بڑے آدمی تھے۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن بزرگوں کا ادب بھی ان کے خمیر میں تھا۔ کئی بزرگ اس کی تصدیق کریں گے کہ حضرت جذب عالمپوری، علامہ حیرت بدایونی، حکیم دائسرائے وہن اور کئی دوسرے حضرات اکثر ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے اور ڈاکٹر صاحب اٹھ کر اور خم ہو کر ملتے۔ اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں ایٹ ہوم کے موقع پر خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین ایک میز پر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی غلام رسول صاحب کا ہاتھ پکڑ کے جا کے تعارف کرایا، آپ میرے استاد مولوی غلام رسول صاحب ہیں۔ جن سے میں اب تک بھی کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں۔ ایسے سعادت مند شاگرد کتنے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جانے کو تو کشمیر گئے لیکن دل ایوانِ اردو میں رہا۔ خطوں میں ہدایتیں ہیں۔ فلاں کتاب پریس کو دو۔ سب رس وقت پر نکالو۔ پروف ریڈنگ اچھی ہو۔ طباعت کا اہتمام کرو۔ دروازے کو پالش کراؤ اس کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ بارش کا موسم ہے۔ رسالے بھیگ نہ جائیں ان کا خیال رکھو۔ ہر کام سلیقے سے ہوتا رہے۔ تم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو مجیبہ صدیقی صاحب یا سکینہ صاحب سے مشورہ کرو یا مجھے لکھو۔ میرے پاس روز ڈائری آتی رہے۔ کوئی دن ناغہ نہ ہو۔ ......

ہمیں مشورے دینے والا، ہمیں زجر و توبیخ کرنے والا، پیٹھ ٹھپک کر حوصلے بلند کرنے والا، تھک جانے تک کام لینے اور کرنے والا۔ ادارے اور آزاد انسٹی ٹیوٹ کا بانی سیکڑوں شاگردوں کا استاد اور ہزاروں کا مرجع اعتقاد آج ہم میں نہیں۔ آج ہم اس کی قبر پر پھول بھی چڑھانے کے قابل نہیں۔ کہ وہ ہم سے ہزاروں میل دور سری نگر کے ایک شہر خموشاں خانیار شریف میں محوِ خواب ہے ؎

" آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے "

بنگلہ دیش

منظور الٰہی

اپنے خیالات کی بلندی کے سامنے میں عاجز ہوں۔ بسا اوقات یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میرے بلند آدرش ایک طرف رہ گئے ہیں جیسے ان کی ایک انانیت ہے اور میری دوسری، گو وہ میری سوچ میرے فکر کی تخلیق ہیں لیکن میں ان تک پہنچ نہیں پاتا، کثافت سنگِ گراں بن کے رستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ کیا ساری عمر اس کشمکش میں کٹ جائے گی؟

سورج ڈوبنے کو ہے لیکن زرد رنگ کی ٹکیا پہ اب بھی نظر نہیں ٹکتی بھبکتی ہوئی۔ بے نور ہوتی ہوئی ٹکیا جیسے شعلۂ جوالہ کے لبادے اتار اتار کے پھینک رہی ہو، منڈیر پر کبوتر تنہا بیٹھا ہے، سفیدے کی نازک ٹہنیوں پر ماتمی لباس پہنے ہوئے کوّے ڈوبتے دن پہ افسوس کناں ہیں (یا وہ آنے والی رات کی سردی سے خائف ہیں؟) پتنگ کا شکستہ کمنڈر ٹہنیوں میں اٹک کے رہ گیا ہے۔ دریدہ، اداس، اس کا سبز رنگ ملگجا ہو چکا ہے۔ شمالاً جنوباً گدھ حسبِ معمول سر جھکائے منتظر ہیں، وہ کس انتظار میں ہیں؟ دور فضاؤں میں دو پرندے علائقِ دنیا سے بے نیاز بسیط فضاؤں میں محوِ پرواز ہیں۔ میں جو علائقِ دنیا میں جکڑ کے رہ گیا ہوں، میرے افکار میرے آدرش مجھ سے کتنے بلند ہو چکے ہیں۔

میری دائیں طرف گیارھویں رات کا چاند بلند ہو رہا ہے۔ بائیں جانب شگوفوں سے لدا ہوا بادام کا درخت حسن کی تصویر ہے، صحنِ چمن آئینۂ حیرت بنا جامد و ساکت ہے پھولوں کا حسن پورے شباب پہ ہے ہلکے کاسنی پھول اتنے دیدہ زیب جیسے نقلی ہوں — موسمِ سرما کا آخری جھکڑ اور باد و باراں کا طوفان گزشتہ شب گزر چکا۔ آج شام فضا میں پاکیزگی ہے اور ہوا میں دلنواز خنکی، بوگن ولا کی بہار اپنا عروج دیکھ چکی۔ اب خال خال سُرخ پتیاں سبز شاخوں میں اٹکی ہیں، مچھلیوں کا تالاب خاموش ہے، سُرخ مچھلیاں سرکنڈوں میں دبک گئی ہیں۔

شاید ہر انسان کے اندر ایک SECRET RETREAT ہوتا ہے، ایک نہاں خانہ، جب ہم دُکھی ہو جاتے ہیں، جب ہم زمانے کی ٹھوکروں سے زخمی ہو جاتے ہیں جب ہم اور لوگوں کے زخم نہیں دیکھ سکتے تو غم زدہ ہو کر ہم اسی آماجگاہ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، وہاں رُوح اشانت ہوتی ہے جیسے کوئی جلتے ہوئے انگاروں پہ پانی چھڑک دے لیکن یہ دولت تب نصیب ہوتی ہے جب محبت کا جذبہ بیدار ہو، اپنے سے ماسوا کے لیے محبت، لیکن جب غم و غصہ حسد اور حقارت کی آگ سے وہ ہرے بھرے باغ جھلس جائیں اور روح ایک ٹنڈ منڈ چٹیل میدان رہ جائے جس پر سے کبھی لاوا گزرا تھا تو وہ SECRET RETREAT کہاں رہ جاتی ہے، پھر اس بدنصیب کی روح انگاروں پہ لوٹتی ہے اور اس کی تشنہ کامی کوئی بجھا نہیں سکتا۔

بنگلہ دیش کے فراق میں دل تار تار ہے اور ان گنجان آبادیوں کے لیے آنکھیں اشکبار، صدیوں سے بنگلہ دیش کے باسی [illegible]

بپھرے ہوئے دریاؤں کا مقابلہ کرتے آئے ہیں لیکن جب دریا میں تلاطم نہیں ہوتا، جب ہوا کا راہوار تا حدّت رفتار رقص کرتے ہوئے نہیں گزرتا تب بھی کہاں چین پڑتا ہے، مجبور انسان کے لیے دھرتی ماتا کی آغوش تنگ ہو گئی ہے۔ نانِ شبینہ کی محتاجی تو تب بھی رہتی ہے جب تھل اور چولستان کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سورج کی شعاعیں گویا آنکھیں خیرہ کرتی ہیں اور لگتا ہے ریت کے ذروں کو سراب کی جھیلیں بنا دیتی ہیں تب بنگلہ دیش کی شادابی دل میں اتر آتی ہے اور آنکھیں اس سہانے خواب کی یاد سے نمناک ہو جاتی ہیں جو برسوں پہلے دیکھا تھا۔

بنگلہ دیش سے مجھے واپس آئے ہوئے عرصہ گزر چکا ہے مگر چشمِ تصور میں آج بھی سب کچھ میرے سامنے ہے ——— ایک یاد کے بعد دوسری یاد ——— ایک خواب کے بعد دوسرا خواب!

میں نے کہیں پڑھا تھا ——" ابتدائی زمانے میں پرتگالی بحری قزاق آئے۔ انھوں نے اہلِ بنگال کو بڑی مشکلات میں مبتلا کیا۔ ان کی سفاکی کی داستانیں عام ہیں، پھر بھی یہ کہنا کہ پرتگالیوں نے اس ملک میں صرف لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ ہی کی غلط ہوگا ——" اور یہ بھی ——" پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی شکست ایک بڑا سانحہ تھا۔ حکومت گئی، وقار گیا، اقتدار گیا، سختیاں ہوئیں، لیکن برطانوی دہشت پسندی سے بنگالی مسلمان کا سر نہیں جھکا۔ ان کے سینے میں ۱۸۵۷ء تک بے اطمینانی کی آگ بھڑکتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر سے برطانیہ کا اعتماد اٹھ گیا۔ نہ صرف مسلم عوام مصیبتوں میں مبتلا ہوئے بلکہ انھیں سیاسی اور معاشی دونوں حیثیت سے کچل دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔"

انگریزوں سے شدید نفرت ہی کا یہ باعث تھا کہ اہلِ بنگال نے یہ نعرہ لگایا کہ ——" فرنگی کا ایجوکیشن نہیں لینا۔ فرنگی کا ایجوکیشن نہیں لینا" ——— انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم کی طرف رجوع نہ کرنا، بدقسمتی کی ابتدا ہی تو تھی۔ اس سے فائدہ وہاں کے اہلِ ثروت طبقہ نے بھی اٹھایا۔

کارنوالس بہادر کا دوامی بندوبست یہ تھا کہ زمیندار واجب المحصول رقم کا دسواں حصہ اپنے پاس رکھے گا باقی خزانۂ عامرہ میں جمع کرائے گا۔ زمیندار اگر کچھ بھی وصول نہ کر سکے تب بھی پوری رقم جمع کرائے گا ورنہ غروبِ آفتاب سے پیشتر اس کی زمینداری نیلام کر دی جائے گی۔ بنیوں منشیوں کی چاندی ہو گئی۔ زمینداروں سے روپیہ لے کر وہی زمینداریاں اغیار نے خرید لیں اور یوں بنگال کا نقشہ بدل گیا۔ زمین آسمان بدل گئے، زمین تنگ ہو گئی آسمان دور ہو گیا، نیل کے فرنگی تاجر اور نئے زمیندار، یہ تھے چکی کے دو پاٹ جن میں عوام پستے رہے۔

بنگال بیدار ہے۔ اسے آپ محض اتفاق نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ سیاسی شعور، یک جہتی اور اجتماعی مسائل پر تدبر آج کی بات نہیں ——— تحریکِ خلافت کے دوران گرام میں ولایتی کپڑا جلایا گیا، پچاس سال اِدھر یونین بورڈ کی تشکیل سے سیاسی بیداری ہوئی۔ اسکول کمیٹی، ڈسپنسری کمیٹی کی روایت قائم ہوئی۔ یہ اجتماعی ادارے کسی فردِ واحد کی ملکیت نہ تھے۔ یہاں کے مسائل باہمی صلاح مشورے سے طے ہوتے تھے۔ شروع بیسویں صدی میں تقسیمِ بنگال، ایجی ٹیشن، ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی تاسیس، سب باتوں میں بنگال پیش پیش رہا۔

گرام گرام گھوم کے مولوی فضل الحق نے خود اعتمادی کے دیے جلائے، بجھے ہوئے سینوں میں ایک نئی جوت جگائی، عزم و توانائی، استقامت اور ولولہ، اس مردِ خود آگاہ نے بنگال کو بہت کچھ دیا۔

سُندربن کا پُراسرار اور بے حد خوبصورت جنگل، جنگل کیا تھا ذخیروں اور راہیوں کی بوقلمونیاں تھیں، پانی اور جنگل پُرشکوہ دریا اور سائیں سائیں کرتے ہوئے خود رَو درختوں کے جھنڈ، دریا سے دریا ملتے ہوئے، دریا کو دریا کاٹتے ہوئے پُرپیچ و تاب کھالی اور دونوں طرف جنگل کا جادو، نیم خوابیدہ، نیم بیدار رنگا رنگ کے پرندے، دُخانی بجرے کی آواز سے ہرن چوکڑی بھرتے ہوئے گھنے ذخیروں میں گم ہو جاتے لیکن کچھ دور دوسری ڈار پانی پینے کے لیے لبِ ساحل موجود ہوتی۔

بیتے ہوئے سال چیئرمین یونین کونسل کے چہرے پہ جھرّیاں ڈال گئے تھے، اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور اس کی بالوں میں پختگی کی جھلک۔

"آپ نے بڑی ہمت کی خود پرائمری سکول اور فرسٹ ایڈ سنٹر تیار کر لیے۔"

"آپ جانیں پرائمری سکول بنانے کی ہمت تو یہاں سب کر لیتے ہیں چاہے اس کے لیے ہر کھانے پر ایک مشت چاول ہی پس انداز کیوں نہ کرنا پڑے۔"

"یہ چھوٹے بڑے بند بھی لوگوں نے خود بنائے ہیں؟"

"جی یہ گزشتہ دو سال میں ہی بنے ہیں، سمندر کے پانی نے ہماری زمین کا بیشتر حصہ ویران کر دیا تھا، متعدد سال لوگوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ کوئی پیداوار ہی نہ تھی، ان دو سالوں میں میں نے لوگوں کی ہمت بندھائی اور ہم نے مل جل کر بند بنا ڈالے، زمین کا بیشتر حصہ پھر سے زیرِ کاشت آ گیا۔"

"تو دو سال پہلے چیئرمین یونین کونسل کون تھا؟"

"جی گزشتہ پندرہ سال سے میں ہی چیئرمین ہوں۔"

"تعجب ہے یہی لوگ تھے آپ ہی چیئرمین تھے، تب بھی آپ نے کئی سال تکلیف اٹھائی، یہ بند اس وقت تیار کر لیے ہوتے۔"

"سچ پوچھئے تو چاروں طرف بد دلی اور مایوسی کا دور دورہ تھا، ہم لوگ بے حس ہو گئے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ سب تباہ ہو رہے ہیں، کوئی کسی کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار نہ تھا، اب دو سال سے ایک نئی امنگ، ایک نیا جذبہ کارفرما ہے، ہم سمجھتے ہیں اجتماعی کام میں ہمیں انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل ہے، خود میرے بوڑھے بازوؤں میں طاقت آ گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے چیئرمین کا کشادہ سینہ کھنچ گیا اور وہ بوڑھے سپاہی کی طرح اٹین شن ہو گیا جسے اپنے فرض کا احساس ہو۔

قدرت کی فیاضیاں اپنی جگہ تھیں اور اس کے ستم اپنی جگہ آئیے دونوں کا نظارہ کر لیں۔ اسی "نظارے" میں تو اہلِ بنگال کی قسمت سوتی اور جاگتی ہے۔

تیتولیا کا دریا، پندرھویں رات کا چاند، آشن کا مہینہ، دریا کا دایاں کنارا پارے میں یوں نہا گیا تھا کہ نظر نہیں ٹکتی تھی، سینۂ دریا پہ منعکس لہریں جھلمل جھلمل کرتی تھیں۔ اس اور دریا کا پاٹ اداس اور ویران پڑا تھا، چاند کو ہلکے پھلکے سفید بادلوں نے گھیر لیا تھا بادلوں کے حلقے میں قوسِ قزح کے پیارے رنگ سمٹ گئے تھے، چند لمحوں کے لیے ہلکا نیلا رنگ غالب تھا جو بھلا معلوم ہو رہا تھا پھر نارنجی پھر چاند بادلوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

چاند اور دریا کی یہ عجیب دنیا ہے، یہاں کے باسی پورنماشی کے چاند اور ایک دم اندھیری راتوں سے گھبراتے ہیں، ان کا کہنا ہے ایسے میں ضرور دریا میں ہلچل ہوتی ہے، ضرور کوئی آفت آتی ہے۔

WATERY MOON SHEPHERD'S WARNING

جب چاند گدلا ہو گڈریے کو چاہیے اپنے ریوڑ کی حفاظت کر لے۔

صاحبِ نظر کو چاہیے اپنے دل کی حفاظت کر لے۔

آرٹسٹ کو چاہیے اپنے رنگ تلاش کر رکھے کیونکہ چاند کے گرد اگرد خوبصورت حلقے ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ وقت بدلتا رہتا ہے، موڈ بدلتا رہتا ہے اور اس لمحۂ گریزاں کو الفاظ یا رنگ میں مقید کر لینے کی خواہش تشنہ رہ جاتی ہے اور وہ لمحۂ گریزاں پھڑپھڑاتا ہوا کہیں دور نکل جاتا ہے!

مثل نپولین "بوڑھا شیر" میں نے شیر اس وقت بھی دیکھا تھا جب متوسط العمر تھا۔ بڑا ماتھا، کھلتا ہوا مسکراتا ہوا چہرہ، ادب سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن جہاں ملاقات ہوتی ہمیشہ یہ سوال ہوتا تھا: "آج کل کہاں ہو؟" میں بڑے ادب سے جواب دے دیتا لیکن دوسری تقریب پر ملاقات تک یا تو شیر بھول جاتا یا برسبیلِ تذکرہ وہی سوال دوہرا دیتا۔ دراصل شیر نیک دل انسان تھا۔ اب سُندر بن کے جنگلوں میں رائل بنگال ٹائیگر تھا اور سنگھاسن پر بوڑھا شیر، تب بھی چند بال سفید ضرور تھے لیکن اب مونچھیں سفید ہو چکی تھیں اور سر کے بال کھچڑی تھے، وہی ہنستا ہوا کھلتا ہوا چہرہ، وہی پیار کی نظر ہر کہ و مہ کے لیے، امیر و غریب کے لیے۔

شیر کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں لیکن ہیلی کوپٹر نہ آنا تھا نہ آیا، تنگ آ کر ہم جیپ لے کر دوسرے مستقر پر پہنچے تو دیکھا حب الوطنی کے نشے میں سرشار شیر پبلک میٹنگ میں دھاڑ رہا ہے، جنوبی اضلاع کا ساحلی علاقہ پانی کی بارہ فٹ اونچی دیوار کی زد میں آ گیا تھا بلکہ ایک دو جزیروں پر پانی کی دیوار کا تسلط چند گھنٹے رہا تھا۔ پھر ہوا کا ہلاکت خیز طوفان اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا تھا۔ شیر ان سب لوگوں کو دلاسہ دے کر ان کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک، ساحلِ سمندر سے ساحلِ دریا تک سبز ٹاپوؤں سے روندی ہوئی بستیوں تک یہ سب اس کی بے پناہ انرجی کی زد میں آئے تھے۔ ہیلی کوپٹر، ہوائی جہاز، دُخانی کشتی اور ریل گاڑی کے ذریعے۔ ماحضر کی سادگی کے لیے میں نے معذرت چاہی تو شیر بولا: "نہیں یہ بہت کافی ہے۔ کل اور پرسوں تو اتنا چکر رہا کہ میں اور گیلیو نے لنچ کے بجائے ایک پیالی چائے پر اکتفا کیا۔" بھوری مونچھوں والا وجیہہ گیلیو نارمنڈی کا رہنے والا تھا اور ہیلی کوپٹر کا پائلٹ تھا۔ اب شیر تیسرے مستقر پر جانے کے لیے مستعدی دکھلا رہا تھا۔ "تو آؤ ہیلی کوپٹر میں بیٹھو، تم تو پائلٹ اور میرے درمیان آ جاؤ گے۔" شیر کی اور میری سیٹ مشترک تھی بمشکل ہم دونوں اس میں سما سکے۔ ہیلی کوپٹر کے اوپر والے بڑے پنکھے کی گردش تیز ہوئی، تماش بین آگے پیچھے ریلا کر رہے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ ہیلی کوپٹر بھی کچھ CLEARANCE چاہتا ہے، جب ہیلی کوپٹر اڑا تو گھاس پھوس کے تنکے تیز ہوا کے جھکڑ سے منتشر ہوئے، اب کچھ لوگ سراسیمگی کے عالم میں پیچھے ہٹے، کچھ بیٹھ گئے، ایک دو نے سائیکل کی آڑ میں پناہ لی لیکن بڑے پنکھے کی تیز گردش الاماں! ظاہر تھا کہ اگر کوئی بدنصیب زد میں آ گیا تو پنکھا فرانسیسی گلوٹین سے کہیں زیادہ مؤثر ہو گا، بیٹری چیک کرنے کے بعد پائلٹ نے لیور اپنی طرف کھینچا اور ہیلی کوپٹر آہستہ سے ہوا میں بلند ہونا شروع ہوا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ذرا پیچھے ہوا پھر عموداً ہوا میں بلند ہو گیا۔ ہیلی کوپٹر کا خول سیلولائیڈ کا تھا اور دائیں بائیں دروازہ نہ تھا جیسے مکان تیار ہو لیکن کوئی دروازے لگانا بھول گیا

ہوا ہیلی کوپٹر ناریل اور بام کے جھنڈوں سے ذرا اونچا اڑ رہا تھا۔ نیچے ندی نالے تھے اور دھان کے عریض کھیت، دریاؤں کے لاتعداد دھارے لے BEND جیسے اپنی جلالی قوتوں کے سامنے خود اپنی کمر خم ہوتی جا رہی ہو۔ بنگال کے لوک گیت دریاؤں کی قہرمانی اور غیظ و غضب کا ذکر کرتے ہیں اور کس طرح جفاکش لوگ ان سے نبرد آزما ہوتے ہیں لیکن دریا ذریعۂ زندگی بھی ہے، ہیلی کوپٹر اڑا جا رہا تھا، ساکن تالابوں پہ کنول کے پھولوں کی دبیز چادر تھی، طوفانِ باد نے دھان کی بالیاں زمین پہ لٹا دی تھیں۔ سپاری کے جھنڈ تہس نہس کر دیے تھے، ٹین کی چھتوں کی پھکی اڑا دی تھی، بام کے ریشے سے بنے ہوئے مکان اب خس و خاشاک کا انبار تھے۔ میں اپنے علاقے کے لیے امداد چاہ رہا تھا۔ میں نے اشارے سے کہا، "دیکھیے جھکڑ کی وجہ سے فصل کا ایک حصہ زمین بوس ہو گیا ہے ان لوگوں کا کافی نقصان ہوا ہے۔" شیر بولا۔ "برخوردار! ذرا سوچو ان جزیروں کی کیا حالت ہوتی ہو گی جہاں پانی کی چودہ فٹ اونچی دیوار پون گھنٹہ تک بہتی رہے، جو لوگ نکل گئے ہیں ان کے پیچھے اب کچھ بھی نہیں۔" شیر کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ نیچے جزیرے میں زندگی اپنے ڈگر پہ چل رہی تھی۔ چاول اور دال کے قلیل ذخیرے سکھائے جا رہے تھے، ننگے دھڑنگے بچے جوہڑوں میں تیر رہے تھے، گڈریا بھینسوں کے ریوڑ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ فرسودہ ساڑھی میں ملبوس بیبیاں مٹی کے گھڑے اٹھائے تالاب کی طرف جا رہی تھیں، زندگی کی رمق نہ صرف باقی تھی بلکہ اپنے آپ کو ASSERT کر رہی تھی۔ زندگی کتنی عظیم چیز ہے اور اسے کچلنا کس قدر ناممکن ہے۔ بڑے بڑے جابر اور سفاک حملہ آور آئے اور اسے نہ کچل سکے۔ زندگی جاری و ساری رہی، طوفان، جھکڑ اور سیلاب گزر گئے، زندگی کے زخم مندمل ہو گئے۔

ہیلی کوپٹر میں بیٹھنے کا احساس ہوائی جہاز سے کس قدر مختلف تھا، اوپر نیچے دائیں بائیں اور سامنے کتاب کی طرح کھلا تھا۔ یوں احساس ہوتا تھا جیسے بے پر کے پرواز کر رہے ہوں۔ انجن کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"ذرا بیلنس کا خیال رکھنا۔" شیر نے زور سے کہا۔

یہ انتباہ بروقت تھا کیونکہ چکر کاٹتے وقت ہیلی کوپٹر اس طرح ترچھا ہوا کہ ایک کا وزن دوسرے پہ ہوتا اور دروازے کھلے تھے بلکہ تھے ہی نہیں!" "IS IT ALRIGHT ?" شیر نے پوچھا۔ "بالکل ٹھیک ہے جناب۔" میں نے عرض کیا اور واقعہ تھا کہ شیر اپنی نشست پہ یوں جا بیٹھا تھا جیسے گھوڑے کی سواری کر رہا ہو۔

یوں تو ازمنۂ عتیقہ سے انسان عناصر کا مقابلہ کرتا آیا ہے اور آج اسے یہ دعویٰ ہے کہ علم اور سائنس کے بل بوتے پر اس نے عناصر کو مسخر کر لینے کی قوت حاصل کر لی ہے لیکن بسا اوقات یہ کشمکش لاحاصل ہوتی ہے اور جب کوئی ناتواں ان عناصر کا مقابلہ نہیں کر پاتا تو آنسو پی کر قسمت پہ شاکر ہو جاتا ہے۔ یہی حال کیشب پور کے رہنے والوں کا تھا، سمندر کی منہ زور لہریں یلغار کرتی ہوئیں، دندناتی ہوئیں اندر گھس آتیں اور مزروعہ زمین زیرِ آب آ جاتی، یہ عمل ساٹھ سال سے جاری تھا، سمندر کے کھارے پانی سے زمین ناکارہ ہو چکی تھی، اس رقبہ کو زیرِ کاشت لانے کے لیے واپڈا نے ساحل کے ساتھ مٹی کے پشتے باندھ دیے تھے اور اب ساٹھ سال کی محرومی کے بعد دھان کی پختہ فصل سر اٹھائے کھڑی تھی، اسے رسمی طور پر کاٹنے کے لیے چاندی کی درانتی تیار کی گئی تھی، یہ جشن اسی سلسلے میں منعقد ہو رہا تھا لوگ جوق در جوق اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس ایک خاص مقام کی طرف بڑھ رہے تھے، انھوں نے میلوں کا سفر پا پیادہ طے کیا تھا، وہ گروہوں کی شکل میں گاتے بجاتے آ رہے تھے۔ مسرت کی کرنیں ان کے بشرے سے پھوٹ رہی تھیں، آنکھوں میں بشاشت تھی ان کی قسمت جاگ اٹھی تھی، محرومی اور بے بسی کے ساٹھ سال ختم ہو رہے تھے، اس موقعہ کے لیے نظمیں لکھی گئیں۔ لوک گیت ترتیب

دیے گئے اور جب مجلس شروع ہوئی تو سازوں کے ساتھ گایا گیا۔

گنار گاہے ....

ہماری مٹی سونا ہے
تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی ہے
ہمارے کھیت لہلہا اٹھے ہیں
انھیں ہوا کے نرم جھونکے لوری دیتے ہیں
سرسبز چراگاہیں روح کو آسودگی بخشتی ہیں
بہت سے درختوں میں پھول آ رہے ہیں
یہ نظارہ آسمانوں کو لبھاتا ہے

اور جو مد ایجنڈے پر نہ تھی وہ بھی ہو کے رہی یعنی لوک ناچ، یہ لوگوں کی بے ساختگی اور بے پایاں خوشی کا ثبوت تھا، شکر گزاری کی جھلک ان کی آنکھوں میں تھی اور امنگیں آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ فطری جذبے کا یہ اظہار، سرکاری تقریب کے ماحول سے کس قدر مختلف تھا!

کتنی دلکش تھیں یہ آوازیں:-

"دو بام ملے نا"
"تین بام ملے نا"

دُخانی بجرہ آہستہ آہستہ کنارے سے سرک کے گہرے پانی میں آ رہا، ملاح دریا میں ڈوری ڈالے اپنی مخصوص آواز میں سارنگ کو گہرائی کا اندازہ دے رہا تھا۔ کوچ کے وقت دخانی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کبھی کبھی وسل کی مہیب آواز فضا میں گونج جاتی، سارنگ صاحب نے زندگی کے پچیس سال اسی لانچ پہ گزار دیے تھے یہیں ترقی کی منازل طے کی تھیں، اب یہ لانچ جیون کا ایک حصہ تھا، سفر اور حضر میں اسی پہ قیام تھا، سارنگ عرشے پہ کھڑا جہاز کے کپتان کی طرح حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

.... سینۂ دریا پہ دُخانی بجرہ بے تکان چلا جا رہا تھا، یہاں دریا کا پاٹ پندرہ میل تھا، بائیں جانب پٹ سن کی فصل تھی، درخت قدم سے قدم ملائے مستعد فوج کی طرح چاک و چوبند کھڑے تھے۔ گھنے درخت اور سبزے کے مختلف SHADES جیسے پریوں کی کہانی کا کوئی سین ہو۔ فضائیں خاموش تھیں، اس خاموشی کو انجن کی DULL CHUGGING توڑ رہی تھی لیکن یہ آواز مدھم اور مسلسل تھی اور خود خاموشی کا ایک حصہ ہو کے رہ گئی تھی۔

اگن کھا میں آج پھر تلاطم تھا۔

اگن کھا، آگ کا دہانہ جہاں پُورُہ، گورنگو، کا جول، وشواش اور رکولا پارا کی طرف سے چورنی ایسے زخار دریا سمندر میں گرتے ہیں، اگن کھا جو جائنٹ سٹیمر کمپنی کے بڑے جہاز چار بجے شام کے بعد پار نہیں کرتے جہاں کپتانوں کا پتہ آب ہو جاتا ہے۔ اگن کھا چوپال تھا لیکن دو آدمی اپنا ننھا نوکا کھیتے ہوئے طوفانی لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ زخار دریا خلیج بنگال کے دہانے پر زرخیز مٹی لا ڈالتے ہیں، اس سے چھوٹے بڑے جزیرے بن جاتے ہیں۔ چور ممتاز، چور مارگریٹ، چور لکڑی مکڑی، چور رانڈر، اجیج الاحسن اکثر شنید یہ ہے کہ جزیرہ بنتے ہی لوگ جوق در جوق آن کر قابض ہو جاتے ہیں جو زمین حاصل نہیں کر سکتے: مویشی

یہ جری لوگ ہیں جو بڑے سینے محنت شاقہ کے عادی، چھوٹی سبک ناؤ، پتلے پتوار اور طوفانوں سے مقابلہ، ان جزیروں میں کوئی ڈاک خانہ نہیں، تار گھر نہیں، مارکیٹ نہیں، سکول نہیں، ہسپتال نہیں۔ یہ خود ہی اپنے نگراں اور محافظ ہیں، باریسال ایسے جنوبی اضلاع اسی زرخیز مٹی سے بنے ہیں۔ اس رقبہ میں مسلسل ایزادی ہوتی رہتی ہے، جب ساحل سے کوئی سو میل جنوب میں...... DEPRESSION بنتا ہے تب تند مشرقی ہوائیں اٹھتی ہیں جو لہروں کو سینۂ سمندر سے اکھاڑ دیتی ہیں اور یہ بپھری ہوئی لہریں چھوٹے بڑے جزیروں کو تاراج کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں، لہلہاتے کھیت، بانس کے مکان اور G. I. SHEETS پرکالہ بن جاتی ہیں، جانوروں کے ریوڑ عورتیں بچے بوڑھے سب بہہ جاتے ہیں۔

یہ کھیپوپاڑا ہے، کسی زمانے میں یہ پرتگیزی بحری قزاقوں کی آماجگاہ تھا اب بھی سبز یا نیلی آنکھوں والے لوگ اور سنہرے بالوں والے بچے خون کی آمیزش کا پتہ دیتے ہیں، روایت ہے کہ یہاں NYMPHS بستی تھیں (نصف دھڑ عورت اور نصف دھڑ مچھلی) جو اپنے مسحور کن گیتوں سے جفاکش ملاحوں کو موہ کر ان کی موت کا باعث ہوتی تھیں۔ وہ کشمکش اب بھی جاری ہے۔ مکڑی کا وہ جال اب بھی موجود ہے۔ انسان عورت کے حسن اور عشوہ طرازی کے سامنے آج بھی بے بس ہے۔ اب کالا پاڑا اور کھیپوپاڑا میں موگ لوگ آباد ہیں۔ یہ منگول نسل سے ہیں اور برمی بادشاہوں کے ظلم سے بچنے کے لیے اراکان سے بھاگے اور چٹاگانگ اور باریسال میں پناہ گزین ہوئے، چپٹا ناک، عورتوں کی جیکٹ اور لُنگی جیسے برمی عورتیں آج بھی پہنتی ہیں۔ سنبل کے پھول جوبن پر ہیں، جھیل کے نشیب سے لے کر ساری وادی تا حدِ نظر سنبل کے پھولوں سے پٹی پڑی ہے جیسے سبز درختوں میں آگ لگ گئی ہو، سنبل میں رنگوں کی بہار ہے، آتشیں، عنابی، کیسری۔

ایک دن جی میں آئی کہ ذرا سیر ہی کی جائے چنانچہ آئیل کمپنی سے OUT BOARD انجن والی کشتی مانگی۔ انجن کی زنجیر کھینچنا تھی کہ کشتی ہوا ہو گئی۔ دائیں بائیں دھان کی فصل، چاروں اور سبزہ ہی سبزہ تھا۔ کہیں کہیں راجہ شالی کے سنہرے PATCH تھے جلد پختہ ہو جانے والا دھان، راجہ شالی کی فصل کٹنے کے لیے تیار تھی۔ کشتی ایک موڑ تیزی سے مڑی تو ایک صحت مند مچھلی SPLASH کے ساتھ کشتی کے عقب میں آ رہی۔ بے چاری پانی میں واپس جانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی لیکن متان پولیس میں تھا کہاں چھوڑنا تھا اور یہ دولت تو خدا نے چھپر پھاڑ کے دی تھی، جب تک سرد نہیں ہو گئی اس نے گھٹنے تلے دابے رکھا رات کے وقت مچھلی کی لذت اس جذبۂ ترحم پر غالب آ کے رہی جو وقتی طور پر بیدار ہو گیا تھا۔

کشتی کافی رفتار سے جا رہی تھی کہ یکدم انجن میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور انجن بند ہو گیا۔ ماہی گیروں نے بڑے دھڑلے سے نہروں کے بیچوں بیچ جال نصب کر رکھے تھے جو سراسر خلافِ قانون تھا۔ ماہی گیر کا جال انجن میں پھنس گیا تھا۔ جب انجن کھولا گیا تو وہ حصہ یوں تھا جیسے کسی نے دانتوں میں پکڑ کے چبا ڈالا ہو۔ غلطی سراسر ماہی گیر کی تھی، اس نے کشتی آتی دیکھی، جال اٹھا لینے کی بجائے اس نے بانس سے جال نیچے دبانے کی کوشش کی اور نتیجہ یہ ہوا۔ میں نے ترجمان سے کہا یہ ۱۵۰ میل کا چکر تو ٹھیک ہے اور ضروری بھی لیکن ہمیں سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آنا چاہیے، جگہ جگہ بانس لگا کے ماہی گیروں نے جال نصب کر رکھے ہیں جیسے جنگ کے زمانے میں سمندر میں MINES بچھا دیتے تھے اور رات کے وقت بانسوں سے ٹکراؤ، خطرناک ہو سکتا ہے اور پھر کشتی میں بتی بھی نہیں۔

"نہیں صاحب! چاندنی رات ہے کیا فکر ہے؟" بڑھاں نے اعتماد سے کہا۔

اواخر اکتوبر کا سورج ہمارے اوپر چمکتا رہا، اس کی شعاعیں پانی میں منعکس ہو کر آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی رہیں۔ ہمارے چہرے SUN BURNT ہوتے رہے، WELL READ شان بحث کرتے وقت اس شد و مد سے بولتا رہا جیسے کوئی اکھڑ کسی سے جھگڑ رہا ہو۔ اب شام ہو چلی تھی، سورج کی بڑی سرخ ٹکیا خلیج بنگال میں ڈوب رہی تھی۔ دریا کا پاٹ یہاں آٹھ دس میل سے کیا کم ہوگا، تاحد نظر پانی ہی پانی تھا، دور ننھے جزیروں پہ اُگے ہوئے درخت ایک غیر مرئی پینٹنگ کی طرح تھے، SEA GULLS کے سفید رنگ میں گہرے اُودے رنگ کی آمیزش تھی، آبی پرندے کبھی اُڑتے اور کبھی پانی پہ تیرتے ہوئے گزر جاتے جیسے ملاحوں کو کہہ رہے ہوں جیسے صدیوں سے کہتے آئے ہیں:۔

"مایوسی کی کیا ضرورت ہے؟ زمین کچھ ایسی دور نہیں۔"

اب خنکی بڑھ چلی تھی، آٹھویں رات کا بیڈھب زرد چاند طلوع ہو رہا تھا۔ "خاصی سردی ہے، اپنے کالر کا بٹن بند کر لو" میں نے صلاح دی۔ سراج الدولہ کے زمانے میں ۶۰۰ جہازوں کا بیڑا امیر البحر کے زیر فرمان تھا، ہماری کشتی کا بھی ایک امیر البحر تھا جو ان پانیوں سے قطعاً ناواقف تھا لیکن عقب سے اس GUSTO کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا جیسے اس کے آبا و اجداد یہی کام کرتے آئے ہوں اور وہ چپے چپے سے واقف ہو، کشتی بانسوں سے ٹکرا کے اُچھلی لڑکھڑائی لیکن صاف نکل گئی۔ یہاں ماہی گیر اگر جال نصب کر کے گھر جا بیٹھے ہوں، صبح مچھلیاں جمع کرنے آتے تو مچھلیوں کی بجائے ہمارا جسم جال میں پاتے، ہم نے امیر البحر سے التجا کی جلدی کیا ہے رفتار ذرا دھیمی رکھو۔ کوئی آدھ گھنٹہ امیر البحر نے صبر سے کام لیا لیکن سفر ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اب ہم ساکت اور گہرے پانیوں میں سے گزر رہے تھے، امیر البحر نے رفتار تیز تر کر دی۔ میں اور فرنگی سامنے والی نشست پہ بیٹھے تھے ہم نے شور مچایا "آہستہ رو کو پل ہے" لیکن صاحب کہاں۔ رُکتے رُکتے بھی دیر لگتی ہے، ہمارا خیال تھا کہ چھوٹی قوس کے نیچے سے کشتی نہ گزر سکے گی، بانسوں سے ٹکرا جائے گی اور ہماری بروقت DUCKING رائیگاں جائے گی لیکن رفتار کم ہو چکی تھی، امیر البحر نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور کشتی تنگ قوس میں سے گزر گئی، سب نے اطمینان کا سانس لیا، دریا کے دونوں کناروں سے بانس کا پل شروع ہوتا تھا لیکن دریا کے بیچوں بیچ خلا تھا۔ اس خلا کو لوگ تنگ سے تختے رکھ کر پاٹ لیتے اور دوسری طرف گزر جاتے، بجروں کے گزرنے کے لیے خلا برقرار رہتا جیسے لندن میں دریائے ٹیمز کا آہنی پل اٹھا ہوتا کہ بڑے سمندری جہاز گزر سکیں۔ امیر البحر نے نادانستہ طور پر خلا ایک طرف چھوڑ دیا تھا، لانچ ایک محفوظ مقام پہ باندھ دیا گیا تھا اور عملہ ہمارا منتظر تھا۔ تھکے ماندے رات گئے واپس آئے تو لانچ میں پہنچ کر یہی احساس ہوا جیسے گھر لوٹ آئے ہوں

یہ آب و رنگ کی دنیا ہے، یہاں کنول کے پھول تالابوں میں سے جھانکتے ہیں اور بیشتر حصوں میں سبزہ اور پانی کا حسین امتزاج عجب لطف دیتا ہے لیکن سندربن کی رعنائی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

گنگا اور جمنا کے عظیم دریا سمندر کے دہانے پہ مٹی ڈالتے رہے، خلیج بنگال سے شور مچاتی ہوئی کھارے پانی کی لہریں اس مٹی کو کاٹتی رہیں۔ پھر صدیوں ان تودوں نے تند ہواؤں کے تھپیڑے اور موسموں کے بے رحم طمانچے کھائے اور یوں سندربن نے جنم لیا۔ سندربن گھنا اور گمبھیر جنگل جو یورش کرتا ہوا سمندر کے اندر جا گھسا ہے، گنگوا، کیوڑا اور باعین کے علاوہ سمندری کے

وہاں تناور درختوں کے ذخیرے عام ہیں، لب ساحل گول پتہ نے اپنی چوڑی چھتری تان کے گول اور سبز پتوں کی دیوار کھڑی کر دی ہے، دخانی بجرہ اس عظیم جنگل کے کنارے چلتا جا رہا تھا، سندری کے درختوں کی مہک سے فضا بوجھل تھی۔ قدرت نے سندربن کو ممنوع علاقہ قرار دیا ہے، یہاں آدم زاد کا گزر نہیں۔ جو باہمت ماہی گیر اور لکڑہارے روزی کمانے کی خاطر جنگل میں دور نکل جاتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی روز لوٹ کے نہ آ سکیں۔ متعدد بار سننے میں آیا ہے کہ آدم خور شیر بیس فٹ چوڑی کھال پھلانگ کے دوسرے کنارے پر آیا اور بندھے ہوئے ڈونگا سے ملاح یا لکڑہارے کو لے اڑا۔

گھنی سفید داڑھی، لہجے میں تحکم، عبدالمطلب نے عمر کے پچیس سال ہیرے لانچ پہ گزار دیے تھے۔ گزشتہ دس برس سے وہ لانچ کا "کپتان" تھا۔ سال خوردہ سارنگ نہ صرف ناخوش تھا بلکہ شکار کے بہانے ہر چرند پرند سے اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ گزشتہ شام سے وہ اس کوشش میں تھا کہ کم از کم ایک ہرن ہاتھ آ جائے، چلتے ہوئے بجرے سے اس نے متعدد فیر کیے لیکن نشانہ خطا گیا، اگرکے جھاڑیوں کو ٹٹولا لیکن آہوئے رمیدہ زخمی ہوتا تو رکتا۔ دوسرے روز علی الصبح سارنگ صاحب نے بجرہ وہیں لا کھڑا کیا جہاں ہرنوں کی ڈاریں پانی پینے آتی تھیں اور بجرے کے انجن بند کر دیے کہ وحشت زدہ ہو کے ہرن بھاگ نہ جائیں، نسیم سحر سینۂ دریا پہ سر بن ہلکورے لے رہی تھیں، فضا نور سے لبریز تھی اور منتظر، لیکن ہرنوں نے ایکا کر لیا تھا کہ سارنگ صاحب کو شکر گزاری کا موقع نہ دیا جائے۔ دو سفید بگلے دیکھ کے سارنگ صاحب نے ایک دو فیر داغ دیے لیکن بے سود، مایوس ہو کے جو چلے تو سارنگ صاحب کی نظر دو بطخوں پہ پڑی جو مزے سے پانی میں تیرتی جا رہی تھیں۔ سارنگ صاحب نے فیر کیا تو بطخوں نے غوطہ لگایا اور بجرے کے نیچے سے ہوتی ہوتی دوسری طرف نکل آئیں۔ اب بجرے کا سارا سٹاف RAILING پہ کھڑے ہو کے سارنگ صاحب کو اپنی وفاداری کا ثبوت دے رہا تھا، ان کی نظریں بطخوں کی متلاشی تھیں، دو ضعیف پرندے پندرہ بیس لوگوں کی آنکھوں کا مرکز بن کے رہ گئے تھے، سارنگ صاحب نے پھر فیر کیا، بطخوں کے جوڑے نے پھر ڈبکی لگائی، HIDE AND SEEK کا یہ کھیل بہت دیر چلا لیکن بطخوں کی یہ حالت تھی کہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ سٹاف نے سو حیلے کیے کہ سارنگ صاحب نامراد نہ لوٹیں، کبھی بجرے کو موڑا، کبھی گھما کے واپس کیا، کبھی ڈونگا پانی میں ڈال کے پتوار سے کھیتے ہوئے ان کا تعاقب کیا لیکن جان کتنی عزیز ہوتی ہے، بطخیں برابر جل دیتی رہیں۔ بالآخر بعد از خرابیٔ بسیار ایک بطخ فیر سے زخمی ہوئی اور پکڑی گئی اور یوں سارنگ صاحب کی انا کی قدرے تسکین ہوئی۔

ٹوکو میاں کی کہانی بھی عجیب ہے اس کی اپنی کوئی زمین نہ تھی لیکن وہ جوان تھا اس کے بازوؤں میں طاقت تھی، مسلسل جفاکشی سے اس کے مسل مضبوط ہو گئے تھے۔ وہ دو مزدوروں جتنا کام کر سکتا تھا، فصل کی کٹائی کے موقعہ پر وہ ایک کانی تنہا کاٹ لیتا۔ پس اندوختہ سے اس نے آدھ ایکڑ زمین خریدی، چھوٹا سا گھر بنایا اور دو چار پھل دار درخت لگائے۔ اسے بڑی آشا تھی کہ اس کا لڑکا جوان ہوگا، محنت کر کے کمائے گا اور اسے کچھ سکھ ملے گا۔ اسی سالہ ٹوکو میاں اب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے اور چلنے پھرنے سے معذور ــــ ایک لڑکا کمانے والا ہے، اس کی بیوی ہے اور چار بچے، وہ کس کس کا پیٹ بھرے۔ ساری زندگی سخت مشقت کے بعد اب جب آفتاب عمر لب بام آ چکا، اب تو ٹوکو میاں کو روٹی کی فکر نہیں ہونی چاہیے تھی، تیس پینتیس سال اِدھر تو یہ تنگی نہ تھی، مچھلی، چاول اور پھل عام تھا لیکن وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔

دھان کی فصل تیار کرتے وقت بہادر چاشی پہروں پانی میں کھڑا رہتا ہے۔ پٹ سن کی فصل پانی میں غوطہ زن ہو کر کاٹتا ہے، سپاری کے لانبے درخت کی چوٹی پر جا پہنچتا ہے، پختہ سپاری نیچے پھینکتا ہے پھر ایک تنے کو جھلا کے دوسرے درخت پہ پہنچ جاتا ہے پھر تیسرے اور چوتھے .... اور یوں جان پہ کھیلتا ہے یہی چاشی رات کا ابلا چاول پانی میں بھگو کے رکھ دے گا اور صبح مرچ کے ساتھ کھا لے گا۔ سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں، لیکن حلاوت کہاں تھی؟

میں نے لڑکوں کو چھوٹی مچھلیوں کی بیسود تلاش میں گدلا پانی کھنگالتے دیکھا ہے، میں نے لوگوں کو اسی ساکی تالاب سے پانی پیتے دیکھا ہے جہاں ڈھور ڈنگر پانی پیتے تھے، میں نے انھیں صبر اور استقلال کے ساتھ طویل بیماری کاٹتے دیکھا ہے۔

اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

رقص و نغمہ وہاں کے باسیوں کی روح میں رچ بس گیا ہے۔ یہاں کی طرح تو نہیں کہ جب بھی گانے کی فرمائش کی جائے تو کچھ اس قسم کے فقرے سننے میں آتے ہیں۔

"قسم لے لیجئے جو میں نے کبھی گایا ہو۔"

"کیا کروں گلا بالکل بیٹھ رہا ہے ورنہ مجھے عذر نہ ہوتا۔"

"کھانا اتنا کھا لیا ہے اب خاک گایا جائے گا۔"

لیکن ایک دفعہ ایک فربہ اندام خاتون نے حد کر دی جب ہمارا اصرار بڑھا تو وہ اپنے نحیف و نزار خاوند کی طرف دیکھ کر شرما گئیں اور اشارے سے کہا۔ "جی میں تو ان ہی کے لیے گاتی ہوں!"

یہ تکلف مشرقی پاکستان میں نہیں۔ ہم کسی صاحب کے ہاں COURTESY CALL پہ گئے، گانے کی بات چل نکلی تو ماں نے فوراً کہا "بیٹی! تم نے بھی تو دو تین راگ سیکھے ہیں، سُنا دو ذرا۔" اور دس سالہ بچی نے ساز یوں درست کیے جیسے اشارے کی منتظر تھی۔

یہ ورائٹی پروگرام نمائش کے منتظمین نے ترتیب دیا تھا۔ پردہ اٹھا تو ایک خاتون نے پکا راگ شروع کیا۔ آواز میں پختگی اور خود اعتمادی ایسی کہ سامعین عش عش کر اٹھے، راگ ختم ہونے پہ جو اٹھی تو ہم سب بھونچکے رہ گئے۔ نو سالہ بھولا فراک پہنے تھی۔ خیر اس لڑکی کو فن میں غیر معمولی کمال حاصل تھا لیکن لوگ رقص و نغمہ کو اپنی ثقافت کا بیش بہا سرمایہ سمجھتے ہیں قصبوں اور چھوٹے شہروں میں بھی راگ کی محفل جم جاتی ہے اور جانے کہاں سے فن کار جمع ہو جاتے ہیں۔

مختصر نوٹس پہ ایک شو سٹیج کیا جا رہا تھا، ایک لڑکی رقص میں کمال دکھا رہی تھی۔ زہرا نے میزبان سے پوچھا۔

"یہ کافی دیر سے مشق کر رہی ہو گی۔"

"بیچاری ایک کلرک کی لڑکی ہے جس کی چھ اور لڑکیاں ہیں۔ ہمسائے میں کوئی لڑکی رقص سیکھا کرتی تھی بس دیکھتے دیکھتے اس نے بھی سیکھ لیا۔"

بنگلہ دیش! تیرے دریاؤں میں پگھلا سونا ہے، تیری دھرتی زمرد اگلتی ہے، ڈیوک آف ونڈسر نے ٹھیک کہا تھا۔

THIS IS A LANDSCAPE IN WATER COLOURS

پھر انسان اتنا دُکھی کیوں ہے؟ کون مہا پُرش تیرے باسیوں میں نئی روح پھونکے گا؟ وہ مسیحا کب آئے گا جو قریہ قریہ گھوم کر زخموں پر پھاہا رکھے اور یاس زدگی کے نشان دور کرے جو صدیوں سے ان لوگوں کا مقدر ہے یا حسرت و درماندگی کی چکی چلتی رہے گی اور رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ تشنہ مسائل ایک بھیانک صورت اختیار کرتے رہیں گے۔

ہوا کے مہربان جھونکو! سپاری کے خاکسار درختوں کو جھلاتے رہو۔
ناریل کے مغرور درختو! دریا کی لہروں میں اپنا عکسِ جمیل دیکھتے رہو۔
ذخّار دریاؤ، دھیرے دھیرے بہتے رہو۔
تمھاری گہرائیاں اتھاہ ہیں، غمِ انسان اتھاہ ہے، دریا کا بہاؤ امر ہے، غم امر ہے، غم زندگی ہے۔

غمِ عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

لاہور نامہ

آغا صادق

ذوق و شوقِ سفر نے تڑپایا   آب و دانہ مجھے یہاں لایا
جلوہ گاہِ جمال ہے لاہور   مخزنِ ہر کمال ہے لاہور
ہر ہُنر اس میں جلوہ آرا ہے   شہرِ لاہور ایک دُنیا ہے
شعر، موسیقی، رقص، خطاطی   فنِ صورت گری و نقاشی
ایک دو حسن ہوں تو بات کروں   کس طرح شرحِ کائنات کروں؟
جوہرِ معدنِ ثقافت ہے!   جلوۂ ایمن لطافت ہے !
کیسے جلووں کے درمیاں ٹھہرے   بجلیوں میں نظر کہاں ٹھہرے !
حسن معراج پر نظر آیا   عشق تھامے ہوئے جگر آیا!
ہر نظارہ نظر کے قابل ہے   یہ محبت بھرا کوئی دل ہے!

عزمِ جزمِ سفر سے باز آئے
ہر مُسافر یہیں ٹھہر جائے!

لاہور کی چند تاریخی عمارات اور اُن کے کتبے

لیفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

یوں تو لاہور میں لاتعداد تاریخی عمارات ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان میں چند ایک ایسی ہیں جن کی طرف یہاں توجہ دلوانا مقصود ہے۔ ہم یہاں ان عمارات سے متعلق جملہ تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ صرف ان تصاویر کے بیان پر اکتفا کریں گے (جن کے یہاں عکس پیش کئے جا رہے ہیں) ان میں فنی، ادبی اور تاریخی لطافت ہے۔ شہر لاہور علم آثارِ قدیمہ کا ایک وسیع میدان ہے۔ جس پر اگر کسی صاحبِ علم نے کبھی کوئی کتاب ترتیب دی تو کئی ضخیم جلدوں پر پھیل جائے گی۔ فی الحال صرف ایک کتاب ایسی ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور وہ سید عبداللطیف کی تاریخ لاہور ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو از سرِ نو ایڈٹ کیا جائے اور اس میں جہاں جہاں مختلف مقامات کے خاکے اور نقشے دیے ہیں ان کی بجائے تصاویر دے دی جائیں۔ مقامات کا محلِ وقوع جو لطیف کی تاریخ میں دیا ہے وہ بھی بدل چکا ہے ہاں اور عمارات بن گئی اس لیے جو محلِ وقوع لطیف بیان کرتا ہے آج ان عمارات کا مقام کچھ بدلا ہوا ہے۔ گزشتہ تین چار سیلابوں نے بھی تاریخی عمارات کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر ایسے مقامات کا جو باغبانپورہ اور بیگم پورہ کی پشت پر واقع ہیں تحفظ نہ کیا گیا تو وہ معدوم ہو جائیں گے اور ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہو جائے گا۔ ان کا تحفظ اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ان کی خاطر خواہ مرمت کی جائے اور ان کی تصاویر کھینچ کر انھیں طبع کرا دیا جائے۔ لاہور، اصفہان، شیراز اور بغداد سے زیادہ اہم شہر ہے۔ مگر مقامِ تاسف ہے کہ جہاں اُن مقامات کے متعلق نہایت عمدہ مصوّر کتابیں ملتی ہیں لاہور اس شرف سے سرفراز نہیں۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ لاہور پر ایک تاریخی اور ادبی کتاب ترتیب دی جائے جس میں شاہنشاہوں، شاعروں، ادیبوں اور صوفیوں کا مفصل ذکر ہو اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی عمارات و روایات کو ایک مستقل عنوان دیا جائے۔ اب لاہور کی چند چیدہ عمارات کا حال سنئے۔ نمبروں کے حوالہ سے عکس بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔

(۱) نیویں مسجد

سیتلا مندر کے سامنے نیا بازار میں بائیں طرف واقع ہے۔ لودھیوں کے زمانے میں دولت خان لودھی گورنر نے تقریباً ۹۰۰ھ کے لگ بھگ تعمیر کروائی تھی۔ سڑک کی سطح سے بہت نیچے واقع ہے۔ اس کے مینار سطح سڑک کے قریب تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں پانی کے بہہ جانے کا انتظام (عرقیاں) [DRAINAGE SYSTEM] نہایت اعلیٰ ہے۔

(۲) مزار حضرت میاں میر صاحبؒ

یہ چھاؤنی کے قریب واقع ہے۔ مُلا فتح اللہ شاہ نے تاریخِ وفات یوں نکالی ہے۔

لہ مضمون لاہور نمبر کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا تھا۔

میاں میر سر دفتر عارفاں   کہ خاک درش خاک اکسیر شد
سفر جانب شہر جاوید کرد   ازیں محنت آباد دلگیر شد
خرد بہر سال وفاتش نوشت   بفردوس والا میاں میر شد
۱۰۴۵ھ

(۳) مسجد وزیر خاں دہلی دروازے کے اندر چوک وزیر خاں میں واقع ہے اور وزیر خاں ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ کاشی کاری کا ایک نہایت اعلیٰ شاہکار ہے جس کے سامنے اصفہان و بغداد کی عمارتیں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ بڑے دروازے پر دونوں طرف کتبات موجود ہیں۔

(دایاں کتبہ)

ایں خانہ کہ بست چوں فلک مظہر فیض   دارد چو حریم کعبہ سرو و سر فیض
بر چہرہ اہل قبلہ ایں در براد   تا حشر کشادہ باد ہمچوں در فیض

(بایاں کتبہ)

(۴) دہقان ورود بحشر اے نیک سرشت   در مزرع جہاں[1] ہر آں چیز کہ کشت
درباب عمل بنائے خیری بگذار   کا فرہمہ را رہست زیں در بہشت

(۵) بڑے دروازے سے اندر داخل ہو کر جب صحن میں آتے ہیں تو دروازے کے اوپر یہ شعر لکھا ہے۔ ؎

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

یہاں پر کاشی کاری کے عجیب و غریب نمونے دیکھنے میں آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

(۶) جب ہم صحن میں آگے بڑھتے ہیں تو جہاں دالان شروع ہوتا ہے وہاں گنبدوں کے نیچے اوپر بائیں طرف جہاں آیات ختم ہوتی ہیں کاتب کا نام بمعہ تاریخ کے یوں درج ہے۔ "یوسف کشمیری غفر اللہ سنہ ۱۰۴۲ھ"

(۷) گلابی باغ شالامار کی طرف جو شہر سے سڑک جاتی ہے وہاں انجینئرنگ کالج کے قریب بر لب سڑک واقع ہے۔ مرزا سلیمان بیگ نے سنہ ۱۰۶۶ھ میں یہ باغ تعمیر کروایا تھا جس کا دروازہ موجود ہے۔ یہ شاہجہان کے زمانے میں امیر البحر تھے۔ تاریخ تعمیر اس مصرع سے نکلتی ہے "گلابی باغ شد تاریخ باغش" پورا شعر تصویر میں ملاحظہ ہو۔ دروازے کے اوپر مندرجہ ذیل اشعار بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تصویر:

---

[1] یہ کتبہ محمد علی کا لکھا ہوا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے جو اس کتبہ کے اختتام پر نظر آتا ہے۔ سید عبد اللطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں اس کتبہ کو ایک جگہ غلط نقل کیا ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع کو اس نے یوں لکھ دیا ہے:

"در مزرع آخرت ہر آں چیز کہ کشت"

(۸)
بانی باغ سخاوت فاتح باب کرم آنکہ ازو رائے گردوں گشتہ باغے چوں ارم
اہل معنی بعد ماتش خواستند از حق دعا بیگ سلطان را الٰہی دار دائم محترم

(۹) دائی انگہ کے مزار کا گنبد اکبر اعظم کی دایہ کا یہ مزار گلابی باغ کے اندر واقع ہے۔ گنبد کے اندر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے اختتام پر کاتب کا نام معہ تاریخ کے درج ہے۔ وہو ہذا "کتبہ محمد صالح غفر اللہ ذنوبہ ستر عیوبہ سنہ ۱۰۸۲ھ"

(۱۰) مسجد زکریا خاں نواب خان بہادر زکریا خاں پسر عبدالصمد خان سیف الدولہ دلیر جنگ۔ یہ مسجد ان کی تعمیر کروائی ہوئی ہے۔ صحن کے سامنے دالان کے اوپر کلمہ طیبہ لکھا ہے اور اس کے دونوں طرف بہ الفاظ لکھے ہیں:۔

عجلوا بالصلوٰۃ قبل الموت عجلوا بتوبۃ قبل الفوت

(۱۱) سرو والا مقبرہ شرف النساء بیگم: یہ نواب بہادر خان گورنر لاہور کی ہمشیرہ تھیں۔ یہ مقبرہ سکھوں نے برباد کر دیا تھا۔ بیگم کا قاعدہ تھا کہ بلا ناغہ ہر روز صبح اس چبوترے کے اوپر بیٹھ کر تلاوت فرماتی تھیں۔ ان کی اپنی وصیت کے مطابق انھیں یہاں ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ اقبال کی مشہور غزل اسی مقبرے سے متعلق ہے۔ مقبرہ کے اوپر چاروں طرف مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں:۔

"اللہ باقی والکل فانی"

١

٢

۱۱

۱

۱۰

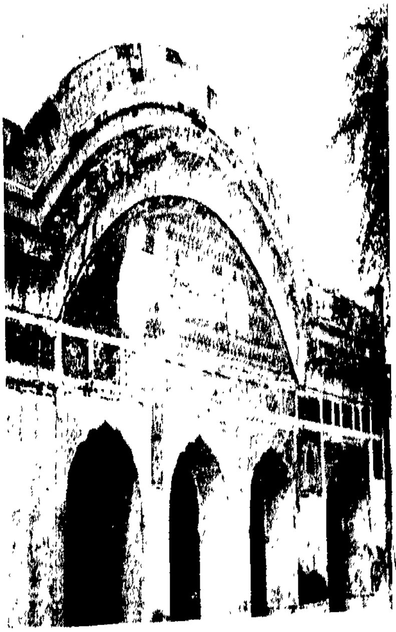

مشرق جلوه زعشق [illegible]
مغرب [illegible] گردیده

ای آنکه زنور بی نهایت [illegible] عکس کرده جمال [illegible] [illegible] ای آنکه درون پرده راز [illegible] لامکان خلقت الافلاک
قرار است آشکار دیده [illegible] آسوده ساحت رسیده [illegible] لطف خاص ره برده [illegible] از فرش بعرش رسیده [illegible]

[illegible]

هدایه محمد کاظم [illegible] طفیل احمد [illegible]

لاهور ۱۵ ستمبر ۱۹۵۰

دعوتِ سفر

جوشؔ ملیح آبادی

آؤ کعبے سے اٹھیں سوئے صنم خانہ چلیں   بخمِ فقر و بہ پیمانۂ شاہانہ چلیں
درخورِ کیف نہیں مور و مگس کی دنیا   ساتھ بلقیس کو لیں اور سلیمانہ چلیں
کانپ اُٹھے حرمِ سترِ عفافِ توحید   یوں پئے سجدۂ سنگِ درِ بتخانہ چلیں
آہِ شب گیر و مناجاتِ سحر گاہی کو   نعرۂ ہُو پہ نچاتے ہوئے خمخانہ چلیں
مشعلِ حسن کے اطراف میں سناٹا ہے   آؤ سینوں میں لیے آتشِ پروانہ چلیں
آؤ اے زمزمہ سنجانِ سراپردۂ گل   بہ ہوائے نفسِ تازۂ جانانہ چلیں
بُت اگر راہ میں مل جائیں جھکیں بہرِ سلام   اور خدا راستہ روکے تو حریفانہ چلیں
تا نہ محسوس ہو واماندگیٔ راہِ دراز   زلفِ پُرپیچ کا چھیڑے ہوئے افسانہ چلیں
پھینک کر سبحہ و سجادہ و دستار و کلاہ   بہ رباب و دف و طنبورہ و پیمانہ چلیں
بادہ و ساغر و طاؤس و غزل کے ہمراہ   ذرّہ ذرّہ پہ لٹاتے ہوئے میخانہ چلیں
خاک قدموں سے اُڑے سر پہ دھنک بن جائے   یوں سوئے گل کدۂ عشوۂ جانانہ چلیں
فرشِ صحرا پہ مچل جائے جوانی کی ترنگ   ثبت کرتے ہوئے یوں لغزشِ مستانہ چلیں
رخصت اے بندہ خرامی کہ وہ دن آپہنچا   جس پہ جھکتے تھے اب اس خاک پہ یزدانہ چلیں

آؤ پھر جوشؔ کے ہمراہ دو عالم کو لیے
خدمتِ پیرِ مغاں میں پئے نذرانہ چلیں

فراق گورکھپوری

○

یہ کھاڑیاں یہ اُداسی یہاں نہ باندھو ناؤ
یہ اور دیس ہے ساتھی، یہاں نہ باندھو ناؤ
دغا کریں گے مناظر کنارِ دریا کے
سفر ہی میں ہے بھلائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
فلک گواہ کہ جل تھل یہاں ہیں ڈانواڈول
زمیں خلاف ہے بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
تمہارے آتے ہی دیکھو جبینِ ساحل پر
ہزار ہا شکن آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ
یہاں کی آب و ہوا میں ہے اور ہی بو باس
یہ سرزمیں ہے پرائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
یہ باندھ، گھاٹ کی یہ سیڑھیاں، ستون و فصیل
نہیں ہیں خطرے سے خالی، یہاں نہ باندھو ناؤ
ڈبو نہ دیں ہمیں یہ گیت قربِ ساحل سے
جو دے رہے ہیں سنائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
جو بیڑے آئے تھے اس گھاٹ تک ابھی اُن کی
خبر کہیں سے نہ آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ
اگرچہ ساتھیو ہم نے یہاں تک آنے میں
بڑی مصیبت اُٹھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
یہ مانتا ہوں کہ پہنچے ہیں اس ٹھکانے تک
بصد ہزار خرابی، یہاں نہ باندھو ناؤ
رہے ہیں جس سے شناسا یہ آسماں، وہ نہیں
یہ وہ زمیں نہیں بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
قریب آئے ہیں جب ہم، تو بازگشت ندا
ہمارے کانوں میں آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ
یہاں کی خاک سے۔ ہم بھی مشام رکھتے ہیں
وفا کی بو نہیں آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ
یہاں سے دور بہت دور ساتھیو ہم کو
بلاتی ہے کوئی وادی، یہاں نہ باندھو ناؤ
جو سرزمینِ ازل سے ہمیں بلاتی ہے
وہ سامنے نظر آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

ق

ہم اپنے آپ کو پا جائیں گے پہنچ کے وہاں
ابھی بڑھے چلو بھائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
نظر فریب اشارے وہ دستِ ساحل کے
وہ کنگروں کی دہائی، یہاں نہ باندھو ناؤ
سوادِ ساحلِ مقصود آ رہا ہے نظر
ٹھہرنے میں ہے تباہی، یہاں نہ باندھو ناؤ
جہاں جہاں بھی ہمیں ساحلوں نے للچایا
صدا فراق کی آئی، یہاں نہ باندھو ناؤ

اثر لکھنوی

○

گلچینیٔ جمال کا لپکا بھی چھوڑ دے
وہ جلوہ گر ہو اس کی تمنا بھی چھوڑ دے
نقشِ خودی کو دل سے مٹانے کے ساتھ ساتھ
ذوقِ سجود ناصیہ فرسا بھی چھوڑ دے
ہستی میں آپ نشہ ہے کیف و سرور ہے
اے رند شغلِ بادہ و مینا بھی چھوڑ دے
اُس کے حضور شرحِ تمنا تو اک طرف
عرضِ نیاز عشق کا سودا بھی چھوڑ دے
ترکِ تعلقات کی اتنی تو مشق کر
اُڑ کر بگولہ دامنِ صحرا بھی چھوڑ دے
کندہ ہے لوحِ دل پہ جو اک نقشِ نازنیں
اُس کو اُبھار، ذوقِ تماشا بھی چھوڑ دے
مانوس ہو کے لیلیٔ حسنِ خیال سے
ہر رہگزر میں خاک اُڑانا بھی چھوڑ دے
منزل وہ عشق کی ہے کہ اندازہ ہو اگر
ناز اپنی رفعتوں پہ ثریا بھی چھوڑ دے
کیسی ہوس کہ صبحِ سعادت طلوع ہو
اے بے خبر خیالِ مسیحا بھی چھوڑ دے
اقلیمِ عاشقی میں نہیں دخلِ آرزو
اے دل خیالِ عرضِ تمنا بھی چھوڑ دے
اے شاہدِ جمال بجا ہے ترا حجاب
لیکن مجھی سے مجھ کو چھپانا بھی چھوڑ دے
پردہ دری نہ ٹھہریں کہیں پردہ داریاں،
کوئی نہ کوئی نقش ہویدا بھی چھوڑ دے
نظارہ ہے محال جو تیرے جمال کا
تو پھر خطا معاف سنورنا بھی چھوڑ دے
پابندیوں سے اور بڑھیں گی درشتیاں،
اس گرگِ نفس کو کبھی تنہا بھی چھوڑ دے
آوارہ مثلِ سیل ہو مٹنے کے واسطے
سرگشتگی کے شوق میں دریا بھی چھوڑ دے

عقل اور عشق شیر و شکر ہو چکے اثر
کیونکر کہوں کہ دونوں کو یکجا بھی چھوڑ دے

فیض احمد فیض

○

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض صاحب کی یہ غزل ایک روزنامہ میں بھی چھپ گئی ہے۔ اس کے باوجود ہم اسے چھاپ رہے ہیں تاکہ یہ ادبی حلقوں تک بھی پہنچ جائے۔ (ادارہ)

حفیظؔ ہوشیارپوری

○

نقشِ ہستی معجزہ ہے شوخیٔ تدبیر کا
نام ہوتا جا رہا ہے خامۂ تقدیر کا

زندگی میں زندگی کے راز کا جویا ہوں میں
خواب ہی میں منتظر ہوں خواب کی تعبیر کا

کس کی سعیٔ نارسا کا عکس ہے افلاک پر
کہکشاں پر کیوں گماں ہوتا ہے جُوئے شیر کا

ہو گیا کچھ اور روشن مطلعِ صبحِ جمال
اُن پہ احساں ہے مرے دستِ گریباں گیر کا

تو مری نظروں کا اعجازِ مسیحائی تو دیکھ
نو بنو ہے دمبدم عالم تری تصویر کا

یہ طلسمِ بے حسی ٹوٹے کسی صورت حفیظؔ
کاش برپا ہو کوئی ہنگامہ دار و گیر کا

احمد ندیم قاسمی

○

عام ہو جائے نہ میرے بتِ مے فام کا نام
گردشِ چشم کو دوں گردشِ ایّام کا نام
نام بدنام ہے نکہت کا، مگر موجِ صبا
چُپ رہی ہے مرے محبوب گل اندام کا نام
وصل کے بعد کی تنہائی بھی اک دُنیا ہے
لوگ آغاز کو دے دیتے ہیں انجام کا نام
شب نہ کٹتی، تو نئی آگ نہ جلتی دل میں
صبح کی ساری شرارت ہے، مگر شام کا نام
دل کی چیخوں میں سنائی نہیں دیتا کچھ بھی
شبِ خاموش ہے شاید اسی کہرام کا نام
آسماں کچھ بھی نہیں، عجزِ بصارت کے سوا
نارسائی ہے محبت کی ـــــ لبِ بام کا نام
کتنے معصوم ہیں انساں، کہ بہل جاتے ہیں
اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام
ایک لمحے کو رُکا ہوں تو افق پھیل گیا
اب تو مر کر بھی نہ لوں گا کبھی آرام کا نام
یوں مسلماں تو بہت ہیں، مگر اب تک نہ سنا
اک مسلماں سے بھی، اک پیروِ اسلام کا نام
یہ فقط میرا تخلّص ہی نہیں ہے کہ "ندیم"
میرا کردار کا کردار ہے، اور نام کا نام

بارکش

مجید امجد

کھنچتے پٹھے، پٹھ پتھریلا، چلتے بجتے سُم
تپتے لہو کی رَو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان،
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جتن،
کالی کھال کے نیچے، گرم، گٹھیلے ماس کا مان!

لیکن تیری اُبلتی آنکھیں، آگ بھری، پُر آب،
سارا بوجھ اور سارا کشٹ، ان آنکھوں کی تقدیر،
لاکھوں گیانی من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید،
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دنیا کی تصویر

مجروح سلطانپوری

○

دستِ پُرخوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے
قتل گہ تھی جسے ہم محفلِ یاراں سمجھے

کچھ بھی دامن میں نہیں خارِ ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھے

ٹوٹے دھاگے ہی سے کرتے ہیں رفو چاکِ جگر
کون بے چارگیٔ سینہ فگاراں سمجھے

ہاں وہ بیدرد تو بیگانہ ہی اچھا یارو
جو نہ توقیرِ غمِ دردگساراں سمجھے

خندہ زن اُس پہ رہے حلقۂ زنجیرِ جنوں
جو نہ کچھ منزلتِ سلسلہ داراں سمجھے

توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کہیے مجروح
تیغ زن کیا ہنرِ زخم شعاراں سمجھے

شادؔ عارفی

○

مشکل سے اُس بُت کی قسمیں   ڈوبی ہوتی ہیں رس میں
کاش مرا دل ہوتا بس میں   ورنہ اُس محفل کی رسمیں
لڑنے کا الزام نہ دیجے   ملتی ہیں نظریں آپس میں
خنجر سے شمشیر بنے گا   وہ ظالم دو چار برس میں
اُس کافر پہ آئی جوانی   ق   اور جوانی کس کے بس میں
یہ پردہ یہ چلمن کب تک   پھول نہیں کانٹوں کے بس میں
مے بن کر کیوں آجاتی ہے   تلخی انگوروں کے رس میں
وقت انھیں جھٹلا دیتا ہے   سب کھاتے ہیں سچی قسمیں
دشمن کو دھوکا مت دیجے   کھا کر میرے سر کی قسمیں
مجبوری میں چند اشارے   طے کر سکتے ہیں آپس میں
شادؔ ”بڑے شاعر“... کھاتے ہیں
”اُس کا جھوٹا“... ”اُس کی قسمیں“

شاد عارفی

○

غم کو رسوائے حکایت کیا کریں
کافرِ "کفرانِ نعمت" کیا کریں
ق
نوجوانوں کو نصیحت کیا کریں
لازمی شے ہے محبت۔ "کیا کریں"؟
ناصحِ مشفق سے پوچھا چاہیے
عشق ہو جائے تو حضرت کیا کریں
زاہدِ قبلہ۔ "بڑی تاخیر کی"
"ختم شد"۔ اب "صرفِ خدمت" کیا کریں
شکر ہے دراصل مجبوری کا نام
"دعوئ صبر و قناعت" کیا کریں
ہم وفاداروں کی "غیبت اور آپ"
ہم ہیں اور "پاسِ شریعت" کیا کریں
دور تک تکتے رہیں اس کی طرف
اور ہم ہنگامِ رخصت کیا کریں
جب کرم کا ان کو آتا ہے خیال
سوچتے ہیں۔ "ترکِ عادت کیا کریں"
ہم بھی چپ ہیں رنگِ محفل دیکھ کر
وہ بھی اظہارِ رفاقت کیا کریں
موسمِ گل کا دلاتی ہے یقیں
باغبانوں کی سیاست۔ کیا کریں؟
بزم جھوٹے شعر کی عادی ہے شاد
التماسِ واقعیت کیا کریں؟

اے ہم وطنو!

مصطفیٰ زیدی

کون ہے آج طلب گارِ نیاز و تعظیم   وہی ہر عہد کا جبروت، وہی کل کے لئیم
وہی عیار گھرانے، وہی فرزانہ حکیم   وہی تم لائقِ صد تذکرہ و صد تکریم
تم وہی دشمنِ احیائے صدا ہو کہ نہیں
پسِ پردہ یہ تمھی جلوہ نما ہو کہ نہیں
تم نے ہر عہد میں ہر نسل سے عیاری کی   تم نے بازاروں میں عقلوں کی خریداری کی
اینٹ سے اینٹ بجادی گئی خودداری کی   خوف کو رکھ لیا خدمت پہ کماں داری کی
آج تم مجھ سے مری جنسِ گراں مانگتے ہو
حلفِ ذہن و وفاداریٔ جاں مانگتے ہو
جاؤ یہ چیز کسی مدح سرا سے مانگو   طائفے والوں سے ڈھولک کی صدا سے مانگو
اپنے درباروں کے جیسے فقرا سے مانگو   اپنے دربار کے گونگے شعرا سے مانگو
مجھ سے پوچھو گے تو خنجر سے عدو بولے گا
گردنیں کاٹ بھی دو گے تو لہو بولے گا
تم نے ہر دور میں دانش پہ کئی وار کیے   کبھی سُولی پہ چڑھا کر لبِ گفتار سِئے
اپنی آسائشِ یک عمرِ گریزاں کے لیے   سب کو تاراج کیا تم نے مگر تم نہ جیے
علم نے خونِ رگِ جان دیا اور نہ مرا
علم نے زہر کا پیمانہ پیا اور نہ مرا
علم سقراط کی آواز ہے عیسیٰ کا لہو   علم گہوارہ و سیارہ و انجام و نمو
علمِ عباسِ علمدار کا زخمی بازو   علم بیٹے کی نئی قبر پہ ماں کے آنسو
وادیٔ ابر میں قطروں کو ترس جاؤ گے
تم ان اشکوں پہ ہنسو گے تو جھلس جاؤ گے

بہ وفاداریٔ تہذیب و فرامینِ علم   بہ گہرباریٔ الفاظ صنادیدِ عجم
بہ صدائے جرسِ قافلۂ اہلِ کرم   مجھ کو ارواحِ شہیدانِ مقدس کی قسم
منزلیں آ کے پکاریں گی سفر سے پہلے
جھک پڑے گا درِ زنداں مرے سر سے پہلے
تم ہی بتلاؤ کہ میں کس کا وفادار بنوں   عصمتِ حرف کا یا دار کا غمخوار بنوں
مشعلوں کا کہ اندھیروں کا طلبگار بنوں   بیچ دوں راز کہ خود محرمِ اسرار بنوں
کون سے دل سے تمھیں ساعتِ فردا دے دوں
قاتلوں کو نفسِ حضرتِ عیسیٰ دے دوں
صبحِ کاشی کا ترنّم مری آواز میں ہے   سندھ کی شام کا آہنگ مرے ساز میں ہے
کوہساروں کی صلابت مرے ایجاز میں ہے   بالِ جبریل کی آہٹ مری پرواز میں ہے
یہ جبیں کون سی چوکھٹ پہ جھکے گی، بولو
کس قفس سے مری پرواز رکے گی، بولو
کس قفس سے غمِ دل قید ہوا ہے اب تک   کس کے فرمان کی پابند ہے رفتارِ فلک
کون سی رات نے روکی ہے ستاروں کی چمک   کس کی دیوار سے سمٹی ہے چنبیلی کی مہک
جھومتے ہیں شبِ میسور کے گیسو اب تک
اک طلسمات ہے بنگال کا جادو اب تک
آج بھی درّۂ خیبر سے اذاں آتی ہے   اب بھی بھٹ شاہ کی ہر رات غزل گاتی ہے
اب بھی لاہور کی ہر شام خراباتی ہے   آج بھی وقت کی نوبت تمھیں سمجھاتی ہے
دل کی درگاہ میں پندار مٹا کر آؤ
اپنی آواز کی پلکوں کو جھکا کر آؤ
آج تم رام کے مونس نہ ہنومان کے دوست   تم نہ کافر کے ثنا خواں نہ مسلمان کے دوست
تم نہ الحاد کے حامی ہو، نہ ایمان کے دوست   تم نہ اشلوک کے ساتھی ہو نہ قرآن کے دوست
تم تو سکّوں کی چمکتی ہوئی جھنکاروں میں
اپنی ماؤں کو اٹھا لاتے ہو بازاروں میں

ذہن پر خوف کی بنیاد اُٹھانے والو   ٹینک اور جیپ کو کھیتوں میں چلانے والو
گیت کے شہر کو بندوق سے ڈھانے والو   فکر کی راہ میں بارود بچھانے والو
کب تک اِس شاخِ گلستاں کی رگیں ٹوٹیں گی
کونپلیں آج نہ پھوٹیں گی تو کل پھوٹیں گی !
ہوگئے راکھ جو کھلیان اُنھیں دیکھا ہے ؟   ایک اک خوشۂ گندم تمھیں کیا کہتا ہے ؟
ایک اک گھاس کی پتی کا فسانہ کیا ہے ؟   آگ اچھی ہے کہ دستورِ نمو اچھا ہے ؟
آج جو بیتی ہے کیا کل بھی یہی بیتے گی
بینڈ جیتے گا کہ شاعر کی غزل جیتے گی
کس پہ لبیک کہو گے کہ نہ ہوگی باہم   جوہری بم کی صدا اور صدائے گوتم
رزق برتر ہے کہ یہ شعلہ بداماں ایٹم   گھر کے چولھے سے اُترتی ہوئی روٹی کی قسم
زخم اچھا ہے کہ ننھی سی کلی اچھی ہے
موت اچھی ہے کہ بچوں کی ہنسی اچھی ہے
کیا قیامت ہے کہ ذرّوں کی زباں جلتی ہے   مصر میں جلوۂ یوسف کی دکاں جلتی ہے
عصمتِ دامنِ مریم کی فغاں جلتی ہے   بھیم کا گرز اور ارجن کی کماں جلتی ہے
چوڑیاں روتی ہیں پیاروں کی جدائی کی طرح
زندگی ننگی ہے بیوہ کی کلائی کی طرح
بوٹ کی نوک سے قبروں کو گرانے والے   تمغۂ مکر سے سینوں کو سجانے والے
جھوجرے، نیونے، قرّابہ اُٹھانے والے   برچھیوں والے، کماں والے، نشانے والے
پھر جگہ ڈھونڈ رہے ہیں کسی بیٹھک کے لیے
ظلم کی دھوپ میں اخلاص کی ٹھنڈک کے لیے
صاحبانِ شبِ دیجور سحر مانگتے ہیں ۔   پیٹ کے زمزمہ خواں دردِ جگر مانگتے ہیں
کور دل، خیر سے، شاہیں کی نظر مانگتے ہیں   آکسیجن کے تلے عمرِ خضر مانگتے ہیں
کم بغل، لطف کا، حاتم سے صلا چاہتے ہیں
فیلیے، دوست کے پردے میں چھپا چاہتے ہیں

تو ہی بول اے درِ زنداں، شبِ غم تو ہی بتا   کیا یہی ہے مرے بے نام شہیدوں کا پتا
کیا یہی ہے مرے معیارِ جنوں کا رستا   دل دہلتے ہیں جو گرتا ہے زمیں پر پتا
کس کی آواز ہے زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
کون سا خوف لگا بیٹھا ہے دیوار کے ساتھ
اتنی ویراں تو کبھی صبحِ بیاباں بھی نہ تھی   اتنی پُرخار کبھی راہِ مغیلاں بھی نہ تھی
کوئی تمہید برائے غمِ دوراں بھی نہ تھی   ہاں کوئی وجہِ گرفتاریٔ یاراں بھی نہ تھی
اے وطن کیسے یہ جالے در و دیوار پہ ہیں
کس شقی کے یہ طمانچے ترے رخسار پہ ہیں
اے وطن یہ ترا اُترا ہوا چہرہ کیوں ہے   غرفہ و بامِ شبستاں میں اندھیرا کیوں ہے
درد پلکوں سے لہو بن کے چھلکتا کیوں ہے   ایک اک سانس پہ تنقید کا پہرا کیوں ہے
کس نے ماں باپ کی سی آنکھ اُٹھالی تجھ سے
چھین لی کس نے ترے کان کی بالی تجھ سے
رودِ راوی ترے ممنونِ کرم کیسے ہیں   صنعتیں کیسی ہیں، تہذیب کے خم کیسے ہیں
اے ہڑپہ ترے مجبور قدم کیسے ہیں   بول اے ٹیکسلا تیرے صنم کیسے ہیں
ذہن میں کون سے معیار ہیں برنائی کے؟
مانچسٹر کے لبادے ہیں کہ ہرنائی کے؟
عسکریت ہے بڑی شے کہ محبت کے اصول   بولہب کا یہ گھرانہ ہے کہ درگاہِ رسولؐ
طبل و لشکر منبر کے ہیں کہ تطہیرِ بتولؓ   مسجدیں علم کا گھر ہیں کہ مشن کے اسکول
جب بھی تاریخ کے قصے ہمیں دُہرائیں گے
خیمۂ شمر میں ہم لوگ نظر آئیں گے

غلام ربانی تاباں

○

وفا نے شیوۂ تسلیم اختیار کیا
حضورِ دوست بہت ہم کو شرمسار کیا

جنوں پہ طنز و ملامت بجا مگر کس نے
چمن میں رنگ فروشی کا کاروبار کیا

ہوئے تو پھر اُسی غمزے کے ہم شکار ہوئے
کیا تو پھر اُسی کافر کا اعتبار کیا

یہ اور بات کوئی وجہِ انتظار نہ تھی
تمام عمر مگر ہم نے انتظار کیا

تری طلب کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ ہے
مرے جنوں کو بھی پابندِ رہ گزار کیا

ق

بہار آنے سے پہلے ترے دوانوں نے
نمو کا راز زمانے پہ آشکار کیا

صبا کی طرح رہے گلستاں میں آوارہ
گلوں کی طرح گریباں کو تار تار کیا

کہاں کہاں سے گزرنا پڑا اُسے تاباں
ہمارے ساتھ سفر جس نے اختیار کیا

مرسیہ

جگن ناتھ آزاد

یہ نظم، شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربیؒ کے زاد بوم مرسیہ (اسپین) میں کہی گئی تھی

کیوں نہ ممتازِ جہاں ہو تری عالی نسبی
تو ہے وہ شہر کہ ہے مولدِ ابنِ عربی
مرسیہ! ان سے فرومایہ نہیں رتبہ ترا
قرطبہ ہو کہ غرناطہ کہ اشبیلیہ!
تو بھی ہے خاتمِ اندلس میں نگینے کی طرح
تو بھی طوفانِ جہاں میں ہے سفینے کی طرح
تری مٹی کا فسوں موجِ گلستاں میں نہیں
ترے ذرّوں کی چمک لعلِ بدخشاں میں نہیں
کل تھا جس طرح طلیطلہ مرا مقصودِ سفر
آج تو عین اُسی طرح ہے مسجودِ نظر
کچھ حقیقت کی خبر ہو مجھے، واللہ نہیں
اور میں شیخؒ کے رُتبے سے بھی آگاہ نہیں
ایک زائر ہوں ترا علم سے بے گانہ سہی
تو بلاشبہ حقیقت ہے میں افسانہ سہی
مجھ کو لیکن دلِ بیتاب لیے پھرتا ہے
دن ہو یا رات ہو اک خواب لیے پھرتا ہے
مرسیہ! لعلِ ادب کا تجھے معدن کہیے
یا تجھے نطق گہربار کا مخزن کہیے
کشتیِ روح کا طوفاں میں سہارا تو ہے
یہ جہاں روم سمندر ہے کنارا تو ہے
اور چمکیں گے تری خاک کے ذرّات ابھی
تجھ کو معلوم نہیں اپنے مقامات ابھی
وقت آئے گا جب اسپین تجھے جانے گا
جو ترا رُتبۂ عالی ہے وہ پہچانے گا
آج ناقدریٔ ایام سے تاراج ہے تو
ورنہ ایام کے ماتھے کا حسیں تاج ہے تو

راز یزدانی

جنوں سے حلقۂ دانش کے درمیاں پہنچی
کہاں سے بات الجھتی ہوئی کہاں پہنچی

خبر ملی کہ ابھی وہ یہاں سے گزرے ہیں
مری نگاہِ محبت جہاں جہاں پہنچی

بلند تر ہے چمن سے حریمِ نازِ بہار
جہاں نہ کشمکشِ برق و آشیاں پہنچی

یہ برقِ طور یہ دار و رسن یہ غنچہ و گل
کہاں کہاں نہ مری سعیِ رائگاں پہنچی

حریمِ دوست بھی کس کی گزر ہوئی ہے، مگر
نظر بہ رنگِ حریفِ مزاج داں پہنچی

یقیں کے بعد ہے کیا اس نگاہ کی منزل
حدودِ بزمِ یقیں تک جو بدگماں پہنچی

شدید تر تو نہ تھے ضابطے اسیری کے
مگر قفس میں نہ رودادِ آشیاں پہنچی

جہاں ہے شکرِ ستم بھی خطا شعاری میں
اس انجمن میں بھی فریادِ بیدلاں پہنچی

حجابِ دوست۔ ذرا لن ترانیوں سے بھی پوچھ
کہاں تک اپنی محبت کی داستاں پہنچی

جبیں پہ داغِ ندامت غلط نہیں اے چاند
مجھے خبر ہے۔ تری چاندنی کہاں پہنچی

فلک نے رات جلائے کئی چراغ اے رازؔ
کہاں تک اپنے اندھیروں کی داستاں پہنچی

میکشؔ اکبرآبادی

○

کلائی اُس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی
نقاب اُس نے سنبھالی مگر سرک بھی گئی

وہی چراغِ تمنّا وہی پیامِ اجل
جو برق راہ کو چمکا گئی کڑک بھی گئی

کبھی وہ طرزِ ستم بھا گئی مرے دل کو
کبھی وہ شانِ ترحم مجھے کھٹک بھی گئی

نسیم آئی ہے شاید گلے لگا کے انھیں
کہ میرے پاس تو آئی مگر جھجک بھی گئی

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر آبروئے شک بھی گئی

وہ اک نظر مری عقل و جنوں کا حاصل ہے
جو اُس نظر سے ملی اور پھر بہک بھی گئی

نگاہِ دوست سے دل میرا خوں ہوا میکشؔ
نگاہِ دوست سے میری غزل مہک بھی گئی

عبدالعزیز خالد

○

دل کا فسانہ طلسمِ ہوشربا ہے
عیش و عقوبت ہے رنج و گنج و عنا ہے
دیو پری کو فریب سے کرے اغوا
نور کا بکتا ہے مشتِ گل پہ فدا ہے
حیرت زدہ افراسیاب ششدر و حیراں
کوکبِ رخشاں نے کس کا ساتھ دیا ہے
عمرو کی عیّاریوں سے ہر کوئی عاجز
یہ ہے نظر کردہ اس سے کون بچا ہے
اوڑھے گلیم اور ہو نگاہ سے اوجھل
اس کو نبیؐ سے عجیب تحفہ ملا ہے
مرد و مخنّث کبھی، کبھی زن و امرد
ذائقہ اس نے طرح طرح کا چکھا ہے
مُوئے کو آتی ہیں قسم قسم کی گھاتیں
دھم سے مری خوابگاہ میں کود پڑا ہے
جال میں ہر شے سمیٹ کر بھی نہیں خوش
طعنۂ بخیلی کے سن کے جھینپ رہا ہے
ایک بلا ہیں امیرِ حمزہ کے پوتے
ہر گھڑی کوئی نہ کوئی فتنہ بپا ہے
گرسنہ ہے شیرِ شرزہ، بیشہ ہے خالی
بچ کے غزالو، کہ خون منہ کو لگا ہے
جام کھنکتے ہیں بزم میں ہے گھما گھم
ساقیِ گلچہرہ سلسبیل بنا ہے
مست نگہ میں اثر خمار کا چھلکے
نشّے کے ڈوروں نے چہرہ لال کیا ہے
مضطرِ لذّت ہے زرنگار چھپر کھٹ
فرشِ مشجّر کا چاندنی پہ بچھا ہے
لاتی ہیں پریوں کے ڈولے چاندنی راتیں
بن بخدا حجلۂ زفاف بنا ہے
برق گھٹا میں چھپی ہے بدر دُجی میں
دلبرِ دوشیزہ محوِ ناز و ادا ہے
لہلہی پوشاک رنگ روپ بھبوکا
آتشِ سیّال نے گلال کیا ہے
دیتی ہے نشّے میں چھاتیوں کے ٹہوکے
جام بیک جرعہ در کشید کیا ہے
خاطرِ مشتاق وصل کی متقاضی
ہونٹ پہ انکار ہے نظر میں رضا ہے
چاکِ عمودی سے جھلکے گوٹے گریباں
دیدہ و دانستہ بے نقاب کیا ہے

ایسی دھما چوکڑی سے مجھے نہیں بھاتی   بیٹھے نچلے ہر ایک کو دیکھ رہا ہے
لہجہ کہ جیسے پہاڑ سے جھرے جھرنا   باغ میں کوئل کہیں پہ کوک رہا ہے
کون سمجھتا ہے مہوشوں کے بہانے   تم سے لگائی بجھائی ہم سے گلا ہے
رم کریں وحشت سے خواستگار تلذذ   نام کھدے ان کا جس نگیں پہ گئی ہے
کر نہ مرے دشمنوں سے لطف و مدارا   جو پھرے عہدِ وفا سے ننگِ وفا ہے
آئی ہے تم جانو راہ کی تھکی ماندی   چہرے کی رنگت اڑی ہے سانس چڑھا ہے
جھٹ کے ہٹاتی ہے سینے پر سے دوپٹہ   اس کو برس آن گنا شروع ہوا ہے
ننگے کھلے ہونے کی میں آپ ہوں حامی   کاندھے سے ڈھلکا دوپٹہ سینہ کھلا ہے

ڈال کے سایہ مجھے دوانہ بنایا
سحر ہے افسوں ہے جذب کاہ رُبا ہے

(ب)

رس بھرے ہونٹوں کا ہم پئیں گے سدا رس   اور کوئی ہوں گے چھلکے چوسنے والے
معتکفِ کنجِ انزوا و خموشی   بُردِ یمانی خیال و خواب کی اوڑھے
سائی بدھائی ہے جوڑ توڑ ہے کیا کیا   سوتے ہیں تیغِ برہنہ بیچ میں رکھ کے
لیٹی ہیں چھ واہیاں چنارسی جگمگ   کیلے کے پتے بچھے ہیں پیڑ کے نیچے
دوست ہے ایکو، سکوت ہے ہمدم   لومۃ لائم نہ بے وفائی کے دھڑکے
بادِ بہاری چلے ہمیشہ جلو میں   روشنی تجھ سے طلیعۂ سحری لے
کیوں میں پرائے مزے میں ڈالتی کھنڈت   ہر کوئی مسئول قول و فعل کا اپنے
رشکِ قمر مبتلا خوفِ الم میں   ہونٹوں پہ بتخالے اور تلووں میں چھالے
سنگِ شرارت سے چور شیشۂ عصمت   آتشِ سوزندہ چہرہ فرطِ شفق سے
نیند جوانی کی سوئے موئے برابر   بال جھٹکتی دوپٹہ اوڑھتی اٹھے
لڑکی سنا ہے کہ کرتی پھرتی ہے سیریں   کس کے سراغی ہیں ٹوٹے ہار کے دانے
شوق اِدھر ہے اُدھر ہے شرم و تکلف   دیکھیے آغاز ہو کس اور سے پہلے
مردِ عبیدِ نسا و خادمِ نسواں   پلکیں ہمیشہ نئی نویلی کے نیچے

چھپ لیے گرہن نے دانہ ہائے کواکب
مرغِ شباہنگ کے لبوں پہ ہیں نالے
مسی لگی ہے جما ہوا ہے لکھوٹا
ایسی حسیں بھی نہیں کہ جو کوئی رتجگے
شرمگیں چتون ہے اور مدھ بھری آنکھیں
دیدۂ ناظر، فروغِ حسن سے جھپکے
مردوئے دم دعا کے جھانسے مجھ کو نہ بتلا
کاٹے ہیں کس پہلتن نے شیر کے پنجے
کر نہ اس آوارہ خانماں سے محبت
سہ نہ سکے گی مسافروں کے وچھوڑے
رہتے ہیں رہن بلائے سحر ہمیشہ
حمزہ کے نورِ نظر ہیں عقل کے کورے
عارضہ کمبخت کو چھنالے کا لاحق
عشق جتاتی ہے جھوٹ موٹ ہر اک سے
ہوش میں آؤ کجا تم اور کجا میں
آئیں گے اب لوٹ کر نہ پہلے زمانے
موچ کلائی میں آئی چوڑیاں ٹوٹیں
زلفِ چلیپا لپٹ گئی ہے کمر سے
دست و گریباں ہے شوق و شرم سے شوخی
ہنس کے طمانچہ وہ ڈھیلے ہاتھ سے مارے
پاؤں کی چھاگل سنائے مژدۂ آمد
دستِ حنائی میں پور پور ہیں چھلے
چھیڑنے والی نہانی راز کی بھیدی
نیند کو کھوئے لپٹ کے رس بھری سوئے
گھومے ہزاروں جگہ اکیلی دکیلی
سیر کا لپکا ہے گھٹ کے گھر میں نہ بیٹھے
آؤ تو کوئی نہیں ہے بارہ دری میں
ڈوبتے سورج کے ہیں یہ آخری شعلے
نہروں پہ ہر جا کنول بلور کے روشن
ڈال دیے مانجھنوں نے چشموں میں بجرے
محض حصولِ نشاط کے لیے زندہ
یہ جو نظر آ رہے ہیں چھیل چھبیلے
سیفِ سیاست ابن آفتابِ سعادت
محترز آرزو و ہوس سے ریب و ریا سے
اصلِ کرامت ہے استجابتِ دعوات
اُخلُوا اکباد کم کی رمز سمجھ لے
میں تو ہوں مشغول برگِ راہِ قیامت
مسئلے سود و زیاں کے پوچھ نہ مجھ سے
آپ عبارت نگار آپ معبر
کوئی سخن فہم ہو تو دادِ سخن دے
فکر و نظر کا سفر ہے کارِ محبت
کر نہ کسی سے تو بحثِ علم میں جھگڑے

شوق کو یکساں ہے مدح و ذمِ خلائق
آگ کے دریا میں عشق غوطہ لگائے

عبدالمجید حیرت

○

آپ کی جب سے توجہ کم ہے
اس گنہگار کو غم ہی غم ہے
کون سی شب ہے کہ ہے بے شیون
کون سا دن ہے کہ بے ماتم ہے
وہ جو اک یورشِ غم ہے ہم پر
وہ بھی تھم تھم کے نہیں، پیہم ہے
اثرِ آہ و فغاں دیکھ لیا
آنکھ مشکل سے کسی کی نم ہے
چارہ گر جلد توجہ فرمائیں
جانے کس کس کا لبوں پر دم ہے
آشیانے کے عوض، کنجِ قفس
ایک افتاد یہی کیا کم ہے
کب نکالے سے نکل سکتا ہے
وہ جو اُس زلفِ دوتا میں خم ہے
نقص کچھ اُن کے تکلم میں نہیں
صرف اندازِ بیاں مبہم ہے
دیکھ کر رنگِ جہاں اے حیرتؔ
اور شیرازۂ دل برہم ہے

ٹیڑھی دیوار

ظہور نظر

یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے
گر گئی رنگ کی دیوار
بجھی شمعِ جنوں
کوئی بے جان سا شرارہ بھی نہ ٹھہرا دل میں
شعلۂ دردِ گریزاں کو تو کیا روکتا میں
موجۂ دودِ تمنّا بھی نہ ٹھہرا دل میں

اس قدر تیز ہوا
اتنی بیابانیٔ دل،
اتنی مغموم وفا، پہلے نہ دیکھی نہ سُنی
یاد کا کیا ہے، — سرِ دشتِ وفا
یاد تو اب بھی چمکتی ہے مگر تو ہی بتا
ریت کے ڈھیر سے ابرق کی ذری کس نے چُنی ؟
چاند کے نور سے پوشاکِ سحر کس نے بُنی ؟

تجھ کو اصرار ہے —— یہ ،
اس قدر تیز ہَوا ،
اتنی بیابانیِ دل،
اتنی معدومِ وفا جو کبھی دیکھی نہ سنی
صرف تجدیدِ محبّت کے نہ ہونے تک ہے
تیری زلفیں میری باہوں پہ نہ سونے تک ہے

اور میں سوچتا ہوں
دشتِ امکاں میں بجز،
منتشر ریگِ تمنّا کیا ہے
کیا میں تجدیدِ محبت کے محل کی دیوار
منتشر ریگِ تمنا سے اٹھا لوں گا؟ نہیں!
یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے !!

بن کے آسیب ،
شبیں پاؤں پٹکتی ہوں جہاں
سرمدی اپنے تعاقب میں بھٹکتی ہوں جہاں
شہرِ مہتاب رنگ کی تعمیر کرے کس کا دل !!
یہ خرابہ کبھی آباد نہ ہوگا مجھ سے !!

شاعر لکھنوی

○

مجھے اب اعتبارِ غم نہیں ہے
بہت دن سے کوئی برہم نہیں ہے
وہ کیوں دیکھے گلوں کی مسکراہٹ
جسے اندازۂ شبنم نہیں ہے
تجلّی کی فراوانی مسلّم
نظر کا حوصلہ بھی کم نہیں ہے
بدل کر رہ گئی تاریخِ جنّت
جوابِ لغزشِ آدم نہیں ہے
کلی چٹکے تو بڑھ جاتی ہے خوشبو
شکستِ دل کی قیمت کم نہیں ہے
خوشا یہ عالمِ چشمِ توجّہ
نظر میں اب کوئی عالم نہیں ہے
فریبِ ماہ و انجم کھانے والو
خود اپنی روشنی بھی کم نہیں ہے
ہوئے آزاد تو سمجھے یہ شاعرؔ
رہائی قید سے کچھ کم نہیں ہے

ایک حادثہ

نور بجنوری

خوابوں کی مہکتی سیجوں پر
گیتوں کا دھواں لہرانے لگا
احساس کی نازک شاخوں میں
عفریتِ ہوس بل کھانے لگا
شہنائی کی ظالم چیخوں سے
ایوانِ وفا تھرّانے لگا

وعدوں کے لچکتے ریشم سے
فولاد کے بے حس تیر بنے
افلاک شفق میں ڈوب گئے
خورشید و قمر نخچیر بنے
وہ عارض و لب اس محشر میں
کس کس کے لیے تصویر بنے

اک موج کفِ ساحل سے اٹھی
اور اپنا سفینہ لوٹ گئی
اک نار کے چنچل ہاتھوں میں
چاہت کی گگریا پھوٹ گئی
دل جس کے لیے ضد کرتا تھا
وہ کانچ کی گڑیا ٹوٹ گئی

نوّر بجنوری

○

بال بکھرائے کوئی دل کے حرم سے نکلا!
ایک شعلہ سا مری نوکِ قلم سے نکلا

وحشتِ عشق نے جی بھر کے مچائیں دھومیں
وہ بیاباں بھی مرے نقشِ قدم سے نکلا

سِل گئے ہونٹ تو ہر موئے بدن بول اٹھا
یہ بھی دستور ترے عہد میں ہم سے نکلا!

اپنے صحرا کے مقدر میں کوئی پھول نہیں !
ایک آنسو نہ تری چشمِ کرم سے نکلا!!

چوم لو فرطِ عقیدت سے چھلکتا ہوا جام
یہ وہ خورشید ہے جو مطلعِ جسم سے نکلا

نوّر گل کر دیے یاروں نے محبت کے چراغ
خارِ حسرت بھی یہاں دام و درم سے نکلا

خوابوں سے ڈر لگتا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

کل کا سورج اسی دہلیز پہ دیکھے گا مجھے
کل بھی کشکول مرا شام کو بھر جائے گا
کل کی تخلیق بھی ہوگی یہی اک نانِ جویں
کل بھی ہر دن کی طرح یونہی گزر جائے گا

بھوک کی آگ جو بجھتی ہے تو نیند آتی ہے
نیند آتی ہے تو کچھ خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب میں ملتے ہیں کچھ لوگ، بچھڑ جاتے ہیں
ان کی یاد اور بھی رہ رہ کے ستاتی ہے مجھے

کل بھی ڈھونڈوں گا انھیں جا کے گلی کوچوں میں
کل بھی مل جائیں گے ان خوابوں کے پیکر کتنے
کل بھی یہ ہاتھ لگاتے ہی بدل جائیں گے
کل بھی پھینکیں گے مری سمت یہ پتھر کتنے

آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی
آج کی رات مجھے خوابوں سے ڈر لگتا ہے

شعر گوئی کی میسر ہو جو فرصت اے دوست

احسن علی خاں

زندگی ہے مری اک جہدِ معیشت، اے دوست
شعر کہنے کی نہیں ہے مجھے فرصت اے دوست
شوقِ نظارہ بھی ہے، ذوقِ سماعت بھی مگر
خواہشِ جلوہ و نغمہ ہے اک حسرت اے دوست
شمعِ جذبات کی لو مثلِ زباں ہے لیکن
کیسے بخشوں اسے گفتار کی طاقت اے دوست
گھٹ کے رہ جائے تو احساسِ مسرت بھی ہے غم
گیت بن جائے تو غم بھی ہے مسرت، اے دوست
صاف و سادہ ہے بہت حرفِ صداقت اے دوست
اس میں کس طرح بھر دوں رنگِ اشارات اے دوست
تج کے دنیا، میں کہوں شعر، مگر کیا ہوگا
نخلِ احساس و تخیل کا ثمر کیا ہوگا؟
ہوں گے اشعار مرے حزن و طرب کے آنسو،
گر گئے ریت پہ یہ اشک اگر، کیا ہوگا
"مردِ ناداں سے گلہ کیا کہ نہیں اس میں سمجھ
جو ہو دانا کے بھی ہیرے کا جگر، کیا ہوگا؟"
جہاں ایٹم کے دھماکوں سے ہیں مفلوج اعصاب
اس جگہ گوش برآوازِ بشر کیا ہوگا؟
میری اس تلخ نوائی کا اثر کیا ہوگا؟
پھر بھی کیوں ہے مجھے کچھ کہنے کی حسرت اے دوست

اس لیے ہے کہ حقیقت میں مرا قلبِ حزیں
منفعل ہے، مگر انساں سے مایوس نہیں
یہ وہ انساں ہے کہ جس نے زمیں کو تسخیر
اور جو چوم رہا ہے مہ و زہرہ کی جبیں
ایک عالم کے عناصر تو کیے ہیں بس میں
اختیار اُس کو مگر اپنی ہی فطرت پہ نہیں
آہ، بیچارہ کشاکش میں ہے بین ضدّین
کبھی نزدیکِ خدا ہے، کبھی شیطاں کے قریں
مگر انساں ہے نہ اللہ، نہ ابلیس لعین
وہ تو انساں ہے بایں پستی و عظمت اے دوست

خیر و شر کیا؟ فقط احساسِ ضمیرِ بیدار
اور ضمیر؟ ایک نگہبانِ متاعِ اقدار
اور قدریں؟ وہ نواہی و اوامر کے ستون
جن پہ جمعیتِ انساں کی عمارت کا ہے بار
مگر افسوس کہ جمعیتِ انسان ہے آج
کہیں مغرب، کہیں مشرق کے خداؤں کی شکار
یہ خدا، اُف یہ خدا، قاتلِ انساں، یہ خدا!
ان خداؤں کی ثنا مجھ سے نہ ہوگی زنہار
صرف انسان کے گُن گائیں گے میرے اشعار
شعر گوئی کی میسّر ہو جو فرصت اے دوست

جمیل ملک

○

رو رو آنسو خشک ہوئے، برسات آئی، برسات گئی
کون کہے اب کس کے دوارے اشکوں کی بارات گئی

بیتے سال کی بات ہے کیا کیا چھم چھم بادل برسے تھے
اب کے برس تم پاس نہیں تو بن برسے برسات گئی

کس امید پہ جیون کاٹیں، کس سے من کی بات کہیں
تیرے ملن کی آس تھی جھوٹی، وہ بھی تیرے سات[1] گئی

سنگی ساتھی پاس نہیں تھے، دشمن گھات میں بیٹھے تھے
جان سی چیز ملی تھی ہم کو، وہ بھی ہاتھوں ہات[2] گئی

ڈوب گئے آشا کے تارے، راکھ ہوئے پروانے بھی
نگر نگر کے دیپ بجھا کر اب کس دیس میں رات گئی

جگ سے توڑ کے رشتے ناطے کیوں گم سم بیٹھے ہو جمیلؔ
اٹھو، سورج سر پہ آیا، رات کے ساتھ وہ بات گئی

---

[1] ساتھ [2] ہاتھ

طلوع و غروب

فارغ بخاری

تجھے یاد ہوگا
اسی موڑ پر ایک دن ہم ملے تھے
وہ دن کیا بہار آفریں تھا
خوشی سے گلوں کی طرح ہم کھلے تھے
حسین قمقموں کے چراغاں تھے ہر سُو
خزاں کے تصور سے نا آشنا
رنگ و بو کے سفینے ہیں
ذوقِ جنوں کے سہارے بہے جا رہے تھے

اسی موڑ پر توڑ کر آج بندھن
بڑی بے دلی سے جدا ہو رہے ہیں
کہ جیسے کسی اجنبی راستے پر
جدا ہونے کو دو مسافر ملے ہوں

جان پہچان

خاطر غزنوی

اونگھتی گلیوں میں ڈھولک کی صدائیں سو گئیں
تھک گئی ہو گویا سب بے تاب ہاتھوں میں حنا
اجنبی خوشبو کی لپٹوں میں بسا حجلہ
سکوں افزا فضا
شوریدہ سر جذبوں کی باہم سازشیں
خامشی کے دودھیا چہرے پہ پردوں کی حزیں سی سرسراہٹ سے خراشوں کے نشاں
تازہ پھولوں کی جواں مہکار میں لپٹا ہوا
مخمل و کمخواب کے بستر پہ ابریشم کا ڈھیر
جس کے ہر ریشے نے بخشیں خوابگوں نرماہٹیں

یاد ہے اب سے اٹھارہ سال پہلے کی وہ رات
میں نے جب لہجے میں نازک تتلیوں کی نرم اڑانوں کا تاثر گھول کر ——
نام پوچھا —— !
اُس سے اُس کے گاؤں کی اِک اِک گلی کی بات کی !!
اُس کی ہر مرغوب، نامرغوب شے پر بحث کی !!!

اطلسی ملبوس،
گورے رنگ،
کاجل سے جھکی پلکوں،
لجائی شوخ آنکھوں
اور اُس ملبوس سے بھی نرم بالوں کی ستائش میں حسیں الفاظ کے دریا بہائے!!!!

ہم اٹھارہ سال سے ملتے ہیں روز
مخمل و کمخواب کے بستر پہ اب ریشم کا ڈھیر
بکھرے بکھرے چند ریشوں کے سوا کچھ بھی نہیں
اطلسی زلفیں ——— دھواں،
اور رنگ ——— روز و شب کی راکھ
شوخ آنکھوں میں کئی بیتی ہوئی راتوں کے خواب
اور پلکوں پر زمانوں کے سفر کی گرد کی گہری تہیں

ہم اٹھارہ سال سے اک دوسرے کو دیکھتے ہیں صبح و شام
میری باتیں،
میری بحثیں!!
میری راہیں!!!
میرے ہاتھ!!!!
اُس کے محرم ہیں تمام
ہو سکا لیکن نہ اب تک اُس کا محرم ——— میرا نام

شفقت کاظمی

○

خوش ہو کے سہہ رہا ہوں زمانے کے غم ابھی
اتنی تو ہے کسی سے امیدِ کرم ابھی
ان دُوریوں پہ بھی تجھے پاتے ہیں رُو برو
جیسے دخیل ہوں تیری خلوت میں ہم ابھی
مجھ پر ہوئی جو تیری نوازش تو کیا ہوا
کیا جانے کتنے لوگ ہیں بربادِ غم ابھی
شاید مرے خلوص میں ہوگی کوئی کمی
آتے ہیں ورنہ کیوں وہ تصور میں کم ابھی
تمہیدِ التفات اُٹھانے سے فائدہ
ہم کو ہیں یاد وہ تیرے اگلے کرم ابھی
راہِ دیارِ دوست ملے کب خبر نہیں
پیشِ نظر ہے جلوۂ دیر و حرم ابھی
وہ لوگ بیشتر جو دغا دے گئے تجھے
تیری نگاہ میں ہیں وہی محترم ابھی
محرومیوں نے گھیر لیا کاظمی ہمیں
رکھا تھا راہِ دوست میں پہلا قدم ابھی

رفعت سلطان

○

زہر بھی اب نہیں پیمانے میں
جائیں کیا سوچ کے میخانے میں
آ کے بیٹھا ہے جو ویرانے میں
ہے شعور اتنا تو دیوانے میں
اک صنم سے ہے عقیدت مجھ کو
چھپ کے جاتا ہوں صنم خانے میں
چاندنی رات ہے پھر چاندنی رات
ہو نہ عذر اُن کو اگر آنے میں
تیری آنکھوں کا تغافل تو نہیں
لوگ کیوں جاتے ہیں میخانے میں!
اس قدر سہل نہیں جل مرنا
شمع کا سوز ہے پروانے میں
یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
آپ اور میرے سیہ خانے میں!
چھوڑ آئے ہیں ترا شہر، مگر
دل کو تسکیں نہیں ویرانے میں
ذکر کرتے ہوئے اُن آنکھوں کا
ہم چلے آئے ہیں میخانے میں
ہے وہی میرا خدا بھی رفعتؔ
چھپ کے بیٹھا ہے جو بتخانے میں

یوسف جمال انصاری

○

کس کو سُدھ بُدھ ہے تن من کی، کس کو ہے اپنا چاو یہاں
ریت کی ڈور میں جیسے بندھی ہو اپنی جیون ناو یہاں
اَنہونی جب ہونی ٹھہری، کس کی شکایت کس سے گِلہ
کب بھرتے ہیں گھاؤ یہاں، تم کتنے ہی اشک بہاو یہاں
یادِ خدا میں ہم دنیا سے ہات اُٹھائے بیٹھے ہیں،
بھولی بھالی صورت والو! ہم کو مت پرچاو یہاں
اپنے آپ پہ مرنے والو! اپنے کو پہچانو بھی
آئینہ چمکانے والو! چہرہ تو چمکاو یہاں
ہنس کے کبھی تو کلام کرو، ہم دکھیاروں کو رام کرو
حسن و جوانی دو دن کے ہیں، رہ جاتا ہے سبھاو یہاں
اپنے آپ میں ڈوب نہ جاؤں جیسے موتی ساگر میں
جس کو میں نے دل میں جگہ دی اُس نے کیا ستھراو یہاں
پیر پیمبر کتنے آئے دنیا داری کم نہ ہوئی
پک گئے کان یہ سنتے سنتے "بابا! دل نہ لگاو یہاں"
خون خرابہ کرنے والے چاند پہ دھاوا ماریں گے
دھرتی کے پھیلاو سے بڑھ کر حرص کا ہے پھیلاو یہاں
پھولوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، کانٹوں سے رِستا ہے لہو
بادِ خزاں نے کیا ہے اب کی کیسا کچھ پتھراو یہاں
پانی سے تشبیہہ نہ دوں گا، پانی بھی کب سستا ہے
پوچھنے والے پوچھ رہا ہے خونِ وفا کا بھاو یہاں
اپنے آپ سے کب تک پیارے آنکھ مچولی کھیلوگے؟
ست جُگ ہے یہ بھول بھلیاں، جو ڈھونڈو سو پاو یہاں

بشیر بدر

○

جب تک نگارِ دشت کا سینہ دُکھا نہ تھا
صحرا میں کوئی لالۂ صحرا کھِلا نہ تھا
دو جھیلیں ۔ اُس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اُس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا
جاگی نہ تھیں نسوں میں تمنّا کی ناگنیں
اِس گندمی شراب کو جب تک چکھا نہ تھا
ڈھونڈھا کرو جہانِ تحیّر میں عمر بھر
وہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے میں نے کہا نہ تھا
اِک بے وفا کے سامنے آنسو بہاتے ہم؟
اتنا ہماری آنکھ کا پانی مرا نہ تھا
دو کالے ہونٹ ۔ جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا
سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کو لائے تھے
اک ہم ہی ایسے تھے کہ ہمارا خدا نہ تھا
وہ کالی آنکھیں شہر میں مشہور تھیں بہت
تب اُن پہ موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا نہ تھا

میں ۔ صاحبِ غزل تھا حسینوں کی بزم میں
سر پہ گھنیرے بال تھے ماتھا کھُلا نہ تھا

خالدؔ مینائی

○

صحنِ چمن میں ذکر ہے گفتارِ یار کا
لے جوئبار کی ہے ترنّم ہزار کا
کشتہ ہوں نرمیٔ نگہِ چشمِ یار کا
مارا مجھے اگرچہ ہے اندازِ پیار کا
ہے سلسلہ ازل سے خزاں اور بہار کا
فطرت کو اک جنون ہے تکمیلِ کار کا
وہ صحنِ باغ اور وہ آمد بہار کی
وہ وقتِ صبح اور وہ عالم نکھار کا
سب کچھ بھلا چکا ہوں مگر بھولتا نہیں
جانا دلِ حزیں کا اور آنا بہار کا
دل کو عزیز خاطرِ الفت بہار میں،
الفت کو پاس اک دلِ دیوانہ وار کا
لانا نہ لب پہ حرفِ شکایت حضورِ دوست
آنا مگر وہ گریۂ بے اختیار کا
کتنی فسوں طراز ہے وہ چشمِ التفات
ہوتا ہے جبر پر بھی گماں اختیار کا
اُس سمت جو نظر بھی ہے پروانہ وار ہے
کیا وصف کیجئے رُخِ زیبائے یار کا
آئی تو ہائے حشر میں دامن کی یاد آئی
دینا پڑا حساب ہمیں تار تار کا
مجھ سے سنو حکایتِ جورِ فلک کہ میں
مارا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا
جب سے ادا شناسِ محبّت ہوا ہے دل
شکوہ نہیں رہا ستمِ روزگار کا
اب میں ہوں اور سرورِ مئے دل گدازِ عشق
اب جیت کی خوشی ہے نہ کچھ رنج ہار کا
اہلِ وفا کو تیری محبت سے کام ہے
شکوہ فراق کا نہ گلہ انتظار کا
گویا ہیں مجھ سے آخرِ شب کی خموشیاں
اک شور ہے کہ شکر ہے پروردگار کا

خالدؔ جگر تو آنکھ سے خوں ہو کے بہ گیا
اب رنگ دیکھتا ہے دلِ بیقرار کا

اختر ہوشیارپوری

○

یوں نہ خود کو کبھی آوارہ و رسوا کرتے
ہم اگر جانتے کیوں تیری تمنا کرتے

پتہ کھڑکے بھی تو ہم تیری صدا جانتے ہیں
شب کے سناٹے میں کیوں تجھ کو پکارا کرتے

یہ بدن آئنہ آسا یہ جبیں ماہِ تمام
تو اگر پاس بھی ہوتا تجھے دیکھا کرتے

ہم تو اے دوست! محبت میں جہاں سے گزرے
تم بھی اک روز کسی وعدے کو ایفا کرتے

کوئی اس پھیلے ہوئے دشت میں زنداں ہوتا
اپنا احوال ہی دیواروں سے پوچھا کرتے

اب تو یہ سوچ کے چپ ہیں کہ ہیں محروم تمام
مل بھی جاتا وہ اگر ہم کو تو پھر کیا کرتے

نگہِ شوق نہ اُس رُخ سے پلٹ کر آئی
عمر گزری نگہِ شوق کو رُسوا کرتے

غمِ دل پہ غمِ جاں پہ کہ غمِ دوراں پہ
زیست! تیرے لیے کس کس پہ بھروسا کرتے

تیری نظروں نے یہ انداز کہاں سے پائے
کاش ہم تجھ کو شریکِ غمِ دنیا کرتے

زندگی اپنی بہرحال بسر ہو جاتی
تو نہ آتا تو ترا راستہ دیکھا کرتے

دل پریشاں کا پریشاں ہی رہے گا اخترؔ
یہ اگر جانتے کیوں ترکِ تمنا کرتے

جاگتا سوتا موسم

شاعر ندیم

کس سے پوچھوں کہ یہ عالم کیا ہے
خود اس دردِ غمِ زیست کا مرہم کیا ہے
نہ دلِ زار کسی وجہِ تسلی کے قریں
نہ ضیا پاشِ مری رات کے تاروں کی جبیں
داغِ دل ایک طرف داغِ جگر ایک طرف
پارہ پارہ مری جمعیتِ خاطر کی زمیں ،

نہ کسی لب پہ کسی نامِ وفا کا الہام
نہ کوئی چاہنے والوں میں بہت ہی بدنام
نہ بہاروں ہی کا موسم نہ خزاں کی یورش
نہ ابھی صبح کی مستی نہ خمارِ مئے شام
نہ چمن سوگ کی موجوں میں ابھی ڈوبا ہے
نہ سرِ شاخ گل و لالہ و نسریں کا مقام

نہ خیالِ خط و خالِ رُخ و چشمِ بیمار
نہ نمائش پہ ہیں آمادہ نقوشِ خمدار
یاد کی بزم جو سجتی ہے تو پھیکی پھیکی
بھولنے کو بھی اُسے دل نہیں ہوتا تیار
عاشقی کشمکشِ مرگِ مسلسل کی نمود
کچھ وہی حال سا جیسے کہ "مریز و کجدار"

نہ کوئی خضرِ رہِ شوق نہ بالِ جبریل
نہ ٹھہرنے کی اجازت نہ کہیں بانگِ رحیل
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ بھی نہیں
نہ کوئی گردشِ ایام سے بچنے کی سبیل
کیا کسی طرح نہ بیتے گا یہ رنگیں ماتم
یہ مرا جاگتا سوتا موسم

عالمی اسلحہ نمائش

ابو سعید قریشی

(۱)

سپتنک

یہ سپٹنک، واسٹوک اور ماہتابی کیپشیول
قصرِ استبداد کے اُڑتے نقیب
دیوِ استعمار کے سارے اسیر
گیگارن اور اس کے سب بھائی تمام
کائناتی کیپشیول کے رحم میں
سائنسی انسان کے تخم
جا رہے ہیں ماہتابی زچہ خانوں کی طرف
کرۂ خاکی سے دور!!
اپنی پیدائش کے عنواں کے لیے

ہاں میاں۔ اسقاط کیوں ممکن نہیں!
کون جانے آج تک
کتنے سپٹنک کھو چکے
اور ان کے بطن میں
کتنے جیالے۔ مرد میداں، سُورما!
زندگی سے ہاتھ اپنے دھو چکے!

یہ مگر مت بھولنا کہ دیوتا نے جنگ کے
بھینٹ لے کر دے دیا ہے
ان کو اپنا اگن بان
اور اک اونچا مقام
ان کی زد میں آگئے ہیں اس طرح
قصرِ ویران اور شہرِ تابناک
جگمگاتی شاہراہیں
ملگجے خوابوں کے کنج
رقص گاہیں، معبد و ایوان —— سب
اک بگولا بن کے اُڑ سکتے ہیں
اس تہذیب کے منظر تمام

یہ شپنگ ۔ ہواسٹوک ——!
کائناتی مورچوں کے پاسباں
آج ان کی زد میں ہیں
ہفت آسمان
ان سے بچ کر کوئی جائے گا کہاں

(۲)

مِسائیل

اور یہ مِسائیل ہے
ملک الموت کی پیغام رساں
پیٹ میں آگ لیے
ناگ لیے
عقل کا سحر و فسوں
سامری فن کے اشارے پہ یہ اُڑتی ڈائن

کسی مامن، کسی مسجد، کسی مندر، کسی مکتب سے نہیں ڈرتی ہے
نئی دُنیا کہ پُرانی دُنیا
اس کی بس ایک اڑان
پیرس و لندن و نیویارک
ماسکو، قاہرہ، دلّی، بغداد
بمبئی، ڈھاکہ، لاہور، کراچی
اک ایک!

فاصلے ختم ہوئے
موت کی راہ میں حائل نہیں کوئی دیوار
نہ سمندر، نہ حصار
اس ہوائی کی لگائی ہوئی آگ
چشمِ جرأت ہی بجھا سکتی ہے!

(۳)

ایٹمی سب میرین

آؤ دیکھو یہ نرالی مچھلی
اسد البحر ہے یہ
(یعنی کہ ”سی لائین“ ہے)
پیٹ میں اس کے ہیں کتنے یونس
امتحاں جن کو لیے پھرتے ہیں
بحرِ ظلمات کی پہنائی میں!
مہ و خورشید کی دنیا سے، افق سے، شبِ انجم سے، ضیاؤں سے نہاں
بحرِ ذخّار کی موجوں کے تلاطم کے سوا
ان کی قسمت میں نہیں کوئی صدا
کوئی صدا،

نفسِ بادِ صبا
لبِ لعلیں کا لمس
پھول کے دل کے دھڑکنے کی صدا
کوئی نہیں
کچھ بھی نہیں !
ہفت قلزم کے یہ نگراں ہیں ——مگر
بحری قزاق کوئی
کوئی جہاز
جال سے اس کے نکل کر نہیں جا سکتا کہیں کوئی نہنگ !

(۴)

ایٹم بم

اور یہ ایٹم بم ہے
یعنی اک ذرۂ ناچیز کے جوہر کا جلال
بنی آدم کے کمالات کا حکمت کا عروج
ہیروشیما کا وہ سایہ تو تمہیں یاد ہی ہوگا شاید
اہلِ مشرق کے لیے
مغربی عدل کی
انصاف و مساوات کی پیغام رساں ایٹمی صبح
اک بگولا تھی کہ شعلہ تھی کہ کیا تھی ؟ —— ہمیں معلوم نہیں !

قصہ روزِ حساب
مرگِ انبوہ کا میلہ جس میں
پیرِ صد سالہ و نوخیز جواں
رندِ مے خوار و مسلم شور و خدا جو سارے !

زنِ پارینہ و معشوقِ جواں
طفلِ گہوارہ و طفلِ مکتب
سب کے سب نعرہ زناں شامل تھے
ان میں اک بچہ تھا
گنگناتا ہوا
مکتب کو رواں،
ایٹمی امن کا معصوم شکار،
موت سے تیز شعاؤں نے دبوچا اس کو
اور بکھرے گئیں اَن دیکھے ستاروں کی رصدگاہوں میں
بھائی ہابیل کی معراج دکھانے کے لیے
کرۂ خاک کا انجام بتانے کے لیے

اسلحہ خانے میں اپنے لیکن
میگاٹن بامب بھی موجود ہیں، جانے کتنے
ہیروشیما کے کروڑوں سورج
ناگا کی ستارے لاکھوں
سامنے جن کے ہیں شمعِ کشتہ!
میگاٹن باب کی حدت سے سمندر کھولے
سنگ و فولاد کی شریانوں کے بادل آئیں
شہر بن بتاں و ویرانہ نہیں
پامپیائی سے کھنڈر
موہنجوڈارو سے آثارِ قدیم!

شہر آشوب

(ایٹمی جنگ کے بعد)

کچے دھانوں میں دودھ سوکھ گیا
گھاؤ سے گیہوں کے لہو ٹپکا
سیپیوں نے تڑپ کے ساحل پر
کچے موتی اُگل دیے کتنے
باغ میں تتلیوں کے پر جل کے
جھلسے پھولوں پہ راکھ بن کے گرے
پردۂ ساز سے دھُواں اٹھا
محفلوں میں فغاں بلند ہوئی
میکدہ یا سرائے وحشت ہے!
واژگوں جام اور خُم حیراں
تیشہ بر دوش سرنگوں فرہاد
سوچتا ہے میں کون ہوں کیا ہوں؟
خسرو پرویز و کوہکن ہیں کون؟
کون شیریں ہے بیستوں کیا ہے؟

ارتقا کا تمام باب ہوا
دشتِ امکاں میں کھو گیا انساں
ہو گئی بزمِ ہائے و ہُو خاموش
دیدۂ آفتاب بند ہوا
تھک کے ارمان سو گئے سارے
قصۂ شہزاد ختم ہوا!

ڈاکٹر سید صفدر حسین

○

اِک دمِ سرد ہے اب بادِ صبا میرے بعد   پھیکی پھیکی سی ہے گلشن کی فضا میرے بعد
قدر اے عشق رہے گی تری کیا میرے بعد   کس کو پہنائے گا تو تاجِ وفا میرے بعد
مجھ کو محروم نہ رکھ بے سبب آزادی سے   کس کے کام آئے گی یہ مشقِ جفا میرے بعد
چھوڑے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں   آ ہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد
میرا خوں کر کے ہتھیلی ہے حنا سے بیزار   اب تو زلفیں بھی ہیں شانے سے خفا میرے بعد
دیکھنا غور سے رُخسارِ جفا کی زردی   آئینہ تم کو دکھائے گی وفا میرے بعد
اب کھلا یہ کہ ہے اِک ظلم کم آمیزی بھی   ہے خجل اپنے تغافل پہ حیا میرے بعد
محفلیں عہدِ گزشتہ کی ہوئیں خواب و خیال   کھو گئے اپنے غموں میں رفقا میرے بعد
مل گیا مجھ کو مرے ذوقِ شہادت کا صلہ   بوئے خوں بانٹتی پھرتی ہے صبا میرے بعد
دل کہ تھا زینتِ آرائشِ کاکل نہ رہا   جب کھلی زلف تو یہ پھول گرا میرے بعد
میں نہیں ہوں تو بیاباں بھی ہے اک بزمِ خموش   خامشی ڈھونڈھتی ہے نغمہ سرا میرے بعد
اب کوئی ظرف نہیں بادۂ رنگیں کا حریف   بہکی پھرتی ہے مئے ہوش رُبا میرے بعد

نقشِ پائے غمِ صفدرؔ بھی مٹا راہوں سے
لُٹ گیا قافلۂ مہر و وفا میرے بعد

آتشؔ لودھیانوی

○

پوچھو دریا کا، خبر دینے لگیں گے نہر کی
میں نے دیکھی ہے عجب یہ رسم تیرے شہر کی
میں بنا پھرتا ہوں اپنے شہر ہی میں اجنبی
انتہا کب ہو نہ جانے اس انوکھی لہر کی
جھانکتی ہیں بام و در سے کیسی کیسی صورتیں
سونے والوں کو خبر کیا شب کے پچھلے پہر کی
شعلۂ گل کی طرح جی کو فروزاں کر گئی
یہ ادا بھی میں نے دیکھی ہے نگاہِ قہر کی
کل جہاں گلشن مہکتے تھے وہاں اب دھول ہے
یہ پرانی ریت ہے عبرت سرائے دہر کی
گرم لُو کے تند جھونکے مثلِ بادِ شام تھے
چاندنی سے بھی خنک تھی دھوپ اک دوپہر کی
اُس سے ملنے اپنے گھر سے جس گھڑی نکلا تھا میں
چل رہی تھی بادِ صرصر راستوں میں قہر کی
میں تو یونہی ہنس دیا تھا، پہروں رُلوایا مجھے
مجھ سے بھی ہے سنگدل مخلوق تیرے شہر کی
آتشؔ اُس کی بے رخی کا گُل نہ مرجھایا کبھی
گو چلی سو مرتبہ باغوں میں آندھی زہر کبھی

صادق نسیم

شہرِ طلب میں آج عجب حادثہ ہوا
ہر آئینے میں تھا ترا چہرہ سجا ہوا
آیا وہ رنگ و نور میں لپٹا ہوا خیال
شب کی سیاہیوں میں شفق گھولتا ہوا
پھر تیرا نام لے کے جلا ایک اک چراغ
پھر اپنا گھر ہے آئینہ خانہ بنا ہوا
کلیاں نہیں تو آ کوئی پتھر ہی پھینک جا
دکانِ شیشہ گر کی طرح ہوں سجا ہوا
آیا ہوں تیری زلف میں تریاق ڈھونڈنے
میں اپنے دل کی تیرگیوں کا ڈسا ہوا
ہر روز ڈھونڈتا ہوں تری یاد کا افق
میں آفتابِ شام کی صورت تھکا ہوا
کن منزلوں کی سمت چلا کاروانِ شوق
دل پر تمھارے نقشِ قدم ڈھونڈتا ہوا
مرجھا نہ جائے لالۂ صحرائے آرزو
آہوں کی سرد سرد ہوا سے کھلا ہوا
آگے نکل گیا ہوں گلوں کے دیار سے
خاروں پہ سرخ سرخ نشاں چھوڑتا ہوا
پھر جاں بلب ہوں آج سرِ رہگزارِ شوق
ہر حادثے سے تیرا پتہ پوچھتا ہوا
کچھ شعلۂ نوائے غزل بھی ہے تیز تر
صادق نسیم کا بھی ہے کچھ دل دکھا ہوا

خورشید احمد جامی

○

یہ کس کی آنچ ہے کس کے بدن کی خوشبو ہے
ترا خیال مرے ساتھ ہے کہ خود تُو ہے
مری نگاہ سے تیری جواں امنگوں تک
وہی سماں ہے وہی فاصلوں کا جادو ہے
سُلگ اُٹھے ہیں کہیں نرم شبنمی بوسے
کہیں اُداس کوئی چاندنی لبِ جُو ہے
حیات آج وہ زخموں کا شہر ہے۔ جس میں
نہ صبحِ عارضِ گُل ہے نہ شامِ گیسو ہے
یہ اشک و آہ کا موسم یہ خارزارِ الم
دیارِ گُل کی تمنّا کا ایک پہلو ہے
ہر ایک درد میں ہے شعلۂ یقینِ وفا
ہر ایک رات میں خوابِ سحر کی خوشبو ہے
سُنا ہے تلخ حقائق کی بستیوں سے پرے
کہانیوں کے سمن زار ہیں جہاں تُو ہے
مرے قریب ہے اک درد کی صدا جامی
مری تلاش میں اک بیقرار آنسو ہے

عبیداللہ علیم

○

خوشا وہ دور کہ جب تجھ سے رسم و راہ نہ تھی
سکون کفر نہ تھا، زندگی گناہ نہ تھی

نفس نفس پہ اُبھرتی ہوں سُولیاں جیسے
حیات اتنی تو پہلے کبھی تباہ نہ تھی

بہ فیضِ حسرتِ دیدارِ خسروانِ جنوں!
اِدھر بھی دیکھ گئے جس طرف نگاہ نہ تھی

خود اپنی روشنیٔ طبع کے ستائے ہوئے
وہ ہم تھے دہر میں جن کو کہیں پناہ نہ تھی

جہاں کے درد کو اپنا ہی درد جانتے ہیں
یہ حوصلہ تھا کہاں جب تمہاری چاہ نہ تھی

وہ اِک نگاہ کہ سب کچھ سمجھ لیا تھا جسے
تباہیٔ دل و جاں پر وہی گواہ نہ تھی !!

محقّق

واہی

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں گورستان سے   یہ نہ سمجھیں آپ، ہیں بیزار اپنی جان سے
آپ کو یونہی ہے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ   جس طرح چونا ڈلی کتھے کو نسبت پان سے
آپ کو قبروں سے الفت عشق ویرانے سے ہے   آپ گھبراتے ہیں جیتے جاگتے انسان سے
کوئی کتنا ہی بڑا ہو، فلسفی، شاعر، ادیب   عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے
ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات   آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے جان سے
سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد   پھر یہ فرماتے ہیں اُٹھ کر عالمانہ شان سے
مرنے والا دفن ہے گو سرزمینِ ہند میں   آئے تھے غسّال کابل سے کفن جاپان سے
طول و عرضِ قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ   گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے
یہ تھا اک رُخ صاحبِ تحقیق کی تصویر کا
دوسرا رُخ بھی بیاں کرتا ہوں سنئے دھیان سے

ہیں بزعمِ خود محقق آپ ہندوستان کے   آپ نے نقطے گنے ہیں میرؔ کے دیوان کے
شہر کے اندر کتابوں کا جو قبرستان ہے   گورکن ہیں آپ اسی مشہور قبرستان کے
کاتتے ہیں سوت کو تحقیق کے اتنا مہین   آپ کے آگے جولاہے مات ہیں ایران کے

زیرِ تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے   کس قدر چرچا ہے پہلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر   داغ نے توڑا تھا دم زانو پہ منّی جان سے کے
رند نے اک بیوفا کے عشق میں کھائے تھے جو   وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے
دُھن ہے یہ ثابت کریں دلّی تھا لنڈن کا وطن   اور سوداؔ کے چچا بوچر تھے انگلستان سے کے
الغرض رہتی ہے روز و شب یہی بس ایک فکر
کوئی گلدستہ اُتاریں طاق سے نسیان کے

آپ کو ہے والہانہ عشق مخطوطات سے   جیسے سناٹے کو الفت ہو اندھیری رات سے
کرم خوردہ اور بوسیدہ کتابوں کے ورق   ڈھونڈھ کر لاتے ہیں آپ اس شہر اُس دیہات سے
لے کے اِن اوراقِ پارینہ کو یوں آتے ہیں خوش   لوٹتے ہیں جس طرح نوشہ میاں بارات سے
پھر مہینوں تک عرق ریزی کیا کرتے ہیں آپ   جوڑتے ہیں سلسلہ اس ڈال کا اُس پات سے
سرحدِ وہم و گماں کو چھوڑ کر میلوں پرے   کھیلتا ہے ذہن دور از عقل امکانات سے
اُس پہ طرّہ یہ کہ رکھتے ہیں کھلے بندوں جناب   دل میں بغضِ للّٰہی اوروں کی تصنیفات سے
گر کسی نے لکھ دیا یہ، میرؔ کے دو ہاتھ تھے   آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے
آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ لُولھا تھا غریب
اور اسے ثابت کریں گے اُس کی کُلّیات سے

ٹیڈی گرل

فرقت کاکوروی

کل بس میں اک گٹھڑی ملی
پوچھا تو ٹیڈی گرل تھی
شرم و حیا میں فرد تھی
عورت سے زائد مرد تھی
تھا جتنا پانی آنکھ کا
وہ سن سے پہلے مر چکا
بازو کی دونوں مچھلیاں
چلّا رہی تھیں پی کہاں؟
آنکھیں پھٹی، زلفیں کٹی
باچھیں چری، چتون کڑی
ہونٹوں پہ لپ اسٹک ملی
رانوں سے رانیں چھیلتی
ہلدی سی سل پہ پیستی
شرم و حیا کو بیلتی
غیرت کا سنگِ میل تھی
سینہ کھلا تراق سا
دل چوکڑی بھرتا ہوا

کولہے کی ساری بوٹیاں
خشکی پہ جیسے مچھلیاں
ابرو کماں، خنجر رواں
پیہم رواں، پیہم دواں
گالوں پہ کچھ دھبّے پڑے
اک غنچہ مذموم کے
تھا جسم پر غلتپہ کسا
جیسے ہو اک بستر بندھا
آدھا کھلا آدھا کسا
یا کھال ہی میں ہو بسا
کپڑا بہت باریک سا
سینے پہ تھی اک الگنی
یہ شئے دوپٹہ تھی کبھی
اب وہ گلے کا ہار تھی
اقرار میں انکار تھی
پہلے یہ ہوتی تھی جلی
اب ہے مگر حرفِ خفی
آنکھیں کھلی اور دل کہیں
تھی خود کہیں منزل کہیں،

کچھ قیل تھی کچھ قال تھی
اک صاحبِ اقبال تھی
اعمال ہی اعمال تھی
اک سبزۂ پامال تھی
اعضا کو پھڑکاتی ہوئی
ننگوں کو شرماتی ہوئی
کولوں کو مٹکاتی ہوئی
طرفہ ستم ڈھاتی ہوئی
تھی جسم پہ جھلّی چڑھی
کھڑکی پہ جیسے چق پڑی
جب بس میں وہ چڑھنے لگی
بولی کہ روکو میں گری
دو ایک نے جب ہلپ کی
مشکل سے تب بس پہ چڑھی
جمپر جو اک دم پھٹ گیا
کونے سے کونا ہٹ گیا
دل نے کہا اچھا ہوا
یہ روز کا جھگڑا کٹا

اک بوجھ تھا ہلکا ہوا
ہے جسم جتنا کھل گیا
عشاق کے کام آئے گا
آنکھوں کو ان کی بھائے گا
اُن کو لہو رلوائے گا
تڑپائے گا برمائے گا
یہ دیکھ کر اک منچلا
جو دُور تھا بیٹھا ہوا
آپے سے باہر ہو گیا
ضبط و تحمل چھوڑ کر
ہر شرم سے منہ موڑ کر
ٹانگوں کو اپنی جوڑ کر
ریلے میں بس کے پل پڑا
پھر کچکچا کر زور کا

اُس نے بگوٹا لے لیا
پر وار کچھ ہلکا پڑا
گو تلملا کر رہ گئی
لیکن وہیں بیٹھی رہی
دل میں بُرا کہتی رہی
پھر بھی مزا لیتی رہی
اور جب ذرا ٹھنڈی ہوئی
انگڑائی لے کر ہنس پڑی
یہ سوچ کر تکتی رہی
اور زیرِ لب کہتی رہی
یہ صاحبِ دل کون تھا؟
فرہادِ کامل کون تھا؟
جو کر کے ہانڈی بد مزا
چکھ کر نمک چلتا ہوا

اتنے میں جب آنکھیں لڑیں
غمزوں میں باتیں ہو گئیں
یاں تک تو ہے ہم کو پتہ
اس داستانِ عشق کا
پھر بعد اس کے کیا ہوا
اخبار میں اتنا پڑھا
اک قیس و لیلیٰ کا جتھا
خوش مزگیاں کرتا ہوا
ہے شب سے تھانے میں ڈٹا
چھوڑا گیا یا چھٹ گیا
واللہ عالم کیا ہوا؟

ایک دوست کی موت

کرشن چندر

پہلی بار جب میں نے اُسے دیکھا۔ تو وہ کالج کے ایک خوب صورت دریچے کے پیچھے کھڑا ہوکر بڑے باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پہلی نظر ہی میں اُسے میں نے پسند کر لیا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی نظر ہی میں اپنے آپ کو پسند کرا لیتے ہیں۔

وہ بالکل لانبا۔ سیدھا کسی تربیت یافتہ فوجی نوجوان کے انداز میں کھڑا تھا۔ کندنی رنگ، گول چہرہ، چیتے کی سی پتلی کمر اور مضبوط دھڑ سے اُس کی وجیہہ شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار اُس کے لیے ایک ایسی گہری کشش محسوس ہوئی کہ میرا دل اُس سے ملاقات کرنے، اُسے جاننے پہچاننے، اُسے اپنا دوست بنانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اُس کی شخصیت میں سب سے اہم اُس کے بال تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے باوقار مردانہ چہرے پر ایسے خوبصورت بال نہیں دیکھے۔ اُس کے سر کے بال گہرے سنہرے تھے۔ ایسے گھنے اور ملائم گویا ریشم کے گچھے۔ اُس کی مغرور مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس ہوا، جیسے اُسے بھی اپنے خوب صورت بالوں کی اہمیت کا احساس ہے۔

اُس کے بالوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں ان میں انگلیاں پھیروں، انھیں اپنے گالوں سے لگا لوں۔ انھیں چوم لوں۔ اُن میں ڈوب جاؤں۔ میں بے اختیار کالج کا بڑا دروازہ کھول کر اُس سے ملنے کے لیے اندر چلا گیا۔

اب تو ہر روز میری اُس سے ملاقات ہوتی ہے اور میں ہر روز بڑے پیار سے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ اُس کی ریشمیں زلفوں سے کھیلتا ہوں۔ کبھی اُن سے اپنی ٹھوڑی گدگداتا ہوں۔ کبھی اپنے گال، کبھی اُس کا سر پانی سے بھگو دیتا ہوں۔ کبھی اُسے تولیے سے پونچھ کر صاف کر دیتا ہوں۔ اور میرا دوست اب میری کسی حرکت پر معترض نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ میرا شیونگ برش ہے!

شروع کے چند دنوں میں وہ مجھ سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہا۔ اُس کے بال مجھے چبھتے تھے۔ میری انگلیاں اُس کی پتلی کمر سے پھسل جاتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا۔ جیسے میرے رخساروں سے چھوتے ہی اُس کا سارا بدن مجھ سے

بغاوت کر رہا ہے۔ اپنی شخصیت کی حفاظت پر تُل گیا ہے۔ مگر ہر نئی دوستی اور رفاقت میں یہی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں نئے دوست ایک دوسرے کو جانچتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے بھی اپنی ذات کو بچانے پر مجبور رہتے ہیں۔ مبادا اُن کی شخصیت مجروح نہ ہو جائے۔ دوستی میں ایک باوقار توازن اور فاصلہ رکھنے پر مجبور رہتے ہیں۔

ہر نئی دوستی میں یونہی ہوتا ہے۔ سپردگی کی وہ منزل بہت دُور ہوتی ہے جب توازن ٹوٹ جاتے ہیں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ اور جھجک غائب ہو جاتی ہے۔ اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو سمجھتے ہوئے بے جھجک اپنا سب کچھ اُس کے حوالے کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور اپنی روح کے سارے دروازے اپنے دوست کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہ منزل سمجھ کی اور سپردگی کی، ایک دوسرے میں ڈوب جانے کی بہت دیر میں آتی ہے۔ اس کے لیے وقت چاہیئے۔ اور دل کا درد، اور وہ لذت آشنا کیفیت جو کچھ پانے سے نہیں بلکہ کچھ کھونے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس لیے شروع شروع میں وہ مجھ سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہا۔ کبھی اُس کے بال مجھے چبھتے، کبھی بار بار بھگونے سے بھی اُس کے بالوں میں نرمی نہ آتی۔ بار بار رگڑنے سے بھی رخساروں پر وہ جھاگ نہ آتا جس کی مجھے توقع تھی۔ اور میں سوچنے لگا۔ کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ اسے پانے میں۔ اسے اس قدر اپنے قریب لانے میں؟ ہر نئی دوستی کے شروع میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ مغائرت کی دیوار کو گھونسے مار رہے ہیں۔ اور وہ دیوار نہیں ٹوٹتی۔ اور دوسرے فریق کی مدافعت کی وجہ سے نہیں ٹوٹتی۔ جیسے اس دوستی کو آگے بڑھانے میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے صرف دوسرے فریق کا قصور ہے۔ ہر آدمی اپنے اعتقادات۔ خیالات اور اندھی غرض سے اس قدر بندھا ہوتا ہے کہ دیوار کے دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ دوستی کے پہلے دن اُس ہوا کی طرح ہوتے ہیں جو گرم گھٹی راتوں میں سانس روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور شبنم کی پہلی بوند یا پھولوں کی پہلی خوشبو کا انتظار کرتی ہے۔

انہی دنوں میں ایک دن میں نے غصے میں آ کر شیونگ برش کو نیچے زمین پر پٹخ دیا۔ زمین پر گرتے ہی برش باتھ روم کی سفید اور سخت ٹائیلوں سے ٹکرایا۔ اور لڑھکتا ہوا اُس گندی آہنی جالی پر جا گرا جس کے نیچے گندی موری بہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دھڑ کے قریب اُسے چوٹ آئی ہے۔ کمر کے قریب ایک جگہ سے اُس کا سنہرا پالش اُکھڑ گیا ہے اور اُس کے سنہرے بال صابن کے سفید سفید جھاگ میں لتھڑے ہوئے آہنی جالی کے کوڑے میں غلیظ ہو چلے ہیں۔ سفید سفید جھاگ والے شیونگ برش کو یوں گندگی میں گرتا دیکھ کر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی صاف ستھرے دُھلے دھلائے بچے کو اُٹھا کر کسی گندی موری میں پھینک دیا ہو۔

جلدی سے بڑھ کر میں نے اپنے شیونگ برش کو زنگ آلود آہنی جالی سے اُٹھا لیا۔ اور دیوار گیر سینک (SINK) کی ٹونٹی کھول کر اُسے دھونے لگا۔ اُسے ٹونٹی کے زوردار کھلے پانی کے نیچے رکھ کر میں اپنے ہاتھوں سے اُس کی غلاظت دھونے لگا۔ جو میری ہی دی ہوئی تھی۔ میں نے بار بار اُس کے سر کو پانی سے دھویا۔ بار بار صابن لگایا۔ اور دھویا۔ اور جب برش خوب اچھی طرح سے صاف ہو گیا۔ تو میں نے بڑے احتیاط سے اُسے تولیے سے

پونچھا۔ اُس کا سر خشک کیا۔ اور پھر اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ تو مجھے ایسا احساس ہوا جیسے اُس کے بال انتہائی نرم اور ملائم ہو چکے ہیں۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ جب میں اُس کے بالوں کو دائیں بائیں گھماتا ہوں تو وہ بے حد نرم معلوم ہوتے ہیں۔ اور جب بائیں سے دائیں گھماتا ہوں تو وہ سخت اور کھردرے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ اب تک میں اپنے دوست کو غلط گھماتا رہا ہوں۔

”نئی دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے!“ شیونگ برش نے ایک میٹھی شکایت کے لہجے میں مجھ سے کہا ”اپنی غرض سے مجبور ہو کر اکثر انسان اپنے دوست کی شخصیت کو نہیں دیکھتے۔ اُس کے طریق کار اور زاویہ نگاہ کو بھول جاتے ہیں اور اُسے غلط طریقے پر گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اک ذرا سی سمجھ سے معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے!“

میں نے اُس کے نرم نرم بالوں کو دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے ندامت بھرے لہجے میں کہا ”تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟“

شیونگ برش نے جواب دیا ”وہ دوستی ہی کیا جس میں زخم نہ ہوں!“

شیونگ برش سے یہ میری پہلی بات چیت تھی۔ بہت سے انسان صرف انسانوں سے بات کرتے ہیں کچھ لوگ جانوروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھتا۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس دنیا کی ہر چیز بولتی ہے۔ کرسی بات کرتی ہے۔ کھٹیا گویا ہوتی ہے۔ تصویر تقریر کرتی ہے۔ دیوار سرگوشی کرتی ہے گلدان کے پھول نغمہ سناتے ہیں اور راستے کے پتھر ہر آن کچھ کہتے جاتے ہیں۔ محبت شفقت اور رفاقت سے ہر چیز بولتی ہے سننے اور سمجھنے والا موجود ہو تو کائنات کی کوئی ایک شئے کسی دوسری شئے سے الگ نہیں رہتی۔۔۔

اس لیے اب کی بار جو میں نے اُسے پانی میں بھگو کر صابن لگایا۔ اور اُسے اپنے رخسار پر دائیں سے بائیں گھمایا تو مجھے اُس کے بال پہلے سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم معلوم ہوئے اور شیو بھی عمدہ بن گیا اور میں نے اپنے دوست کو بدلنے کا خیال ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے۔ اور مجھے اپنے دوست کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ میری طرح اُسے بھی ٹھنڈے پانی کے غسل سے نفرت ہے۔ سرد پانی سے اُس کا جسم ٹھٹھر جاتا ہے۔ بال سخت ہو جاتے ہیں اور جھاگ بھی زیادہ نہیں آتا۔ بہت گرم پانی سے بھی وہ گھبراتا ہے۔ اُس کے سر کے بال ایسے کمزور اور لجلجے سے ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک سے شیو نہیں ہو سکتا۔ نیم گرم پانی اُس کے لیے بہترین ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جو اکثر میری گرفت سے پھسل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اُس کی کمر کو بڑے زور سے پکڑتا ہوں۔ دوست پر جس قدر آپ کی گرفت مضبوط اور سخت ہو گی اُتنا ہی وہ رسیاں تڑا کر آپ سے اور بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے گرفت ہلکی ہونی چاہیئے۔ اور دباؤ مدھم۔ شیونگ برش کو پکڑنے کا بہترین

طریقہ یہ ہے کہ اُسے عورت کی طرح پکڑا جائے اور عورت کو پکڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے شیونگ برش کی طرح تھاما جائے۔ تبھی بہترین نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگلے چند مہینوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے شیونگ برش کو ایک خاص قسم کی صابن کی ٹکیہ پسند آگئی ہے۔ وزالی۔ اس دوران میں میں نے بہت سی صابن کی ٹکیاں بدلیں۔ آسطرا۔ جامکو۔ تارا۔ شاہ پسند۔ مگر کسی صابن سے وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو وزالی کی خاصیت ہے۔ مرد کی طرح شیونگ برش بھی حسن پرست ہے۔ وہ اپنی صابن کی ٹکیہ پہچانتا ہے۔ اور میں نے شیونگ برش سے کہا "یوں دیکھا جائے تو ایک صابن کی ٹکیہ اور ایک عورت میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ کبھی عورتیں صابن کی ٹکیہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ملائم اور نرم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مہکتی ہیں۔ صاف ستھری اور اُجلی معلوم ہوتی ہیں۔ پیار سے ٹھوڑی چھوتی ہیں۔ رخسار چومتی ہیں اور گردن میں بانہیں ڈال کر ہر روز مرد کی حجامت بناتی ہیں!"

برش بولا "مگر صابن کی ٹکیہ گھستی بھی تو ہے۔ یہ شمع ساں گھلنا کوئی صابن کی ٹکیہ سے سیکھے۔ کسی دوسرے کی خاطر رفتہ رفتہ گھل گھل کر اپنی جان دے دینا اسی مخلوق کا خاصہ ہے۔ اتنی بڑی قربانی تو آج تک کسی شیونگ برش نے نہ دی ہو گی۔ جس دن یہ صابن کی ٹکیہ ختم ہو جائے گی تم بازار سے دوسری خرید لاؤ گے۔ ٹکیہ مرد کی بے وفا فطرت جانتی ہے۔ پھر بھی ہر آن گھلتی ہے۔ اور گھل گھل کر مرد کے رخسار چمکاتی ہے۔ ایسا ایثار عورت کے سوا اور کس سے ممکن ہے؟"

میں چپ ہو رہا کیونکہ عمر عزیز کے پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی کنوارا تھا۔ لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ آئینے کے سامنے اپنے شیونگ برش اور اس کی ٹکیہ کو اکٹھا کھڑا کر دیا۔ اور پھر ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کاٹیج کے بلند و بالا دریچوں والے ہال کے باہر میاں بیوی مسکراتے ہوئے اپنے مہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایسے متبسم اور خوش معلوم ہو رہے تھے کہ جب سے میں ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہوں، آئینے کے سامنے، البتہ جب کبھی اپنے شیونگ برش سے خفا ہوتا ہوں۔ تو اس کی ٹکیہ کو اٹھا کر آئینے کے دوسرے کونے کی طرف الگ رکھ دیتا ہوں۔ اس وقت میرے شیونگ برش کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے بڑا مزا آتا ہے مجھے ان دونوں کو اکٹھا کرنے میں اور پھر جب جی چاہے تو الگ کر دینے میں! شاید خدا کو بھی کچھ اس طرح کا مزا آتا ہو گا ......

دفتر میں ایک بدنام لڑکی تھی۔ سونی۔ سنا ہے کئی جگہ اس کا معاشقہ چلتا تھا۔ وہ میرے پاس بھی کبھی کبھی آتی تھی۔ بس یونہی سی تھی۔ دبلی پتلی سانولی۔ آنکھوں کے سوا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور ابرو کمان کی طرح تنے ہوئے۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ ہے نہیں اس لیے وہ اپنی آنکھوں سے بہت سا کام لیتی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ بولتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے سن بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پھیلا کر اپنے پاس بلاتی تھیں، کبھی کبھی آہیں بھر کر سسکتی ہوئی معلوم

ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بلّی کی آنکھوں کی طرح چالاک دکھائی دیتیں۔ کبھی سقراط کی آنکھوں کی طرح فلسفے میں ڈوبی ہوئیں کبھی بچوں کی طرح بھولی۔ اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی کہ ایک مرد اپنی آنکھوں سے کتنا کام لے سکتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ اُسی سے کام لیتا ہے۔

میں اُس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ بس یونہی میرے پاس چلی آتی ہے دوسروں سے اُکتا کر، اور وہ دوسرے بھی غالباً میری طرح زمانے سے حالات سے زندگی سے ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے ہوں گے۔ اور اسی طرح سلسلے وار ایک سے دوسرے سے تیسرے تک یہ یکسانیت اور اکتاہٹ کی زنجیر چلتی ہے۔ جس میں کسی فرم۔ کسی دفتر یا کسی مِل کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا نیم تاریک بدبودار سیلا ہوا کمرہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے بُک شیلف پر بہت سی کتابیں اور فائلیں پڑی رہتی ہیں۔ دوسرے کونے میں کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا رہتا ہے، دو تین کرسیاں ہوتی ہیں۔ ایک ٹوٹا سا سٹول ہوتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی میز ہوتی ہے۔ جو بیک وقت کھانے کی میز، مطالعے کی میز۔ تاش کی میز اور مہمانوں کے سونے کا کام دیتی ہے۔ جس پر کسی زمانے میں ایک خوب صورت میز پوش بچھا ہوا ہوگا۔ لیکن جس کا گہرا سبز رنگ اب متواتر استعمال سے اور نہ دُھلانے سے سیاہی مائل ہو چلا ہے۔ جس کے گلابی کناروں پر چھپی ہوئی اجنتا کی حسیناؤں کے چہروں پر پانی کے دھبے۔ سگریٹ کی راکھ۔ شوربے کی چکناہٹ، فونٹین پن کی سیاہی، اور صابن کی جھاگ جمی ہوئی ہے، اور ان سب کے بیچ بان کی ایک جھلنگا چارپائی ہوتی ہے۔ جس پر بیٹھے بیٹھے آدمی زندگی کے سب کام کر سکتا ہے۔ اسی پر آلتی پالتی مار کر کھانا کھا سکتا ہے، پائینتی پر فائلیں رکھ کر کام کر سکتا ہے۔ میز قریب گھسیٹ کر شیو کر سکتا ہے۔ عورت کو قریب گھسیٹ کر محبت کر سکتا ہے۔ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ جی سکتا ہے۔ سو سکتا ہے۔ مر سکتا ہے۔ آخر ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک بان کی کھاٹ کے سوا اور چاہیئے بھی کیا۔ اور میرے ایسے سُست الوجود اور کاہلی کے مارے ہوئے آدمی کے نزدیک تو جنّت کا تصور بان کی کھاٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ جس پر بیٹھے بیٹھے ہی زندگی کے سارے کام سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ وہ کس طرح کی جنّت ہوگی جس کے لیے دُنیا کے لوگ دن رات اتنی بڑی نیکیاں کرتے پھرتے ہیں۔ یہ نیکیاں جن کے چمکتے ہوئے خول کے اندر خودغرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کس طرح کی جنّت ہمیں دیں گی؟ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی بان کی ایک چھوٹی سی کُھٹیا پر لیٹ جائے اور چُپکے چُپکے نیلے آسمان کو دیکھ کر رویا کرے، یا خوب صورت عورتوں کو ہولے ہولے گلی میں سے گزرتے دیکھ کر مسکرایا کرے یا بلّی کے بچّوں کو ایک دوسرے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا کرے۔ کبھی کبھی نیکی کرنے سے مجھے یہ کام بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں!

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس دن سوتی آجاتی تھی۔ اور ہمیں کوئی بیہودہ سی فلم دیکھنے کے لیے باہر جانا نہیں ہوتا تھا تو میرے کمرے کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی ساڑھی کا پلّو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر کمرے میں جھاڑو دیتی تھی۔ پھر میرے بُک شیلف کو ٹھیک کرتی تھی۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر کی چھان پھٹک کرنے کے بعد رسالوں کو الگ

کرتی تھی۔ اور کتابوں کو قطار دار الگ فرش پہ سجا دیتی تھی۔ میز پہ میرا سامان قرینے سے رکھتی تھی۔ سٹول پہ رکھے ہوئے کلاک کو چابی دیتی تھی۔ اور پھر ہاتھ منہ دھو کر میرے قریب آ کر بان کی کھاٹ پر بیٹھ جاتی تھی۔ اور میں ان تمام کاموں کے بدلے میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اُسے ایک بوسہ دیتا تھا۔ جیسے جھاڑو بہارو کا کام ٹھیک سے کرنے پر ہم بھنگی کو ایک دونی دے دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ کبھی کبھار آتی رہی اور زندگی کو برداشت کرنے کا یہ سلسلہ نیم بیزاری اور نیم اکتاہٹ کے عالم میں چلتا رہا۔ لیکن ایک دن جو وہ آئی، تو میں نے اُسے عجب رنگ میں پایا۔ وہ بے حد کھوئی کھوئی اور گم سم اور کبھی کبھی دہشت زدہ سی دکھائی دیتی اور گھبرا گھبرا کے میری طرف دیکھتی۔ اور جب میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ تو "کچھ نہیں" کہہ کر بار بار گاتی رہی۔ اور پھر پریشان ہو کر اپنی ساڑھی کے پلو کو اپنی انگلی پر لپیٹتی رہی اور کھولتی رہی۔ ہار کر میں اُس کے ذہنی خلفشار کی طرف سے انجان بن گیا۔ اور باتھ روم سے شیو کا سامان اُٹھا لایا۔ اور وہیں میز آگے گھسیٹ کے اُس کے سامنے شیو کی تیاری کرنے لگا۔

آخر کار وہ بولی۔ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ؟

کیوں کر لوں !

وہ بہت دیر تک چپ رہی۔ آخر اُس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ بالکل گھبرا کر بار بار سر ہلا کر بولی "میں — میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں"

تو اپنی مصیبت مجھ پر کیوں لانا چاہتی ہو !

تم سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں ؟ ——

جواب میں میرے ذہن میں بہت سے نام آئے۔ مگر میں چپ رہا۔

اُس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو ؟"

"نہیں !"

غالباً اس جواب کی اُسے توقع نہیں تھی۔ کیونکہ یہ سنتے ہی اُس نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک لمحے کے لیے میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ٹھس ہو کر بیٹھ گئی۔ اور میں چپ چاپ شیو بناتا رہا۔ اور جب شیو بنا چکا تو اُس نے صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا میرا شیونگ برش اُٹھا لیا اور اُسے دھیرے دھیرے اپنے رخساروں پر پھیرنے لگی۔

کیا کر رہی ہو ؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مرد بننا چاہتی ہوں" اُس نے سسکتے کہا۔

*

جب وہ چلی گئی۔ تو شیونگ برش نے مجھ سے کہا۔ تم کتنے کڑوے اور کھردرے ہو۔ کیا تم میری طرح کسی دوسرے کی مصیبت پر جھاگ نہیں لگا سکتے۔ جھاگ لگانے سے زندگی کے بہت سے کانٹے نرم پڑ جاتے ہیں ! —— کیا تم اتنا بھی

نہیں سمجھتے؟

سب سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا۔ لیکن کیا کروں؟ میرے ذہن میں جس بیوی کی تصویر بسی ہے اس پر سوفی پوری نہیں اترتی۔ اور جو پوری اترتی ہے اسے حاصل کرنے کے لیے میری تنخواہ پانسو روپے ہونی چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر کس سے کروں شادی اور کہاں ہے وہ گھر جس کے آنگن سے مجھے آسمان نظر آتا ہو۔ اور کہاں رکھوں گا میں اپنے بچوں کو؟ اس نیم تاریک بدبودار مرغیوں کے ڈربے میں؟ —— تو پھر ہم اپنے آپ کو انسان کیوں کہتے ہیں۔ صاف صاف مرغیاں اور بھیڑیں اور بکرے کیوں نہیں کہتے۔ اس لفظی رعایت کا کیا فائدہ؟ جبکہ میری تنخواہ ایک سو ساٹھ روپے ہے۔ اور سال میں تین روپے کی ترقی مجھے ملتی ہے۔ اور تین سال کے بعد جب میرے ہاں تین بچے ہو جائیں گے تو جناب میں تو ان تین بچوں کو نو روپے ماہانہ پر نہیں پال سکتا۔ اگر میں اپنے خوابوں کی دیوی سے نہیں سوفی سے بھی شادی کر لوں تو بھی نہیں پال سکتا!

دوسرے دن دفتر میں سوفی مجھے کہیں نہیں دکھائی دی۔ معلوم ہوا اس نے استعفےٰ دے دیا ہے۔ وہ کہیں چلی گئی ہے۔ دن بھر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس طرزِ عمل کی مجھے اس سے امید نہ تھی۔ میں تھوڑا سا خوش بھی ہوا۔ چلو کسی نے میری خاطر اپنے آپ کو پریشانی میں تو ڈالا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ پھر میرے خیالات نے دوسری راہ اختیار کی۔ اونہہ؟ کہیں جھنجھلا کر چلی گئی ہوگی۔ کسی نہ کسی سے وہ ضرور شادی کر لے گی۔ کوئی نہ کوئی احمق اسے ضرور مل جائے گا۔

دن پھر اسی یکسانیت سے گزرنے لگے۔ اسی اکتاہٹ اور بیزاری سے جو میری طبیعت کا خاصا بن چکی تھی۔ اس دوران میں جون آئی جس کے بال بھورے تھے۔ اور ایمی جس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ اور وملا جس کی ناک چپٹی تھی اور —— نام گنانے سے کیا فائدہ؟ —— ان سب کی صورتیں گو مختلف تھیں۔ لیکن وہ سب ایک سی تھیں۔ وہ سب بہت سوں میں سے کسی ایک کو تلاش کر رہی تھیں۔ اور ہم بھی بہتوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب لوگ کسی بہت بڑے کھنڈر میں آ نکلے ہیں اور ایک دوسرے کے چہروں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک راستہ دوسرے راستے کو کاٹتا ہے۔ ایک چہرہ دوسرے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نگاہ گہری پہچان کی ملتی ہے۔ مگر دوسرے لمحے ہی میں وہ چہرہ مکمل اجنبی ہو جاتا ہے۔ اور راہی مایوس ہو کر پھر اپنی تلاش پر آگے دوڑنے لگتا ہے۔ اور سارا کھیل یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیری غلام گردش میں بہت سے چوہے مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر پھلانگتے ہوئے جا رہے ہوں۔

اپنی بے معنی بے مقصد زندگی سے عاجز آ کر میں نے ایک دن فرم کی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ اور سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ جب کبھی کوئی نیا وائسرائے ہندوستان میں آتا تھا۔ میرا جی اس کا گلا گھونٹ دینے کو چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے باپ کا بھی یہی جی چاہتا تھا۔ اور اس سے پہلے میرے باپ کے باپ کا۔ اور اس طرح نسلوں اور پشتوں سے جمع ہوتی ہوئی یہ نفرت مجھ تک پہنچی تھی۔ اور جب اس نفرت کی حدّت سے میرا خون کھولنے لگا۔ اور جب فرم کے انگریز مینجر کو دیکھ کر مجھے بخار سا چڑھنے لگا تو میں نے فرم کی ملازمت چھوڑ دی اور سول نافرمانی کی

تحریک میں حصہ لینے لگا۔ کیونکہ نفرت ایک مرض ہے۔ اور جب تک آدمی اسے اپنے جسم اور روح کی سسٹم سے خارج نہ کر دے اُسے چین نہیں آ سکتا۔ اس لیے جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تو مجھے قرار سا آ گیا۔ دل کو ایک تسکین سی ہوئی۔ جیسے مرض سے نجات مل گئی۔ جیل کی زندگی سے مجھے کسی طرح کی حیرت نہ ہوئی۔ جو آدمی زندگی بھر ایک تنگ و تاریک کھولی میں رہنے کا عادی ہو۔ اسے جیل کی بارکیں کیوں بری معلوم ہوں گی۔ جس آدمی نے اپنی ساری زندگی جھونپڑے نما ڈھابوں کا غلیظ کھانا کھا کر بسر کی ہو۔ اسے جیل کا کھانا کیوں برا معلوم ہوگا۔ جو آدمی ایک چھوٹی سی میز پر۔ چار فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر ایک کونے میں صبح سے شام تک سر جھکائے دس گھنٹے کام کرنے کا عادی ہو۔ اسے جیل کی مشقت سے کیا تکلیف ہوگی؟ یہ جیل بہت بڑی تھی۔ اور اس میں سینکڑوں قیدی تھے۔ اور لمبی لمبی دیواروں کے اندر گھاس کے میدان تھے اور درختوں کی قطاریں تھیں۔ اور پھولوں کے قطعے تھے۔ اور رات کو بارکوں کے باہر چاندنی چھٹکتی تھی۔ اور ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسمان نظر آتا تھا۔ اور دو وقت ہر ایک کو کھانا ملتا تھا جو جیل سے باہر ہر کسی کو کہاں ملتا ہے۔ اور رہنے کو ایک فرش اور ایک چھت ملتی ہے۔ یہاں آ کے مجھے معلوم ہوا کہ ہر برس میں جب فٹ پاتھ بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں اور برساتوں میں جب وہ بہت گیلے ہوتے ہیں۔ بہت سے غریب لوگ بے گھر لوگ چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل میں آ جاتے ہیں۔ اور مزے سے تین چار ماہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل جرم نہیں کرتے۔ بلکہ حالات سے ایک طرح کی سول نافرمانی کرتے ہیں۔ اور یہ سول نافرمانی ہزاروں سال سے جاری ہے اور بڑی بڑی جیلوں کے باوجود اس وقت تک جاری رہے گی جب تک باہر کی دنیا میں عام آدمیوں کو وہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی جو بڑی سے بڑی جیل میں بھی ایک عام قیدی کو حاصل ہوتی ہیں۔

جیل میں مجھے تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا۔ جہاں میری طرح کے سینکڑوں لوگ مجھ سے پہلے موجود تھے۔ جن کی زندگیاں مسلسل ایک تیسرے درجے کا سفر رہی تھیں۔ یہاں ہم سب لوگوں کو ایک سے کپڑے دیئے گئے تھے۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ ہمارا کوئی نام نہ تھا۔ ہم سب نمبر تھے۔ اور میرا نمبر ۱۵۲ تھا۔ اور میری بارک کے تالے کا نمبر ۱۱۵ تھا۔ اور میرے شیونگ برش کا نمبر ۱۳۳ تھا۔ اور یہاں آ کر پہلی بار میں نے ایک انسان کے مقابلے پر اپنے آپ کو ایک آہنی تالے اور لکڑی کے ایک شیونگ برش کے بہت قریب محسوس کیا۔ اور شاید اسی لیے بہت محفوظ بھی۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری طرح کے سست اور کاہل انسانوں کے لیے جو لاکھوں آدمیوں کو جنگ کی بھٹی میں نہیں جھونک سکتے۔ جو بان کی ایک کھٹیا پر لیٹ کر صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کے لیے جیل بہترین جگہ ہے!

میں جیل میں اپنا شیونگ برش لے گیا تھا۔ اور جیل کے ساتھیوں میں میرا شیونگ برش بہت مقبول ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ واقعی عمدہ شیونگ برش تھا۔ اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا۔ حالانکہ جیل میں عمدہ صابن اور عمدہ بلیڈ دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ پھر بھی شیونگ برش بڑی تن دہی سے اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اور ہر روز تقریباً دس بارہ آدمیوں کی شیو کرتا تھا۔

ان آدمیوں میں اناؤ کا بھگیلو اہیر بھی تھا۔ بھگیلو ساڑھے چھ فٹ کا اونچا لانبا احمق تھا۔ جو انگریزوں کی فوجی ٹرین کے آنے سے قبل کی پٹڑی اکھاڑتے ہوئے پایا گیا تھا۔ اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے صرف سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اُس کی چھاتی بڑی چوڑی تھی۔ اڑھی بڑی سخت تھی۔ اور گردن بیل کی طرح مضبوط تھی۔ اور وہ اکثر اپنے وارڈروں سے جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بالکل پاگل ہو گیا۔

نے اپنے وارڈر کا جبڑا توڑ دیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ میرا آئینہ توڑ دیا۔ اور میرے شیونگ برش کو بار بار اُٹھا کر دیوار پہ پٹخے کہ اُس کے خول کا کرومیم نما چھلا ٹوٹ گیا۔ اور میرے شیونگ بُرش کے سارے خوبصورت بال زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے بہت سے ساتھیوں نے اُسے تھاما اور اُسے پکڑ کر وارڈروں کے حوالے کر دیا۔

اگر شیونگ بُرش اس قدر خوبصورت اور کارآمد نہ ہوتا۔ تو کسی کو اُس سے ہمدردی نہ ہوتی۔ مگر میرا شیونگ بُرش خوبصورت اور کارآمد ہونے کے علاوہ بے قصور بھی تو تھا۔ اس لیے کسی نے اُس کا ٹوٹا ہوا چھلا اُٹھایا۔ کسی نے اُس کا لکڑی کا خول — دو تین آدمیوں نے مل کر اُس کے نرم اور ملائم بال چُن کر جمع کیے۔ ایک وارڈر نے بالکل اسی سائز کا پیتل کا چھلا مجھے دینے کا وعدہ کیا۔ دو تین دن کی سرجری اور مرہم پٹی کے بعد میرا شیونگ بُرش پھر اپنے محاذ پہ موجود تھا۔ اُس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشان تھے اور اس کے سر کے کچھ بال بھی غائب تھے۔ اور نصف سے زیادہ اُس کا پالش بھی نکل گیا تھا۔ اور اس کی چوبی ہستی پر کرومیم کے بجائے پیتل کا ایک بدنما چھلا تھا۔ مگر وہ پھر سے کام کر رہا تھا۔ اور اپنی زندگی، افادیت اور شخصیت کا ثبوت دے رہا تھا۔ گو وہ اب جوان نہ رہا تھا۔ خوبصورت نہ تھا۔ بلکہ کسی قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اور بہت مدت کے بعد مجھے اُس کے بارے میں شکایت سی محسوس ہوئی۔

تم اپنے دوستوں کو برتنا نہیں جانتے ہو! وہ بولا۔ اُس کم بخت جگیلو کے بال بڑے سخت ہیں۔ اُسے میرا ایسا بُرش چاہیے؟ موٹے بالوں والا بُرش چاہیے۔ تم نے مجھے اُس کے حوالے کیوں کیا۔ میں ایسے سخت بالوں اور کڑے رخساروں پر کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوستی وہیں مضبوط ہوتی ہے۔ جہاں شدید اختلاف کے باوجود کچھ قدریں مشترک ہوں۔ تم نے میرے اور جگیلو کے درمیان کونسی قدر مشترک دیکھی؟ دوست کو غلط ہاتھوں میں نہ دینا چاہیے۔ یہ دوستی کی توہین ہے!

اتنے رحیم مت بنو۔ مت بھولو کہ تم ایک غریب آدمی کے بُرش ہو۔ اور جگیلو بھی ایک غریب آدمی ہے۔ اور یہی غریبی ہی تم دونوں میں مشترک ہے

لیکن میرا قصور کیا تھا؟ بُرش نے پوچھا۔

تم بے گناہ تھے۔ اس سے بڑا قصور اس دُنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے بُرش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ جگیلو بھی تمہاری طرح بے قصور ہے۔ اُسے غصّہ آگیا تھا۔ کیونکہ جب سے وہ جیل میں آیا ہے۔ اُس کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ اُس کے چچا نے اُس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اُس کی ماں کنوئیں میں گر کر مر گئی ہے۔ ان حالات میں کوئی شخص بھی پاگل ہو سکتا ہے۔

تم میرے مالک تھے۔ بُرش نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ تم میری جان بھی لے لیتے تو مجھے غم نہ ہوتا۔

میرے دوست! میں تمہیں امریکی شاعر ویٹمن کے دو مصرعے ترجمہ کر کے سُناتا ہوں "وہ چیز جو سب کی ہے اُس کا کوئی ایک مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ جسے سب استعمال کرتے ہیں اُسے کون مار سکتا ہے؟؟" اگر تم نے دو دن پہلے کا وہ منظر دیکھا ہوتا جب دو درجن ہاتھوں نے تمہاری زندگی ریزہ ریزہ کر کے جیل کے فرش سے اُٹھا لی اور اُسے از سرِ نو ترتیب دیا، تم جگیلو کو یقیناً معاف کر دیتے..... کیونکہ کسی ایک شخص کی زندگی صرف اُس کی اپنی نہیں ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں سینکڑوں لوگ، ہزاروں حالات اور لاکھوں، کروڑوں خلیے حصّہ لیتے ہیں۔ پھر تم صرف اپنے کیسے ہو سکتے ہو۔ یا صرف میرے کیسے؟

جیل سے رہا ہو کر میں اپنے شہر میں واپس آگیا۔ اور دفتر دفتر ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک چھوٹا سا خلیہ میں بھی تھا۔ اور جگیلو اسیر بھی اور ہماری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ جن کے نام تاریخ کے کسی صفحہ

اور سڑک کے کسی کھمبے پر نہ ہوں گے۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ پھولوں کو دیکھتے ہیں۔ کھاد کی طرح گندے میلے کچیلے غلیظ غریب آدمیوں پر کس کی نظر جاتی ہے۔

اور تین ماہ کی کاوش کے بعد مجھے ایک دفتر میں ایک سو چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے چند دن بعد مجھے اپنے دوست کا مکان چھوڑ دینا پڑا۔ کیونکہ اس کی بیوی میکے سے آنے والی تھی۔ اس لیے میں اپنا سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کسی کھولی کی تلاش میں۔ اور سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنے پہلے گھر کا خیال آیا۔ ممکن ہے وہ خالی ہو۔ مگر اتنے عرصے تک اتنے بڑے شہر میں کوئی گھر خالی کیسے رہ سکتا ہے؟ مگر اس کے باوجود میرے قدم مجھے اسی پرانے گھر کی طرف لے گئے۔ ممکن ہے اسی بلڈنگ میں کوئی دوسری کھولی خالی ہو۔ مالک مکان سے میرے مراسم اچھے تھے۔ ممکن ہے وہ کوئی انتظام کر دے۔

لیکن اُس بلڈنگ کے اندر پہنچ کر میں مالک مکان کے دفتر میں نہیں گیا۔ جو گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ بلکہ دو منزل سیڑھیاں چڑھ کر اپنے پرانے گھر کو دیکھنے گیا۔ دروازے پر تالا نہ تھا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور برتنوں کے کھنکنے کی آواز کہیں اندر سے آ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھولا۔

میں نے دیکھا۔

دروازے پر سونی کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ آگے بڑھ کر اُس نے میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور مجھے کھینچ کر اندر لے گئی۔ اور دروازہ بند کرتے ہی میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی "دو سال سے میں نے اس گھر کو تمہارے لیے تیار رکھا ہے۔ میرا خیال تھا کبھی نہ کبھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ، دیکھو، اپنا گھر.....!"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں نے زور سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور چند لمحوں کے مکمل سنّاٹے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے لگے لگے کانپتے رہے۔ پھر اُس نے آہستہ سے اپنے سر کو میرے سینے سے ذرا سا ہٹا کر مجھے دو تین بار زور سے سونگھا اور مسکرا کر بولی "ہائے تمہارے سینے سے کیسی کورے گھڑے کی کچی کچی خوشبو آتی ہے!

ہر ڈال میں پھول آتے ہیں اور ہر خلا ستاروں سے بھر جاتی ہے۔ میری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے بھرنے لگی، اور اُس نیم تاریک کھولی میں بھی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ننھے ننھے دیوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دو سال کے بعد میرے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ وہ میری گود میں بیٹھ جاتی تھی اور غوں غاں کرتے ہوئے ایک عجیب زبان میں میرا اخبار پڑھتی تھی۔ کبھی اپنا پورا ہاتھ منہ میں ڈال کر میری زبان پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور میری ٹائی پکڑ کر اُس سے جھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اُسے میرا شیونگ برش بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر میری نقل کرتے ہوئے شیو کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور کئی بار اُس نے صابن کے جھاگ سے اپنا چہرہ بھر لیا۔ اور تالی بجا کر کہنے لگی "آہا۔ میں پپا ہوں۔ ممی دیکھو۔ میں پپا ہوں!"—

میں اپنی بچی کے لیے ایک خوبصورت پنگوڑا لایا۔ اور سونی نے اُس کے لیے بڑے خوبصورت فراک سیے۔ اور میں نے شدید جدوجہد کے بعد سوا دو سو روپے کی ایک بہتر ملازمت بھی حاصل کر لی۔ کیونکہ اُس بچی کے لیے میرے حوصلے اور میرے عزائم بلند ہو چلے تھے۔ میں اپنی بچی کو بہترین کھانا دوں گا۔ بہترین کپڑے۔ اور بہترین تعلیم۔ اور وہ شادی کے بعد کسی کھولی میں نہیں بلکہ پانچ کمروں والے جگمگاتے ہوئے کسی عمدہ فلیٹ

بن جائے گی۔ اسی طرح ماں باپ خواب دیکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں شیو کی تیاری کر رہا تھا۔ اور شیونگ برش کو صابن کی ٹکیہ سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہا تھا۔ میری بیوی ایک کونے سے چلائی "دیکھو تو آشا کو کیا ہو گیا ہے"۔

اُس کے چہرے پر وحشت اور خوف کا شدید تاثر تھا۔ میں نے صابن سے لتھڑے ہوئے شیونگ برش کو وہیں چھوڑا۔ تولیے سے اپنے منہ کو صاف کیا۔ اور آشا کی طرف بڑھا۔ اور اُس کا منہ کھول کر غور سے اندر دیکھنے لگا۔

بچی کا منہ اندر سے سوجتا جا رہا تھا۔ اور اُسے سانس لینے سے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ میں فوراً اُسے گود میں اُٹھائے اُٹھائے سیڑھیوں کے نیچے بھاگا۔ اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوا اور انجکشن دیتے ہوئے بتایا۔ کہ بچی کو ڈپتھیریا (DIPTHERIA) ہو گیا ہے۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بچی چل بسی۔

تین دن تک میں دفتر نہیں گیا۔ کپڑے نہیں بدلے۔ شیو نہیں کیا۔ اپنی کھاٹ پر لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک کونے میں پنگوڑا پڑا تھا۔ اور اُس پر بچی کے فراک پڑے سوکھتے تھے جو ابھی ابھی دھوبی سے دُھل کر آئے تھے۔ کیا جس طرح سے میری بچی کے فراک دھوبی سے دُھل کر آتے ہیں۔ کیا اسی طرح میری بچی مرگھٹ سے واپس نہیں آ سکتی؟ سوفی نے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ اور میں نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ میں کیا جواب دوں۔ میں کوئی خدا ہوں؟

چوتھے روز سوفی نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بستر سے اُٹھایا۔ کیا اسی کھاٹ پر لیٹے لیٹے مر جانے کا ارادہ ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے۔ اُٹھو شیو کرو۔ کپڑے بدلو۔ اور کام پر جاؤ۔

میں شیو کرنے لگا۔ معلوم ہوا۔ کہ شیونگ برش اُس وقت سے صابن میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ جس وقت میں پلٹ کر بچی کا منہ دیکھنے کے لیے مڑا تھا۔ صابن کا جھاگ اُس کے بالوں میں سوکھ گیا تھا۔ اور وہ اُن سفید سفید بالوں میں بہت بڈھا اور سوکھا ہوا اور غمزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر باتھ روم میں اُس کے بالوں سے سوکھا ہوا صابن چھڑایا۔ اور اُسے اچھی طرح سے صاف کر کے جب شیو کرنے لگا۔ تو مجھے اس کا لمس بے حد ملائم مکھن کی طرح نرم اور بالائی کی طرح ریشمیں معلوم ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو مجھے ایسا لگا گویا یہ برش کے بال نہیں ہیں، میری بچی کی ننھی ننھی انگلیاں ہیں جو بڑے پیار اور محبت سے میرے رخساروں سے کھیلتی ہوئی صابن کے جھاگ کی دھاریاں بکھیر رہی ہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہ نکلی۔ اور آنسو میرے رخساروں پر بہ بہ کر صابن کے جھاگ میں ملنے لگے۔ اور مجھے ایسا لگا، جیسے میرا شیونگ برش بھی میرے ساتھ رو رہا ہے اور انتہائی رفاقت سے ہولے ہولے میرے رخساروں کو تھپک رہا ہے۔

ڈیڑھ سال کے بعد ہمارے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی، لیکن مری ہوئی، پھر تیسرے برس ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن وہ بھی مرا ہوا۔

اس واقعے کے چند ماہ بعد سوفی اچانک مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اُس نے مجھے کچھ بتایا نہ کہا۔ نہ میرے لیے کوئی خط چھوڑا۔ چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی۔ بہت جگہوں پر میں نے اُسے ڈھونڈا۔ اور بہت عرصے تک میں نے اُس کی تلاش کی۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ اور میں پھر اپنی کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

اب مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے میں اپنے شیونگ برش سے کہتا ہوں، کیونکہ آدمی صرف نفرت کرنے والا صرف لڑنے جھگڑنے والا

صرف کام کرنے والا انسان نہیں۔ وہ محبت کرنے والا انسان بھی ہے۔ اور جب انسان اُس کی بات نہ سُنیں تو وہ کسی سے تو اپنے دل کا درد کہے گا۔ چاہے وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔

آٹھ سال سے میں اور میرا شیونگ برش اس کھولی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ میرا شیونگ برش بہت بڈھا ہو چلا ہے۔ بُری طرح اُس کے سر کے بہت سے بال جھڑ گئے ہیں۔ لکڑی کے دستے کا سارا پلستر اکھڑ چکا ہے۔ اور لکڑی میں بھی گہری گہری دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں۔ اور اُس کا بدنما پیتل کا خول جگہ جگہ سے یوں ہلتا ہے جیسے بڈھے کے منہ میں دانت ہلتے ہیں۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ بہت سیانا اور دانا ہو گیا ہے۔ میں گھنٹوں اُس سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور اُس کی باتیں سُنا کرتا ہوں۔ جو اُس کے لکڑی کے دستے نے کبھی جنگل کے درختوں سے سُنی تھیں۔ جو اُس کے بالوں نے غیر پالتو جانوروں سے مستعار لی تھیں۔ قدرت کا قانون۔ جانور کا سلیقہ اور انسان کی ہوشمندی اور زندگی کا گہرا دردناک تجربہ بھی اس میں شامل ہیں۔

آٹھ برس کے بعد آج مجھے سوتی کا خط ملا ہے۔ سوتی مجھے واپس بلا رہی ہے۔ سوتی نے دُوسری شادی کر لی تھی۔ اُس شادی سے اُس کے دو بچے پیدا ہوئے۔ دونوں لڑکے۔ دونوں زندہ ہیں۔ ایک کی عمر سات سال کی ہے۔ دوسرے کی پانچ سال کی۔ سوتی کا دوسرا شوہر مر چکا ہے۔ اور اب سوتی اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھی اکیلی ہے۔ شاید وہ تو اب اپنی باقی زندگی کسی شوہر کے بغیر بسر کر سکتی ہے۔ لیکن اُس کے بچوں کو ایک باپ کی شاید ضرورت ہے!

تمھیں جانا چاہیئے۔ شیونگ برش نے دوسرے دن مجھے صلاح دی۔

میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سوتی نے مجھے دھوکا دیا۔ بے وفائی کی۔

وہ تم سے بے وفا نہیں تھی۔ اپنی کوکھ کی وفادار تھی۔ ہر عورت اپنی کوکھ کی عزت کی محافظ ہوتی ہے! برش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جب دو مرے ہوئے بچے پیدا ہوئے تو سوتی کو ایسے لگا جیسے کسی نے اُس کی کوکھ کو کالکھ لگا دی ہے اور کوئی باعزت عورت اس کالکھ کو چھٹائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ تو زندگی کا قانون ہے کہ ہر جاندار اپنی زندگی اور تخلیق کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ جس کا رواں رواں سراسر تخلیق ہو اپنے حق سے باز کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے وہ چلی گئی کیونکہ اُسے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس میں تمہارا قصور تھا۔ نہ اُس کا...... اس دنیا میں کتنے ہی درد ایسے ہوتے ہیں جن کا الزام کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

مگر میں اُس کے بچوں کو اپنا بیٹا سمجھ سکتا ہوں؟ وہ میرے اپنے بچے نہیں ہیں!

اس دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا۔ اپنا بنایا جاتا ہے۔ برش نے جواب دیا۔

اپنائیت ایک رشتہ ہی نہیں ہے ایک عمل بھی ہے۔

بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ، میں نے غصے سے جھلاتے ہوئے کہا۔ میں اُس کُتیا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہرگز ہرگز اُس کے بیٹوں کا باپ نہیں بنوں گا۔

شرم نہیں آتی تمھیں ایسی باتیں کہتے ہوئے۔ مجھے اُس بڈھے برش کے سر کا ایک ایک بال غصے سے تنتا ہوا معلوم ہوا۔ اگر ایک جنگلی بھیڑیئے کی ماں انسان کے بچے کو اپنا بیٹا بنا سکتی ہے تو تم انسان ہو کر کسی دوسرے انسان کے بچوں کو اپنا بیٹا نہیں بنا سکتے؟ بس اتنی ہی ہے تمھاری تہذیب؟......!

یکایک میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کیونکہ اس کی منطق کے اندر مجھے ایک گہری اور وسیع حقیقت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میرا [illegible] ہوشمند

یہ خود بخود دھیما پڑ گیا۔ اور آئینے میں دیکھ کر اور احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر میں نے آہستہ سے کہا۔ اچھا اچھا۔ میں اسے کل خط لکھوں گا۔

کل پر مت ٹالو۔ کل تک شاید تمہارے خلوص کی گرمی ٹھنڈی ہو جائے۔ ابھی لکھو۔ اسی وقت!

اچھا لکھتا ہوں۔ میں نے آئینے میں اپنی محجوب صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر میں خط لکھنے کے لیے پلٹا ہی تھا۔ کہ میرا پاؤں فرش پر پھسل گیا۔ اور شیونگ برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب کی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا۔ اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں خود بھی بچتے بچتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اور پھر سنبھل کر گھٹنوں کے بل اٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جو سیدھا ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ فرش پر میرے شیونگ برش کی لاش پڑی ہے۔ سر کہیں۔ دھڑ کہیں۔ پاؤں کہیں۔ اور اس کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کی طرح بھیانک تھا۔ جس کے اندر ایک دانت باقی نہ رہا ہو۔ لکڑی کی ہتھی کے چھوٹے چھوٹے درجنوں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پیتل کا خول ریزے ریزے ہو گیا تھا۔ اور شیونگ برش کے چند بال جو اس کے سر پر باقی رہ گئے تھے عجب منتشر شدہ حالت میں فرش پر ادھر اُدھر خاک میں بکھرے پڑے تھے۔ یکایک کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور فرش کے گرد و غبار میں اس کے بال اُڑ اُڑ کر فضا میں بکھرنے لگے۔

تو یہ موت ہے! موت جس کا کوئی اپریشن نہیں ہوتا۔ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ جو بالآخر کسی طرح سے ٹالی نہیں جا سکتی۔

میرے سینے سے دبی دبی اک آہ سی نکلی۔

اس دوست نے اٹھارہ برس تک میرا ساتھ دیا۔ اس نے میری ہر کمینگی برداشت کی اور میرا ہر دُکھ جھیلا۔ یہ میرے ساتھ جیل گیا۔ اور اس اندھی کھولی میں رہا اور جب سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تو یہ میرے ساتھ رہا۔ اس نے ہر مصیبت کا وار ہنس ہنس کر خالی دیا۔ اور جب کسی نے مجھے زخم دیے اس نے اک دردمند مسکراہٹ سے اس پر صابن کا نرم نرم جھاگ رکھ دیا۔

غم موت کا نہیں ہے!

غم اس جانی پہچانی شکل و صورت کا ہے جو اب کبھی دکھائی نہ دے گی۔ غم شخصیت کی اس ادا کا، حسن کی اس ترتیب کا ہے جو آج ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔

غم موت کا نہیں ہے!

غم اس مخصوص اور مانوس رشتہ کا ہے جو آج ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ننگے پاؤں سے فرش پر چلتا ہوا، میں اس کے قریب پہنچا۔ اور فرش پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے یوں چننے لگا جیسے کوئی جلی ہوئی چتا سے اپنے کسی پیارے کے پھول چنتا ہے۔

چند دن تک میں نے شیو نہیں کیا۔ یونہی ڈاڑھی بڑھائے ادھر اُدھر ایک عجب بے کلی سے گھومتا رہا۔ چند لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کوئی قریبی رشتے دار مر گیا ہو۔ لیکن جب انھوں نے میرے غم کی وجہ پوچھنا چاہی تو میں انھیں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ کس سے کہتا کہ میرا شیونگ برش مر گیا۔ اس دنیا میں جہاں آج کوئی ایک انسان کا رشتہ ماننے کو تیار نہیں ہے۔ ایک انسان کا ایک شیونگ برش سے رشتہ کون تسلیم کرے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ غریب ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے اور کانچ کے دریچوں پر رکھے ہوئے شیونگ برش ہمیشہ بیچے جائیں گے لیکن ان کی روح کا درد کون دیکھے گا؟

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائلپور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائلپور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ اُن دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے، اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے۔ اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائلپور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی، اس لیے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائلپور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اُٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں۔ جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔

زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ میسر آ جائے تو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ ساری عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالے سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ بھی جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی نہ کوئی زیور۔ اسبابِ دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے۔ ایک جوڑا دیسی جوتا۔ ایک جوڑا ربڑ کے چپل۔ ایک عینک۔ ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز۔ ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن۔ دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بُکل ماری اور جہاں کہئے چلنے کو تیار۔ سفرِ آخرت بھی انھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی گھنٹوں میں زندگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دُنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبےٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقعہ کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالےٰ ہاتھ پاؤں چلتے چلاتے اُٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے.....

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ سب کے بعد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے

براہ راست کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال ہی کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائلپور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں۔ تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا۔ جو کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پا پیادہ بھٹکتا رہا لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خضرِ صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھوس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بُری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے پر اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح چلتے چلتے وہ چک نمبر ۵۰ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توڑیے اور کُلفتے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھا دیا۔ جب پک کر تیار ہو گیا۔ اور ساگ کو آلن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے

ی ہنڈیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر ضیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس زنانہ ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں وہ بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایئرکنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں۔ اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

ضیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائلپور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ اور ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پہ رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انھیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں "ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔"

"ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پُتّ" ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے۔ اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے

میں منہمک ہوگئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کرکے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کرکے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سر سید کے کانوں میں بھی پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بُلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہوگئے۔

سر سید کو اس بات کی دُھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان جاکر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادتمندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سر سید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

”کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟“ سر سید نے کڑک کر پوچھا۔

”جی ہاں“ عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کر سر سید آپے سے باہر ہوگئے۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا، اور پھر کالج کی نوکری سے برخواست کرکے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: ”اب تم ایسی جگہ جاکر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سُن سکوں۔“

عبداللہ صاحب جتنے سعادتمند بیٹے تھے اتنے سعادتمند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دُور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہوگئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کرلیے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

”اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟“ عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

”اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔“ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ۔ وسیع باغ۔ نوکر چاکر۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو ان کو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر ایک خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انھوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی ویسے گزر ہی گئی ہے۔ اب اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ برتن مانجھنا۔ کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا "مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں۔ براہِ مہربانی میری طرف سے آپ اس کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا۔ جیسے سر سید کے ہاں سے بھاگا تھا۔"

ماں جی پر ان ہنگاموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار۔ صرف ایک بار۔ ماں جی بھی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمہارا

نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمھاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا دُکھ سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی۔ "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بُلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا اُفتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرِ وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سُن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا "کبھی ہمارے لیے بھی دُعا کرنا۔"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سُوجھتا۔

ماں جی خود بھی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اُتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالمِ شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا۔ اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو نہ رویا کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب لان کی کھردری چارپائی پر حسبِ معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر اُن کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے۔ اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے۔ اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال اُمڈ آئے۔ "ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی سے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم میرے ساتھ نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمھارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمھیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے

میرے سرتاج......

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آچکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اُٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے تکیے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا۔ ہلایا۔ چمکارا۔ پکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقیماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی "بچہ۔ رونا مت۔ تمہارے ابا جس آرام سے رہے تھے اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی"۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گودڑی" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی......

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے آگے ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا مُلا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں تو پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی رُوح کو تکلیف نہ پہنچے۔

اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا............

پھول کی چھڑی

علی عباس حسینی

لچھمن سچ مچ بڑے ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ وہ ہر ایک سے ہنس کر بولتا، جھک کر ملتا۔ قصبے کا سب سے بڑا پہلوان ہونے پر بھی نہ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا اور نہ اسے لڑائی دنگے سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا، دو چار نوجوانوں کو زور کرا دیتا، پھر سیر ڈیڑھ سیر تازہ دودھ پی کر، چبینا چباتا اپنی بھینسوں گایوں کو چرانے سبزہ زاروں میں نکل جاتا۔ جب تک اس کا باپ موہر زندہ تھا لچھمن کا بس اتنا ہی کام تھا۔ صبح شام ورزش، مویشی چرانا، اور اکیلے میدانوں میں "برہا، ٹھمری" گاتے پھرنا۔ جب سے موہر مرا تھا کھیت کھلیان بھی اسے دیکھنا پڑتا تھا۔ اس نے اس بار کو بھی خوشی خوشی سنبھال لیا تھا۔ دودھ دہی بیچنا، غلہ کوٹھیوں میں رکھنا، ٹھاکر کا لگان ادا کرنا پہلے بھی یہ کام ماں باپ کرتے تھے، اب بھی اس کی بوڑھی "ماتا" اسے انجام دیتی تھی۔ ذات برادری کی رسم کے مطابق اس کا بیاہ سات ہی برس کے سن میں ہو چکا تھا۔ مگر وہ اب تک "گونا" کر کے اپنی دلہن کو گھر نہ لایا تھا۔ ماں بار بار گونے پر زور دیتی تو وہ کہتا "گونا جب ہی کراؤں گا جب کسی بڑے دنگل میں کسی بڑے پہلوان کو مار لوں گا!" سسرال والوں کو بھی کوئی جلدی نہ تھی۔ جوان بیٹے اپنا اپنا گھر کر کے الگ ہو گئے تھے۔ بوڑھے ماں باپ کے سارے کاموں کا بوجھ یہی جوان بیٹی اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھائے تھی۔ جتنی دیر میں لچھمن کا یہ پہلوانی کا شوق پورا ہو اتنا ہی اچھا۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ بنارس کے ایک کل ہند دنگل میں بھارت کے نمبر ۲ پہلوان ہیکڑ سنگھ سے لچھمن کی کشتی ہوئی اور اس نے ہیکڑ کو چند ہی منٹ میں پچھاڑ دیا۔ قصبے کے سینکڑوں آدمی یہ کشتی دیکھنے گئے تھے۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لچھمن نے گویا ان کے قصبے کو اپنی اس جیت سے ایک تاریخی قصبہ بنا دیا تھا۔ وہ اسے شہر اور قصبے میں دو دن تک کندھوں پر بٹھائے بٹھائے چیختے اور اچھلتے پھرے۔ بچہ بوڑھا سب ہی خوش تھا، صرف ناخوش تھے تو ٹھاکر دھنپت سنگھ۔

انگریزی راج میں دھنپت سنگھ دس بارہ گاؤں کے مالک تھے۔ جب ملک کو آزادی ملی اور اتر پردیش میں زمینداری توڑ دی گئی تو دھنپت سنگھ کے پاس سوائے خود کاشت اور سیر کے کھیتوں اور آم و امرود کے باغوں کے کچھ نہ رہا۔ مگر جس نے چالیس برس تک "داتا" اور راجا کی طرح دس بارہ گاؤں پر راج کیا ہو، وہ لچھمن کو کیا خاطر میں لا سکتا تھا۔ دھنپت سنگھ سورج بنسیوں سے ناطہ جوڑتے تھے۔ لچھمن ضلع کا سب سے بڑا پہلوان سہی مگر تھا تو ان کا کچھ ہی برس پہلے "پرجا"۔ اور ذات کا اہیر تھا۔ اس ذات کے بارے میں دھنپت [illegible] بڈھوں سے سن رکھا تھا کہ [illegible] "اہیرا ہیرا [illegible]" [illegible] اہیر کے بچے نے یہ [illegible]

ہی۔ وہ دنگل جیتنے کے بعد گڑھی پر سلام کرنے تک حاضر نہ ہوا۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کے باپ دادا گڑھی کے ٹکڑوں پر پلے تھے۔ قصبہ کی یہ ریت بھی تھی کہ رعایا پرجا میں سے جب بھی کسی کے ہاں کوئی خوشی کی بات ہوتی۔ شادی، بیاہ، گونا۔ تو خوشی منانے والے ٹھاکر صاحب کو سلام کرنے ضرور جاتے۔ زمینداری چھن جانے کے بعد دھنپت سنگھ کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ پرانے رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے پائے۔ وہ جو رعایا تھے، خود سر ہو کر "من مانی" نہ کرنے پائیں۔ اس لیے اگر اس میں کوئی فرق آجاتا تو وہ حد درجہ خفا ہو جاتے تھے اور ان کا خفا ہونا اب بھی اثر رکھتا تھا۔ ضلع کے حاکم اب بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اب بھی اس مرے ہوئے ہاتھی کا وزن کسانوں کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ تھا۔ وہ اب بھی اپنے کھیت بٹائی پر اُٹھاتے تھے اور بڑی بڑی نذریں لے کر ایک سے کھیت نکال کر دوسرے کو دے دیتے تھے۔ ان کے پاس اب بھی لاٹھی چلانے والے کارندوں کی فوج تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کر سکتا۔

مگر جیسے جیسے پھمن کی شہرت بڑھتی گئی، اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ قصبے کے آپس کے جھگڑوں میں جن کا فیصلہ گڑھی میں ہمیشہ غصے اور غم سے رُتا جاتا تھا، اس کے ہنستے ہوئے چند فقروں پر مدعی اور مدعا علیہ دونوں خوش خوش گھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہ صاف ٹھاکر دھنپت سنگھ کی حکومت میں مداخلت تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہوا کہ اُن کے کھیتوں کے بندوبست میں مقابلہ کرنے والوں کی کمی ہونے لگی اور اس طرح نذر کی مجموعی رقم بھی گھٹنے لگی۔ پرانے کسانوں سے کھیت چھیننے کے لیے نیا دعویدار مشکل ہی سے تیار ہوتا۔ پھمن کے خفا ہو جانے کا ڈر جو تھا!

اتفاق یہ ہوا کہ ایسا ہی ایک معاملہ دنگل کے چوتھے ہی دن پیش آگیا۔ ٹھاکر صاحب کے ایک کھیت کے دونوں حریف پھمن کے چیلے تھے۔ ایک کئی برس سے وہ کھیت جوت رہا تھا۔ دوسرا للچائی نظروں سے اسے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اب کے ٹھاکر کے کارندوں نے اس سے کچھ نذر لے کر اسے کھیت دلوانے کا وعدہ کیا۔ پھمن کو دو دن پہلے خبر معلوم ہو گئی۔ اس نے کھیت کے نئے طلبگار کو سمجھایا "بُری بات ہے۔ دونوں ایک ہی اکھاڑے میں لڑتے ہو، آپس میں یہ پھوٹ کیسی؟" چنانچہ اس نے ٹھاکر صاحب کو نذر دینے اور کھیت لینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے کارندوں میں سے ایک کو حکم دیا "تم خود کھیت جوت لو!"

پرانے کاشتکار نے یہ حکم جو سُنا تو مُنہ اندھیرے کھیت پر ہل چڑھا دیا۔ ٹھاکر صاحب کو جیسے ہی خبر معلوم ہوئی انھوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "اسے مار کر کھیت سے باہر نکال دو۔" اس نے اپنے گرو کے پاس فریاد کہلا بھیجی۔ پھمن اسی وقت کئی چیلوں کو زور کرا کے اکھاڑے سے نکلا تھا۔ وہ جسم جھاڑتا لپکا ہوا کھیت پر پہنچا۔ خیال تھا "اپنے قصبے ہی کے لوگ ہیں، میری بات نہ ٹالیں گے۔ جھگڑا چکا کے چلا آؤں گا۔" مگر وہاں جو فریقِ مخالف نے اسے نہتا دیکھا تو لاٹھیاں لے کر پل پڑے۔ وہ "ہائیں ہائیں!" کرتا ہی رہا کہ دو ایک لاٹھیاں اس پر پڑ گئیں۔ اب اس نے اپنے کو بچانا ضروری سمجھا۔ اس نے ایک وار کو جھکائی دے کر خالی دیا اور مخالف کی کلائی مروڑ کر لاٹھی چھین لی۔ اور صرف ڈرانے کے لیے دو ایک ہاتھ گھما دیے۔ مگر اسے خود بھی غالباً اپنی قوت کا اندازہ نہ تھا۔ لاٹھی جسے بھی چھو گئی، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر باقی بھاگ نکلے۔

ٹھاکر صاحب نے فوجداری میں مقدمہ دائر کیا۔ ان کے آدمیوں پر پھمن نے زبردستی حملہ کر کے انھیں زخمی اور مجروح کیا اور ان کے کھیت پر قبضہ کر لیا۔ عدالت میں خود ذاتی طور پر حاضر ہوئے اور چشم دید گواہ بنے۔ پھمن بجائے اس کے کہ گونا کرا کے بیوی گھر لاتا، خود [illegible] ماں کے سیئے جیل جا بسایا۔ یہیں اس ٹھنڈے مزاج کے پھمن میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ اس کا سینہ غصے اور نفرت کی ایک

دہکتی بھٹی بن گیا۔ وہ جس نے کبھی کسی کے لیے کوئی بُرائی نہ سوچی تھی اب ہر وقت ٹھاکر صاحب کو طرح طرح سے اذیتیں دینے کی صورتیں سوچنے لگا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا وہ قید سے چھوٹتے ہی سیدھا گڑھی جائے گا اور ٹھاکر کو گھسیٹتا باہر لائے گا۔ پھر اس کے جھوٹ، اس کی بے ایمانی کی پورے قصبہ کے سامنے اسے سزا دے گا۔ وہ دانت پیس کر کہتا "میں ٹھاکر کو اس کی بے ایمانی کا مزہ چکھا کر چھوڑوں گا! اس کی ٹھکرائی بھلا دوں گا!"

دوسرے قیدی اور جیل کے اہل کار اس کی عزت اور اس کا خیال کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کے لیے اپنی ورزش جاری رکھنے کا خاص انتظام کر دیا تھا۔ اسے جو بھی کام دیا جاتا اسے پوری تندہی سے انجام دیتا۔ دوسروں کے لیے اس کی مسکراہٹ اور اس کی ہنسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس لیے جس دن معیاد پوری ہوئی اسے رہائی کا حکم تو دس ہی بجے مل گیا، لیکن وہ چھوٹا شام کے قریب۔ قصبہ چھ میل پر تھا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ادھر چلا۔ ٹھاکر سے بدلہ لینے اور اس سے نفرت کی بھٹی دل میں جل رہی تھی۔ بس یہی فکر تھی کسی طرح قصبہ آئے تو میں گڑھی میں گھس کر اس کی گت بنا لوں، پھر گھر جا کر منہ ہاتھ دھوؤں، ماں کے پاؤں چھوؤں۔ لیسفر اچکاؤں تو دل میں لگی آگ ٹھنڈی پڑے۔

اسی دُھن میں اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سورج کب ڈوبا، دُھندلکا اندھیرے میں کب بدلا اور شام نے رات کی سیاہ ساڑی اپنے بدن پر کب لپیٹنا شروع کر دی۔ سڑک گو کچی تھی مگر کشادہ تھی۔ راستہ منجھا ہوا تھا۔ قدم بے کھٹکے اُٹھ رہے تھے۔ ماں سے، دوستوں سے ملنے کے شوق سے زیادہ نفرت کی گیس اسے تیز قدم بنائے ہوئے تھی کہ قصبے کی طرف سے روشنی اس کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے غور سے دیکھا کہ کوئی لالٹین لیے چلا آ رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ سُرخ بانات سے ڈھکا ہوا "جوپالا" چار کہار کندھوں پر اُٹھائے لا رہے ہیں۔ دو پیادے لاٹھیاں لیے اُس کے ساتھ ہیں۔ اس طرح کے ڈولے، اتنے اہتمام کے ساتھ سوائے رئیسوں، امیروں کے اور کسی کے نہیں آتے جاتے ہیں۔ خیال آیا راجکماری میکے آئی رہی ہو گی "بدا" ہو کر سسرال واپس جا رہی ہوں گی۔ بیٹی کا خیال کرتے ہی اس کا باپ، ٹھاکر دھنپت یاد آ گیا اور غصہ اور انتقام کے بخارات سینے سے اس طرح اُٹھے کہ سر میں ٹیک سی بیدار ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا ٹھاکر سے بدلہ لینے کا اس سے اچھا اور کیا موقع مل سکتا ہے؟ اس کی ساری عزت خاک میں ملائی جا سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا سارا گھر تھو تھو کرے گا کمبخت پہلوان کا ٹھاکر سے تو کچھ بس نہ چلا۔ اس نے ایک کمزور عورت پر ہاتھ اٹھایا۔ نہیں، نہیں، یہ تو بڑی [illegible] بات ہو گی! اسے تو بدلہ لینا ہے ٹھاکر ہی سے اور اس کے ان پیادوں سے جنہوں نے گواہ بن کر اس پر جھوٹا الزام لگایا۔

وہ یونہی اپنے من [illegible] باتیں کرتا آگے بڑھتا گیا۔ کہاروں کی [illegible] ہاں، [illegible] چل چل سنائی دینے لگی۔ آدمیوں کی بھی [illegible] کی روشنی میں [illegible] پسینے [illegible]۔ وہ [illegible] کی آنکھ [illegible] بعد [illegible]۔ لالٹین زمین پر رکھ دی گئی۔ [illegible] جیسے [illegible] ہو۔ [illegible] قدم اور تیز [illegible] قریب پہنچا تو دیکھا کہ چار آدمی منہ [illegible] چار [illegible] ان سے [illegible]۔ [illegible] آ کر پہنچا ہی تھا کہ [illegible] [illegible] تھا۔ مگر وہ اس طرح دھاڑتا [illegible] کا مار خالی دے کر اسے گرا [illegible] [illegible] کیا تھا چندری [illegible]

میں دو ڈاکو ڈھیر تھے اور دو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔

لچھمن نے لالٹین اُٹھا کر پیادوں کی صورت دیکھی۔ دونوں وہی تھے جنھوں نے جھوٹی گواہیاں دے کر اسے جیل کی ہوا کھلائی تھی۔ وہی جن سے ٹھاکر کے ساتھ ساتھ وہ بدلہ لینے کے منصوبے ایک سال سے بنا رہا تھا۔ جی چاہا ان دونوں بیہوش پیادوں کو ایک ایک لاٹھی اپنی طرف سے مار دے تو اس پر کوئی الزام بھی تو نہیں آ سکتا۔ لوگ یہی سمجھیں گے۔ ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ اس نے لاٹھی تانی مگر معلوم ہوا جیسے کسی نے تھپکی دے کر ہاتھ کا رُخ بدل دیا۔ اس نے پاس والے درخت کے تنے پر اتنے زور سے لاٹھی ماری کہ وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ وہ کانپنے لگا۔ اس نے جھک کر لاٹھی کا ایک ٹکڑا اُٹھا لیا اور اسے اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے اس طرح توڑتا پھاڑتا رہا جیسے کہ وہ پیادوں کی زندگی کے ورق پرزے پرزے کر رہا ہے۔ وہ ایک منٹ ہاتھی کی طرح جھومتا دُور اندھیری فضا میں گھورتا رہا۔

دفعتہً زخمی پیادوں میں سے ایک نے کراہ کر اسے چونکا دیا۔ وہ اس پر جھک پڑا۔ اس نے پکارا "امراؤ کاکا! امراؤ کاکا!"— امراؤ نے آنکھ کھولی۔ مگر اسے بالکل نہ پہچانا۔ اس نے آخری ہچکیوں کے ساتھ حق نمک ادا کیا۔ وہ رُک رُک کر بولا "چوپالا!..... بٹیا رانی!" اور اس کا منکا ڈھل گیا۔

لچھمن نے جلدی سے چوپالے کے پاس جا کر پکارا "بٹیا رانی! بٹیا رانی!"

جواب ملا "کون؟"

لچھمن نے کہا "نام پوچھ کے کیا کیجیے گا۔ یہ بتائیے کہ آپ چوپالے میں اکیلی بیٹھی رہیے گا کہ میرے ساتھ قصبے چلیے گا۔ کہار سب بھاگ گئے!"

راجکماری نے پردہ اُلٹ دیا۔ حُسن کی دیوی سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ سسرال سے میکے آئی تھی۔ اب واپس جا رہی تھی۔ جو کچھ پہن کر آئی تھی اس میں باپ نے کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ ساٹھ برس کے دھنپت سنگھ کے بعد سب کچھ اسی اکیلی کا تھا۔

لچھمن نے راجکماری کو بارہا دیکھا تھا۔ ٹھاکر کے ہاں زیادہ پردہ نہیں تھا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ جب بھی کھیتوں، باغوں میں صبح شام گھومنے ٹہلنے نکلتے تو رانی بٹیا کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ دو لڑکے جوان ہو کر مر گئے تھے۔ یہی ایک بیٹی رہ گئی تھی۔ اسی کو سب کچھ اب ملنے والا تھا۔ اسی لیے وہ اسے ہر چیز دکھا دینا چاہتے تھے اور بٹیا رانی کی مختلف صورتیں لچھمن کی نظر میں اس وقت [illegible]

وہ بھی جب وہ ننھے ننھے پاؤں پر لُدپُد لُدپُد چلتی تھی، وہ بھی جب وہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر اس کے لمبے تڑنگے ڈیل کو اس [illegible] تی تھی جیسے وہ آدمی نہیں کوئی دیو ہے۔ وہ بھی جب اُس نے تیرہ برس کے سن میں لچھمن کے سلام کرنے پر حقارت سے ہونٹ [illegible] کے اس پر اچٹتی نظر ڈالی تھی۔ گویا ان جیسوں کے سلام کا جواب نہ دینا ہی ان کے مرتبوں کے فرق کی خاص پہچان ہے۔ [illegible] س وقت کچی سڑک پر، درختوں کے نیچے، رات کے اندھیرے میں، صرف ایک بھبکتی ہوئی لالٹین کی دھوئیں والی روشنی میں، [illegible] یسی دکھائی دی جیسے وہ کوئی اپسرا ہے، خوابوں میں آنے والی کوئی پری یا راہو کے مُنہ سے چھوٹتا ہوا چاند۔

اس کے دل میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ وہ جس کا باپ اس کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا تھا۔ وہی جو لچھمن کو "اہیر کا بچہ" کہا کرتا تھا [illegible] سمجھتا تھا۔ اسی کی چاند سی بیٹی، وہی بیٹی جو اس کے سلام کا جواب سلام سے دینا اپنی توہین سمجھتی تھی وہی

"بٹیا رانی"، وہی راجکماری اپنے قبضے میں تھی۔ رگ رگ میں آگ سی دوڑی، کنپٹیاں دھمکنے لگیں۔ مگر خیال آیا، عورت پر، کمزور پر آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جو سنے گا کیا کہے گا! وہ پھر کانپنے لگا۔

ادھر غریبے، زخمی پیادہ کراہا۔ راجکماری جلدی سے لالٹین اُٹھا کر اس کی طرف مُڑ گئی۔ اور اس کا چہرہ خون میں بھرا دیکھ کر "ہائے رام! ہائے رام" کہہ کر زمین پر بیٹھ کر اُسی کے "انگوچھے" سے اس کا خون پونچھنے لگی۔ لچھمن نے ایک لمبی سینے میں کھلتی سانس لی۔ اور آگے بڑھ کر غریبے کی پگڑی پھاڑ کر اس کا سر کس کر باندھ دیا۔ پھر اُسے اُٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔

راجکماری نے پوچھا "اور امراؤ؟"

لچھمن نے کہا "وہ مر گیا!"

راجکماری پھر "ہائے رام ہائے رام" کہہ کر رونے لگی۔

لچھمن نے پوچھا "چوپالے میں کوئی گہنے کا صندوق ہے؟"

اس نے سسکتے ہوئے سر ہلا کر کہا "ہاں"

لچھمن نے وہ بھی بغل میں دبا لیا اور لالٹین ہاتھ میں لے کر کہا "آؤ چلو، رانی بٹیا!"

اور وہ دونوں گڑھی کے پھاٹک تک پہنچے۔ پھاٹک بند تھا۔ لچھمن نے کنڈی کھٹکھٹائی، آواز دی۔ غریبے کو کندھے سے اُتار کر زمین پر لٹا دیا۔ لالٹین اور صندوق وہیں رکھا۔ پھر وہ بولا "اب ہم گھر جاتے ہیں"

راجکماری نے کہا "ارے تم کون ہو بھیا؟ نام تو بتلاتے جاؤ!"

اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولا "وہی لچھمن اہیر جسے ٹھاکر صاحب نے بے قصور قید کرایا تھا!" اور وہ وہ سے مڑ کر جانے لگا۔ راجکماری جھپٹ کر سامنے آ گئی۔ اور اس نے جھک کر لچھمن کے پاؤں چھو لیے۔ پھر وہ ہاتھ جوڑ کر بولی "چھما کر دو بھ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اب پتا جی! تم ان کے بیٹے سمان ہو!"

لچھمن کھڑے کھڑے اس طرح ہلنے لگا جس طرح سخت طوفان میں جہاز کا مستول ہلتا ہے یا تاڑ کا درخت۔ اس نے اپنا کانپتا ہاتھ راجکماری کے سر پر رکھ دیا۔ اسے تھپتھپایا۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولا "اچھا اچھا، تمھارے نالے!"

راجکماری کے میٹھے بول نے فولاد کو موم بنا دیا! پھولوں کی چھڑی نے لوہے جیسی لاٹھی توڑ دی! راجکماری پھر اس کے پاؤں کی طرف جھکنا چاہتی تھی کہ زنجیر کھٹکنے کی آواز آئی۔ ہنس مکھ پہلوان سسکتا ہوا بھاگا!

(طنزیہ)

سٹاف آرٹسٹ

(نارتھ کوٹ پارکنسن سے معذرت کے ساتھ)

ممتاز مفتی

جو شخص فنکارانہ ذہنیت کا حامل ہونے کے باوجود گورنمنٹ سروس میں لے لیا جائے، اُسے سٹاف آرٹسٹ کہتے ہیں۔ حالانکہ علم نفسیات کی رو سے فنکارانہ ذہنیت گورنمنٹ سروس کے لیے قطعی طور پر ناموزوں ہوتی ہے۔

برطانوی راج کے اوّلیں ادوار میں، فنکارانہ ذہنیت کی مناسب چھان پھٹک کے بعد، برطانوی ماہروں نے حتمی فیصلہ کر دیا تھا کہ فنکارانہ ذہنیت نوکرشاہی کے لیے نااہلی کی مظہر ہے۔ اور ایسے اوصاف کی حامل ہے جو ایڈمنسٹریشن سے متعلقہ ذمہ دارانہ فرائض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہے۔

فنکار شاید برطانوی ماہروں کے اس فیصلے سے اتفاق نہ کریں لیکن نظم و نسق سے متعلقہ حضرات اس حقیقت کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔

فنکارانہ ذہنیت کئی ایک اجزا سے مرتب ہوتی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا جزوِ اعظم SENSITIVITY یا شدتِ احساس ہے۔ شدتِ احساس کے بل بوتے پر آپ ایک پُراثر نغمہ تخلیق کر سکتے ہیں ایک نظم یا غزل کہہ سکتے ہیں۔ رنگ اور خطوط سے مرتبہ طوفان بپا کر سکتے ہیں۔ الفاظ کی مدد سے زندگی کی نقاشی کر سکتے ہیں یا ہیر رانجھا سی محبت رچا سکتے ہیں۔ لیکن نظم و نسق کے سے ذمہ دارانہ فرائض ادا نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر سرجن محسوس کرنا شروع کر دے تو وہ کیا اپریشن کر سکے گا؟ اگر جج محسوس کرنا شروع کر دے تو کیا وہ کوئی صحیح فیصلہ کر سکے گا؟ اس کے محسوسات قاتل کو کس طرح پھانسی کی سزا دے سکیں گے؟

ملک کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے یہ احتیاط ازبس ضروری ہے کہ ایڈمنسٹریشن میں کوئی رقیق القلب قسم کا شخص نہ آ گھسے یعنی ایسا فرد شامل نہ ہو جائے جو فنکارانہ ذہنیت کا مالک ہو۔

یہ تو طے شدہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی بہبود، امن، ترقی اور خوشحالی کا تمام تر انحصار اس ملک کے نظم و نسق پر ہوتا ہے۔ اور اگر ملک نوزائیدہ ہو اور عوام میں احساسِ قومیت نے ابھی جڑ نہ پکڑی ہو تو یہ حقیقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں خود مختاری ملنے پر یہ سوال پیدا ہوا کہ غیر ملکی حکومت کے جانے اور حصول آزادی کے بعد کیا حکومت کی پالیسی

بدلنے کی ضرورت ہے؛ اگر ہے تو کس حد تک اور کیوں! اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لیے اربابِ بست و کشاد نے سمجھدار سنجیدہ اور تجربہ کار اہلکاروں کا ایک کمیشن قائم کیا۔ جنھوں نے مناسب تحقیق کے بعد اپنی سفارشات پیش کر دیں۔ اس کمیشن کا نام ایڈمنسٹریٹیو یکیو ریوریشن کمیشن تھا۔ کمیشن کی جملہ سفارشات کا تو علم نہیں ہو سکا لیکن فنکارانہ ذہنیت کے متعلق اُن ذمہ دار اور صاحبِ نظر افراد کا فیصلہ یہ تھا کہ اس ضمن میں برطانوی فیصلے کو برقرار رکھا جائے چونکہ اس نوزائیدہ ملک کی بقا اور بہبود کے لیے یہ اصول پہلے کی نسبت قدر بھی زیادہ اور بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

کمیشن کا یہ فیصلہ ٹھوس حقائق اور سوجھ بوجھ پر مبنی تھا۔ اس ضمن میں ان کی سفارشات مختصر مگر جامع تھیں:۔

(۱) شدتِ احساس کی وجہ سے فنکارانہ ذہنیت۔ نسوانی ذہنیت کے قریب ہوتی ہے۔ ملک کا نظم و نسق عورتوں کے ہاتھ میں دے دینا دانشمندی نہیں۔

مندرجہ بالا حقیقت ناقابلِ تردید ہے۔ عورت کی طرح فنکار کا نقطہ نظر بھی خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتا ہے اور نظم و نسق کے فرائض ادا کرنے کے لیے خارجی اور جذبات سے عاری زاویہ نظر اشد ضروری ہوتا ہے۔ اگر نظم و نسق عورتوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو بے شک بچوں کو محبت بھری گود دستیاب ہو جائے گی لیکن زندگی کو (جو تلخ حقائق سے عبارت ہے) بسر کرنے کی اہلیت پیدا نہ ہو سکے گی۔

نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے قدرت نے باپ کی تخلیق کی۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے آدم کی تخلیق کی اور بعد میں اماں حوا کو پیدا کیا۔ یہ حقیقت اس امر کی شاہد ہے کہ خالقِ ارض و سما کی نگاہ میں نظم و نسق، احساس اور محبت سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔

ممکن ہے ادیب اور فنکار کمیشن کے اس فیصلے پر احتجاج کرتے لیکن اراکین نے پہلے سے ہی اس بات کا خیال رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی سفارشات میں ادیبوں کی اپنی تحریروں کے اقتباسات حوالے کے طور پر دیے تھے اور دوسری شق میں اپنی دلیل کی وضاحت کی تھی۔

(۲) اپنے ادب پاروں میں ادیبوں نے جگہ جگہ فرض اور جذبے کی کشمکش کا اظہار کیا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ احساس یا جذبہ فرض کی ضد ہے جو بسا اوقات فرض پر غالب رہتا ہے اور ہمیشہ انسان میں تذبذب پیدا کرتا ہے۔ تذبذب فیصلہ کرنے کی قوت کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور جس شخص میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو وہ ایڈمنسٹریٹر نہیں بن سکتا۔

اس حوالے اور دلیل سے انھوں نے یہ امکان ہی ختم کر دیا تھا کہ فن کار ان کی سفارشات کے خلاف آواز اٹھائیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ رکھے تھے۔ للٰذا کس منہ سے بات کرتے۔

کمشن کی تیسری دلیل اس سے بھی زیادہ جامع تھی۔

(۳) فنکار صرف خود ہی شدتِ احساس کے مرض میں مبتلا نہیں بلکہ عوام کے دلوں میں بھی احساس پیدا کرنے کے خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ خود مریض ہیں اور قوم کے لیے وبائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا وجود اور بھی خطرناک ہے۔

فنکار کمیشن کی اس دلیل کو بھی رد نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ فن کی غایت تاثر پیدا کرنا ہے۔ خوابیدہ

جذبات کو جگاتا ہے۔ ہر فن پارے کی حیثیت خمیر کی سی ہوتی ہے۔ سیدھے سادے دلوں میں خمیر چھڑک کر ایمان پیدا کرنا، صحت مند عوام میں احساس کے جراثیم پیدا کرنا۔ ساکن دلوں کی تاروں کو چھیڑنا۔ داخلیت کے انجکشن لگانا۔ اور اس طرح قوم کا نفسیاتی توازن تباہ کرتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بیان بھی کر دیا جائے کہ ایڈمنسٹریٹیز پالیسی ریویژن کمیشن کی اس دلیل کو دیکھ کر محکمہ کارِ خاص کے کان کھڑے ہوئے۔ محکمہ کارِ خاص ایک فرض شناس اور اولعزم محکمہ ہوتا ہے چونکہ ملک کی سالمیت اور اندرونی تحفظ کی حفاظت اس کے فرائض میں داخل ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے مناسب کارروائی شروع کر دی۔

مزید تحقیقات کے بعد ان پر منکشف ہوا کہ فنکارانہ ذہنیت کے حامل لوگ صرف احساس کا خمیر ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ اس کے علاوہ مروجہ اور مستند خیالات سے ہٹ کر سوچتے ہیں اور لوگوں کو سوچنے پر اُکساتے ہیں۔ مروجہ اور مستند باتوں کا تمسخر اڑانا درحقیقت درپردہ باغیانہ روش پیدا کرنا اور اسے شہہ دینا ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس طبقے پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے اور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں محکمہ والوں کو اندراجات کا ایک نیا سلسلہ کھولنا پڑا جس کا نام انھوں نے بستہ ب رکھا۔

کارِ خاص کا کام صرف اندراجات ہی نہیں ہوتا۔ انھیں فیلڈ ورک بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی عادت ہے کہ ہر جگہ جمگھٹا لگا بیٹھتے ہیں۔ پان تھوکتے ہیں۔ سگرٹ جلاتے ہیں، شعر پڑھتے ہیں۔ لہٰذا محکمہ کو کثیر تعداد میں سفید پوش پیادے بھرتی کرنے پڑے تاکہ وہ ہر ایسی ادبی محفل پر کڑی نظر رکھیں اور نتیجتاً اندراجات کا سلسلہ احسن طریق پر قائم رکھا جا سکے۔

کارِ خاص کے اس اقدام پر ادیبوں نے سخت احتجاج کیا۔ انھیں یہ اعتراض نہ تھا کہ ان پر کڑی نگاہ کیوں رکھی جا رہی ہے۔ انھیں یہ شکایت تھی کہ ان کی تخلیقات کو جانچنے کے لیے اَن پڑھ پیادے کیوں مقرر کیے گئے جو ادب پاروں کے محاسن اور بلند خیالی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس احتجاج سے ادیبوں اور فنکاروں نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی کہ زندگی کے اہم مسائل کے متعلق ان کا نقطۂ نظر جذباتی ہے اور وہ خارجی نگاہ سے حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اُلٹا یہ اقدام تو کارِ خاص کی سوجھ بوجھ کا غماز تھا۔ اگر پیادوں کی جگہ پڑھے لکھے لوگ مقرر کر دیے جاتے تو وہ ادیبوں کی تخلیقات پر کڑی نگاہ رکھنے کے بجائے ان سے اثر قبول کرنا شروع کر دیتے۔ اس طرح مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

تجربے کے بعد ان پیادوں نے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کو جانچنے کے متعلق ایک اچھا خاصا قابلِ عمل طریقِ کار وضع کر لیا۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے خام سمجھیں۔ شاید یہ درست ہو کہ وہ مناسب طور پر مکمل اور جامع نہیں لیکن جہاں تک PRACTICAL WISDOM کا تعلق ہے وہ کافی موزوں اور قابلِ عمل ہے۔ طریقِ کار یہ ہے کہ پیادہ، ادیب کے مقالے، مختصر افسانے، غزل یا نظم کو غور سے سنتا ہے اور احتیاط سے الفاظ کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر ادب پارے میں بار بار مزدور یا ہڑتال یا سرخ یا سویرا کا نام آئے تو وہ ادیب کمیونسٹ ہے اور ادب پارہ ایک سرخ تحریر ہے۔ اگر عورت، جسم یا محبوب کی تکرار ہے تو مصنف جنس زدہ ہے اور تحریر فحش ہے۔ اگر اللہ، رسول، سنت یا اسلام کا تذکرہ ہو تو مصنف مذہبی دیوانہ ہے اور اس پر مزید کڑی نظر رکھنے کی ضرورت

ہے۔ اس طریق کار کے مطابق سفید پوش پیادے پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ مزدور ہڑتال حکومت عورت جسم اور اسلام کے الفاظ سے واقف ہو اور ایک سے سو تک گنتی جانتا ہو اور احساس، جذبہ، تاثر وغیرہ سے قطعی بے گانہ ہو۔

تعلیم اور احساس کا مسئلہ صرف ٹیڑھا ہی نہیں بلکہ پرانا بھی ہے۔ اس پرابلم کو سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی تاجروں نے محسوس کیا تھا۔ کمپنی کے دورِ حکومت سے پہلے مغل اور پٹھان غیر ملکی بادشاہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ تعلیم احساس اور جذبہ انسان کے اعلیٰ اوصاف ہیں۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ وہ غیر ملکی ہیں۔ اور اس ملک کو اپنا ملک سمجھنے لگے تھے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ تاجر نہیں تھے بلکہ بادشاہ تھے۔ بہرصورت ان کے دور میں تعلیم یافتہ اور احساس سے سرشار لوگوں کی قدر و منزلت تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ انھوں نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے فنکار قسم کے لوگوں کو نورتن بنا کر سر چڑھا رکھا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے آتے ہی یہ محسوس کیا کہ انھیں ملک کا نظام اور اپنا کاروبار چلانے کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو شدّتِ احساس سے خالی ہوں۔ تعلیم اور احساس کا ساتھ ایک قدرتی امر ہے۔ یہ ایک بہت بڑی مشکل تھی اگر کمپنی مشرقی ذہنیت کے حامل ہوتی تو غالباً وہ قدرت کے اصولوں میں دخل دینا پسند نہ کرتی۔ لیکن وہ تو مغربی نقطہ نظر کے حامل تھے لہٰذا ان کا ایمان تھا کہ انسانی ذہن کی عظمت اس بات پر موقوف ہے کہ قدرت کو اپنے ڈھنگ پر لایا جائے اور اپنے کام میں لایا جائے۔

اس پرابلم کو حل کرنے کے لیے کمپنی نے حسبِ دستور ایک بورڈ قائم کیا۔ بورڈ نے متعلقہ امور پر بڑی کاوش سے تحقیق کی۔ متواتر اجلاس کئے۔ اور بالآخر پورے غور و خوض کے بعد اعلان کر دیا کہ یہ پرابلم ناقابلِ حل ہے۔ تعلیم کا ایسا طریق وضع کیا جا سکتا ہے کہ فارغ التحصیل جوان پڑھے لکھے تو ہوں لیکن تعلیم یافتہ نہ ہوں اور احساس اور جذبات سے کورے ہوں تاکہ ملک کا نظم و نسق ان کے سپرد کیا جا سکے۔

انسانی ترقی کی راہ میں یہ ایک عظیم قدم تھا۔

بورڈ کی سفارشات کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کئے گئے اور بہت جلد یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا کہ بورڈ کے فیصلوں پر عمل کرنے سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

فارغ التحصیل جوانوں کی پہلی کھیپ میں انگریزی تہذیب سے لگاؤ تھا اور آثار غالب تھے کہ یہ لگاؤ جنون بنے گا۔ ان میں خارجی نقطہ نظر حاوی تھا۔ بات سمجھنے اور تو لنے کی قابلیت تھی۔ تقلید کی صلاحیت تھی۔ احکامات سمجھنے اور ان پر بے چون و چرا عملدرآمد کرنے کی صلاحیت تھی۔ ذہانت کی چمک تھی۔ یعنی تیار شدہ مال ہر لحاظ سے حوصلہ افزا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ذہانت کی تیسری سمت یعنی گہرائی جسے احساس اور جذبہ کہا جاتا ہے مفقود تھی۔

ایڈمنسٹریٹر کی اس تخلیق پر بورڈ کے جملہ ممبران کو سرکار کی طرف سے اعزاز دیے گئے۔ اور چیئرمین کو سَر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

اس نئی تخلیق پر ہم سب ناز کر سکتے ہیں۔ چونکہ مشکل کے وقت ملک کی خدمت ایڈمنسٹریٹر ذہنیت کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

ایچ۔ جی ویلز، آلڈو ہکسلے اور دیگر مشاہیر نے پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں سائنس اس حد تک ترقی کر جائے گی کہ ملکی ضروریات

بمطابق حسب ضرورت نفسیاتی لیبارٹری میں، مزدور، دستکار یا حاکم افراد کی تخلیق کی جا سکے گی۔

ان مشاہیر کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ برطانوی پانیرز، نو آبادیات میں ایسے تجربات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ دوررس نگاہ بسا اوقات قریب کی چیزوں کو نظر انداز کر جاتی ہے۔

(۴) تقسیم کے بعد کی ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن نے اپنی رپورٹ کی چوتھی شق میں، اس امر کے متعلق وضاحت کر دی تھی۔

یہ درست ہے کہ برطانوی سامراج کے ختم ہونے پر پاکستان ایک خود مختار ملک بن چکا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک مملکت ہے اور کوئی مملکت نظم اور تنظیم کے بغیر چل نہیں سکتی۔ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ حصول خود مختاری کے بعد یہ مملکت ایک نوزائیدہ مملکت بن گئی ہے اور اب اس کے بقا اور تحفظ کے لیے نظم اور تنظیم کی پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمیں زیادہ تعداد میں ایڈمنسٹریٹرز پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا طریقہ تعلیم بدلنا ملک کے مفاد کے منافی ہو گا۔ اُلٹا پرانے طریق تعلیم کو از سر نو استوار اور مضبوط کیا جائے۔

ان کی اس سفارش پر تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کو گشتی مراسلات جاری کئے گئے۔ اور ان پر واضح کر دیا گیا کہ تعلیم کو برطانوی دور میں قائم کئے ہوئے طریقے پر چلایا جائے۔ بلکہ مزید طریق کار ایجاد کئے جائیں جو مغربی رنگ کو اور بھی شوخ کریں۔

ممتحنوں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ ایسے سوالات پوچھے جائیں۔ جو رٹا یا روٹ سسٹم کو اور بھی تقویت دیں اور سمجھنے یا سوچنے کی بدعت کو روکیں۔ اگر امتحان میں یہ سوال پوچھا جائے کہ ٹامس ہارڈی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے تو ان امیدواروں کو سب سے زیادہ نمبر دیے جائیں جو کسی مشہور نقاد کی رائے حرف بحرف نقل کر دے۔ اگر کوئی امیدوار اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی جرأت کرے تو اسے کم سے کم نمبر دیے جائیں تاکہ سکہ بند خیالات سے انحراف کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔

گمان غالب ہے کہ جدید تعلیمی اصلاحات انہی گشتی مراسلات اور ہدایات کا نتیجہ ہیں۔ جدید تعلیمی اصلاحات کا مقصد تو یہی ہے تاکہ ہماری تعلیم مغربی تعلیم کے خطوط پر استوار ہو اور اس سے مزید ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

(۵) کمیشن کی رپورٹ کی پانچویں شق میں کمیشن نے تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی تھی جسے عرف عام میں انصاف کہا جاتا ہے جس کے چند متعلقہ اور موزوں حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ا۔ یہ امر تشویشناک ہے کہ عوام میں انصاف کے متعلق عجیب و غریب قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے واقف نہیں اور اپنے "وشفل تھنکنگ" کے مطابق اس لفظ کو جذبہ اور احساس کے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔ یہ رجحان نظم و نسق کے حق میں سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب۔ انصاف کا تخیل دراصل پرانے زمانے کے بادشاہوں کی غلط کاریوں اور کوتاہ بینیوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جہانگیر نے عدل و انصاف کی زنجیر لٹکا کر عوام میں یہ قبیح عادت ڈالی کہ جب بھی وہ چاہیں گھنٹی بجا کر شاہ کو اپنے حضور میں بلا لیں اسے اپنی کتھا سنانے پر مجبور کریں۔ اور عدل و انصاف کا مطالبہ کریں۔

ج۔ دورِ حاضر میں انصاف کے اس غلط تخیل کو فنکار اور مذہبی دیوانے ہوا دے رہے ہیں۔ جن پر کڑی نگاہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رپورٹ کی پانچویں شق ایک قابلِ قدر چیز ہے تو شاید اہلِ اسلام اہلِ فن اور عوام بدظن ہو جائیں گے۔ بہرصورت یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے اور ملک کی بہبود کی خاطر اس پر جوش میں آئے بغیر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

سب سے پہلے اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور فرمائیے۔

مُلّاؤں نے مشہور کر رکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ انصاف کو محبوب رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالےٰ انصاف کو محبوب رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کائنات عدل و انصاف کے اصولوں پر چلتی ہے۔ اللہ تعالےٰ رب العالمین ہیں۔ وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو رزق پہنچاتے ہیں۔ سب کے پالن ہار ہیں، چاہے وہ سؤر ہو بکرا ہو یا بچھو۔ سب کے حاجت روا ہیں چاہے کوئی زانی ہو یا عابد ہو یا سیہ کار۔ ایذا دہی کے مشتاق کو ایذا دہی کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ غم خور کو غم کی نعمت بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر قدرت کا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہوتا تو دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ اگر دنیا میں عدل و انصاف حاوی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو قیامت برپا کرنے، مُردوں میں دوبارہ جان ڈالنے اور روزِ حساب، اعمال کا جائزہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔

پھر ادیبوں نے مکافاتِ عمل کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو حاکموں سے بدظن کیا جائے اور انتشار پھیلایا جائے۔

ادیبوں کی اصلاحی کہانیاں خرافات سے بھری ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت ایسپ نے اپنی کہانی میں خرگوش اور کچھوے کا دوڑ میں مقابلہ کروا دیا ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انجام کار کچھوے کی جیت دکھائی ہے۔ ادیبوں کا اس قسم کی کہانیاں لکھنا حقائق سے گریز کرنے کے لیے پرچار ہے۔ ان سے پوچھا جائے کہ سچائی کا بول بالا اور بدی کا منہ کالا دکھانے سے آپ کا مقصد کیا ہے تو وہ بڑی معصومیت سے جواب دیں گے کہ ان کا مقصد نیکی کا پرچار ہے اور بچوں کو اچھے سبق سکھانا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا دورِ حاضر کا کوئی بچہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کے قصّے کو سچ مان سکتا ہے اور اس کہانی سے مسلسل محنت اور کوشش کا سبق سیکھ سکتا ہے؟

سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں جب ایک اتالیق جماعت کو خرگوش اور کچھوے کی کہانی پڑھا رہا تھا تو ایک کچھوا جماعت میں داخل ہوا۔ اور اتالیق سے مخاطب ہو کر چلّایا "شرم کرو شرم کرو۔ کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ کیوں ان معصوم بچّوں کے دلوں میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہو جن کی وجہ سے ان کی زندگی تلخیوں سے بھر جائے گی۔ کبھی مجھے بھی یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔ میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ کہ مسلسل دوڑنے سے میں خرگوش سے جیت سکتا ہوں۔ مگر آج تک مجھے کوئی ایسا خرگوش نہیں ملا جو مقابلے کی دوڑ میں لیٹ کر سو گیا ہو اور اس وقت تک بیدار نہ ہو جب تک میں منزل پر نہ پہنچ جاؤں۔ سچی بات یہ ہے بچو" خرگوش نے بچّوں سے مخاطب ہو کر کہا "خرگوش خرگوش ہے اور کچھوا کچھوا ہے"

بے شک حاکم حاکم ہے اور محکوم محکوم ہے۔ بے شک نظامِ حکومت چلانے کے لیے صرف حاکم ذہنیت کے لوگوں کو ایڈمنسٹریشن میں بھرتی کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خربوزہ چاہے کڑوا ہو یا میٹھا وہ خربوزہ ہے۔ حاکم چاہے اچھا ہو یا بُرا بہرصورت وہ حاکم ہے اور اس کے منصب کی عزت کرنا اور اس کے احکامات کو بجا لانا ضروری ہے۔

زندگی یا کسی نظام میں انصاف نہیں بلکہ قانون اہم ہے۔ انصاف ایک انفرادی چیز ہے نہ وہ قوم پر لاگو ہو سکتا ہے

نہ سماج پر۔ قانون چاہے انصاف پر مبنی ہو یا نہ ہو بہرصورت ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہئے۔ ورنہ ہم میں قومیت پیدا نہ ہو سکے گی۔ اور یہی ایڈمنسٹریشن کا مارٹر ہے۔ قانون کی اہمیت صرف ایک ایڈمنسٹریٹر ہی سمجھ سکتا ہے۔

ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے کے ہیڈ ماسٹر اپنی جماعت کو پڑھانے میں مصروف تھے تو ان کے افسرِ اعلیٰ ڈائرکٹر صاحب اتفاقی دورے پر تشریف لائے۔ جماعت میں داخل ہوئے تو ان کی آمد پر ہیڈ ماسٹر تعظیماً کھڑے نہ ہوئے۔

تخلیے میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے رویے کی معذرت چاہی کہنے لگے۔ اس سکول کے بچے مجھے ہر بات میں سند سمجھتے ہیں اور میرے ہر حکم کو آخری فیصلہ سمجھ کر مانتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ میرے اُوپر بھی کوئی افسر ہے تو ان کا مجھ پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا اور سکول کا نظم و نسق تباہ ہو جائے گا۔ لہذا آپ کی آمد پر میرا تعظیماً کھڑے ہونا مناسب نہ تھا۔

اگر گاؤں والے سچے دل سے یہ بات تسلیم کر لیں کہ وہی عدل و انصاف ہے جو علاقے کا تھانیدار عمل میں لاتا ہے تو ملک کا نظم و نسق نہایت اعلیٰ اور مستحکم ہو جائے۔

اربابِ بست وکشاد اس حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں کہ نظم و نسق چلانے کے لیے صرف قانون بنانا ہی کافی نہیں۔ بلکہ مناسب وقت پر بنے ہوئے قانون کی مناسب تاویل کرنا، اس میں سے مناسب معانی اخذ کرنا بے حد ضروری ہے۔ یقین جانیے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے خصوصی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر اچھے ایڈمنسٹریٹر میں یہ قابلیت ہونا ازبس ضروری ہے۔

ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی سفارشات میں مندرجہ بالا کے متعلق کوئی شق موجود نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کمیشن کو اس کا احساس نہیں تھا چونکہ رپورٹ ایک ٹاپ سیکرٹ چیز تھی۔ اور قانون اور عمل کی COORDINATION کا مسئلہ باقی سفا کی نسبت زیادہ خفیہ نوعیت کا تھا اس لیے گمان غالب ہے کہ اسے حذف کر دیا گیا۔

کبھی کبھار سہواً اچھے ایڈمنسٹریٹر اس خفیہ شق کا حوالہ دے دیتے ہیں اور اپنے نائب کو حکم دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس شخص کو سزا ملنے کی بجائے انعام کے طور پر ایک خصوصی سالانہ ترقی ملے۔ جاؤ اس مقصد کے لیے مناسب قانو تلاش کرو۔"

کبھی کبھار اتنی احتیاطوں کے باوجود کوئی فنکارانہ ذہنیت کا فرد اپنی چالاکی یا ممتحنوں کی غفلت کی وجہ سے سپیریر ایڈمنسٹریٹو سروسز میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے۔ ایسے سٹاف آرٹسٹ تعداد میں بہت کم ہیں۔

خیر ہر اصول کے ساتھ مستثنیات کی کلیاں تو ہوتی ہی ہیں۔

دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی خصوصی محکمہ میں جان بوجھ کر سٹاف آرٹسٹ بھرتی کرنے پڑ جائیں۔

یہ مشکل برطانوی راج میں تقسیمِ ہند سے کچھ سال پہلے پیدا ہوئی جب حکومت کی پبلسٹی کے لیے ریڈیو کا محکمہ ترتیب دینا ناگزیر ہو گیا۔ یہ ایک ایسا محکمہ تھا جس میں فنکاروں اور ادیبوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔

برطانوی حکومت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مشکلات سے ڈرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے کی قائل تھی۔ ل حسبِ دستور تجربہ کار اور جہاں دیدہ افسروں کو اکٹھا کیا گیا اور معاملے کی اہمیت اور نزاکت بیان کرنے کے بعد حل کرنے کے

یہ مسئلہ انھیں سونپ دیا گیا۔

برطانوی حاکم بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور غالباً اسی وجہ سے سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب جو سورج غروب ہونے لگا ہے تو یہ برطانوی مدبروں کے ذہنی انحطاط کی دلیل نہیں۔ ان کی عقل و فراست اسی طرح چاک و چوبند ہے۔ اس میں سورج کا بھی قصور نہیں۔ جہاں تک جیمز جینز کی تحقیق کا تعلق ہے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ سورج کو برطانیہ سے لاگت ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی مدبروں نے خود بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ حالات حاضرہ کے پیش نظر یہ بہتر ہے گا کہ سورج کو سلطنت انگلشیہ پر غروب ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

براڈ کاسٹنگ کے اجرا سے پہلے برطانوی افسروں نے اپنے مقاصد کے پیش نظر اس ملک کے عوام، تہذیب، تمدن، کئی لوگوں کی ذہنیت اور ادیبوں کی نفسیات کا پورے طور پر جائزہ لیا۔

اس مسئلہ کو حل کرنے میں سب سے بڑی مشکل ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادی سفارشات تھیں جن میں واضح طور پر متنبہ کیا گیا تھا کہ فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کو ایڈمنسٹریشن میں لینا حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ ایسے لوگوں کو عہدے نہ دیے جائیں بلکہ اس کے علاوہ کوشش کی جائے کہ:۔

ا۔ ایسے اصحاب مجلسی زندگی میں وقار حاصل نہ کر سکیں۔

ب۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ اقتصادی بحران کا شکار رہیں۔

ج۔ وہ اہل کار جنھیں بڑی کاوش سے برطانوی رنگ میں رنگا گیا ہے اور برطانوی مفاد کے پیش نظر کنڈیشن کیا گیا ہے ان کے دلوں میں ان لوگوں کے لیے نفرت پیدا کی جائے۔

د۔ ایسے حالات پیدا کرنا مناسب ہوگا کہ فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کی اپنے دلوں میں اپنی عزت نہ رہے۔

نوٹ:۔ مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لیے سائیکولاجیکل وارفیئر یونٹ کی سفارشات کی پندرھویں شق اور اس کی سی کے سے ڈی تک جزویات اور فٹ نوٹ (i)، (iii)، (iv) پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ان لوگوں کے دلوں میں کمتری کے جذبات پیدا ہوں گے اور ان کی ازلی اور طبعی غم خوری کی شدید خواہش کی وجہ سے یہ مقصد احسن طریق سے پورا ہوگا۔

نوٹ:۔ (i) کمپنی حکومت کے لیے مندرجہ ذیل حضرات باعث خطرہ ہیں۔

(ا) وہ لوگ جن میں انفرادی سوچ بچار کی صلاحیت ہو۔

(ب) جو ملکی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا جذبہ رکھتے ہوں۔

(ج) اور یا جو برطانوی رنگ کی تشہیر میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ذہنی یا عملی طور پر مصروف کار رہنے کے خواہاں ہوں۔

نوٹ:۔ (ii) کوتاہ بینی یا شاہانہ بے نیازی کی وجہ سے شاہان مغلیہ نے ادیبوں اور فنکاروں کو مراتب بخش کر اور انھیں دربار کے نورتن ستارے بنا کر جو سر چڑھا لیا ہے۔ ان نورتنوں کی چمک کو دھندلانا اشد ضروری ہے۔ برطانوی مدبروں اور اعلیٰ افسروں نے کمپنی کی بنیادی تجاویز کا بہ نظر غور مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ متعلقہ امور اور اشاروں پر از سر نو نگاہ ڈالی اور پھر سوالناموں۔ تحقیق اور وسیع قسم کی گفت و شنید کے کئی ایک مراحل طے کر کے فیصلہ کیا کہ:۔

(۱) محکمہ نشر و اشاعت بذریعہ ریڈیو، اس کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اسے چلانے کے لیے ادیبوں، فنکاروں، گویوں ور مصنفوں کی امداد کے بغیر چارہ کار نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ محکمہ کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ فنکاروں اور ادیبوں کی حیثیت نوی رہے اور ایڈمنسٹریٹروں کی حیثیت اوّلین رہے۔

(۲) گورنمنٹ سروس کی ایک ایسی خصوصی قسم بنائی جائے جس کی رُو سے ادیب اور فنکار اپنے آپ کو گورنمنٹ سروَنٹ تو سمجھیں لیکن درحقیقت وہ سروس میں شامل نہ ہوں۔ اور گورنمنٹ سروس کی مراعات کے حقدار نہ ہوں۔

(۳) محکمہ کا طریق یوں وضع کیا جائے کہ فنکار یہ محسوس نہ کرنے پائے کہ محکمہ کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کے برعکس وہ یہ محسوس کرے کہ محکمہ اس کی اعانت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

حصول خود مختاری کے بعد ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی سب کمیٹی (ج) کو یہ موضوع سونپا گیا۔ سوال یہ تھے کہ:۔

(i) سیاسی حالات کی تبدیلی کے بعد کیا ریڈیو پاکستان کے طریقِ کار یا تشکیل میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر ہے تو کیوں اور س حد تک اور اس کی نوعیت کیا ہو؟

(ii) کیا فنکارانہ ذہنیت کے لوگوں کی خدمات کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے؟

(iii) کیا سٹاف آرٹسٹ محکمے کی نوکری سے غیر مطمئن تو نہیں۔ اور اگر ہیں تو کیا ان کی بے اطمینانی سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا احتمال تو نہیں؟

ریڈیو کے محکمے کی تنظیم بڑی سادہ ہے۔

وہاں کا عملہ دو قسم کا ہے (۱) انتظامیہ (۲) سٹاف آرٹسٹ، سٹاف آرٹسٹ دو قسم کے ہیں (ا) وہ جو روزانہ اُجرت پر کام کرتے ہیں اور (ب) وہ جو ماہانہ تنخواہ پر ملازم ہیں۔

انتظامیہ کا کام یہ ہے کہ آرٹسٹوں سے کام کرائے اور انھیں معاوضہ دے۔

اس محکمہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آرٹسٹوں میں پچاس روپے بانٹنے کے لیے انتظامیہ کو دو سو پچاس روپے دیے جاتے ہیں۔ یعنی دھیلے کی گڑیا ٹکہ سر مُنڈائی۔

ماڈرن ہیرڈریسرز سے تفصیلی تحقیق کے بعد اس امر کا انکشاف ہوا کہ دورِ حاضر میں جس قدر کم تر گڑیا ہو گی اتنی ہی اس کی سر منڈائی گراں تر ہو گی۔ اگر وہ دھیلے کی ہو تو ٹکہ، اگر دمڑی کی ہو تو آنہ۔ اس لیے یہ مثل تو محض مضحکہ خیز ہے چونکہ تہذیبِ نو کا یہ اہم اصول ہے۔ رہا سوال پچاس اور دو سو پچاس روپے کا، تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس محکمہ میں انتظامیہ کو جان بُوجھ کر مضبوط کیا گیا ہے چونکہ اہلکار متوازن ذہنیت کے حامل نہیں اور اپنی رقیق القلبی اور شدتِ احساس کی وجہ سے غیر ذمہ دارانہ حرکات کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ایک ہزار روپیہ تنخواہ پانے والے آرٹسٹ کو بھی ایک سو اسی روپے تنخواہ پانے والے رکن انتظامیہ کے احکامات پر چلنا پڑتا ہے۔

یہ اعتراض بے حد بودا ہے۔ صلاحیت ایک چیز ہے تنخواہ دوسری چیز ہے۔ دنیا میں کئی ایسے افراد ہیں جن کی کوئی آمدنی

ہیں لیکن ان میں لیڈر شپ کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے پھر ایسے کروڑپتی بھی ہیں جو فقط جی حضور ہی جی حضور ہیں۔

سپیرئیر سروسز کا ایک نیا بھرتی شدہ افسر ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہے لیکن کلاس ٹو کے ایک تجربہ کار افسر جس کی تنخواہ سو روپیہ ہے اس کے کام کی پڑتال کرنے کا فرض ادا کرتا ہے۔ اس کی رپورٹ لکھتا ہے۔ اسے سزا دلا سکتا ہے۔ اس کی ترقی روک سکتا ہے۔

پاکستان ٹائمز اور سول ملٹری گزٹ کے کالموں میں ننھے نے کئی ایک بار اس کے خلاف احتجاج کیا ہے کہ ۹۰۰ روپے تنخواہ پانے الا کلاس ٹو افسر اگر ۳۵۰ روپے تنخواہ پانے والے اعلیٰ افسر کی دعوت کرے تو وہ اسے نامنظور کرنے پر مجبور ہوگا چونکہ اعلیٰ افسر کو پنے جیسے اعلیٰ افسروں سے میل جول رکھنا چاہیے۔

یہ حقیقت سب سے پہلے آریہ لوگوں نے اپنائی تھی۔ وہ دراوڑوں سے میل جول نہیں رکھتے تھے چونکہ وہ اعلیٰ نسل سے تھے ورزیادہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی ناکیں اونچی تھیں۔ جبھی عورتوں نے ناک میں زیور پہننے کی رسم ڈالی۔ مطلب تھا میری ناک ملاحظہ ہو۔ اونچی ہے۔ میں اعلیٰ نسل کی ہوں اور قابلِ التفات ہوں۔

ننھے نے چند اور تفاصیل بھی پیش کی تھیں مثلاً کلاس اوّل افسروں کے بیٹے کلاس دوئم کے بیٹوں سے نہیں کھیلتے۔ کلاس اوّل ی بیگمات کلاس دوم کی بیگمات سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ انھیں کورنش بجا لائیں، ادب سے بات کریں اور زیادہ راہ رسم اور بے تکلفی ڑھانے کی کوشش نہ کریں۔

ننھے کے یہ احتجاج اگر سنجیدہ قسم کے ہوتے تو لازماً انتظامیہ کی طرف سے کوئی اعلان جاری کیا جاتا۔ لیکن وہ تو محض تفننِ بع قسم کی چیز تھی۔ افسرانِ اعلیٰ نے انھیں دیکھا اور اخلاقاً ہنس دیے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ محظوظ ہوئے اور ننھے کے خالق کی ملاحیت کو آپس میں سراہا مگر اپنے اصول سے پیچھے نہ اُترے۔

ایڈمنسٹریٹرز پالیسی ریویژن کمیشن کی سب کمیٹی ج نے اپنی رپورٹ کی ابتدا میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ:۔

حصولِ آزادی کے بعد حالات قطعی طور پر بدل چکے ہیں۔ ہمیں اس آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔ ملک میں احساسِ قومیت پیدا کرنا ہے۔ اور ملک اور قوم کی محبت کو عوام کے دلوں میں جاگزیں کرنا ہے۔ اس اہم کام میں ہمارے ادیب فنکار مصنّف گُنی ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں اور قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ہمارے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم پرزور سفارش کرتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ ادیبانہ اور فنکارانہ صلاحیتیں اور بھی بیدار ہوں۔ فنکاروں میں شدّتِ احساس بڑھے تخلیق کا جذبہ اور بھی ابھرے اور فنکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس مقصد کے لیے مناسب تحقیق کے بعد ہم سب متفق طور پر مندرجہ ذیل سفارشات پیش کرتے ہیں:۔

(۱) اس ضمن میں سب سے اہم چیز SEUSE OF SECURITY ہے۔ اگر فنکاروں کو SECURITY کا احساس دے دیا جائے تو وہ لازماً ان میں جمود کی کیفیت پیدا کرے گا۔ ایک آرٹسٹ کے لیے جمود موت کے مترادف ہے۔

لہٰذا سٹاف آرٹسٹ کو PERMANENT گورنمنٹ سروس دینا۔ ایک فاش غلطی ہوگی۔ اس سے اس کی قوتِ تخلیق پر اثر پڑے گا اور وہ اپنی صلاحیت کو آہستہ آہستہ مگر یقیناً کھو بیٹھے گا۔

آرٹسٹ کا اپنا اور ملک کا مفاد اسی بات میں ہے کہ وہ محکمے کی نوکری کرے چاہے اسے یومیہ اُجرت دی جائے یا ماہانہ البتہ سے ایک ماہ کی SECURITY دینا ضروری ہے۔ لہذا اُسے حسب دستور سابق ایک ماہ کا نوٹس دینا ضروری ہوگا۔

(۲) فنکارانہ صلاحیت ایک خصوصی چیز ہے اور وہ خصوصی حالات میں نکھرتی ہے۔ سپاہی کو پیٹ بھر کر کھلا دو تو وہ بہتر طور پر لڑ سکتا ہے۔ لیکن فنکار کا پیٹ بھر دیا جائے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے لہذا فن اور ادب کی بہبود اسی میں ہے کہ فنکار اور ادیب کو "تنگ کشی" سے نوازا جائے تاکہ ان کا احساس کند نہ ہو۔ اور غم خوری کے مواقع بڑھائے جائیں تاکہ ان کی تخلیقات کی دھار اور بھی تیز ہو۔ لہذا انھیں باقاعدہ انکریمنٹ نہ دیے جائیں۔

(۳) عام حالات میں گورنمنٹ کے ملازم کو بڑھاپے میں پنشن دینا ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کسی فنکار کو پنشن دی جائے تو اس کی عمر کا وہ حصہ تخلیق سے خالی رہ جائے گا۔ جس میں وہ عمر بھر کے تجربے اور مشق کے بل بوتے پر بہترین تخلیقات سے قوم اور ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔ لہذا سٹاف آرٹسٹوں کو پنشن نہ دی جائے۔

(۴) اس کے علاوہ انھیں چھٹی پر جانے کی عادت نہ ڈالی جائے لہذا چھٹی کے سلسلے میں انھیں وہ مراعات نہ دی جائیں جو دوسرے ملازمین کو دی جاتی ہیں۔

(۵) اگر انھیں عام میڈیکل سہولتیں دی گئیں تو یہ خطرہ لاحق ہو جائے گا کہ وہ بار بار بیمار پڑیں گے جو قومی نقصان کا باعث ہوگا۔

(۶) انھیں یہ ذہن نشین کرا دیا جائے کہ جب ان کے افکار اپنی تازگی کھو دیں گے تو ان کی خدمات کی ضرورت نہیں رہے گی انھیں چاہیئے کہ وہ اپنے خیالات تحریر اور فن میں تازگی پیدا کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہیں۔

واضح ہو کہ محکمے کا مقصد فن کی اعانت کرنا ہے فنکار کی نہیں اگر فنکار کی دلجوئی شروع کر دی جائے تو وہ افراد کی اعانت کے مترادف ہو گی۔ اور افراد کی اعانت قوم کے مفاد کے منافی ہے۔

سٹاف آرٹسٹ جذباتی ہونے کی وجہ سے اس نقطے کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اور نتیجہ کے طور پر ان میں FRUSTRATION پیدا ہو رہی ہے لیکن نفسیات کی رُو سے یہ ایک نیک فال اور اچھی علامت ہے۔ کیونکہ فنکار میں جتنا اضطراب پیدا ہوگا اتنا ہی ان کی تخلیقات میں خون دل کا رنگ جھلکے گا۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

ل۔ احمد

[۲۶ء میں میرا ایک پارہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" بصورت مکتوب نگار میں شائع ہوا تھا۔ یہ پارہ میں نے اس مکتوب کے جواب کی صورت میں لکھنا چاہا مگر نامکمل رہ گیا تھا۔ اور دوسرے نامکمل پاروں کے ساتھ یہ پارہ بھی حال میں مکمل کیا ہے۔] (ل۔ احمد)

اچھی نوشابہ!

تمہارا خط ملا، اسے خط کہوں یا بلبل کی صدا جسے کوئی نغمہ کہتا ہے کوئی نالہ و فریاد!

میرے خط میں ایسی تو کوئی بات بھی نہیں جسے تم میرے دل کی کراہ کہہ سکو۔ ہاں، دو ایک باتیں نوکِ قلم سے ایسی ضرور ٹپک پڑی تھیں جو کائناتی حقیقت ہیں اور عورت کی زندگی پر منطبق ہو جائیں گی۔ کون دعوے کر سکتا ہے کہ مسرت و خوشدلی بالذات کوئی شے ہے؟ کون انکار کرے گا کہ اس دنیا میں غم ہی غم نہیں ہے؟ مسرت و غم کو میں تو اعتباری چیزیں کہتی ہوں۔ ایک محبت کر کے ہدفِ بلا ہے تو دوسرا اسے کھو کر! کوئی دولت پا کر مبتلائے تفکرات ہے تو کوئی اسے گنوا کر! فرق و اختلاف اس بات میں ہوتا ہے کہ آیا شئے مطلوبہ حاصل کہنے کی سعی و کاوش میں زیادہ لذت تھی یا کامرانی کی طلسم شکنی کے بعد مایوسی میں؟

نوشابہ۔ فلسفہ ایک ہی ہے اور وہ غم کا فلسفہ ہے۔ وہ بھی جو مسرت کی تلاش کرتا یا اسے حاصل کر لیتا ہے، اصل میں خوگرِ الم ہے، اور اس کی یہ عادت ہی لذت و مسرت کا مفہوم رکھتی ہے! مگر غم سے میری مراد روزمرہ زندگی کے دُکھ درد یا مادی محرومیاں ہرگز نہیں ہیں، بلکہ میرے نزدیک غم کا مفہوم احساس کا مجروح ہونا ہے! قدرت کی ستم ظریفی کا شاہکار یہ ہے کہ انسان مجلسی حیوان ہے مگر دوسرے انسان کو سمجھنے سے معذور ہے! ایک آدمی دوسرے کے محسوسات کو ایک معمولی لفظ سے مجروح کر دیتا ہے، اور تم جانتی ہو کہ دل کے آبگینے میں بال آیا تو پھر مٹانے سے نہیں مٹتا!

خیر، اسے ایک جملۂ معترضہ سمجھو! میں کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ میری تحریر تمہاری اذیتِ احساس کا سبب بن گئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ لیکن میں اس لیے خوش بھی ہوں کہ اس سبب سے تم بولیں تو سہی! غرض جس طرح میرے خط نے تمہیں بے تابِ گفتگو کر دیا ویسے ہی تمہاری داستانِ دل نے میری جراحتِ قلب کو گریاں کر دیا ہے، اور اب میں اپنی داستانِ غم سنانے کو بے تاب ہوں!

میرے حالات کا علم ہونے کے مفہوم میں تمہیں میرے انیسویں برس تک کا حال معلوم ہے جبکہ میں ایم اے کرنے بمبئی گئی ہوئی تھی اور تعلیم شروع ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے کہ یکایک حیدرآباد بلالی گئی تاکہ میرا ہات ایک ایسے شخص کو پکڑا دیا جائے جو میرے والد سے بھی دو چار سال بڑی عمر کا ہے۔

اب چونکہ میرے آنسوؤں کی تحریک کا موجب تمہاری تحریر ہے، اس لیے سنتے سنتے اُکتا نہ جانا۔ بہت مختصر کروں گی تب بھی ان کڑیوں کا سلسلہ تو ملانا ہی پڑے گا جن کے بغیر افسانے کا سر پیر ہی نہ مل سکے! چنانچہ نہ پوچھو کہ شادی کی رسمیں کیونکر ادا ہوئیں اور اس وقت میرا حال کیا تھا۔ میں اس بات پر صبر کر سکتی تھی کہ میری مرضی بھی معلوم نہیں کی گئی، اگر اس کے ساتھ اتنا لحاظ رکھا گیا ہوتا کہ میں نو عمر تھی اور مجھے جدید قسم کی تعلیم دی گئی تھی۔ اس لیے کہ میرا پختہ خیال یہ ہے کہ اگر جذبات کسی ذات خاص پر منحصر نہ ہو چکے ہوں تو کسی ایسی ہستی کے ساتھ وابستہ کئے جا سکتے ہیں جس کے اندر کوئی بات خلاف طبیعت نہ ہو، اور اگر فریقین میں کوئی ایک بات بھی مشترک ہو تو اس وابستگی میں شاید ارادے اور کوشش کی مدد بھی درکار نہ ہوگی! میں یہ بھی بلا شرط مان سکتی ہوں کہ اگر جانبین کی عمروں میں مناسبت ہو تو متضاد طبع و مزاج کے باوجود وہ ایک دفعہ تو مانوس ہو ہی سکتے ہیں، اور ایسا ہو سکے تو بالآخر ساتھ رہنے کی عادت ایک زبردست تعلق خاطر کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اور اگر فریقین میں ایک دوسرے کی حالتوں کو سمجھ سکنے کی اہلیت بھی ہو اور مزاجوں میں ذرا سی رعایت روا رکھنا بھی ہو سکے تو موانست کی اس عادت کو محبت کی صورت بھی مل جا سکتی ہے!

غرض، نوشابہ، اس وقت تو میرا یہ خیال نہیں تھا مگر آج میرا یہ عقیدہ ہے کہ "محبت" کا لفظ اسم بے مسمیٰ ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس لفظ میں یہ "عملی" مفہوم کیونکر پیدا ہو گیا! اس لیے کہ ہم جس شے سے واقف نہ ہوں، جو چیز ہمارے تصور میں نہ آ سکے، اس کے لیے ہم نام کس طرح وضع کر سکتے ہیں؟ اور جو شے ہمارے ذہن و تصور میں آ سکتی ہے اس کا وجود میں آ جانا بھی لازمی ہے! اور زندگی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ "عملی" محبت کامران ہو جانے کے بعد تھکا فضیحتی بھی بن گئی ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ کی بات دوسری ہے۔ خیر، چھوڑو اس بحث کو۔ میں کہنا کچھ اور چاہتی تھی مگر اُلجھ گئی ایک بحث میں۔

ہاں، تو میری شادی ایک جاگیردار صاحب کے ساتھ کر دی گئی جو ہر اعتبار سے میرے لیے ناجنس تھے۔ صورت دیکھو تو ماشاء اللہ اور سیرت پرکھو تو سبحان اللہ! تعلیم کے نام سے کریما مقیماں کے ڈاکٹر اور تمیز تہذیب کا حال یہ کہ منہ ہر وقت اُگالدان بنا رہے! ڈکاریں لے لے کر کھانا ہضم کریں اور خراٹے ایسے کہ آس پاس کوئی سو نہ سکے! میں ان کی کس کس خوبی کو بیان کروں؟

عہد عروسی کا بس ایک واقعہ سُن لو اور اس پر سے قیاس کر کے ایک کتاب لکھ ڈالو:-

میں کسی ضرورت سے ڈیوڑھی کی طرف جا رہی تھی اور نواب صاحب دیوان خانے سے اُٹھ کر آ رہے تھے۔ تم اسے میرے جذبات کی بے غیرتی کہہ لو کہ اس ناجنسیت سے اپنی بیزاری کے باوجود نجانے اس وقت جی میں کیا آ گئی کہ جب ہم دونوں برابر آئے تو چلتے چلتے میں نے کہنی کا ایک ٹہوکا دے دیا۔ اس پر ارشاد ہوتا ہے:-

"اوہو! آپ ہم سے چھیڑ خانی بھی کرنے لگیں!"

سچ کہو نوشابہ۔ کہ شوہر کے منہ سے یہ سُن کر کسی جوان عمر بیوی کے دل میں کیا زندگانی کا حوصلہ باقی رہ سکتا ہے؟ تم شاید میرے اس وقت کے محسوسات کا اندازہ کر سکو گی۔ اس دن کے بعد سے میں نے اپنے شباب کی ساری آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا، اور ہر وقت

اس کوشش میں رہی کہ زندگانیٔ دل کے مفہوم کو یکسر بھلا دوں، اپنی کتابِ زندگی سے اس باب ہی کو محو کردوں، لیکن نوشابہ ایسا کرنے میں مَیں ایک منٹ کے لیے بھی تو کامیاب نہ ہوسکی! میری خلاقِ آرزو دل نے اُلٹا میری ایسی کوششوں کا مذاق اُڑایا!

میں نوشابہ اس خیال کی ہوں کہ جب عورت اور اس کا دل ہم ساز و ہم نوا ہو جاتے ہیں تو اس کا صبر و سکون خطرناک ہوتا ہے اس کے برخلاف مرد کے باب میں یہی بات دانشمندی کا ثبوت مانی جاتی ہے۔ الغرض، میرے قلبِ آرزومند کی مایوسی اور حرماں نصیبی معمولی سماجی مشغلوں میں صرف ہونے لگی۔ اس وقت اگر میں کسی قطعی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تو اس کے معنی تھے کہ مجھے اپنی ہستی کے اندر ایک خوفناک خلاء کا احساس ہوتا، اور اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے میرے پاس وہی آرزوئیں تھیں جن کے لیے میرا وجود طلب و تمنّا کا مترادف بنا ہوا تھا!

لیکن نوشابہ جانتی ہو کہ آدمی اپنے آپ کو کس کس صورت میں فریب دیتا ہے؟ یہ میری سماجی مصروفیتیں فی المعنی تلاشِ مقصود کے لیے تھیں! جسے میں اپنی سادہ لوحی سے دھیان بٹانے کی کوشش سمجھ رہی تھی وہ اصلاً خود فریبی تھی۔ ہرچند اس وقت میں اپنے تحت الشعور کے اس مشغلے کو بالکل نہ سمجھی تھی۔

تو ایک روز میں اپنے باغ میں جا پہنچی جو ہے تو مکان ہی کا حصہ، اسی لیے پائیں باغ کہا جاتا تھا۔ لیکن اتنا بڑا تھا کہ اسے رمنہ کہنا درست ہوگا۔ غرض میں اس چھوٹی سی جھیل کی طرف بڑھی جو ہماری اس عروسِ چمن کی آرسی تھی، تو جھیل کے کنارے کسی کو پڑے دیکھا پہلا خیال مالی والی کی طرف گیا مگر فوراً لباس کے خیال نے اصلاح کردی، پھر نواب صاحب کا گمان ہوا مگر پاس ہی ایک کتاب پڑی دیکھی۔ نواب صاحب کو بھلا کتاب سے کیا واسطہ! اور جب یہ خیال ہوا کہ وہ نہ مالی ہے نہ حضورِ معلیٰ" میں تو معاً میرے اندر ایک جھجک پیدا ہوگئی کہ وہ کوئی غیر آدمی ہے۔ مگر نوشابہ فطری جھجک کبھی جستجو کی حریف ہوسکتی ہے؟ اب وہ سونے والا میرے خیال میں ایک طلسمی مخلوق بن گیا اور مجھے اس کتاب کا نام معلوم کرنے کے لیے بے تابی محسوس ہوئی۔ لیکن یہ بھی فریب تھا۔ بے تابی مجھے کتاب کے لیے نہیں، کتاب والے کے لیے ہو رہی تھی! تم اندازہ نہیں کرسکتیں نوشابہ! ہم سب کتنے بڑے خود فریب ہیں! خود کو فریب دینے میں کتنا مزا ملتا ہے!

مختصر یہ کہ بہت آہستہ آہستہ بڑھ کر میں نے وہ کتاب اُٹھا لی۔ یہ دیوانِ غالب تھا۔ اب میں بتا نہیں سکتی نوشابہ کہ اس کتاب کا دیوانِ غالب ہونا میرے لیے کتنی بڑی خوشدلی کا موجب تھا! تم بے چین ہو گی کہ میں کتاب والے کے ذکر کو بھلائے دے رہی ہوں، نہیں، ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب کے ایک دیوان ہونے نے مجھے کتاب والے کی طبع و مزاج کی طرف سے مطمئن کر دیا تھا!

بہرصورت، وہ کتاب والا کوئی شہزادۂ گلفام تو نہیں تھا لیکن اس خصوصیت کا مالک تھا جو عموماً ہر مرد کو کسی نہ کسی کا گلفام بنا دیتی ہے۔ اس کا عہدِ شہزادگی!

اس کے بعد کی داستان وہی ہے جو تخلیقِ آدم کے بعد سے برابر دہرائی جا رہی ہے۔ البتہ نواب صاحب قبلہ سے رہائی پانا ہفت خواں طے کرنا ثابت ہوا اور اس کا بیان قصّہ ہوشربا ہے۔ انھوں نے جب مجھ سے سوا لاکھ روپے مہر کی فارغ خطی لکھوالی تب طلاق دی!

اب تم پوچھو گی کہ میری فردوسِ آرزو کیسی ہے، میں اپنی حیاتِ معاشقہ کیسے گزارتی ہوں تو سنو، انسان کسی حال میں مطمئن نہیں رہ سکتا مگر رہتا ہے! ایک ہی بات کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اور شاید یہی وہ مسالا ہے جو زندگی کو کیف آور بنائے ہوئے ہے!

اچھا تو سرِدست، خدا حافظ

تمہاری نازلہ

سوکھے پتے

حجاب امتیاز علی

تعارف

ان کی کائنات میں زندگی کی شام ڈھل چکی ہے۔ جادۂ حیات کے دو تھکے ماندے مسافر ایک دوسرے کا بازو تھامے زندگی کے ڈھلوانوں سے نیچے اتر رہے ہیں۔ ان کے نحیف پیکروں کو دیکھ کر، دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خزاں کے دو سوکھے پتے کسی دشتِ نامعلوم کی طرف اڑتے جا رہے ہیں۔

بہاریں گزر چکیں اور یہ خزائیں ہیں مگر انھیں اس بات کا یقین نہیں کہ بہاروں کو گئے اتنی مدت گزر چکی ہے جس میں ویرانیاں آبادیاں اور آبادیاں ویرانیاں بن جاتی ہیں۔ ان کی کائنات کی ہر چیز پرانی اور بوسیدہ ہو چکی ہے۔ رشتے آشنا ہمراہی زمین و آسماں غرض کائنات مر چکی ہے۔ اس کائنات کی ایک چیز اب بھی زندہ ہے یعنی زندگی کے قبرستان پر محبت کا سورج اب تک دمک رہا ہے۔ نہایت تاباں، نہایت درخشاں!

[ٹرین کے گزرنے کی آواز آ رہی ہے]

بوڑھی زیتون:۔ اسٹیشن ابھی کتنی دور ہے؟

بوڑھا احمد:۔ بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ ریل کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے۔

زیتون:۔ فرخ ہمارے لیے بےچین ہوگا۔

احمد:۔ اور جانے کب سے اسٹیشن پر ہماری راہ تک رہا ہوگا۔

زیتون:۔ میرا بچہ ——!

احمد :- اس کا بچپن اب تک میری آنکھوں میں ہے حالانکہ اب وہ پچیس سال کا ہو چکا ہے۔

زیتون :- (ذرا ہنستی ہے) یاد ہے تمہیں اس کا وہ گھروندوں والا کھیل؟ تمام تمام دن باغ میں بیٹھا مٹی کے گھروندے بنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا "امی! جب میں بڑا ہوں گا تو ایک اتنا بڑا گھر بناؤں گا کہ تم اور ابا بڑے آرام سے اس میں رہ سکو گے۔"

احمد :- (خوشی سے ہنستا ہے) اور آج ہم سچ مچ اس کے بنائے ہوئے گھر جا رہے ہیں۔

زیتون :- (بے حد خوش) کتنا خوش ہوگا آج میرا بیٹا ہمیں دیکھ کر!

(ٹرین آہستہ آہستہ رکتی ہے)

احمد :- لو آ گیا اسٹیشن!

زیتون :- (بے چینی سے) ارے کھڑکی کھول کر باہر تو دیکھو، فرخ کھڑا ہوگا۔

احمد :- (کھڑکی کھول کر دیکھتا ہے) بڑی بھیڑ ہے۔ فرخ کہیں نظر نہیں آ رہا۔

زیتون :- (خوشی سے لرزاں آواز میں) ریل کے ایک ایک ڈبے میں ہم بڈھوں کو تلاش کر رہا ہوگا غریب! تم خود اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو احمد، پر جلد آنا ـــــ"

احمد :- ابھی آیا ــــ سامان کے تھیلوں سے پرے تم اُدھر چل کر بیٹھو۔

(بوڑھی زیتون ریل سے اتر کر ایک طرف کو بیٹھ جاتی ہے اور احمد بیٹے
کی تلاش میں بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے)

احمد :- (واپس آ کر) فرخ کہیں بھی نہیں ملا۔

زیتون :- (پریشان ہو جاتی ہے) خدا کرے خیریت سے ہو میرا بچہ۔ احمد! تم نے اسے اچھی طرح سمجھا کر لکھ دیا تھا نا کہ ہم شام کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں؟

احمد :- ہاں ہاں! بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ آج کل تمہاری طبیعت اچھی نہیں رہتی اس لیے ہمیں لینے کے لیے وہ اپنی کار لے آئے ورنہ چھ میل کی مسافت کرائے کی گاڑی میں ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہوگی۔

زیتون :- اے ہے میری طبیعت کا خواہ مخواہ لکھ دیا تم نے احمد! جانتے بھی ہو کس دل کا بچہ ہے، ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتا ہے۔

احمد :- میں نے اسے تمہاری بیماری کی نوعیت سے تھوڑا ہی آگاہ کیا ہے۔ بس صرف اتنا لکھا تھا کہ ان دنوں تم کچھ اچھی نہیں رہتیں۔

زیتون :- خدا خیریت رکھے۔ میرا دل مٹھی میں ہے۔ اب تک نہیں آیا۔ اس کی دلہن کے ہاں بال بچہ بھی ہونے والا تھا۔

احمد :- اسے تم وہم نہ کرو زیتون! انتظامات میں دیر لگ گئی ہوگی۔ ہم اس کے پاس جا بھی تو پہلی دفعہ رہے ہیں۔

زیتون :- (پھر خوش ہو جاتی ہے) ہاں پہلی دفعہ جا رہے ہیں ــــ بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ!

احمد :- لیکن ہمارے لیے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں کرنا چاہیے۔

زیتون :۔ کھانے پر تکلف کرنے کا اسے بڑا شوق ہے ہمارے لیے سویّوں کا زردہ ضرور پکوایا ہوگا۔ وہ جانتا ہے بالائی کے ساتھ تم کس شوق سے کھاتے ہو۔

احمد :۔ (مسکراتا ہے) اس کی بیوی بھی بڑی نیک طبیعت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ شادی کے بعد صرف ہفتہ بھر ہی تو ہمارے ہاں رہی لیکن اس کی طبیعت کا اندازہ مجھے ہو گیا تھا۔

(لمحہ بھر کو خاموشی جس میں دونوں بیٹے کے لیے چشم براہ ہیں)

زیتون :۔ (وقفہ کے بعد) طرح طرح کے وہم مجھے ستا رہے ہیں احمد! اب تک آیا کیوں نہیں فرخ؟

احمد :۔ (تسلی دیتا ہے) آرام سے بیٹھ جاؤ۔ آ ہی رہا ہوگا۔ طبیعت تو اچھی ہے نا تمہاری؟

زیتون :۔ آج درد میں کمی ہے۔ نہ جانے یہ کیا مرض لگ گیا ہے مجھے۔ شانے میں بعض وقت برچھی سی انی محسوس ہوتی ہے ساتھ ہی بے حد تکان سی ہو جاتی ہے ...... لیکن آج بیٹے سے ملنے کی خوشی میں مجھے اپنا درد بھی یاد نہیں رہا۔

احمد :۔ (مغموم، ہلکی آہ) ہوا بڑی تیز چل رہی ہے، لاؤ میں تمہیں چادر اوڑھا دوں۔ ٹھنڈ نہ لگ جائے۔

زیتون :۔ اب تو اس چادر میں گرمائی بھی نہیں رہی۔

احمد :۔ (چادر اوڑھاتے ہوئے) جبھی تو کہتا تھا کہ نئی چادر لے لو۔ تم نہ مانیں۔

زیتون :۔ اپنے لیے نئی چادر لے لیتی تو فرخ کے منّے کی سالگرہ پر اسے نیا جوڑا کیسے دیتی؟

احمد :۔ تمہارے سینے میں ماں کا دل ہے۔ ماؤں کو نہ سردی محسوس ہوتی ہے نہ گرمی۔

زیتون :۔ (ہنستی ہے) زندگی رہی تو اپنے لیے آتے سال نئی چادر لے لوں گی۔

احمد :۔ (یکایک بے چین ہو جاتا ہے) آتے سال؟ —— (مغموم ہو جاتا ہے) ہوں —— بڑی دور کی بات ہے زیتون!

(لمحہ بھر کے لیے دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ وقت کی رفتار کو دیکھنے لگتے ہیں)

زیتون :۔ شام پڑ گئی —— کتنی دور ہوگا فرخ کا گھر یہاں سے؟

احمد :۔ (متفکر) بڑی دور ہے۔

زیتون :۔ شانے اور پسلی کے درد کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم خود ہی چلے چلتے —— جانے یہ کیسا مرض ہے میرا۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں اور سینے میں درد کی برچھی چبھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے میرے متعلق؟"

احمد :۔ (دھیمے اداس لہجے میں) کہ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔

زیتون :۔ لیکن مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ ناامید سا ہو گیا ہے۔

احمد :۔ (مغموم) ارے وہم نہیں کیا کرتے۔

(لمحہ بھر کو وقفہ)

زیتون :۔ (اچانک) احمد! اس اسٹیشن کا نام کیا ہے؟

احمد :۔ ارے پہچان نہیں سکیں زیتون؟ —— بھئی پاکول کا اسٹیشن ہے پاکول کا۔

زیتون :- (یکلخت چونک پڑتی ہے) ہائیں —؟ کیا کہا؟ پاکول کا اشٹیشن؟ — (چپ ہو جاتی ہے)

احمد :- کس سوچ میں پڑ گئیں؟

زیتون :- (متاثر) پاکول! میرے ارمانوں کی وادی! — میں سوچ رہی تھی احمد! پاکول کے نام کے ساتھ ساتھ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں ہائے ہائے!

احمد :- (لمبی سانس) ہوں!

زیتون :- یہاں آکر گزری بہاروں کی یاد نہیں ستا رہی تمھیں؟

احمد :- (متاثر) یہ مجھ سے پوچھتی ہو زیتون؟ — انھیں گزری بہاروں کی یاد سے آج ہماری زندگی کی خزائیں سلامتی سے گزر رہی ہیں

ع نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی!

زیتون :- (بے چین ہو کر) یاد کرو وہ زمانہ — وہ ہماری عمریں، وہ وقت، وہ ولولے! آج سے برسوں پہلے اسی پاکول کے اشٹیشن پر ہماری تمھاری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یاد ہے کچھ؟

احمد :- (جیسے سہانا خواب دیکھ رہا ہو) ہاں — آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کائنات میں ایک دفعہ بہار آئی تھی۔

زیتون :- ایسی بہار پھر نہیں آئی۔

احمد :- وہ ہماری جوانی کی بہار تھی۔

زیتون :- دلوں میں تڑپ تھی۔

احمد :- اور مزاجوں میں دیوانگی۔

زیتون :- کیا دن تھے احمد!

احمد :- اور کیا راتیں زیتون!

زیتون :- اندھیری راتیں چاندنی راتوں سے زیادہ روشن معلوم ہوتی تھیں۔

احمد :- اور چاندنی راتیں اندھیری راتوں سے زیادہ دلچسپ اور پُراسرار۔

زیتون :- ہائے کہاں گئے وہ دن اور وہ راتیں —؟

احمد :- اور وہ ولولے، وہ امنگیں —؟

(لمحہ بھر کو وقفہ جس میں دور سے کسی ٹرین کے گزرنے اور سیٹی بجنے کی آواز آتی ہے)

زیتون :- مگر احمد!

احمد :- ہاں زیتون؟

زیتون :- یہ پاکول ہی کا اسٹیشن ہے؟

احمد :- (ہنستا ہے) وہ دیکھتی نہیں سامنے تختے پر اتنے موٹے موٹے حروف میں کیا لکھا ہے؟

زیتون :- مگر مجھے یہ جگہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کے اسٹیشن کی وہ پرانی رنگ اڑی لالٹین اس کے سایے میں سونے والا وہ

رہیں سکتا۔ کھڑکی کے اندر بیٹھا ہوا وہ گاؤ تکیے جیسا موٹا مسٹر ٹکٹ بابو، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ پالکول کا اسٹیشن کیسے ہو گیا۔

احمد :- (متاثر) زمانے کی آندھی ان سب کو لے اڑی زیتون۔ تم پچاس سال پرانے ماضی کو آج ڈھونڈ رہی ہو! وہ کالا ٹکٹ بابو، وہ رنگ اڑی لالٹین۔ وقت کی کتاب کے پچاس سال الٹ چکے ہیں۔

زیتون :- (حیران، ششدر) پچاس سال! ——— (خوف زدہ ہو جاتی ہے) ہائے نہیں نہیں (دھیمے لہجے میں) مجھے تو یہ بالکل کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

احمد :- (مغموم) ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ ہم کل کی بہاروں کے دو خشک پتے ہیں جو زمانے کی تیز ہوا میں جانے کس دشتِ نامعلوم کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔

زیتون :- (گھبرا سی جاتی ہے) خشک پتے! ——— نہ نہ۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں تو مجھے کونپلیں ہی کونپلیں نکلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ چاروں طرف ناشگفتہ کلیاں ہی کلیاں مہک رہی ہیں۔

احمد :- کونپلیں اور کلیاں۔ سچ کہتی ہو زیتون ——— اس زمانے میں تم بھی ایک کونپل تھیں۔ ایک ناشگفتہ کلی ——— جس کی ہوشربا مہک پر میں بھونرے کی طرح اڑتا ہوا آ پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر آج مجھے پھر تم وہی الھڑ لڑکی معلوم ہو رہی ہو۔

زیتون :- اور تم؟

احمد :- (ہنستا ہے) یہ تم بتاؤ۔

زیتون :- ایک جوانِ رعنا! ——— احمد! لو میرا ہاتھ پکڑو۔ مجھے باہر لے چلو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں ان بیتی بہاروں کی پرانی یادگاروں میں سے یہاں کوئی چیز باقی بھی ہے؟

احمد :- صرف دو سوکھے پتے!

زیتون :- (کھڑی ہو جاتی ہے اور احمد کے الفاظ سنتی ہے) آؤ احمد! باہر چل کر دیکھیں پرانی یادوں کی گھڑیوں سے اس مقام کی جو جو دلفریبیاں اور رنگینیاں جھلکا کرتی تھیں ان کا اب یہاں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

احمد :- وقت کی ریت پر سے پرانے قدموں کے نشان تک مٹ چکے ہیں زیتون۔

زیتون :- (یکلخت آسمان کی طرف دیکھ کر چلاتی ہے) وہ دیکھنا احمد! وہ وہ.... صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔

احمد :- (مغموم) کیا!

زیتون :- افق کے شفق زاروں میں دہکتا ہوا پرانا سورج! برسوں پہلے بھی وہ بالکل اسی طرح، اسی عقب میں، شفق کے خونچکاں دریا میں ڈوبا کرتا تھا۔ یہ وہی سورج ہے احمد۔ وہی پرانا سورج!

احمد :- (گہرا سانس ——— متاثر) ہوں ——— چاند ہو یا سورج اپنے وقت پر ڈوبتا اور اپنے وقت پر ابھرتا ہے۔ خواہ وہ انسانی آبادیوں پر ڈوبے یا ویرانوں پر ابھرے۔ اسے انسان کے ماضی و مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں زیتون۔

زیتون :- (ادھر ادھر دیکھتی ہے پھر یکایک ایسی گرمجوشی سے جیسے کوئی پرانا دوست نظر آ گیا ہو خوشی کے لہجے میں کہتی ہے) احمد! احمد! وہ دیکھو۔ وہ رہا وہ ہمارا پرانا تاڑ کا درخت۔ وہ اس ڈھلوان پر جوں کا توں کھڑا ہے ——— (پھر غمگین ہو جاتی ہے) اور یوں

معلوم ہوتا ہے جیسے گزرے وقتوں پہ ماتم کر رہا ہو۔

احمد :- (آہ سرد) ہر چیز پرانی ہو چکی ہے۔ رستے، شاہراہیں، زمین، آسمان، کائنات مر چکی ہے مگر زندگی کے اس قبرستان میں صرف ایک چیز اب تک زندہ ہے۔ نہایت تاباں، نہایت درخشاں، جانتی ہو کیا؟

زیتون :- (آہستہ) کیا؟

احمد :- (کچھ دیر چپ رہتا ہے پھر مدھم مگر موثر لہجے میں کہتا ہے جیسے کوئی سسکی لے رہا ہو) محبت!

زیتون :- محبت! انسان کی محبت زندہ ہے تو پھر کائنات مر نہیں سکتی۔ پھر تو ہر چیز زندہ ہے۔

احمد :- (جوان اور جوشیلی آواز میں ہنس پڑتا اور کہتا ہے) ! ! ! محبت زندہ باد! ——— آؤ زیتون! عصائے محبت کا سہارا لے کر ارمانوں کے ان اجڑے کھنڈروں میں جوانی کے نقشِ قدم کو ڈھونڈ نکالیں جو یہاں کی مٹی پر کندہ ہیں۔ آؤ میرا سہارا لو اور قدم آگے کو بڑھاؤ ———

زیتون :- آگے کو؟ ان پگڈنڈیوں پہ چلتے اب اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب یہ شاہراہیں بن گئی ہیں۔

(دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیے ڈوبتی شام کے سایوں میں آگے بڑھتے جاتے ہیں)

یہاں کی خاکِ پاک کا ذرہ ذرہ ——— یہاں کے طلوع، یہاں کے غروب غرض یہاں کی ہر چیز مانوس سی ہے۔

احمد :- ماضی ہمیں اپنی پچھلی رعنائیوں کی قسم دے دے کر اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یہاں کی ایک ایک چیز جانی پہچانی ہے ——— اور آگے چلو ———

زیتون :- (چونک پڑتی ہے) ارے ذرا سننا احمد ———!

(شام کے سناٹے میں دور سے کسی کارخانے کی دھک دھک
کی آواز سنائی دے رہی ہے)

زیتون :- سنا تم نے؟ پن چکی کی کُوکُوکُو؟

(آواز مسلسل اور آہستہ آہستہ آ رہی ہے)

احمد :- (غور سے سنتا ہے) ارے کہیں وہی پرانی پن چکی تو نہیں زیتون جس کی آواز ہم دن رات سنا کرتے تھے؟ مجھے یاد ہے اسٹیشن سے باہر نکل کر جونہی ہم اس چڑھائی پہ چڑھتے تھے وہ سامنے نظر آ جایا کرتی تھی۔

زیتون :- کیسے کیسے وقتوں میں اس کی آواز سنی ہے احمد!

احمد :- ہاں ——— بہار کی دہکتی ہوئی دوپہروں میں، خزاں کی دھندلی شاموں میں ——— اور گرمیوں کی اداس راتوں میں ———!

زیتون :- مگر آہ ——— یہ تو اس سامنے والے کارخانے کی دھک دھک ہے وہ دور دیکھو۔ کارخانے کے دودکش میں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ وہ پرانی پن چکی اب کہاں ———! (یکلخت بے اختیار کراہتی ہے)

احمد :- (گھبرا کر) کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

زیتون :- ٹیس سی اٹھنے لگی ہے پہلو میں۔ نجانے یہ کیا بیماری لگ گئی ہے مجھے۔ برچھی کی سی چبھن محسوس ہوتی ہے..... (کچھ دیر بعد) احمد!

کہ بتاؤ میں تندرست ہو جاؤں گی؟

احمد :- (بے حد غمگین) کیوں نہیں زیتون! —— (پھر اسے بہلانے کے لیے) بیٹے کے پاس جا رہی ہو۔ اس کے گھر پہنچتے ہی اپنی ساری تکلیفیں بھول جاؤ گی۔

زیتون :- لیکن فرخ ہمیں لینے آیا کیوں نہیں؟

احمد :- چلو اس کے انتظار میں اس سامنے کی ٹیلیا پہ بیٹھ جاتے ہیں تم تھک گئی ہو، کچھ دیر آرام کر لو۔

زیتون :- ٹیلیا ٹھیک نہیں۔ وہ ہمارا پرانا ٹھکانا "گل رنگ" کتنی دور رہ گیا؟ وہیں چل کر بیٹھیں گے اور فرخ کا انتظار کریں گے۔

احمد :- (بیتاب ہو جاتا ہے) گل رنگ! ہائے ہائے یہ تم نے کیا یاد دلا دیا زیتون —— یاد ہے اس چھوٹی سی سرائے میں ہم نے کیسی کیسی شامیں کبھی گزاری تھیں؟

زیتون :- (آہ بھرتی ہے) کچھ نہ پوچھو۔

احمد :- اس زمانے میں جو اکا دُکا مسافر یا کرل آتا تھا اس کا واحد ٹھکانہ گل رنگ ہی ہوتا تھا۔ وہ دیکھنا۔ وہ سفید دیواریں اسی کی تو نہیں؟

زیتون :- یہ تو کوئی بہت اونچی عمارت ہے۔

احمد :- (مایوس) ہاں! گل رنگ تو ایک چھوٹی سی سرائے تھی۔

زیتون :- مگر کیا معلوم —— یہ شاندار عمارت اسی چھوٹی سی سرائے کی قبر پہ کھڑی ہو!

(لمحہ بھر کو وقفہ۔ پھر دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آنے لگتی ہے
پھر مردانہ آواز میں کسی کے آہستہ آہستہ گنگنانے کی آواز آتی ہے)

احمد :- غضب کی آواز ہے! کون گا رہا ہے......!

زیتون :- کوئی شکاری چلا آ رہا ہے۔

احمد :- (پلٹ کر ڈھلوان کی طرف دیکھتا ہے) شکاری! (ٹاپوں کی اور گنگنانے کی آواز قریب آنے لگتی ہے) آواز میں رس ہے اور —— دیکھنا زیتون! کیسا بانکا سجیلا ہے۔

زیتون :- کوئی جوان بے پروا معلوم ہوتا ہے۔ گا رہا ہے اور چلا آ رہا ہے۔

احمد :- یوں سینہ تانے چلا آ رہا ہے جیسے زمانے کی آندھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

زیتون :- اور جیسے حسن و شباب کا آفتاب اس پہ کبھی غروب ہو ہی نہیں سکتا۔

احمد :- انسان یونہی سوچتا ہے —— کبھی میں بھی یہی سوچتا تھا!

زیتون :- ہاں! اور اسی طرح تم بھی کبھی محبت کے رسیلے گیت گایا کرتے تھے۔

احمد :- (مغموم) ہوں!...... یہ زندگی ایک خواب ہے زیتون۔ نجانے کب آنکھ کھلے اور ہم کب جاگ جائیں۔

(اب گنگنانے کی اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بہت ہی قریب آ گئی ہے)

زیتون :- وہ اِدھر ہی کو چلا آ رہا ہے۔ اسی سے "گلرنگ" کا پتہ پوچھو۔

نوجوان :- (قریب آ گیا ہے اپنے خیالوں میں گم مزے سے گا رہا ہے۔ شاید محبت کا خواب دیکھ رہا ہے۔ گھوڑے کے آہستہ آہستہ ٹاپوں کی آواز اس کے گانے کی سرن گتی ہے) ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ......

(زیتون اور احمد اسے بغور دیکھنے لگے)

(دیکھنے والے کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک تر و تازہ پھول کے آگے دو خشک پتے گھاس پر پڑے ہوں)

احمد :- (گلا صاف کر کے) ذرا سننا میاں صاحبزادے!

نوجوان :- (تان لگاتا ہے، بوڑھے کی آواز نہیں سنتا) ؏ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

احمد :- (آگے کو بڑھ کر) میری بات سننا نوجوان! یہاں "گلرنگ" نامی چھوٹی سی سرائے تھی، کدھر کو ہے؟

نوجوان :- (گانا بند کر کے بے پروائی سے) مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو؟

احمد :- میں نے کہا بیٹے! یہاں ایک چھوٹی سی سرائے تھی گلرنگ۔ کدھر کو ہے؟

نوجوان :- گل رنگ؛ ــــ نام تو بڑا بانکا ہے مگر بڑے میاں اس نام کی یہاں کوئی سرائے نہیں ہے۔

(گنگناتے ہوئے پھر گھوڑے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے)

احمد :- ذرا رکنا صاحبزادے! گلرنگ تو بہت مشہور سرائے ہے۔ تم یہاں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ اس پہاڑ کی ڈھلوان کے ختم ہوتے ہی یہاں گلرنگ کی دیوار نظر آجاتی تھی۔

نوجوان :- (ہنستا ہے) ہی ہی ہی ــــ ارے بڑے میاں! خواب تو نہیں دیکھ رہے؟

احمد :- نہیں بیٹے! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

نوجوان :- کب کی باتیں کر رہے ہو؟

احمد :- ابھی چند ہی سالوں کی۔

زیتون :- شادی کے بعد ہم دونوں چند روز اسی سرائے میں رہے تھے۔

نوجوان :- (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ــ ایک صدی پرانی چیز کو آج ڈھونڈنے نکلے ہو؟

؎ وقتِ پیری شباب کی باتیں　　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ہا ہا ہا ـــ ہا

(تانگا ناہموار روانہ ہو جاتا ہے۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز مدھم پڑتی جاتی ہے
دونوں میاں بیوی ششدر، ویران شام کے دھندلکے میں کھڑے ہیں)

زیتون :- (مغموم) چلا گیا ——!

احمد :- (مغموم) یوں نکل گیا جیسے وقت گزر جاتا ہے ——!

(تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ——!)

زیتون :- احمد!

احمد :- (جیسے خوابوں سے چونک پڑا ہو) ہوں!

زیتون :- اس نوجوان کے قہقہے سے پہلے ——— یعنی آج سے پہلے مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہوا تھا کہ زندگی کی بہاروں کو گزرے اتنی مدت ہو چکی ہے۔

احمد :- (اب تک مغموم) ہو ——ں!

(گہرا سناٹا۔ پھر یکایک کسی پرندے کے پروں کو پھڑپھڑانے کی آواز آنے لگتی ہے)

زیتون :- ہائیں! یہ کیسی آواز ہے!

احمد :- (مغموم) ابابیل ——

زیتون :- ابابیل؟ ——— ارے دیکھنا احمد! وہ آہیں بھرتی ہمارے سروں پر سے اڑ گئی۔

احمد :- (اداس) ہاں! اور شفق کے خونچکاں دریا میں جا کر ڈوب گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

زیتون :- (گھبرا جاتی ہے) وقت کے پر نہیں ہوتے ——— پھر بھی وہ کس تیزی سے پرواز کر جاتا ہے احمد!

احمد :- ہاں! اس ابابیل کی طرح ———

زیتون :- اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی!

(خاموشی گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر آہستہ سے دو دفعہ ٹک ٹک کی آواز آتی ہے)

زیتون :- یہ کیسی آواز تھی احمد؟

احمد :- دو خشک پتے درخت سے ٹوٹ کر ہمارے سامنے آ گرے ہیں۔

زیتون :- رستہ اور بھی ویران معلوم ہونے لگا ———!

احمد :- نئے رستوں پر پرانے مسافروں کا کیا کام زیتون؟

زیتون :- (خوف زدہ) واپس لوٹ چلو۔

احمد :- چلو ——!

زیتون :- مگر ——— ذرا ٹھہرو۔ جانے فرخ کس رستے آئے۔

احمد :- رستہ ایک ہی ہے۔ اس کی پگڈنڈیاں مختلف منزلوں پر جا نکلی ہیں۔

(دونوں واپس جانے لگتے ہیں کہ یکایک ایک نو دس سال کے لڑکے
کے گانے کی شگفتہ آواز ان کے کانوں میں پہنچتی ہے)

لڑکا :۔ (گا رہا ہے) ۔

شبِ غم سے صبحیں تراشوں گا میں
چٹانوں میں راہیں نکالوں گا میں
زمانہ مری کامرانی کا نقش!
اسے جس طرح چاہوں ڈھالوں گا میں
چٹانوں میں راہیں نکالوں گا میں

احمد :۔ (مدھم لہجہ) سُنا تم نے؟

زیتون :۔ کیا؟

احمد :۔ انسان کے ارادے!

زیتون :۔ ہوں ——

احمد :۔ یہ ننھا سا لڑکا —— دیکھا تم نے کس بے فکری سے مستقبل کے ارادوں کے گیت گا رہا اور بیری تلے پکے پکے بیر چن رہا ہے۔

زیتون :۔ ابھی اس نے زندگی کی دہلیز میں قدم رکھا ہی ہے ——

احمد :۔ (یکایک بے ساختہ چلّاتا ہے) امجد! او امجد!

زیتون :۔ (گھبرا جاتی ہے) ارے! کس امجد کو بلا رہے ہو؟ کون امجد؟

احمد :۔ (شرمندہ ہو کر ہنستا ہے) میں بھی کیسا دیوانہ ہوں —— ماضی کو حال سمجھ بیٹھا۔ اس کنوئیں کی بیری مجھے بیتے دنوں میں گھسیٹ لے گئی۔ اس نو دس سال کے معصوم لڑکے کی سُرخ دھاری دار واسکوٹ کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے امجد کا دھوکا ہو گیا۔

زیتون :۔ (حیران) امجد کون؟ کس امجد کا ذکر کر رہے ہو؟

احمد :۔ (دردناک ہنسی) میرے بچپن کا ہم مکتب امجد —— میں نے بارہا تم سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی سُرخ واسکوٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ مدرسے سے بھاگ کر ہم دونوں کنوئیں کی بیری تلے پہنچ جایا کرتے تھے۔ نہ وقت کی رفتار کا دھڑکا ہوتا تھا نہ مستقبل کا اندیشہ۔ اپنے حالوں میں مگن تمام تمام دوپہر کھٹے میٹھے بیر چنتے آپس میں لڑتے جھگڑتے، محبت کرتے، پیار کرتے، روٹھتے منتے —— وقت گزارا کرتے تھے۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وقت کے گھوڑے کی باگ ہمارے ہاتھوں میں ہے ...... جیسے بیری تلے بیر چننا ہی وقت کا مقصد ہے ...... بالکل اسی طرح ..... جیسے یہ لڑکا اس وقت مشغول ہے —— ہماری مائیں گھروں پر ہماری راہ تکا کرتیں۔ شام کو ہمیں سزائیں بھی ملتی تھیں مگر پھر صبح اٹھ کر ہم اسی شغل میں لگ جاتے تھے۔ زیتون! کیا وقت تھا اور کیا ولولے! کسی کی ناراضی کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے! —— حالانکہ امجد کو اس دنیا سے گزرے پندرہ سال گزر چکے ہیں —— وہ اپنی ملازمت کی مدت ختم کر کے

پنشن لے کر واپس آ رہا تھا کہ ریل کے حادثے ہیں —— (آہ بھرتا ہے) مگر تعجب اس بات کا ہے کہ نصف صدی گزرنے کے بعد آج بھی میرے تصور میں احمد وہی دس بارہ سال کا بے فکر لڑکا ہے جو سکول سے چھٹی ہوتے ہی گھر جانے کی بجائے رستے ہی میں سے بھاگ کر چپکے چپکے بیر توڑنے آ گیا ہے۔ اس کم سن لڑکے کو بیری تلے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہی زمانہ ہے اور وہی ہماری عمریں۔ (آواز دیتا ہے) میاں لڑکے! ادھر تو آنا ——

لڑکا :۔ (چونک پڑتا ہے) مجھ سے کچھ کہا؟

احمد :۔ (گہری دلچسپی لیتے ہوئے) کیا کر رہے ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟

لڑکا :۔ (خوف زدہ ہو جاتا ہے) یقین کرو بابا! مدرسے سے بھاگ کر نہیں آ رہا۔ چھٹی ہو گئی تھی۔ گھر جاتے جاتے ذرا بیری تلے رک گیا۔

احمد :۔ ڈرو نہیں بیٹے! میں تمہیں برا بھلا کہنے نہیں آیا۔

لڑکا :۔ (اب تک خوف زدہ) آپ ہمارے مدرسے کے ماسٹر تو نہیں ہیں؟

احمد :۔ (ہنستے ہوئے) نہیں بیٹے! میں بھی تمہاری طرح کا ایک طالب علم ہوں۔

لڑکا :۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) ہی ہی ہی ہی —— اس عمر میں آپ طالب علم ہیں؟ ہی ہی ہی!

احمد :۔ (سنجیدہ اور پر اثر لہجہ) ہاں! زندگی کا! میں ہمیشہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں —— کبھی میں بھی تم جتنا لڑکا تھا اور تمہاری طرح مدرسے سے بھاگ کر یہاں بیر چننے آیا کرتا تھا۔

لڑکا :۔ (ہنس پڑتا ہے) کبھی تم بھی چھوٹے تھے بابا؟

احمد :۔ (دردناک خیالات میں گم) ہوں —— ہاں! کبھی آتش جوان تھا۔

(شام اور بھی گہری ہوتی چلی گئی - ہر طرف اداسی اور خاموشی مسلط ہے)

احمد :۔ (لمبی سانس۔ پھر زیتون کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے) دیکھا تم نے زیتون! اس رستے پر سے ایک احمد گزر جاتا ہے تو دوسرا نمودار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی پگڈنڈیاں کبھی خالی نہیں رہتیں۔ (وقفہ۔ اداس لہجہ) میاں لڑکے! اب گھر لوٹو۔ تمہاری ماں راہ تک رہی ہوگی۔

لڑکا :۔ وہ تو ہمیشہ ہی ہماری راہ دیکھتی رہتی ہیں۔

احمد :۔ ہمیشہ؟! ایسے نہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ کوئی ہمیشہ کسی کی راہ نہیں دیکھتا۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے —— وہ دور دیکھو۔ دھان کے ہرے ہرے کھیتوں پہ پیلی دھوپ دم توڑ رہی ہے۔ سائے بڑھتے ہی جاتے ہیں اور یہ شام اب ڈھل چکی ہے۔

زیتون :۔ ہاں —— اور تھوڑی دیر بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔

احمد :۔ ہاں! اندھیرا ہی اندھیرا —— آہ!

(لمحہ بھر کو وقفہ۔ پھر دور سے ایک نوجوان اور ایک لڑکی کے گانے کی آواز آنے لگتی ہے)

نوجوان لڑکا:۔ (گا رہا ہے) ؎

اپنے قابو میں نہ دن اور نہ رات

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ع اب کے آئی ہے غضب کی برسات

لڑکا :۔ (گاتا ہے) ع آمدِ فصلِ بہاراں کے طفیل

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ع دے دیا ہم نے ترے ہاتھ میں ہات

لڑکا :۔ (گاتا ہے) ع اپنے قابو میں نہ دن اور نہ رات

لڑکی :۔ (گاتی ہے) ع اب کے آئی ہے غضب کی برسات

احمد :۔ وہ دیکھنا زیتون ــــ ڈھلوان پہ ایک نوجوان اور اس کی محبوبہ ــــ ہنس کے جوڑے کی طرح حسین!

زیتون :۔ اور کنول کے پھولوں کی طرح تر و تازہ۔

احمد :۔ ان دونوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے گزرا وقت لوٹ کر آگیا۔

زیتون :۔ ارے وہ تو ہماری طرف آرہے ہیں۔

لڑکا :۔ (قریب پہنچ کر) بڑے میاں! یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے؟

احمد :۔ ایک ایسی شاہراہ کی طرف ــــ جہاں سے پھر واپس آنا پڑتا ہے۔

لڑکی :۔ (شوخی سے ہنس پڑتی ہے) کیا کہا؟ واپس آنا پڑتا ہے؟ ہی ہی ہی ہی ــــ

احمد :۔ جس رستے کو چھوڑ کر جا رہے ہو ایک دن گھوم گھام کر پھر اسی پہ لوٹ آؤ گے۔

لڑکا :۔ تم فلسفے کے طالب علم معلوم ہوتے ہو۔

احمد :۔ ہاں! میں نے زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔

لڑکی :۔ (اشتیاق سے آگے کو بڑھتی ہے) مجھے بتاؤ تم نے زندگی سے کیا سیکھا؟

احمد :۔ یہ ــــ کہ زندگی میں ایک دفعہ محبت ضرور کرو، خواہ چند منٹوں کے لیے سہی۔

لڑکی :۔ (بیساختہ) ہائے تم کتنے سچے ہو بابا!

لڑکا :۔ اور بڑے میاں! محبت کی جنگ میں اگر جان و دل کی بازی لگانا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے نا؟

احمد :۔ قطعاً نہیں۔ قطعاً نہیں ــــ سنا نہیں تم نے؟ ؎

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

لڑکا اور لڑکی :۔ (دونوں مل کر گاتے ہوئے ڈھلوان کی طرف چلے جاتے ہیں) ؎

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

(آواز رفتہ رفتہ شام کے سناٹے میں ڈوب جاتی ہے)

احمد :- (ان دونوں کے جانے کے بعد خالی رستے کو تک رہا ہے) ہا ــــ ہا ــــ! ان دو وارفتگانِ محبت کو دیکھ کر مجھے برسات کی ایک گئی گزری پرانی شام یاد آ گئی۔

زیتون :- احمد! یاد ہے تمہیں، ہماری پہلی ملاقات بھی ایک برسات کی شام ہی میں ہوئی تھی۔

احمد :- اسی کو تو یاد کر رہا ہوں زیتون ــــ یاد ہے وہ برسات کی ڈھلی ڈھلائی سونے کے رنگ کی شام! دن بھر برستا رہا تھا اور شام کو بادل چھٹ رہے تھے اور سورج کی طلائی کرنیں جنگل میں آگ لگا رہی تھیں۔

زیتون :- اور ساری کائنات سوسن کے شگوفوں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔

احمد :- تم اور تمہاری سہیلی عائشہ گرمیوں کی چھٹیوں میں پالکول آ رہی تھیں۔

زیتون :- اور اتفاق سے تم بھی اسی گاڑی میں سوار تھے۔

احمد :- اور تمہیں یاد ہے ریل کس تیزی سے اڑی جا رہی تھی؟

زیتون :- (خوابناک آواز) ہاں ــــ شاید وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز!

احمد :- اور جب ریل عمرِ رواں کی طرح سفر کاٹتی اپنی منزل پر آ کر رکی اور پالکول کا اسٹیشن آ گیا تو میں کسی ضرورت پر تمہارے ڈبے کے قریب سے گزر رہا تھا۔

زیتون :- (ذرا ہنستی ہے) اس کے بعد تم بار بار میرے ڈبے کے سامنے سے گزرنے لگے ــــ یہاں تک کہ ــــ

احمد :- (ہنس کر) تم نے مجھے غنڈا سمجھ لیا۔

زیتون :- (ہنستی ہے) نہ صرف میں نے بلکہ عائشہ نے بھی!

احمد :- کیسے نہ گزرتا۔ میں پہلی ہی نظر میں تمہارے تیرِ نظر کا گھائل ہو گیا تھا۔

زیتون :- (پُرشوق لہجہ) اور یاد ہے تمہارے بار بار چکر لگانے سے میں اور عائشہ کس قدر گھبرا گئی تھیں۔

احمد :- (بالکل نوجوانوں کی طرح ہنس پڑتا ہے) اور یہ بھی یاد ہے تم دونوں نے مجھے بدمعاش سمجھ کر پکڑوا دینے کی صلاح کی تھی۔

زیتون :- (الھڑ لڑکی کی سی آواز میں ہنس پڑتی ہے) تمہاری حرکات ہی ایسی تھیں۔

احمد :- اور وہ بورے کا بورا، اسٹیشن ماسٹر الیاس! یاد ہے ہماری محبت سے واقف ہونے کے بعد ہم سے کس قدر متنفر اور بدگمان رہنے لگا تھا۔

زیتون :- (شگفتہ آواز میں) بھلا الیاس کو میں بھول سکتی ہوں، نفرت تھی مجھے اس سے۔ ایک تو وہ ہم سے جلتا تھا، دوسرے اپنے آپ کو بڑا حسین سمجھتا تھا حالانکہ یہ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا۔

احمد :- پہلے ہی دن سے ہم سب کے تعلقات اس سے کشیدہ ہو گئے تھے۔

زیتون :- (لڑکیوں کی سی آواز) جس شام ہماری ٹرین یہاں پہنچی تھی میں اور عائشہ گاڑی سے اتر کر پریشان سی پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں کیونکہ ہمیں لینے کوئی نہ آیا تھا۔ عائشہ دل کی کمزور تھی رونے لگی اور بولی "ہائے زیتون! اب کیا ہوگا؟ ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟"

یہاں تو کرایے کی کوئی گاڑی واڑی بھی نہیں ملے گی:

احمد :- (اشتیاق سے) پھر؟ پھر کیا کیا تم دونوں نے؟

زیتون :- موٹا الیاس کہیں قریب ہی کھڑا کن انکھیوں سے ہمیں بار بار دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کا فقرہ سننا تھا کہ اپنی توند ہلاتا ہوا خراماں خراماں ہماری طرف چلا آیا۔ عاشقانہ انداز سے مسکرا کر کہا گیا ہے (نقل اتارتی ہے) "چمن میں ظالم گلچینوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ حسین لڑکیوں کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہیے۔" جب ہم نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو ایک ادا کے ساتھ سر جھکا کر گانے لگا ؏

"نازنینو! غلام حاضر ہے"

احمد :- دل میں کہتا ہوگا ؎ گر بر سر چشم من نشینی نازت بکشم کہ نازنینی

زیتون :- نازنینو کے خطاب پر ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی، جی چاہتا تھا مزا چکھا دوں مگر وقت کی نزاکت کا خیال کر کے ضبط کیا اور تحکمانہ لہجہ میں کہا: "آپ اپنی توند لے کر فوراً واپس تشریف لے جائیے اور ہمیں ہمارے حالوں پر چھوڑ دیجیے۔"

احمد :- (قہقہہ لگا کر نوجوانوں کی طرح ہنس پڑتا ہے) ہا ہا ہا —— تم تھیں بلا کی تیز و طرار۔ شوخی تمہارے قدم چومتی تھی۔

زیتون :- (ذرا افسردہ ہو جاتی ہے) ہاں! اس زمانے میں رگ و پے میں بجلی بھری ہوئی تھی ——

احمد :- اچھا! پھر کیا ہوا تھا —— ؟

زیتون :- ہونا کیا۔ الیاس صاحب ہمیں قہر آلود نظروں سے گھورتے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے اپنی توند لیے مڑ گئے۔

احمد :- (ہنستا ہے) ہا ہا ہا —— پھر؟

زیتون :- پھر تھوڑی ہی دیر بعد اناج کی بوریوں سے لدی لدائی ایک بیل گاڑی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم نے سوچا چلو اسی گاڑی میں اناج کی بوریوں پہ سوار ہو کر شہر پہنچتے ہیں مگر گاڑی تھی اونچی اس پہ چڑھنا آسان نہ تھا اس لیے ہم دونوں چھلانگوں پہ چھلانگیں لگا لگا کر اس پہ چڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

احمد :- (ہنستا ہے) ہا ہا! بڑا مزا آیا ہوگا۔

زیتون :- خاک مزا آتا۔ چھلانگیں لگا لگا کر ہم تھک کر چور ہو گئیں تو میں نے عائشہ سے کہا۔ اے کاش! وہ بھیلے جیسا اسٹیشن ماسٹر یہاں آ کر کھڑا ہوتا اور ہم دونوں اس کے کندھے کو سیڑھی بنا کر بآسانی گاڑی پہ پہنچ جاتیں۔

احمد :- (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) ارے واہ! بھئی خوب سوجھی تمہیں۔ واقعی شوخی میں تمہارا جواب نہ تھا۔

(دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ڈھلی ہوئی شام
ایک روشن صبح میں تبدیل ہو گئی ہے، عمرِ رفتہ واپس آ گئی ہے اور دو
بوڑھے میاں بیوی کی بجائے ایک شوخ و شنگ نوجوان جوڑا ہنس بول رہا ہے)

زیتون :- (ہنس رہی ہے اور خوش ہے) موٹا الیاس میری جھڑکی کھا کر کھسیانی بلی کی طرح دور کھڑا ہماری حرکات کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بات اس نے سن لی۔ بس پھر کیا تھا، چنگھاڑتا ہوا ہماری طرف آیا اور بولا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے نہایت غرور و خفگی سے جواب دیا "دیکھ رہے ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ چھلانگیں لگا رہے ہیں اور کیا ہو رہا ہے؟" یہ کہہ کر میں نے ایک

اور چھلانگ لگادی۔

احمد :۔ عائشہ! تم تھیں کافر ادا......

زیتون :۔ (فقرہ جاری رکھتے ہوئے) الیاس جل گیا۔ کہنے لگا میں ہرگز تم دونوں کو اس پہ چڑھنے نہ دوں گا۔ گستاخ لڑکیاں کہیں کی! باغ خراب ہو جائے گا۔ یہ سن کر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ارے بڈھو! عقل ماری گئی ہے۔ بھلا ہمارے بیٹھنے سے باغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ہاں تم دور ہی رہنا۔ تم نے گاڑی کو ہاتھ بھی لگایا تو دونوں بیل بدکے جائیں گے۔

احمد :۔ (اشتیاق سے سن رہا ہے) اس وقت تک میں تم لوگوں کے درمیان پہنچا نہیں تھا۔

زیتون :۔ بس اس کے بعد تم پہنچ گئے تھے —— اور کس شان سے! میری بات سن کر بوڑھا الیاس کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں کسی نے اچانک پیچھے پولیس کے سپاہی کی ایک زوردار سیٹی بجائی جسے سن کر وہ مارے خوف کے پیچھے ہٹ گیا عین وقت پہ پولیس کے سپاہی کی آمد پر میں اور عائشہ پھولے نہ سماتی تھیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو —— (زور سے ہنس پڑتی ہے)

احمد :۔ (شوخی سے ہنس کر) تو میں کھڑا تھا —— میں نا؟

زیتون :۔ واقعی تم نے کمال کر دیا تھا۔ پولیس کے سپاہی کی سیٹی بجا کر دشمن کو بھگا دیا تھا۔

احمد :۔ (ہنس رہا ہے ہنستے جا رہا ہے) وہ سیٹی میں نے منہ میں انگلی دبا کر بجائی تھی........ اور دشمن ایسا بزدل تھا کہ پہلی ہی سیٹی پر بھاگ کھڑا ہوا.......

زیتون :۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے تم کھڑے تھے —— کتنے حسین تھے احمد تم! بلند و بالا قد، آنکھوں میں شدید اظہاریت، ہونٹوں پر مسکراہٹ، خوش لباس و خوش ادا۔ ہائے ہائے —— وہ ہماری پہلی ملاقات تھی احمد!

احمد :۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ تم پہلی ہی نظر میں مجھے دل دے بیٹھی ہو۔ ہا ہا ہا........!

زیتون :۔ (ناز سے) خیر! یوں تو نہیں ہوا تھا —— یہ بعد کا قصہ ہے۔

احمد :۔ بیشک، مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ میں پہلی ہی نظر میں تمھیں دل دے بیٹھا تھا زیتون! تم تھیں بھی تو آفتِ جاں! ستاروں کی طرح دمکتی ہوئی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ہونٹوں پر وہ ساحرانہ مسکراہٹ کہ انسان بھسم ہو کر رہ جائے۔ چال میں وہ مستانیت کہ اچھا بھلا آدمی دیوانہ ہو کر رہ جائے........!

زیتون :۔ ہاں! اس زمانے میں میں اپنے کالج کی سب سے زیادہ شوخ لڑکی سمجھی جاتی تھی۔

احمد :۔ اور میں بھی تو کالج ہی میں تھا —— آخری سال میں تھا اور شاعری پر ایک بسیط مقالہ لکھ رہا تھا میری زبان پہ ان دنوں غزل کا بڑا اثر تھا چنانچہ یاد ہے تمھیں دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے نکل گیا تھا ع وہ جانِ بہار آ ہی گیا۔

زیتون :۔ (ہنستی ہے) یاد ہے تم نے مجھے اور عائشہ کو کیسا دھوکا دیا تھا —— بڑے شریر تھے تم! ہم بیچاری بھولی بھالی لڑکیاں تمھاری باتوں میں آگئیں۔ عائشہ نے تم سے اتنا پوچھا تھا کہ یہاں کھانے کی کوئی چیز مل جائے گی؟

احمد :۔ (ہنستا ہے) اس پر میں نے کہا تھا جہاں انسان ہو گا وہاں اس کی خوراک بھی ہو گی چلیے میرے ساتھ۔

زیتون :۔ تم نے اس دھڑلے سے یہ جملہ کہا تھا کہ ہم دونوں تمھیں کسی ہوٹل کا منیجر سمجھ بیٹھیں اور اسی دھوکے میں تمھارے ساتھ چل پڑیں۔

احمد :۔ (بڑے مزے سے باتیں کر رہا ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی پرانی یادوں سے متاثر ہو کر مغموم ہو جاتا ہے) پھر میں نے یہ چال چلی کہ فوراً ایک کرایے کی گاڑی منگوائی اور تم دونوں کو ساتھ لے کر "گل رنگ" جا پہنچا جہاں بعد میں ہم نے کئی دفعہ کئی رنگین شامیں گزاریں۔

زیتون :۔ (شگفتہ لہجے میں) وہاں پہنچ کر تم یوں ظاہر کرنے لگے جیسے تم "گل رنگ" کے مالک ہو۔ ہمارے لیے گرم گرم ناشتہ لے آئے۔ انڈے، پراٹھے، کافی ....

احمد :۔ کھا پی کر تم بل ادا کرنے لگیں ——

زیتون :۔ یاد ہے اس پر تم نے کیا شور مچایا تھا —— جونہی میں نے روپے تمہارے آگے رکھے تم ہوٹل کے کنجوس مکھی چوس منیجر کی طرح ایک ایک روپیہ زمین پر مار مار کر دیکھنے لگے پھر آنکھیں نکال کر مجھے ڈرایا اور بولے۔

احمد :۔ (قطع کلام کرتا ہے) یہ سب سکے جعلی ہیں۔ چلیے پولیس اسٹیشن۔

(دونوں زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں)

احمد :۔ (اب تک ہنس رہا ہے) تم کو بڑا غصہ آیا تھا۔ تم بے ضبط ہو کر عائشہ سے کہنے لگیں، کہیں سے ایک موٹا ڈنڈا ڈھونڈھ لاؤ تاکہ اس کنجوس منیجر کو مزا چکھا دوں۔

زیتون :۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے) تم اپنی شرارت سے کب باز آنے والے تھے۔ جھٹ سامنے کے ایک درخت سے ایک لکڑی توڑ لائے۔ بڑے ادب سے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر وہ لکڑی میرے سامنے پیش کی۔

احمد :۔ میری اس حرکت پر تم کو ہنسی آگئی تھی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔

زیتون :۔ ہاں تمہاری وہ شوخی مجھے بہت بھاتی تھی۔ تم تھے بھی تو حرفوں کے بنے ہوئے!

احمد :۔ پھر کچھ دیر بعد تمہاری سہیلی عائشہ نے کہا تھا کہ اب ذرا پالکول کی سیر کو نکلنا چاہیے۔

زیتون :۔ گویا اس نے تمہارے دل کی بات کہی تھی۔

احمد :۔ ہاں! یہ سنتے ہی میں بھاگ کر ایک کرایے کی گاڑی لے آیا تھا۔ کچھ یاد ہے زیتون؟ اس موقع پر کیا ہوا تھا؟

زیتون :۔ نہیں تو ——

احمد :۔ یاد کرو۔ بڑا دلچسپ واقعہ تھا۔

زیتون :۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تم ہی بتاؤ۔

احمد :۔ گاڑی میں اتفاقاً عائشہ میرے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ بات تم کو ناگوار گزری تھی۔

زیتون :۔ کیوں؟ مجھے ناگوار کیوں گزرتی، واہ!

احمد :۔ تم نے اس کے بازو میں چپکے سے ایک چٹکی بھری تھی۔

زیتون :۔ اور یہ سب کچھ تم دیکھ رہے تھے؟

احمد :۔ کن انکھیوں سے۔ تم غصے سے گلابی ہو رہی تھیں اور ....

زیتون :- (ذرا سے بے چین) ارے چھوڑو۔ پچاس سال پہلے کے دکھڑے آج لے بیٹھے ہو۔

احمد :- انسان کی محبت یا نفرت کو وقت کے کلہاڑے نہیں توڑ سکتے زیتون! تم میں رقابت کا جذبہ شدید تھا تم ہاتھ دھو کر عائشہ کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ تمھیں شبہ تھا کہ میری توجہ عائشہ کی طرف ہے۔

زیتون :- (جیسے نصف صدی پرانا جذبہ زندہ ہو گیا ہو) سچ بتاؤ احمد ——— تمھیں عائشہ سے دلچسپی نہیں تھی؟

احمد :- محض اسی غلط فہمی کے باعث تمھیں ہمیشہ عائشہ بری لگتی رہی۔

زیتون :- (آہ بھرتی ہے) اور اب...... وہ بچاری بیوہ ایک ہسپتال میں پڑی عمر کے آخری ایام پورے کر رہی ہے ——— میرا دل اس کی طرف سے آئینہ کی طرح صاف ہے۔

احمد :- مگر جب تک وہ خوش اور تندرست رہی تم کبھی اس سے صاف دلی سے نہ مل سکیں۔

زیتون :- (ذرا ناگواری کے لہجے میں) دراصل یہ تمھاری غلطی تھی۔ تم اس کے ذمہ دار ہو کہ میرے بار بار پوچھنے پر بھی تم نے اس بات کا کبھی اقرار نہ کیا کہ تمھارے دل میں عائشہ کے لیے محبت نہیں ہے۔

(زیتون کی آواز بھرا جاتی ہے)

احمد :- محض اس لیے ——— کہ تمھیں اپنے لیے بے چین کرنے میں مجھے بڑا مزا آتا تھا زیتون!

زیتون :- بڑے ظالم تھے ——— خواہ مخواہ ہم دونوں کے دلوں میں رنجش ڈلوا دی۔ مجھے عائشہ سے جتنی محبت تھی اس سے کہیں زیادہ نفرت ہو گئی۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا تھا احمد! کہ عائشہ کسی وبا میں مبتلا ہو کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائے۔

احمد :- اور وہ گلابی رخساروں اور سیاہ بالوں والی لڑکی ——— تمھارے دلی جذبات سے بالکل ناواقف تھی اور مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔

زیتون :- (اچانک سنجیدہ ہو جاتی ہے) تمھیں عائشہ کی گلابی رنگت اور سیاہ زلفیں اچھی لگتی تھیں نا؟

احمد :- تم اب تک بدگمان ہو زیتون!؟ ——— آج اس بیچاری کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ چکا ہوگا اور اس کے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے ہوں گے۔

(لمبی سانس لیتا ہے)

زیتون :- ہائے بچاری ——— جانے کیسی ہے!

احمد :- پچھلے دنوں کسی نے کہا تھا کہ وہ ایک خیراتی ہسپتال میں پڑی ہے۔

زیتون :- (گھبرا جاتی ہے) خیراتی ہسپتال!؟

احمد :- ہاں ——— کیونکہ اس کا کوئی گھر نہیں۔

زیتون :- لیکن اس کا ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کے ہوتے ہوئے خیراتی ہسپتال میں کیوں پڑی ہے؟

احمد :- مگر وہ سوتیلے بیٹے کی بدسلوکیوں سے تنگ آ گئی تھی۔

زیتون :- اور بیٹے نے اسے گھر سے اٹھا کر ہسپتال میں ڈال دیا! .... نہ جانے قصور کس کا ہے۔ سوتیلی ماں کا، کہ سوتیلے بیٹے کا؟

احمد :- وقت کا! سارا قصور وقت کا ہوتا ہے کہ وہ کیوں آدمی کو ناکارہ کر کے اتنی جلدی گزر جاتا ہے ——— (متاثر ہو جاتا ہے) شام کیسی گہری ہوتی جاتی ہے۔

زیتون :- ہاں! ابھی تو اندھیری رات سامنے ہے!

(تھوڑی دیر گہری خاموشی ——— پھر دور سے کوئی تنہا جھینگر اچانک بےسُرا الاپنے لگتا ہے)

زیتون :- (دھیمے لہجے میں) احمد!

احمد :- ہاں زیتون!

زیتون :- شکر ہے ہمارا کوئی سوتیلا بیٹا نہیں۔

احمد :- ہاں! ورنہ آج یہ خوشی ہمیں نصیب نہ ہوتی۔

زیتون :- فرخ چاہے گا کہ اب ہم ہمیشہ اسی کے پاس رہیں۔ اس سے کبھی جدا نہ ہوں، میرا بھی دل یہی چاہتا ہے۔

احمد :- لیکن یہ میرے اصول کے خلاف ہے زیتون!

زیتون :- اپنے اصول اپنے ہی تک رکھنا احمد! فرخ کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو اسے بڑا صدمہ ہوگا۔

احمد :- میں جانتا ہوں بڑا حساس لڑکا ہے۔

زیتون :- وہ اب ہمیں اپنے سے جدا نہ ہونے دے گا۔ شاید ہماری آخری سانس تک!

احمد :- اور جب غریب کو تمہاری بیماری کا علم ہوگا .... تو تمہاری پٹی سے لگ جائے گا بیچارا۔

زیتون :- احمد! مجھے بتاؤ ڈاکٹر نے میرے مرض کے متعلق کیا کہا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟

احمد :- مرض کچھ ہی ہو بیٹے کے پاس جا کر شفایاب ہو جاؤ گی زیتون!

زیتون :- (خوشی سے ہنستی ہے) تم ٹھیک کہتے ہو (یکلخت کراہنے لگتی ہے) ہوں ——— ہوں ——— ہوں ——— ہائے ———

احمد :- (خوف زدہ) کیا ہوا میری زیتون؟

زیتون :- ہائے پھر وہی برچھی پیٹ میں چبھنے لگی ہے احمد۔ فرخ کیوں نہیں آیا اب تک؟

احمد :- مگر تانگے کی تلاش بے سود ہے۔ فرخ کے آنے تک سامنے کی سرائے میں چل کر آرام کرو۔ بہت تھک گئی ہو۔

زیتون :- مگر جانے وہاں کا کرایہ کتنا ہوگا؟

احمد :- تم فکر نہ کرو۔ چل کر آرام کرو۔ لو اٹھو میری جان! میرا سہارا لو اور قدم آہستہ آہستہ آگے کو بڑھاؤ۔

(لمحہ بھر کو وقفہ ——— جس میں دونوں سرائے کی طرف رواں ہیں۔
وہاں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ زیتون بُری طرح ہانپ رہی ہے)

احمد :- لو اب آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔

زیتون :- کہیں آنکھ نہ لگ جائے میری ——

احمد :- کیا ہرج ہے؟ آرام کی ضرورت ہے تمھیں۔

زیتون :- اور اگر میرے سوتے میں فرخ آ گیا تو؟

احمد :- تو تمھیں جگا دوں گا۔

زیتون :- میں چاہتی تھی جب وہ آئے تو میں جاگ رہی ہوں —— (کراہتی ہے) اُف! درد بڑھتا جاتا ہے۔

احمد :- سو رہو زیتون! آج تم بہت تھک گئیں۔

زیتون :- (درد کے دوران میں مسکراتی ہے) کوئی بات نہیں۔ فرخ آئے گا تو سارے درد بھول جاؤں گی۔ وہ گرم شال مجھ پر ڈال دو احمد!

احمد :- اب اس پرانی شال میں رکھا ہی کیا ہے۔

زیتون :- مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ سردی کی تکلیف سہ لوں گی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ فرخ کے بچے کو اس کی سالگرہ کے دن نیا جوڑا اپنے ہاتھ سے پہنا سکوں گی۔

(سو جاتی ہے۔ احمد آہستہ آہستہ اٹھتا اور سوتی ہوئی زیتون کے چہرے
کو محبت سے بغور دیکھتا اور آہ بھرتا ہے۔ جیب سے رومال نکال کر
امنڈ آنے والے آنسوؤں کو خشک کر لیتا ہے
اتنے میں دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے)

احمد :- کون؟

آواز :- دروازہ کھولیے۔

احمد :- (دروازہ کھول دیتا ہے) ارے فرخ بیٹے! آ گئے تم۔

فرخ :- آداب عرض ابا جان!

احمد :- (فرطِ محبت سے معمور آواز) جیتے رہو میرے بیٹے جیتے رہو۔ بڑا انتظار کروایا تم نے۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے تمھاری ماں کی۔ کہاں رہ گئے تھے بیٹے؟

فرخ :- کچھ نہ پوچھیے ابا جان! ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا اور اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

احمد :- (پریشان) خیریت تو ہے؟ پہلے یہ بتاؤ ٹل گئی وہ مصیبت؟

فرخ :- (ذرا ہنستا ہے) میں نے وہ چال چلی کہ اسے ٹلنے کے سوا چارہ ہی نہ رہا۔

احمد :- (اب تک پریشان) کیا تھی وہ مصیبت؟

فرخ :- مہمان —— بوریا بستر لے کر آ گئے تھے۔

احمد :- مہمان !!! ——— (وقفہ) مگر بیٹا! مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔

فرخ :- (ہنستا ہے) رحمت! مگر ابا جان! یہ بھی تو سوچئے نا آج کل کے نئی وضع کے گھر کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ ان میں فالتو کمرہ ایک بھی نہیں ہوتا کہ خدا کی اس رحمت کی نذر کیا جائے۔ جدید وضع کے گھروں میں ایک میاں بیوی اور ایک آدھ بچے کے لیے تو جگہ نکل آتی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی آجائے تو رحمت نہیں بلکہ زحمت اور مصیبت بن جاتا ہے۔

احمد :- ہاں ——— نئے معماروں کے دلوں میں جگہ ہوتی ہے نہ ان کے تعمیر کردہ گھروں میں ———

فرخ :- اور پھر ابا جان! ان مہمانوں کی توقعات بھی تو بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ کوئی مریض یہ امید لے کر آتا ہے کہ ہمارے ہاں ٹھہر کر آپریشن کرائے گا۔ کوئی بیماری سے اٹھنے کے بعد محض تفریحاً چلا آتا ہے کہ چلو تھوڑے دنوں کا آرام مل جائے گا۔ پہلے زمانے میں تو یہ ٹھیک تھا اور بہت ٹھیک تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات پریشانی کا موجب بن جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے بڑے بڑے آرام دہ ہوٹل ہیں اور مریضوں کے لیے سینی ٹوریم اور ہسپتال موجود ہیں۔ نرسنگ ہوم کھلے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں جاکر انھیں پریشان کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ بتائیے ابا جان! میں کچھ غلط کہتا ہوں؟ اب دیکھیے وہ مہمان میاں بیوی پورے دو مہینوں کی نیت بنا کر آدھمکے تھے بہانہ یہ بنایا تھا کہ منے کی سالگرہ میں شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ بھلا بتائیے، ایک غسل خانہ ہے ...."

احمد :- (نہایت سنجیدہ) کون تھے یہ لوگ؟

فرخ :- (ذرا ہنستا ہے۔ لہجے میں خفیف سی ندامت پائی جاتی ہے) کیا بتاؤں؟ تھے تو شائستہ کے والدین ہی۔ — پر کیا کیا جائے آج کل کے تنگ گھر ——— اس پر شائستہ کے ہاں بچہ بھی ہونے والا ہے۔

احمد :- (ششدر، کسی قدر وحشت زدہ) شائستہ کے ماں باپ! ——— یہ تو تم نے اچھا نہ کیا بیٹا! آخر وہ بہو کے ماں باپ تھے۔

فرخ :- مجھے خود احساس ہے ابا میاں! میں نے کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کیا لیکن آج کل کے اخراجات بھی تو دیکھیے ان دنوں تو ایک کتے کی معقول پرورش بھی کم بھاری نہیں۔ منے کی سالگرہ بھی آرہی ہے۔ شائستہ کی آرزو تھی اس موقع پر منے کے لیے ایک بچہ گاڑی لے لی جائے مگر کہاں سے لاؤں روپیہ؟ میری تنخواہ ہی کیا ہے۔

احمد :- (ٹھنڈی لمبی سانس) تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ ان دنوں سکونِ قلب کسی کو میسر نہیں مگر فرخ بیٹے! اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ زندگی کے بکھیڑے اور الجھنیں انسان کے ساتھ ہمیشہ یونہی لگی رہی ہیں۔ ہاں ان کی نوعیت بدل ضرور گئی ہے۔ پہلے زمانے کا آدمی ہل چلایا کرتا تھا۔ سوچتا کم تھا، جسمانی محنت زیادہ کرتا تھا اور خوش تھا۔ آج کا آدمی قلم ہاتھ میں لے کر میز پر بیٹھتا اور سوچتا زیادہ ہے، جسمانی محنت بالکل نہیں کرتا اور غم میں ڈوبا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج کے انسان میں زندگی کی الجھنوں کو سہنے کی طاقت گھٹتی جاتی ہے۔ ان مشینوں اور کلوں سے جہاں ہمیں کئی فوائد پہنچے ہیں، وہاں ہماری قومی تندرستی کا خاتمہ بھی ہو گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے ہلانے سے جو دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی اب وہ ایک بوجھ بن کر ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو گئی ہے۔

فرخ :- آج کا آدمی زیادہ عقلمند اور زیادہ سوچ بچار کا عادی ہے ابا جان! اس کا مقابلہ آپ پرانے دقیانوسی آدمی سے نہ کیجئے!

احمد :- مقابلہ تو میں کسی کا بھی کسی سے کرنے کا قائل نہیں بیٹے۔ میں تو سوچنے کا عادی ہوں۔ میں کہہ رہا تھا پچھلے زمانے کا آدمی بڑی محنت کی وجہ سے چور چور ضرور رہتا تھا، اسے مشینوں اور کلوں کی سہولتیں میسر نہ تھیں، اپنے ہاتھ پاؤں کی توانائی کا قائل تھا، مگر اس پر ذہنی اضمحلال اور محرومی کے احساس کے دورے کم پڑتے تھے۔ جانے کس طرح اس کا ذہن تروتازہ رہتا تھا اور وہ زندگی کی آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا تھا۔ تمھیں یاد ہوگا، تمھارے بچپن کی بات ہے، میری آمدنی ہی کیا تھی؟ تم سے نصف بھی نہ تھی مگر میں نے تمھاری دو پھوپھیوں کی شادیاں کی تھیں، تمھارے دادا اور دادی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ تمھارے چھوٹے ماموں مفلوج و معذور تھے، ان کے لیے باقاعدہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ روپیہ پس انداز کر کے بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ جب ہمارے ہاں آتے تھے تو تمھاری والدہ باوجود خانہ داری کی الجھنوں کے کبھی اپنے بھائی کی تیمارداری سے دریغ نہ کرتی تھیں۔

فرخ :- ٹھیک ہے۔ وہ فراغت کے دن تھے نا ابا جان! ——— اب تو ایسے مریضوں کے لیے سوائے ہسپتال کے اور کوئی جگہ نہیں۔

احمد :- (چونک پڑتا ہے) ہسپتال؟

(لمحہ بھر کو خاموشی)

فرخ :- خیر ابا جان! چھوڑیئے ان باتوں کو۔ امی کہاں ہیں؟ آپ نے کبھی ان کے متعلق لکھا تھا کہ وہ آج کل اچھی نہیں رہتیں۔ کیا ہوا انھیں؟

احمد :- (مغموم آواز) دو ہفتے ہوئے میں انھیں ایک ڈاکٹر کے ہاں لے گیا تھا، اس نے فیس کے تیس روپے لینے کے بعد ایک نہایت ناخوشگوار خبر سنائی۔

فرخ :- کیا بتایا؟

احمد :- اس کا خیال ہے تمھاری ماں کو سرطان ہو گیا ہے۔

فرخ :- (حیران) کینسر؟

احمد :- (وہی مغموم لہجہ) ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ چند ہی مہینوں کی مہمان ہیں۔ چند مہینے!

فرخ :- کیسی بری خبر سنائی آپ نے! پھر تو انھیں فوراً ہسپتال میں داخل کرا دینا چاہیے۔

احمد :- (گھبرا کر) نہیں نہیں۔

فرخ :- اور کیا۔ بھلا گھر میں ان کی خاطر خواہ تیمارداری کیسے ہو سکتی ہے ابا جان؟

احمد :- (ضبط کر کے) ٹھیک ہے مگر بیٹے! اس کا ذکر اپنی ماں سے نہ کرنا۔

فرخ :- ڈاکٹر نے کتنا عرصہ بتایا ہے ابا جان؟

احمد :- مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میں تھرامبوسیس کا مریض ہوں۔ میرا اسپ حیات بھی اب اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مدت سے شاید پہلے ہی افقِ حیات کو پھلانگ جائے اور مجھے دنیا میں تنہا رہ جانے کا غم دیکھنا نصیب نہ ہو۔

فرخ :- ایسے حالات میں آپ دونوں کو گھر سے نکلنا نہیں چاہیے تھا — میں حیران ہوں آپ کو گھر سے نکلنے کا خیال آیا ہی کیوں؟

احمد :- (ضبط کر کے) کیوں! — وہ تمہاری ماں کا خیال تھا — کہ زندگی کے آخری ایام تمہارے پاس گزار دیں۔

فرخ :- (ذرا سے تامل کے بعد فوراً) تو — تو میں پھر انھیں اپنے گھر لے چلتا ہوں۔

احمد :- نہیں بیٹے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس کوئی فالتو کمرہ نہ ہوگا۔

فرخ :- کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا —

احمد :- (مغموم) ہاں! کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔

فرخ :- نہیں نہیں — مجھے آپ لوگوں کو ساتھ لے جانے میں بھلا انکار تھوڑا ہی ہے؟ تنگ جگہ ہی ہی کچھ دنوں بسر کر لیں گے چلیے!

احمد :- شائستہ کے ہاں بال بچہ ہونے والا ہے۔ ایسی حالت میں اتنی رات تک تمہارا یوں باہر رہنا ٹھیک نہیں۔ تم ہمارا فکر نہ کرو، گھر لوٹو بیوی بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ سرائے بہت اچھی ہے۔ صبح تمہاری والدہ کو یہاں کے ہسپتال لے جاؤں گا۔ ہو سکے تو تم وہیں مل لینا۔

فرخ :- دفتر سے چھٹی ہوتے ہی وہیں پہنچوں گا۔ میں وہاں کے بڑے ڈاکٹر سے واقف ہوں اس لیے مجھے امید ہے کہ وہاں بہتر نگرانی ہو سکے گی۔

احمد :- میرا بھی یہی خیال ہے — (توقف) ہاں بیٹا! یاد آیا۔ تمہاری اماں نے منے کی سالگرہ کے جوڑے کے لیے یہ روپے بچا کر رکھے تھے۔ ہماری طرف سے منے کو خوب پیار کرنا اور دے دینا (جیب سے نکال کر روپے دیتا ہے)

فرخ :- (زورا ہنستا ہے) ارے خواہ مخواہ —

احمد :- تمہاری ماں کی تمنا تھی کہ اپنے ہاتھ سے جوڑا سی کر منے کو پہنائیں مگر اب اس کا موقع نہیں رہا۔

فرخ :- امی جان جاگ گئی ہیں تو میں ان کا شکریہ ادا کر دوں اور مزاج پرسی بھی کر لوں۔

احمد :- (مصلحتاً نہیں چاہتا کہ ماں بیٹے کی ملاقات ہو) نہیں بیٹے! انھیں سونے دو۔ انھیں آرام کی بڑی ضرورت ہے۔ تم سدھارو رات ہو رہی ہے۔

فرخ :- کچھ دیر انتظار نہ کر لوں؟

احمد :- (بے چین) نہیں وہ جاگیں گی تو میں کہہ دوں گا کہ تم آئے تھے۔

فرخ :- جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اچھا ابا جان! کل ہسپتال میں ملاقات ہوگی۔ میں ٹیلی فون پر صبح صبح ڈاکٹر کو تاکید کر دوں گا — کہ وہ آپ لوگوں کا خاص خیال رکھیں۔ خدا حافظ!

احمد :- (بھرائی ہوئی آواز) خدا حافظ!

(فرخ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

[وقفہ — ہوائیں تیز و تند چلنی شروع ہو گئی ہیں اور درختوں سے سوکھے پتے
بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے ہیں۔
احمد چپ چاپ دریچے کے آگے کھڑا خوفناک رات کو بے حس آنکھوں سے دیکھ رہا ہے]

زیتون :- (نیند سے چونک پڑتی اور ذرا کراہتی ہے) فرخ نہیں آیا ابھی؟

احمد :- (مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے) نہیں ——!

زیتون :- بھیگ نہ جائے وہ۔

احمد :- مگر بارش تو نہیں ہو رہی۔

زیتون :- تو پھر یہ آواز کیسی ہے ٹپ ٹپ؟

احمد :- سوکھے پتے شاخوں سے گر رہے ہیں ٹپ ٹپ۔

زیتون :- سوکھے پتے؟ ——!

احمد :- ہوں!

زیتون :- تو پھر کل صبح جنگل کے سارے درخت ننگے اور ویران نظر آئیں گے۔

احمد :- مگر نہ گھبراؤ۔ ان کی جگہ نئے پتے اور نئی کونپلیں نکل آئیں گی۔

زیتون :- (فرطِ مسرت سے لرزاں آواز) ٹھیک کہتے ہو۔ کیا معلوم فرخ کے چمن میں بھی آج کوئی نئی کونپل پھوٹ نکلی ہو——

احمد :- (غمگین) ہاں! کیا معلوم —— مگر اس نئی کونپل کو جگہ دینے کے لیے سوکھے پتوں کو شاخ سے گر جانا چاہیے۔ باغ کا ہر نیا پتا سوکھے پتے کی جگہ لے لیتا ہے ——!

جلدی سے دریچے کی طرف جاتا اور اسے کھول کر باہر اندھیرے کو
جھانک کر دیکھتا ہے۔ رات کالی اور ویران ہے اور خزاں کے پتوں
..... کی مسلسل بارش ہو رہی ہے۔
ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ!

تہمت

کنہیا لال کپور

ہمارا خیال ہے آپ ہم سے غائبانہ طور پر ضرور متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں ہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے ہوں گے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہوگا۔ آخر ہم کوئی معمولی انسان نہیں ہفتہ وار "تہمت" کے ایڈیٹر ہیں۔ ہم نے یہ اخبار کیوں نکالا؟ یہ مت پوچھئے نہایت دردناک داستان ہے۔ بی۔ اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپڑاسی تک کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ہفتہ وار "تہمت" کا ڈیکلیریشن داخل کر دیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا تو اس وقت ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب بھی گھوڑا گاڑی غنیمت ہے۔ انشاءاللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی۔

ہمارے اخبار میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خوبی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگائی یا چپکائی جا سکتی ہے۔ آخر ذات خدا کے علاوہ کون عیوب سے مبرا ہے؟ بڑے سے بڑے دیش بھگت کو بگلا بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ صاحب جنھوں نے یتیموں کو پالنے کے لیے یتیم خانہ کھول رکھا ہے؛ ان کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود یتیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔ امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی کے لیے سنسنی پھیلاتے ہیں تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔ اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ ہم واعظ ہیں نہ ناصح۔ ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر ایک سمجھدار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجئے۔ اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں سینکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر احساسِ جرم سوار ہے یعنی جنھیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے ان داتا ہیں کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔ آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سرخی چھاپی "شہر کے معزز ترین رئیس کی کارستانی۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر" اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے کہ ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار، مینجر اور چیف ایڈیٹر ہیں) ہاں تو ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے لاکھ

ی آمدنی دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔ اس سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ اس کا بڑا لڑکا بھی شامل ہے۔ ممکن ہے اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔"

جس دن یہ خبر چھپی خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک درجن سیٹھ اخبار "تہمت" کے دفتر میں (کہ جو دفتر ہونے کے علاوہ ہمارا مکان بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے کے لیے آئے۔ لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے کو معزز ترین سمجھتا تھا۔ قریب قریب ہر ایک نے منت سماجت سے مجھ سے درخواست کی کہ ہم اس کا نام اور پتہ اخبار میں شائع نہ کریں نہیں تو غضب ہو جائے گا اور اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کے لیے اس سے معاوضہ طلب کرتے اس نے بڑی شرافت سے ایک معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے یعنی اخبار "تہمت" کے ہاتھ ہے۔

کوئی دو ہفتے کا ذکر ہے۔ ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی۔ "نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش" دو کالم کی اس چٹپٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا "محض اس لیے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی تھی۔ حریص ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین تفاصیل کا انتظار کریں۔"

اس خبر کو پڑھ کر ایک سیٹھ صاحب ہانپتے کانپتے ہمارے دفتر میں تشریف لائے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہنے لگے "ایڈیٹر صاحب! خدا کے لیے اس قصے کی تفاصیل چھاپنے سے احتراز کیجئے۔ نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا۔ اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی ہے تو میں سکوٹر پر ہی قناعت کر لوں گا۔"

ہم نے کہا "یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب اخبار "تہمت" اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے، آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں نا ...... یعنی ......"

"جی ہاں! میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پانچ سو روپے کی حقیر رقم حاضر ہے۔ اگر یہ کافی نہیں تو کچھ اور"
"بس مبلغ پانچ سو اور بھجوا دیجئے۔ معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا۔"

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس قصے کی مزید تفاصیل پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا تو صاحب اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا "چار سو بیس کی دلچسپ مثال، پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے" اور دوسرے کی سرخی تھی "افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا استعمال"۔ ظاہر ہے کہ جب قارئین کو بدن کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں پڑھنے کو ملیں تو وہ ساس اور بہو کے جھگڑے میں کیوں دلچسپی لیں گے۔ اپنے خاص الخاص نامہ نگار کی وساطت سے (یعنی اپنی ہی وساطت سے) ہم نے ایک ڈاکٹر کی خباثت کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھا کہ وہ مریضوں کو پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے لگاتا ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ معاملے کی فوری تحقیق کی جائے اور اس بدطینت ڈاکٹر کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ موخرالذکر خبر میں ہم نے ایک یونانی حکیم کی قلعی کھولتے ہوئے بتایا کہ وہ افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا کہ جن پر اس نے شکر کا غلاف چڑھا رکھا ہے استعمال کراتا ہے۔

اب آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اور حکیم معاملہ طے کرنے کے لیے بھاگم بھاگ ہمارے پاس پہنچے اور کس کس چیز کا واسطہ دے کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم ان کے تجارتی رازوں کو فاش کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ ہم نے انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ وہ "تہمت بھونچال فنڈ" میں تین تین سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ "تہمت بھونچال فنڈ" ہماری جدت کی ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس بھونچال کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا روپیہ کمانے کا طریقہ۔ آپ کی دعا سے ایسا دماغ پایا ہے کہ ہر روز نئی نئی سرخیاں سوجھتی رہتی ہیں۔ قارئین کو اس قسم کی سنسنی خیز خبریں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ اگر ایک آدھ دن اخبار لیٹ ہو جائے تو کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔ آخر "تہمت" کے علاوہ کونسا اخبار ہے جو انھیں اس پایے کی سرخیاں دے سکتا ہے "ایک کم عمر پروفیسر کا تیسرا معاشقہ" "بوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی کا پراسرار فرار" "خادمہ سے محبت کرنے کا شاخسانہ" وغیرہ وغیرہ۔

ہم جانتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہے کہ ہمارا ضمیر ہمیں یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دیتا ہے تو صاحب اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم ضمیر کو خدا بخشے ہم کو مدتوں سمجھاتا رہا کہ میاں کیوں خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے ہو لیکن ہم نے اس بھلے مانس کو صرف ایک مصرع سنا کر خاموش کر دیا یعنی ع اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ ضمیر کی ضرورت سے زیادہ پروا کرتے ہیں۔ عموماً بزدل ہونے کے علاوہ تنگدست بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی اور ہم نے دین و دنیا میں سے موخر الذکر کا انتخاب کیا ہے اور صاحب ہمارا تو تجربہ ہے کہ آدمی ضمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ آپ کے مرنے کے بعد سنگ لحد پر یہ شعر لکھ دیا جائے گا ؎

تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

اچھا صاحب تو یونہی سہی۔ کم از کم آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اتنے اچھے شاعر کا ہے۔ ہماری مانیے تو لوگوں کو یہ شعر گنگنانے دیجیے اور خود آرام سے قبر میں لیٹیے۔

سکندر نامہ

عرف، قصہ بدایوں والے سکندر کا

سلمیٰ صدیقی

سکندر نام کے ایک بہت مشہور آدمی کا ذکر ہم تاریخ میں پڑھتے آئے ہیں۔ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن قدرت نے اس کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا اور اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو جیت سکتا موت نے اس پر فتح پالی۔

اس کی زندگی اور موت کی مختصر سی مدت کا بیان خاصا دلچسپ ہے۔

لیکن میں آج جس سکندر کا ذکر کر رہی ہوں۔ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا خواب تو درکنار کبھی دنیا کو سمجھنے تک کا بھی خیال نہ کیا پھر بھی اس کی معمولی سی اس زندگی کی داستان کسی طرح اس سکندر کی زندگی کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں جس نے دنیا پر حکومت کرنے کی ٹھانی تھی۔

ہمارے ہیرو سکندر کا جنم اتر پردیش کے ایک ضلع بدایوں میں ہوا جہاں کے پیڑے کسی زمانے میں بہت مشہور تھے لیکن اب سکندر کی شہرت کے آگے پیڑوں کی شہرت ماند پڑ چکی ہے۔ سکندر کا پورا حال جاننے کے بعد ہی آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ نہ صرف بدایوں کے مشہور پیڑوں کی شہرت کو بلکہ دنیا کے بڑے سے بڑے احمق کی شہرت کو بھی سکندر نے ٹھیس پہنچائی ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا پھیر آپڑتا ہے کہ مانے ہوئے تاریخی بیوقوف کی شہرت کو صرف ٹھیس ہی نہیں گولی لگ جاتی ہے اور مشہور ترین بیوقوف بھی سکندر کی عقلمندی کے سامنے بے بس اور ہکا بکا نظر آتا ہے۔ یوں بھی بے وقوفی اور ہکا بکا پن کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے گو سکندر اور بے وقوفی کا رشتہ چولی دامن کے رشتے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اس لیے کہ چولی اور دامن کپڑے کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور انھیں آسانی سے ناپا جا سکتا ہے لیکن چونکہ بیوقوفی کو ناپنے والا آج تک کوئی فیتہ دریافت نہیں ہو سکا اس لیے سکندر کی حماقتوں کو ہم بھی آسانی سے ناپ تول نہیں سکتے۔

سکندر وہ مخلوق ہیں جن پر پیدا کرنے والے کو اتنا فخر نہیں ہوگا جتنی حیرت ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ سکندر خود اپنی بے مثل صلاحیتوں سے قطعاً ناواقف ہیں اور ہر دم بے حد عقلمند ظاہر ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سکندر کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد کسی کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ اس معمولی سے آدمی کے سسٹم میں حماقتوں کے ایسے ایسے کل پرزے چھپے ہوتے ہیں جو وقت آنے پر کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں۔ سکندر کی بے وقوفی کو سمجھنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ ان کی حماقت سستی، گھٹیا، معمولی یا آسانی سے سمجھ میں آجانے والی نہیں ہے۔ وہ ایک اس مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر دل لگا کے ریسرچ کی جائے ـــــ اور کبھی کبھی خود ریسرچ کرنے والا بھی سکندر کی شخصیت کے آگے سپر ڈال دے یعنی قلم رکھ دے اور غش کرنے لگے۔

سکندر کی عقلمندی کی داستان کا آغاز خود ان کی اس کوشش سے ہوتا ہے جو وہ خود کو ہر دم عقلمند جتانے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ خود کو ایک فرد نہیں ایک جماعت تصور کرتے ہیں اور کبھی 'میں' نہیں بلکہ ہمیشہ 'ہم' کہہ کر بات شروع کرتے ہیں۔ اس 'ہم' کا تذکرہ ان گنت بار اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس دنیا میں سکندر ہی سب کچھ ہیں اور 'ہم' کچھ بھی نہیں ہیں۔

تقریباً تیئیس چوبیس سال گزرے ایک صبح سکندر ہمارے گھر میں نوکری کے ارادے سے داخل ہوئے تھے اور آج حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خود ہم لوگ یعنی گھر والے بھی سکندر کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونے کا حق کھو بیٹھے ہیں۔ سکندر بادشاہ کا تو دنیا پہ حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہوا لیکن ایک گمنام سا بیوقوف سکندر آج ایک پورے گھرانے پہ حکومت کر رہا ہے اس لیے کہ اس نے خواب نہیں دیکھا تھا منصوبے نہیں بنائے تھے۔ بستیاں نہیں اجاڑی تھیں۔ قبریں نہیں بنائی تھیں بلکہ محض اپنی بیوقوفی کے بل بوتے پہ دنیا کے بازار میں اپنی حماقتیں سجائی تھیں اور اسی لیے فاتح ناکامیاب اور احمق کامیاب ہو گیا۔

اس چوبیس سال کی مدت میں شاید ہی کوئی ایسا روکھا پھیکا دن گزرا ہو جب سکندر سے کوئی نہ کوئی حماقت بڑے پیمانے پر سرزد نہ ہوئی ہو ـــ سکندر اور بیوقوفی ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو چکے ہیں کہ دونوں کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یعنی فن اور فنکار کی اپنی الگ الگ کوئی حیثیت ہی نہیں۔ بڑے آرٹ کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں آرٹسٹ کا 'خون جگر' شامل ہوتا ہے۔ سکندر کا آرٹ اس منزل پہ پہنچ چکا ہے اور کبھی کبھی ان کی احمقانہ حرکتوں سے دل اس قدر جلتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے بڑے آرٹ میں ان کے خون جگر شامل ہونے کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ سیدھے سیدھے اس بڑے آرٹسٹ ہی کا خون کر دیا جائے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی ان کے آرٹ کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑ جاتی ہے یعنی اس وقت جب حالات اور مزاج سازگار نہ ہوں اور سکندر کا احمقانہ آرٹ بھی اپنے عروج پہ ہو۔

سکندر جس دن ہمارے گھر ملازم ہوئے اس دن انھوں نے اپنی آمد کے سلسلے میں آتے ہی ایک خوبصورت چائے کے سیٹ کی پیالی توڑ ڈالی اور ٹوٹی ہوئی کرچیں اپنے کرتے کے دامن میں بٹور لائے اور سامنے کھڑے ہو کے بولے،

"یہ دیکھیے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" ہم لوگوں نے گھبرا کے دریافت کیا۔

"ہونا کیا؟ آپ کے یہاں کے پانی کے نل نے یہ کر دیا؟"

"پانی کے نل کا اس میں کیا قصور......؟" کسی نے کہا۔

"اور کس کا قصور ہے صاحب؟ بھلا ہم کیا کرتے...... ہم پیالی دھو رہے تھے کہ نل اس سے ٹکرا گیا... نل بدلوا دیجیے۔"

غصہ تو ان پر بہت آیا۔ چونکہ وہ ان کی پہلی غلطی تھی پھر ان کے بیان کے مطابق قصور ان کا نہیں نل کا تھا اس لیے سب لوگ چپ ہو رہے۔

لیکن اس دن سے آج تک سکندر کی اس پانی کے نل سے دشمنی چلی آ رہی ہے جو کبھی پلیٹ توڑ دیتا ہے کبھی گلاس چکنا چور کر دیتا ہے، کبھی اس قدر سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ اسے کھولنے میں سکندر کی انگلیاں دکھنے لگتی ہیں اور کبھی اس طرح کھل جاتا ہے کہ بند کرنے میں سکندر کی کلائی مڑ جاتی ہے۔

سکندر کی زبان بڑی کڑوی ہے۔ اچھا بھلا آدمی ان کے دو میٹھے بول" سن لے تو زندگی بھر کے لیے ان کا دشمن ہو جائے۔

نئے نوکروں کے ساتھ ان کا یہ سلوک گھر والوں کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہا ہے اس لیے کہ سکندر خود کو اب ملازم نہیں بلکہ مالک سمجھنے لگے ہیں اور نوکر کو نوکر کا بھی نوکر سمجھتے ہیں۔ مشکل یہ آپڑتی ہے کہ ان کے اس طور طریقے کی بنا پر کوئی نیا ملازم ہفتے دس دن سے زیادہ ٹھہرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ سکندر نے کوئی ایسی ہی حرکت کی، ایک ملازم کو جو بڑا سیدھا سادا اور نیک سا چھوکرا تھا، ڈانٹ ڈپٹ کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑا محنتی نوکر تھا۔ اس کے جانے سے کام کاج میں بڑی رکاوٹ پڑ گئی۔ سکندر سے پوچھا گیا کہ۔

"بھئی تم نے آخر اس اچھے بھلے آدمی کو کیوں نکال باہر کیا۔ تم سے کام ہوتا نہیں۔ دوسروں کو ٹکنے نہیں دیتے ہو، آخر ہمارے گھر کا کام کیسے چلے گا؟"

سکندر نے حسبِ عادت گردن کو جھٹکا دیا اور بولے۔

"اس چھوکرے کو بلائیے اور پوچھئے۔ ہم نے اسے کہا ہی کیا تھا؟ پھر سوچ کے بولے "ہم نے تو اس سے بس یہ کہا تھا کہ بھئی تو ہماری پسند کا کام نہیں کرتا ہے۔ ہم تجھ کو بے حد کرکے "ناپرسند" (ناپسند) کرتے ہیں۔ پھر تیری یہ مجال کہ تو ہمارا مقابلہ کرتا ہے۔ بھلا کہاں تو کہاں ہم —— تو جو در کوئی نیچ جات کا آدمی ہے۔ ہم ٹھہرے جات برادری والے —— ہیں تو تو کوئی کنجڑا، قصائی، اٹھائی گیرا سا نظر آتا ہے...... چل دور رہو ہماری نظر کے سامنے سے!"

سکندر اب تک حیران ہیں کہ ایسے پیارے پیارے میٹھے بول سن کر آخر وہ 'بیوقوف' چھوکرا بھاگ کیوں گیا.......

ایک بار ایک چھوٹے سے بچے کے لیے آیا کی تلاش تھی۔ کئی آیائیں آئیں اور جاتی رہیں —— ایک عورت ذرا ٹھیک نظر آئی اس سے تنخواہ کی بات ٹھیک نہیں ہو پائی تھی —— سکندر سے کہا گیا کہ الگ لے جا کر اس آیا سے تنخواہ کی بات چیت ٹھیک ٹھاک کر لیں بولے "کیا کہیں ہم اس سے؟"

کہا گیا یہ کہنا کہ تیس روپے دیے جائیں گے۔ دونوں وقت کا کھانا اور دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ اترن ملے گی۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر پچاس روپے خشک ملیں گے۔"

سکندر سر کو جھٹکا دے کر آیا کو باورچی خانے میں لے گئے اور دو ہی تین منٹ میں مع آیا کے واپس آگئے اور بولے۔

"لیجئے صاحب سب ٹھیک کر دیا ہم نے........"

پھر آیا کی طرف دیکھ کے مخاطب ہوئے "ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ دونوں وقت کا کھانا ملے گا، پھٹے پرانے کپڑے ملیں گے لیکن پچاس روپے بالکل "خوشک" ملیں گے۔"

سکندر آج تک کنوارے ہیں۔ شادی کا ارمان ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ہر دم، ہر گھڑی، ہر وقت وہ اپنی شادی کے خیال میں گم رہتے ہیں۔ چوبیس سال سے وہ اپنی شادی کی فکر میں مشغول ہیں۔ گھر میں، پڑوس میں، محلے میں یا سکندر کے وطن میں، کوئی بھی کنواری بیاہی، بڑھیا، جوان، خوبصورت، بدصورت عورت ایسی نہیں جس سے وہ شادی کے لیے آمادہ نہ ہو گئے ہوں۔ ان کی اس کمزوری سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا ہے خاص طور پر سکندر کے رشتہ داروں نے انہیں اس سلسلے میں ہمیشہ ستایا اور زیر بار کیا۔ ہزاروں بار ان سے شادی کے وعدے کیے گئے۔ کبھی خود لڑکی نے، کبھی لڑکی کے باپ نے، کبھی کسی دوست نے اور کبھی کسی بالکل اجنبی راہ چلتے مسافر نے —— ! مگر آج تک کسی نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ کسی نے شادی نہیں کرائی۔ کسی نے شادی کرانے کے لیے لی گئی رقم نہیں لوٹائی

کسی نے ایک بار پیسے لینے کے بعد دوبارہ صورت نہیں دکھائی لیکن سکندر کو کسی سے گلہ نہیں ہے۔ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے، کہتے ہیں

" بیچارے وہ لوگ کیا کریں۔ جب ہماری قسمت میں کھوٹ ہے تو کوئی کیا کرے!"

رشتے دار بن کے سکندر کو لوٹنا بہت آسان ہے۔ کوئی ایک بار اس سے دور کی یا نزدیک کی رشتے داری جھوٹی یا سچی نکال دے سکندر کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ بٹوہ کھل جاتا ہے۔ بے حد فاتحانہ نظروں سے ہر طرف دیکھتے ہیں، بچھے بچھے جاتے ہیں۔

ہم میں سے کوئی سمجھاتا ہے کہ " بھئی یہ سب لٹیرے ہیں۔ تمہیں لوٹنے کے لیے آجاتے ہیں۔" تو سکندر الٹا ہم سے روٹھ جاتے ہیں کہ " صاحب! ہم تو رشتے داروں کو چھوڑیں گے نہیں۔ ہم کماتے کس کے لیے ہیں؟"

اسی 'رشتے داری' کے سبب سے سکندر خود کنگال رہتے ہیں۔ جو کچھ بھی جمع پونجی ان کے پاس ہوتی ہے وہ کوئی نہ کوئی ایرا غیرا رشتے دار کا لیبل لگا کے ان سے جھپٹ لے جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو سکندر خود بھی اپنے رشتے دار کو نہیں پہچان پاتے۔ لیکن یہاں کی مروت اور جذبۂ رشتہ داری کے خلاف ہے کہ وہ رشتے کی چھان بین کریں ـــ کہتے ہیں۔

" صاحب! ہمارا خیال تو یہی ہے کہ اس آدمی کو ہم نے کبھی اپنے خاندان میں نہیں دیکھا۔ نہ اس کا نام کبھی سنا۔۔۔۔ لیکن آخر اس کو کیا پڑی ہے جو خواہ مخواہ ہمیں اپنا رشتے دار کہے گا۔ ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔" مطلب یہ ہوتا ہے کہ ضرور اس میں کوئی رشتے داری ہے! اور پھر اس 'بے غرض' رشتے دار کی جی جان سے خاطر کرتے ہیں۔ اس کو دودھ جلیبی کا ناشتہ کراتے ہیں۔ علی گڑھ کے بسکٹ اس کو تحفے میں دیتے ہیں۔ اس کو ریل کا کرایہ دیتے ہیں، ریل پہ سوار کراتے ہیں اور بس اس سب کے بدلے میں وہ چلتے وقت صرف ایک فقرہ کہہ دیتے ہیں ـــ 'وہ جو ہمارا خیال رکھیے گا۔۔۔۔۔ لڑکی شریف ہو۔۔۔۔ کھڑکی دروازے کی جھانکنے والی نہ ہو۔ چٹوری نہ ہو۔۔۔۔' رشتے دار بڑے زور و شور سے اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں ان کی شادی کرانے کی شرطیہ قسم کھاتا ہے۔ ریل چل جاتی ہے، سکندر واپس چلے آتے ہیں اور جانے کتنے اگلے ماہ گزر جاتے ہیں وہ رشتے دار پھر کبھی اپنے رشتے دار سے ملنے واپس نہیں آتا ـــ لیکن سکندر کا ایمان 'رشتے' کی اہمیت میں اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔

سکندر کو شور شغب، میلے ٹھیلے اور چہل پہل سے بہت دلچسپی ہے۔ تیوہاروں کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، عید، بقر عید اور بڑے دن سب کا انھیں انتظار رہتا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان تیوہاروں پہ وہ بازار کی دھوم دھام دیکھ سکیں گے۔ تیوہار کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی ہی ہے کہ اس میں آدمی اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ ناچتے گاتے اور گھومتے پھرتے ہیں۔ ناچ گانے سے سکندر کو حد سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس میں بندر اور ریچھ کے ناچ سے لے کر عورت مرد اور لونڈوں تک کا ناچ شامل ہے۔ جہاں کہیں کسی ناچنے گانے والی کا پتہ چلے گا سکندر سب کام کاج چھوڑ وہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے خیال میں بازاری ناچنے گانے والیوں کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ وہ کسی قیمت پر کسی ناچنے یا گانے والی کو گھٹیا یا معمولی ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ کوئی مانے نہ مانے سکندر کو بازاری عورتوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی ہے۔ وہ ان عورتوں کا ذکر اس قدر عزت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں جیسے اپنے گھرانے کی بے حد قابلِ عزت اور پارسا عورتوں کا تذکرہ کر رہے ہوں۔ کوئی لاکھ سمجھائے سکندر کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ ان عورتوں کو سماج میں نیچ سمجھا جاتا ہے۔ وہ حیران ہو کے آنکھیں پھاڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ـــ

" ہم کیسے مان لیں صاحب! کہ چمنی بائی، گوری جان اور رمجھو بائی بُری عورتیں ہیں۔۔۔۔۔ ان کے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔؟ پھر یہ بھی تو دیکھیے

کہ بیچاری کس طرح آنے جانے والوں کا دل بہلاتی ہیں۔ خاطر مدارات کرتی ہیں، گانا سناتی ہیں۔ ناچ دکھاتی ہیں، پان کھلاتی ہیں اور کتنا خیال کرتی ہیں۔"

مزے کی بات یہ ہے کہ سکندر اس طرح کی تفریح گاہوں میں کسی بری نیت یا برے ارادے سے نہیں بلکہ صرف 'آرٹ برائے آرٹ' کی خاطر جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہر چیز پر سیدھی سیدھی اور سادی سی اوپری پڑتی ہے۔ کسی بھی شے کو وہ گہرائی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چونکہ سماج سے ہٹ کر انسان ایک دنیا کی ہر شے کی اوپری سطح بہتر اور رنگین نظر آتی ہے۔ اس لیے سکندر کو ہر چیز بہت اچھی اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ نہ وہ سماج کی دکھتی ہوئی رگ چھوتے ہیں۔ نہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کا چھپا ہوا زخم دیکھتے ہیں۔ اس لیے اپنے دل پر بھی کسی طرح کا بوجھ نہیں رکھتے ہیں۔ شہر کی ہر مشہور اور غیر مشہور طوائف کے آستانے پر وہ اس طرح پابندی سے جاتے ہیں جیسے کوئی مقدس فریضہ ادا کر رہے ہوں۔ وہ عورتیں بھی سکندر کا سواگت اس طرح کرتی ہیں جیسے اپنے کسی باپ بھائی، بیٹے یا تیمار دار کا انتظار کر رہی ہوں۔ سکندر ان کا گاہک نہیں، ان کا ایجنٹ نہیں، ان کا پیار نہیں، ان کا خریدار نہیں، پھر وہ ان کا ہے کا!! اور جہاں بڑے بڑے دولتمند اور رئیس جاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں وہاں غریب اور مفلس سکندر دھڑلے سے چلا جاتا ہے۔ امیر لوگ تو وہاں جاتے ہیں، اپنا غم ہلکا کرنے، اپنی جیب ہلکی کرنے، سکندر وہاں جاتے ہیں ان عورتوں کا دکھ سننے ان کا غم ہلکا کرنے ——!!

سکندر اس بازار میں صرف گانا سننے ہی تھوڑی جاتے ہیں، وہ تو ان عورتوں سے گھریلو باتیں کرتے ہیں۔ اپنے رشتے داروں کی باتیں کرتے ہیں، اپنے دوستوں کی باتیں کرتے ہیں، مہنگائی کی بات کرتے ہیں، تیوہاروں کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سیاست کی باتیں کرتے ہیں، گانا تو وہ عورتیں خود ہی کبھی کبھار عادتاً سنا دیتی ہیں تو سکندر سن لیتے ہیں ورنہ وہ تو محض ان کے دکھ سکھ کی باتیں سننے گئے تھے، کسی بری نیت سے تھوڑی گئے تھے۔ ایک بار رکشا بندھن کے تیوہار کے موقع پر سکندر صبح سے خلافِ عادت کام کاج بہت تندہی سے کر رہے تھے۔ گھر والے حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ——

"آپ کو نہیں معلوم آج راکھی کا تیوہار ہے —— ہمیں جرا جانا ہے...... ہماری دعوت ہے آج......"

پوچھا گیا "کہاں جانا ہے تمہیں، کہاں دعوت ہے؟"

بہت فخر سے مسکرائے اور بولے ——

"وہ آج جرا چھمی بائی (طوائف) کے ہاں جانا ہے —— راکھی بندھوانے ——"

سکندر ایک دن کمرے کی صفائی کر رہے تھے۔ جھاڑن سے میز کرسیاں پونچھتے پونچھتے ان کی نظر دیوار پر لگے ہوئے ایک کیلنڈر پر پڑ گئی۔ وہ ایک بڑا خوبصورت رنگ برنگا کیلنڈر تھا۔ کسی دریا کے کنارے گھنے گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں پانچ چھ خوبصورت خوبصورت بنی سجائی عورتیں ناچ کا پوز دے رہی تھیں۔ سکندر چپ چاپ اس منظر کی دلکشی میں کھو گئے۔ پھر میری طرف دیکھ کے بولے۔

"دیکھئے ڈینس (ڈانس) ہو رہا ہے۔"

"ہاں!" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک کیلنڈر کو غور سے دیکھتے رہے پھر بولے "میرے خیال میں تو یہ سب سہجادیاں (شریف زادیاں) ہیں ——" پھر اس کی وضاحت بڑے احترام سے کرتے ہوئے بولے "طوائفیں ہیں شاید۔"

ایک بار سکندر میرے ساتھ دہلی آ رہے تھے وہ سامان لے کے پہلے ہی سے اسٹیشن جا چکے تھے۔ جب میں اسٹیشن پہنچی تو ٹرین آ لگی

والی تھی۔ سب نے اِدھر اُدھر سکندر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے سے وہ قلیوں کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی میری طرف بڑھنے لگے۔ جب دس بارہ قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو اچانک ٹھٹھک کے رُک گئے اور برابر میں کھڑی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوئے ——

"ارے لیلا بائی تم کہاں؟"

مَیں نے ان خاتون کا جائزہ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک بڑی لمبی چوڑی بے جھجک جھگڑالو سی عورت نظر آتی تھیں۔ میلی سی پیلی دھوتی پہنے ہوئے تھی اور ایک بیڑی کو اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے منہ سے دھواں نکال رہی تھی۔ ٹرین آگئی تھی۔ جلدی جلدی سامان وغیرہ رکھا گیا اور گاڑی چلی تو میں نے ذرا سخت لہجے میں سکندر سے کہا۔

"یہ کون بیہودہ سی عورت تھی؟"

سکندر نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کے کہا: "ارے! ...... توبہ کیجئے بی بی .... وہ بیہودہ سی عورت کیوں ہونے لگی۔ وہ تو مدار گیٹ (علی گڑھ کا مشہور طوائفوں کا محلہ) کی لیلا بائی تھیں ...... ابھی ابھی چھ مہینے کی جیل کاٹ کے آرہی ہیں۔"

سکندر کے لہجے میں ایسی عزت تھی مدار گیٹ کی لیلا بائی کی جیسے وہ کوئی بڑی ہی شریف اور باعزت سوشل ورکر تھیں اور قومی خدمات کے سلسلے میں جیل کاٹ کے آرہی تھیں۔

کبھی کبھار سکندر فلم دیکھنے بھی چلے جاتے ہیں لیکن فلم دیکھنے کا شوق ان کو ذرا کم ہے۔ جب کسی تصویر کی بہت تعریف سنتے ہیں تو جاتے ہیں لیکن جب فلم دیکھ کے آتے ہیں تو دو دن تک اسی فلم کے ماحول اور ڈائیلاگ میں کھوئے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اسی طرح کوئی فلم دیکھ آئے تھے اور صبح سے خلافِ معمول چپ چپ سے تھے۔ ہاں! آتے جاتے جھاڑو دیتے دیتے، برتن دھوتے دھوتے کبھی کبھی ہاتھ روک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے کبھی مسکراتے، کبھی افسوس سے سر ہلاتے، کبھی خلا میں اس طرح ہاتھ کو نچاتے گویا جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمے داری ان پر کسی طرح عاید نہیں ہوتی اور جیسے خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہوں ؎

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو
جہاں تیرا ہے یا میرا؟

جب سکندر پر یہ کیفیت طاری ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ دورہ شدید ہے اور جب تک مریض کا پورا حال نہیں پوچھا جائے گا افاقہ ممکن نہ ہوگا۔ جب سکندر چائے کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں آئے اور بڑے میز پر رکھ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے تو میں سمجھ گئی کہ اب کچھ وقت ان کی نذر کرنا ہی پڑے گا ..... میں نے پوچھ ہی لیا۔

"رات کون سی فلم دیکھی؟"

سکندر کھل گئے۔ آگے بڑھ کے اور بڑے گمبھیر لہجے میں بولے۔

"مُرغ اعظم (مغلِ اعظم) دیکھ آئے ہم۔"

"کیسی لگی تمہیں فلم؟"

"ارے بی بی ..... کیا بتائیں ہم —— عجیب فلم تھی ...... وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے تو ہماری انارکلی کا مقدر کا

عالم رابھا ......؟"

"بھئی! یہ انار کلی کون تھی؟" میں نے قصے کو طول دیتے ہوئے کہا۔

اب سکندر روڈ میں آ چکے تھے۔ آرام سے نیچے قالین پہ بیٹھ گئے اور بولے "ارے بی بی...... آپ کو انار کلی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں اور لوگ باگ تو کہیں ہیں کتابوں میں اس کا قصہ لکھا ہے......"

"بھئی! میں ذرا کتاب کم ہی پڑھتی ہوں۔ تم تو بتاؤ یہ قصہ کیا ہے آخر؟"

"قصہ صاف ہے۔ مرغ اعظم کے دربار میں ایک باندی تھی۔ مرغ اعظم کی دیکھا دیکھی لوگ باگ اس کو انار کلی کہنے لگے۔ ایک دن وہ سارے عالم (صاحب عالم) کے سامنے پہنچ گئی اور رو رو کے (ان سے) محبت کرنے لگی...... مرغ اعظم کے ڈر سے کوئی ڈاکیہ اس کا خط سارے عالم کے پاس پہنچانے پہ راضی نہ ہوا ہوگا تو انار کلی اپنا خط لکھ کے ایک پھول میں بند کر کے دریا میں ڈال کے بیٹھ رہی اور گانے لگی کہ ——

'نہ دیکھا نہ بھالا۔ تیری جھوٹی کہانی پہ ہم بہت روئے'

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ سارے عالم کی نظر پڑ گئی پھول پہ اور انھوں نے (انھوں نے) پھول جو اٹھایا تو اس میں سے نکلا خط، بس پھر کیا تھا سارے عالم اپنے باپ مرغ اعظم کے خلاف ہو گئے۔ اُدھر مرغ اعظم بھی ٹھہرے ایک ہی چندی آدمی، بس باپ بیٹے کی ٹھن گئی...... باپ آپ کو پیچھے چلائے، بیٹا آپ کو پیچھے بیٹھے۔ اُدھر انار کلی اور اس کی ماں نے شور مچا دیا۔ شور غل سے مرغ اعظم کو اور بھی 'چڑ' پڑ گئی اور انھوں نے حکم دے دیا کہ انار کلی کو جندی چنوا دیا جائے......!!"

"پھر، پھر کیا ہوا؟" میں نے ذرا حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ارے ہونا کیا صاحب! سارے تماش بین رونے لگے کہ بادشاہوں کے چکر میں بچاری لونڈیا کی جان مفت میں چلی گئی۔ اچھی بھلی شکل صورت کی تھی...... کہاں دربار میں جا کے سارے عالم کی جان کو آ گئی...... کنیز لونڈیاں ہی ٹھہری...... بھلا پوچھو تو سہی تجھے کس نے کہا تھا کہ اپنی جات برادری کو چھوڑ کے دربار میں گھس جائے...... ارے اپنی جات میں دیکھتی کسی برابر والے کو تو...... سادی بیاہ بھی ہو جاتا اور جان بھی بچ جاتی مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کہ 'عورت جات تو وہی کرے ہے جو اس کا جی چاہے ہے'۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔ "تو پھر کیا انار کلی کو جندی چنوا دیا مرغ اعظم نے؟"

سکندر رو رگزر کے انداز میں بولے۔

"ہم تو یہی سمجھے تھے صاحب کہ انار کلی اب نظر نہ آئے گی۔ وہ تو گئی کام سے ...... پر شاباش ہے مرغ اعظم کو، دربار میں موت کا حکم دیا اور پھر جو ہم نے دیکھا تو کھڑے ہیں سرنگ میں اور انار کلی الگ کھڑی ہے ...... ہم تو جانیں جان بخشی کر دی اس کی.... بس اتنا جرور اس سے مرغ اعظم نے کہا کہ 'لڑکی جا ہم نے تیری جان بخشی کر دی۔ اب تو یہاں سے نکل جا اور پہنچ جا سیدھی کسی محل سرائے (محل سرا) کو!"

انار کلی کے پورے قصے میں سکندر کو یہی اعتراض تھا کہ اس بے وقوف چھوکری نے سخت حماقت ہی کی تھی کہ بادشاہ کے بیٹے سے عشق کر بیٹھی۔ سیدھے سیدھے اپنی جات برادری والے میں کسی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتی...... اور اس جات برادری کا تذکرہ کرتے ہوئے

سکندر کا لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ خود انارکلی کی جات برادری کے سب سے موزوں فرد ہوں!!

دلیپ کمار کی اداکاری کے اب بہت قائل ہو گئے ہیں۔ پہلے نہیں تھے اور جب سے مغل اعظم میں اس نے انارکلی سے عشق کیا تھا خاصے اس سے ناراض رہنے لگے تھے لیکن ایک دن پکچر ہاؤس سے لوٹے تو بہت ہی خوش تھے اور دلیپ کمار کا تذکرہ اس طرح کر رہے تھے گویا اپنی جات برادری کی عورت سے عشق کرنے کا جرم انہوں نے معاف کر دیا ہو۔ بولے۔

"صاحب! کیا ایکٹنگ کی ہے دلیپ کمار نے اس فلم میں؟"

"کس فلم میں؟"

"ارے اسی کوہن صور (کوہ نور) میں، کیا فلم بنا ہے کہ دس بار دیکھو اور جی نہ بھرے ......" پھر گانے تو ایسے گائے ہیں کہ پیسے وصول ہو گئے۔ ایک شہور شہیر (شعر) تو ایسا گایا ہے وس سنے کہ جو سنتا ہے، واہ واہ کرتا ہے۔ جنگل میں رات کے بخت (وقت) گاتا ہے کہ آج کی رات چاند اور ستاروں کا ملن ہوگا اور مسکراتا رہے گا جمین (زمین) پہ آسمان آج کی رات۔ دوسرے سکنے (موقعے) پر گاتا ہے؎

لوگ باگ پیار لی یہ دیکھیں جادوگری
سبز پری کو نچا لایا گلپھام ......"

سکندر شاعری کے سلسلے میں کسی ردیف قافیے، وزن یا بحر کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے دل کو تو جو الفاظ شعر میں بھا جاتے ہیں۔ ان کو الٹ پلٹ کے کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت اور سوجھ بوجھ کے مطابق ترتیب دے لیتے ہیں اور اکثر اوقات اپنی کسی نہایت بے معنی اور احمقانہ بات کے ثبوت میں بطور مثال شعر پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک دن باورچی خانے میں بیٹھے دوسرے نوکروں سے کچھ امیری غریبی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بولے۔

"بھائی! بات کے (یہ) ہے کہ امیر امیر ہے، گریب گریب ہے، دونوں کومیں (قومیں) ایکدم الگ الگ ہیں۔ امیروں کا کیا ہے سیر تپھریح (سیر تفریح) میں بخت (وقت) گزار دیتے ہیں۔ رہے گریب تو ان کی بھی گجر ہو ہی جاتی ہے۔ وہ جو کہا ہے کسی ساحر (شاعر) نے کہ؎

'جب وقت تنہائی ہوتی ہے۔ ہم اس طرح گزارا کرتے ہیں'

جانے کس بھلے آدمی کے شعر کے گلے پر چھری پھیر کے وہ اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے باورچی خانے سے نکل گئے۔

ایک دن گرمیوں کی رات میں گرمی اور مچھروں سے عاجز سکندر کو نیند نہیں آ رہی تھی صحن کے ایک گوشے میں اپنی کھاٹ پہ کبھی اٹھ رہے تھے، کبھی بیٹھ رہے تھے۔ میرا ادھر سے گزر ہوا اور میں نے پوچھا—

"کیا بات ہے سکندر، سوتے کیوں نہیں ہو؟"

بولے "کیا بتائیں بی بی...... گے مچھر سونے ہی نہیں دیتے ہیں۔ گرمی سے نیند الگ نہیں آ رہی ہے۔ وہی مجمون (مضمون) ہو گیا ہے جو کسی ساحر (شاعر) نے کہا ہے کہ؎

کجا (قضا) کا تو دن ہم نے مکرر (مقرر) کر دیا ہے
پھر تجھے نیند کیوں نہیں آوے ہے؟

کڑاکے کی سردی کے دنوں میں کوئی فلم دیکھ کے آئے تو بہت ہی متاثر معلوم ہوتے تھے۔ بولے "صاحب! یہ فلم کے ایکٹر ایکٹرانیاں

بھی جانے کس شے کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ نورس کا جاڑا پڑ رہا ہے .... دانت سے دانت بج رہا ہے اور اوپر سے فلم میں مینہ پہ مینہ پڑتا جا رہا ہے اور دونوں گا رہے تھے مجے مجے (مزے مزے) سے کہ ؎

جندگانی بھر نہ بھولے گی یہ برسات کی رات
کہ ہو گئی ایک حسینہ سے اچانک ملاقات

کاش خدانخواستہ وہ تو کمو خدا کو ان کی جندگانی بجو رہتی اور رچو ہو جاتا المونیا (نمونیہ) تو کیا ہوتا۔"

گیتا بالی کی کوئی فلم ایسی نہیں ہے جو سکندر نے نہ دیکھی ہو۔ پوری ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اگر کسی ایکٹرس کے قائل ہیں تو صرف گیتا بالی کے۔ سکندر نے گیتا بالی کو سب سے پہلے فلم 'سہاگ رات' میں دیکھا تھا اور اسی وقت سے اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"بھئی آخر ایسی کیا بات گیتا بالی میں ہے جو دوسری ایکٹرسوں میں نہیں ہے؟"

بولے: "آپ سمجھتیں نہیں۔ اُن میں (گیتا بالی میں) کیا کیا کھوبیاں (خوبیاں) ہیں۔ ارے صاحب! ایسی اچھی عادت کی ہیں وہ کہ کیا کہیں ہم۔ بڑی سیدھی سادی طبیعت ہے ان کی۔ شان اور رغرور تو ان میں نام کو نہیں۔ ہم تو صاحب بس "سوہاگ رات" دیکھتے رہے اور واہ واہ کرتے رہے۔ بھکارن کی طرح رہتی ہیں۔ بچاری کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں، کھانے کو روٹی نہیں، رہنے کو گھر نہیں، پر کیا مجال جو شکایت کا حرف منہ پہ لائیں۔ بڑی گریبی طبیعت کی ہیں۔ جیسا روکھا پھیکا کھانے کو دے دیا خوشی خوشی کھا لیا جیسا موٹا جھوٹا پہننے کو دے دیا پہن لیا۔ بس صاحب ہم تو اس بات کے قائل ہو گئے ہیں۔ دوسری ایکٹرسوں کی بات الگ ہے۔ بڑی دماگ دار (دماغ دار) ہوتی ہیں وہ — کیا ہم نے دیکھی نہیں ہیں۔ ان کی فلمیں، ہر بات پہ جھگڑا، ہر چیز پہ نخرہ!"

غرضیکہ گیتا بالی کو ایک فلم میں سادہ مزاج بھکارن کے روپ میں دیکھ کے سکندر نے دل ہی دل میں بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کر لیے اور رہ رہ کر اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اس غریب بھکارن کے کام آ سکیں۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ انہی دنوں سکندر کے دانت میں درد شروع ہو گیا اور ایک دن جب کہ وہ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں تھے، کسی نے ان کو بتایا کہ گول مارکٹ میں ایک ڈنٹسٹ ہیں۔ ڈاکٹر بالی۔ ان سے ملیں اور علاج کرائیں۔ سکندر ڈاکٹر بالی کا نام سن کر کھل اٹھے اور انھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ ڈاکٹر صاحب گیتا بالی کے والد بزرگوار ہیں اور غربت سے تنگ آ کے ڈاکٹر بن بیٹھے ہیں اور ان کے ذریعے سے دانت کے درد کا نہیں تو کم از کم دل کے درد کا تو علاج ہو ہی سکے گا۔ چنانچہ سیدھے سیدھے وہ ڈاکٹر بالی کے مطب میں گھس گئے۔ ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟ دانت میں کیا تکلیف ہے آپ کے؟"

سکندر نے ان سے کہا: "اطمینان رکھیے دانت کا علاج ہم آپ ہی سے کرائیں گے لیکن پہلے یہ پھرمائیے ... کہ وہ کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بولے: "وہ کون؟"

بولے: "آپ کی صاحب جادی (صاحبزادی)؟"

ڈاکٹر صاحب نے غصیلی نگاہوں سے دیکھ کے گرج کے پوچھا: "ہوش تو ٹھکانے ہیں مسٹر آپ کے۔ میری صاحبزادی کا نام لیا آپ نے تو گولی مار دوں گا آپ کو۔"

سکندر بولے: "واہ صاحب واہ! ہم نے جرا پوچھ لیا ان کو تو آپ یوں چیخنے لگے اور سارے شہر میں لوگ باگ ان کے چرچے

کرنے ہیں تو آپ سب کو گولی مار دیں گے۔“

ڈاکٹر صاحب اس بات پر چکپائے اور سمجھ گئے کہ خرابی سکندر کے دانت میں نہیں دماغ میں ہے۔ پھر بھی موٹی عقل کے آدمی تھے۔ بات کی تہ تک پہنچنے میں دیر لگی۔

آخر کار سکندر نے خود ہی بات صاف کی اور پوچھ ہی بیٹھے۔

”تو کیا گیتا بالی آپ کی صاحب جادی نہیں ہیں؟“

اب ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آئی۔ پھر بھی وہ سکندر کی جان بخشی پر رضامند نہ ہوئے اور سکندر کے دانت پر اپنی نظریں لگائے ہوئے تھے۔ آس پاس کے لوگوں نے سکندر اور ڈاکٹر صاحب کا جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا تو صلح صفائی کرانے لگے اور بڑی مشکلوں سے پانچ روپے اور ایک دانت کا نذرانہ لے کر ڈاکٹر صاحب نے سکندر کا پیچھا چھوڑا ——— اس دن سے گیتا بالی کا نام سنتے ہی سکندر کو دانت کا درد لاحق ہو جاتا ہے اور اس طرح ہمیں بھی گیتا بالی کی گریب طبیعت اور غریبی کے قصے سننے سے نجات مل گئی ہے۔

سکندر کو ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ ان کی صحت خراب رہتی ہے اور اس لیے وہ عام طور سے ڈاکٹروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جان پہچان کے ڈاکٹروں کی وجہ سے انھیں میڈیکل ایڈ کی طرف سے بڑا اطمینان رہتا تھا۔ جب وہ دہلی آئے تو اپنے اُلٹے سیدھے بستر کے ساتھ ساتھ اپنے امراض کی پوٹلی بھی اٹھا لائے۔ دہلی میں ان کو علاج کی وہ آسانیاں اور سہولتیں کہاں میسر آئیں جو علی گڑھ میں تھیں۔ اس بات سے سکندر بہت دُکھی رہنے لگے اور ایک دن کہنے لگے۔

”اے صاحب! علی گڑھ کی بھی کیا بات ہے۔ علاج اور ڈاکٹری کا تو وہاں بڑا آرام ہے ..... ایک یہ ہے آپ کا دہلی یہاں تو بیمار پڑنے سے بھی دل ڈرتا ہے۔ کل رات ہمیں بدہضمی ہو گئی تھی۔ ہم تو سمجھے کہ ہم کو ہو گئی موکا لگے ’(کالرے) کی بیماری ——— پر وہ تو خدا کو جندگانی منجور تھی ہماری کہ آپ ہی آپ ہم ٹھیک ہو گئے ورنہ یہاں تو مر جاتے ہم جب بھی کسی ڈاکٹر کو فکر نہ ہوتی۔“ پھر بڑی حیرت سے بولے۔

”کاس کھدا نہ کھواستہ کوئی بیمار پڑے تو بس علی گڑھ میں لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کے آگے کسی کی نہ چلے ہے تو یہ تو وہی مجمون (مضمون) ہو گیا ہے کہ ’مجبوری کا نام شکریہ ہے۔“

بیماریوں میں وہ سب سے زیادہ زکام سے ڈرتے ہیں اور اسے بڑے خوف سے ”جکھام“ کہتے ہیں۔ ایک بار سردی کے دنوں میں انھیں کوئی ضروری خط لے کر علی گڑھ سے دہلی جانے کو کہا گیا۔ سکندر نے صاف انکار کر دیا کہ ”صاحب ہم نہیں جائیں گے۔ یہ زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم دہلی گئے تو پانی بدلنے سے ہمیں جکھام کا مرض پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔“

سردی سے بہت بچتے ہیں اور اکتوبر سے لے کر مارچ تک ایک مفلر اپنے سر اور کانوں کے گرد لپیٹے رہتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی موقعہ آن پڑے سکندر پانچ ماہ تک اس مفلر کو کسی قیمت پر اپنے سر اور کانوں سے الگ کرنے پر تیار نہیں کیے جا سکتے۔ پانچ ماہ تک یہ مفلر باقاعدہ سکندر سے چپک کے رہ جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اکتوبر سے مارچ تک کی ہوائیں تو بس چلتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ہواؤں کی شان میں وہ ایسے ایسے الفاظ کہتے سُنے گئے ہیں جو شاید وہ اپنے کسی بدترین مخالف سے کہتے۔ اس مفلر کا بھی عجیب حال ہے۔ یہ کبھی وقت سے پہلے اتارا نہیں جاتا اور وقت گزرنے کے بعد اس کی حالت ایسی نہیں رہ جاتی کہ اتار کے رکھا جا سکے۔ جب وہ سکندر پر سے اترتا ہے تو سیدھے کوڑے کرکٹ کی بالٹی میں جاتا ہے۔ سکندر سردی کی مدت ختم ہونے پر اس مفلر کو اس طرح اپنے سے الگ کرتے ہیں جیسے ہم آپ کیلے کا چھلکا

ارنے میں یا سامنے والی کھڑکی تار سے پھینکتا ہے۔ چنانچہ رُت بدلنے کا اندازہ محض کیلنڈر سے نہیں کبھی کبھی سکندر کے مفلر کے اُترنے چڑھنے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

کچھ تو سکندر سنتے بھی اونچا ہیں اور کچھ اس مفلر کی وجہ سے بھی سننے سے معذور رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آئے دن طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہتے ہیں۔ ...... مثلاً ان سے کہا جاتا ہے۔

"بھئی سکندر! دھوبی کتنے دن سے نہیں آیا ہے؟"

جواب ملتا ہے: "واہ صاحب واہ! اگربتی تو ابھی پرسوں ہی لی تھی۔"

کوئی کہتا ہے: "ہمارا بستر چھت پہ لگانا۔"

سکندر جواب دیتے ہیں: "خط تو ہم ڈال بھی آئے۔"

کسی نے کہا: "بازار جاؤ تو گڑ لیتے آنا۔"

سکندر نے لاپروائی سے حقہ پیتے ہوئے جواب دیا: "گنے کا رس آج کل کہاں ملے گا۔"

ایک دن میں نے ان سے کہا: "رات تم نے میری صراحی کیوں نہیں بھری؟"

بڑے فلسفیانہ انداز میں بولے: "ہم نے تو آج تک آپ کی برائی نہیں کی۔"

عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر سکندر ذرا کم ہی سنتے ہیں اور اگر بقول ان کے کوئی 'رگڑے' (جھگڑے) کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے جب تو بالکل ہی بہرے پٹ بن جاتے ہیں لیکن جونہی بازار جانے کا نام کوئی لے دے سکندر چاہے زمین کی ساتویں تہ میں ہوں وہ سن لیں گے اور بازار جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ جانے کسی دیو کی جان کسی طوطے میں بستی تھی کہ نہیں لیکن سکندر کی جان تو بازار میں بستی ہے۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی بازار کا کام کسی نہ کسی طرح نکال لیں۔ ایک گلاس پانی کوئی گھر میں مانگ لے ان سے تو لگتا ہے ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھنے کی فرمائش کر دی گئی ہے لیکن اگر بازار کا کام ہو تو سکندر چاہے گھر کے کسی بھی حصے میں ہوں ایک جھپاکے میں الہ دین کے چراغ والے دیو کی طرح سامنے آ جاتے ہیں۔ دراصل سکندر کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز بازار ہے۔ کام چاہے آدھے گھنٹے کا ہو وہ بازار میں تین گھنٹے سے کم صرف نہیں کریں گے۔ ساری خبریں، طرح طرح کی افواہیں، جھوٹی سچی وارداتیں سن کے آتے ہیں اور پھر طرح طرح سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ سیاست سے بہت دلچسپی ہے اور لیڈروں کے نام خاص طور سے یاد ہیں انہیں۔ ذرا جغرافیائی معلومات میں کمزور پڑتے ہیں اس لیے کبھی کبھی ڈھاکے کو بہار میں، ناگپور کو بنگال میں، لاہور کو ہندوستان میں اور ملتان کو کانپور کے قرب و جوار میں شامل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بمبئی میں ہونے والے کسی حادثے کو مدراس سے منسوب کر دیتے ہیں اور دہلی میں ہونے والے واقعہ کو بلوچستان پہنچا دیتے ہیں۔ ایک دن ایک نہایت تاریخی اور دھارمک واقعہ اپنے کسی دوست کو ان الفاظ میں سنا رہے تھے کہ:

"جب تیمور لنگ حضرت ابراہیم کے پاس پہنچا اور اس نے کہا کہ 'صاحب! طور کے جلوے پہ ہمیں بھی ساتھ لے چلیے' تو حضرت ابراہیم بولے کہ پہلے ہیں وہ کشتی تو بنا لیجئے وہ جس میں بیٹھ کے ہم طور پہ پہنچیں گے۔ ...."

قصہ تو اس کے آگے بھی بہت کچھ تھا لیکن اس کے آگے کا احوال سننے کی ہمت نہ پڑی ——!

بات چیت کے دوران میں سکندر کو محاورے بولنے کا بڑا شوق ہے مثلاً 'مجبوری کا نام شکریہ'، 'کاش خدانخواستہ'، 'بھینسیا آنا کانی ہے'!

(آنی جانی ہے)' بھلا اچھا گمنام مرا' ———— ان کا سب سے دلچسپ قول تو یہ ہے کہ قبر کا حال یا تو مُردہ جانے یا زندہ' ہم کیا جانیں؟"

سکندر کو حادثوں سے بھی بڑی دلچسپی ہے لیکن چھوٹے موٹے حادثے جن میں کسی کو جان یا مال کا نقصان نہ پہنچے انھیں بالکل نہیں بھاتے۔ وہ حادثے کو بڑے فخر سے "ایسی ڈینٹ" (ایکسیڈنٹ) کہتے ہیں اور صرف اسی حادثہ میں جو "ایسی ڈینٹ" بن جاتا ہے سکندر کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ایک بار بازار سے لوٹے تو بڑے پریشان، مارے بدحواسی کے سانس نہیں سما رہا تھا۔ اپنی سائیکل کو بڑی بیزاری سے انھوں نے ایک طرف دیوار کے ساتھ جھٹکا دے کے کھڑا کر دیا اور ایک کیاری کی منڈیر پہ بیٹھ کے کراہنے لگے۔ دھیرے دھیرے گھر والے ان کے چاروں طرف اکٹھا ہونے لگے اور حال پوچھنے لگے۔ سکندر اس تمام عرصے میں اپنے سیدھے پاؤں کی دو انگلیوں کو بڑے ہی پیار سے سہلا رہے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کے پوچھ ہی لیا

"آخر ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ بھی تو؟"

سکندر نے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولے "پرے ہٹ کے کھڑا ہو۔ منہ پہ کیوں چڑھا آوے ہے۔ تجھے کچھ نظر نہ آوے ہے جو مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا...... دیکھتا نہیں ہے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔"

انگلیوں کے ٹیڑھی ہونے کی خبر پہ سب لوگ چونک گئے۔ آخر گھر کی مالکن نے آگے بڑھ کے اور ذرا ڈانٹ کے پوچھا "کیا انگلی انگلی کیے جا رہے ہو؟ اگر چوٹ زیادہ لگی ہے تو ہسپتال جاؤ، مرہم پٹی کرواؤ۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو...... سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں ہو کہ آخر ہوا کیا......؟"

سکندر نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، بیگم کو بھانپا، ہلکے سے کراہ کے بولے "ہوتا کیا بیگم صاحب...... ہم تو سودا سلف خرید کے بازار سے لوٹ رہے تھے کہ پھل والے نے آواز دی کہ "میاں سکندر! کہاں بھاگے جا رہے ہو، دو گھڑی کو سستا لو۔" بس صاحب ہم نے کہا، ایسا بھی کیا ہے ذرا اس کی بھی دو باتیں سنتے چلیں...... ہم نے سائیکل کو دکان کے تختے سے لگا کے کھڑا کیا اور خود دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ابھی دو ہی ملٹ (منٹ) ہوئے تھے ہمیں کھڑے ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک گنوار...... زاہل (جاہل) رکشے والے نے اپنا رکشا ہماری طرف بڑھا دیا اور بس اس کم بخت رکشے کے اگلے پہیے نے آگے بڑھ کے ہمارے پاؤں پہ ایسی ڈینٹ (ایکسی ڈینٹ) کر دیا۔"

"ارے، ارے...... "کسی نے کہا" اور سکندر تم نے رکشے والے کو یونہی چھوڑ دیا......؟"

سکندر معاف کرنے کے انداز میں بولے۔

"ارے بھئی ہم نے تو آگے بڑھ کے اس کو گلے سے پکڑ لیا تھا اور اس کو سیدھے لے جا رہے تھے تھانے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اپنے بنادیری کے تعلقے کے دیوان جی چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں جو دیکھا دیوان جی نے تو فوراً آگے بڑھے اور انھوں نے روگاد (روداد) پوچھی۔ ہم نے رکشے والے کا ہاتھ دیوان جی کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا "آپ خود انصاف کیجیے اس نے اتنے زور سے ہمارے پاؤں پہ ایسی ڈینٹ کیا ہے اس کو کیا سزا ملنی چاہیے؟" دیوان جی نے ہمارے پاؤں کو دیکھا، پھر رکشے والے کو دیکھا اور بولے "ارے بھئی جانے بھی دو، یہ بے وقوف آدمی ہے۔ آپ عقل مند آدمی ہیں منشی جی!...... بات بڑھانے سے کیا فائدہ؛ معاف کر دو۔" پھر مسکرا کے بولے دیوان جی کی بات کیسے ٹالتے صاحب! پھر انھوں نے تو خود ہی کہہ دیا کہ آپ ٹھہرے منشی جی...... رکشے والا ٹھہرا زاہل (جاہل) آدمی......" بس

سیدھے سیدھے سائیکل اٹھا کے چلے آئے......"

سکندر کی اس سائیکل کا بھی عجیب حال ہے۔ پچھلے پندرہ سولہ برس ہوئے سکندر کو یہ سائیکل دی گئی تھی...... اس وقت اس بچاری کے پرزے سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ اب تو اس کی عجیب و غریب حالت ہوگئی ہے۔ سائیکل کے علاوہ ہر دوسری مشین کا اس پہ گماں ہوتا ہے اس کے سارے انجر پنجر گھس گھسا کے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی سائیکل کا موجد بھی چاہے تو اس کے الگ الگ پرزے نہیں پہچان سکتا ہے۔ ہر پرزے پر کسی دوسرے پرزے کا گمان گزرتا ہے۔ سکندر کے اپنے ہاتھ پاؤں کا بھی یہی حال ہے۔ پاؤں کی وہ انگلیاں جن پہ اس بدنصیب رکشے نے ایکسیڈنٹ کیا تھا مدت سے ایسی ہی ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ چلتے وقت ان کی دونوں ٹانگیں اس ترازو کی طرح اونچی نیچی ہوتی رہتی ہیں جس میں اناڑی یا بے ایمان دوکاندار کبھی توازن برقرار نہ رکھ سکتا ہو۔ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا جانے کس طرح پیچھے جانے لگتا ہے۔ سکندر کو چلتے دیکھ کے بیک وقت دنیا کے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا، ترقی کرنے اور خوف کھانے کا خیال آتا ہے۔ سکندر کے پاؤں ایک پوری اس نسل کی نمائندگی کرتے ہیں جو آگے بڑھنا بھی چاہتی ہے اور پیچھے ہٹنا بھی نہیں چاہتی۔ سکندر کی چال میں ایک عجیب سا تذبذب پایا جاتا ہے جیسے وہ چلنے سے پہلے فیصلہ نہ کر سکے ہوں کہ کدھر جانا ہے۔ شاید یہی تذبذب سکندر کو پیدا کرنے والے کو بھی پیش آیا ہوگا کہ ان کو بھیجے کہ نہ بھیجے۔ سکندر نے اپنی سائیکل کو بھی اپنی عادتوں اور اپنے ہاتھ پاؤں کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس سائیکل کو سکندر کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں چلا سکتا ہے۔ سکندر اس سائیکل پہ اتنا حق جتاتے ہیں جتنا بعض والدین اپنی اولاد پہ یا بعض شوہر اپنی بیویوں پہ جتاتے ہیں یعنی سکندر جو سلوک چاہیں سائیکل سے کریں۔ سائیکل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ان کے حکم کے خلاف عمل کرے۔ گھر کے وہ لوگ جو سکندر اور ان کی سائیکل سے واقف ہیں وہ تو اس سائیکل سے ایسا خوف کھاتے ہیں جیسے بھڑوں کے چھتے سے یا بجلی کے کھلے ہوئے تار سے لیکن ایک بار ایک نئے ملازم نے سکندر کو سوتا دیکھ کے ان کی سائیکل کو اغوا کرنا چاہا تھا نتیجے میں اس بچارے کو کئی دن مرہم پٹی کرانا پڑی تھی۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں سائیکلوں کی بڑی چوریاں سننے میں آ رہی تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کی سائیکل کہیں نہ کہیں سے اور کسی نہ کسی طرح چوری ہو جاتی تھی۔ سکندر اس زمانے میں اپنی سائیکل کی طرف سے بہت فکر مند رہنے لگے تھے اور ان کی کچھ اس طرح کی حالت تھی جیسی اس غریب باپ کی ہوتی ہے جس کے گھر میں جوان کنواری بیٹی بیٹھی ہو اور پڑوس میں اچانک غنڈے آ بسیں۔ ہر روز سکندر سائیکلوں کی چوریوں کی خبریں لاتے تھے اور بدحواس سے رہتے تھے۔

ایک دن جو سکندر پوسٹ آفس گئے، خط ڈالنے تو ان کو وہاں دیوان جی (پولیس کانسٹیبل) مل گئے۔ پولیس والوں کو دیکھ کے تو سکندر کا چلوؤں خون بڑھتا ہے۔ پھر دیوان جی بھی آخر سکندر کی کمزوری سے واقف تھے۔ انھوں نے محلہ اوپر کوٹ کے ایک ریٹائرڈ کانسٹیبل کا ذکر چھیڑ دیا جن کی دو بیٹیاں شادی کے قابل تھیں...... دیوان جی بھی جلدی میں تھے اور کسی طرح پوسٹ آفس میں سکندر کی تو اس میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتے تھے لیکن مشکل یہ آ پڑی تھی کہ ان دنوں دیوان جی کی اوپر کی آمدنی کچھ یوں ہی سی ہو رہی تھی...... اور تہوار نزدیک تھا۔ اس لیے سکندر سے ان کی شادی کا تذکرہ ضروری تھا۔

سکندر حسب معمول کھل اٹھے اور بولے "اب کہئے دیوان جی! ہم آپ کو کیا پرمائیں (فرمائیں)؟"

دیوان جی بولے "بھیا! تم جانتے ہو ہم تو تمہارا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ اسی نیت سے لڑکی والوں پہ نظر رکھتے ہیں...... کچھ روپیہ پیسہ بھی ان پہ خرچ کرتے ہیں کہ تمہارا کام نکل جائے...... اب یہی اوپر کوٹ والوں کو دیکھو، گھر والے سب ٹھیک ٹھاک کر بیٹھے تھے لیکن لڑکی

کا بھائی اڑ گیا ہے کہ ہم تو لڑکے کو دیکھیں گے، پھر کچھ کہیں گے۔"

"لڑکے" کے نام پر سکندر کچھ مسکرائے، کچھ شرمائے پھر بولے "آں ہاں ...... تو اس میں کیا جھگڑا ہے ..... لڑکے میں کیا کھرابی ہے ..... مریج ہے لڑکا کہ بیمار ہے لڑکا؟ تم نے کہا نہیں ان سے دیوان جی کہ لڑکا ہزاروں میں ایک ہے۔ کوئی عیب اس میں نہیں اور کسی عیب میں وہ نہیں ..... سارے کالج میں ہم سرنام (مشہور) ہیں ..... جس سے چاہیں پوچھ لیں ہماری بابت ...... !"

دیوان جی نے کہا: "یہ باتیں تو میں نے سب ان کو بتا دیں مگر تم جانو لڑکی کا معاملہ ہے، چھان بین تو کرتے ہی ہیں گھر والے ....."

"ارے تو صاحب! جتنی چھان بین چاہیں کر لیں۔ ہمیں کیا ڈر ہے، ہر طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیں۔"

دیوان جی نے کہا: "وہ جات برادری کا معاملہ ہے نا۔"

"جات برادری کا کیسا معاملہ؟"

"بھئی وہ لوگ پٹھان ہیں اور پٹھان ہی کو لڑکی دیں گے اور تم ٹھہرے شیخ!"

"آں ہاں! ہم تو ٹھہرے شیخ! پاس سے کیا ہووے ہے۔ ہم ان کی کھاطر بن جائیں گے پٹھان ——!" سکندر نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

"کیوں باؤلے ہوئے ہو۔ بھلا بننے سے کوئی بنتا ہے۔ ذات برادری آدمی بانٹ نہیں سکتا ہے، نہ خرید سکتا ہے۔ وہ تو پیدائش کے ساتھ ساتھ چلتی ہے ......"

سکندر نے منہ بنا کے کہا: "ارے تو چلے ساتھ ساتھ جات برادری بھی ...... ہمیں کیا ڈر ہے۔ کیا شیخوں کو لڑکیاں نہ ملتی ہیں ......؟"

پھر زرا نرم پڑے اور بولے "لیکن دیوان جی! ہم تو جانیں آپ چاہو گے تو جرور ہی ہمارا کام بن جائے گا۔ کسی کی جات برادری بدلنا تو تمہارے بائیں ہات کا کھیل ہے ...... یاد ہے وہ سیتا کی شادی تم نے کرائی تھی سیدوں میں ...... اور ساری دنیا جانے ہے کہ سیتا اصل نسل کی کھالص (خالص) جولاہے کی جات سے ہے۔"

دیوان جی مسکرائے۔ کچھ خوش بھی ہوئے پھر بولے: "بھئی ہم کیا ہیں ...... سب اوپر والے کی قدرت ہے ..... اب تمہارا ہی معاملہ ہے۔ ہم تو اپنی سی سب کر رہے ہیں ...... پر تم جانو زمانہ ہی خراب آ لگا ہے۔ پھر اپنی حالت بھی آج کل زرا یوں ہی سی ہے ..... ویسے ہم روپے پیسے کا کچھ خیال نہیں کر رہے ہیں اس سلسلے میں!" دیوان جی اب معاملے پہ آ پہنچے تھے۔

سکندر خوش ہو کے بولے: "روپے پیسے کا آپ خیال نہ کریں دیوان جی! جب تک سکندر کے دم میں دم ہے وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے۔ روپے پیسے کی آپ پھکر نہ کریں ...... جو آپ کہیں، ہم آپ کو پہنچائیں ......!"

دیوان جی نے کہا: "آج رات کو لڑکی کے بھائی کو زرا منانے جاؤں گا۔ وہاں چائے پانی سے اس کی خاطر کروں گا۔ دیکھو شاید جم جائے تمہارا معاملہ ......"

سکندر نے بڑی شان سے جیب میں ہات ڈال کے دس روپے دیوان جی کی نذر کیے۔ دیوان جی بولے: "ارے بھئی! اتنے میں تو آج کل سادا پانی بھی کوئی نہ پلا دے ہے کسی کو اور تم چلے ہو اپنے سالے کو اس رقم سے ٹالنے ......"

"سالے کو" یعنی بیوی کے بھائی کو۔" ہائے ہائے سکندر اس رشتے کا نام سن کر شرما شرما کے مسکرائے رہے اور بولے "ہاں صاحب!

سالے کی تو بات جدا رہتی ہے...... لوگ باگ کہتے ہیں۔ ساری خدائی ایک طرف' جورو کا بھائی ایک طرف......" اور پانچ روپے سکندر نے بیوی کے بھائی کی مزید خاطر کے لیے دیوان جی کو دیے۔ پھر احتیاطاً پوچھ بیٹھے "کوئی بہن بھی ہے ان کی؟"

دیوان جی ذرا چکرائے۔ پھر سنبھل کے بولے "ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ بھرے گھر کی لڑکی ہے۔ تین وہ۔ دو بہنیں اس کی اور ہیں۔"

"دو اور ہیں؟" سکندر خوشی اور اطمینان سے بولے۔

"آں ہاں بھئی! دو اور ہیں۔" دیوان جی نے جواب دیا۔

سکندر مسکراتے ہوئے بولے "بس دیوان جی! ہمارا دل کہے ہے کہ سکندر کا کام تو یہیں بنے گا...... ارے صاحب! ایک سے نہ ہوگی شادی تو دوسری تو ہے اور وہ بھی کسی وجہ سے رہ گئی تو پھر تیسری کہاں جائے گی بچ کے......؟"

دیوان جی اب جلد سے جلد بھاگنا چاہ رہے تھے۔ بولے "ہاں جی! تیسری کہاں جائے گی۔ ہم نے تو سکندر اسی خیال سے اس بار ایسا گھر دیکھا ہے جہاں تین تین لونڈیاں موجود ہیں۔ اب بھی کوئی ایک تو تیرے مقدر میں ہوگی ہی......"

دیوان جی چلے گئے۔ سکندر تھوڑی دیر تک لوہے کا جنگلہ پکڑے کھڑے رہے۔ وہ تینوں لڑکیوں کے خیال میں گم تھے۔ جب وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے نکل کے اپنی اس پرانی باسی اور کنواری دنیا میں آئے تو انھیں گھر جانے کا خیال آیا اور پھر اپنی سائیکل کا خیال آیا...... باہر نکلے تو سائیکل غائب! سکندر کے ہوش گم ہو گئے۔ چیخ پکار اور پوچھ تاچھ شروع کی۔ سائیکل کا ناک نقشہ حسب نسب سب کچھ بتاتے پھر رہے تھے لیکن سائیکل نہ ملنا تھی نہ ملی۔ لوگ باگ ادھر ادھر اکٹھے ہو گئے اور طرح طرح کی سائیکلوں کی طرح طرح کی چوریوں کا ذکر کرنے لگے۔ آخر کار تھک ہار کے اور سائیکل کو صبر کر کے سکندر پیدل گھر لوٹے اور اس طرح تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے جیسے کوسوں کا سفر کر کے آ رہے ہوں حالانکہ پوسٹ آفس دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا لیکن سکندر تو گھر کی چہار دیواری کے علاوہ کہیں بھی پیدل نہیں چلتے تھے۔ ہر دم اسی اپنی سائیکل پر سوار رہتے تھے۔ سکندر ابھی چوری کی داستان ختم بھی نہ کر سکے تھے کہ دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔ سکندر پریشان حال اور بڑی بیزاری سے دروازے کی طرف بڑھے...... اور پلک جھپکتے جو لوٹے ہیں تو خوشی سے بے حال' اپنے سارے ٹیڑھے میڑھے دانت نکالے اپنی سائیکل کو جھاڑتے پونچھتے اندر داخل ہوئے۔ قصے میں جان آگئی تھی۔ گھر والے سب سکندر کے آس پاس جمع ہو گئے تو سکندر بہت فخر سے بولے "دیکھئے ہم نہ کہتے تھے ہماری چیز کہاں جا سکتی ہے۔ اب پوچھیں گے ذرا سائیکل چور سے کہ بچہ! سکندر کی سائیکل چرانا مذاق نہیں ہے۔"

کسی نے پوچھا "چور پکڑا گیا؟"

"آں ہاں! پکڑا گیا۔" سکندر نے کہا۔

"تو کیا تھانے میں ہے چور؟" کسی نے پوچھا۔

سکندر مسکرا کے بولے "تھانے کیوں نہیں جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو ضرور ہی تھانے جائے گا۔ ابھی تو ہسپتال میں پڑا ہے!"

سکندر کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ دہلی میں انھوں نے ایک سردار سے دوستی کر لی تھی۔ اسی کے ساتھ باہر آتے جاتے تھے۔ ایک دن بہت شام گئے تک بھی نہ لوٹے تو مجھے فکر شروع ہوئی۔ آخر میں آٹھ بجے رات کو سکندر اکیلے گھر لوٹے۔ میں نے انھیں ڈانٹا کہ اتنی دیر تک کہاں غائب رہے سارے کام چھوڑ کے؟"

بولے "ارے صاحب! کیا بتائیں آج کیا قصہ ہوگیا۔"

میں نے پوچھا "کیا قصہ ہوگیا؟"

کہنے لگے "دیکھیے تو۔ ہوا یہ کہ ہم دونوں یعنی سردار اور میں چلے بازار کو، پہلے پہنچے فتحپوری، وہاں ہم نے خریدا کرتا اور جو مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ نہ سردار نہ میں! وہاں سے گھبرایا گھبرایا میں آیا چاندنی چوک۔ ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا لیکن دیکھا کہ نہ سردار نہ میں۔۔۔۔۔۔ وہاں سے بھاگا بھاگا آیا کشمیری گیٹ پہ دیکھا کہ نہ سردار نہ میں۔ اسی چکر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ نہ سردار نہ میں!!"

سکندر یہ کہتے جاتے تھے اور ہاتھوں کو نچاتے جاتے تھے۔ اب ان سے کوئی کیا پوچھتا کہ بھئی سردار تو نہیں تھا لیکن آخر یہ میں، کہاں چلا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن سکندر کی زبان پہ تو محاورہ چڑھا تھا کہ نہ آدم نہ آدم زاد۔۔۔۔۔۔ انھیں کون کچھ سمجھا سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔

فسادات کے زمانے میں سکندر دہلی ہی میں تھے لیکن تفصیل سے کچھ نہ جانتے تھے۔ انھیں تو بس یہ معلوم تھا کہ دہلی میں جھگڑا ہو رہا ہے کون کس سے جھگڑ رہا ہے اور کیوں جھگڑ رہا ہے اور جھگڑے میں کس کا پلہ بھاری ہے، ان سب باتوں کا نہ تو سکندر کو دھیان آیا تھا نہ وہ ایسی باتوں پہ دھیان دینے کے قائل تھے۔ انھیں تو صرف یہ بات کھلتی تھی کہ وہ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے ہیں اور گھر پہ پڑا رہنا سکندر کے لیے تقریباً سولی پہ لٹکنے کے برابر ہے۔۔۔۔۔۔ ایک دن اپنے دوست سردار سے بولے "بھئی گھر میں بیٹھے بیٹھے گھبرا گئے ہم تو۔۔۔۔۔ کہیں باہر چلو گھوم پھر آئیں۔"

سردار نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا پھر کہا "آج نہیں ۔۔ کل چلیں گے باہر گھومنے گھامنے۔۔۔۔۔"

"کل ہی سہی" سکندر نے کہا اور بیٹھ رہے۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے دن پھر سکندر نے سردار کو یاد دلایا کہ "بھئی! کل تو تم ٹال گئے۔ آج تو ضرور ہی چلو باہر۔۔۔۔۔۔۔"

سردار نے 'تفریح' کو مزید ٹالنا چاہا۔ بولا "بھئی سکندر میاں!۔۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ بھئی ایسی جلدی کیا ہے۔۔۔۔ ذرا اطمینان ہونے دو پھر چلیں گے گھومنے پھرنے۔"

سکندر بولے "ایسی کیا بے اطمینانی ہے تجھ کو۔۔۔۔۔۔۔ نہ بھائی۔۔۔۔ ہم تو آج ضرور ہی باہر جائیں گے۔"

سردار نے اس احمق کو سمجھانا چاہا۔ "ارے بھائی سکندر میاں! تم سمجھتے نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ گھر سے ابھی کچھ دن تک نہیں نکلنا چاہیے۔۔۔۔۔۔"

"کیوں نہیں نکلنا چاہیے؟" سکندر نے جھنجھلا کے پوچھا۔

سردار نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا "کہہ تو دیا تم سے کہ ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑے دن صبر کر لو، پھر چلیں گے۔"

اب سکندر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جل کے سردار سے بولے "اچھا! اچھا!۔۔۔۔۔ تو یوں کہہ کہ ڈرتا ہے تو ہم سے۔ ارے بھئی! بے مغول میں ڈرتا ہے تو ہم سے۔ چل ہمارے ساتھ۔ ہم تجھے امن دلاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہم سے مت ڈر۔۔۔۔۔۔۔ ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔۔۔۔۔۔"

اسی زمانے میں ایک دن خریداری کے لیے سکندر کہیں باہر گئے تو نو بجے رات تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم سب سخت پریشان

۔۔ ہو اس تھے اور سب بے چینی سے سکندر کا انتظار کر رہے تھے۔ تقریباً نو بجے رات کو وہ ہانپتے کانپتے غصے سے لال پیلے، منہ ہی منہ میں کسی کو برا بھلا کہتے گھر میں داخل ہوئے۔ جب قریب آئے تو یہ کہتے سُنے گئے کہ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ نہتا دیکھ کے حملہ کر بیٹھے۔ ہمارا ہمارے پاس بھی لاٹھی ڈنڈا ہوتا تو پوچھتے ...."

سکندر کو بار بار اپنے نہتے پن کا اور حملہ آور کی غیر شریفانہ حرکت کا تذکرہ کرتے سنا تو سب لوگ گھبرا گئے۔ فسادات کا زمانہ تھا، طرح طرح کے خیالات لوگوں کے دماغ میں آ رہے تھے ..... آخر ایک آدمی نے آگے بڑھ کے پوچھا۔

"کس نے حملہ کیا؟ کون تھا وہ؟"

سکندر غصے سے بولے "ہوتا کون ٹڈو پہ ڈبل کہتے تھے۔"

ایک رات کو سب گھر والے سو رہے تھے کہ سکندر نے اچانک صاحبِ خانہ کی مسہری کے پاس آ کے آواز دی ——

"صاب! صاب!!"

صاحبِ خانہ گھبرا کے اٹھ بیٹھے، بولے "کیا ہے سکندر، خیریت تو ہے؟"

"خیریت کہاں صاب .... وہ سیاپ آئے ہیں!"

"کون صاحب آئے ہیں؟ کیا کوئی مہمان ہیں؟"

"مہمان نہیں صاب! سیاپ آئے ہیں"

"ارے بھئی کون صاحب؟ کیا خاں صاحب آئے ہیں؟"

"جی نہیں صاب۔ خاں صاب نہیں، صرف سیاپ آئے ہیں۔"

گھر کے مالک کو اب غصہ آ چکا تھا۔ بگڑتے ہوئے بولے "آخر صاف صاف کیوں نہیں بتاتا ہے، کون صاحب آئے ہیں؟"

سکندر نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صاف صاف تو بتا رہا ہوں صاب کہ سیاپ آئے ہیں۔"

صاحب نے غصے سے پوچھا "کیا نام ہے ان صاحب کا؟"

"نام؟ نام کیسا؟" سکندر نے حیرت سے پوچھا۔

صاحب اب اٹھ کے بیٹھ گئے تھے اور سکندر کی باتوں پر سخت غصہ ان کو آ رہا تھا۔ آخر انھوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آخر وہ صاحب ہیں کہاں؟"

سکندر آگے بڑھ کے ہولے سے بولے۔

"آدھے بل میں ہیں آدھے باہر ہیں۔"

اچھا بھلا لفظ سکندر کی زبان پر چڑھتا ہے تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ان کو بازار جاتے ہوئے دیکھا تو فرمائش کی کہ کوئی ٹوس ٹوتھ پیسٹ اور یوڈی کلون خریدتے لائیں —— سکندر گھر لوٹے تو بہت خفا تھے، بولے۔

"جانے کہاں کے بے وقوف دکاندار آ گئے ہیں شمشاد بلڈنگ (مارکیٹ) میں —— کوئی بات ہی نہیں سمجھتے ہیں ...."

میں نے پوچھا: "آخر کیا ہوا؟"

بولے: "ہم نے دکاندار سے کہا کہ ذرا کالی داس دے دو تو اس نے ہنسنا شروع کر دیا...... ہمیں بڑا غصہ آیا...... اور ہمارا آ جھگڑا شروع ہو گیا۔ لوگ باگ جمع ہو گئے......"

دوکاندار پوچھنے لگا: "کالی داس ہم کہاں سے لا دیں آپ کو؟"

ہم نے کہا: "کیوں بھئی! کیا گورنمنٹ نے مناہی کر دی ہے کالی داس استعمال کرنے کی؟"

"استعمال و استعمال۔ کیسے کریں گے کالی داس کو؟" دکاندار ہنستے ہنستے بولا: "سکندر میاں! اپنے یہاں تو تیل صابون کنگھا منجن ملتا ہے۔ کالی داس لینا ہے تو راستے میں کالج کی لائبریری پڑتی ہے وہاں جاؤ۔"

سکندر جھنجھلا کے بولے: "کالج کی راے بریلی (لائبریری) میں تو کتابیں رکھی ہیں...... وہاں کالی داس کہاں ملے گا؟"

پھر الماری کی طرف اشارہ کر کے بولے: "ارے کاہے کو وقت خراب کرتا ہے بھئی، وہ دیکھ تیرے پاس ہے تو کالی داس۔ بس یہی چاہیے......"

اور سکندر اس طرح کولی نوس ٹوتھ پیسٹ خرید لائے.........

یوڈی کلون کے سلسلے میں انھوں نے ایک کیمسٹ کی دکان کا انتخاب کیا۔ وہاں جا کے بولے: "ایک شیشی گولی کونین دے دو......"

کیمسٹ نے ایک شیشی انھیں تھما دی۔ سکندر بہت خفا ہو کے بولے۔

"یہ کیا ہے! یہ تو گولیاں ہیں؟"

دکاندار نے کہا: "یہی تو آپ نے مانگی ہیں کونین کی گولیاں!"

سکندر دکاندار کی حماقت پر ہنستے ہنستے بولے: "ارے صاحب! یہ تو وہ گولیاں ہیں...... ملیریا میں کھانے کی --- اور ہمیں تو چاہیے گولی کونین کی شیشی جس میں چھڑکنے والا تیل ہوتا ہے!"

دکاندار نے گولیاں واپس لیں اور ایک بوتل سکندر کو تھما دی۔ بوتل دیکھ کر سکندر چراغ پا ہو گئے۔ چل کے بولے: "بالکل ہی اُلّو سمجھ لیا ہے آپ نے...... یہ کیا تھمائے دے رہے ہیں آپ؟"

دکاندار نے کہا: "یہی چھڑکنے والا تیل ہے۔ فینائل ہے ڈی۔ ڈی۔ ٹی ملی ہوئی ہے اس میں......!"

سکندر خفا ہو کے بولے: "یہ نہیں چاہیے ہم کو......... فنائل اور ڈی۔ ڈی ٹی تو ہم سب سمجھے ہیں...... ہمیں تو گولی کونین چاہیے جو کپڑوں پر بھی چھڑکتے ہیں......"

دکاندار نے عاجز آ کے انھیں فلٹ کا ڈبہ تھما دیا جسے سکندر نے کاؤنٹر پر پھینک دیا اور بولے: "واہ صاحب واہ فلٹ کو ہم نہیں پہچانتے ہیں کیا؟ اس سے تو مکھیاں مرتی ہیں!"

آخر کار دکاندار نے ان سے کہا کہ تم خود اشارہ کر کے بتاؤ کہ کونسی شیشی تمھیں چاہیے --- سکندر نے یوڈی کلون کی شیشی پر ہاتھ رکھ کے بولے: "بس یہی تو ہے گولی کونین کی شیشی...... یہی تو ہمیں چاہیے!"

اور اس طرح بیچارے کیمسٹ کی جان بچی!

پولیس والوں سے سکندر کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا میں ان پر کسی شخص کا یا کسی عہدے کا وہ رعب نہیں پڑتا ہے جو پولیس کی وردی میں ملبوس کسی بھی ایسے سیدھے آدمی کو دیکھ کر ان پر پڑتا ہے۔ ان کے خیال میں پولیس کانسٹیبل ہونا دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کانسٹیبل کو بڑی عزت اور احترام سے دیوان جی کہتے ہیں اور یہ لفظ ان کے منہ میں مصری کی طرح گھل جاتا ہے۔ ایک بار گھر میں ایک صوبے کے گورنر صاحب جن سے گھر والوں کے پرانے مراسم تھے، تشریف لا رہے تھے۔ ان کی آمد کے سلسلے میں ایک دن پہلے گھر کے آس پاس پولیس یا سی۔ آئی ڈی کے آدمی ضابطے کی خانہ پری کے لیے آ جا رہے تھے۔ سکندر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بار بار اس طرح بھاگ بھاگ کے باہر جا رہے تھے اور اس طرح پولیس والوں کی خاطر مدارات کر رہے تھے جیسے اپنی بارات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوں۔ گھر کا سارا کام کاج انھوں نے چھوڑ رکھا تھا اور تمام تر توجہ دیوان جی پہ صرف کر رہے تھے۔ دوسرے دن صبح نو بجے گورنر صاحب تشریف لائے تو سکندر بھی گھر والوں کے آس پاس منڈلاتے دیکھے گئے ان کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس تھا اور وہ انتظار کر رہے تھے کہ جلد سے جلد بھیڑ چھٹے تو وہ باہر نکل سکیں۔ گورنر صاحب نے سکندر کو جو دیکھا تو بڑے تپاک سے آگے بڑھے اور بولے "ارے بھئی سکندر! اچھے تو ہو! آؤ ذرا ہاتھ تو ملاؤ!"

سکندر نے بڑی عجلت میں جواب دیا: "جی ہاں! اچھے ہیں ہم!" اور ہاتھ ملانے کی پیش کش کو انھوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "صاحب.... ذرا راستہ دیجیے....... ہم باہر جائیں گے....... باہر دیوان جی کھڑے ہیں۔ ان کے لیے پانی لے جا رہے ہیں ہم!!"

ایک دفعہ پڑوس میں چوری ہو گئی۔ سکندر کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ لوگ باگ چور کی کھوج میں تھے اور چوری کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ سکندر کو پولیس والوں کا انتظار تھا اور دیوان جی کے آتے ہی انھوں نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ چلا چلا کے چوری کی تفصیل بیان کرنا شروع کی۔

تھانیدار نے مالک مکان سے پوچھا۔

"آپ نے کوئی نیا نوکر رکھا تھا؟"

سکندر آگے بڑھ کے بولے: "ارے دیوان جی! ادھر روز نئے نوکر آتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی دو دن سے زیادہ ٹکتا ہی نہیں۔"

صاحب خانہ نے کہا: "ادھر ایک مہینے سے تو ایک ہی ملازم کام کر رہا ہے۔"

تھانیدار نے پوچھا: "چوری کس کمرے میں ہوئی؟"

صاحب خانہ نے کہا: "ہم لوگ برآمدے میں سو رہے تھے۔ سامان بیڈ روم میں تھا، اسی کمرے میں چوری ہوئی......"

سکندر نے کہا: "اس کے مطلب یہ ہوئے کہ چور برآمدے سے نہیں بلکہ پیچھے کی کھڑکی سے کود کر کمرے میں داخل ہوا...."

تھانیدار نے پوچھا: "آپ لوگوں کو کوئی کھٹکا وغیرہ تو نہیں سنائی دیا تھا؟"

سکندر بولے: "کھٹکا تو ضرور ہی ہوا ہوگا۔ یوں کہیے کہ یہ لوگ بے خبر سو رہے تھے!"

تھانیدار نے کہا: "آپ کا کتا گھر کے اندر تھا کہ باہر؟"

سکندر نے جواب دیا: "کتوں کو تو ایسے موقعوں پہ چور نشہ کھلا دیتے ہیں۔"

تھانیدار نے پوچھا: "گھر کے باہر کی بتی جل رہی تھی کہ نہیں؟"

سکندر نے کہا: "دو ڈھائی بجے رات تک تو جل رہی تھی....... اس کے بعد ہم سو گئے تھے۔ پتہ نہیں کب تک جلی... ویسے چور ایسے موقع پہ پتھر مار کے بلب بھی توڑ دیا کرتے ہیں......"

سب نے ایک ساتھ باہر کی بتی پر نظر ڈالی تو اتفاق سے بلب ٹوٹا ہوا ملا! سکندر نے بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی تفتیش پر بہت خوش نظر آ رہے تھے...... اسی طرح انھوں نے چوری کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف یہ کہ سکندر کو چوری کے بارے میں کچھ معلومات ہیں بلکہ شاید وہ خود اس چوری میں شامل بھی رہے ہیں۔ آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کی ان کو عادت ہے۔ پھر اس دن اتفاق سے دیوان جی بھی کوئی نئے تھے۔ انھوں نے سکندر کو اس طرح بڑھ بڑھ کے بولتے سنا تو انھیں سکندر پر کچھ شبہ ہونے لگا اور انھوں نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ تھانے چلو، وہاں تمھارا بیان قلمبند ہوگا!“ سکندر نے اپنی اس اہمیت پر اور بھی فخر کا اظہار کیا، ادھر مجمع پر نظر ڈالی اور بڑے فخر سے بولے ”تھانے لے جا کے کیا کیجیے گا۔ قلم تو آپ کے پاس ہے ہی اس میں ہمارا بیان بند کر لیجیے!“

دیوان جی ذرا کڑوے مزاج کے تھے اور سکندر کے اس والہانہ عشق سے بھی قطعی ناواقف تھے جو ان کو محکمۂ پولیس کے افراد سے تھا، بگڑ کر بولے ”بک بک مت کرو، سیدھے چلو تھانے...... وہاں تیرا مزاج درست کریں گے۔“

اب سکندر معاملے کی سنگینی تک پہنچ گئے تھے۔ خود بھی بگڑ کے بولے ”معلوم ہوتا ہے نئے نئے آئے ہو دیوان جی —— اس علاقے میں......“

دیوان جی نے کہا ”ہم نئے نئے آئے ہیں کہ نہیں، اس سے تمھیں کیا مطلب......!“

سکندر جھنجھلا کے بولے ”آخر آپ کو ہم پر کیا شبہ ہے؟ ہم چور لگتے ہیں آپ کو؟“ پھر بہت اکڑ کر بولے ”اچھا صاحب —— ہم چور ہیں، ہم نے کی ہے چوری —— اگر اصل نسل دیوان جی ہیں آپ تو نکالیے چوری کا مال ہمارے پاس سے!!“

جس گھر میں چوری ہوئی تھی اس گھر والے اس جھگڑے پر سخت کڑھ رہے تھے۔ ان کا معاملہ جہاں کا تہاں تھا اور ادھر سکندر میاں نے ایک دوسرا جھگڑا اٹھا دیا تھا۔ بات خاصی بڑھنے لگی تھی کہ اچانک پولیس کپتان صاحب کی گاڑی آتی نظر آئی۔ دیوان جی نے آگے بڑھ کے سلیوٹ کیا اور گاڑی کا پٹ کھولا...... کپتان صاحب سکندر کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سکندر ان کو دیکھتے ہی آگے بڑھے اور بولے ”صاحب! یہ کہاں سے دیوان جی پکڑ لائے ہیں آپ نے، انھیں شریف آدمی بھی چور نظر آتے ہیں!“

دیوان جی نے جلدی جلدی مختصر فقروں میں سکندر کے بارے میں بتایا تو کپتان صاحب کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ سکندر کی پوری ہسٹری سے واقف تھے...... انھوں نے سکندر سے کہا ”میاں سکندر تم گھر جاؤ۔ ہمارے لیے چائے بناؤ...... وہیں آکے بات کریں گے!“ اور دیوان جی سے کہنے لگے ”دیوان جی! اس علاقے میں آئے ہوئے آپ کو چار، پانچ مہینے ہو گئے اور اب تک سکندر سے ناواقف ہیں آپ۔ اس طرح کیسے کام چلے گا!“

سکندر فاتحانہ انداز سے جھومتے جھامتے گھر آگئے اور بات آئی گئی ہوئی لیکن اس واقعے سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ آئندہ سے وہ اتنے محتاط رہنے لگے ہیں کہ دیوان جی کی وردی سے بات چیت شروع کرنے سے پہلے ان کا چہرہ مہرہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔

پچھلے سال علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فسادات کی واردات ہوئی تو ہر شریف اور بھلا مانس انسان ان ناخوشگوار واقعات سے اداس اور ہراساں تھا۔ کرفیو لگا تو پریشانی اور بڑھی۔ سارے کام کاج بند ہو گئے تھے، عجیب سی بددلی اور مایوسی فضا پر طاری تھی۔ سکندر نے اس طرح کی خبریں سنیں تو ذرا دیر کچھ سوچتے رہے لیکن جیسے ہی انھیں پتہ چلا کہ شہر اور یونیورسٹی پر پولیس کا پہرہ ہے...... تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ بے حد خوش ہو ہو کے ہر منٹ ایک نئی خبر اس فخر سے سنانے آتے جیسے کسی میلے کی چہل پہل کا ذکر کر رہے ہوں! بار بار اپنی

تا بھی پیدل اٹھتے تھے اور پیچھے کے دروازے سے گھر والوں کی نظر بچا کے نکل جاتے تھے۔

کرفیو کی وجہ سے دو دن ڈاک نہ آئی۔ گھر والوں کو ڈاک کا منتظر دیکھ کر سکندر گھر سے اچانک غائب ہو گئے اور سیدھے سیدھے پوسٹ آفس کی طرف سائیکل دوڑانے لگے۔ راستے میں دو دفعہ کانسٹیبل نے سیٹی دی جسے سکندر نے بہرے ہونے کے کارن سنا نہیں اور آگے بڑھتے گئے۔ ناکہ والے کانسٹیبل نے انھیں ہاتھ دکھا کے روکنا چاہا تو بولے "ہم جلدی میں ہیں ..... ڈاک پہنچانی ہے گھر ..... دیکھتے نہیں ہو دیوان جی "ہم کون ہیں؟" پھر اپنی گاندھی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے بولے "یہ نہیں دیکھتے ہو کیا ہے؟"

دیوان جی نے حیرت اور بیزاری سے پوچھا "یہ کیا ہے؟ ٹوپی ہے!"

بولے "یہ تمھیں صرف ٹوپی لگے ہے؟ ارے بھیا ہم نے تو سنا ہے، جو یہ ٹوپی پہن لیتا ہے وہ حکومت کا آدمی ہو جاتا ہے ......"

دیوان جی کو سکندر کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی اور انھوں نے کہا: "سیدھے سیدھے گھر چلے جاؤ" لیکن سکندر سیدھے پوسٹ آفس پہنچے اور اس بچارے ڈاکیے سے، جو ان دنوں ہمارے محلے کی ڈاک لاتا تھا، بولے "کیوں جی! ڈیوٹی بھی کوئی چیز ہے ...... تین دن سے ڈاک کا انتظار ہو رہا ہے اور تم یوں آرام کر رہے ہو ..... شرم نہ آوے ہے تمھیں!"

ڈاکیے نے کہا: "بھیا سکندر، ہم تو بال بچے والے آدمی ہیں، اپنی جان پیاری ہے ہمیں تو .... مر گئے تو بیوی بچوں کو کون پوچھے گا۔"

سکندر کو بچوں سے قلبی نفرت ہے اس لیے بچوں کے مسئلے کو گول کر گئے لیکن جب گھر آ کے یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ان کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا کہ غالباً ڈاکیے کی بیوی کے مستقبل کی طرف سے کافی مطمئن ہیں!

ڈاکیے سے یہ باتیں کیں اور جتنی ڈاک ان کے ہاتھ لگی سب سمیٹ کے اپنے تھیلے میں رکھی، گھر آئے اور برآمدے کے فرش پر ساری ڈاک پھیلا دی۔ گھر والوں کو ڈاک دے کے پورے محلے کی ڈاک بانٹ آئے۔

یوں تو سکندر اپنی کڑوی زبان کی وجہ سے اکثر دکانداروں وغیرہ کو ناراض کرتے رہتے ہیں لیکن عبدالشکور نامی ایک پھل والے سے ان کی نوک جھونک آئے دن ہوتی رہتی ہے اور سکندر کا گزر جب بھی اس کی دکان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس سے مخاطب ہو کے یہ ضرور کہہ آتے ہیں کہ "تو ٹھہرا ایک لمبر کا بے ایمان ..... ہم تجھ سے بے حد کر کے نفرت کرتے ہیں۔"

کرفیو ختم ہوا اور حالات نارمل ہونے لگے تو سکندر معلومات کی خاطر بازار پہنچے۔ وہاں انھیں بہت سارے جان پہچان والوں کی کمی نظر آئی۔ آگے بڑھے تو دیکھا، عبدالشکور اپنا پھلوں والا ٹھیلا لیے بیچ چوراہے میں کھڑا ہے۔ سکندر ہر چند کہ اس سے خفا رہتے تھے لیکن کچھ حالات کے تحت نرم لہجے میں انھوں نے آگے بڑھ کے پھلوں کی قیمت اس سے پوچھی، اس نے ہمیشہ کی طرح دام دُگنے بتائے ...... اسکندر کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے "ابے تیرا دماغ اب بھی ٹھیک نہیں ہوا ..... لوگ باگ کہتے تھے کہ تیرے جیسے سب مر کھپ گئے ہوں ..... پر تو تو کھڑا ہے ویسا ہی کا ویسا .... تجھ میں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ویسا ہی بے ایمان اور جھوٹا ہے تو، تو ....." پھر کچھ سوچ کے بولے "ٹھہر جا! لگنے دے اب کے کرفیو پھر سے .... اللہ چاہے گا تو ہم ضرور ہی تجھے اپنے "ناپاک ہاتھوں" سے ختم کریں گے۔"

مشکل یہ ہے کہ سکندر بات کی تہہ میں کبھی جاتے ہی نہیں ہیں، نہ ان کو جھگڑے کی نوعیت سے غرض تھی اور نہ محاورے کے غلط استعمال سے!

ایک دن بازار سے لوٹے تو بڑے خوش نظر آئے۔ کچھ مسکراتے جاتے تھے اور خلافِ عادت کام بھی کچھ دل لگا کے کر رہے تھے۔ وہ زمانہ رمضان شریف کا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں روزہ کھولنے کے لیے شام کو سورج غروب ہونے پر سائرن بجایا جاتا ہے۔ گھر والے جب شام کو کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو سکندر بولے "آج نئی دکان بازار میں کھلی ہے۔ بڑی بڑی بڑھیا مٹھائیاں بنتی ہیں وہاں اور صاحب لوگ باگ کہتے ہیں کہ دہی کی لسی تو مشہور ہے وہاں کی۔ ایسی لسی تو سارے شہر میں کوئی نہیں بنا سکتا جیسی یہ حلوائی بناتا ہے!" پوچھا گیا "تم نے بھی چکھی ہے وہ لسی یا یونہی سنائی تعریف کر رہے ہو؟" سکندر بولے "صاحب! کل شام تو ہمارا ارادہ تھا لسی پینے کا لیکن پھر وہ بات کچھ ایسی ہوگئی کہ ارادہ بدلنا پڑا۔"

"کیوں بھئی ایسی کیا بات ہوگئی؟"

بولے "کل شام جب ہم بازار سے سودا خریدنے کے اس حلوائی کی دکان کے سامنے سے گزرے تو سائرن بجنے لگا........ حلوائی نے ہمیں آواز دے کے کہا کہ "بھائی سکندر میاں...... لسی تیار ہے۔ آئیے روزہ کھولتے جائیے۔" ہم نے حلوائی سے کہا "بھائی صاحب! آپ کی لسی کی تعریف تو ہم نے بھی سنی ہے اور آپ کہتے ہیں تو ضرور ہی آپ کی لسی ایک نمبر کی ہوگی۔ ہمارا دل لسی پینے کو بھی چاہ رہا ہے لیکن کیا کریں، ہم بہت مجبور ہیں...... ہم لسی سے روزہ نہیں کھول سکتے ہیں۔ یوں کہ ہمارا تو روزہ ہی نہیں ہے!!"

سکندر کو قدرتی مناظر وغیرہ سے بالکل کوئی دلچسپی نہیں۔ کالی گھٹا، ٹھنڈی ہوا، رنگین شفق، لہریہ دھنک، بہتا ہوا جھرنا، ابھرتا ہوا چاند، چڑیوں کا چہکنا...... یہ سب کچھ انھیں بالکل نہیں بھاتا۔ ایک بار برسات کے موسم میں ان سے کسی نے کہا "سکندر! دیکھو کیا گھٹا چھائی ہے؟" برا سا منہ بنا کر بولے "ہاں ہاں! گھٹا چھائی ہے دیکھ رہے ہیں ہم۔ اب برسنے پہ آوے گی تو مصیبت کھڑی کر دیوے گی۔ ہر طرف کیچڑ ہو جاوے گی پھسل پھسل کے لوگ باگ الگ گریں گے!"

کسی نے کہا "آج چودھویں کا چاند ہے...... کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔" سکندر نے بیزاری سے کہا "سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کم بخت چاند میں کھاص بات کیا ہے جو سب اس کو دیکھیں ہیں...... چالیس سال سے ہم اس کو دیکھتے آ رہے ہیں...... نکلتا ہے...... ڈوبتا ہے...... اس میں آخر کھاص بات کیا ہے!"

ایک بار گرمیوں کی چھٹی میں جبکہ ہم لوگ نینی تال میں تھے۔ بیٹھے بٹھائے پکنک کا پروگرام بن گیا اور کھرپا تال (نینی تال سے چند میل نشیب میں واقع ایک خوبصورت سی وادی) جانا طے ہوا — سکندر کو معلوم ہوا تو بہت بددلی سے انھوں نے پکنک کا سامان تیار کرنا شروع کیا... بہت خفگی سے بولے "سمجھ میں نہیں آتا، یہ بیگم صاحب کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے؟...... اچھا بھلا گھر چھوڑ کر جنگل میں جانے کا پروگرام بنا لیتی ہیں۔ بھلا پوچھو...... اچھی خاصی میز کرسی چھوڑ کے وہاں کوڑے کرکٹ پہ بیٹھ کے کھانا کھائیں گی۔ تال کے گندے پانی سے ہاتھ دھوئیں گی گھاس پہ لیٹیں بیٹھیں گی...... پھر آنے جانے میں جو تھکن ہوگی سو الگ......!!" آخر کار اسی طرح بدبداتے اور بڑبڑاتے ہوئے سکندر ہم لوگوں کے ساتھ کھرپا تال روانہ ہوئے...... جب کافی دیر ہوگئی اور سکندر کا مزاج بدستور بگڑا رہا، تو ہم میں سے کسی نے ان کو خوش کرنے کی خاطر ان سے کہا۔

"ارے سکندر! دیکھو تو کیسا خوبصورت منظر ہے!"

سکندر نے تیوری پر بل ڈال کے کہا "کدھر...... کدھر ہے منظر؟"

کہا گیا "یہ دیکھیو وہ سامنے کتنی خوبصورت پہاڑی ہے....... مویشی کس قدر خوش خوش ادھر ادھر گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ دیکھو چرواہا بھی

ابھی یہ درخت کی شاخ پہ بیٹھا ہے...... سامنے جھرنا بہہ رہا ہے......!"

سکندر نے جھٹ ہی برا منہ بنا کے کہا: "لو صاحب! یہ نیچر ہو گیا۔ اس میں کیا خاص بات ہے...... سامنے ایک اینٹ پتھر کا ٹیلہ ہے اس پہ گھسے پٹے گھاس پھوس ہے ہیں...... ایک گندہ غلیظ کالا سا چھوکرا پیڑ پر اچھل کود رہا ہے اور جو شاخ ٹوٹی ہو اور آ پڑے سے بچہ منہ کے بل جمین پہ دھپ سے گرے گا کہ چودا کے کتنے ہیں اور مرنے کا کیا ہے...... پانی اوپر سے گر رہا ہے تو نیچے گر کر تو آوے ہی ہے۔ سدا سے یہی قاعدہ (قاعدہ) ہے دنیا کا۔ آپ اسے جھرنا بناتے رہیں ہیں۔ اب ہم آپ کو کیا بھرمائیں؟"

سکندر کو قدرتی مناظر کے بعد اگر کسی چیز سے بے حد کر کے "نفرت" ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کہتے ہیں 'صاحب! ہمری سمجھ میں نہیں آتا آخر بچوں سے فائدہ کیا ہے۔ ہر وقت دنگا فساد مچاتے رہتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے ہیں اور ہر وقت ان کی دیکھ بھال الگ کرنا پڑتی ہے۔"

جس گھر میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں جانے سے سکندر ہمیشہ بچتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ بچے بھی سکندر کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کرتے ہیں جیسے کسی جیتے جاگتے انسان سے کیا جاتا ہے۔ گھر اور محلے بھر کے بچے سکندر کو ایک انوکھی مخلوق سمجھتے ہیں اور آئے دن سکندر کو اپنی شرارتوں کا مرکز بناتے رہتے ہیں۔ کبھی موقع پا کر سکندر کی سائیکل گھسیٹتے ہیں، کبھی سکندر کی نظر بچا کے ان کا حقہ چھپا دیتے ہیں، کبھی سکندر کو بے خبر پا کر ان کی ٹوپی جھپٹ لیتے ہیں۔ اس وقت سکندر کا غصہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور وہ معصوم بچوں کی شان میں ایسے ایسے الفاظ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ اگر بچوں کی مائیں سن لیں تو سکندر کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں لیکن بچے ان کی گالیوں سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں اور سکندر کا بھلا بُرا کہنا تو انہیں کسی دلچسپ کھیل کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

میرے بچے سے سکندر عام طور سے خفا رہتے ہیں۔ یہ بچہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہے لیکن سکندر کو دیکھتے ہی اس کی خاموشی اور سنجیدگی یکدم غائب ہو جاتی ہے اور سکندر کو ستانے میں وہ سب سے آگے رہتا ہے...... چنانچہ آئے دن سکندر اور اس بچے کے جھگڑے کا فیصلہ مجھے کرنا پڑتا ہے...... دراصل سکندر اس بچے سے اس کی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی سے خفا رہتے ہیں۔ اس خفگی کے پیچھے ایک قصہ ہے۔ یہ کہ جب بچہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کا تھا تو ایک دن اس کی آیا ایک دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلی گئی۔ مجھے کسی ضروری کام سے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے گھر سے باہر جانا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے سکندر سے کہا کہ وہ میری غیر حاضری میں بچے کے پالنے کے پاس بیٹھے رہیں اور اس کی نگرانی کریں۔ خلافِ عادت سکندر نے حامی بھر لی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد میں لوٹی تو بچے کے کمرے سے سکندر کی باتیں کرنے کی آوازیں سن کے میں دروازے کے باہر ٹھٹک گئی۔ سکندر بچے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھے کہ

"ہم آپ سے اتنی دیر سے بات کر رہے ہیں اور آپ چُپ ہیں...... آخر ماجرا کیا ہے؟ آپ اگر کوشش کریں تو ضرور ہی بول سکتے ہیں۔"

یونہی پڑے پڑے بچہ ہنس دیا تو سکندر کا حوصلہ اور بڑھا اور وہ کہنے لگے:

"جب آپ ہنس سکتے ہیں تو بولنے میں ایسا کون سا زور پڑے گا آپ پہ؟ ہم اتنی دیر سے یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے قید بھگت رہے ہیں اور آپ ہیں کہ چپ چاپ پڑے ہوئے ہیں۔ بس انہی باتوں کی وجہ سے تو ہمیں بچے بے حد کر کے ناپسند ہیں۔"

میں اندر داخل ہوئی تو سکندر اسٹول سے اس طرح تھکے ہارے اٹھے جیسے کوسوں کا سفر کر کے آئے ہیں۔ جماہی لے کے بولے۔

"ارے بی بی! بڑی کڑی ڈیوٹی آج آپ نے ہماری لگا دی...... ہم تو اکیلے بیٹھے بیٹھے عاجز آ گئے۔ عجیب بچہ ہیں یہ بھی...... نہ اپنی

کہیں نہ ہماری سنیں !!" بچہ دو تین سال کا تھا کہ ایک دن میری ایک بزرگ ملنے والی آگئیں .... انھوں نے جیسا کہ بڑوں کا قاعدہ ہے لپٹے بچے کو گلے سے لگایا اور اس کو دعائیں دیتی ہوئی بولیں۔ "ارے بس ایک ہی بچہ ہے؟" میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا تو وہ اور بھی ہمدردی کرنے لگیں "ارے۔ ایک بچہ بھی کوئی بچے میں بچہ ہوتا ہے۔ چار پانچ بچے تو کم از کم گھر میں ہونے ہی چاہئیں۔ بچوں ہی سے تو گھر کی رونق ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ !"

جب وہ اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں تو سکندر بھی چائے پانی وغیرہ لانے کے سلسلے میں کہیں آس پاس بھٹک رہے تھے اور ہماری بات چیت سنتے جاتے تھے۔ ان بیوی کے جانے کے بعد سکندر میرے سامنے آ کے کھڑے ہوئے اور بولے "بھیجئے اور سنئے .... کہے جا رہی تھیں کہ بس ایک ہی بچہ ہے .... ارے صاحب ایک بچے نے تو آفت مچا رکھی ہے اور جو "کاس کھدا نخواستہ" دو ایک اور ہوتے تو بچے قیامت آجاتی' اس گھر میں تو .... یہ تو ایک بھی بھاری ہے سو بچوں پہ !" میں تو خیر سکندر کے انداز گفتگو سے واقف تھی اس لیے مجھے تو بڑا لطف آیا' ان کی اس بات سے' لیکن بچے کی دادی اور نانی نے اس دن سکندر کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔

سکندر کو اپنی زندگی میں صرف ایک چھوٹی سی بچی سے قدرے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی بھی ایک داستان ہے۔ ہمارے گھر میں تین پشتوں سے ملازموں کا ایک خاندان رہتا ہے۔ ایک ملازمہ ہے جس کی نانی کو میری نانی نے قحط کے زمانے میں خرید کے پالا تھا۔ اس کی بیٹی کو میری والدہ نے پالا پوسا اور اس کی شادی کر دی۔ یہ شادی ایسی مبارک ثابت ہوئی اور اولاد کا ایسا سلسلہ بندھا کہ ہمارے گھر میں گھر والے کم اور اس ملازمہ کا خاندان زیادہ نظر آنے لگا۔ اس کا شوہر بڑا نکما اور کام چور تھا۔

سکندر جس دن ہمارے وہاں نوکری کرنے کی نیت سے آئے تھے تو بس ایک ماہ پہلے ہی اس ملازمہ کی شادی ہوئی تھی۔ سکندر کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ وہ ایک ماہ لیٹ ہو گئے ورنہ صغریٰ (ملازمہ کا نام) کا بیاہ انہی سے ہوتا۔

اتفاق کی بات ہے جب ۴۳-۱۹۴۲ء میں لڑائی کا عروج تھا' ایک دن صغریٰ کا کوئی طعنہ سن کر اس کا شوہر "مبارک" فوج میں بھرتی ہو گیا اور اچانک لام پر چلا گیا .... کچھ عرصے تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر دو تین مہینے تک جب اس نے صغریٰ کو کچھ رقم بھی خرچ کی ......! تو صغریٰ بہت فخر محسوس کرنے لگیں اور سکندر کو اور بھی زیادہ حقیر سمجھنے لگیں کہ سکندر تو ایک معمولی گھریلو ملازم ہی تھے اور اس کا شوہر ایک مانا ہوا فوجی تھا۔ آئے دن سکندر اور صغریٰ کی جھڑپ ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو جب گھر والے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک ایک پولیس کانسٹیبل ایک سرکاری نوٹس لے کے آیا جس پر درج تھا کہ۔

"مبارک خاں مرحوم کے بال بچوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ لام پہ کام آگئے" وغیرہ وغیرہ !

اتفاق سے وہ نوٹس سکندر کے ہاتھ میں پڑا۔ بجائے افسوس کرنے کے وہ بڑے فخر اور خوشی سے گھر میں داخل ہوئے اور صغریٰ سے مخاطب ہو کے بولے "لو بڑا ہر وقت فوج' فوج کرتی رہتی تھیں .... اب دیکھ لو ہو گئے نا مبارک خاں بھی "مرہوم" (مرحوم) !!"

صغریٰ بیچاری پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سے بچے سہم کے رہ گئے۔ سارے گھر والے صغریٰ کو دلاسہ دینے لگے .... کئی دن تک گھر پہ بڑا سوگ طاری رہا۔ دھیرے دھیرے لوگ باگ اس واقعے کو بھولنے لگے۔ صغریٰ غریب ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اس نے چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ سفید کپڑے پہننے لگی تھی اور خود کو بیوہ کے روپ میں اس نے ڈھال لیا تھا۔

صغریٰ کی سب سے چھوٹی بیٹی افسری اس وقت ڈھائی تین سال کی تھی۔ بڑی تندرست اور سرخ ٹماٹر سی بچی تھی۔ توتلا توتلا کے بولتی تھی اور بڑی بھولی بھالی نظر آتی تھی۔ سکندر بھی صغریٰ کو دم دلاسہ دیتے رہتے تھے لیکن صغریٰ ان کا نوٹس ہی نہ لیتی تھی۔ آخر سوچ بچار کے بعد سکندر نے ایک ترکیب

نالی، افسری پر وہ بہت توجہ صرف کرنے لگے۔ اس کو بڑے چاؤ سے "بچی" کہتے تھے اور اس کے سبب پھل مٹھائی وغیرہ بھی دینے کے آنے ے۔ دھیرے دھیرے افسری بھی ان سے مانوس ہو چلی......

ہم لوگوں کو بڑی حیرت تھی کہ آخر سکندر نے کسی بچے سے کیونکر سمجھوتہ کرلیا ہے۔ ایک دن میرا گزر باورچی خانے کی طرف ہوا تو سکندر کی آواز سن کے میں ذرا کی ذرا باہر ہی رک گئی...... سکندر کے ہات میں ایک کاغذ کی پڑیا تھی۔ اس میں دو لڈو تھے۔ سامنے لڈو پہ نظریں جمائے افسری بیٹھی تھی اور بار بار اس طرح زبان ہونٹوں پہ پھیر رہی تھی جیسے بھوکی بلی طشتری کے دودھ کی طرف دیکھتی ہے...

سکندر بولے: "بیٹا! لڈو کھائے گی؟"

افسری نے آگے بڑھ کے زور سے گردن ہلائی اور ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

سکندر بولے: "ہم یہ لڈو تیرے ہی لیے لاتے ہیں!...... لیکن..... ایسے نہیں دیں گے...... بس ایک بار تو ہم کو ابا کہہ دے۔ یہ لڈو تیرے ہیں!"

صرف اتنی سی بات کہنے میں بچی کا کیا نقصان تھا اگر مٹھائی پانے کی یہی شرط تھی تو وہ سکندر تو کیا لڈو تک کو ابا کہنے پر تیار تھی...... اس نے آگے بڑھ کے پڑیا سکندر سے چھینتے ہوئے کہا: "ابا لڈو دے دے!" سکندر خوشی سے کھل اٹھے۔ اپنے ٹیڑھے میڑھے سارے دانت باہر نکال دیے انھوں نے اور لڈو بچی کے حوالے کر دیے۔ بچی پڑیا لیتے ہی اچک کے سکندر کی پہنچ سے دور ہوگئی اور ایک کونے میں کھڑی ہوکے زور زور سے کہنے لگی: "تو ابا نہیں ہے۔ تو تو چھکندر ہے چھکندر...... چھکندر چھکندر......"

سکندر غصے سے بے حال ہوکے آگے بڑھے کہ میں اندر داخل ہوگئی۔ سکندر مجھے دیکھ کر پانی کے بلبلے کی مانند ایکدم بیٹھ گئے...... اور حقہ گڑگڑانے لگے!!

اسی زمانے میں عید کا تہوار آگیا۔ افسری کے اس واقعہ کے بعد بھی سکندر مایوس نہیں ہوئے تھے اور اپنی سی کوشش میں لگے رہتے تھے اور سفری کے جھڑکنے پھٹکارنے کے باوجود وہ سفری کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔

عید کے دن صبح ہی سے سفری نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ بالوں میں دھول ڈال لی اور اپنے شوہر کی ہر اس خوبی کو یاد کر کر کے رونے لگی جو اس بچارے مرے ہوئے آدمی پہ سراسر بہتان تھا۔ سکندر صبح صبح چھٹی لے کر عید کی نماز پڑھنے گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو مردانے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے کورے کورے کھڑکھڑاتے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ نیا جوتا چوں چوں کرتا ہوا ان کے پاؤں کاٹ رہا تھا۔ سر پہ ترچھی ہوئی ٹوپی تھی۔ ہات میں ایک دونا تھا اس میں افسری کے لیے گرما گرم مٹھائی تھی......

سکندر بلاوجہ ہنستے ہوئے ایک دروازے سے گھر میں داخل ہوئے اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ان کے بالکل سامنے والے زنانے دروازے سے سفری کا شوہر مبارک اپنی خاکی وردی پہنے داخل ہوا۔

سفری تو خوشی سے چیخ مار کے اس کی طرف دوڑی...... لیکن سکندر کے ہاتھوں سے مٹھائی کا دونا چھوٹ پڑا۔ ان کا رنگ فق ہوگیا اور وہ دانت جھاڑ کے اس طرح ہکا بکا کھڑے ہوگئے جیسے انھوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب سکندر کے ہوش و حواس بجا ہونے لگے تو وہ بھی مبارک کی طرف بڑھے وہاں افسری کھڑی تھی۔ سکندر نے بچی پر کڑی نظریں ڈالتے ہوئے کہا: "اری چڑیل! کیوں راستہ گھیرے کھڑی ہے...... چل دور ہٹ..... ادھر سے کاٹے کو پھنک رہی ہے!"

اور مبارک سے بڑے اداس لہجے میں انھوں نے صرف اتنا کہا کہ "یہاں تو گھبرا گئی تھی کہ کہیں خدانخواستہ آپ ہو گئے "مرحوم" ..... لیکن اب ہم آپ کو کیا پھر پائیں!"

مبارک کو ایک مہینے کی چھٹی ملی تھی۔ وہ کسی فوجی کنٹین میں بیرا ہو گیا تھا لیکن لڑائی اور فوج کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتا تھا کہ سکندر دنگ رہ جاتے تھے اور ایک دن جب مبارک نے سکندر کو یہ واقعہ سنایا کہ "فوج کا بھی عجیب حال ہے سکندر بھائی ..... وہاں تو ہر بات ہی کا ڈھنگ الگ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ایک چیز کہلاتی ہے پیراشوٹ!"

سکندر ٹھٹکتے ہوئے بولے "ہاں ہاں! ہم جانتے ہیں اسے وہ ہوائی جہاز سے اترنے کی چھتری ہوتی ہے!"

مبارک نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا "ایک دفعہ کیا ہوا سکندر بھائی ..... کہ ہمارا جہاز سنگاپور کے اوپر اڑ رہا تھا ..... کچھ خطرہ دیکھ کے ہمارے افسر نے حکم دیا کہ فوراً اپنی اپنی چھتریاں کھولو اور نیچے اتر پڑو۔ ہم لوگ جلدی جلدی چھتری کھول کے نیچے اتر پڑے ..... سنگاپور بھی بڑا خوبصورت شہر نظر آیا۔ بڑی رونق تھی وہاں، ہم نے سوچا ذرا دو ایک دن گھوم پھر لیں یہاں، کہ بس اچانک افسر نے پھر حکم دیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے اور واپس اڑ جاؤ اپنی ڈیوٹی پر۔"

سکندر نے مبارک کی زبانی فوج کا اتنا حال سنا کہ وہ خود بھی فوج میں بھرتی ہونے کی سوچنے لگے۔ پہلے تو انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا ..... پھر دوسرے نوکروں سے ذکر کیا ہوتے ہوتے گھر والوں تک سکندر کے فوج میں بھرتی ہونے کے فیصلے کی خبر پہنچی! شروع شروع میں تو سب لوگ سکندر کا اس سلسلے میں مذاق اڑاتے رہے لیکن چند دن بعد جب معلوم ہوا کہ سکندر واقعی بہت سنجیدہ ہیں اور اکثر صبح شام وہ گھر سے غائب رہنے لگے اور ہر روز علی گڑھ کے اس پرانے قلعے میں جانے لگے جہاں اس زمانے میں ادھر ادھر سے بٹور کے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے اور وہاں ان کو فوجی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ فوجیوں کی وردی سے وہ بہت مرعوب تھے اور صبح کے وقت جب سڑک پر سے فوجیوں کے ٹرک گزرتے تھے تو سکندر بڑی حسرت سے ان کو دیکھتے تھے۔

ہم لوگ ہر وقت ان کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ فوج کی زندگی اور اس کی پابندی سکندر کے بس کی چیز نہیں لیکن ایک دن سکندر کہیں سے ایک فارم بھروا لائے اور انھوں نے گھر آ کے اطلاع دی کہ اب تو ان کو خوشی خوشی فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دے دی جائے ورنہ وہ خود ہی غائب ہو جائیں گے۔ نوبت یہاں تک پہنچی تو مجبوراً انھیں اجازت دے دی گئی بلکہ ایک ملاقاتی کپتان پولیس سے سکندر کی بہادری، ہمت اور دلیری کی بھی بڑی تعریف کر دی گئی اور سکندر کو بڑی عزت سے رخصت کیا گیا۔

آٹھ دس دن تک سکندر کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایک دن کسی بچے نے بتایا کہ وہ فوجیوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہوئے شمشاد بلڈنگ (یونیورسٹی کی مارکیٹ) میں دیکھے گئے ہیں۔ اسی شام کو سکندر جب ہم لوگوں سے ملنے گھر آئے تو فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ کسی بڑے جسیم فوجی کی وردی انھیں دے دی گئی تھی لہٰذا سکندر تو برائے نام نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف وردی ہی وردی نظر آتی تھی۔ سکندر نے آتے ہی ہم لوگوں کو فوجی سلام کیا اور بڑے فخر سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ باورچی نظر آیا تو اس سے بولے "جا بھئی جا تو چولہا جھونک، یہاں کیا کر رہا ہے کھڑا کھڑا!"

کسی نے ان سے پوچھا "کیوں بھئی سکندر! فوج میں بھرتی ہو گئے تم، اب تو خوش ہو؟"

سکندر ہنس کے بولے "جی ہاں! بہت خوش ہیں اب تو ہم!"

"کیسی لگ رہی ہے فوج کی زندگی تمھیں؟" میں نے پوچھا۔

بولے "اور تو سب ٹھیک ہے بی بی........ بس ذرا جوتے کی مشکل ہے!"

"جوتے کی مشکل! کیا مطلب ہے بھئی؟"

"وہ صاحب بات یہ ہے کہ فوج میں ہمارے سائز کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وردی ہے تو ــــ جوتا ہے تو ــــ سب یا تو ہمارے ناپ سے بڑے ہیں یا چھوٹے........ اب یہی دیکھئے نا......" یہ کہتے ہوئے سکندر نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے ایک پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے آگے ٹھیل دیا اور بولے "یہ جوتا ہے؟ اس کو جوتا کہیں ہیں؟ ارے صاحب! خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈھائی ڈھائی سیر اس ایک کا وزن ہے........ نیچے یہ بڑی بڑی کیلیں الگ جڑی ہیں۔ پھر بڑے سائز کا ہے تو بار بار ہمارا پاؤں اس میں سے نکلے ہے!؟ اور صاحب! حکم یہ ہے کہ دن بھر یہی وردی پہنے رہو اور رسالے میں ہر دم یہی جوتا چڑھا رہے...... کسی وقت دل چاہے کہ اپنا کرتا پاجامہ پہن کے چپل پاؤں میں ڈال کے گھومیں تو صاحب اجازت نہیں ہے! جمعدار جی بڑے کڑوے مزاج کے ہیں۔ ہر بات پہ گالی دے بیٹھتے ہیں۔ کل ہم جرا دیر کو دوپہر میں کمر سیدھی کرنے کو لیٹ رہے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھے آ کے ایک ہنٹر جڑ دیا انھوں نے! پھر بولے "چل سیدھے سے پریڈ ہو رہی ہے۔"

"ابھی سویرے اٹھتے ہیں تو نہ ہمیں وقت دیتے منہ ہاتھ دھونے کا...... چار بجے تھے چائے تک تو پینے کو ملی نہیں تھی، فوراً کھڑا کر دیا لے جا کر ہمیں لین ڈوری میں! اور ڈانٹ ڈانٹ کے کہنے لگے کہ "دایاں ــ" "بایاں ــ" "دایاں ــ" "بایاں ــ" اب صاحب تو ہمیں معلوم تھا کہ فوج میں ٹانگوں کو دایاں اور بایاں کہتے ہیں لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ دایاں کون سا پاؤں ہے اور بایاں کون سا ہے۔ اب جانے کیا پھیر پڑ جاتا تھا کہ جب جمعدار جی کہیں بایاں تو ہمارا شاید "دایاں" پاؤں اٹھ جاتا تھا اور جب وہ پکاریں "دایاں" تو ہمارا "بایاں" پاؤں بڑھ جاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پیچھے جو "رنگروٹ" تھا وہ ہمیں دیکھ دیکھ کر پاؤں بڑھاتا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی اس کے پیچھے والا بھی ایسا کرتا تھا۔ بس صاحب! قواعد میں جھگڑا پڑ گیا اور جمعدار جی ہماری جان کو آ گئے اور آگے بڑھ کے انھوں نے ہمیں اپنے بوٹ سے ٹھوکر ماری........ اور صاحب! بوٹ بھی کیسا بوٹ........ کہ پانچ سیر وزن اس کا...... ہم نے اس مصیبت سے جان بچانے کے لیے جمعدار جی سے کہا کہ ہمیں بیچ میں کھڑا کرنے کی بجائے سب سے آگے کھڑا کریں۔ جب ہی معاملہ ٹھیک ہو گا۔ وہ مان گئے اور ہمیں اس سے آگے کھڑا کر دیا اور لگے ڈانٹنے پکارنے کہ "دایاں...... بایاں ــــ دایاں...... بایاں......" پھر صاحب! ہم جلدی جلدی پاؤں آگے پھینکنے لگے کہ انھوں نے بیچ کے پریڈ ہی رکوا دی اور ہمیں گالیاں دینے لگے کہ پوری لائن ہی بگڑ گئی ہے اب کے تو لالو کیا کہیں صاحب...... اس دائیں.... بائیں نے بڑی مصیبت کر دی ہے ہماری!"

اس دن تو سکندر چلے گئے، تیسرے دن آئے تو بہت بجھے ہوئے تھے۔ وردی بھی میلی ہو چکی تھی اور سکندر کے چہرے پر ایسی کمزوری تھی جیسے کسی بیمار کے چہرے پر ہوتی ہے۔ کمرے کے نیچے بیٹھ گئے اور بولے "ہائے ارے صاحب! ہم باز آ گئے اس فوج سے...... کسی طرح ہماری جان نکل جائے اس سے...... ہم تو بڑی مصیبت میں پھنس گئے!"

"کیوں بھئی کیا ہوا آخر؟"

سکندر اداسی سے بولے "ایک بات ہو تو کہیں صاحب! وہاں تو ہر بات ہی اوندھی ہے۔ ابھی دایاں بایاں ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کل ناشتے پہ جھگڑا ہو گیا۔ صبح صبح جو ملیدہ ہمیں کھانے کو ملا وہ ایسا تھا جیسا یہاں ہماری بھینس کو دیا جاتا ہے! جب ہم نے کہا کہ "یہ خدا آدمیوں کے

کھانے کی ہے؟ تو جمعدار جی ہم پر برس پڑے کہ فوج میں بھرتی ہوا ہے کہ بادشاہی تخت پر بیٹھا ہے۔ کل جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے جمعدار جی سے کہا: "آج تو ہم نہائیں گے، مسجد جائیں گے نماز پڑھنے اور شام کو برچھی بہادر صاحب کے مزار پہ قوالی سننے جائیں گے تو جمعدار جی نے ایک موٹی سی گالی ہمیں دی اور کہا کہ کیا پاگل خانے سے نکل کے آیا ہے؟ یہ فوج ہے کہ راج محل .... ! ہم پرسوں شام کو یونہی ذرا بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھیوں کو مارگیٹ والی بلا باؤ کا قصہ سنانے لگے کہ کیسی آن بان والی عورت ہیں وہ اور کیسے کوکین پھروشی کرتے ہوئے پکڑی گئیں اور کیسے چھ مہینے کی جیل کاٹ کے آئیں اور کیا گلا پایا انھوں نے۔ صاحب بس اتنی جرا سی بات پر جمعدار جی نے آ کے شور مچا دیا۔ گالیاں دیں۔ ایک بید بھی مارا اور بولے "اسے تو یہاں ہمارے فوجیوں کو بگاڑ رہا ہے۔ تجھے کس نے یہاں بھرتی ہونے کو بھیج دیا۔ تو تو جا کے سیدھے سیدھے کسی کوٹھے پہ طبلہ تھاپ !!"

آج صبح کہنے لگے کہ "حکم آ گیا ہے تیار رہو بس چار پانچ ہی دن میں کوچ کرنا ہوگا......"

ہم نے جمعدار جی سے پوچھا: "جمعدار جی! کہاں جانا ہوگا؟"

بس صاحب اتنی سی بات پر بگڑ گئے۔ بولے "تجھے کیا — کہاں جانا ہے .... ارے جہاں بھیجنا ہوگا وہاں بھیج دیے جاؤ گے!!"

ہم نے کہا "ہم یہ کیسے مان لیں جمعدار جی ...... ہم بھی بھلا کوئی مرغی ہیں کہ انڈے ہیں کہ جہاں چاہا بھیج دیا۔ جب تک بتاؤ گے نہیں ہم تو کھسکنے کے نہیں یہاں سے ...."

لوگ ہنسنے لگے تو جمعدار جی نے ہمیں پھر گالی دی اور بولے "بکواس مت کرو .... سیدھے سیدھے جانے کی تیاری کر لو......"

ہم بھی اڑ گئے صاحب کہ ایسا قاعدہ نہ سنا نہ دیکھا، آدمی جہاں جاتا ہے وہاں کا کچھ نام پتہ ہوتا ہے .... ٹکٹ ہوتا ہے ..... یہ کیا کہ بس حکم دے دیا کہ چلنا ہے .... ارے بھئی کہاں چلنا ہے؟ یہ تو بتا دو .... لیکن صاحب فوج کی تو کوئی بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جمعدار جی کو نہ بتانا تھا نہ بتایا انھوں نے کہ کہاں جانا ہے؟ جب ہم نے ان سے کہا کہ ہم اپنے رشتے داروں کو کہاں کا پتہ دیں تو انھوں نے کہا کہ تمھارا لمبر لکھ کے دے دیا جائے گا ان کو — اسی سے کھط کتابت ہو سکتی ہے۔

اب صاحب ہم کوئی چور ہیں، اچکے ہیں، جھوٹے ہیں کہ لونڈے ہیں جو ہمارا لمبر ہوگا....... پر صاحب وہ تو اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔" اسی طرح سکندر میاں دس پندرہ دن تک ہر دوسرے تیسرے دن آ کے اپنا دکھڑا سناتے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ ان کی درگت سے خوش ہوتے تھے لیکن آخر میں جب ان کی حالت واقعی بہت تباہ ہو گئی تو بڑی کوششوں، طرح طرح کی سفارشوں اور میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کروا کے ان کو فوج سے چھٹکارا دلوایا گیا —

سکندر فوج کے ذکر سے اب بہت بیزار ہو چکے ہیں — اور اس طرح ہندوستان کی فوج وطن کے اس سپاہی یعنی سکندر جیسے سورما کی خدمات سے محروم ہو گئی —

سکندر فوج سے لوٹے تو کچھ دنوں بہت دل لگا کے کام کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے کام کاج میں پھر ڈھیل دینے لگے اور ایک دن کسی کام سے بازار گئے تو ایک گھنٹے کے بجائے چار گھنٹے میں گھر لوٹے۔ گھر میں اس دن کوئی دعوت وغیرہ تھی۔ مہمان آ چکے تھے مگر سکندر کا کوئی پتہ نہ تھا اور کھانے پینے کی وہ چیزیں بھی غائب تھیں جنھیں لینے سکندر بازار گئے تھے۔ گھر کی مالکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں اور مہمانوں کو طرح طرح کی باتوں میں مشغول رکھ رہی تھیں کہ خدا خدا کر کے میاں سکندر لدے پھندے اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہوئے۔ موقع ایسا تھا کہاں سے

پولہ نہیں جا سکتا تھا — جب مہمان وغیرہ چلے گئے تو مالکن نے سکندر پر غصہ اتارتے ہوئے کہا — "میں نے طے کر لیا ہے کہ آج کے بعد سے تم سے بازار کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ تم نہایت کام چور آدمی ہو اور کسی ڈھنگ کے کام کی تم سے توقع رکھنا انتہائی حماقت ہے۔ تم تو بس باربھاری (بوجھ ڈھونا) کے قابل ہو!"

باربرداری کا لفظ سن کے سکندر کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور وہ بہت جھنجھلا کے بولے "لو صاحب اور سنو! چوبیس سال سے ہم رات دن سب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہر دم ہر گھڑی اس گھر کی "بھلائی" میں لگے رہتے ہیں اور آپ کہتی ہیں کہ ہم بربادی کر رہے ہیں اس گھر کی! یہی بات ہے تو لیجئے اپنا گھر سنبھالیے ہم تو جاتے ہیں......."

مالکن بھی اس دن غصے میں تھیں اس لیے فوراً ہی کہہ بیٹھیں "تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا ہمارے گھر کا کام تمہارے بغیر چل نہیں سکتا۔ تم ایک منٹ میں یہاں سے جا سکتے ہو اور آئندہ اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھنا........!"

سکندر بھی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ سیدھے اپنی کوٹھڑی میں پہنچے اور اپنا سامان وغیرہ باندھنے لگے اور مالی سے انھوں نے ایک رکشا لانے کے لیے کہا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا — !! علی گڑھ میں اس زمانے میں نمائش ہو رہی تھی۔ سکندر کو ڈانٹ پھٹکار کر سب گھر والے نمائش دیکھنے چلے گئے — اتفاق سے اس دن وہاں بہت رات ہو گئی جب ہم لوگ گھر لوٹے تو دیکھا کہ سکندر صحن کے بیچوں بیچ پتھر کی چبوتری پر بیٹھے ہیں اور اپنا مفلر سر سے لپیٹے ہوئے سردی سے کانپ رہے ہیں اور ان کا سامان ان کے پاس رکھا ہوا ہے...... ہم لوگوں کو دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن تیور بتا رہے تھے کہ اب تک گھر والوں کی طرف سے دل صاف نہیں ہوا ہے....... مالکن نے ان کو دیکھا تو بولیں۔

"کیوں؟ گئے نہیں تم اب تک؟"

سکندر غصے میں کانپتے ہوئے بولے۔

"جانے کو کیا ہوا؟ کیا ہم جا نہیں سکتے؟ کیا ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟ کیا ریل گاڑیاں بند ہو گئیں ہیں جو ہم جا نہیں سکتے!"

کسی نے پھر سکندر کو چھیڑا۔ "پھر گئے کیوں نہیں آخر؟"

اب سکندر آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ گرج کے بولے۔

"آپ لوگوں کا کیا ہے....... وقت دیکھتے ہیں نہ موسم...... بس سب کو تفریح کی پڑی رہتی ہے۔ سب کے سب چل دیے نمائش دیکھنے...... اور جو کاس کھدا نہ کھاستہ ہم بھی چلے جاتے اور ہمارا گھر کوئی لوٹ لے جاتا...... تو...... آپ لوگوں کا کیا جاتا.......!!"

یہ فقرے سن کے ہم سب کے سر شرمندگی سے جھک گئے اور خاموشی سے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مالکن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے سکندر کو ڈانٹ کے کہا۔

"کیوں سردی میں کھڑا کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ باورچی خانے میں جا کے کچھ کھا پی اور اپنی کوٹھڑی میں جا کے مر۔ یہاں کیوں ہماری صورت پر سوار ہے۔ بیمار ہو جائے گا تو گھر کا کام کون کرے گا؟ کام چور کہیں کا!!"

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے سکندر کے وطن سے ان کے نام ایک خط آیا — سکندر کو اپنی ڈاک کا بہت انتظار رہتا ہے اور ہفتے دس دن میں ان کے نام ضرور ایک نہ ایک خط ان کے گھر سے آ جاتا ہے...... عجیب بات یہ ہے کہ چوبیس سال کی مدت میں ان کے

نام جتنے خط آئے ہیں ان سب کا مضمون تقریباً یکساں ہوتا ہے، صرف بھیجنے والے کے نام میں کبھی کبھی فرق ہو جاتا ہے...... ہر خط میں سکندر سے کوئی نہ کوئی فرمائش یا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی کا قرضہ چکانا لکھا ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاج کے لیے رقم درکار رہتی ہے۔ گھر کی مرمت کے لیے پچاس ساٹھ روپیوں کا سوال ہوتا ہے۔ آج تک ان میں سے کوئی سکندر کے کام نہیں آیا ہے۔ کسی نے سکندر کی کبھی کوئی مدد نہیں کی۔ سکندر کو وطن جانے پر کسی نے مہمان نہیں رکھا بلکہ الٹا سکندر سے پیسے لے لے کے گھر کا خرچ چلایا ہے......

اک سکندر ہیں کہ سب پر جان چھڑکتے رہتے ہیں۔ ہر سال محرم کے زمانے میں دس دن کی چھٹی لے کے اپنے وطن بدایوں جاتے ہیں اور جو کچھ بھی جمع پونجی، قرض لی گئی رقم یا پیشگی تنخواہ ہوتی ہے سب اپنے ان خود رو رشتے داروں پر خرچ کر آتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو بہت برا مانتے ہیں اور کہتے ہیں: "صاحب! ہم تو اپنے 'ماں باپوں' کو چھوڑیں گے نہیں!"

یہ ماں اور باپوں کا لطیفہ بھی کم دلچسپ اور عبرتناک نہیں۔ سنا ہے جب سکندر پیدا ہوئے تو ان کے ماں باپ دونوں زندہ تھے۔ کچھ عرصے کے بعد سکندر کی ماں کا انتقال ہو گیا اور ان کے باپ نے کسی عورت سے شادی کر لی جسے سکندر ماں کہنے لگے...... عجیب اتفاق کہ آٹھ دس سال کے بعد سکندر کے والد بھی چل بسے اور اس عورت نے کسی اور آدمی سے شادی کر لی...... اور سکندر اس آدمی کو باپ کہنے لگے! لاکھ لاکھ سمجھاؤ کہ بھئی تمہارے لیے یہ عورت اور مرد دونوں قطعاً اجنبی ہیں لیکن سکندر کسی طرح یہ ماننے پہ تیار نہیں ہوتے ہیں کہ ان کے "ماں باپوں" میں کوئی گڑبڑ ہے...... ان دونوں ماں باپوں نے بھی سکندر کو لوٹنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ سکندر کی پوری کمائی انہی کے حصے میں آتی ہے..!

ایک دفعہ میں نے سکندر کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ تمہارے یہ سارے رشتے دار بڑے خود غرض اور لٹیرے قسم کے ہیں۔ اپنی تمام ضرورتیں تم سے پوری کرا لیتے ہیں اور تمہاری شادی تک کہیں نہیں کراتے ہیں...... چونکہ شادی کا ذکر آ پڑا تھا لہٰذا سکندر کے دل کو یہ بات لگ گئی اور انھوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے کے اپنے گھر جانے کی ٹھانی اور ہم لوگوں سے کہہ گئے کہ اب کی بار تو ضرور ہی وہ شادی کر کے اور "ای کو "ساتھ لے کے لوٹیں گے!! جب ایک ہفتہ گزر گیا اور سکندر نہیں لوٹے تو سب کو بڑی فکر ہوئی کہ آخر ہوا کیا، سکندر تو اس معاملے میں بڑی پابندی کے قائل تھے، چھٹی ختم ہونے پر ایک دن بھی زیادہ وہ کہیں نہیں رکتے تھے —— آٹھویں دن سکندر کا ایک ہم وطن چپراسی آیا اور اس نے ایک لفافہ دیا جو سکندر نے اس کو دیا تھا کہ گھر جا کے مالکن کو دے آئے۔

خط کھولا گیا تو اس میں درج تھا:

"بیگم صاحب —— ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہم وقت پر گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں کہ آپ کی دعا سے ہمارے 'ماں باپوں' نے یہاں ایک جگہ ہمارے 'رشتے' کی بات چیت چلا رکھی ہے —— آج لڑکی والوں نے ہم کو اپنے گھر بلایا ہے، دیکھنے کو —— ہم خود بھی چاہتے ہیں کہ اس دفعہ یہ ہماری شادی کا رگڑا (جھگڑا) جڑ سے ختم ہو جائے۔ ہم اپنے دوست کے ہاتوں یہ گستی (دستی) خط بھجوا رہے ہیں!"

اس خط کے چوتھے دن سکندر بے حد خوش و خرم گھر میں داخل ہوئے...... سب گھر والوں نے ان کو گھیر لیا، یہ سوچ کر کہ سکندر بیاہ کر آئے ہیں......

کسی نے پوچھا: "کیوں سکندر آ گئے؟"

بولے: "آں ہاں! ہم آ گئے۔"

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کے پوچھا: "تمھاری شادی ہو گئی سکندر؟"

سکندر نے جذبات سے خالی لہجے میں جواب دیا: "نہیں ...... شادی تو نہیں ہوئی ہماری!"

"ارے ...... رے ...... رے اس بار بھی تم کنوارے کے کنوارے لوٹ آئے ...... بھئی تم نے تو اپنے کسی خط میں لکھا تھا کہ تم یہ دکھوا کو جا رہے ہو!"

سکندر نے اطمینان سے پتھر پہ بیٹھتے ہوئے کہا: "بات ذرا لمبی ہے ...... بیگم صاحب ...... فرصت سے سنائیں گے ہم اس قصّے کو۔"

لیکن ایسا دلچسپ قصّہ سننے کے لیے فرصت کا انتظار کسے تھا، سب لوگ سکندر سے اصرار کرنے لگے کہ پورا پورا حال ابھی سنا دیں۔

سکندر بھی اب قصّہ سنانے کے موڈ میں آ چکے تھے۔ کہنے لگے: "صاحب! ہمارے پڑوس میں ایک منشی جی رہتے ہیں، ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی اپنے گھر میں خوش ہے اور اپنے آدمی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ دوسری بیٹی یہیں ہاتھرس میں بیاہی تھی۔ اس کا گھر والا ٹھیک آدمی نہیں تھا اور سسرال والے بھی اچھے نہیں تھے ...... اس لیے وہ لڑکی اپنے میکے آ کے رہنے لگی تھی اور اس نے صاف صاف اپنے ماں باپوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کو دوبارہ اس کی سسرال بھیجا گیا تو اپنی جان کی کُدس کَسی (خودکشی) کر لے گی۔ اب پانچ سال سے وہ اپنے میکے ہی بیٹھی تھیں۔ اس کا آدمی بار بار اس کو لینے آتا تھا لیکن اس نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے میکے والوں نے سوچا کہ کہیں دوسرا گھر اس کے لیے دیکھا جائے۔ انھیں اچھے داماد کی تلاش تھی کہ ہمارا تذکرہ چھڑ گیا۔ ہمارے ذکر پہ سُننے میں وہ کچھ کچھ راضی ہونے لگی تھیں۔ انھوں نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ اب کی دفعہ وہ اندھے کنویں میں نہیں گریں گی بلکہ دروازے کی آڑ سے خود بھی "لڑکے" کو دیکھیں گی۔ ہمیں یہ روگاد (روداد) معلوم ہوئی تو ہم نے کہا کہ ہمیں ان کی یہ شرط بھی منظور ہے اور اسی دن شام کو ہم ان کے گھر پہنچے۔ وہاں ہماری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ شربت پلایا گیا، پان کھلایا گیا اور منشی جی نے ہم سے کہا کہ آپ خاطر جمع رکھیں شاید آپ کی قسمت کھلنے والی ہے اور شاید ہم آپ کو اپنی "گلامی" (غلامی) میں لینے والے ہیں۔ ہم یہ سن کے اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب سارا دن گزر گیا اور شام بھی ہونے لگی تو ہم "ان" کے گھر پہنچے ...... وہاں جا کے پتہ چلا کہ ہمارے آنے کے بعد سے جو "انھوں" نے رونا شروع کیا تو رات بھر روتی رہیں اور صبح سویرے اٹھ کے رکشا منگوا کے اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں۔"

ہم سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ میں نے کہا: "واہ سکندر واہ ...... یہ بھی خوب ہوا ... تمھیں تو اس قصّے سے بڑا دکھ ہوا ہو گا!"

سکندر نے ذرا سا پہلو بدلا۔ کچھ مایوسی سی ان کی آنکھوں میں جھلکی لیکن وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولے: "دکھ کی کیا بات ہے بی بی! ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہماری وجہ سے کسی کا گھر تو بس گیا!!"

پھر وہ آہستہ آہستہ چل کے پانی کے نل کی طرف گئے اور جوتے اتار کے اکڑوں بیٹھ کے سر جھکا کے اپنے پاؤں دھونے لگے، جیسے اب ان کی زندگی میں یہی ایک اہم کام باقی رہ گیا ہو!

میری شادی کی پچیسویں سالگرہ

(ایک تقریر)

فکر تونسوی

(پچیس سال پہلے والدین نے سازش کر کے میری شادی کر دی تھی۔ اور پچیس سال بعد احباب نے سازش کر کے میری شادی کی پچیسویں سالگرہ منا ڈالی۔ اس "تقریبِ سعید" پر مجھے بھی تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ تحریری تقریر سوائے میری اہلیہ محترمہ کے سبھوں نے پسند کی)

محترم خاوندو! بیویو! ——— اور ناکتخداؤ!

آپ حضرات نے میری شادی کی پچیسویں سالگرہ منا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک انتہائی بھونڈی بات بھی بڑے خوبصورت سٹائل سے کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ ایک شاعرانہ خصوصیت ہے۔ لہٰذا مجھے شبہ ہے آپ سب حضرات شاعر ہیں۔

مگر جناب! ہر شاعری میں ایک نقص بھی ہوتا ہے۔ اور وہ نقص ہے مبالغہ آرائی کا۔ چنانچہ آپ سب نے اتفاق رائے سے مبالغہ کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ ہم ایک "آئیڈیل جوڑا" ہیں تو گویا آپ نے ہم میاں بیوی کے گذشتہ پچیس سال کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ ہماری شادی کو پچیس برس گزر چکے ہیں تو مجھے فطرتِ انسانی پر بے حد ترس آیا۔ جو بچاری اپنی قوتِ برداشت کی بُری طرح شکار ہے ——— صاحبان! پچیس برس تک شادی شدہ رہنا بے حسی کی بدترین مثال ہے۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ پچیس برس تک دُودھ کی نہر میں بیٹھے نہاتے رہیے تو میرا خیال ہے، چوبیس گھنٹوں ہی میں دودھ کی بُو سے آپ کی ناک سڑ جائے گی اور آپ نہر میں شگاف کر کے اُسے توڑ ڈالیں گے ——— لیکن پورے پچیس سال تک ہم دونوں میاں بیوی نے ایک دُوسرے کی نہر کو نہیں توڑا۔ تو اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دودھ کی نہر اور انسانی فطرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر میری بیوی دُودھ کی نہر ہوتی تو آج مجھ سے کٹ کر کسی مندر کی ہیڈ پجارن یا کسی مانٹیسری سکول کی انچارج بن چکی ہوتی۔ اور آج کی محفل میں گلابی غرارا پہن کر یوں مرغی کی طرح اٹھلاتی نہ پھرتی۔

دوستو! اس مرحلہ پر میری بیوی طفلانہ حد تک بھڑک سکتی ہے اور کہہ سکتی ہے کہ اگر وہ ہیڈ پجارن ہوتی تو آپ کیا ہوتے؟

میرا جواب یہ ہے کہ میرے لیے بہترین راستہ تو یہ تھا کہ میں دنیا تیاگ دیتا۔ (کیونکہ اگر دنیا نہ تیاگی جائے تو لوگ کہتے ہیں دوسری شادی کر لو) لیکن دُنیا تیاگنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم سے کم گوتم بُدھ ہو۔ میں نے گذشتہ پچیس برس میں پچیس مرتبہ گوتم بدھ بننے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار بلی کی میاؤں نے مجھے ڈرا دیا۔ اور جس رات بلی کسی بلّے کے ساتھ رومانس کرنے گئی ہوئی ہوتی، اُس رات

کوئی بچہ رونے لگتا یا گشت کا سپاہی ہانک لگانے لگتا اور میں گوتم بدھ بنتے بنتے رُک جاتا۔ اس سے اگرچہ دنیا میرے عظیم پیغام سے محروم رہ گئی لیکن انشورنس کمپنی کو بڑا فائدہ پہنچا کہ اُسے میرے بیمہ کی قسط برابر پہنچتی رہی۔ شادی کے فوراً بعد مجھے کسی نے ڈانٹ پلائی تھی کہ اب تم گرہستی ہو گئے ہو اس لیے اب اگر تم مر گئے تو تمہارے ساتھ تمہارے بیوی بچے مرنا پسند نہیں کریں گے اس لیے پسماندگان کو زندہ رکھنے کی خاطر تم بیمہ ضرور کروا لو۔

برادران! بات یہ ہے کہ دراصل گوتم بدھ کو وہ دقتیں درپیش نہیں تھیں جو مجھے ہیں کیونکہ اس نے بیمہ نہیں کروایا تھا۔ میرے جیسے ان گنت خاوند بلی کی میاؤں کا شکار ہیں۔ اور شاید یہ بات صحیح ہو کہ جو خاوند بلی کی میاؤں سے ڈرتا ہے وہی معزز اور آئیڈیل گرہستی کہلاتا ہے۔ بلی کی میاؤں ہی گرہست کے ناموس کو بچاتی ہے — حضرات! آپ میں سے کونسا خاوند ہے جو گوتم بدھ نہیں بننا چاہتا۔ اور کونسی بیوی ہے جو "میراں" بننے کے لیے مارکیٹ میں تنبورے کا ریٹ نہیں پوچھتی پھرتی۔

جب لمبے قد اور چھوٹی مونچھوں والے برہمن نے معتبر اگنی کے سامنے مقدس منتر پڑھتے ہوئے حکم دیا تھا "دولہا اور دلہن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں" تو بیوی کے ہاتھ کے لمس سے میرے بدن میں ایک تیز سی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ حضرات! بعد میں مجھے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ سنسنی دراصل ہمارے جوان اور راحتی خون کی تھی ——— یاد رکھئے، یہ ڈاکٹر لوگ صرف علم الاعضا میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ محبت، رومانس، حسن، ہجر، جذبہ، دھڑکن وغیرہ اشیاء کو صرف خون ٹیسٹ کرنے والے آلہ سے ناپتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے جناب! اگر برہمن کا رول ڈاکٹر لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو بیاہ کی ویدی اور ہسپتال کی آپریشن ٹیبل میں کوئی فرق باقی نہ رہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ سرجری کی بنیاد پر کوئی شادی ہو بھی سکتی یا نہیں؟

میں سرجری کے خلاف نہیں ہوں لیکن میں شاعری کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ جو دل کی دھڑکن اور جسم کی سنسنی کو مبالغہ کا شکار بنا کر محبت کہہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس لمحہ کے بعد ویسی سنسنی مجھے پھر کبھی نہیں ہوئی۔ پچیس برس سے میں اُس سنسنی کی دوبارہ آمد کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ لیکن وہ نہیں آئی بلکہ اُس کی بجائے بچے آئے، رشتہ دار آئے، بل آئے، راشن آیا حتیٰ کہ ایک بار پولیس کا سپاہی بھی آ گیا۔ جو میرے قرضہ کے وارنٹ گرفتاری لے کر آیا تھا۔ میں نے ہزار بار بیوی کا ہاتھ پکڑا، لیکن ہمیشہ یوں لگا، جیسے میرا ہاتھ کسی کرسی پر جا پڑا ہے، کسی ایش ٹرے کو چھو رہا ہے، کسی تولیے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

لیکن جناب عالی! میرا اور میری بیوی کا (مشترکہ) کمال یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو تولیہ یا ایش ٹرے نہیں کہا۔ آئیڈیل گرہستی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کے زوال کا ذکر نہ کیا جائے بلکہ گندم کی مہنگائی اور پڑوسن کی خود غرضی کا ذکر کیا جائے اور جتنی شد و مد سے ذکر کیا جائے گا، اُتنا جذبات کا زوال کم محسوس ہو گا۔ دوستو! وہ لمحہ گرہستی زندگی میں بڑا نازک ترین لمحہ ہوتا ہے۔ جب گندم سستی ہو جائے اور پڑوسن سے تعلقات خوشگوار ہو جائیں۔ اُس لمحے میاں بیوی خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ اور ویرانی بہت ستاتی ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑتے ہیں، ایک دوسرے کو ایش ٹرے اور تولیہ تک کہہ دیتے ہیں اور یہی وہ نادر موقع ہوتا ہے، جب وہ ایک دوسرے کو طلاق بھی دے ڈالتے ہیں ——— لہٰذا حضرات! کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ گندم مہنگی رہے، پڑوسن سے تنازعہ جاری رہے اور بچے متواتر پیدا ہوتے رہیں، تاکہ میدانِ کارزار خالی نہ رہے۔ کیونکہ بھرے پڑے میدان میں ہی محبت زندہ رہتی ہے۔ بیوی کے ہونٹ گلابی محسوس ہوتے ہیں۔ اور سنسنی کی آمد کا انتظار بڑا

ابھی ابھی ایک دوست آپ کو بتا گئے ہیں کہ میرے ازدواجی تجربات بڑے قیمتی ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائینگی چنانچہ جناب! میں آیندہ نسلوں کو باآواز بلند ایک قیمتی بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ شادی نیچرل چیز نہیں ہے۔ آپ غصہ میں مت آئیے میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے پاؤں سے چلنا نیچرل چیز ہے، پانی پینا نیچرل چیز ہے، گھاس کا اُگنا نیچرل چیز ہے۔ اس حساب سے شادی نیچرل چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کی ذاتی اختراع ہے۔ اصل میں انسان کو اختراعات کا بڑا شوق ہے۔ مثلاً وہ چابی بھر کر چلنے والی پتلی ایجاد کرتا ہے، پانی کو برف کی طرح جمانے کا طریقہ ایجاد کرتا ہے، پینٹر ایجاد کرتا ہے جو رنگ اور برش سے گھاس کی ہو بہو ہری پتیاں بنا دیتے ہیں — بالکل اسی طرح انسان نے شادی بھی ایجاد کر ڈالی۔ اس ایجاد کے ذریعے وہ ایک مرد اور عورت کو اکٹھا کر دیتا ہے اور اُسی طرح کر دیتا ہے جیسے وہ میز کے ساتھ کرسی بنا دیتا ہے۔ بارش کے لیے چھتری بنا دیتا ہے اور اُسے وہ اپنا آرٹ کہتا ہے۔ برادران! انسان نے آج تک نیچر کے خلاف جتنے کام کئے ہیں وہ اُس کا آرٹ کہلاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے۔ اگر سماج میری اہلیہ کو چھتری قرار نہ دیتا تو نیچر کے اولوں سے میرے گنجے سر کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔

چونکہ شادی نیچرل چیز نہیں ہے بلکہ انسان کی ایجاد ہے۔ اس لیے نیچر کی طرح پرفیکٹ نہیں ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کا زندگی بھر اکٹھے رہنا ایک مکینکل کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی خاوند کو اچھی بیوی نہیں ملی اور کسی بیوی کو اچھا خاوند نہیں ملا۔ صاحبان! اچھے خاوندوں کے لیے بُری بیویوں کی اور بُرے خاوندوں کے لیے اچھی بیویوں کی بہتات پائی جاتی ہے۔ مگر میری اہلیہ محترمہ سمجھتی ہیں کہ وہ ایک اچھی بیوی ہیں۔ اور اگر میرے متعلق بھی اُن کا یہی خیال ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ بے ہوش ہو جائیں تو میں ان کے چہرے پر گلاب کا پانی ضرور چھڑکوں گا اور جواباً وہ بھی اپنی ننھی ننھی پلکیں اُٹھا کر یہ ضرور کہیں گی "پیارے! تم کتنے اچھے ہو"

حضرات! میں مانتا ہوں کہ گلاب کا پانی ایک ڈاکٹر بھی چھڑک سکتا ہے لیکن ڈاکٹر کی پرابلم یہ ہے کہ وہ سال میں ایک آدھ مرتبہ ہمارے گھر آتا ہے اور میں ہر روز گھر آجاتا ہوں اور انسان صرف اُسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے، اُسی چیز کو پیارا کہہ سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ اُس کے نزدیک رہے۔ مثلاً میری جرابیں، بیوی کی چوڑیاں، بچے کی گڑیا۔ جناب! میں تو اس چڑیا کو بھی "پیاری" سمجھتا ہوں جو صرف میرے ہی گھر میں گھونسلہ بنا کر رہتی ہے اور کہیں نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ وہ کئی بار ہمارے گھر میں بچے بھی دے چکی ہے۔

میری بیوی اور چڑیا میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ چڑیا کے بچوں کی تعداد ہمارے بچوں سے زیادہ ہے اور بس!

اور میرا تیسرا تجربہ یہ ہے کہ بچے پیدا کرنا ایک نہایت ہی معمولی فعل ہے۔ جو لوگ بچے پیدا نہیں کرتے وہ صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو غیر معمولی فعل میں یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً پیغمبری کرنا، خدا کی تلاش کرنا، شہید ہونا۔ حتیٰ کہ ایک صاحب تو کبوتروں کی مختلف اقسام کی چھان بین کے غیر معمولی فعل میں اتنے مگن ہو گئے کہ لاولد مر گئے — لیکن مجھے اور میری بیوی کو نہ پیغمبری کا شوق ہے نہ کبوتروں کا۔ کیونکہ ہم دونوں معمولی انسان ہیں بلکہ جب ہماری شادی کے پانچ سال بعد تک ہمارے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا تو پڑوسی ہمیں یوں شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے جیسے ہم سمگلر ہوں۔ بچوں کے جھولے بنانے اور بڑھئی ہماری طرف دیکھتا تو ناک سکوڑ لیتا۔ ایک دکاندار نے تو ہمیں قرض دینے سے انکار کر دیا تھا کہ بانجھ لوگوں کا کیا اعتبار ہے، کب خودکشی کر جائیں یا پیغمبر بن جائیں اور قرضہ ڈوب جائے۔

اور جب پہلا بچہ تولد ہوا تو اُس نے آتے ہی حالات نارمل کر دیے۔ جھولے والے بڑھئی سے لے کر زائچہ بنانے والے جیوتشی تک سب نے یہی کہا کہ بچہ بڑا بھاگوان ہے اور بڑا ہو کر بادشاہ بنے گا اور خاندان کا نام روشن کرے گا — چنانچہ ہمارا

وہ پہلا فرزندِ ارجمند گذشتہ دنوں نوکری نہ ملنے کی وجہ سے گھر سے نکل کر نجانے کہاں بھاگ گیا ہے اور دکاندار سے لے کر شری کیدار ناتھ ریٹائرڈ ایڈووکیٹ تک سبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ بھگوان نالائق اولاد کسی کو نہ دے۔

مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ بھگوان نالائق اولاد بھی دے اور لائق بھی۔ لیکن سب سے زیادہ اولاد وہ دے جو درمیانہ قسم کی ہو۔ آئیڈیل گرہستی زندگی صرف درمیانہ اولاد کے سہارے ہی چلتی رہی ہے۔ نہ صرف گرہستی زندگی بلکہ خدا کی ساری خدائی بھی۔ میں میری بیوی اور آپ سب درمیانہ قسم کی اولاد ہیں، خدا کی خدائی ہم سے قائم ہے۔ ہم تمنائے خداوندی ہیں۔ ہم مقصدِ تخلیق ہیں۔ میری بیوی نے جب جب بھی مندر میں جاکر پرارتھنا کی ہجب جب خدا نے ہمیں ایک درمیانہ بچہ عطا کر دیا۔ اور جب جب بھی پرارتھنا کے بغیر بچہ پیدا ہوا وہ لائق نکل آیا یا نالائق۔ اور میری بیوی گواہ ہے کہ نہ نالائق بچے ہمارے کام آئے نہ لائق۔ ایک لائق بچہ فلاسفر بن گیا اور ایک نالائق بچہ نوکری حاصل نہ کر سکا اور بھاگ گیا۔

بھائیو اور بہنو! بچوں کی پرورش اور تربیت کے مسئلہ پر میں اپنا کوئی تجربہ بیان نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس مسئلہ پر ہزاروں کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں آپ انھیں پڑھ سکتے ہیں۔ ہمارا جو لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے اُس کی پرورش کے لیے میں نے ڈیڑھ سو کتابیں پڑھی تھیں ——— اور اُس کے بھاگ جانے کے بعد وہ تمام کتابیں ایک لائبریری کو دان میں دے دی ہیں۔

میرا خیال ہے جناب! کہ معمولی رکھ رکھاؤ کے علاوہ بچوں کی تربیت پر زیادہ مغز پچی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بچے خود بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ کئی نالائق والدین کے بچوں کو جب میں وزیر اور ادیب بنتے دیکھتا ہوں تو والدین پر سے میرا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ میری اہلیہ محترمہ نے لاکھ کوشش کی کہ ہمارا منجھلا لڑکا بازاری گالیاں سیکھ جائے جو اُسے اپنی ماں کے زیرِ سایہ مل رہی ہیں۔ مگر لڑکا بالکل بُدھو نکلا یعنی ہمیشہ سر نیوڑا کر چلتا ہے۔ میرے ایک اور بچے کا خیال ہے کہ ڈیڈی مجھے تو مضمون پولیٹکل سائنس پڑھا رہے ہیں حالانکہ میں ٹیکسی ڈرائیور بنوں گا۔ اسی طرح میری ایک چھوٹی بچی ہمیشہ اپنی سہیلیوں کی پٹائی کر کے گھر آتی ہے۔ حالانکہ اُس کے لہو میں ہماری گذشتہ آٹھ نسلوں کا شریفانہ کلچر گھلا ہوا ہے۔ اگر وہ بڑی ہو کر کسی ملک کی ڈکٹیٹر نہ بنی تو یہ ایک انتہائی غلط بات ہوگی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بچوں سے پیار نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بچوں سے اتنا گہرا پیار ہے کہ یہ پیار میری بیوی کی آنکھوں میں کئی بار کھٹکا ہے۔ لیکن پیار میرا ذاتی پرابلم ہے' بچوں کا نہیں۔ ورنہ بچے اپنی تربیت خود کر لیتے ہیں۔ اپنی ترقی، اپنا مستقبل' اپنی نفرت، اپنا حسد' اپنے رجحان کا تصفیہ وہ خود کرتے ہیں۔ اور یہ تصفیہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! شاستر انوسار آج ہمارا گرہست آشرم کا پیریڈ ختم ہو چکا۔ اور بان پرستھ آشرم شروع ہو گیا۔ لہٰذا کل میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اب ہمیں بن کی طرف نکل جانا چاہیئے لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ مشکل یہ ہے کہ اُس کی کوئی پڑوسن، کوئی سہیلی آج تک بن میں نہیں گئی۔ میں نہیں جانتا یہ شاستروں کی توہین ہے یا شاستروں کے احکام میں کوئی خامی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ شاستروں کی فروخت ممنوع قرار دے دی جائے۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُن کے احکام پر عمل کروانے کے لیے سرکار کوئی قانون ضرور بنائے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاستروں کے احکام صحیح ہیں۔ غلطی صرف میری بیوی میں ہے یا اُس کی سہیلیوں میں۔

ایک مرحلہ پر میری بیوی اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ وہ بن میں چلنے کے لیے تیار ہے۔ مگر اس شرط پر کہ دونوں ایک ہی بن میں ایک ہی کُٹیا میں رہیں۔ لیکن یہ تجویز مجھے "سوٹ" نہیں کرتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ تم ڈنڈک بن میں جاؤ اور میں پوربن کی طرف نکل جاتا

ہوں۔ جناب! جب ہندوستان میں بہت سے بن موجود ہیں تو کیوں نہ اُن سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لیکن افسوس! میری بیوی کا ٹیسٹ اتنا ڈیولپ نہیں ہے۔ کاش! شاستروں میں ٹیسٹ ڈیولپ کرنے کے طریقے بھی درج کئے جاتے تو اُن کے احکام پر زیادہ بہتر طریقہ پر عمل کیا جا سکتا تھا۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ مگر خاتمہ پر ایک راز کا انکشاف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں کئی بار دوسری شادی کا خیال آتا رہا ہے۔ ہر خاوند کے دل میں ایک آدھ بار یہ خیال ضرور آتا ہے۔ مگر میری بیوی کو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے اس خیال کو ہمیشہ زبردستی دبا دیا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ہر بیوی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر خاوند بھی پہلے خاوند جیسا ہوتا ہے۔ ہر دوسری شادی صرف ایک تجربہ کا اعادہ ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بلی جب بھی کرتی ہے 'میاؤں' کرتی ہے۔ جب بھی پیدا کرتی ہے 'بلونگڑے' پیدا کرتی ہے۔ یقین نہ آئے تو میرے دوست مسٹر برش بھان سے پوچھ لیجئے، جن کی تیسری بیوی کے ہاں آٹھواں بچہ پیدا ہوا ہے ——— آٹھواں بلونگڑا نہیں۔

رنگوں کا بھرم

جوگندر پال

جدائی وطن کی جغرافیائی حدود سے نہیں ہوتی، جدائی اپنے گھر کی اینٹوں سے بھی نہیں ہوتی، جدائی تو اقارب سے ہوتی ہے، اُس ماحول سے ہوتی ہے جو اقارب کی سانسوں سے مہکا ہوتا ہے۔

جب میں اپنوں کو ہزاروں میل پیچھے چھوڑ کر افریقہ پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا پُر رونق وجود —— میری خواہشوں سے لدا پھندا یہ گھر یکلخت تنہا ہو گیا ہے، اس گھر کے افراد —— میرے سبھی اعزا پھانسی لے کر مر گئے ہیں اور اس خالی خالی مکان میں میں اکیلا باسی ہی رہ گیا ہوں، جیسے کسی غیر آباد گھر میں گھر کی اپنی ہی المناک روح کے سوا کوئی اور مکین نہ ہو۔

مجھے اپنا جسم اپنے آبائی قصبے کی لال سرائے کی طرح معلوم ہونے لگا جس کی دیواریں اجڑ اجڑ کر پیلی پڑ چکی تھیں اور جہاں میں سب کی نظروں سے چھپ چھپ کر ویرو سے ملا کرتا تھا۔

ہماری سگائی کے بعد ویرو مجھ سے پرے پرے رہنے لگی لیکن کوئی اپنے آپ سے کیسے پرے پرے رہ سکتا ہے، کبھی کبھی وہ لال سرائے کے پیلے سایوں میں ملاقات کے لیے آ جاتی تو اُجڑی دیواروں پر شرماتی ہوئی دلہن کے رنگدار دوپٹے کے بیل بوٹے نکھر آتے۔

ناطے جوڑتے ہوئے جی کو یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کچے دھاگے کہیں جھٹکا نہ کھا جائیں۔ رشتہ جتنا پیارا ہو، دھاگا اتنا ہی کچا ہوتا ہے۔ میرے افریقہ آنے سے پیشتر ہماری شادی میں چند ہی روز رہ گئے تھے کہ دفعتاً ہماری سگائی ٹوٹ گئی۔

"گیان شاہ!" ویرو کا باپو آ کر میرے پتاجی سے کہنے لگا، "میں بڑا شرمندہ ہوں۔ نہ لڑکی کی ماں مانتی ہے، نہ بھائی، نہ ماما ——!"

"پر لعل شاہ! اب تو ——"

"نہیں میرے بھائی! وہ سب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جان بوجھ کر تو مکھی نہیں نگلی جا سکتی۔ مہاتما پرشوں کو مر کر سورگ ملتا ہے، پھر بھی وہ مرنا پسند نہیں کرتے۔ میں اپنی لڑکی کو اتنی دور کیسے بھیج دوں۔ افریکا بڑا مزے دار شہر ہوگا۔ تو مجھے معلوم ہے میری بیٹی وہاں راج کرے گی پر گھلنے اچھا سو، ہم سب کے لیے تو مر ہی جائے گی، اتنی دور ——"

"لعل شاہ! یہ باتاں تم نے پہلے کیوں نہ سوچیں؟ اب تو —— اب تو میں ایسٹ افریقن ریلویز کے کانٹریکٹ پر دستخط

کر کے بھی بھیج چکا تھا، اپنی پہلی نوکری سے استعفیٰ بھی دے چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟

''ہنس گُلنے'' ویرو کے باپو نے اپنی پگڑی اتار کر میرے بھائیا جی کے قدموں پر ڈال دی۔ ''تو میرا بھائی ہے۔ پنچایت میں بیٹھ کر میں اپنا تھوک چاٹ دوں گا میرے بھائی، پر ویرو کو سمندر میں دھکا نہیں دوں گا۔ تیرے بیٹے کی نوکری چنگی بھلی شہر کے ریلوائی سٹیشن پر لگی ہوئی تھی۔ ہیں تو وہ بھی دور لگتا تھا، پر یہ دُوری تو ہماری سوچ سے بھی باہر ہے —''

اور بھائیا جی بڑے اداس نظر آنے لگے، شاید یہ سوچ کر کہ وہ کیوں اپنے بیٹے کو سمندر میں دھکا دے رہے ہیں لیکن وہ بیچارے لاچار تھے۔ ہماری زمین اور مکان ٹھاکر جی کے پاس رہن تھے اور جب سے میری نوکری کی خبر اڑی تھی، ٹھاکر جی نے ہمیں بڑی ڈھیل دے رکھی تھی —!

آج کل کی بات کچھ اور ہے۔ آج کل تو چاند کی کرنیں دیکھ کر بھی انسان کو یہی گمان ہوتا ہے کہ پڑوس کے گھر سے روشنی آ رہی ہے لیکن جس زمانے کا قصہ میں سنا رہا ہوں، ان دنوں لوگوں کے اپنے اپنے قصبے ہی علیحدہ علیحدہ چاند تھے۔ کبھی کوئی بدقسمت قصبے سے باہر جا بسنے کی تیاری کرتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ بے چارہ دوسرے جہان میں اینٹیں ڈھو رہا ہے۔

بھائیا جی بظاہر خوش خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتے لیکن اچانک کبھی ہماری نظریں مل جاتیں تو مجھے ان کی آنکھوں میں وہی گیلی گیلی آہ نظر آتی جو کئی برس پہلے اپنا پلا ہوا بھولو بیل بیچتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بہہ نکلی تھی۔

اور میری ماں —!

پہلی بار جب میرے افریقہ جانے کی بات چلی تو وہ میری طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہی، پھر میں نے کانٹریکٹ پر دستخط کر کے اسے بھیجا تو اسے عمر بھر میں پہلی مورچھا ہوئی اور پھر تو یہ حالت رہی کہ وہ تصویر سی بن گئی، چلتی پھرتی بھی ایسی ہی نظر آتی گویا بیہوشی میں ہو۔ اپنی ماں کی اس بیہوشی کا تصور کر کے مجھے اکثر وسواس ہو جاتا ہے کہ دکھیا آدمی بیہوش ہو یا مردہ، اس کا باطن اپنے دکھ سے غافل نہیں ہوتا۔

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں افریقہ نہیں جاؤں گا۔

میرا چھوٹا بھائی سرنا ابھی پرائمری اسکول میں ہی پڑھتا تھا۔ ایک بار میں ایسٹ افریقن ریلویز کے باتصویر پمفلٹ میں کالے حبشیوں کے چہرے دیکھ رہا تھا کہ مجھے باہر سے سرنے کی آواز سنائی دی۔

''میرا بھیا افریقہ جا کر ہمیں ڈھیر روپے بھیجے گا۔'' وہ اپنے معصوم دوست کو بتا رہا تھا۔ ''اور ان روپوں سے میں پڑھوں گا اور ولایت جا کر بڑا ڈاکٹر بنوں گا۔''

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں افریقہ ضرور جاؤں گا۔

میری روانگی میں ایک ہفتہ رہ گیا تو میری بہن بسنتی بھی سسرال سے چلی آئی۔

''بھیا! راکھی کے دن تو تم ابھی سمندر دیوتا کی ہتھیلی پر ہی ہو گے؟'' آنسو کی ایک ننھی منی بوند سمندر کی طرح بے کراں اور گہری ہو گئی۔

''ہاں!''

''تو پھر میرا راکھی بندھن یہیں بندھوا لو۔''

سب بندھن کچے دھاگوں کے کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے ایک زبردستی مسکراہٹ سے اپنی کلائی اس کی طرف بڑھا دی۔

"بھیا! آج میں ویرو کے گھر گئی تھی:

میری بہن شاید سنا رہی تھی کہ ویرو کے بندھن مجھے بیچ کا باندھ لیں گے۔ پگلی!

"بھیا! وہ تو رو رو کر جھاڑو کا تنکا نکل آیا ہے۔"

اور میری آنکھ میں بھی جھاڑو کا تنکا چبھ گیا اور میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بھیا! افریقہ کوئی آسمان سے دور تو نہیں۔ پھر بھی ہم آسمان کے سب تارے دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ افریقہ پہنچ کر میں اپنی روح کو کسی تارے میں بند کر دوں گا اور وہ تارا جہاں میرے اپنوں کے سروں پہ جھلملایا کریگا۔

"بھیا! میں ہر روز تمہیں آسمان پہ ڈھونڈا کروں گی۔"

اور آسمان سے رم جھم ہونے لگی، پتہ نہیں کب تک ہوتی رہی۔

جانے سے پہلے میری ملاقات ویرو سے بھی ہوئی، وہیں لال سرائے کی پیلی دیوار تلے۔ —اور رونے کے سوا ویرو کے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا۔ محسوسات میں سیلاب آیا ہو تو انسان شاید باتیں کر ہی نہیں سکتا بے زبانوں کی طرح صرف ہنستا یا روتا ہی چلا جاتا ہے۔

پیلی پیلی دیوار پہ ویرو کے بیلدار دوپٹے کا لرزاں سایہ دیکھ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کسی کنواری کی لاش پہ رنگدار کفن لہرا رہا ہے!

"ویرو! میں نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا——!"

لیکن اس کا یقین نہ ویرو کو تھا نہ مجھے۔

ٹھاکر جی کے الفاظ پتھر بن کر میرے دل کی تہوں پہ اُتر آ رہے تھے۔

"بیٹا لکشمن! ہر مہینے ڈیڑھ سو کا منی آرڈر سید حامد میرے نام ہی بھیج دیا کرو۔ سید حامد میرے نام ہی، بیٹا! تمہارے باپ کو خواہ مخواہ میرے گھر آنے کی تکلیف ہوگی —— سید حامد میرے نام ہی ——!"

میں نے ویرو سے ایک بار پھر کہنا چاہا کہ میں نہیں جاؤں گا، لیکن انجن کے پیچھے بندھے ہوئے ریل کے ڈبے اپنی مرضی سے تھوڑا ہی رکتے یا چلتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بھگوان کی ساری رچنا ہی اسی اصول پر ہے کہ منش اپنے آنے جانے کا فیصلہ خود آپ نہیں کر سکتا۔

اور آخر میں اپنے باپ کا قرض اتارنے کے لیے سفر پہ چڑھ گیا، سولی پہ چڑھ گیا اور یہاں آ پہنچا، افریقہ میں!

جب میں گھر سے چلا تھا تو افریقہ بہت دور لگتا تھا اور یہاں پہنچ کر اب گھر بہت دور لگنے لگا، اتنا دور کہ واپس پہنچ سکنے کا تصور بھی ذہن میں نہ آ سکا——!

(۲)

یہ افریقہ کا پیٹ ہے بابو!" بلو رو ریلوے اسٹیشن پہ افریقی کانٹے والے نے دنیا کی عظیم ترین رفٹ ویلی کی طرف انگلی کر کے کہا۔

اور مجھے معلوم ہوا کہ افریقہ کا کالا دیو مجھے ہڑپ کر گیا ہے اور میری نظریں سراسیمہ ہو ہو کر اس کے پیٹ کی تاریک وسعتوں میں سرپٹ دوڑ رہی ہیں۔

بچپن میں میں ایسی کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔

پھر راجکمار راجکماری کی تلاش میں گھنے جنگل کی سیاہیوں میں کھو گیا اور اس کا گھوڑا ایک دیو کے غار کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا.....

لیکن میں اپنی راجکماری کو روتا چھوڑ کر یہاں کالے پیٹ میں کیوں آ گھسا؟

کٹی کے اطراف گھنے پودوں کے سایے میں شاید میرا خاکی رنگ بھی افریقی کانٹے والے کے رنگ کی طرح سیاہ نظر آنے لگا۔

”آؤ بابو! تمھیں تمھارا کوارٹر دکھا آؤں۔“

اسٹیشن کے عقب میں وادی میں اترتے ہوئے مجھے یوں معلوم ہوا جیسے دیو میرے ساتھ ساتھ ہے۔

”ایک کمرے میں ہم سوئیں گے (ہم!) ایک میں میں رامائن پڑھوں گی اور تم سنو گے۔ (ریلوے اسٹیشن پر انجن کی وسل نے چیخ ماری!) اور ایک کمرہ ملنے والوں کے لیے ہوگا——“

ملنے والے! میں نے نگاہ اٹھا کر خالی خالی دھرتی کی طرف دیکھا۔ کون ملنے والے؟ یہاں تو دور دور تک کسی اپنے آدمی کی دھول بھی اڑتی دکھائی نہیں دیتی —— وہ خمیدہ درخت اپنا لمبا سا منہ جھکا کر میرے بوڑھے باپ کی طرح اپنے بیٹے کو پردیس بھیج کر پچھتا رہا ہے ——!

میں ٹھوکر کھا کر اپنے کوارٹر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور اندر جھانکنے لگا گویا اپنے ہی سنسان وجود کے خالی خالی نہاں خانوں پہ نظریں کھڑی کر لی ہوں۔

اچانک کوارٹر کے ایک کمرے سے ایک کالی لڑکی برآمد ہوئی، ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے، نہایت کالے چہرے پر بلا جھجک مسکرا مسکرا کر کھلتے ہوئے نہایت سفید دانتوں کی قطاریں —— اور انھیں دیکھ کر مجھے اسٹیشن کے پاس کالی مٹی پر اگے ہوئے چنبیلی کے دودھیا پھولوں کا خیال آ گیا اور وہ بھی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔

”یہ میری لڑکی ہے بابو! تمھارا کوارٹر صاف کر رہی ہے۔“

وہ بدستور مسکراتی رہی۔

”اس کا نام ٹیٹرو ہے۔“

”ٹیٹرو؟“

”ہاں! ہماری کِکیو بولی میں ٹیٹرو کا مطلب ہوتا ہے گوری۔“

اچانک ٹیٹرو نے خوشی سے تالی بجا کر اپنے باپ سے تیز تیز افریقی زبان میں کچھ کہا۔

”ٹیٹرو کیا کہہ رہی ہے؟“ اگرچہ یہاں پوسٹ ہونے سے پیشتر میں نیروبی ہیڈ کوارٹرز میں افریقی زبان کا کورس پاس کر چکا تھا، تاہم ابھی میرا اس زبان کا علم خام تھا۔

”وہ دیکھو!“ بوڑھے کانٹے والے نے زمین کی طرف اشارہ کیا جہاں ٹیٹرو کا سایہ میرے کندھے پہ سر ٹیکے بڑی شوخی سے ہل رہا تھا۔

کانٹے والے کا لہجہ بڑا واضح تھا۔

”ٹیٹرو نے کہا ہے، اس کا سایہ اور تمھارا سایہ دونوں ایک جیسے کالے ہیں۔“

میں سرعت سے پیچھے ہٹ گیا۔

کانٹے والا جانے کے لیے مڑ گیا لیکن میٹرو وہیں کھڑی میری جانب تکتی رہی کچھ دور جاکر کانٹے والے نے میٹرو کو پکارا۔ "آؤ بیٹی ہم دونوں بابو کا سامان اسٹیشن سے لے آئیں" پھر اس نے میری طرف منہ اٹھا کر کہا: "تمھارے کواٹر کے نیچے میرا گھر ہے ——— وہاں کسی شے کی ضرورت پڑ جائے تو آجایا کرو ——— یا بلا لیا کرو!"

(۳)

ٹیڈرو میں ان دنوں دن رات بارش ہوتی رہتی جیسے ہمارے دماغ پہ ویرو ہر دم روتی ہی رہتی تھی۔

میرا سارا دن اسٹیشن پر دودھ اور آلوچوں کی بلٹیاں بناتے، کانٹے بدلواتے اور زیریں ہیڈ کوارٹرز سے متفرق ہدایات موصول کرتے ہوئے بیت جاتا۔

ایک ادھیڑ عمر انگریز کسان ہر روز بارہ بجے دوپہر کی گڈز ٹرین پر دودھ کے کین اور آلوچوں کی بوریاں بک کروانے آتا اور اگر کبھی اتفاق سے خود نہ آتا تو عین وقت پر اس کا کالا نوکر اور سفید کتا میرے آفس میں آ کھڑے ہوتے۔

"مسٹر ہربرٹ!" چند روز میں یہ انگریز کسان میرا دوست بن گیا۔ "کیا تم یہاں تنہائی محسوس نہیں کرتے؟"

"تنہائی؟" وہ اپنے منہ سے پائپ ہٹا کر تعجب سے مسکرانے لگا۔ "وہ کیوں؟"

"تم بھی یہاں میری طرح اجنبی ہو۔"

"او ——— نو! میں اجنبی نہیں ہوں۔ یہ میرا گھر ہے! ———"

"گھر؟"

"ہاں! میں یہیں پیدا ہوا تھا اور میری خواہش ہے کہ مرنے پر میری قبر بھی یہیں کہیں وادی میں پھیلتے ہوئے پہاڑوں پر بنے۔" اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے تمباکو کا دھواں ہاتھ سے پرے جھٹک دیا اور شفقت اس کی نگاہ سے اڑ اڑ کر پہاڑوں کی محراب آگیں دھند کو چھونے لگی۔ "اگر اتفاق سے میری پیدائش کہیں اور ہوتی تو بھی میرا گھر یہیں ہوتا۔" ہربرٹ نے اپنی کرسی میرے نزدیک سرکالی۔ "میرے بھائی! پیدائش تو محض ایک اتفاق ہے۔ آدمی یہاں پیدا ہو جائے یا وہاں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پیدا ہونے کے بعد میں بھی چرند پرند کی طرح گھر کے لیے چاروں کھونٹ گھومنا پڑتا ہے اور پھر جہاں متعلق ہو گئے وہیں گھر ——— سوال تو تعلق کا ہے۔" ہربرٹ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چار پانچ بڑے سے پکے ہوئے موٹے موٹے آلوچے نکالے۔

"لو کھاؤ، مجھے اچھے لگے تھے اس لیے میں نے بوری سے نکال کر اپنے بیٹے کے لیے رکھ لیے تھے۔"

آلوچے کا میٹھا میٹھا رس چوستے ہوئے مجھے اپنے عزیز و اقارب کا خیال آیا تو میرے حلق میں زہر کی بوندیں ٹپکنے لگیں اور میں نے جلدی جلدی ہربرٹ کی بلٹی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "وِن، پلیز؟"

"میرے مشورے پر عمل کرو گے تو بہت خوش رہو گے۔" اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ "اکیلے مت رہو۔ خدا کی بھی مرضی ہے کہ انسان اور حیوان اپنی اپنی مادہ کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کریں اور اپنی اپنی نسل بڑھائیں۔ ینگ مین! جو انسان اکیلا ہے گاڈ کے فطری اصولوں کے مطابق ہمیشہ غمگین رہے گا ———"

"بڑا اچھا آدمی ہے۔" جب ہربرٹ چلا گیا تو کانٹے والا اس کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ "اس علاقے میں تنہا یہی ایک سفید آدمی

ہے اور اس نے — ہمارے قبیلے کی ایک عورت سے شادی کر رکھی ہے اور اس کے بچے —" گویا کانٹے والا اپنے ہی پوتوں کی بات کر رہا ہو۔ "بڑا پیارا رنگ ہے ان کا، جیسے گہرے نیلے آسمان میں سفید بادل گھلے ملے ہوں۔"

اسی اثنا میں دفتر میں کہیں سے بندر کا ایک بچہ گھس آیا۔ میں نے پیپر ویٹ اٹھا کر اسے دوڑانا چاہا لیکن کانٹے والے نے لپک کر بندر کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور اس کی جلد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسی کی مانند منہ بنا بنا کر ہنسنے لگا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں اس بندر کے بچے سے، بابا؟"

"اس بندر کی تین نسلوں سے میرا ملنا جلنا رہا ہے، بابو!" کانٹے والے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر بندر کو زمین پر چھوڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔ "جاؤ بیٹا! تمہاری دادی نیچے ہی ہوگی۔ جاؤ کھیلو۔"

بندر کا بچہ دوڑ کر کانٹے والے کے گھر کی طرف ہو لیا۔

"بابو! یہ ان پہاڑوں کے عقب میں رہتا ہے — وہاں!" اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے بتایا۔ "یہاں سے کم از کم دس میل کا فاصلہ ہے، پر یہ ٹوٹو (بچہ) بڑا ہوشیار ہے، اچھل اچھل کر پلوں میں یہاں آ پہنچتا ہے۔"

میں نے سمجھا کہ بڈھا شاید اپنی بات بھول کر کسی انسان کے بچے کا ذکر لے بیٹھا ہے۔

"بابو! یہاں ہمارے قبیلے کے صرف گنتی کے ہی چند لوگ ہیں اس لیے ہماری اور ان پشوؤں کی یہاں سانجھی برادری ہے۔ اپنے آس پاس جانداروں کی گنتی زیادہ معلوم ہو، بابو! تو جیون سکھی رہتا ہے۔" مجھے اپنی باتوں میں اتنی دلچسپی لیتے پا کر کانٹے والا میرے پاس زمین پہ بیٹھ گیا۔ "اس ٹوٹو کا دادا میرا منہ بولا بھائی تھا۔ اپنی بڑھیا سے لڑ جھگڑ کر اکثر میرے پاس چلا آتا — پچھلے سال میرے رفیق (یار) کو انگائی (لگبو قبیلے کا خدا) کا بلاوا آ گیا —" کانٹے والا ہتھیلی سے آنسو پونچھ کر چاٹنے لگا۔ "مُردوں پر بہائے ہوئے آنسو ہم لوگ ضائع نہیں کرتے بابو! ہمیں انگائی کا حکم ہے کہ انھیں پی جاؤ۔"

میں حیرت سے کانٹے والے کی طرف تکتا رہا۔

"لیکن بابا! پشو تو بے زبان ہوتے ہیں، پھر تم ایک دوسرے سے بات کیسے کرتے ہو؟"

"بات؟" بڈھے کو شاید میری جہالت پر ترس آنے لگا۔ "بات صرف زبان سے ہی نہیں کی جاتی، بابو! تمھاری طرح ایک جانور بیچارہ بڑا حیران ہو کر ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا۔ بابا! تمھاری صرف دو ٹانگیں ہیں، پھر تم چلتے کس طرح ہو؟ — اب کوئی اس مورکھ سے پوچھے کہ سانپ کی ایک ٹانگ بھی نہیں ہوتی، پھر وہ کیسے چلتا ہے؟"

میں لاجواب ہو گیا۔

"بابو! یہ پہاڑ، یہ درخت، یہ نالے سب باتیں کرتے ہیں —"

"اچھا بابا! بتاؤ وہ درخت کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

اور بابا نے درخت کو بغور سننے کے لیے زمیں اس کی طرف اپنا سر اٹھا لیا۔

"پہلے تو یہ درخت چپ چپ رہا، بابو!" کانٹے والا مجھ سے گویا ہوا۔ "اور پھر تمھارے متعلق شکایت کرنے لگا کہ یہ اجنبی بابو جھٹ پٹ ہم سے گھل مل کیوں نہیں جاتا —"

میں ڈھیلا پڑ گیا۔

ہمیں اجنبیوں سے بڑا پیار ہے بابو! ان کے گورے رنگ سے! ان کی گوری بڈھی سے! اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی اپنی طرح لیں۔ ادھر آؤ بابو ——" وہ بکنگ آفس کے پچھلے دروازے سے مجھے باہر ایک جوہڑ کے پاس لے آیا۔ "پانی کے بیچ وہ مجانی (پودے) ھ رہے ہو؟ عام طور پر پودوں کی جڑیں زمین کے نیچے ہوتی ہیں مگر جوہڑ کے یہ پودے زمین کے اوپر اوپر ہی رہتے ہیں۔ ان کی جڑیں بھی زمین ے اوپر ہی ہوتی ہیں۔ ہم لوگ انھیں پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ ہمارا ہی پانی پی پی کر پلتے ہیں لیکن اپنی جڑوں کو ہماری دھرتی میں نہیں اترنے دیتے — لیکن ہمیں ایسے اجنبیوں سے بڑا پیار ہے بابو! جو یہاں رچ بس جاتے ہیں، جو ہمیں اپنے جیسا بنا لیتے ہیں۔ جب تم یہاں آئے تھے تو ری منرو نے تمہارے کوارٹر کے سامنے آم کے پیڑ کا بیج کھڑا کیا تھا۔"

"میں تو ایک ٹوٹی ہوئی ٹہنی ہوں بابا!" میں نے کانٹے والے سے کہنا چاہا، "جو اپنے گھر کے سایہ دار پیڑ کے ساتھ جڑ جانے کے ظار میں سوکھ رہی ہے!"

"ہمارا ہربرٹ صاحب کہا کرتا ہے بابو۔" کانٹے والا بول رہا تھا "بیج کی ٹہنی کہیں کی بھی ہو پر پیڑ تو اسی دھرتی کا ہو جاتا ہے جہاں اس شاخیں پھیلتی ہیں —"

اس کی باتیں سنتے ہوئے میں نے اطمینان سے اپنا جائزہ لیا اور جوہڑ کے مجانی کی طرح اپنی جڑوں سمیت افریقی دھرتی کے اوپر اوپر ہی ٹک کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

رات کو اپنے کوارٹر کے کمرے میں بھابیا جی کی دی ہوئی رامائن پڑھتے پڑھتے مجھے اونگھ آگئی اور یوں لگا جیسے باہر آنگن میں میری بی ماں بے ہوشی میں چل رہی ہے۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

وہاں تیترو کھڑی تھی اور اس کے سیاہ ہاتھ پر رکھے ہوئے گلاس سے بکری کا گرم گرم سفید دودھ چھلک رہا تھا۔

"لو دودھ پی کے سو جاؤ۔"

(۴)

ہوتے ہوتے تیترو نے میرے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا تھا۔

شام کے ساڑھے پانچ بجے کی گڈز ٹرین سے فارغ ہو کر میں گھر لوٹتا تو وہ ہمیشہ میری منتظر ہوتی اور مسکرا مسکرا کر دروازہ کھولتی۔ میں ایں چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا اور وہ رسوئی میں جا کر فوراً میرے لیے چائے لے آتی۔

"اچھی بنی ہے؟" میں ابھی پہلی چسکی ہی بھر رہا ہوتا کہ وہ پوچھ لیتی۔

"ہاں! بہت اچھی!"

"میں نے پہلے ہی چکھ کر دیکھ لی ہے۔" وہ نہایت خوش ہو کر جواب دیتی۔ "اگر اچھی نہ ہوتی تو میں جھٹ پٹ دوسری بار تیار کر لیتی۔"

اور تو اور اگر میرے بھابیا جی بھی ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے تو یہی سوچتے کہ میں نے اسے جورو بنا لیا ہے۔

"یہ میری جورو ہے؟!" اس کی طرف دیکھ دیکھ کر میری ہنسی پھوٹ پڑتی۔ "جورو ——" وہ کالی کلوٹی، سر پر الجھے سمٹے بالوں کے چھوٹے چھوٹے

ان گنت سیاہ بچے، اور یہ موٹے موٹے ہونٹ، مانو زبان کی بجائے اس کے ہونٹ ہی بولتے ہوں —— ہم ہم ہا ہم —— ہم —— یہ میری جورو! ——"

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

میری اداسی کبھی اس کی موجودگی میں کھلکھلا پڑتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ ساکت کھڑی خوشی سے گوما (افریقی ناچ) کر رہی ہے۔

"بس یونہی مجھے خیال آیا ہے کہ ہمارے ریل کے کالے بھوت انجن میں کیا کشش ہوتی ہے جو گورے گورے ڈبے اس کے پیچھے مارے پھرتے ہیں؟"

"میں بتاؤں؟"

"ہاں!"

"ڈبے اپنا راستہ بھول گئے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ کالی بھوکارٹ ان کے ٹھکانے ڈھونڈ نکالے گی؟"

ایک دن بیٹھے بیٹھے چائے پر مجھے دیر ہو گئی۔ سامنے پہاڑ کی پشت پر رات شاید سج سنور کر آ پہنچی تھی اور اپنی اس افریقی محبوبہ کو سجدہ کرنے کے لیے پہاڑ کا سر پستیوں میں ڈوب رہا تھا۔

چائے کی آخری چسکیاں بھرتے ہوئے میں نہ جانے کس سوچ میں مستغرق تھا کہ میرا دھیان اپنے سامنے کوارٹر کی دیوار کی طرف چلا گیا جہاں ایک بھولا بھٹکا کوا لگاتار کائیں کائیں کر رہا تھا۔

میٹرو نے بڑی معصوم شادمانی سے اپنی نظریں کوّے پر جما لیں اور بڑے عقیدت مند کانوں سے کائیں کائیں سننے لگی۔

میری بھرائی ہوئی فکر کی لہریں بیتاب ہو ہو کر نئے کنارے بنانے لگی۔

"تم اتنے دلگیر کیوں دکھائی دے رہے ہو بالو؟"

"میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا میٹرو۔" کوا بدستور کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"ہمارے دیش میں روایت ہے کہ جب کوا کسی گھر کی منڈیر پہ اسی طرح کائیں کائیں کرتا ہے تو گھر والے اسے اپنے بچھڑے ہوؤں کا سندیش سمجھتے ہیں۔"

میٹرو کو شاید مجھ پر ترس آنے لگا تھا، اس لیے میں نے اپنے لہجے کو قابو میں کرنا چاہا۔

"میٹرو! یہ کوا سات سمندر پار کر کے یہاں آیا ہے اور میری دیوار پر آ گرا ہے۔ ضرور یہ ہندوستان سے میرے گھر والوں کی خبر لایا ہے ——"

"نہیں بالو! یہ کوا ہندوستان کا نہیں، ہمارے دیش کا ہے۔" میٹرو نے مجھے ٹوک کر کہا۔ "اور ہم لوگوں میں کوّے کے بارے میں ایک اور ہی روایت مشہور ہے۔ ہمارے کوّے صرف اجنبیوں کی دیواروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتے ہیں، ان سے یہ کہنے کے لیے کہ اپنا اپنا رفیق اب یہیں ڈھونڈ لو ——"

پہاڑ کا سر اپنی افریقی محبوبہ کو سجدہ کرتے کرتے اب یکسر معدوم ہوتا جا رہا تھا ——!

(۵)

مجھے بسنتی کی چٹھی ملی گویا کوّے کی کائیں کائیں کو انسانی زبان میں سمجھانے کے لیے!

میں نے خوشی سے دیوانہ ہو ہو کر تیزی سے لفافہ کھولا۔

منگل کے دن ویرو کی شادی ہو رہی تھی! جیسے مرتے مرتے مریض کے چہرے پر رونق آ گئی ہو اور پھر جاں بلب ہونے کا عالم! میرے سر پر ایک ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا اور میں اس ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ ہوائی جہاز ہندوستان جا رہا تھا اور سارا سامان میرے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا ——

ویرو! —— ویراں! —— ویرو!!

لیکن آج تو بدھ وار ہے! ویرو کی شادی ہو چکی ہے! ویرو اپنے گھر جا چکی ہے!

ہائے! میں سوچا کرتا تھا کہ ویرو میرے گھر کی مالکن بنے گی۔ میرا یہ کوارٹر —— یہ گھر ویرو کا بھی ہو سکتا تھا!

"میں تو ڈرتی تھی جی! آپ کے افریقہ میں کسی طرح ہمیں مرضی کی خوراک مل جائے، پر یہاں تو دودھ کی ندیاں بہہ رہی ہیں —— اور لوچوں کے ڈھیر! موئے اپنے دیش میں تو انھیں آگ لگی رہتی ہے —— میں کہتی ہوں جی! اگر ہم گھر کے سبھی آدمی ساتھ لے آتے تو خوشی ہوتی! ابھی جی بھر بھر کے کھاتے پیتے —— اے جی! اٹھئے اب، آپ کی آٹھ بجے کی گاڑی کا ٹائم ہو رہا ہے! —"

ہاں! ویرو میری بھی ہو سکتی تھی! لیکن اب کیا فائدہ؟ اب تو —— اب تو وہ مر چکی ہے!

جدائی میں ہمارے سینے اعزا کے سینوں سے ملنے کے لیے پھٹتے رہتے ہیں لیکن اسی دوران میں ہمیں خبر مل جاتی ہے کہ ہمارے ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن گئے ہیں تو یہ سن کر پہلے تو کلیجہ منہ کو اچھل آتا ہے لیکن پھر ہماری بے قراریوں کے منہ پر گہری نیند کے آثار ہونے لگتے ہیں، شاید اس لیے کہ دوسری جانب ہمارے لیے رو رو کر ہلکان ہونے والے بھی اب اٹوٹ نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں!

رات کو سونے سے پیشتر میں نے کھڑکی سے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی، مانو یونہی دوریوں کے تصور سے مغلوب ہو کر! ایک تنہا کونے میں، ایک بھیگا بھیگا تارا ٹمٹما رہا تھا، گویا بسنتی کی آبدیدہ نظر میری ڈھارس بندھا رہی ہو۔ تھوڑی دیر میں یہ پرنم آنکھ بادل کی ایک لمبی چادر میں چھپ گئی۔

اندھیرے کی تاریکی میں سر تک رضائی اوڑھ کر سو گیا!

(۶)

مجھے بہت خوشی تھی کہ اب میں پہلے کی طرح اداس نہیں رہتا۔

"[illegible] بو —— وا!"

بہروں کی سماعت کا علاج درکار ہو تو ان کے لیے ایسی ہی مسرور آوازوں کا ریکارڈ بھر لینا چاہیے۔

میں نے اپنے کوارٹر کے دروازے کی طرف نظر اٹھائی تو تیرو کا مسکراتا ہوا تابندہ، سیاہ چہرہ وہاں آ رُکا۔

"ہم [illegible] میں جا رہے ہیں۔ آؤ، تم بھی چلو۔"

"یہ اتنی خوش کیوں ہے؟"

لیکن میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ خوشی کا کوئی خاص سبب نہیں ہوتا کیونکہ انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ خوش رہے سبب تو ہمیشہ انسان کی اداسی کا ہوتا ہے۔

"چلو گے؟ بابا بھی جا رہا ہے۔"

اور شدید تھکن کے احساس کے باوجود میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر میں ہم تینوں نیچے وادی میں اتر رہے تھے۔

"ماری! آہستہ چلو نا۔" کانٹے والے نے اپنی بیٹی کو پکار کر ہدایت کی جو ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھی، پھر وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ "آج یہ بہت خوش ہے۔"

"کیوں؟" بات چیت میں سے "کیوں" اڑا دی جائے تو شاید انسانی گفتگو بھی جانوروں کی طرح زبان کی محتاج نہ رہے۔

"نیچے وادی میں میرے بھائی کا بیٹا آج اس کی ایک سہیلی کو بیوی بنا کر گھر لایا ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

"با — بو — وا"

کسی پتھر کی طرح تیز تیز لڑھک کر میترو ہم سے بہت آگے پہنچ چکی تھی اور اب ذرا رک کر ہماری طرف ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھی۔

"با — بو — !"

"نہیں۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "آدمی صرف خوش رہنے کی خواہش سے ہی خوش نہیں رہ سکتا بلکہ خوشی کا بھی کوئی نہ کوئی حیلہ ہوتا ہے، کوئی بھولا بھالا، ننھا منا، بے ضرر سا حیلہ، جیسے یہ معصوم لڑکی اپنی ایک سہیلی کے دلہن بننے کی خبر پا کر من ہی من میں اپنے سارے چاؤ بھی پورے کر رہی ہے —"

"مجھے یوں لگتا ہے بابو، اب میری لڑکی کو بھی مرد کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔" گویا کانٹے والے نے گاڑی کی آمد کی اطلاع پا کر بڑی آسانی سے کانٹا بدلا ہو۔

"با — بو — وا" اور گویا میترو کی آواز لائن پر تیز تیز دوڑنے لگی ہو۔

ہم دونوں جلدی جلدی اس کے پاس پہنچے تو وہ ایک سفید بکری کے گلے میں باہیں ڈالے اس کے گال سے گال جوڑے ہے:

"میں اچھی لگ رہی ہوں یا یہ بکری؟"

اور بکری کی سفیدی مجھے اس کے کالے رنگ سے سنوری سنوری سی نظر آنے لگی۔

"تم سفید بکری ہو اور بکری —"

"کالی میترو۔" میترو کے بابا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

میترو نے شرما کر سر جھکا لیا، بالکل ہمارے دیش کی کنواریوں کی طرح، اور میں دیکھتا رہ گیا کہ جنگلی بکریاں بھی اس طرح شرماتی ہیں!

جب ہم کافی نیچے اتر آئے تو شام ذرا گہری ہو چکی تھی۔

یکایک میرے نتھنے آگ میں بھنتے ہوئے جنگلی شکار کا گوشت سونگھ سونگھ کر پھڑکنے لگے۔

"وہ دیکھو!" ٹیٹرو کے بابا نے وادی میں ایک طرف آگ کے ایک ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ بلندی اس پہاڑی پگڈنڈی کا پر بے صبری سے نیچے دوڑ دوڑ کر میری نگاہ سے بھی پہلے پتنگوں کی روشنی سے ملی ہے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے گویا ہمارے استقبال میں اپنا گانا تیز کر لیا۔

دائرے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ٹمبو (افریقی شراب) کا ایک ایک پیالہ پیش کیا گیا۔

ایک گبرو سر دھن دھن کر ڈھول کی تھاپ پہ گا رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ناچ کے گھنگھروں کی طرح چمک رہے تھے۔

"اس گیت کا یہ مطلب ہے" ٹیٹرو کا بابا میرے لیے گکیو بولی کے اس گیت کا ترجمہ سلیس افریقی زبان میں کرنے لگا "اری اجنبی! اب تو اپنے آپ کو اجنبی مت سمجھ، اب تو ہم میں سے ہی ایک ہے ---- گھر والے یہ گیت دلہن کی آمد پر گاتے ہیں۔"

"مزوری سانا" (بہت خوب) مٹی کے پیالے سے باقی ماندہ ٹمبو میں غٹ غٹ چڑھا گیا۔ "میں بھی تم میں سے ہی ایک ہوں۔"

"اگر یہ بات ہے" لڑکے کے باپ نے جو پاس ہی کھڑا تھا، اپنے کندھے سے لنگور کی کھال کا پہناوا اتار کر میرے کندھے پہ لٹکا دیا۔ "تو یہ لو!"

"اس کا مطلب ہے" ٹیٹرو کے بابا نے مجھے سمجھایا، "کہ اب تم ہمارے قبیلے کے ہو گئے ہو!"

"ہاں!" کسی نے میرے پیالے میں مزید ٹمبو انڈیل دی۔ "اب میں تم لوگوں کا ہو گیا ہوں۔"

ٹیٹرو لڑکیوں کی ٹولی سے نکل کر میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی نشیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سے [illegible]۔ مجھے معلوم ہونے لگا کہ میری اس سے پرانی جان پہچان ہے۔ انڈیا میں ہمارے گھر ایک تصویر تھی کرشن کی گھن روپ [illegible] ہرن کی طرح کالی تھی، بڑی خوبصورت، اور اس کی آنکھیں ہو بہو ایسی ہی تھیں!

(۷)

[illegible] دن جب میں کوارٹر پہ لوٹا تو ان لوگوں سے اتنا میل ملاپ بڑھانے پر بہت پچھتا رہا تھا۔

[illegible] کھول کر پاؤں اندر دھرنے لگا تو سامنے ایک ناگ اپنی طرف گھورتا ہوا نظر آیا۔ ابھی میں واضح طور پر یہ بھی نہ سوچ پایا تھا [illegible] کہ پچھتاوے اور نفرت کے روپ سے ملتا جلتا ہے کہ ظالم نے اچھل کر میرا ٹخنہ ڈس لیا۔

مجھے صرف یہی یاد ہے کہ میرے پیچھے سے ٹیٹرو بے دم ہو کر دوڑی دوڑی آئی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

شام کو جب مجھے ہوش آیا تو ٹیٹرو کا بابا میرے سرہانے مسکرا رہا تھا اور ٹیٹرو میرے پاؤں کی طرف زمین پر بیٹھی غالباً کوئی [illegible] رہی تھی۔

"مزوری بڑا ظالم تھا بابو! پر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ٹیٹرو نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے تمہارا سارا زہر چوس لیا ہے۔"

ٹیٹرو کے موٹے موٹے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تو میرا جی چاہا کہ نقاہت سے لڑکھڑاتا ہوا انھیں چوم لوں۔

جنبو اٹھ کر ذرا رسوئی میں گئی تو بابا نے خوش ہو کر کہا "تم ہماری عورتوں کے بھرے بھرے، جھٹ چپک جانے والے ہونٹوں کا ٹھپکا۔ کیا سمجھو گے بابو! جب میری لگائی زندہ تھی اور مجھے چوما کرتی تھی تو لگتا تھا گویا ــ مجھے یہی لگتا تھا کہ سانپ کے کاٹے کا منتر پھونک رہی ہے!"

جنبو نے کمرے میں لوٹ کر اپنے بابا کو ٹوکا۔ "بابو کو آرام کرنے دو بابا!"

"ہاں بستی میں چلتا ہوں" بابا نے اٹھ کر کہا "اسٹیشن کا چکر کاٹ آؤں۔ تم فکر نہ کرو بابو! ایک دو دن اسٹیشن کا کام میں خود ہی سنبھال لوں گا۔"

جب بابا چلا گیا تو میں نے جنبو کو اپنے پاس بلا لیا اور جب وہ سمٹ کر میرے سرہانے جھکی جھکی آ کھڑی ہوئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ پہلی بار اس کے بدن کو چھوا۔ یہ لمس! ملائمت کا صرف تخیل ہی! مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ کالی کھال اس قدر کومل اور صحت مند ہوتی ہے! اس کے نغموں میں رس بھرا جادو ہوتا ہے۔ میں افریقی جلد کے سیاہ طلسم سے بالکل واقف نہ تھا ——

میری نظریں اس کی دریائے نیل کی سی آنکھوں میں جھانک کر اس کی روح کو چھونے لگیں، جو اس کی جلد سے بھی زیادہ ملائم تھی۔

"جنبو! تو نے میرا سارا زہر چوس لیا ہے، سب بھرم مٹا دیے ہیں ——"

وہ مسکرانے لگی اور میں نے کوشش کر کے اپنا منہ آگے بڑھایا اور چنبیلی کے شگفتہ پھولوں کے میٹھے موٹے کناروں کی زرخیز، کالی مٹی کو چوم لیا۔

(۸)

"بابا!" دوسرے دن جب بابا میری عیادت کے لیے آیا تو میں نے اس سے پوچھا "اگر میں تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہوں تو کتنی بکریاں لو گے؟"

بابا اپنی خوشی میں میری کمزوری بھی بھول گیا اور میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے مسرت سے دھڑکتی آواز میں کہنے لگا۔

"اوروں سے پوری ایک درجن، مگر تم میرے سفید فام نواسوں کے باپ ہو گے! اس لیے تم سے صرف دو بکریاں ——" اس نے ایک اور ہاتھ میری پیٹھ پر دے مارا "یا اگر تم چاہو تو بے شک ایک بھی نہ دو ——"

دھرتی

رام لعل

رمیش ہاں سے مہینے کی دھمکی دے کر نیچے اترا تو دیا رانی نے اسے روکنا چاہا لیکن اس کی دیورانی سروج نے غصے سے چلّا کر کہا —— "اسے جانے دو دیدی! مرتا ہے تو مرے۔ روز روز کا ٹنٹا آج ختم ہو جائے۔"

وہ اپنے کمرے کے دروازے میں بھیگے ہوئے بالوں کو سکھانے کے لیے تولیے سے زور زور سے جھٹک رہی تھی۔ بڑی جیٹھانی نے آنگن میں واپس آ کر کہا —— "آخر بچہ ہے سروج!"

یہ سن کر سروج نے اپنے بھیگے ہوئے بال سر کو زور سے گھما کر پیٹھ پر پھینک دیے۔ قدرے بپھر کر بولی "ابھی یہ بچہ ہے! اگر ایسا ہی ہے تو پھر پڑھتا لکھتا کیوں نہیں؟ اس کی عمر کے لڑکے تو دن رات ایک کر کے وظیفے اور انعام پر انعام پا رہے ہیں۔ اسے یونیورسٹی کے نام سے ہی بیر ہے جیسے۔ سب کتابیں بیچ باچ کر کھا گیا۔ یہاں سے فیسیں لے جا جا کر سنیما اور جوئے پہ لگا دیں۔ کیوں؟ لو[illegible]ام کی کمائی ہے کیا؟ آئندہ سے ایک پیسہ نہیں دوں گی۔ میں نے خیرات خانہ نہیں کھول رکھا ہے!"

یا رانی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ کسی سوچ میں ڈوب کر سر جھکا لیا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "سروج! میں یہ تو کبھی نہیں بھول سکتی کہ [illegible] میری بڑی مدد کی۔ ڈوبتے کو سہارا دیا۔ میرا سارا سنکٹ ہر لیا۔ میرے بچوں کو پڑھایا لکھایا، ان کی شادیاں بھی کر دیں۔ ان کے سورگیہ [illegible] کو [illegible]ی بخشی۔ میں جب تک تمھارے قدموں پر پڑی ہوں تمھیں ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی۔ پھر بھی اگر تمھیں میری وجہ سے کوئی کشٹ [illegible] کہیں اور بھی چلی جانے کے لیے تیار ہوں لیکن بھگوان کے لیے تم یہ نہ سمجھ لینا میں تمھارا احسان بھلا کر ایسا کہہ رہی ہوں۔"

روج ہکا بکا رہ گئی۔ "دیدی!" اس نے آگے بڑھ کر اپنی جیٹھانی کو گلے سے لگا لیا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میرے منہ سے [illegible] غلط بات بھی نکل سکتی ہے لیکن میرا یہ مطلب کبھی نہیں تھا۔ نہیں دیدی نہیں۔ یہ تو میں اس نالائق رمیش کے لیے کہہ رہی تھی، اپنے بچے کے لیے۔ لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم مجھ پر بوجھ ہو؟ تم تو میری ساس کی طرح میرے لیے قابلِ عزت ہو۔ پھر تم نے بھی تو [illegible] مزدوری کرتی ہو۔ بتاؤ بھلا تم مجھ پر بوجھ کس طرح ہوئیں؟"

اچانک نیچے سے گھنٹی بجی۔ نیچے کوئی آیا ہوا تھا۔ سروج نے بڑی ملتجیانہ نظروں سے اپنی جیٹھانی کی طرف دیکھا اور کہا —— "کیا میں [illegible] کر سکتی ہوں کہ اب تم مجھے کبھی غلط نہیں سمجھو گی؟ نہیں نا؟"

دونوں کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں۔ دیا رانی آنکھیں پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سروج نے بھی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بکھرے ہوئے

گیلے بالوں کو جلدی جلدی ایک ڈھیلی کھلی کھلی چوٹی میں سمیٹا۔ اس کے کالے بالوں میں چاندی کی طرح سفید بالوں کی بھی بڑی کثرت تھی۔ وہ پینتیس برس کی تھی۔ صحت مند، گورے چکنے چہرے اور سڈول جسم کی۔ بڑی جذباتی اور سنجیدہ۔ بڑی ہمت والی بھی۔ اس کے باحوصلہ ہونے کا احساس اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور اونچی کھنچے ہوئے نتھنوں والی ناک، بھنچے رہنے والے پتلے پتلے ہونٹوں اور نوکیلی ٹھوڑی کی سختی سے بھی ہوتا تھا۔ ربڑ سول کی سرخ چپل، سفید وائل کی دھوتی اور پیلے رنگ کا بنا آستین کا بلاؤز پہنے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ نیچے اتر گئی۔

اس کے مکان کے نچلے حصے میں ناری شلپ نکیتن کا دفتر اور سلائی گھر تھا۔ دو بڑے بڑے کمروں میں بجلی اور ہاتھ سے چلنے والی مشینوں کے سامنے عورتیں اور مرد الگ الگ بیٹھے کپڑے سی رہے تھے۔ مشینوں کی مسلسل اور ایک ساتھ گونجنے والی گھرر گھرر سے ایک عجیب سی نغمگی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ سنگیت روز ہی گونجتا تھا۔ صبح نو بجے سے لے کر رات کے آٹھ بجے تک۔ پچھلے پندرہ برسوں میں سروج شاہ نے کپڑا سینے والی مشینوں کے مدھر سنگیت میں اپنی کئی مایوسیوں، محرومیوں اور کئی دوسری مشکلات کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کسی حد تک بھول بھی چکی تھی۔ اپنی نئی زندگی بنانے میں وہ خاصی کامیاب نظر آتی تھی لیکن آج اس کے دل پر اپنے بنا ماں باپ کے چھوٹے بھائی کے تعلیم سے جی چرانے اور بری عادتوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے بہت بڑا بوجھ تھا۔

وہ کاریگروں کے کمروں میں سے ہوتی ہوئی اپنے دفتر میں پہنچی جہاں دیوار سے لگے ہوئے ایک لمبے اور چوڑے صوفے پر ایک عورت اپنے ننھے منے بچے کے ساتھ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ یہ بات حیرت ناک تھی کہ سروج جو چند لمحے پہلے تک بہت ہی افسردہ نظر آ رہی تھی اپنے سامنے ایک دوسری عورت کو دیکھ کر ایسی آسانی سے مسکرا دی تھی جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔ اس کا دل خوشی اور اطمینان سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بچے کو بھی پیار کیا اور پھر اپنی چوڑی میز کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ "کہیے بہن جی! کیا حکم ہے؟"

اس عورت نے کپڑوں کا ایک بنڈل اس کی میز پر رکھ دیا اور بولی — "میں نے کبھی شلوار قمیص نہیں پہنی۔ اب تو ان کا بہت فیشن چل پڑا ہے۔ دو شلواریں اور دو قمیصیں بنا دیجیے۔ چار فراک اور چار نکریں اس راجیو کے لیے ہوں گی۔"

سروج جلدی جلدی کپڑوں کا بنڈل کھولنے لگی۔ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں شیشوں کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ ان میں عورتوں اور بچوں کے بڑے ہی سندر اور دلکش کٹنگ کے نئے نئے فراک، بلاؤز، قمیصیں اور شلواریں سجی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے پھولوں، بوٹیوں اور بارڈروں سے کاڑھے ہوئے رنگ برنگے دوپٹے اور ساڑھیاں بھی تھیں۔ عورتوں کے ہاف اور پورے کوٹ بھی بنتے جہاں وہ کھڑی تھی اس کے پیچھے کئی ایک سلائی کے فیشن کی کتابوں، بٹنوں، تاگوں اور دوسری ضروری چیزوں سے بھرے ہوئے ڈبے پڑے تھے اور ان کے اوپر دیوار پر ایک وجیہہ اور صحت مند نوجوان کا فوٹو ٹنگا ہوا تھا۔ کالے چمکیلے بال، آنکھوں پر جھکی ہوئی محراب دار گھنی بھویں، ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ، دھاریوں والے ہرے رنگ کے کوٹ کے ساتھ قمیص اور نکٹائی۔ یہ تھے سروج شاہ کے پتی مہاشے نریندر ناتھ شاہ۔

سروج نے سب کپڑوں کو ایک نظر دیکھ کر پلاسٹک کے ایک فیتے سے عورت اور اس کے بچے کا ناپ لیا اور ان سے ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کر کے انھیں رخصت کر دیا۔

کاریگروں کو کام دینے کے لیے اس کے پاس بہت سے کپڑے رکھے تھے۔ دوسرے کمروں میں سے کاریگر کام لینے کے لیے

ن کے پاس آنے لگے، عورتیں بھی اور مرد بھی۔ اس نے سب کو کام بانٹ دیا۔ جن کے پاس کام تیار تھا اس کی سلائی کی کمیشن دے کر اس سے کام واپس لے لیا۔ گاہک بھی [illegible] آتے رہے۔ شاپ نکیتن میں بہت دور دور سے گاہک آتے تھے۔ اچھی سلائی اور نئے نئے ڈیزائن پیش کرنے کی وجہ سے سروج شاہ نے بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ دو منزلہ مکان سروج نے اپنی ہی محنت سے بنایا تھا۔ اس کا ایک ایک اینٹ پر اس کی کڑی محنت اور حوصلے کی گہری چھاپ تھی۔ پندرہ سال پہلے جب اس نے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مشین چلانی شروع کی تھی اس وقت اس کے پاس اس مشین کے علاوہ اپنے پتی کی رُلانے تڑپانے والی صرف ایک یاد ہی تھی۔ پاکستان سے آنے کے دو مہینے بعد اس کا پتی اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کئی ہزار روپے تھے۔ وہ کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ بہت انتظار اور تلاش کے بعد بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ یہی سمجھ لیا گیا تھا آزادی کے بعد کی افراتفری میں کسی نے اس کی جان لے لی یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا

اس وقت سروج کی عمر بیس سال تھی۔ بیس سال اور کچھ مہینے۔ اس کی شادی ہوئے بھی آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ ان دنوں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ خود غرضی اور ستم پیشی ایک مجبوری بن گئی تھی۔ کوئی کسی کا شکوہ کرنے کے لیے بھی حق بجانب نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے سورگ باسی ماں باپ کا ہی رنج بھی تھا۔ اس کے سسرال میں ایک جیٹھ زندہ بچے جو فوج میں تھے۔ وہ اپنے بیوی بچے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ پارٹیشن کے ریلے میں دیارانی بھی دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کے ساتھ سروج کے پاس آ گئی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر اس سے اس کا خاوند ایک ہی بار ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے بعد اچانک ایک مہلک عارضے سے اس کا انتقال ہو گیا تھا لیکن وقت تو گزر جاتا ہے اچھا بھی اور بُرا بھی۔ انسانی زندگی میں جب بھی طوفان آتے ہیں، جب بھی آندھیاں چلتی ہیں اور حادثات گزرتے ہیں۔ وہ سب کہیں نہ کہیں گہرے، ہلکے نقوش یقیناً چھوڑ جاتے ہیں۔ دھرتی پر بھی اور چہروں پر بھی۔ انسان دھرتی کا ایک روپ ہی تو ہوتا ہے دھرتی کی طرح اجڑتا ہے۔ دُکھ سہتا ہے اور پھر پھلنے لگتا ہے۔ اتنے دل شکن حالات کے باوجود سروج بوڑھی نہیں ہوتی تھی۔ کمھلائی نہیں تھی۔ کچھ تنک مزاج ضرور ہو گئی تھی لیکن غصہ اسے کبھی کبھی ہی آتا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے اندر کی خلا اور ویرانی کا شدید احساس ہوتا تھا۔

اچانک شاپ نکیتن کے گیٹ پہ ایک نئی اور قیمتی کار آ کر رُک گئی۔ اس میں سے شہر کا میئر، اس کی بیوی اور رمیش نکلے۔ رمیش کو ان کے ساتھ دیکھ کر وہ چونک گئی۔ میئر ہنستا ہوا اندر آیا۔ بولا۔ "مسز شاہ! اس جانور کو کیوں گھر سے باہر ہانک دیا ہے؛ کانجی ہاؤس والے پکڑ کر لے جائیں، کیا یہی چاہتی ہو؟ یہ میری کار کے آگے آگے بڑی مستی سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے بہت ہارن دیا۔ اسے پکارا بھی لیکن اسے تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت میں تھانے میں ہونے کی بجائے تمہارے پاس آ کر اس کی شکایت کر رہا ہوں۔"

سروج کا دل غصے، تعجب اور ہمدردی سے بیک وقت بھر گیا۔ اس نے رمیش کو ہلکی سی چپت لگا کر ایک طرف بٹھا دیا اور پھر حافظ صاحب کا اس کی جان بچانے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے حافظ صاحب سے رمیش کے سارے کرتوتوں کی کہانی بھی کہہ سنائی جسے سن کر میئر نے کچھ سوچا اور پھر کہا ــــ تم فکر نہ کرو مسز شاہ! کل اسے میرے پاس بھیج دینا ــــ میرے کاغذ کے کارخانے میں ایک ایسی جگہ خالی ہے جہاں اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے اور دن بھر کی مصروفیت بھی رہتی ہے۔ خدا نے چاہا تو

وہاں سے یہ آدمی بن کر نکلے گا۔"

سروج نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا۔ اس کی مشکلیں اسی طرح کسی نہ کسی کی بروقت مدد سے آسان ہوتی رہی تھیں۔ اسی لیے تو اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ سیٹھ بیگم جو اب تک خاموش بیٹھی تھی موقع پا کر بولی — "ہم تو تمھارے ہی پاس کپڑے سلوانے آ رہے تھے۔" یہ کہہ کر اس نے کار میں رکھے ہوئے کپڑوں کے دو بنڈل منگوائے۔ وہ لوگ پچھلے کئی سالوں سے اسی سے کپڑے سلوا رہے تھے۔

وہ ابھی شلپ نکیتن ہی میں تھے کہ کسی پاٹھ شالا کی ہائی سکول کی لڑکیوں کی فوج کی فوج اندر گھس آئی۔ انھیں اپنی یونیفارمیں سلوانی تھیں۔

سروج اپنے معزز گاہکوں سے معذرت خواہ ہو کر اور انھیں وداع کر کے لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک ہی رنگ کے کپڑے کی یونیفارمیں بنانا تھیں۔ چونکہ لڑکیاں بہت کافی تعداد میں تھیں اس لیے ان سب کا ناپ لیتے لیتے دوپہر ہو گئی۔ اس درمیان میں اس کی جیٹھانی اپنا شلپ کا کام ختم کر کے دو ایک بار جھانک گئی۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ سروج تو کھانا ہمیشہ دیر سے کھاتی تھی۔ کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا تھا۔

جب لڑکیاں ایک دوسرے کو دھکا دیتی، ہنستی، چلاتی ہوئیں باہر چلی گئیں تو دیورانی اسے بلانے کے لیے ایک بار پھر اندر آئی۔ لیکن اسی وقت ایک تانگہ پانچ لڑکیوں اور ایک تیس برس کی عورت اور تھوڑے سے سامان کے ساتھ لدا پھندا شلپ نکیتن کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس عورت کے ہاتھ میں شلپ نکیتن والی سروج کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

وہ سب اندر آ گئیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے اوپر آتی ہوئی لگتی تھیں۔ بارہ، آٹھ، چھ، چار اور ایک سال کی۔ سب سے چھوٹی کو بڑی لڑکی نے بغل میں لے رکھا تھا۔ سب کی سب میلے اور معمولی فراکوں میں بکھرے بکھرے بے ترتیب بالوں میں۔ اس عورت نے بھی بہت اچھے کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ اس کے بھورے کالے بالوں پر سفر کی گرد جمی ہوئی تھی جیسے کہیں بہت دور سے لڑکیوں کو لیے آ رہی ہو۔ وہ دبلے پتلے شریر کی بڑے دلکش ناک نقشے والی عورت تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ تھکی ہوئی بھی لگتی تھی۔

سروج ان سب کو اپنی چوڑی میز کے پار سے بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ انھیں نہیں جانتی تھی لیکن وہ اسی کے پاس آئی تھیں۔

باہر سے آنے والی عورت کچھ دیر تک صوفے پر لڑکیوں کے درمیان اس طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے چاہتی ہو سروج اسے پہچان لے تو پھر وہ کچھ کہے۔ جب سروج خاموش رہی تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور بولی — "میرا نام کنتی ہے۔ میرا باپ انجینئر تھا۔ ہم دونوں نے کتنے دن تک ایک ہی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ خانیوال سے جالندھر تک۔ پھر کچھ دن ہم ایک ہی کیمپ میں بھی رہی تھیں۔ یاد ہے؟"

سروج کو جیسے ایک لمحے میں سب کچھ یاد ہو آیا۔ اس نے کنتی کو کپڑوں کا اپنا ایک فالتو جوڑا بھی دیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی توے پر روٹی پکاتی رہی تھیں۔ ایک ہی برتن میں کھانا تیار کرتی تھیں۔

"ارے تو کنتی! میری اچھی کنتی!" وہ خوشی سے باؤلی ہو کر اس سے لپٹ جانے کے لیے دوڑ پڑی لیکن کنتی نے اسے روک دیا۔ میز پر پڑی ہوئی وزنی قینچی اٹھا کر دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھ کر بولی "رک جاؤ۔ اس طرح مت بھاگو۔ پہلے میری بات سن لو۔ تم جس پتی کی پتنی تھیں اگر میں یہ کہوں کہ میں بھی پچھلے پندرہ سال اسی کی پتنی رہی ہوں تو تم یہ قینچی لے کر میرے منہ پر تو نہیں دے مارو گی؟ لیکن مارو، میں تمھارے ہاتھ سے یہ چوٹ سہنے کے لیے ہی آئی ہوں۔"

سروج جہاں تھی وہیں رکی رہ گئی۔ بالکل سکتے کے عالم میں، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اگر سنا بھی ہو تو کہیں بہت دور سے۔ اتنی دور سے کہ وہ آواز ابھی تک صاف صاف شبدوں کی شکل بھی اختیار نہ کر سکی ہو لیکن کنتی نے اس کے پتی کا نام کیوں لیا تھا۔ وہ دراصل کتنا

ما چاہتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے پتی کی تصویر کو دیکھا۔ پھر اپنے اندر کے سارے طوفانوں کو جو نہ جانے کیسے اس قدر اچانک اٹھ کھڑا ہوا تھا، دبا کر بڑے ضبط سے پوچھا۔ "کنتی! تم یہاں کیوں آئی ہو؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

لیکن کنتی کوئی جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ سروج کی جیٹھانی حیرت سے بھی ایک طرف کھڑی رہ گئی تھی۔ کنتی کے رونے کی آواز سن کر سارا اسٹاف جمع ہو گیا تھا۔ سروج نے ان سب کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کی جیٹھانی نے سارے دروازے بند کر دیے اور اس عورت کو خاموش کرانے کے لیے اس کے پاس گئی۔

"تم کون ہو بہن؟ یہاں کیوں آئی ہو؟ تمہیں کیا دکھ ہے؟"

سروج کا دل ایک عجیب سی چبھن سے چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا ایک دن اس عورت نے ان سب کے کپڑے دھوئے تھے۔ وہ بہت بیمار تھی۔ اس کا پتی اسے پانی بھر بھر کر لا کر دیتا رہا تھا۔ دونوں نے مل کر کپڑے سکھائے تھے۔ پھر مل کر کھانا بنایا تھا بس اتنی سی بات اسے یاد تھی جو اب پھوڑے کی طرح اس کے ذہن میں ابھر آئی اور پھر اس نے اچانک میز پر رکھی ہوئی قینچی اٹھا لی۔ اس نے کنتی کے جسم کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ اس تصویر کو بنایا جو دیوار پر ٹنگی تھی۔ تصویر کا شیشہ چھن سے ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گیا اور تصویر الٹی ہو کر [illegible] کانپنے لگی۔

"کہاں ہیں وہ جنھوں نے مجھے پندرہ سال سے بیوہ بنا رکھا ہے؟ میں انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

کنتی نے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور روتے روتے بولی "اب وہ زندہ نہیں ہیں۔ پانچ مہینے ہوئے ٹی بی سے چل بسے۔ دو سال ہوئے ایک بار یہاں تم سے ملنے کے لیے آئے تھے لیکن شرم کے مارے ملے بغیر ہی لوٹ گئے۔ مرنے سے پہلے مجھے ہدایت کر گئے تھے میں لڑکیوں کو لے کر تمھارے ہی قدموں میں جاؤں کیونکہ انھیں یقین تھا تم انھیں اور مجھے ضرور معاف کر دو گی۔"

شام کے ساتھی

رتن سنگھ

بابے کھیمے کو سردیوں کے دنوں میں دھوپ سینکنے میں کہیں لطف آتا تھا، تو صرف مائی ویراں والی کے آنگن میں۔ اور مائی ویراں والی کو گرمی کے موسم میں اور سارا گاؤں چھوڑ کر بابے کھیمے کے پیپل کی چھاؤں ہی زیادہ ٹھنڈی لگتی تھی۔ اس طرح کئی سال گزر گئے تھے اُن کو اکٹھے بیٹھتے۔

بابے کھیمے کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ نہیں نہیں! کہنا یوں چاہیئے تھا کہ اُن کی شادی نہیں ہو پائی تھی۔ بیاہ کی عمر میں تو وہ کالے پانی میں عمر قید کاٹ رہا تھا، ایک قتل کے مقدمے میں پھنس کر۔ اور جب وہ قید کاٹ کر لوٹا تو پینتالیس سال کا ادھیڑ تھا جس کا جسم طویل قید کی مار نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے، اور چہرے سے جیتی جاگتی زندگی کے آثار مٹ سے رہے تھے۔ بہت ہی بے رونق سا ہو گیا تھا اُس کا چہرہ۔ ویسے تو کچھ مہینے آزاد فضا میں سانس لینے کے بعد اُس کے چہرے پر رونق پھر لوٹ آئی تھی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش اُس کے دل میں ترنگ بن کر اٹھی تھی لیکن اُس کی شادی نہ ہو سکی۔ کئی تو کہتے ہیں کہ بڑے بھائی نے ہی کھیمے کی شادی نہ ہونے دی کہ کہیں وہ بیاہ کے بعد اُس سے جائداد کا حصہ نہ مانگ لے۔ اور کئی کہتے ہیں، کہ عمر قید کاٹ کر آئے مجرم کو کون اپنی بیٹی دیتا۔ بات کچھ بھی ہو کھیمے کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔

شادی نہ ہونے کے دکھ کو کھیمے نے اِسی طرح برداشت کر لیا جیسے قید کی جسمانی و ذہنی تکلیفوں کو برداشت کیا تھا۔ لیکن لوگوں کی تیکھی زہریلی نظروں کو وہ برداشت نہ کر سکا۔ لوگ اُس کی طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی کوڑھی ہو۔ گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اُسے جلدی جلدی دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی دروازوں کے پیچھے ہو رہی کھسر پھسر بھی اُسے سنائی دیتی۔ چھوٹے چھوٹے بچے اُس سے ڈرتے تھے۔ اُس کے پاس آ کر سہم جاتے تھے، جیسے وہ انہیں کچا ہی کھا جائے گا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لوگ اُس کی طرف انگلیوں سے اِشارے کرتے ہوں کہ وہ جا رہا ہے کھیما جو عمر قید کاٹ کر آیا ہے۔ کبھی کبھی تو اُسے اِتنا غصہ آتا کہ اُس کا دل چاہتا کہ ان انگلیوں کو کاٹ کر رکھ دے یا کسی کا قتل کر کے پھر جیل چلا جائے۔

لیکن کھیمے نے کچھ بھی نہ کیا۔ دراصل اُس کا خون ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اُس کا غصہ اب پانی کے اُبال کی طرح تھا۔ منٹ دو منٹ کیلئے رہتا اور بس۔ ویسے بھی وہ جیل سے اچھی زندگی جینے کی تعلیم لے کر نکلا تھا۔ اور وہ سچ مچ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ جیل میں اُسے کئی قسم کے کام سکھائے گئے تھے۔ چارپائیاں بُننا۔ طرح طرح کے رسّے بنانا۔ کھادی کا کپڑا بُننا۔ وہ ان ہنروں کو استعمال میں لانا چاہتا تھا۔

نے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ لڑتا، اُس نے اُن سے اچھا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ کسی کا کوئی کام ہو کسی قسم کا، کھیما ہنس کر کر دیتا۔ اس کے متعلق طنزیہ باتیں کرتے رہتے۔ لیکن وہ اپنے کام میں مست رہتا۔

اس طرح زندگی بسر ہوتی رہی اور اب وہ اسی سال کا ہو گیا تھا۔ اب گاؤں کے لوگ قریب قریب بھول چلے تھے کہ کھیما عمر قیدی ہے۔ اُس کے بہت سے ساتھی مر کھپ چکے تھے یا وہ اُس کی طرف زہریلی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ نئی پود میں توں کو تو معلوم ہی نہیں تھا اور جن کو معلوم بھی تھا وہ کھیمے کے بزرگ ہونے کی وجہ سے اُس کی عزت کرتے تھے۔ اس لیے اُن کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے عمر قیدی کہہ کر اُس کی توہین کریں۔

اسی لیے کھیما خوش تھا۔ اور اب تو اُسے مائی ویراں والی جیسی ساتھن مل گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ مائی ویراں والی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بڑھاپے کا سونا پن ختم کرنے کے لیے اُسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور یہ ساتھی اُسے ملا تھا بابا کھیما۔ کھیمے کے گھر آتے جاتے رہنے سے مائی ویراں والی کو گھر میں مرد کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کھیمے کو دمے کی بیماری تھی۔ ضرورت پڑنے پر مائی ویراں والی اُسے جوشاندہ یا چائے وغیرہ بھی بنا دیتی تھی۔ تھکا ہوا ہو تو اُس کی ٹانگیں اور کمر بھی دبا دیتی تھی۔

جب شروع شروع میں بابے کھیمے اور ویراں والی نے ایک ساتھ بیٹھنا شروع کیا تو کچھ لوگوں نے ہنسی ہنسی میں کہا: "بابا! ویراں والی پر چادر ڈال لو۔" رام سنگھ کے لڑکے اور روینا ناتھ نے ایک دن سب کے سامنے اُن دونوں کے اوپر ایک چادر تان دی۔ نمبردار نے ہنستے ہنستے چادر ڈالنے کی ارداس بھی پڑھ دی۔ سنت رام کا گھر نزدیک ہی تھا وہ جھولی بھر کر شکر بھی لے آیا اور وہاں بیٹھے لوگوں میں بانٹ دی۔ کنوارے لڑکوں نے وہ شکر چھین چھین کر کھائی تاکہ اُن کے بیاہ جلدی ہوں۔ اس مذاق کا نہ تو بابے کھیمے نے بُرا منایا نہ مائی ویراں والی نے۔ بلکہ دونوں ہنستے رہے۔ مائی ویراں والی بھی ہنستی رہی اور چادر ڈالنے والوں کو گالیاں دیتی رہی۔ "وے ٹٹ پینیو، تمہارا کچھ نہ رہے۔" لیکن وہ چادر کے نیچے بیٹھی رہی۔ کھیما تو اُس دن بہت خوش تھا۔ جیسے سچ مچ اُس کی شادی ہو گئی ہو۔ اس واقعے کے تین چار دن بعد اماوس تھی۔ بابا کھیما اور مائی ویراں والی کھڑک سنگھ کی بیل گاڑی پر بیٹھ کر اماوس کا اشنان کرنے کے لیے امرتسر کو چلے تو نمبردار نے کہا: "بابا کھیما ہنی مون منانے کے لیے پہاڑ پر جا رہا ہے۔"

سارے گاؤں والے اس بات کو دہرا کر کئی دنوں تک ہنستے رہے۔

ویراں والی کا ساتھ مل جانے سے بابا کھیما یوں محسوس کرتا تھا جیسے ساری عمر کانٹوں پر گھسیٹنے کے بعد کوئی اُس کے لہولہان جسم کو پھولوں کی سیج پر پھینک گیا ہو۔ سچ مچ بابے کھیمے کو سکھ کا سانس ابھی لینے کو ملا تھا۔ ایک عمر تو جیل میں بیت گئی تھی اور دوسری لوگوں کی زہریلی نظروں کو برداشت کرتے۔

لوگ کہتے تھے جب سے بابے کھیمے اور مائی ویراں والی کا ساتھ ہوا ہے، بابے کھیمے کی عمر بڑھ گئی ہے۔ جب تک مائی ویراں والی جیتی ہے تب تک تو موت بھی بابے کھیمے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک دن بابا کھیما ویراں والی کے آنگن میں بیٹھا اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ کچھ دیر تک دونوں بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ کھیما اُٹھ کر اپنے گھر کو چلا تو مائی ویراں والی

نے روک لیا۔ کہیں راستے میں بارش نہ آ لے۔

وہ دونوں اندر چلے گئے۔ باہر کی کوٹھڑی میں ہوا زیادہ زور سے آ رہی تھی۔ اِس لیے وہ اندر کے کمرے میں بیٹھے۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بابے کھیمے نے تھوڑی دیر بعد کہا "ویراں والی! دیا جلا لو۔ تمہاری کوٹھڑی میں تو بہت اندھیرا ہے"

ویراں والی کو ڈھونڈنے پر ماچس نہ ملی۔ اِس لیے انھیں اندھیرے میں ہی بیٹھنا پڑا۔ وہ کافی دیر بیٹھے رہے۔ بات کرنے کو کوئی تھی نہیں۔ دوپہر کو انھوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ ایسے ہی کوئی بات چلانے کے لیے مائی ویراں والی نے بابے کھیمے سے پوچھ لیا "بھلا جیل کی کوٹھڑی میں اِس سے زیادہ اندھیرا ہوتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ....."

مائی ویراں والی کے دل میں کچھ نہیں تھا۔ وہ جیل کا نام لے کر بابے کھیمے کا دِل دُکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ بات اُس نے بالکل غیر شعوری طور پر کی تھی۔

لیکن یہی بات بابے کھیمے کے دل کو چیرتی چلی گئی۔ تیکھے کانٹوں کی طرح۔ "اچھا! تو یہ بھی مجھے عمر قیدی ہی سمجھتی ہے۔" اُس نے سوچا۔ منٹ دو منٹ تک وہ مائی ویراں کی طرف اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر وہ چُپ چاپ اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

ویراں والی اُسے روکتی ہی رہ گئی۔ منتیں کرتی رہی۔ باہر بارش ہے۔ ابھی نہ جاؤ۔ لیکن بابا کھیما کسی کام کا بہانہ کر کے گھر آ گیا۔

جب بابا کھیما اگلے دن سویرے مائی ویراں والی کے گھر دھوپ سینکنے کے لیے نہ آیا تو مائی ویراں والی کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ کھیما اُس سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ اور وہ اُسے منانے کے لیے اُس کے گھر کی طرف چل دی۔

بابا کھیما اپنے پیپل کے نیچے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن اندرونی درد سے اُس کا دل رو رہا تھا۔ مائی ویراں والی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس کا تمام غصہ جاتا رہا اور اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

(۲)

جو افسانے بروقت مل گئے تھے۔
وہ سب پہلے حصّہ میں آ گئے ہیں۔
جو بعد میں ملے۔ انھیں یہاں پیش کیا
جارہا ہے۔ (ادارہ)

روشن

عصمت چغتائی

اصغری خانم دو باتوں میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک تو دین و دھرم کے معاملے میں اور دوسرے شادیاں کروانے میں۔ اُن کی بزرگی اور پارسائی میں تو کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سب کو یقین تھا کہ انھوں نے اتنی عبادت کی ہے کہ جنت میں کے لیے ایک شاندار زمرد کا محل ریزرو ہو چکا ہے۔ حوریں اور فرشتے وہاں ان کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ کابدھنا، جائے نماز اور تسبیح سنبھالے برقع پھڑکائے جنت کی دہلیز پر ڈولی سے اتریں اور وہ انھیں دُودھ اور شہد کی نہروں میں پستے اور بادام کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلاتے ہوئے زمرد کے محل میں بٹھا دیں اور اُن کی سیوا پر جٹ جائیں۔

اصغری خانم کا غصہ ہمیشہ ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ اگر ذرا بھی کسی جنتی بیوی نے چیں چپڑ کی تو وہ اس کی سات پشت مُردے اکھاڑنے لگیں گی۔ اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے گی اور دوزخ کی آگ کی پناہ لے گی۔

دُور دُور خانم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انھیں ساری دنیا کا کچا چٹھا معلوم تھا۔ مجال تھی جو کوئی اُن کے سامنے بڑھ چڑھ بولے۔ غازی پور سے لے کر لندن تک کی ہر بدکار عورت کا بھید جانتی تھیں۔

“اے ہے موئی بیاہی تیاہی ڈھڈو نے نگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا” وہ مسز سمسن اور ایڈورڈ ہشتم کے عشق پر تبصرہ کرتیں۔ “منہ جلی کو لاج بھی نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو خصمی (جس نے تین خصم کئے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کا بس نہیں چل سکتا تھا۔ لندن سات سمندر پار تھا۔ اور اُن کو گھٹنوں میں آئے دن ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چونڈا جھلسنے کیسے جاتیں۔ اتنا دم ہوتا تو حج نہ کر آتیں۔

مگر شادیاں کرانے میں تو وہ ایسے ایسے معرکے مار چکی تھیں کہ دنیا میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریب قریب ناممکن قسم کی شادیاں کرانے کا انھوں نے ریکارڈ قائم کر دیا تھا جسے وہ خود ہی آئے دن توڑا کرتی تھیں۔ بس اسی وجہ سے لوگ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ کنواریاں کس گھر کا بوجھ نہیں ہوتیں۔ جس گھر میں چلی جاتیں لوگ سر آنکھوں پہ بٹھاتے سر جھکا کر اُن کی گالیاں، کوسنے، طعنے مہنے سنتے۔ انھوں نے ایسی ایسی ٹڈماؤنی شکل کی لڑکیوں کے نصیب کھولے تھے کہ لوگوں پر اُن کی ہیبت بیٹھ گئی تھی۔ خاص طور پر یہ کنوارے لڑکے تو اُن سے ایسے کانپتے تھے جیسے وہ موت کا فرشتہ ہوں۔ نہ جانے کس پر مہربان ہو جائیں اور اپنے بٹوے میں سے کوئی کچھل پائی نکال کر سر پہ منڈھ دیں۔ جہاں کوئی شادی کے لائق نظر پڑ جاتی وہ پنجے جھاڑ کر اس کے

ب اور سارے محلے ٹولے والوں کے پیچھے لگ جاتیں اور شادی کے قابل نہ رہتے تو۔ اُلٹے مگر وہ شادی کرا کے ہی دم لیتیں۔ پہ بیٹیاں چلتیں کہ الٹا لڑکا دہلیز پر ناک رگڑنے لگتا۔ لوگوں کا کہنا تھا اُن کے قبضے میں جنات ہیں جو اُن کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔ مگر ایک جگہ اُن کے سارے ہتھیار کُند ثابت ہوئے۔ تمام تعویذ گنڈے چوپٹ ہو گئے۔ ان کی اپنی ممیری بہن توفیق جہاں کی بیٹی صبیحہ کو چھبیسواں سال لگ چکا تھا اور ابھی تک کنوار کوٹھہ چُنا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی عقیلہ منگی ہوئی تھی۔ عقیلہ کی پیٹھ کی میمونہ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے چھوٹی منو تھی۔

قبر کے بھی چار کونے ہوتے ہیں۔ توفیق جہاں بکی قبھوتی کھڑی تھی۔ آج تک خاندان میں نہ کوئی باہر کی لڑکی آئی تھی نہ گئی تھی۔ سیدوں کے گھرانے کو داغ لگانے کی کسے ہمت تھی۔ لڑکوں کا تو دن بدن کال پڑتا جا رہا ہے۔ کسی کی تنخواہ ٹھیک ہے تو نسل میں کھوٹ، کوئی کمبوہ ہے تو کوئی پٹھان۔ ایک بیچارے انجینئر کی شامت آئی پیغام بھجوا دیا بعد میں پتہ چلا کہ سبے ہے ہوئے انصاری ہیں۔ اصغری خانم نے ستیہ گرہ شروع کر دی، طوفان کھڑا کر دیا۔ ان کے جیتے جی بیٹی انصاریوں میں جائے ایسی بھاری پھانی کا بوجھ ہے تو کوئیاں میں ڈال دو۔

یہ جب کی بات ہے جب صبیحہ کو میٹھا برس لگا تھا۔ اس کے بعد جب چھ برس چھ صدیوں کی طرح چھاتی پر سے دندناتے گئے تو اصغری خانم کو اپنی پالیسی نرم کرنی پڑی اور یہ طے پایا کہ اچھے خاندان کا لڑکا ہو تو کوئی زیادہ بڑا اندھیر نہیں۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صبیحہ کوئی بدصورت ہو، کہ کوئی کمتری اور جاہل مراثیوں کا لٹھ ہو۔ سانولی سلونی بوٹا سا قد، نازک ہاتھ پیر، کمر سے نیچے لٹکتی ہوئی چوٹی، سوئی سوئی آنکھیں جن میں قدرتی کاجل بھرا ہوا تھا، جی بھر کے دیکھ لو تو نشہ آ جائے۔ ہنس دیتی تو موتی سے رل جاتے۔ آواز ایسی میٹھی کہ نوحے پڑھتی تو سننے والوں کی ہچکی بندھ جاتی۔ اس پر سونے پر سہاگہ علیگڑھ سے پرائیویٹ میٹرک پاس کر چکی تھی۔

مگر نصیب کی بات تھی، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ورنہ کہاں صبیحہ اور کہاں روشن۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں عورت مرد کا جوڑ آسمانوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اگر صبیحہ اور روشن کا جوڑ بھی آسمان پر طے ہوا تھا تو ضرور کچھ گھپلا ہو گیا۔ فرشتوں سے کچھ بھول چوک ہوئی۔ یہ دھاندلی آسمانی طاقت نے جان بوجھ کر اصغری خانم کو ستانے کے لیے تو ہرگز نہ کی ہوگی۔

مگر الزام سارا اصغری خانم کے ماتھے تھوپ دیا گیا۔ لڑکا لڑکی صفا چھوٹ گئے اور وہ دھر لی گئیں۔ صمد میاں کو کسی نے کچھ نہ کہا کہ وہ بہن کی بانہہ پکڑ کے اُسے عذاب دوزخ جیسے کو جھونک آئے۔ سارا گھر منہ پیٹ کے رہ گیا، کسی کی ایک نہ چلی۔

ہائے اصغری خانم کہیں منہ دکھانے کی نہ رہیں۔ کیا آن بان شان تھی بیچاریوں کی۔ مجال تھی جو محلہ میں اُن کے بغیر کوئی کاج ہو جائے۔ کسی کی منیا کا کن چھیدن ہوتا تو انھیں کو دبوچ کر بیٹھنے کے لیے بلوایا جاتا۔ کسی کے بال بچہ ہونا ہوتا وہی پیٹ تھام کر سہارا دیتیں۔ پھر توفیق جہاں تو ان کی سگی ممیری تھیں اور روشن کو شیشے میں اتارنا کوئی کھیل نہ تھا۔ اس لیے معاملہ انہی کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا۔

صمد میاں چھ سال انگلستان رہ کر لوٹے تو بیٹے کی سلامتی کی خوشی میں توفیق جہاں نے میلاد شریف کروایا تھا۔ بریلی والے میاں خاص طور پر میلاد پڑھنے تشریف لائے تھے۔ سب عورتیں اندر والے گول کمرے میں بیٹھی ثواب لوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں چک سے لگی کھسر پھسر کر رہی تھیں کہ اتنے میں صمد میاں روشن کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ شاید میلاد شریف کے بارے میں بھول ہی

چلے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید لوٹ جاتے مگر میاں صاحب نے گھور کر دیکھا تو پکڑے گئے۔ مجبوراً دونوں ایک طر بیٹھ گئے۔

"ہائے یہ کون ہے؟" لڑکیوں نے روشن کو دیکھ کر کلیجے تھام لیے۔ صمد میاں کے سارے دوستوں کو دیکھا تھا۔ کمبخت بھی تو چمرخ مرگھلے اور گھونچو تھے۔ مگر روشن اپنے نام کی طرح روشن تھے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ کلیجے منہ کو آ گئے۔ جیسے دن پھاڑ کر آفتاب سوا نیزے پر آ گیا۔ کیا تیز تیز جگمگاتی آنکھیں جو ہنستے میں یوں کھو جاتیں کہ جی گم ہو جاتا۔ دانت گویا موتی چن دیئے ہوں۔ چوڑے چکلے شانے لمبی لمبی بُت تراشوں جیسی سڈول انگلیاں اور رنگت — جیسے مکھن میں زعفران کے ساتھ چٹکی بھر شہابی رنگ ملا دیا ہو۔ پنچوں نے دیکھا کہ صبیحہ کے سونے چہرے پر یکایک ہلدی بکھر گئی۔ گھنی گھنی پلکیں لرزیں اور جھپک گئیں۔ ہونٹ میٹھے میٹھے ہو گئے۔ لڑکیوں کو مکاری سے مُسکراتا دیکھ کر بگڑ بیٹھیں۔

صمد میاں اور روشن ننگے سر بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایک ڈاڑھی والے بزرگ غرّائے:

"اے صاحبزادے اتنے بھی جنٹلمین نہ بنئے۔ میلاد شریف کے موقع پر ننگے سر بیٹھنے والوں کے سر پر شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

روشن نے سہم کر صمد کی طرف دیکھا۔ انھوں نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر چپاتی کی طرح سر پر منڈھ لیا۔ روشن نے بھی اُن کی نقل کی۔ ہوا سے رومال اُڑا تو بندر کی طرح سر پر ہتھیلی جما کر بیٹھ گئے۔ ایسی بھولی بھولی شکل لگی کہ لڑکیوں کی پارٹی میں گدگدی رینگ گئی۔ صبیحہ کے مکھڑے کی ہلدی میں ایکدم گلال گھل گیا اور نارنجی رنگ پھوٹ نکلا۔

ڈاڑھی والے حضرت جو مونچھ ڈاڑھی صفاچٹ ولایت پلٹ لڑکوں کی گھات میں بیٹھے تھے اور اپنی قہر آلود نگاہیں لونڈوں پر گاڑ رکھی تھیں۔ مگر یہ دونوں بھی چوکنے بیٹھے تھے۔ اور بالکل بندروں کی طرح اُن کی نقل میں آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر سُن رہے تھے اور سر دُھن رہے تھے۔ بڑے میاں نے درود پڑھ کر انگلیوں کے پوروں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ جھٹ صمد میاں نے اُن کی نقل کی اور روشن کو کہنی ماری۔ انھوں نے بھی بوکھلا کر جلدی سے انگلیاں چوم لیں ایسے بھونڈے پن سے کہ لڑکیوں کے دل اُچھلنے لگے۔ بڑے میاں کا جی خوش ہو گیا۔ وہ انھیں بڑے فخر سے بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ سیّد کا بیٹا انگلستان کیا امریکہ بھی چلا جائے رہے گا کھرا سیّد۔ مگر لڑکیوں کو خوب معلوم تھا کہ ان لوگوں کو خاک کچھ یاد نہیں یونہی ملاؤں کی طرح بڑ ہونٹ ہلا رہے ہیں۔ انکی اس شرارت پر اتنی بُری طرح ہنسی کا حملہ ہوا کہ صغرا خانم نے دُور سے پنکھے کی ڈنڈی دکھا کر دھمکایا تب کہیں جا کر ہنسی نے دم توڑا۔

میلاد شریف کے خاتمے پر جب سلام پڑھا گیا تو سب کھڑے ہو گئے۔ بڑے میاں نے محبت سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر سلام پڑھنے میں شریک ہونے کا اشارہ کیا۔

"پڑھو میاں، خاموش کیوں ہو —"

"جی — ا — جی!!"

خدا کے حضور میں جو دل سے نکلے، وہی اسے منظور ہوتا ہے۔" انھوں نے روشن کو ایسے گھورا کہ وہ سہم کر ساتھ دینے لگے

صمد میاں نے بھی ایک تان کچھ "اولڈ مین ریور" سے سروں میں لگائی۔ مگر روشن نے سنبھال لیا۔ کیا بھاری بھرکم پرسوز آواز تھی کہ بڑے میاں پر رقت طاری ہو گئی۔ ولایت پلٹ لڑکوں سے بدظن تمام بزرگ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر رہ گئے۔

"ارے صاحب سچا مسلمان چاہے کافروں میں رہے چاہے مسجد میں اس کے ایمان پر داغ نہیں پڑتا۔ ماشاءاللہ سُر بہانے لگے ہیں عقیدے کا سوز بھرا ہوا ہے۔" بڑے میاں نے آستین کے کونے سے آنکھیں صاف کر کے فرمایا اور روشن کے چہرے پر نور کی جھلک دیکھ کر کھل اُٹھے۔

صبیحہ کی کٹورہ جیسی آنکھیں چھل چھل برس اُٹھیں۔ ٹکٹکی باندھے وہ انھیں تکتی رہ گئی۔ جب لڑکیوں نے قاعدے کے مطابق اُسے چھیڑا تو وہ جھوٹوں کو بھی نہ بگڑی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پرانا جان پہچان کا مل گیا ہو۔

صمد میاں جب گھر میں آئے تو ہر ایک کا چہرہ روشن کے پرتو سے جگمگا رہا تھا۔ سوائے صبیحہ کے جس نے چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بھرمار کر دی۔ کون ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔

"اے کس کا لڑکا ہے؟" صغرا خانم نے لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

"اپنے باپ کا۔" صمد نے لاپرواہی سے ٹال دیا اور چلے باہر جانے کے لیے کہا۔

"اے ہے لڑکے ہر وقت کا مذاق نہیں بھاتا۔ یہ بتا اس کے باپ کون ہیں؟"

"ہیں نہیں — تھے — فورسٹ افسر تھے۔ تین سال ہوئے ڈیتھ ہو گئی اُن کی۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون! کیا کرتا ہے لڑکا؟" نانی بی نے پوچھا۔

"کون سا لڑکا؟" صمد نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

"اے یہی تیرا دوست۔"

"روشن؟ ڈاکٹر ہے ایم۔ڈی کی ڈگری لینے میرے ساتھ ہی گیا تھا پھر وہیں انگلینڈ میں نوکری کر لی۔ کچھ کھانے کو بھجوا دیجئے ذرا میرے کمرے میں بھجوائیے گا باہر درجن بھر بڈھے بیٹھے ہیں سب ہڑپ کر جائیں گے۔ یہ بڑھاپے میں لوگ اتنے ندیدے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

صغرا خانم فوراً خم ٹھوک کر میدان میں پھاند پڑیں۔ تیر تلوار سنبھالے اور ہلّہ بول دیا۔

"اے صمد میاں جیسے تم ویسے تمہارا دوست۔ اس سے کیا پردہ؟ ادھر ہی گول کمرے میں بلا لو۔" وہ آنکھوں میں رس گھول کر بولیں۔ "ان دنوں سیدوں میں بھی کاتا پردہ شروع ہو گیا ہے۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر لڑکیاں کھلے منہ نمائش میں جائیں مشاعروں میں شریک ہوں۔ سہیلیوں کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضامندی سے کر لیں مگر سڑک پر چلتے وقت تانگے میں پردہ باندھا جاتا ہے۔ بزرگوں کو دکھانے کے لیے۔" صمد روشن کو گول کمرے میں لے آئے۔ صبیحہ کے سوا سب وہیں چائے پینے لگے۔

صبیحہ کو صغرا خانم کمرے میں گھیرے چوٹکتے ملے کر رہی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو جہیز کا کوئی بھاری زرتار جوڑا پہنا دیتیں۔ مگر صبیحہ حسب عادت بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے سو رہی تھیں۔ گھر میں جب کوئی موٹا مرغا آتا اُسے یونہی سجایا جاتا۔ بیچاری کے

ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے، منہ لٹک جاتا اور ناک پر پسینہ پھوٹ نکلتا اور شکل بھیگی بلی کی سی ہو جاتی۔ جب سے کئی پیغام آ کر پھر گئے تب اُسے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ روشن جیسا ہینڈسم اور کماؤ بر بھلا کیسے پھنسے گا۔ ذرا کوئی لڑکا کسی قابل ہوا تو خاندان والے ہی رشتہ حق وصول کرنے دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر ملنے ملانے والوں کی باری آتی ہے ــ ہو سکتا ہے اُس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ دو بچے ہوں!

مگر اصغری خانم کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ نہ انھوں نے دھوپ میں چونڈا سفید کیا تھا۔

"لونڈا خیر سے کنوارا ہے۔ بیاہے مرد کا ڈھنگ ہی اور ہوتا ہے۔" دوسرے انھوں نے پہلے ہی صمد سے پوچھ لیا تھا۔

"بیوی بچے سنگ لایا ہے؟"

"کس کے؟ روشن کے ــ ارے اُس گدھے کے بیوی بچے کہاں۔ ابھی تو خود ہی بچہ ہے۔ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔"

بس اصغری خانم نے جھٹ حساب لگا لیا کہ صبیحہ سے چار سال بڑا ہوا۔ خوب جوڑی رہے گی۔ اس سے کم فرق ہو تو چار بچوں کے بعد بیوی میاں کی اماں لگنے لگتی ہے۔ ویسے مرنے والے تو اصغری خانم سے بیس برس بڑے تھے۔ ہائے کیا عشق تھا اپنی دلہن جان سے

مگر جب اصغری خانم سجا بنا کر صبیحہ کو گول کمرے میں لائیں تو روشن جا چکے تھے! اصغری خانم کا بس چلتا تو چیختی چلاتی ان کے پیچھے لپکتیں۔ مگر صمد میاں کی انھوں نے خوب ٹانگ لی۔

"میراں بھنیا کی پال کب تک ڈالو گے۔ کیا سفید چونڈے ہیں اُفتاں چُنی جائے گی۔ تم ہی کچھ نہ کرو گے تو کون کرے گا؟"

"کون میں؟" صمد خواہ مخواہ چڑ گئے۔ "مجھ سے خود تو اپنی شادی ہو نہیں رہی ہے دوسروں کی کیا کروں گا؟"

"مذاق میں ہر بات کو ٹال دیتے ہو۔ آج اُس کا باپ زندہ ہوتا تو ــ؟" اصغری خانم ٹسر ٹسر رونے لگیں۔ "آخر کیا ہو گا ان چار چٹانوں کا۔ توفیق نگوڑی کو ہول دل کے دورے نہ پڑیں تو اور کیا ہو۔"

"کونسی چٹانیں؟" صمد میاں انجینئر تھے انھیں چٹانوں، پہاڑیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔

"اے میاں اب بوزمت اللہ رکھے اب تم اس قابل ہو اپنے دوستوں میں سے ڈھونڈو کوئی۔"

"بھئی میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ ٹال کر چل دیے۔

مگر آندھی سے طوفان سے اصغری خانم کو کون ٹالے؟ آتے جاتے ٹانگ لیتیں۔ پھر انھیں ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ وہ فوراً کسی جان لیوا اور انجانے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ اور عین اس وقت جب روشن صمد میاں سے ملنے آئے، ان پر سخت بھیانک قسم کا دورہ پڑ گیا۔ اتنی زور زور سے آہیں بھریں کہ بیچارے بدحواس ہو گئے۔ جھٹ سے نوکر کو بھیج کر اپنی ڈسپنسری سے بیگ اور انجکشن منگوائے۔ بڑی دیر تک دیکھتے بھالتے رہے۔ اصغری خانم آخری وقت میں بھلا صبیحہ کا ہاتھ کیونکر چھوڑ دیتیں۔ وہ ان کے سرہانے سہمی ہوئی بیٹھی رہی کہ کہیں چور پکڑ نہ لیا جائے۔ انھیں خاموش دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اصغری بوا کی چال پکڑی گئی۔

"کیا بیماری ہے؟" اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ پوچھئے کونسی بیماری نہیں ہے۔ گردوں کی حالت خراب ہے، معدہ قطعی کام نہیں کرتا۔ دل بس ذرا سا دھڑک رہا ہے۔ آنتوں میں زخم ہیں، پھیپھڑوں کے نیچے پانی اُتر آیا ہے۔" انھوں نے صمد کو ایک طرف لیجا کر کہا۔ صبیحہ نے سُنا تو ہنسی نہ روک سکی۔ اصل مرض کی طرف تو انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"اماں بشاؤ بھی اتنی بیماریاں ہوتیں تو زندہ کیسے رہ سکتی تھیں۔ اور زندہ بھی کیسی، سارے خاندان پر چابک پھٹکارتی ہیں ——" صمد بولے۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں یہ زندہ کیسے ہیں۔ کچھ ایسی لیپاپوتی ہوتی رہتی ہے کہ کھنڈر کھڑا ہے۔ ڈاکٹری سے بڑھ کر کوئی طاقت کام کر رہی ہے۔" اصغری بوا ٹھٹکیں اور بدک اُٹھیں۔

"اوئی نوج —— دور پار —— اے لو میرے دشمن کاہے کو لب گور ہوتے —— اے میاں تم ڈاکٹر ہو کہ نرے سلوتری۔ اے چولہے میں جائیں تمھاری دوائیں۔ موئی فرنگیوں کی دواؤں میں دنیا بھر کی غلاظتیں ہوتی ہیں —— تھو ——" وہ بڑبڑائیں۔

"بس اللہ پاک عزت آبرو سے اٹھا لے —— اے لڑکے ٹھیک سے بیٹھ۔ تھوڑا یہ کچھ شربت پانی لاؤ کہ گدھیوں کی طرح کھڑی منہ دیکھ رہی ہو —— اے بچے کئے بہنیں ہیں تیری ——؟" اچانک صغرا خانم نے پینترا بدلا۔

"ایں —! جی دو — دونوں بڑی نہیں — ایک بیوہ ہے۔" روشن نے سنبھل کر دار روکا۔

"اچھا ہے —— اور دوسری کہاں بیاہی ہے؟"

"کانپور میں سول انجینئر ہیں اُن کے ——"

"اے کانپور ہی میں تو اپنے تقی میاں کی خلیا ساس رہتی ہیں۔ کیا نام ہے اللہ رکھے بہنوئی کا ——"

"ایس این کچلو۔" صمد میاں بولے۔ "کیوں کیا کچھ بنوانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں اپنی قبر بنواؤں گی —— اچھا تو تم لوگ کشمیری ہو۔" بیچاری کچھ بجھ گئیں۔ "یہ سیف الدین کچلو کے خاندان سے کچھ ہے میل ——؟"

"جی وہ میرے چاچا کے دوست تھے۔"

روشن کے جانے کے بعد تڑپ کر مریضہ اُٹھ بیٹھیں۔

"بھئی سوچ لو کشمیری ہیں۔"

"ہاں اور اس سے پہلے جو پیغام آیا تھا وہ لوگ کمبوہ تھے۔ بس یہی دیکھتی رہو۔ اے سب انسان برابر ہیں۔ پاک پروردگار نے سب کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات چھوت چھات نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں بگڑنے لگیں۔

"بھئی مجھے یہ صبیحہ کے نخرے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔ ادھر وہ آیا اور ادھر بنو منہ تھوتھا کر بھاگیں۔ جی چاہا لگاؤں چڑیل کے دو دھپلے۔"

مگر صبیحہ کیا کرتی۔ روشن کے آتے ہی وہ کمرے میں بھاگ جاتی۔ یوں سب کے سامنے گھور کر دیکھتی تو نہ جانے وہ کیا سوچتے، دروازے کی آڑ سے مزے سے جی بھر کے دیکھ سکتی تھی۔ اب تو علاج کے لیے وہ بلاناغہ آنے لگے۔ اصغری خانم کچھ ایسی ترکیب چلتیں کہ صبیحہ کو پاس روک لیتیں۔ اور بے چارے روشن تو ایسے جھینپو تھے کہ صبیحہ بھی شیر ہوگئی۔ انھیں ایک نظر بھر کے اپنی کالی بھونرا آنکھوں سے دیکھتی تو اُن کے ہاتھ میں انجکشن کی سوئی کانپنے لگتی۔ وہ ہنس پڑتی تو گھبرا کر بچوں کی طرح ناخن کترنے لگتے۔ تب وہ اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتی۔

"ڈاکٹر صاحب ہماری بی کا جی اچھا نہیں۔"

"کیا ہو گیا؟"

"پتہ نہیں — بیچاری کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔"

"اوہو — معلوم ہوتا ہے بیچاری کا دل ٹوٹ گیا ہے۔"

"ارے واہ — کیوں؟"

"آپ روٹھ گئی ہوں گی" وہ دبی زبان سے کہتے۔

"اجی ہاں، میں کیوں روٹھتی" صبیحہ کالی کالی پلکیں جھپکاتی۔

"تو پھر ڈر گئی ہوں گی آپ سے —"

"واہ کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں۔"

"ڈراؤنی چیزوں سے تو ڈرپوک ڈرتے ہیں!"

"اور بہادر؟"

"کالی کالی آنکھوں سے۔"

دونوں انگریزی میں نوک جھونک کئے جاتے تو اصغری خانم کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بھلا گٹ پٹ کرکے بھی کہیں پیار کی ہوا کرتی ہیں۔ موئی کافروں کی زبان میں "لفٹ رائٹ کوئیک مارچ" کے سوا اور کیا ہوتا ہے؛ وہ ایکدم بیچ میں کود پڑیں۔

"اے روشن میرے چاند ذرا میری بالوشاہیوں پر نیاز تو دے دے۔ تیرے خالو میاں کی برسی ہے۔" وہ فوراً ہوشیاری سے رشتہ لگاتیں۔

"کون میں؟" روشن بوکھلا گئے۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں اصغری خالہ۔ ان سے فاتحہ پڑھوا کر اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ ہے۔ بھلا انہیں کیا خبر کہ فاتحہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ایک آئت بھی نہ یاد ہو گی۔" صبیحہ اڑانے لگی۔

"اچھا ملانی جی آپ بیچ میں نہ بولیں۔" روشن چڑ گئے۔

"ارے صاحب چھوڑیے۔ ہمیں معلوم ہے آپ اور صمد بھیا میں کیا کچھ فرق ہے۔ وہ بھی تو صاحب بہادر بن گئے ہیں۔"

"خالہ جی آپ روشن سے فاتحہ پڑھوا رہی ہیں؟" صمد نے قہقہہ لگایا۔

"اے غارت ہو کل مونہو۔ لعنت ہو موئے آج کل کے لونڈے ہیں کہ نگوڑے سب کے سب بے دین۔" صغرا خانم بالوشاہیوں کا تھال اٹھا کر دالان میں لے گئیں۔ مگر بیچاری کی فکر دور نہ ہوئی۔

"اے توفیق جہاں۔"

"ہاں کیا ہے؟" توفیق جہاں نے پنکھے سے مکھی کو دھمکا کر جواب دیا۔

"اے میں کہوں یہ آج کل کے لڑکوں کے نکاح کیسے پڑھے جاویں گے۔"

"کیوں؟"

"ہے انھیں —— آمنتو بھی تو نہیں آتی۔" "آمنتُ باللہ — ایک آیت ہوتی ہے جو نکاح کے وقت دولہا کو پڑھنی پڑتی ہے جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ میں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس آیت کو پڑھے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

"قاضی جی بولتے جاتے ہیں اور دولہا دہراتا جاتا ہے۔ بس بہن اب تو ایسے ہی نکاح ہو رہے ہیں۔" توفیق جہاں بولیں۔

"مگر اب اس نیاز کا کیا ہو؟" وہ فکر مند ہو گئی۔

"کیسی نیاز —؟"

"ارے بھئی میں نے تو جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ اُن کی برسی ہے۔ یہ منّت کی نیاز ہے۔ لڑکا خود نیاز دے جب ہی پوری ہو گی۔"

"اے چلو اُدھر، ایسی کوئی منت نہیں ہوتی۔" توفیق جہاں نے ٹالنا چاہا۔ "نہیں جی تم تو کسی بات کو مانتی ہی نہیں ہو۔ خیر پھر سہی۔" اور وہ خود دوپٹہ سر پہ منڈھ کر بُڈ بُڈ نیاز دینے لگی۔

دوسرے دن روشن آئے تو جھٹ پوچھا "کیوں رے تُو نے قرآن ختم کیا تھا؟"

"جی؟ — نہیں تو ایکبار انگریزی میں پڑھا تھا تھوڑا سا — تو —" روشن ہکلائے۔

"ہے ہے یہ موئی ٹکڑ توڑ زبان میں کیسا قرآن؟ لڑکے دیوانہ تو نہیں ہوا؟"

"تو صمد بھیا نے کونسا پڑھ لیا ہے۔ ساری عمر انگریزی اسکولوں میں رہے۔ کالج میں فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔" مگر صبیحہ خود ہر رمضان کے مہینے میں پانچ قرآن ختم کرتی تھی۔ روزے نماز کی پابند تھی۔ حالانکہ صمد کہتے تھے۔ وہ نازک بدن رکھنے کے لیے فاقے کرتی تھی —— توبہ توبہ!

سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا! روشن کی آنکھوں سے دل کے راز کا پتہ بچے بچے کو مل چکا تھا مگر زبان نہ جانے کیوں گنگ تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایکدم آنکھوں میں غم کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور سر جھکا کر اُٹھ کر چلے جاتے۔ صبیحہ کی طرف ایسی ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں کھڑی ہو، درمیان میں فولادی سلاخیں، جن اور کالے دیو کا پہرا۔ صبیحہ کے مکھڑے پر غرور اور اطمینان کا نور پھوٹنے لگا تھا جیسے منزل پہ پہنچ کر آرام سے چھاؤں میں بیٹھ گئی ہو۔ ساری انجانی سکت اور تنہائی سمٹ کر گھروندا جگر مگر کرنے لگا ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ لڑکے کا یہاں کوئی ہے نہیں پھر پیغام کیسے منگوایا جائے۔ آج تو شادیاں ایسے بھی ہوتی ہیں کہ دو جیوں کا ایک دوسرے پر جی آ گیا دوستوں نے پیغام دیا۔ یاروں نے شادی کر دی۔ اصغری خانم کو ایسی ٹکڑہ توڑ شادیوں سے نفرت تھی مگر زمانے کے نئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر نئی وضع کی شادیوں سے بھی انھوں نے رو پیٹ کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل جب نصرت اور خلیقہ نے ایسی چٹ پٹ شادی کی تھی تو انھوں نے بڑا شور مچایا تھا۔ مگر پھر انھیں اپنی پالیسی نرم کرنا پڑی۔

ادھر روشن بھوندو تھے ادھر صبیحہ بھی ذرا چنٹ ہوتیں تو کبھی کا انھیں ڈکار چکی ہوتیں۔ کاش اُسے کوئی چھوٹی موٹی پیاری سی بیماری لگ جاتی تو روشن اس کا علاج کرتے کرتے خود مرض مول لے بیٹھتے۔ اصغری خانم گھیر گھیر کے مُرغی کو ڈربے میں پھانسنے

کی کوشش کرتیں مگر اپنے منہ کی کھا کر رہ جاتیں۔

"اے لڑکی تیرے سر میں آدھے سر کا درد ہووے ہے۔ علاج کیوں نہیں کرا لیتی ڈاکٹر سے؟" وہ صبیحہ کو رائے دیتیں۔

"اے واہ خالہ جی میرے سر میں کاہے کو ہوتا درد۔" وہ بگڑنے لگتی گڑی۔

"پہلے تو ہووے تھا اب بھلی چنگی ہو گئی ہو تو مجھے نہیں خبر۔" وہ صبیحہ کی صحت سے جل کر کہتی۔ "دیکھ تو بیٹا روشن کیسی جلس کر رہ گئی ہے بچی۔"

"ارے خالہ جی ان کی تو رنگت ہی سیاہ بھٹ ہے۔ کہئے تو کھال کھینچ کر دوسری چڑھا دوں پلاسٹک سرجری سے۔"

"جی ہاں بڑے آئے کھال کھینچنے والے۔ ہم کالے ہی بھلے۔"

"اوئی کالی کدھر ہے لونڈیا، ہاں گیہواں رنگت ہے۔" اصغری بوا پریشان ہو کر کہتیں۔

"جی ہاں ادھر کچھ دنوں سے امریکہ سے گیہوں بھی کالا ہی آ رہا ہے۔" روشن چھیڑتے۔

"ہاں بس ایک آپ ہی زمانے بھر میں گورے ہیں، ہونہہ پھیکے شلجم!" صبیحہ چڑ جاتی۔

"آپ تو نمک کی کان ہیں سچ چلئے کچھ تو مزہ آ جائے گا۔" وہ چپکے سے کہتے۔

صغرا خانم بدمزگی مٹانے کو جلدی سے بات بدلتیں۔ "اے کالی گوری رنگتیں سب اللہ کی دین ہیں۔ پرسوں کہہ رہی تھی سر بھاری ہے ویسے تیرے بال بھی تو جھڑ رہے ہیں۔ بیٹا کوئی بال بڑھانے کی دوا بتاؤ۔"

"ارے خالہ جی بہت بال ہیں۔ ہاں کہئے تو دماغ کو بڑھانے کے دو چار انجکشن لگا دوں۔"

"آہا ہا بڑے آئے سلوتری جی۔" اور روشن کا چہرہ ہنستے ہنستے صبیحہ کے گلابی آنچل کو مات کرنے لگتا۔

صغرا خانم اس کچر پچر سے اداس ہو کر بڑی زور زور سے کراہنے لگتیں۔ ایک دن انھوں نے صمد کو گھیر کر بات کر ہی ڈالی۔

"اے بھیا کو پیغام نہ ایغام۔"

"کیسا پیغام؟"

"اے روشن کا۔ اس سے کہو اپنی بہن بہنوئی سے پیغام بھجوائے۔"

"مگر خالہ جی روشن —"

"ہاں ہاں بیٹے مجھے سب معلوم ہے — مگر اب زمانہ بدل گیا ہے ہزاروں شادیاں ہو رہی ہیں۔ کب تک لڑکی بٹھائے رکھیں گے۔ توفیق جہاں کا دل کوئی دن اور کام دے گا — پھر دونوں میں اللہ رکھے چاؤ بھی ہے۔"

"مگر — خالہ جی —"

"بیٹے تم اللہ رکھے سات سمندر پار رہے تمھیں کیا معلوم دنیا کتنی بدل گئی۔ سیدوں کی بیٹیاں کن کن کو گئیں۔ سرفراز میاں کی لڑکی نے تو زہر کھا لیا۔ اب اللہ کی مرضی یہی ہے تو جہالت کی باتوں میں پڑنے سے کیا حاصل۔"

"مگر — میں سوچوں گا۔" صمد میاں چکرائے سے جا کر باہر پڑ گئے۔ اس انقلاب کی انھیں امید نہ تھی۔ دنیا سے دور وہ کتنے جاہل رہ گئے جبکہ ان کے بزرگ تک اتنے روشن خیال ہو چکے تھے۔ ان کا دل غرور سے بھر گیا۔ شام کی گاڑی سے انھیں سائنس کانفرنس

میں شرکت کے لیے جاتا تھا۔ اب وہاں سے لوٹ کر ہی سب کچھ ہوگا۔

ادھر اصغری خانم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو آسمان سر پر اُٹھا لیتیں۔ یہاں بیٹی بیاہنی تھی اس لیے توفیق جہاں کو کہہ سُن کر پٹا لیا کہ صبیحہ بیکار وقت برباد کرنے کے اگر کچھ کام سیکھنے لگے تو کیسا رہے۔ طے ہوا کہ روشن میاں کی ڈسپنسری میں نرسنگ سیکھنے چلی جایا کریں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور صبیحہ نرسنگ سیکھنے جانے لگی جس کا سبق صبح سے لے کر رات کے سینما کے آخری شو تک چلتا رہتا۔ اور صبیحہ چست چالاک نرس کے بجائے دن بدن اُس جانے پہچانے مرض میں کھوتی گئیں جو جنم جنم سے مرد عورت کو سونپتا آیا۔ روشن کے سوئٹر بنے جانے لگے اور کمرے میں اُن کی قمیص اُن کے موزے بکھرے گئے۔ بس چودہ طبق روشن ہو گئے!

جیسے ہی شکار گرتا ہے شکاری جو مکر گانٹھے جھاڑیوں میں دبکا ہوتا ہے، ایک ہی جست لگا کر آ دبوچتا ہے اور گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اصغری خانم نے بھی ساری بیماری دور پھینکی اور دم سے اکھاڑے میں آن جمیں۔ چھپا چھپ جہیز سلنے لگا بڑی دیگوں پر سے لحاف توشک کے انبار اتار کر قلعی ہونے لگی۔ ڈیوڑھی پر سنار بیٹھ گیا کہ سامنے نہ بنواؤ تو موا اُپلے تھوپ دے گا۔ بی سیدانی محلے کی پوٹ سنبھال کر لوی چھپا اور گوکھرو توڑنے لگیں۔ گوکھرو کے ہر کنگورے پر لب بھر کے دعائیں دیتی جاتیں۔ گوٹیاں سہاگ۔ اور بنرے یاد کر کر کے کاپیوں میں اُتارنے لگیں۔ گورے دولہا اور سانولی دلہن پر گیت جوڑے جانے لگے۔

”اے بھی باپ کا نام روشن تو بیٹے کا؟“ صغرا خانم فکر مند ہو کر پوچھتیں۔

”جوشن“ کوئی شوخ سیلی چھیڑتی اور صبیحہ جل کر اُس کی بوٹیاں نوچنے لگتی۔

”اے بھی اُنھیں اپنی کلورانی ہی پسند ہے تم لوگ کاہے کو جلی مرتی ہو۔“ صغرا خانم ڈانٹتیں، اور صبیحہ آنکھوں میں خوابوں کے جگمگٹے لیے نرسنگ سیکھنے بھاگ جاتیں۔

مگر کسے خبر تھی قسمت یہ گُل کھلائے گی۔ پل بھر میں چمکتا سورج اُلٹا توا بن جائے گا۔ وہی روشن جو کل تک چودھویں کے چاند کو شرما رہے تھے لوٹ پوٹ کھڑے ہوئے تو کالا دیو! اور اس کالے دیو نے پلک جھپکاتے میں اونچے اونچے محلوں کو چکنا چور کر دیا۔ صغرا خانم کے سارے سنے پرانے مرض ایک دم اُن پہ ٹوٹ پڑے۔ جب صمد میاں کانفرنس سے جم جم لوٹے تو گھر میں جیسے کوئی میت ہو گئی ہو۔ سناٹا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صغرا خانم کا ایک کونا زمین تو ایک آسمان۔۔ زمرد کا محل ساتویں آسمان پر لرزا اور ایکدم پھس سے بیٹھ گیا۔ قلعی کی دیگوں پر پھر لحاف توشک لد گئے۔ دھنک کی پنڈیاں اُلجھ کر جھونجھ بن گئیں۔ سنار ڈیوڑھی سے دھتکار دیا گیا اور جس نے سُنا منہ پیٹ لیا۔

”آخر ہوا کیا۔۔ کچھ معلوم تو ہو؟“ صمد میاں نے پوچھا۔

”ارے اس چھتیسی سے پوچھو۔ جو چڑھ چڑھ کے دیدے لڑانے جاتی تھی۔“

توفیق جہاں نے زانو پیٹ لیا۔ ”حرافہ۔۔۔“

فیشن

احمد ندیم قاسمی

اِدھر فیشن بدلتا، اُدھر حلیمہ کے وارے نیارے ہو جاتے۔ نجمہ پرانے فیشن کے سب کپڑے حلیمہ کو تھما دیتی اور کہتی ”لے بھئی حلیمہ۔ تیری قسمت سے فیشن بدل گیا ہے“ یہی وجہ تھی کہ حلیمہ کے پاس بند گلے والے، کھلے گلے والے، پوری آستینوں والے، آدھی آستینوں والے، بہت نیچے اور بہت اونچے جمپروں کے علاوہ کھلے اور تنگ پائنچوں والی گھیرے دار اور بے گھیر شلواروں کا ڈھیر سا لگ جاتا تھا۔ حلیمہ ہر مہینے کی چار تاریخ کو نجمہ کی امی سے تنخواہ لیتی تھی اور جب حلیمہ کی ماں ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو حلیمہ سے تنخواہ لینے آتی تھی تو شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جب وہ اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک گٹھڑ اٹھا نہ لے گئی ہو۔ پھر وہ خوش ہو کر حلیمہ سے کہتی تھی ”ہائے ری چھوکری۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ جب دیکھو نئے کپڑے۔ جب دیکھو نئے کپڑے۔ یہ نجمہ بی بی نے تجھے نوکرانی رکھا ہے کہ سہیلی بنایا ہے؟“

پھر جب وہ دیکھتی کہ نجمہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے تو وہ دانت بھینچ کر اور حلیمہ کے سینے میں اپنے دو ہتڑ چبھو چبھو کر کہتی ”اری حرام کی اولاد۔ نجمہ بی بی جو تجھ پر اتنی صدقے قربان ہوتی ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھا۔ تجھے جو ڈھیر سے کپڑے ملتے ہیں، ان میں اچھے والے خود کیوں پہن لیتی ہے؟ تُو نوکرانی ہے۔ اپنے آپ میں رہا کر۔ اپنا جہیز جمع کر۔ ریشمی کپڑے ملیں تو خود نہ پہن لیا کر۔ ان پر لوہا کر لیا کر اور میں آؤں تو مجھے دے دیا کر۔ اس صدی کا ایمان خراب ہو گیا ہے۔ اب صورت کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سب جوڑے گنتے ہیں اور زیور تولتے ہیں۔“

اور اگر اوپر سے نجمہ کی امی آ گئیں تو وہ ہنس ہنس کر کہتی ”یہ میری بیٹی سدا کی انوکھی ہے بی بی جی۔ تیرہ سال تک ہاتھ بھر کی رہی۔ اس کا باپ اسے پدی کہتا تھا۔ پھر جو ایکا ایکی بڑھنے لگی ہے، تو بی بی جی، قسم لے لیجئے کہ سردیوں میں اس کے لیے جو شلوار سلائی وہ گرمیوں میں اس کے گھٹنوں سے نیچے اُترتی ہی نہیں تھی۔ یوں کڑوی بیل کی طرح بڑھی ہے کہ الٰہی توبہ۔ اس کا باپ ہنس ہنس کر کہتا تھا۔ اسے روکو، روکو، یہ کہاں جا رہی ہے۔ پہلے مجھ سے سر نکالا۔ پھر اپنے باپ کے بھی آس پاس پہنچنے لگی تھی کہ اسے اللہ نے بلا لیا اور یہ وہیں رُک گئی۔ شکر ہے رُک گئی ورنہ پرنالوں سے ٹکراتی پھرتی۔“

بی بی جی کی ہنسی ختم ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ کہتی ”اب بھی دیکھ لیجئے۔ ویسی ہی انوکھی ہے۔ نوکری کرنے کو اللہ نے ایسا گھر دیا ہے کہ ——، یہی جوڑا دیکھ لیجئے۔ ایسا ریشم پہننے کا خواب تو میری دادی پردادی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

یں تو ایک دن اسے نجمہ بی بی سمجھ کر سلام بھی کر بیٹھی تھی، اور اس حرام کی اولاد کو دیکھئے کہ بولی: "وعلیکم سلام۔"

دونوں مائیں ہنسنے لگتیں اور حلیمہ، جو ماں کی باتوں کے دوران میں مسلسل مسکرائے جاتی، بھاگ کر نجمہ کو ماں کی ساری باتوں کی رپورٹ کرنے پہنچ جاتی۔

نجمہ کے لیے حلیمہ محلے کا اخبار تھی۔ وہ دس منٹ کے لیے بھی کہیں پڑوس میں رقعہ دینے جاتی تو واپس آ کر ایک گھنٹے تک گلی کے ہر گھر کے تازہ حالات بیان کرتی رہتی اور نجمہ کے جسم میں سنسنی پر سنسنی دوڑتی رہتی۔ "اب آگے بھی بکو نا — پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی۔ طلاق ہو گئی۔"

"کس کی؟"

"جس کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہائے بے چاری۔"

"بے چاری نا بے چاری! قسم سے نجمہ بی بی۔ بیویوں نے بھی کبھی عشق کیا ہے؟"

"پھر کسی نے دیکھا تھوڑی ہو گا۔"

"کسی نے دیکھا ہو، نہ دیکھا ہو، اس کے گھر والے نے تو دیکھا۔ لوگ تو کہتے ہیں نجمہ بی بی، کہ اس نے چاقو بھی نکال لیا۔"

"ہائے — پھر؟"

"پھر کیا۔ بس سوچا ہو گا کہ چاقو نہ مارو، طلاق دے دو۔"

"ہاں — بات تو ایک ہی ہے۔"

یا پھر نجمہ بے قرار ہو کر پوچھتی۔ "اب کہہ بھی چکو نا۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا نجمہ بی بی۔ بس پولس آ گئی۔"

"پھر — ؟"

"پھر کیا نجمہ بی بی؛ بس بچے کو نالی میں سے اٹھوایا۔"

"ہائے — نالی میں سے؟"

"تو کیا گود میں سے؟ قسم سے نجمہ بی بی، آپ بھی بڑی بھولی ہیں۔ کہہ تو چکی ہوں کہ حرام کا تھا۔"

"اونچا مت بکو۔"

"بیبی جی۔ باہر گھر گھر ڈھنڈورا پٹ گیا ہے اور نجمہ بی بی کہتی ہیں اونچا مت بکو۔"

"پر تھا کس کا؟"

"یہ تو نجمہ بی بی، خدا ہی جانے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ سنا ہے سارے محلے کی عورتوں کی ڈاکٹری ہو گی تو پتہ چل جائے گا۔"

"ہائے۔ خدا سب کے پردے رکھے۔"

ایک بار حلیمہ کی ماں کو نمونیہ ہو گیا اور حلیمہ اس کے پاس چلی گئی تو نجمہ سارے گھر میں اجنبیوں کی طرح ٹامک ٹوئیے مارتی پھری۔ ایک دن "چنا جور گرم" والے نے اپنی کراری آواز میں مسالوں کی تعریف گائی تو نجمہ رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ چنوں والا سیڑھیوں کے سامنے کھڑا حلیمہ کے اترنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اسی لیے تو وہ "چنا جور گرم بابو" کی جگہ "چنا جور گرم بی بی" گا رہا تھا، اور اس کے گیت میں یہ اصلاح حلیمہ ہی نے کی تھی۔ اس نے کہا تھا "کیوں وے۔ تو مینوں بابو کیوں کہتا ہے۔ کیا بابو ایسے ہوتے ہیں؟" اور وہ یوں اکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے تصویر اتروا رہی ہے۔ نجمہ اوپر کھڑکی کی چق میں سے دیکھ رہی تھی۔ اس زور سے ہنسی اور اتنی دیر تک کمرے کمرے میں ہنستی پھری کہ اس کے ابا جی کو بھی آخر کار ذرا سا مسکرا دینا پڑا۔

نجمہ کے ابا صرف اس وقت مسکراتے تھے، جب انھیں یقین ہو جاتا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ نہیں اور مسکرائے بغیر چارہ نہیں۔ اسی لیے نجمہ اپنی امی سے کہا کرتی تھی کہ اگر ابا کھالوں کے سوداگر نہ ہوتے تو بڑے قنوطی قسم کے فلسفی ہوتے۔ وہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ایسے لگتے جیسے انھوں نے اپنی گردن پر چیتے کی کھال لپیٹ رکھی ہے۔ ہزاروں کماتے مگر کبھی کبھار ایک آدھ سینکڑے کا بھی نقصان ہو جاتا تو کم سے کم ایک وقت کا کھانا نہ کھاتے اور رات بھر جاگتے اور تسبیح کے منکے چلاتے رہتے۔ کھالیں بیچ بیچ کر انھوں نے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ بیٹھے ہوئے بھی ہانپتے رہتے۔ محلے والے ان کی دولت کا اندازہ یہ کہہ کر لگاتے کہ جب وہ مر گئے اور ان کی دولت کو ان کے ساتھ قبر میں دفن کرنا پڑا، تو خود ان کی میت کے لیے دوسری قبر کھودنی پڑے گی۔ اور اگر ان کی گنجائش نکالنے کے لیے قبر کو کچھ اور کھودا گیا تو نیچے سے پانی نکل آئے گا۔

مگر ادھر نجمہ اسکول سے نکل کر کالج پہنچی، ادھر ان کی دولت کو سیند لگ گئی۔ ادھر فیشن بدلتا، ادھر وہ نئے فیشن کے اکٹھے دس پندرہ جمپر سلوا لیتی۔ چار تو اس کے صرف برقعے تھے۔ کالا، نیلا، گہرا چاکلیٹ اور ہلکا بادامی۔ جوتے اتنے تھے کہ دو شیلفوں میں سے کتابیں نکال کر ان میں جوتے بھر دیے گئے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بھی فیشن کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ لپ اسٹک کے سب شیڈ اس کے پاس تھے۔ نیل پالش کی ہر ملک کی شیشیاں اس کی سنگار میز پر سجی رہتی تھیں۔ "آئی برو" پنسلیں تک درجنوں کی تعداد میں موجود تھیں۔

شروع شروع میں جب نجمہ نے ہاتھ دکھانے شروع کیے تو اس کی امی بہت گھبرائیں۔ نجمہ کو ابا کے پاس جانے سے روکتی رہیں مگر نجمہ بولی "میں ان کا بیٹا ہوتی تو اب تک دو تین موٹریں خرید چکی ہوتی۔ پھر پتہ چلتا ابا جی کو۔ میرا خرچہ تو ایک سائیکل تک کا خرچہ بھی نہیں ہے۔" پھر وہ ابا کے کمرے میں دراز چلی گئی اور ہکا بکا ماں دیوار سے چمٹ کر اندر جھانکنے لگی۔

وہ بیٹھے شاید کھالیں گن رہے تھے۔ نجمہ نے "ابا جی" کہا تو اسے چھوٹے چھوٹے شیشوں والی سنہری عینک کے اوپر سے یوں دیکھا جیسے مارے پیار کے، ڈکرانے لگیں گے۔ پھر جب اس نے کہا کہ "ابا جی۔ مجھے پانچ سو روپے چاہئیں۔ کپڑے خریدنے ہیں اور چند جوڑی جوتے اور لڑکیوں کی ضرورت کی کچھ اور الا بلا۔" تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مہینوں کے بعد مسکرا دیے۔ پھر گدے کا ایک کونہ اٹھایا۔ انگشتِ شہادت کو زبان سے چھو کر گیلا کیا اور سو سو کے پانچ نوٹ گن کر نجمہ کی طرف بڑھا دیے۔

چکرائی ہوئی امی کو اتنا ہوش تھا کہ بیٹی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے جب نجمہ نوٹ لے کر اور سر پہ ہاتھ پھروا کر پلٹی تو وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئیں۔ اور جب وہ چلی گئی تو آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پاس پہنچیں۔ انھوں نے بیوی کی طرف

یوں دیکھا جیسے وہ کچھ اور قریب آئیں تو انھیں سینگ مار دیں گے۔ بولے: "روپیہ چاہیئے؟" نجمہ کی امّی بولیں: "جی ہاں۔" اور انھوں نے سنہری عینک کی کمانی کو ذرا سا ہلا کر کہا: "تو پھر اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔ میرے مرنے کا تو ذرا سا انتظار کر لو۔" پھر سر جھکا کر ہنسنے لگے۔

بیٹی کے سلسلے میں باپ کی اسی فیاضی کا نتیجہ تھا کہ نجمہ نے اپنی الگ نوکرانی رکھ لی۔ پچاس روپے ماہانہ بھی، اور روٹی بھی، اور کپڑا الگ۔ اور کپڑے بھی موسم کے ساتھ نہیں، فیشن کے ساتھ۔ امی نے صرف اتنا کہا کہ "بیٹی۔ جب تمہارے ابا کلرک بھرتی ہوئے تھے تو اتنی تنخواہ تو انھیں بھی نہیں ملتی تھی۔" مگر بیٹی پر اس بات کا صرف اتنا سا اثر ہوا کہ ہنسنے لگی اور بولی: "ہائے امی۔ یہ سوچ کر کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہمارے ابا جی بے چارے کبھی کلرک بھی تھے۔"

آہستہ آہستہ نجمہ کی امی بھی عادی ہو گئیں، بلکہ اب تو جب بھی نجمہ، ہاتھ میں سو سو کے چند نوٹ لے کر ابا کے کمرے میں سے نکلتی تو وہ یوں اطمینان کی سانس لیتیں جیسے انھوں نے اپنے شوہر سے انتقام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان کی بھی بعض ضرورتیں نجمہ کے روپے سے پوری ہونے لگی تھیں۔ اب روپے کی خاطر وہ شوہر کی بجائے بیٹی کو خوش کرنے میں لگی رہتیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ایک دن حلیمہ کی تنخواہ میں اکٹھے دس روپے بڑھا دیے، اور جب حلیمہ نے جا کر نجمہ کو بتایا تو وہ اتنی خوش ہوئی کہ بھاگتی آئی اور امی سے لپٹ کر انھیں چومنے لگی۔ پھر امی کو ابا جی کی طرف سے ملے ہوئے ماہانہ حساب کے روپے میں اس نے حلیمہ کی تنخواہ کے علاوہ دس دس کے دو نوٹوں کا بھی اضافہ کر دیا اور بولی: "آپ نے میری نوکرانی کے دس روپے بڑھائے ہیں تو میں آپ کی مائی کے دس روپے بڑھاتی ہوں۔"

ویسے تو مائی اور شرفو، نجمہ کے دست بستہ غلام تھے مگر نجمہ کی مشکل یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے کمرے میں اگر دو منٹ سے زیادہ رکتا تو نجمہ کو ایسا لگتا جیسے وہ پلٹ کر آئینہ دیکھے گی تو اس کے بال سفید ہو چکے ہوں گے۔ شرفو کے سر اور داڑھی کے بال اتنے سفید تھے کہ وہ سارے کا سارا برف کا بنا ہوا لگتا تھا۔ اور پھر وہ مرد تھا اور نجمہ کو بیٹی جی اور بٹو جی کہہ کر پکارتا تھا۔ اب نجمہ اسے یہ کیسے سمجھاتی کہ لتا نے "برکھا بہار آئی" گا کر اپنے آپ پر دوزخ کی آگ حرام کر لی ہے۔

ادھر مائی تھی کہ اس عمر میں اس کے صرف دو کام رہ گئے تھے۔ کھانا پکانا اور وضو کرنا۔ کھانا یوں فٹافٹ پکاتی تھی۔ جیسے چولہے میں لکڑیوں کے ساتھ خود بھی جل رہی ہے۔ مگر نماز یوں آسودگی سے پڑھتی تھی جیسے اب مر کر ہی سلام پھیرے گی۔ پھر ایک بار جب نجمہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سن رہی تھی اور مائی اس کے پاس کافی لائی تھی، تو گانے میں "جوبن" کا لفظ سن کر مائی کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی تھی۔ جیسے گانے والے نے اس کے سینے میں مکا کھینچ مارا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا: "یہ تو بٹو جی، بڑی شرم کی بات ہے۔" اور نجمہ نے کہا تھا: "ہاں مائی، تمہاری عمر میں سچ مچ بڑی شرم کی بات ہے۔" اس کے بعد وہ خوب ہنسی تھی مگر یہ اکتاہٹ کی ہنسی تھی، جیسے وہ ہنس نہیں رہی ہے، چہرے کو مکھیوں سے بچا رہی ہے۔

حلیمہ کو اس نے صرف اس لیے ملازم رکھا تھا کہ جوان لڑکی ہے۔ اس سے دل کی بات کہی جائے گی تو پلکیں نہیں جھپکنے لگے گی۔ وہ غسل خانے میں ہوئی اور ادھر ریڈیو پر فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا تو وہ بے کہے ریڈیو آن کر دے گی اور یوں ایک بھی ریکارڈ کو ضائع نہیں جانے دے گی۔ وہ گھر میں چلے پھرے گی تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نہیں کھنچ جائے گا بلکہ زندہ رہنے کو جی چاہے گا۔

مگر جس روز حلیمہ آئی تو دن بھر نجمہ سے دُور رہنے کے بہانے ڈھونڈھتی رہی۔ نجمہ نے اسے بار بار پکارا اور وہ بار بار آئی مگر یوں جھجکی اور سمٹی ہوئی جیسے جوانی کا محض سوانگ بھرے پھرتی ہے۔

رات نجمہ کو کھانا کھلانے کے بعد جب حلیمہ جانے کی سوچ رہی تھی تو نجمہ اُٹھی اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ پھر حیران حلیمہ کو بازو سے پکڑا اور جھٹکے سے کھینچ کر اپنے بستر پر گرا لیا۔ حلیمہ پلش کے لحاف پر یوں گیند کی طرح اچھلی جیسے آگ میں گر پڑی تھی۔ مگر بے تحاشہ ہنستی ہوئی نجمہ نے اسے پھر سے دھکا دیا اور وہ پلش کے لحاف کو اپنے جسم کے مس سے بچانے کی کوشش میں نجمہ کی مسہری کو دُور تک دھکیلتی چلی گئی اور پھر فرش پر گر پڑی۔ مسہری کے پائے ٹائیلوں والے صاف فرش پر چیخے تو دور سے نجمہ کی امی کی آواز آئی "کیا ہوا بیٹی؟" نجمہ پکاری "کچھ نہیں امی جی۔ حلیمہ سے پلنگ کی پوزیشن بدلوا رہی ہوں۔" پھر وہ حلیمہ کی طرف ہنستی ہوئی بڑھی۔ حلیمہ ڈر کر اٹھی اور کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو دیوانی؟" نجمہ نے حلیمہ کے پاس آکر پوچھا "مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نہ دیکھو۔"

حلیمہ نے ایک دم اپنا کھلا منہ اور پھٹی آنکھیں سمیٹ لیں۔

"تم میری نوکرانی نہیں ہو۔" نجمہ نے اسے سمجھایا "تم میری سہیلی ہو۔ تم میری باتنخواہ سہیلی ہو۔ میں بڈھوں میں گھر گئی تھی۔ گھر میں رہ کر بھی ایسا لگتا تھا جیسے موہنجوداڑو کے کھنڈروں میں گھوم رہی ہوں۔ اسی لیے میرا دل بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اب میں زہرِ عشق کی بجائے مناجاتِ بیوہ پڑھنے کی سوچ رہی تھی۔ سمجھ رہی ہو میری بات؟"

حلیمہ کا منہ پھر کھلنے لگا تھا مگر نجمہ کے اس سوال پاس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی "جی کچھ سمجھی ہوں، کچھ نہیں بھی ہوں۔"

نجمہ مسکرائی "جو کچھ سمجھی ہو وہ مجھے بتاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتاؤ۔"

خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے میں حلیمہ نے ہمت باندھی۔ پھر کچھ تُنک کر بولی "جی بس اِتنا سمجھی ہوں کہ آپ بھرے گھر میں اکیلی ہیں اور ـــــ، اور اکیلی ہیں اور ـــــ"

"اور؟" نجمہ نے پوچھا۔

"اور آپ بہت اچھی بی بی ہیں۔" حلیمہ سے صرف یہی الفاظ بن پڑے۔

نجمہ نے ہنس کر حلیمہ کا ہاتھ پکڑا۔ پھر اسے اپنی مسہری کے پاس لے آئی اور بولی "اچھی بیبیاں محبت تو نہیں کرتی نا؟"

"جی نہیں" حلیمہ فوراً بولی۔

اور نجمہ نے پوچھا "پھر میں اچھی کیسے ہو گئی؟ میں تو محبت کرتی ہوں۔"

نجمہ یہ کہہ کر مسہری پر بیٹھ گئی اور حلیمہ یوں کھڑی رہ گئی جیسے گاڑی یکایک چھوٹ گئی ہے۔

نجمہ نے مسہری پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا اور بولی "آؤ، ادھر میرے پاس لحاف میں گھس آؤ۔"

"میں؟" حلیمہ نے پوچھا جیسے کمرے میں نجمہ اور اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو۔

"تم نہیں تو کیا تمہارے فرشتے!" نجمہ ہنسی "کہہ جو چکی ہوں کہ تم میری نوکرانی نہیں ہو، سہیلی ہو۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ لوگ

سہیلیاں بناتے ہیں۔ میں نے سہیلی رکھی ہے۔ اور اگر تم اپنے آپ کو نوکرانی ہی سمجھتی ہو تو میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ اِدھر میرے پاس گھس آؤ۔"

حلیمہ ہکا بکا کھڑی رہی۔

"سُنتی نہیں ہو؟" نجمہ نے ذرا رُعب سے کہا۔ "چلو، اِدھر آؤ۔"

حلیمہ اس کی طرف یوں چلی جیسے ملزم حوالات کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پھر وہ اس کے پاس جا کر رُک گئی۔ نجمہ نے پل بھر انتظار کیا۔ پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا، اور جب وہ بستر پر گر پڑی تو اسے لحاف اُڑھا دیا۔ حلیمہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر بولی "تم سے نجمہ بی بی، کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

نجمہ نے سیس کے تکیوں پر سے سر اٹھایا اور حلیمہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "تم کتنی خوبصورت ہو حلیمہ۔ تمہاری آنکھیں کسی شاعر فرشتے نے بنائی ہیں اور تمہارے ہونٹ کسی مصوّر فرشتے نے تراشے ہیں۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے حلیمہ؟ مگر تم نے کیا کی ہو گی۔ تم سے تو محبت کی جانی چاہیے۔ کسی نے کی؟"

حلیمہ جو نجمہ کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی، آنکھیں جھکا کر مسکرانے لگی۔

"اچھا تو پہلے میں بتاتی ہوں۔" نجمہ بولی۔ "میں نے صرف ایک محبت کی ہے۔ اور میں نے جو تمھیں پچاس روپے مہینے پر بلایا ہے نا، تو اسی لیے بلایا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

"پر کس سے نجمہ بی بی؟" حلیمہ نے پہلی بار کارروائی میں براہِ راست حصّہ لیا، مگر یہ پوچھتے ہی وہ ڈر گئی جیسے اس کا مخاطب کوئی مرد ہے اور اس کے سوال کے جواب میں وہ اسی کا نام لے دے گا۔

نجمہ نے لحاف کے اندر حلیمہ پر اپنا بازو پھیلا دیا اور بولی۔ "آج تم چنا جور گرم والے سے چنے خریدنے گلی میں گئی تھیں نا۔ تو سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے جس مکان کے سامنے تم نے چنے خریدے، اس کا مالک شیخ منصور احمد ہے اور وہ اتنا خوبصورت ہے کہ اگر وہ عورت ہوتا اور میں مرد ہوتی تو اسے بھگا لے جاتی۔"

حلیمہ پہلی بار کھل کر ہنسی۔

نجمہ کہتی رہی۔ "اس کے گھر میں صرف وہی رہتا ہے یا نوکر چاکر ہیں جو اس کے حکم کے بغیر اُوپر کی منزل میں نہیں آ سکتے۔ اگر کوئی چاہے تو بڑی آسانی سے اس کے پاس جا سکتا ہے اور گھنٹوں بیٹھ سکتا ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کسی ایسے گھر میں قدم رکھنا جس میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں رہتی، ایسا ہی ہے جیسے میں نیکر بنیان پہن کر سڑک پر نکل جاؤں۔"

حلیمہ ایک بار پھر ہنسی۔

نجمہ بولتی رہی۔ "میرے ہاں سے اگر کوئی وہاں جا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔"

"میں؟" حلیمہ بستر میں اُٹھ بیٹھی۔

نجمہ نے تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے ایک بند لفافہ نکال کر بولی۔ "میں نے باتوں میں عمر لی

سے اس کے گھر کا سارا نقشہ پوچھ لیا ہے۔ اندر جاتے ہی دائیں ہاتھ کو سیڑھیاں ہیں جو سیدھی اوپر جاتی ہیں۔ تم اوپر چلی جانا۔ بنہ سلام کرنا اور کہنا کہ اس خط کی صورت میں بے حد شریف خاندان کی ایک لڑکی کی آبرو آپ کے پاس امانت رکھنے آئی ہوں۔“

“آپ نے اسے خط لکھا ہے؟” حلیمہ نے پوچھا۔

“ہاں۔” نجمہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔ “میں نے اسے لکھا ہے کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے، مجھے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے پوری دنیا میں صرف ایک مرد رہتا ہے اور وہ آپ ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ کوئی سبیل نکالیے ورنہ میں کسی روز آپ کے کمرے میں چھرا لے کر داخل ہوں گی اور اسے آپ کے سامنے اپنے سینے میں اُتار لوں گی۔“

“ہائے نجمہ بی بی، قسم سے، یہ لکھا ہے آپ نے؟” حلیمہ نے پہلی بار نجمہ کے کندھے پکڑ لیے۔

“ہاں۔” اب نجمہ کی آنکھوں پر آنسوؤں کی ایک مہین سی تہہ پھیل رہی تھی۔ “میں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر صورت دیکھے بغیر محبت نہیں ہو سکتی تو بھی آپ کو مطمئن رہنا چاہیئے کیونکہ مجھے میرا آئینہ روزانہ بتاتا ہے کہ میں بھی کچھ ایسی بُری نہیں ہوں۔“

“بُری نہیں ہوں!” حلیمہ بولی۔ “ارے نجمہ بی بی۔ قسم سے، آپ تو چھپی ہوئی مُورت ہیں۔ آپ تو اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ کو میں نے پہلی بار دیکھا تو سوچا کہ یہ بی بی بے شک مجھے تنخواہ نہ دیں، بس مجھے دیکھتا رہنے دیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔“

نجمہ چونکی۔ پھر ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور بولی۔ “ہائے، تم نے کیسی پڑھے لکھوں کی سی بات کی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بس یونہی ہو۔ تمہارے سینے کے اندر تو دل ہے۔“

حلیمہ شرما کر مسکرائی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ “لائیے۔“

“اس وقت؟” نجمہ نے خط کتاب میں رکھ دیا۔ “اری نہیں دیوانی۔ اس وقت نہیں۔ رات بھی کوئی وقت ہے، صبح صبح سودا لینے کے بہانے نکلنا تو چلی جانا۔ اوپر کوئی نوکر ہو تو کہنا، شیخ جی سے ایک دکان کا پوچھنے آئی ہوں۔ بازار میں منصور کی اپنی بھی ایک بڑی دکان ہے اور بہت سی دکانیں کرائے پر بھی دے رکھی ہیں۔ لوگ دکانوں کے لیے اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور دیکھو۔ میں نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا۔ تم بھی نہ بتانا۔ پوچھے تو کہنا، بس کوئی ہے۔ اس کے جواب ہی سے پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اگر وہ ایسا ویسا نکلا تو یوں کریں گے کہ تم ابا جی کے لیے کشتے کے بہانے ذرا سی سنکھیا لے آنا۔ وہ میں چپکے سے کھا لوں گی اور میرے ساتھ میری محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ محبت یونہی ختم ہوتی ہے۔ یوں ختم نہ ہو تو محبت نہیں ہوتی، بدچلنی ہوتی ہے۔ سمجھ گئیں نا؟“

مگر حلیمہ تو یہ بات سُن کر رونے لگی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ حلیمہ بس اسی دن روئی اور اس کے بعد تو وہ جیسے رونا بھول ہی گئی۔ چند ہی دنوں میں اس کے اندر سے چنچلتا یوں امڈ گھمڈ کر نکلی کہ سارے گھر کو ہنسانے اور سارے محلے کو چونکانے لگی۔ ایک لڑکا تو اس پر فدا بھی ہو گیا۔ جس گلی میں سے گزرتی، وہ نکڑ پر کھڑا آہیں بھرتا ملتا۔ ایک دن اس نے حوصلہ کر کے کہہ بھی دیا کہ “حلیمہ، میں تم پر مرتا ہوں۔“ اور حلیمہ پٹ سے بولی۔ “مرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتے۔ کہ تمہاری ناک کو سامنے سے دیکھیں تو پورب سے پچھم تک پھیل رہی ہے۔“

اور ایک طرف سے دیکھیں تو جیسے تم گھر سے نکلتے ہوئے ناک کہیں الماری میں بند کر آئے ہو۔" اس لڑکے کی محبت شکیب کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

حلیمہ، شیخ منصور احمد کے گھر یوں جانے لگی تھی جیسے اپنے گھر میں جا رہی ہو۔ رقعہ دیتی۔ رقعہ لیتی۔ پھر نجمہ کے پاس آ کر دروازہ اندر سے بند کر دیتی اور کہتی "پڑھئے نجمہ بی بی۔ اونچا اونچا پڑھیئے۔"

نجمہ پڑھتی "تم نے یہ کیا ستم توڑا ہے کہ اپنے کاروبار میں میرا جی ہی نہیں لگتا۔ دکان پر بھی جاتا ہوں تو تمہارے خط ساتھ لے جاتا ہوں اور انھیں بار بار پڑھتا ہوں۔ اب، کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم کون ہو۔ یہ دُوری مجھے اور بھی مارے ڈال رہی ہے۔ کل ایک شخص نے سات روپے کے رومال خریدے اور مجھے دس روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے تین کی جگہ اسے ترانوے روپے تھما دیے اور اس اللہ کے بندے نے بھی انھیں اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میرا ایک آدمی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ٹوکا تو گاہک بولا۔ کہ میں سمجھا شیخ صاحب زکوٰۃ نکال رہے ہیں۔ میرا آدمی نہ دیکھتا تو نوے کی ڈز پڑ گئی تھی — تو میرے ذہن کا یہ عالم ہے۔ اور تم ایسی ظالم ہو کہ آج تک ذرا سی جھلک بھی نہ دکھائی۔ تم کہتی ہو تم ہر روز مجھے چق میں سے دیکھتی ہو، تو کیا یہ چق اتنی بھاری ہے کہ تم سے ذرا سی اٹھ نہیں سکتی؟ کیا یہ بھینسے کی کھال سے بنی ہوئی چق ہے؟ —"

نجمہ اور حلیمہ ایک دم کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔ پھر حلیمہ نجمہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کی مسہری پر گراتی اور اسے پیار کرنے لگتی اور کہتی "قسم سے نجمہ بی بی۔ آپ کے رقعے کے انتظار میں وہ ایسا تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسے بلی چڑیا کی تاک میں ہو۔ مجھے دیکھتا ہے تو یوں فراٹے سے آ کر رقعہ چھینتا ہے کہ میرے تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آج تو اس نے شاید سیڑھیوں پر میرے قدموں کی چاپ سن لی۔ ابھی میں آخری سیڑھی پر تھی کہ میرے ہاتھ سے رقعہ جھپٹ کر وہ گیا۔ اور میں گرتی گرتی بچی۔ سیدھی سیڑھیاں ہیں۔ گرتی تو کھوپڑی ہنڈیا کی طرح پھیتے پھیتے ہو جاتی۔"

"اور جب تک وہ میرا رقعہ پڑھتا اور اپنا رقعہ لکھتا ہے، تم کیا کرتی ہو؟" نجمہ پوچھتی۔

حلیمہ کہتی "میں بس اس کی کتابوں میں مورتیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

ایک دن حلیمہ نے اسی سلسلے میں بتایا کہ "نجمہ بی بی۔ ہائے کیسے بتاؤں۔ اس کے پاس ایک کتاب ہے۔ اس میں ننگی تصویریں ہیں قسم سے۔ بالکل الف ننگی۔ یہاں وہاں دو انگل دھجی بھی نہیں۔ سہاگ رات کو پوچھ بیٹھے گا اس سے۔ کوئی کھڑی ہے، کوئی بیٹھی ہے، کوئی لیٹی ہے۔ کوئی دوہری ہو گئی ہے۔ کوئی تہری ہو گئی ہے۔ قسم سے!"

"ہائے، ایسی ہے وہ کتاب!" نجمہ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"جی" حلیمہ نے جی کی 'ی' کو لٹکایا۔ "پرسوں وہ رقعہ لکھ رہا تھا۔ میں نے کیا کیا کہ یہی کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی مگر وہ اللہ کا بندہ اِتنا سا بھی نہ گھبرایا۔ بولا "ارے یہ کہاں سے اٹھا لائی ہو میری ڈاکٹری کی کتاب؟" — سو نجمہ بی بی۔ آپ کا شیخ منصور صرف کاروباری ہی نہیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی بننے والا ہے۔"

اسی دوران میں حلیمہ پر کپڑوں کے نت نئے بدلتے فیشنوں کے دم سے جمپروں اور شلواروں کے ڈھیر لگتے رہے اور اس کی تنخواہ میں اضافے پہ اضافہ ہوتا رہا۔ پھر حلیمہ کے دم سے نجمہ کو محلے کے سو سوا سو بالغ افراد میں سے ہر ایک کے

معاشقے بھی معلوم تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کس کی کس کے ساتھ دوستی لگی ہے۔ کون کس کو دھوکا دے کر کدھر جھک گیا۔ کس نے کس کے ہاتھ کیوں رقعہ بھیجا ہے۔ حد یہ تھی کہ جب نجمہ اور حلیمہ چق کی اوٹ میں بیٹھی ہوتیں اور سڑک پر سے کوئی برقعہ پوش لڑکی گزرتی تو حلیمہ برقعے ہی سے پہچان لیتی کہ یہ اس محلے کی نہیں ہے اور —— "اگرچہ میں اسے نہیں جانتی مگر یہ کہیں خرا نیت سے نہیں جا رہی ہے۔ نیت خراب ہو تو چال بولتی ہے۔ یہ ضرور کسی خالہ نانی سے ملنے جا رہی ہے۔"

محبت کے بعد نجمہ کے صرف دو محبوب مشغلے تھے۔ نئے فیشن کے کپڑے اور محلے کے اسکینڈل۔ یہ شوق اس ح بڑھ چکے تھے کہ اگر کالج میں اس نے کسی لڑکی کے دوپٹے کا ایک سرا محض اتفاقاً بال پن سے اٹکا پایا تو اسی فیشن بنا اور محلے میں کوئی زور سے چھینکا بھی تو حلیمہ کو دوڑایا کہ گن سن لے آئے۔

ایک روز نجمہ نے شام کے بعد حلیمہ کو بلایا اور اس سے کہا "وہ ادھر منصور کے گھر کی پرلی طرف سے عورتوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ذرا جا کر معلوم تو کرو کہ کیا ہوا ہے۔"

حلیمہ تیر کی سی تیزی سے گئی مگر خاصی دیر تک نہ آئی۔ نجمہ چق کی اوٹ سے گلی میں جھانکتی رہی مگر حلیمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی بھی نہ کی۔ وہ بار بار چق کے پاس کیسے جا سکے گی۔ اس کی امی نے آ کر اسے پکارا تو وہ بولی "کیا ہے امی؟"

امی نے روشنی کر دی اور پوچھا "اندھیرے میں کیا کر رہی ہو بیٹی؟"

نجمہ بولی "سر میں درد ہے۔"

"تو پھر کھڑی کیوں ہو؟" امی نے پوچھا

"بس ٹہل رہی تھی۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"حلیمہ سے سر دبواؤ۔ وہ کہاں ہے؟" امی نے پھر پوچھا۔

"اسپرو لینے بھیجا ہے۔" نجمہ نے فوراً جواب گھڑا۔

"اسپرو؟" امی بولیں "تمہارے ابا کے لیے میں درجنوں منگوا کے رکھتی ہوں۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

امی پلٹیں تو حلیمہ آ گئی۔ وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھی جیسے ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اس کی عمر دس سال بڑھ گئی ہے۔ "اسپرو لائیں؟" امی نے پوچھا۔

حلیمہ بس ایک پل کو جھجکی۔ پھر بولی "جی نہیں ملی۔"

"اسپرو نہیں ملی؟" امی حیران رہ گئیں "یہ بھی کوئی نہ ملنے والی چیز ہے؟"

حلیمہ نے بڑے بھولپن سے کہا "جی میں نے تو یہاں سے وہاں تک سارے سبزی والوں سے پوچھا ہے۔ کسی کے پاس نہیں۔"

"سبزی والوں کے پاس؟" امی نے قہقہہ مارا اور نجمہ بھی ہنسنے لگی "رہیں نا وہی گنوار کی گنوار۔" پھر وہ چلی گئیں۔

نجمہ سنجیدہ ہو کر حلیمہ کی طرف بڑھی مگر اب حلیمہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی "کیوں نجمہ بی بی۔ قسم سے، کیسا بہانہ گھڑا؟"

"مگر تمھیں ہوا کیا تھا؟" نجمہ نے پوچھا۔

حلیمہ کچھ کہنے لگی تو امی اوپر سے آگئیں۔ پھر جب وہ نجمہ کو چند ہدایات دے کر چلی گئیں۔ تو حلیمہ بولی: "ایک لڑکی بھاگ گئی۔ وہ س کا دوپٹہ برقعے میں سے ہمیشہ نکلا رہتا تھا۔ اری نجمہ بی بی، وہی جو اس روز کپڑے والے سے قیمت چکا رہی تھی کہ برقعے کی نقاب اٹھا دی اور کپڑے والا مفت کپڑا دے گیا۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا؟"

"مجھے تو یاد نہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"تو پھر میں بتانا بھول گئی ہوں گی۔" حلیمہ بولی: "بس وہ لڑکی بھاگ گئی۔ ایک سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے گئی اور اسی سہیلی کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ اس کا کوئی دوست تھا جو برقعہ پہن کر آیا تھا۔"

"پر یہ سب پتہ کیسے چلا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"یوں، کہ سینما کا وقت ختم ہو گیا اور وہ نہ آئی۔ پھر اس کی ڈھنڈیا پڑی۔ پھر اس کی ماں وہیں اس کے بستر پہ بے ہوش ہو گئی۔ سی نے تکیہ ٹھیک کیا تو نیچے سے لڑکی کا رقعہ نکلا۔ اس میں وہ لکھ گئی ہے کہ ہم چلے۔"

"بے حیا!" نجمہ نے گالی دی۔

"اس کے باپ نے تو کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ہے اور اس کا بھائی گلیوں میں چاقو لیے پھرتا ہے۔"

"ہائے"، نجمہ ڈر گئی۔ "پر تم نے کیوں اتنی دیر لگا دی؟"

"میں اس کی ماں بے چاری کے تلوے ملتی رہی۔ اب ہوش میں آئی ہے تو میں اٹھ آئی۔"

"اب کیا ہو گا؟" نجمہ نے پوچھا۔

اور حلیمہ بولی: "ہونا کیا ہے بی بی۔ ہوتا آیا ہے۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔"

پھر حلیمہ جانے لگی تو نجمہ نے کہا: "اپنا کھانا یہیں اٹھا لاؤ۔ اکٹھے کھائیں گے۔"

حلیمہ بولی: "آج تو نجمہ بی بی، قسم سے میری طبیعت اتنی الجھ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بس بستر پہ لیٹوں گی۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔ آج رات کی چھٹی دے دیجیے۔" پھر وہ ایک دم ہنسنے لگی اور بولی: "ہائے۔ بڑی بی بی جی کے سامنے مجھے کیسا مزے کا بہانہ سوجھا۔ کیوں نجمہ بی بی؟" اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اب حلیمہ کا معمول سا ہو گیا کہ نجمہ کے کسی حکم کی تعمیل میں جاتی تو دیر دیر سے واپس آتی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی کہ درد ہو رہا ہے۔ انہی دنوں مہینے کی پانچویں کو اس کی ماں تنخواہ لینے آئی۔ پہلے اس نے بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی کو سلام کیا۔ پھر حلیمہ سے رقم لینے کے لیے اسے الگ لے گئی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے حلیمہ کو دوہتڑوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ نجمہ اور اس کی امی آوازیں سن کر نیچے بھاگیں مگر جب تک وہ حلیمہ کو ہاتھ سے گھسیٹ کر باہر گلی میں لے جا چکی تھی۔ نجمہ اور اس کی امی نے فوراً اوپر آ کر چق میں سے نیچے گلی میں جھانکا تو حلیمہ کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی اور اس کی ماں نے اس کا بازو اسی طرح جکڑ رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار نجمہ کی آواز چق کی چھلنی میں سے نکلی اور وہ پکاری: "حلیمہ۔ اے حلیمہ۔"

مگر نہ حلیمہ نے اوپر دیکھا نہ اس کی ماں نے اور دونوں گلی کے موڑ پر غائب ہو گئیں۔

نجمہ کی امی نے اسے فوراً پیچھے کھینچ لینا چاہا۔ "محلے میں اتنا اونچا نہیں بولتے بیٹی۔ کوئی تمہاری آواز سن لیتا تو کیا کہتا۔"

نجمہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور بولی "مگر امی۔۔۔ یہ آخر ہوا کیا؟"

امی نے اسے سمجھایا کہ "اُجڈ لوگ ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پہ گلے کاٹ دیتے ہیں۔ حلیمہ نے پیسے کہیں خرچ کر ڈالے ہوں گے۔ بڑھیا کو ہر مہینے بندھی ہوئی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتی۔ مار پیٹ کرے گی۔ کل کلاں سے آئے گی۔"

مگر کل کلاں کیا، حلیمہ مہینوں تک واپس نہ آئی۔

اور جس روز آئی، اس روز نجمہ کا گھر رنگ رنگ کی جھنڈیوں سے دلہن بن رہا تھا اور سڑک تک کی لمبی گلی نے شامیانے اور قناتیں اور قالین اوڑھ بچھا رکھے تھے۔ حلیمہ نے فوراً پلٹ کر سبز دروازوں، سبز کھڑکیوں اور سبز روشن دانوں والے مکان کی طرف دیکھا مگر وہاں تو محلے کے چند کتے ایک ہڈی کے مسئلے پر لڑ رہے تھے۔

حلیمہ کے پاؤں میں پھٹا پرانا جوتا تھا۔ اس کے کپڑے ڈھیلے اور میلے تھے اور اس کی لٹوں کو دھول نے رسیاں بنا ڈالا تھا۔ وہ آئی اور سیدھی اوپر جانے لگی۔ عورتوں کا اتنا ہجوم ہو رہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جنگلے کے ساتھ اس کی کمر چھل چھل گئی۔ مگر اسے کسی نے نہ پہچانا۔ پھر اوپر سے ہانپتا ہوا شرفو آیا، اسے گھور کر دیکھا اور بولا "اے۔ اوپر منہ اٹھائے کہاں جا رہی ہے؟ جا۔ باہر سے مانگ۔" پھر وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا اور حلیمہ اوپر نجمہ کے کمرے میں آ گئی۔

رنگ رنگ کے ریشم میں لپٹی ہوئی ساٹھ ستر لڑکیوں نے اس مخلوق کو ایک ساتھ دیکھا۔ پھر کوئی ہنسا تو سب ہنسنے لگیں۔ حلیمہ ان میں سے کئی کو پہچانتی تھی اور وہ ان کا سارا کچا چٹھا بیان کر سکتی تھی مگر پھر وہ سب ایکدم خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ دُلہن اُٹھی۔ روتی بلکتی ہوئی جھپٹی اور حلیمہ سے لپٹ گئی۔ "اری حلیمہ۔ اری میری سہیلی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم حلیمہ ہی ہو نا؟"

"جی ہاں نجمہ بی بی۔" وہ بولی "ہوں تو حلیمہ ہی۔"

"اور یہ کون ہے؟" نجمہ نے مہینے دو مہینے کے بچے کی طرف اشارہ کیا جسے حلیمہ نے اٹھا رکھا تھا۔

"جی یہ میرا بیٹا ہے۔" حلیمہ بولی۔

"اری کم بخت" نجمہ مسکرائی اور اس کے کندھے پر چپت ماری "تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور چپکے سے شادی کر لی؟"

حلیمہ بولی "شادی تو کر لی نجمہ بی بی۔ چپکے سے ہی کر لی۔ کرنی پڑ گئی۔ کرنی پڑتی ہے۔"

لڑکیاں ہنسنے لگیں تو حلیمہ نے نجمہ کو بازو سے پکڑا اور ملحقہ غسلخانے میں لے گئی۔

ذرا سی دیر کے بعد ایک چیخ نکلی اور کسی کے دھب سے گرنے کی آواز آئی۔ لڑکیاں گھبرا کر اٹھیں اور غسلخانے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ پھر نجمہ کی امی کو راستہ دیا گیا۔ انھوں نے اندر جا کر دیکھا کہ نجمہ فرش پر بے ہوش پڑی ہے، حلیمہ زور زور سے اس کی ہتھیلیاں مل رہی ہے اور بچہ فرش میں گڑے ہوئے فلش کے بیسن میں لڑھک گیا ہے اور رو رہا ہے۔

نجمہ کی امی نے وہیں فرش پر بیٹھ کر بیٹی کا سر گود میں رکھ لیا۔ لڑکیاں اس کی ہتھیلیوں اور تلووں سے چمٹ گئیں اور حلیمہ بچے کو فلش میں سے اٹھا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

پھر دالان میں کھڑی ہوئی لڑکیاں دوپٹے سروں پر پھیلاتی ادھر اُدھر ہٹ گئیں اور نجمہ کے ابا گھبرائے اور ہانپتے اندر آ گئے۔ نجمہ کے ہاتھ پیروں میں حرکت آ چلی تھی اس لیے اُدھر سے مطمئن ہو کر وہ حلیمہ کے سامنے آ تنے اور گرج کر پوچھا: "سچ سچ بتا کیا ہوا!"

حلیمہ دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولی: "میں نے تو میاں جی، قسم سے، بس اتنا کیا کہ نجمہ بی بی کو شادی کی مبارکباد دی۔ اور کہا کہ نجمہ بی بی، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی شادی شیخ منصور احمد جیسے کمینے سے نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا بکتی ہو!" نجمہ کے ابا کڑکے: "اسی سے تو ہو رہی ہے۔"

حلیمہ کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں: "اسی سے ہو رہی ہے! مگر میاں جی۔ وہاں اس کے گھر کے سامنے تو ——"

"وہ گلبرگ چلا گیا ہے" نجمہ کے ابا دہاڑے: "پر کتیا، تُو نے اسے کمینہ کیوں کہا؟"

حلیمہ خاصے وقفے تک ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی۔ پھر نظریں جھکا لیں اور بچے کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر لاتی ہوئی بولی: "غلطی ہو گئی میاں جی!"

خرمن

خدیجہ مستور

کنیز کوٹھری کے ایک کونے میں سر نہوڑائے بیٹھی تھی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے جا رہی تھی۔ اس کے پاس اماں کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور اسے گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔ کنیز نے ایک بار سر اٹھا کر بے بسی سے ماں کو دیکھا اور پھر گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔

"سوچ لے ری، ہاں کتنا بڑا آسمان ہے۔ چھ مہینے بعد جب واپس آئے گی تو دنیا یہی کہے گی کہ تیری ماں نے کھسم کیا' بہت برا کیا' کہہ کے چھوڑ دیا اسی سے بھی برا کیا' مجھ بڑھیا کی "جندگی" کیوں کھراب کرنے کی سوچ رہی ہے۔"

"اتنے دن تو گھر بیٹھوں گی اماں ری۔" کنیز منمنائی۔ "دنیا تو اب بھی جانے کیا کیا کہتی ہے۔ کوئی پتہ ہے میں مڑ کر نہ آؤں۔"

"مڑ کر نہیں آئے گی تو پھر کہاں جائے گی ری؟" اماں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"جواب دے اماں، دیری ہو رہی ہے۔" دین محمد نے صحن میں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ ستمبر کی دھوپ کھوپڑی چٹکائے دیتی تھی۔

"ماں باپ کی اٹکی سے چھ مہینے تو مجھ سے کھاتے پیتے گی۔" دین محمد کی آواز بہت اونچی تھی۔

"کہیں چلی جاؤں گی اماں، تو اسے جواب تو دے دے، کب کا کھڑا ہے۔" کنیز نے بے چینی سے کہا۔

"تو میری ناک کاٹنے پھر ادھر ہی آئے گی، پھر جائے گی کہاں و باؤلی، ایسی جگہ بیٹھ جہاں سے مڑ کر نہ آئے، اننوں کو کھسم بنایا پر کسی کے گھر نہ ٹک گئی۔"

"تجھ سے جو کہا ہے، کہہ دے جا کر کہ منجور ہے اب کے کل آ کر سادی کر لے۔" کنیز جیسے بلبلا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر دھم سے بیٹھ کر اور ٹانگ میں پھنسے ہوئے چوڑی دار پاجامے کو کھسکا کر پنڈلی کھجانے لگی۔

"حرامجادی کس کی سنتی ہے۔" اماں بڑبڑائی اور ایڑیاں پٹختی کوٹھری [illegible] "منجور ہے رے دین محمد!" اس نے چیخ کر اعلان کیا۔

کنیز دوڑ کر کوٹھری کے دروازے سے جا لگی اور باہر صحن میں جھانکنے لگی جہاں کھڑا ہوا دین محمد اپنا صافہ ٹھیک سے باندھ رہا تھا۔

"اچھا اماں میں چلا، کل کو آؤں گا، تیار رکھیو۔" وہ پگڑی سر پر جماتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

کنیز کوٹھری سے نکل آئی۔ سامنے صحن کا دروازہ اب تک کھلا تھا۔ وہ گم سم سی ادھر دیکھنے لگی۔ "کل سچ مچ تیری سادی ہو جائے گی ری کنیج" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"تل کوٹ کر تھوڑے سے لڈو بنا لے۔ کل جو تیرا خصم آئے گا تو اسے کیا دوں گی؟" ماں نے کڑوی کڑوی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو کس کارن کھار کھا رہی ہے اماں" کنیز نے چمک کر جواب دیا اور پھر کوٹھڑی میں جا کر ٹوکری سے تل نکالنے لگی۔

ماں کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی اور کنیز تل کوٹنے بیٹھ گئی۔ "اگر ابا جندہ ہوتا تو ایک دن تیری شادی بھی محبت کے ساتھ ہو جاتی ری، جب محبت نہیں رہی تو تجھ سے شادی کون کرتا" ـــــ کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "خیر کوئی بات نہیں، تھوڑے دن تو محبت کے ساتھ گھر بیٹھ کر گزر جائیں گے" کنیز نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔ آج اسے بڑی مدت بعد جانے کیوں ابا بار بار یاد آ رہا تھا اور اس کی موت کی ذرا ذرا سی تفصیل اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔

اس دن جب ابا مزدوری کر کے واپس آیا تو بکری کے لیے ہریالی لانا بھول گیا تھا۔ ایک گلاس پانی پی کر فوراً ہی چلا گیا۔ ماں روکتی بھی رہی "مت جا رے، بادل گھرے کھڑے ہیں۔ کپڑے بھیگ جائیں گے، رات ویسے بھی گجر جائے گی" پر ابا نے اس کی بات نہ سنی اور چلا گیا۔ پھر کنیز روٹیاں پکا کر انتظار کرتے کرتے تھک گئی مگر ابا نہ آیا۔ رات آ گئی، بڑے زور سے بارش ہونے لگی تھی۔ باہر گھور اندھیرا تھا اور بڑے زور سے بجلی چمک رہی تھی۔ ماں بے چین ہو کر بار بار بارش میں بھیگتی ہوئی باہر کے دروازے تک جاتی اور پھر لوٹ آتی۔ کنیز بار بار ماں کو تسلی دیتی کہ "بارش میں بھیگنے کے ڈر سے کہیں درخت تلے بیٹھا ہوگا۔" اس طرح اور بھی وقت گزر گیا، بارش رک گئی مگر ابا درخت تلے سے نہ غائب۔ وہ اماں کے ساتھ ابا کو دیکھنے نکل کھڑی ہوئی۔ دیا جلا کر اس نے پلو کی آڑ میں چھپا لیا تھا اور کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی قریب کے جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ ہوا دیے کی روشنی کے ساتھ دشمنی پر اتری ہوئی تھی مگر کنیز نے اسے بجھنے نہ دیا اور ایک ایک درخت تلے گھور گھور کر دیکھتی چلی گئی۔ پھر ایک درخت تلے اس نے دیکھا کہ ابا بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ اس نے ابا کو آوازیں دیں مگر وہ نہ اٹھا۔ ہریالی کا گٹھا اس کے قریب پڑا تھا اور درخت کے پتوں سے بوندیں ٹپ ٹپ اس کے کپڑوں پر گر رہی تھیں۔ ماں نے دیے کی روشنی میں غور سے دیکھا تو ابا کے منہ سے ہرا ہرا جھاگ بہہ رہا تھا اور ٹانگ پر خون کی دو بوندیں بڑی تازہ لگ رہی تھیں۔ "اری اسے تو سانپ ڈس گیا ہے" ماں کلیجہ پھاڑ کر رونے لگی۔

کنیز نے موسل زور سے پٹک دیا اور اوکھلی سے تل نکالنے لگی۔ "جانے کتنا جہر بھرا ہوگا۔ انہی تلوں کی طرح کالا ہوگا ری" کنیز کو وہ تل لہراتے ہوئے سانپ معلوم ہو رہے تھے۔ "اری تجھے نہ ڈس گیا۔ تیرا کیا کام تھا اس دنیا میں، ابا جندہ ہوتا تو کچھ کما کر لاتا، ماں کو محبت سے بٹھاتا۔ تو نے کیا کمایا ری، سب کچھ لٹا دیا۔ بھوک ظالم نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔"

اور پھر کنیز کو یاد آیا کہ بھوک نے اسے کتنی جلدی بے ایمان بنا دیا تھا۔ ابا کے مرنے کے دوسرے دن شام کو جب بکری سینگ ہلاتے گھر میں داخل ہوئی تو وہ لٹیا لے کر دوڑ پڑی تھی اور دودھ دوہ کر آدھے سے زیادہ خود پی گئی تھی اور آدھے سے کم اماں کو دیا تھا پھر بھی رات تڑپ کر گزری تھی۔ مارے بھوک کے ایک منٹ کو بھی نیند نہ آئی تھی اور وہ منہ اندھیرے چپکے چپکے اٹھ کر بکری کا دودھ دوہ کے پی گئی تھی۔ ساری رات کی روتی ہوئی اماں صبح بے خبر سو رہی تھی۔ دن چڑھے جب وہ اپنی کھاٹ پر سے اٹھی تو بکری کے تھن خالی تھیلیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کنیز نے گھنٹوں تھنوں کو سہلایا تھا تو کہیں جا کر آدھا پاؤ دودھ اترا تھا۔ اماں اتنا سا دودھ دیکھ کر بلبلا اٹھی تھی "اس ناس ماری کو کسی کصائی کے ہاتھ بیچ دے ری، یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔" اور کنیز نے بڑی مکاری سے کہا تھا

کہ "اماں ساید یہ گیابھن ہو گئی ہے' اللہ کرے گا دوسری بکری آ جائے گی' اسے بیچ کر کتنے دن روٹی چلے گی۔"

شام کو جب بکری چراگاہ سے واپس آئی تو تھن اتنے بھرے ہوئے تھے کہ بھوری بھوری کھال کھنچی معلوم ہو رہی تھی۔ دو تین دن میں ہی یہ راز کھل گیا تھا کہ بکری گیابھن نہیں اور وہ خوب چیخی تھی کہ "حرام جادی! گیابھن تو تو ہو گئی ہے۔ اری چار دن پیٹ کا بوجھ نہ رکھا' اتنے میں کما سکے تیرے ابا نے اور اب چاہتی ہے کہ تیرا پیٹ بھرنے کے لیے ابھی سے مجوری سروع کر دوں' مرنے والے کی عجت کھاک میں ملا دوں۔ بہادری بھی کیسی کی کہ کچھ نہ چھوڑ مرا۔"

"بڑے میں سیکے تھے۔" کنیز بڑبڑا اٹھی تھی۔ "روج روج باجرے کی روٹی اور دھنیے کی چٹنی' بہت ہوا تو گڑ کی بھیلی مل گئی' اب عجت لے کر بیٹھی ہو' مجوری کیسے بگیر پیٹ بھرنے سے رہا۔" کنیز نے ماں کو سمجھایا تھا۔

ماں سر جھکا کر کچھ سوچنے بیٹھ گئی تھی۔ "پر میں تو گنٹھیا کی ماری ہوں مجھ سے مجوری کیسے ہو گی ری' اور تو کرے گی تو تیرے ابا کی روح کیا کہے گی؟"

"لے بلا روحیں بھی کبھی کچھ کہنے آتی ہیں اماں' تو پھکر نہ کر' میں تیری کھدمت کروں گی۔" اور پھر دوسرے دن سے کنیز محنت مزدوری کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھی۔

"توبہ توبہ اللہ ما بھی دے۔" کنیز اوکھلی سے تل نکالتے ہوئے بڑبڑائی اور پھر سوچتی چلی گئی — "بن باپ کا جان کر جگت نے کتنا ستایا۔ ساروں نے اپنی عورت سمجھ لیا پر ایک نے بھی گھر نہ بٹھایا۔ جالم مار کر پانی بھی نہ دیتے اور توبہ سرم پھر بھی تلیا میں نہ ڈوب مری۔ یہ جندگی بھی کیسی چیج ہوتی ہے' اپنے ہاتھوں نہیں لی جاتی ری۔" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری اور دو آنسو ٹپ سے تلوں پر گر کر جذب ہو گئے۔ "رے دین محمد تو یہ لڈو کھائے گا' اس میں کنیج کے آنسو ملے ہیں' چھوڑیو نہ رے' تجھے ان آنسوؤں کی کسم!"

کنیز نے گھٹنوں میں منہ چھپا لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی مگر جب اماں جلانے کی لکڑیاں چن کر اندر آئی تو وہ آنسو پونچھ کر اس طرح جلانے بیٹھ گئی جیسے ذرا دیر پہلے روئی ہی نہ تھی۔

اب شام ہونے لگی تھی۔ وہ چولہے پر چھوٹی سی کڑھائی چڑھا کر لڈو بنانے لگی۔ اس کی اماں نیم تلے کھاٹ ڈال کر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکنیں بڑی گہری ہو رہی تھیں۔

"اماں اداس نہ ہو۔ میں تیرا کھیال رکھوں گی' سال سے جیادہ کا آٹا تو کوٹھری میں بھرا ہے' تیری اکیلی جان ہے۔" کنیز نے کڑھائی اتارتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی پھکر کر ری' میرا کیا ہے۔" ماں نے دھیرے سے کہا اور پھر المونیم کی لٹیا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

لڈو بنا کر کنیز مسافروں کی طرح صحن میں ٹہلنے لگی۔ برسات میں جمی ہوئی کائی کے اب سوکھ سوکھ کر اکھڑ چلے تھے' کچی دیواروں پر شورا پھول رہا تھا اور نیم کا درخت خوب ہرا بھرا ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ برسات میں ابا اس درخت میں جھولا ڈال دیتا تھا اور وہ لڑکیوں کو جمع کر کے گھنٹوں جھولا جھولا کرتی تھی۔ شادیوں کی باتیں ہوتی تھیں اور ساس سے جلن کا اظہار کرتے ہوئے سب کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے تھے۔

کنیز ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی کھاٹ پر لیٹ گئی۔ "اری کنیج! تیری ہی کسمت کھراب تھی' ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ ایک ایک کی شادیوں میں کھوب ڈھول بجے' نکاح ہوئے' دولہے سہرے باندھ باندھ کر آئے تھے۔ ایک تیری سادی ہو گی' اپنے ہاتھوں

ڈھونڈنے کی مصیبت سے۔ تو کیا ہے ری اور تیری شادی کیا ہی ڈھول بجانے کون آئے گا۔ اماں تو سب سے چھپاتی پھرتی ہے کسی کو پتہ نہ چلے کہ پوچھنے کے لیے شادی ہو رہی ہے۔" وہ نیم سے جھڑی ہوئی پتیاں دوپٹے پہ سے اٹھا کر مسلنے لگی۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا نہ اماں باہر سے لوٹی اور نہ کنیز کھاٹ سے اٹھی۔ اس وقت اسے اپنی بدنصیبی کے احساس کو جگانے اور سلانے میں بڑا سکون مل رہا تھا۔ بکری جب سے آئی تھی صحن میں کھلی پھر رہی تھی اور ہر جگہ مینگنیاں بکھیر رہی تھی مگر کنیز کا جی نہ چاہا کہ اٹھ کر اسے باندھ دے۔

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ منظر دیکھا تو منہ ہی منہ میں جانے کیا کچھ کہنے لگی پھر بکری کو باندھ کر دودھ دوہا اور آنگن سے مینگنیاں بٹورنے بیٹھ گئی۔

رات تھکی تھکی نیند میں کٹ گئی۔ آج صبح مزدوری کے لیے جانے کے بجائے وہ ماں کے ساتھ جنگل جا کر واپس آگئی۔ جھاڑو اٹھا کر اس نے کوٹھری اور آنگن جھاڑا پھر دو کھاٹیں نیم تلے بچھا دیں۔ اپنے حساب وہ بھائیوں کے پہنچنے کا انتظام کر رہی تھی مگر نظریں باہر کے کھلے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ "بس اب آتا ہی ہوگا وہ، کہیں نہ آیا تو؟" کاہے شبے کے کنیز کا دل بیٹھنے لگا۔ "اری اس گاؤں میں تو کوئی تجھ سے پوچھنے کے لیے بھی شادی نہ کرے گا۔"

ماں کوٹھری کی دہلیز پہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کنیز ہاتھ دھو کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی "میں تیرا کھیال رکھوں گی اماں ری!"

"چپ رہ حرام جادی" ماں نے جھنجھلا کر کہا اور پھر گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی —— "جو تو ایسی نہ ہوتی تو آج اپنی برادری میں محبت کے ساتھ بیاہ جاتی۔ اپنا گھر، اپنا گاؤں ہوتا۔ چھ مہینے بعد پھر بے عزت ہو کر آ جائے گی۔" اماں آنسو پونچھ کر اٹھ گئی اور کوٹھری میں جا کر سرخ پھولوں والے اپنے بکس میں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

کنیز جیسے کلیجہ تھامے وہیں کھڑی رہی۔ اس نے پہلے بھی اپنے لیے دوسروں سے اور خود اپنی ماں سے جانے کیا کچھ نہ سنا تھا مگر اسے اتنا ا نہ لگا تھا۔ پر آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر کہے کہ وہ ایسی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے گھر اور عزت کے لیے تڑپتی رہی تھی۔

"میلے پہ تیرے باپ نے تیرا جوڑا بنایا تھا، نہا کر پہن لے۔ وہ کہہ گیا تھا کہ نہ کچھ لانا ہے نہ لینا ہے، پھر کن جوڑوں کے انتظار میں ئی ہے۔" اماں نے جاپانی کپڑے کا سرخ پھولدار جوڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور پھر مٹکی سے چاول اور گڑ کی بھیلی نکال کر سوپ میں رکھنے لگی۔

"اماں کھا کما جان نہ جلا۔ تو نہ ڈر ری، میں واپس نہیں آنے کی۔" کنیز نے کپڑے بغل میں دبا لیے۔ "آ لینے دے، پھر پہن لوں گی، فکر نہ کر۔" جوڑا کھاٹ پہ رکھ کر وہ صحن میں چلی گئی۔ پانی کا گھڑا اٹھا کر نیم کے پاس رکھا اور پھر کھاٹ کھڑی کر کے اس کی آڑ میں نہانے بیٹھ گئی۔

نہانے کے بعد اس نے کھاٹ بچھا دی اور کوٹھری میں جا کر میلے دوپٹے سے بال پونچھنے لگی۔ اماں اب تک دہلیز پہ بیٹھی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھی۔ جانے اس وقت وہ کیا کیا سوچ رہی تھی۔ شاید یہی کہ سردیاں آنے والی ہیں۔ اس کے جوڑوں کا درد جاگ اٹھے گا۔ وہ اس میں اکیلی کھاٹ پہ پڑی کراہا کرے گی، کوئی اس کے جوڑوں پہ سرسوں کا تیل ملنے والا نہ ہوگا۔ کوئی ایک گلاس پانی دینے والا نہ ہوگا۔ آج اگر اس کی اپنی برادری میں، اپنے گاؤں میں بیاہی جاتی تو وہ اسے سردیوں کے سردیوں سسرال سے بلا لیا کرتی اور جانے کیا کیا ——

"اماں یوں چپ چاپ نہ بیٹھ۔" کنیز نے بال پیچھے جھٹک کر دھیرے سے کہا۔ اس کی نظریں آنگن کے ادھ کھلے دروازے کے پار ا محمد کی راہ تک رہی تھیں۔

ابھی اچھی طرح دھوپ نہ چڑھی تھی کہ دین محمد چار آدمیوں کے ساتھ آگیا۔ اماں نے آگے بڑھ کر ان کو کھاٹوں پر بٹھایا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "بہت صبح چلے ہو گے، پھر دھوپ کڑی ہو جاتی ہے، راستے میں تکلیف تو نہیں ہوئی تھی؟"

"کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اب تم جلدی کرو اماں، دھوپ چڑھنے سے پہلے نکل کھڑے ہوں، تین کوس کا راستہ ہے۔" دین محمد نے آہستہ سے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنے لگا۔

"تلے اتنی صبح صبح آگیا، چین نہیں پڑا تجھے رات کو۔" کنیز نے دل میں کہا۔ وہ خوشی سے جیسے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ "گاؤں والوں کو جب مالوم پڑے گا کہ کنیج بیاہ کر چلی گئی تو کیسا پانی پڑ جائے گا سب پہ۔" اس نے جلدی سے پھولدار کپڑے بدل لیے، تین موتیوں والی ہنکلی کی نتھ ناک میں ٹھونس لی اور پڑیا سے لال رنگ ہونٹوں پر ملتے ہوئے جب اس نے شیشہ دیکھا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ "ہے ری کنیج، اس وکھت ڈھول بجانے والیاں پاس ہوتیں تو پھر کیسا مجا آتا۔" وہ بڑبڑائی۔

گواہ کوٹھری کے دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے اور کنیز نے اتنے زور سے "ہوں" کی کہ سب نے سن لی۔ اماں ایک بار کھڑے سے بیٹھ گئی اور پھر لڈوؤں کی تھالی اٹھا کر کوٹھری سے نکل گئی۔

لڈو کھلانے کے بعد جب اماں اندر آئی تو اس نے سوپ میں رکھے ہوئے چاول اور گڑ کی بھیلی کنیز کے پلو میں باندھ دیے۔ "لے اب اٹھ، جانے کا وکھت ہو گیا ہے۔"

کنیز ذرا دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کا جی دکھ رہا تھا —— یہ کیسی شادی ہے کہ کوئی رخصت کرنے والا بھی نہیں اور پھر چھ مہینے کا کھٹکا جی کو ڈسے جاتا ہے —— وہ پلو میں بندھے ہوئے چاول سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔ "اماں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میری سادی چھ مہینے کے لیے ہوئی ہے۔"

"ایسا ہی ڈر پڑا تھا تو پہلے سوچتی ری، جب آئے گی تو سب کو نہ مالوم ہو گا؟" اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ "لے اب چل۔"

اماں کنیز کا بازو تھام کر اسے باہر آنگن میں لے آئی تو دین محمد اور اس کے ساتھی کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اماں کو سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔ کنیز اماں سے گلے مل کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

کچے لمبے راستے پر جب وہ تھوڑی دور چل لی تو اس نے مڑ کر دیکھا کہ اماں کھلے دروازے کے بیچ میں بیٹھی آنسو پونچھ رہی ہے۔ اماں سے رخصت ہوتے وقت اسے رونا نہ آیا تھا مگر اب اس کا جی بھر آیا۔ وہ رک کر اماں کو دیکھنے اور آنسو پونچھنے لگی —— "اماں! میں تیرا بڑا کھیال رکھوں گی تو پھکر نہ کرنا۔" کنیز کا جی چاہا کہ چلا کر کہہ دے۔ جانے کیوں اب اس کے قدم نہ اٹھ رہے تھے۔

دین محمد چلتے چلتے رک گیا۔ "کیوں روتی ہے ری، جلدی جلدی چل نہیں تو دھوپ تیج ہو جائے گی۔"

"اپنا آدمی اپنا ہوتا ہے ری، ابھی سے کھیال کر رہا ہے۔" کنیز کے پاؤں جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ اگلی پگڈنڈی پر جب وہ مڑی تو اس کا گھر اور گاؤں نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

چلتے چلتے وہ پسینے میں نہا گئی۔ ہونٹوں پر لگا ہوا لال رنگ پسینے میں بہہ گیا اور مارے گرمی کے اس کا سانولا رنگ تپ کر سیاہ لگنے لگا۔ راستے کی دھول نے اس کے پھولدار پاجامے کو گھٹنوں تک ڈھانپ دیا تھا، پھر بھی اسے تھکن کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آدمی کے ساتھ اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس کے خوابوں میں بسنے والا، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا جوان موٹی سی لاٹھی زمین پر مارتا اس کے آگے آگے

چل رہا تھا اور کنیز کی آنکھیں اس کی پیٹھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سوا وہ کچھ نہ دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ بکریوں کے ریوڑ ادھر ادھر چرتے پھر رہے تھے اور چرواہے لٹھ کی لاٹھی کے سہارے ٹیک کر اسے بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

”بس وہ اپنا گاؤں دکھنا ہے ری۔“ چلتے چلتے دین محمد نے رک کر کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ کنیز بھی تیزی سے چلنے لگی۔ ”سیدھے صبح سے چلنا ہے، جانتا ہوگا کہ میں تھک گئی، ارے میں تیرے ساتھ چل کر نہیں تھکتی رے۔“ کنیز نے بڑے جوش سے سوچا۔

اگلی پگڈنڈی کے موڑ پر وہ چاروں آدمی ہاتھ ملا کر دین محمد سے رخصت ہو گئے۔ ”وہ اپنا گھر دکھنا ہے ری ـــ“ دین محمد نے سب کو رخصت کر کے کنیز کی طرف دیکھا اور پھر اس کے برابر چلنے لگا ـــ ”تو گھر سنبھال لے گی؟ میرے دو بچے بھی ہیں، سکینہ بہت بیمار رہتی ہے۔“

”تو فکر نہ کر مجھے سب مالوم ہے۔“ کنیز نے آہستہ سے جواب دیا۔

”لڑائی جھگڑا تو نہ کرے گی؟“

”میں تجھے شرمندہ نہ کروں گی، فکر نہ کر۔“ کنیز نے کہا۔ اس کا جی بیٹھا جا رہا تھا۔ گھر قریب تھا اور وہ تھک گئی تھی۔ اس سے اب ایک قدم بھی نہ اٹھ رہا تھا۔ ”ارے دین محمد اس وکھت تو کوئی اچھی سی بات کر لیتا، اپنا مطلب بکتا ہے۔ لڑنا ہوتا تو تیرے ساتھ آنے کو راضی کیوں ہوتی ـــ تو کنیز کو نہیں جانتا۔“ کنیز نے آنسو پونچھ کر دین محمد کی طرف دیکھا جو اب اس سے بہت آگے چل رہا تھا۔ وہ سوچتی چلی گئی ـــ ”اپنی تو کسمت ہی کھراب تھی ری، لڑ کر کسے کھوری ملے ہے۔“

دوپہر پلٹ چکی تھی۔ اب دونوں گاؤں کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں اور گاؤں کی چکی بڑے زور سے ہک ہک کر رہی تھی۔ دین محمد ایک گھر کے سامنے رک گیا اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کنیز بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلی گئی۔ دین محمد جھپٹ کر آگے بڑھا اور برآمدے میں لیٹی ہوئی سکینہ پر جھک گیا۔ ”کیسی طبیعت ہے ری؟“

کنیز اجنبیوں کی طرح آنگن میں کھڑی رہ گئی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے گوندھی ہوئی مٹی سے کھیلتے کھیلتے اٹھ کر اسے اشتیاق اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”لے آیا رے؟“ سکینہ بستر سے اٹھنے کی کوشش میں جیسے گر سی پڑی۔

”لے آیا، پر تو نہ اٹھ طبیعت کھراب ہو جائے گی۔“

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے تکیے کے نیچے رکھا ہوا دوپٹہ نکال کر اپنے منہ پر ڈال لیا جیسے وہ کچھ بھی نہ دیکھنا چاہتی ہو۔

”اری تو ہی نے تو کہا تھا کہ گھر اور بچے تباہ ہو رہے ہیں۔“ دین محمد بڑا بیتاب ہو رہا تھا اور بار بار اس کے چہرے سے دوپٹہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو ہاتھ منہ دھو لے رے، میری طبیعت بگڑ رہی ہے، ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ سکینہ نے منہ پر سے پلو ہٹا دیا اور دین محمد کا ہاتھ پکڑ کر بڑے انداز سے دیکھنے لگی۔

کنیز آنگن میں کھڑی جیسے نہ کچھ دیکھ رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ دیوار پر بیٹھے ہوئے کوّے شور مچا رہے تھے اور آنگن کے ایک کونے میں بندھی ہوئی بھینس جانے کیوں ڈکرا رہی تھی۔

"اندر آجا ری، کچھ سوالی کیوں کھڑی ہے۔" سکینہ نے نقاہت سے کہا اور کنیز دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سکینہ کے پاس آئی، ہاتھ کی چاول اور گڑ کی پوٹلی اس کی گود میں آپڑی۔

"گھونگھٹ اُلٹ دے ری" سکینہ نے اشتیاق سے کہا ——— "میں بھی تو منہ دیکھوں تیرا۔"

کنیز نے گھونگھٹ سرکا دیا تو سکینہ نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے بڑے سکون کی لمبی سی سانس لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

کنیز نے بھی نیچی نیچی نظروں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی۔ "ہے ری کیسی خوبصورت بلا ہے یہ جان ہی تو کچھ سوا نہیں، ہڈیاں ہی ہڈیاں، جانو قبر کے کنارے لگ گئی ہے اور کتنے دن جئے گی غریب۔" کنیز نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

سکینہ کی بُری حالت نے اسے جانے کتنا مطمئن کر دیا تھا پھر بھی سکینہ کا حسن آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

دین محمد ہاتھ منہ دھو کر لال انگوچھے سے منہ پونچھتا ہوا باہر چلا گیا تو سکینہ پٹی کی ٹیک لے کر اٹھ گئی۔ "بڑے دنوں سے بیمار ہوں، کوئی نہ گھر دیکھنے والا ہے نہ بچے۔"

"تو پھکر نہ کر ری، میں جو آگئی ہوں تیری کھدمت کرنے۔" کنیز نے دھیرے سے کہا ——— اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی ——— "مجھے سب کام بتا دے۔" وہ دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے چاول کھولنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سکینہ کی آنکھوں میں اس کے لیے کتنی نفرت تھی۔

چاول اور گڑ کی بھیلی تھالی میں رکھ کر کنیز نے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر گھڑے کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ منہ دھلانے لگی "راجہ بابو منہ دھلائے گا، گڑ کا ملیدہ کھائے گا۔" وہ لڑکوں کو ضد کرنے پر بہلا بھی رہی تھی۔

دوپٹے کے پلو سے منہ ہاتھ پونچھنے کے بعد وہ بچوں کو کوٹھری میں لے گئی اور پھر چھوٹے سے ہرے پھول دار بکس سے کپڑے نکال کر بچوں کو پہنا دیے۔ ہاتھ منہ صاف کرا کے دونوں کیسے پیارے لگ رہے تھے۔ بڑے لڑکے کی رنگت تو بالکل سکینہ جیسی تھی چھوٹا باپ پر پڑا تھا۔ کنیز کو چھوٹے پر بڑی ممتا پھوٹ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے کو لپٹا کر چومنا شروع کر دیا۔ "ہے ری کچھ دن بعد بیچارے بن ماں کے رہ جائیں گے، پر میں انھیں تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ یہ تو میرے دین محمد کے بچے ہیں۔"

بچے خوشی خوشی باہر نکل گئے تو کنیز اپنے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ تین بڑے بڑے بکس جن میں تالے پڑے ہوئے تھے، پیتل کے بھاری بھاری، سرخ پایوں والا نواڑی پلنگ اور اس کے پائنتی رکھا ہوا نیا لحاف اور گدا، ایک طاق میں رحل پر قرآن شریف رکھا تھا، دوسرے طاق میں گیس کی لالٹین اور تیسرے طاق میں آئینہ اور سرمے دانی۔

کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ان تینوں بکسوں کو بھی کھول کر دیکھ لے۔ جانے کیا کچھ بھرا ہوگا۔ آخر تو اب یہ سب چیزیں اس کی ہیں۔ سکینہ کی بُری حالت دیکھ کر کنیز کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس گھر سے مر کر ہی نکلے گی۔

ہر چیز پر دھول جمی تھی، بچوں نے ہر طرف کوڑا پھیلا رکھا تھا۔ جانے کب سے کوٹھری میں جھاڑو نہ دی تھی۔ کنیز کو افسوس ہونے لگا ——— "عورت روج روج کی بیمار ہو تو پھر یہی ہونا ہے ری۔ اسی کارن تو بیچارے کو دوسری سادی کرنی پڑی۔ ایسی عورت سے بھلا کیا سواد ملے۔" کنیز نے شرما کر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ لیا ——— "ہے ری کیسا محلوں جیسا گھر ملا ہے۔ کیسی کیسی چیزیں کہ آدمی کی نجر نہ ہٹے۔"

[illegible] اس نے سکینہ کی طرف دیکھا جو نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ سکینہ نے چونک کر کنیز کی طرف دیکھا: "باہر چھپر کے جو بیل بندھے ہیں وہ اپنے ہی ہیں ری؟" کنیز نے پوچھا۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول کر گھر کی مالکن بنی ہوئی تھی۔

"کیوں ری! کس لیے پوچھ رہی ہے؟" سکینہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر تجھے کیا۔ "بیل میرے ہیں تیرے باپ کے نہیں۔ اب جا کر ہانڈی چڑھا دے، شام ہو رہی ہے، دینو جلدی روٹی کھاتا ہے۔ بھینس بھی دوہ لے۔" سکینہ نے منہ پھیر لیا۔

"ہے ری کیسا گھور رہی ہے، کل کی آس نہیں، جندگی نام کرا کی نہیں۔" کنیز صحن میں جا کر بالٹی دھونے لگی۔ "اری اب تو یہ گھر میرا ہے، تیری بھی خدمت کروں گی۔"

بھینس دوہتے ہوئے کنیز کو عجیب سا فخر محسوس ہو رہا تھا۔ "ہے اتنا بڑا جانور، جانو ہاتھی لگتا ہے۔ بھلا بکری بھی کوئی چیز ہوئی، ایک لٹیا دودھ دے اور سینگ مارے الگ۔" بکری کے ساتھ اسے اپنی بکری بھی یاد آ گئی اور اماں کی تنہائی کا خیال بھی ستانے لگا۔ "نہ جانے بیچاری اماں کیا کرتی ہوگی، پر بیٹیاں ہمیشہ تو نہیں بیٹھی رہتیں۔"

شام ہو گئی تھی، آنگن کی کچی دیوار پر بیٹھے ہوئے کوّے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے۔ باہر سڑک سے بھینسوں اور بکریوں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دال صاف کر کے چڑھا دی اور پھر دو گھڑے اٹھا کر کنوئیں پر پانی بھرنے چل گئی، بچوں کا ہاتھ منہ دھلانے کے بعد ذرا سا پانی رہ گیا تھا۔

گھڑے منڈیر پر رکھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرنے لگی، دوسری عورتیں بڑی تیزی میں تھیں۔ "اری تو دوسرے گاؤں سے آئی ہے، دین محمد کی عورت ہے نا؟" ایک عورت نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ری!" کنیز نے غرور سے گردن اونچی کر کے ذرا سی گھونگھٹ نکال لی۔

"آج ہی تو لایا ہے کر کے، اس دنیا کا کیا اعتبار، سکینہ کو تو مر لینے دیتا۔" دوسری عورت نے کہا اور گھڑا کمر پر جما کر چل دی۔

"چڑیل کو جانے کاہے کا دکھ ہے۔" کنیز نے ٹیڑھی ٹیڑھی نظروں سے جاتی ہوئی عورت کو دیکھا اور گراری میں رسی ڈال دی۔

پانی بھر کر جب گھر لوٹی تو دین محمد چھوٹے کو گود میں لیے سکینہ کے پاس بیٹھا تھا اور سکینہ منہ موڑے لیٹی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بار بار شانے پر ہاتھ رکھ رہا تھا اور آنچل کھینچ رہا تھا۔ کنیز کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل کے بالکل نزدیک کسی نے آگ جلا دی ہے۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں پکانے لگی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھاتی بھی جا رہی تھی۔ "اری تجھے تو پہلے ہی معلوم تھا، پھر کیا فائدہ اس کڑھنے کا۔ تجھے تو [illegible] کو لے کر آئے ہیں۔ تو تو مسافر ہے ری۔ رات کے رات ٹھہرے، منہ اندھیرے چل دیے۔" کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری اور دونوں لڑکوں کو پیار کر کے روٹی کھلانے لگی۔

بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد اس نے ڈلیا میں روٹی اور دال کا پیالہ رکھ کر سکینہ کی طرف بڑھا دیا جو اب تک منہ پھیرے لیٹی تھی۔ پھر چپ چاپ کھڑے ہو کر نیچی نیچی نظروں سے دین محمد کو دیکھنے لگی۔

"اٹھ کر تھوڑا سا کھا لے۔" دین محمد نے سکینہ کو سہارا دیا تو وہ بڑے تکلف سے اٹھ گئی اور دین محمد اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلانے لگا۔ سکینہ ہر نوالے پر بس بس کر رہی تھی اور کنیز بڑی بے بسی سے کھڑی دیکھ رہی تھی کہ اس جھانگڑ جیسی عورت میں اب کیا رہ گیا ہے جو دین محمد اس

کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔

"بس کر دینو میرے پیٹ میں چھریاں چلتی ہیں رے۔" دو چار نوالوں کے بعد سکینہ نے تڑپ کر پیٹ پکڑ لیا۔ دین محمد نے گھبرا کر اسے لٹا دیا اور لحاف سے چورن کی شیشی اٹھا کر پھنکارنے لگا۔

کنیز روٹی کی ڈلیا اٹھا کر چولہے کے پاس چلی گئی۔ کیسا جی دکھ رہا تھا۔ دینو نے کچھ بھی تو نہ کھایا ری، اسی لیے تو کمزور ہو رہا ہے، نہ خود کھائے نہ کھانے دے، ابھی ہوتی تو اس کے لیے بھر دستی کھاتی، چاہے میرا پیٹ پھٹ جاتا، کیسی جھوٹی محبت کرتی ہے تو بھی، جانے کس سے جادو کرا دیا ہے، ویسے کون پھرتا ہے بیمار عورت کے پیچھے۔"

کنیز کو کئی نام یاد آ گئے جن کی عورتیں ہمیشہ بیمار رہتیں اور وہ انھیں پلٹ کر پوچھتے تک نہ تھے۔ ان میں سے دو ایک تو کنیز کے پیچھے پھرتے تھے۔

سامان بٹورتے اور بھینس کو سانی لگاتے لگاتے خاصی رات ہو گئی۔ دور سے سیاروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جانے کہاں، کتنی، دور بہت سی مردانی آوازیں مجیرے پر گا رہی تھیں۔ پیا سوتن گھر جائے بسے ہو ہو——

کنیز کان لگا کر سننے لگی——" لے تیری شادی کی خوشی میں گانے ہو رہے ہیں، تیری تو ایسی شادی ہوئی کہ نہ ڈھول بجی، نہ ڈولی میں بیٹھی، کسی نے بیل گاڑی بھی نہ کی، بس تیری شادی ہو گئی۔" پھر ایک دم کنیز کو یاد آیا کہ آج تو اس کی شادی کی پہلی رات ہے۔ ابھی تو اسے اپنا بستر لگانا ہے "بھلا تو کہاں سوئے گی ری—— تو اس سے کون کون سی باتیں کرے گی؟ ہائے کیسا میٹھا میٹھا لگتا ہے۔"

"تو چھوٹے کو اپنے پاس سلا لیجیو ری۔ آنگن میں بستر لگا لے۔ اچھی طرح اڑھا لیجیو، رات اوس پڑتی ہے، چھوٹے کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔" سکینہ نے درد سے تڑپتے ہوئے اور دین محمد کی آغوش میں سر ٹیکتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔

کنیز کو ایسا لگا کہ سکینہ کے پیٹ سے ایک چھری نکل کر اس کے کلیجے کو چیر گئی ہے۔ وہ ذرا دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ رات کے سناٹے میں کنوئیں کی گراری گھومنے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی—— اماں نہ کہتی تھی کہ سوچ لے۔" اب کاہے کا گم کرتی ہے؟" کنیز نے اپنے آپ سے پوچھا۔

آنگن کے ایک کونے میں بستر لگا کر اس نے باہر کے دروازے بند کر لیے اور پھر چھوٹے کو اپنے سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔

"بھول تو نہ جائے گا رے؟" سکینہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ دینو نے کیا کہا، کنیز سن نہ سکی۔ اس نے گردن اچکا کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں منہ سے منہ جوڑے لیٹے تھے۔

کنیز نے ٹھنڈی آہ بھری——" جانے چاند کی کون سی تاریخ ہو گی۔ شاید رات گئے چاند نکلے گا، ابھی تو اندھیارا پھیلا ہے۔" کنیز جیسے اپنے جی کو بہلا رہی تھی۔" جانے گاؤں والوں نے اپنے جی میں کیا سوچا ہو گا، کہتے ہوں گے کہ لو کنیز کی بھی شادی ہو گئی، اب جرور پچھتاتے ہوں گے کہ ہم نے کیوں نہ شادی کر لی۔ سب جرور یاد کرتے ہوں گے، پر اب یاد کرنے سے کیا بننا ہے ری۔ اس وکھت تو سب کو کہہ تھکی کہ گھر میں بٹھا لو، تب کسی نے نہ مانا۔"

ایک بار اس نے پھر گردن اچکائی۔ وہ دونوں اسی طرح لیٹے تھے—— شاید سو گئے۔ گریب سوئے نہ تو کیا کرے، مرد جاگے تو کچھ اور ہی یاد آتا ہے۔ اس نے جادو کرا کے کابو میں کر لیا ہے۔ کب تک جئے گی۔"

تین کوس پیدل چلنے کی تھکن نے اسے جلدی سلا دیا مگر وہ صبح منہ اندھیرے اٹھ گئی۔ بھینس دوہنے کے بعد اس نے آگ جلا کر دودھ پکنے کے لیے رکھ دیا اور پھر جلدی سے رات کے بچے ہوئے دہی کو متھنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں دین محمد جنگل سے فارغ ہو کر آ گیا۔ اس نے رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کیا اور چھاچھ کا گلاس پی کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا — "سکینہ کا خیال رکھیو ری۔" باہر نکل کر چھپر تلے سے بیل کھول کر وہ جلدی سے انھیں ہانکنے لگا۔

کنیز اسے ناشتہ کرتے اور جاتے ہوئے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تھی۔ اسے کتنا انتظار تھا کہ شاید وہ کچھ کہے گا۔ سکینہ سو رہی تھی اب تو وہ کچھ کہہ سکتا تھا۔

دین محمد کے جانے کے بعد کنیز نے بھینس کے نیچے سے گوبر سمیٹ کر اس میں پیلی مٹی ملائی اور سکینہ اور بچوں کے سو کر اٹھنے سے پہلے پہلے کوٹھری اور برآمدہ لیپ ڈالا۔ جس وقت سے وہ یہاں آئی تھی جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین کھل رہی تھی۔

کوٹھری کو لیپتے ہوئے اس نے بڑا سکون محسوس کیا تھا — اسے بڑے سہانے سہانے خواب نظر آ رہے تھے اور وہ اپنے کو سمجھا رہی تھی — "ساری کچھ دن کی دیر ہے، ماہ پوہ کی سردی میں تو یہیں اس نواڑی پلنگ پہ دینو کی چھاتی سے لگ کر سویا کرے گی — سکینہ نہیں جیئے گی۔"

ہاتھ دھو کر جب وہ بچوں کو لپٹائے پیار کر رہی تھی تو سکینہ اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ذرا دیر کے لیے التفات کی جھلک آ کر غائب ہو گئی۔ اس نے کراہتے ہوئے کنیز کو آواز دی تو وہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر بھاگی — "ہائے ری سکینہ، رات کی تکلیف میں کیسا پیلا منہ ہو رہا ہے، ذرا سا دودھ پی لے تو کچھ جی جائے۔"

سکینہ نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لیے اور پیٹ سہلانے لگی — "نصیبوں سے کھانا پانی اٹھ گیا ہے ری، تو جلدی جلدی روٹی پکا لے، کھیت پہ لے جانی ہو گی، چھوٹے کو ساتھ لے جائیو، ورنہ بتا دے گا۔" سکینہ نے کراہتے ہوئے کہا اور پھر لیٹ گئی — کتنے خطرات، کتنی نفرت اس کی آنکھوں میں امنڈ رہی تھی۔ کتنی ناکامیاں زہر گھول رہی تھیں۔

موٹی موٹی گھی چپڑی دو روٹیاں اور چھاچھ سے بھری ہوئی لٹیا لے کر جب کنیز نے کھیت پہ جانے کے لیے چھوٹے کی انگلی پکڑی تو سکینہ جیسے ناگن کی طرح لوٹنے لگی — "روٹی دے کر پھوراً مڑ آئیو، دھوپ اس دیوار تک نہ چڑھنے پائے ری۔" سکینہ نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ کنیز نے مڑ کر دیکھا، دھوپ دیوار کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

کنیز جب کھیت پر پہنچی تو دین محمد تھک کر ایک پیڑ تلے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دھول کا غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کنیز اس کے قریب بیٹھ گئی اور انگوچھا کھول کر روٹی سامنے رکھ دی۔ دین محمد نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر کھانے لگا۔ "سکینہ کیسی ہے ری؟" اس نے پوچھا۔

"اچھی ہے رے" کنیز نے آہستہ سے جواب دیا — "اتنی دور سے آئی ہوں، مجھے بھی پوچھ لے رے!" کنیز نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دین محمد نے کوئی جواب نہ دیا اور روٹی کھا کر برتن انگوچھے میں باندھ دیے۔ "تجھے یہ گھر اچھا لگا ری؟" دین محمد نے دھیرے سے پوچھا جیسے کسی کے سننے کا خوف طاری ہو۔

"تیرا گھر نہیں، میرا گھر ہے دین محمد۔" کنیز نے کچھ اس طرح سر اٹھا کر کہا کہ دین محمد ایک لمحے کو جیسے ان آنکھوں میں کھو کر رہ گیا۔ "ارے میں چلی۔ سکینہ نے کہا تھا کہ دھوپ دیوار پہ نہ چڑھے تو لوٹ آئیو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو اس کی کھوب کھدمت کرے گی نا؟" سکینہ کا نام سنتے ہی دین محمد کا چہرہ اتر گیا۔

"میرے اوپر بھروسہ کر رے۔" وہ چھوٹے کی انگلی پکڑ کر چل دی۔

گھر پہنچی تو سکینہ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں —— "تو نے اتنی دیر کیوں لگا دی ری؟" سکینہ جیسے چیخ پڑی۔

"لمبا رستہ ہے سکینہ! اس نے روٹی کھائی تو میں اٹھ پڑی۔"

"تو نے اس سے کون سی باتیں کی تھیں؟" سکینہ نے اسے گھورا۔

"اری! مجھے کیا کہنا ہے، میں تو تیری کھدمت کر آتی ہوں۔" کنیز کمر پہ گھڑا جما کر پانی بھرنے چلی گئی۔

شام جب دین محمد کھیت پر سے واپس آیا تو سکینہ بیتابی سے اٹھ پڑی اور اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ دین محمد نے اس کا سر سینے سے لگا لیا تو سکینہ سرگوشیوں میں اس سے جانے کیا کہتی رہی۔ یہاں تک کہ ذرا ہی دیر میں دینو صافے سے آنسو پونچھنے لگا۔

"ارے تو کیوں روئے، تیرے دشمن روئیں" —— کنیز نے پھڑک کر ادھر دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ توے پہ پڑی ہوئی روٹی جلتی رہی۔ اس کا کیسا ہی جی چاہ رہا تھا کہ دین محمد کے آنسو پونچھ ڈالے اور سکینہ کا گلا گھونٹ کر یہ چار دن کی زندگی بھی چھین لے۔

رات مارے درد کے سکینہ نے کچھ نہ کھایا۔ دین محمد نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کنیز بچوں کو کھلا کر خود بھی بھوکی پڑ رہی، پھر اس سے کون کہتا کہ تو بھوکی نہ رہ —— ہاں سکینہ ساری رات ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہی اور دین محمد اس کی ہر آہ پر سوتے میں بھی چونکتا رہا۔

دوسرے دن جب کنیز کھانا لے کر اس کے پاس کھیت پر گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، بیلوں کی طرح سر جھکا کر کھانا شروع کر دیا۔

"بہت تھک گیا ہے رے، تو کھانا کھا لے تو میں تیرے پاؤں داب دوں۔" کنیز نے اس کے قریب سرک کر کہا۔ چھوٹا ادھر کھڑے کھیت میں ادھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا —— "تجھ سے سکینہ نے کہا ہے کہ بات نہ کیجیو۔ نہ بول، پر میں تو بولوں گی، اس نے مجھے کوئی کسم دی ہے، تجھ سے نہ بولوں گی تو پھر کس کے سنگ بات کروں گی رے، کیوں میں جھوٹ کہتی ہوں؟"

دین محمد پھر بھی کچھ نہ بولا۔ بس ایک بار نظر اٹھا کر کنیز کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو آواز دینے لگا۔

کنیز ذرا اور قریب سرک گئی۔ دین محمد چھوٹے کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگا۔

"یہ کس کے نام کی چمیاں لے رہا ہے رے؟" کنیز نے اسے چھیڑا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ دین محمد نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا —— "گھر جا ری۔" اس نے چھوٹے کو گود سے اتار دیا اور بیلوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ہائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ سے کیوں بھاگتا ہے؟ کیا میری تیری سادی نہیں ہوئی؟ تین کوس دور تیرے پیچھے آئی ہوں رے ——" کنیز اکیلی بیٹھی سوچتی رہ گئی اور پھر برتن اٹھا کر چھوٹے کی انگلی پکڑ لی۔ دینو کی شرافت پر تو وہ اس وقت قربان ہو کر رہ گئی تھی۔ "اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو جانے کیا کرتا ری پر وہ آدمی تھوڑے ہوتے ہیں، ڈنگر ہوتے ہیں۔"

گاؤں والے حیران تھے کہ کنیز نے گھر اور بچوں کو سنبھال لیا۔ سکینہ کی خوب خدمت کی، کبھی کسی سے نہ لڑنے بھڑنے کی آواز

دشمنی۔ جب کنوئیں پر جاتی تو عورتیں سکینہ کا حال پوچھتیں اور وہ ایسی رقت سے اس کی خراب حالت کا ذکر کرتی کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ جوں جوں سردی بڑھتی جا رہی تھی سکینہ کی حالت بھی گرتی جا رہی تھی۔ کنیز اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیتی مگر اس کی یہ کیفیت کوئی نہ جانتا تھا۔ دین محمد خوش نظر آتا تھا کہ اس کی سکینہ کی خوب خدمت ہو رہی ہے مگر جب کنیز کھیت پر روٹی لے کر جاتی اور اسے رجھانے کے لیے باتیں کرتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔

جب سے سردیاں پڑی تھیں سب لوگ ایک ہی کوٹھری میں سونے، ایک سرے پر سکینہ اور دین محمد کا پلنگ ہوتا، دوسرے سرے پر کنیز چھوٹے کو لے کر لیٹتی۔ سرِ شام پکا کھا کر وہ کوٹھری کو اُپلے جلا جلا کر گرم کر دیتی اور پھر دور پڑے پڑے دیکھتی رہتی کہ کراہتی ہوئی سکینہ پر دین محمد جھکا ہوا ہے، اسے سہلا رہا ہے، دبا رہا ہے، چوم رہا ہے، اس کی تکلیف پر آنسو بہا رہا ہے۔ کنیز تڑپتی رہتی، جلتی رہتی، اس کے شوہر کو ایک بیمار عورت چھینے ہوئے تھی مگر کنیز منہ سے اُف بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ سکینہ کی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو بہت سے لوگوں نے بتایا تھا کہ بعض جادو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اسی وقت ختم ہوتا ہے جبکہ جادو کرانے والا مر جائے۔

شام پڑتے ہی کنیز جلدی جلدی سارا کام ختم کر لیتی تو بھینس کو دالان میں باندھ کر اپنے بستر میں آجاتی۔ دین محمد جیسے ہی گھر میں آتا اور سکینہ کے پاس بیٹھتا تو کنیز کے دانتوں میں جیسے بجلی کی تڑپ آجاتی —— "ہائے ری جانے وہ دونوں کیا کہتے ہوں گے کون سی باتیں کرتی ہو گی سکینہ؟" گھنٹوں کے کام منٹوں میں کر کے وہ اپنی کھاٹ پر آجاتی اور سکینہ کو بار بار کام یاد آنے لگتے مگر آج جب وہ اپنی کھاٹ پر بیٹھی تو سکینہ کو کوئی کام نہ یاد آیا۔ دین محمد کے کندھے پہ سر رکھے جانے کیوں وہ چپ چاپ بیٹھی دیے کو تکے جا رہی تھی۔ دین محمد بار بار اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کنیز کا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ کر کہہ دے "مرنے والے اسی طرح روشنی کو تکتے ہیں رے، تو کیوں پھکر کرتا ہے۔"

"تیل کھتم ہو جائے تو بتی آپی آپ بجھ جاتی ہے رے، میری جندگی کا تیل بھی کھتم ہو رہا ہے۔" دین محمد کے اصرار پہ آخر سکینہ بول ہی پڑی۔

"اس طرح کہے گی تو میں کنوئیں میں کود پڑوں گا، تو نے تو ساری باتیں بھلا دیں سکینہ۔" دین محمد بیتاب ہو رہا تھا۔

کنیز تن من سے سن رہی تھی —— "کون سی باتیں رے دین محمد، تجھ سے کیا کہا تھا سکینہ نے؟ ہائے رے مجھے نہ بتائے گا؟ کیا تو میرا آدمی نہیں؟ مجھے بتا، میں جو تیری عورت ہوں۔ ارے دین محمد میں نے تیرے ہی تو کھواب دیکھے تھے۔" کنیز بار بار کروٹیں بدل رہی تھی اور سکینہ دیے کی لو تکے جا رہی تھی۔

"بول ری؟" دین محمد اس سے جواب مانگ رہا تھا۔

"پھر وعدہ کر کہ اگلے مہینے پھصل کاٹ کر مجھے سہر آگرہ علاج کے لیے لے جائے گا، وہاں بڑے اسپتال میں رکھے گا، تو چاہے گا تو تیل کبھی نہ کھتم ہو گا۔"

"سہر میں علاج کے لیے تو بہت سے روپیوں کی جرورت ہو گی، پر تو نے پہلے کیوں نہ کہا۔ میں تیری کھاطر ہل، بیل، بھینس سب بیچ دوں گا۔ پھصل کا دانہ دانہ اٹھا دوں گا، میں بھوکا رہ لوں گا پہ تجھے جرور لے جاؤں گا۔"

"بھوکے مریں تیرے دشمن۔" کنیز تڑپ کر بیٹھ گئی۔ "کون بیچے گا میرے بیل، میری بھینس، پھر یہ سب کہاں سے ملے گا رے ——؟"

گاؤں والے بے حجت سمجھیں گے شہر میں تو بابو لوگ جاتے ہیں علاج کرنے۔ جانے کیسے کیدو نے یہ سب کچھ کہہ دیا۔ اس کا تن ٹٹ رہا تھا اب گھر گھٹتے کیسے دیکھتی۔

"اری تو کون بولنے والی۔ کہاں سے آگیا تیرا گھر حرام جادی! تجھے تو جینے کے لیے کھدمت کرنے کو لائی ہوں" سکینہ ڈائنوں کی طرح چیخی۔

"کھبردار جواب تو نے بات کی، جان کھینچ لوں گا" دین محمد چنگھاڑا۔

"ملے میں کیوں نہ بولوں، سب بیچ دے گا تو بھوکا مرے گا، میں تجھے بھوکا کیسے دیکھوں گی، یہ تجھے الٹی باتیں سکھاتی ہے، اس نے تجھ پر جادو کیا ہے رے۔ یہ مر جائے گی پر تجھے بھوکا چھوڑ کر جائے گی۔"

"یہ مر جائے گی!" دین محمد دیوانوں کی طرح کنیز کی طرف جھپٹا اور چوٹی پکڑ کر بے دردی سے پیٹنے لگا۔ "نکل جا، ابھی نکل جا——" وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ کنیز نے ایک لمحے کو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اس نے اپنے جسم پر پڑتے ہوئے گھونسوں سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ چھوٹے سوتے سے اٹھ کر کنیز کے ساتھ لپٹ گیا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔

"بس کر رے دینو، چھوٹے کو کیوں رلاتا ہے، ابھی تو میں جندہ ہوں، میں اس کے کہنے سے نہ مروں گی" سکینہ کی آواز میں بلا کا سکون تھا۔

دین محمد نے کنیز کو چھوڑ دیا اور اپنے بستر پر آکر لحاف میں منہ چھپا لیا۔

"بس رے جھلّی تھک گیا؟" کنیز نے زخمی نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے کو سینے سے لگا کر بیٹھ گئی۔

دوسرے دن جب کنیز دین محمد کا کھانا لے کر گئی تو دین محمد نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں، بس سر جھکائے روٹی کھاتا رہا اور کنیز اس کے قریب بیٹھی تکتی رہی مگر جب دین محمد نے برتن اس کی طرف بڑھائے تو ایک لمحے کو نظریں مل گئیں۔ اس کے ہونٹ کانپے اور وہ جلدی سے پیٹھ موڑ کر آگے بڑھ گیا۔

"جالم مارنا ہے تو پھر چھاتی سے بھی لگا لے۔" کنیز سوچتی ہوئی تھکے تھکے قدموں سے گھر کی راہ ہولی "سرمندہ ہے نجریں نہیں ملاتا۔ ارے باؤلے میں کوئی پرائی عورت ہوں، تیری ہی تو ہوں۔ تیرا کیا کصور، تجھ پر تو سکینہ نے جادو کیا ہے۔"

کنیز کو مارنے کے بعد جانے کیوں دین محمد پھر اس سے بات نہ کر سکا۔ وہ روز روٹی لے کر جاتی، جانے کتنی بہت سی باتیں کرتی——
"دینو رے گیہوں کی کیسی موتی موتی بالیاں پڑی ہیں۔ دینو رے! چھوٹے کے کپڑے بنوا دے۔ چھوٹے کی صورت بالکل تیرے جیسی ہے رے! دینو رے! مجھ سے ناراج ہے کیا؟ مجھے چھوڑیو نہیں۔ دیکھ رے میں نے تیرے گھر کو چندن بنا دیا ہے۔ دینو رے! ایک بار تو مجھے بھی چھاتی سے لگا لے۔ دینو رے——"

دین محمد جانے سب کچھ سنتا بھی تھا کہ نہیں۔ کھانے کے بعد برتن اس کی طرف بڑھا دیتا اور فوراً ہی کھیت کے اندر چل دیتا۔
فصل کٹتے کٹتے سکینہ بڑی کمزور ہو گئی۔ دین محمد نے ساری فصل بیچ دی تھی اور کل صبح سکینہ کو شہر لے جا رہا تھا۔ اسٹیشن تک جانے کے لیے بیل گاڑی کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ کنیز خوش تھی کہ اب سکینہ جا رہی ہے، وہیں اسپتال میں مر جائے گی، کنیز کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے گاؤں سے کئی آدمی آگرہ اسپتال گئے تھے جب وہ لے جائے گئے تھے تو ان کی سخت بری حالت تھی۔ اسپتال جا کر وہ زندہ واپس نہ آتے تھے۔ کنیز کو یقین تھا کہ سکینہ بھی واپس نہ آئے گی اور پھر وہ اس خیال سے بھی کتنی خوش تھی کہ دین محمد نے اسے مارنے کے باوجود بیل یا بھینس نہ بیچی تھی۔ ساری فصل بیچ دی تو کیا ہوا۔ وہ خرید کر کھا لے گی۔ گھی بیچ کر روپے کھرے کر لے گی۔

صبح منہ اندھیرے جب سکینہ جا رہی تھی تو بہت دنوں کے بعد اس نے کنیز سے بات کی — "بچوں کو تیرے سہارے چھوڑ رہی ہوں کنیز، ان سے جدائی نہ کیجو۔ جندگی کا کیا بھروسہ" اور پھر بچوں کو لپٹا کر رونے لگی۔

"کنیز مر جائے گی پر انھیں تکلیف نہ ہونے دے گی۔" کنیز نے جواب دیا اور روتے ہوئے بچوں کو لپٹا کر کوٹھڑی میں چلی گئی۔

دین محمد سکینہ کو بیل گاڑی میں بٹھا کر سامان اٹھانے آیا تو کنیز کو یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"تو تو نہ کہیو رے کہ انھیں اچھی طرح رکھنا، یہ تو میرے اپنے ہیں، تو جا۔"

آٹھ دس دن گزر گئے، نہ دین محمد آیا نہ کوئی خبر آئی۔ کنیز پل پل انتظار میں گزارتی۔ خواب میں کتنی ہی بار اس نے سکینہ کو مرتے دیکھا تھا، اس نے آخری ہچکی کی آواز تک سنی تھی۔ اس نے اطمینان کی ٹھنڈی لمبی سانسیں بھری تھیں مگر جب خواب سے چونکتی تو پھر عجیب سا عالم ہو جاتا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ بچوں کو جیسے تیسے روٹی کھلا دیتی مگر خود کھانا بھول جاتی۔ ہاں دوپہر میں جانے اسے کیا ہوتا انگوچھے میں دو روٹیاں باندھ لیتی، لٹیا میں چھاچھ بھرتی اور پھر ذرا دیر بعد انگوچھا کھول کر رونے لگتی۔ "ارے دین محمد! تو اس کے پیچھے پھرتا تھا" جانے وہ کس سے فریاد کرتی۔

ان دنوں اسے اماں بھی یاد آنے لگی تھی — "جانے کیسی ہوگی، سردیاں کیسے کاٹی ہوں گی۔ اس کے گھٹنوں پر سوجن چڑھی ہوگی تو کس نے سینکا ہوگا۔ ایک بار تو آ کر مل جاتی ری۔ شاید ڈرتی ہوگی کہ کنیز ساتھ ہی نہ لگ آئے۔"

اماں کی یاد سے وہ بہت جلدی پیچھا چھڑا لیتی۔ اسے اپنے گاؤں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جانے کیوں گاؤں کا خیال بھوت کا سایہ بن جاتا۔

دسویں دن صبح صبح دین محمد آ گیا۔ کنیز اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ گھٹ کر آدھا رہ گیا تھا۔ رنگ ایسا پیلا کہ لگتا برسوں کا بیمار ہے۔ اس نے آتے ہی بچوں کو لپٹا لیا۔ کنیز دور کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

"سکینہ کی حالت بڑی کھراب ہے ری۔ اس کا آپریشن ہوا ہے۔" دین محمد نے کنیز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے ہوئے تھے۔

کنیز کچھ نہ بولی، دین محمد کے پیروں کے پاس بیٹھ کر راستے کی دھول پونچھنے لگی — "یہ حال بنا لیا رے، سکینہ اب نہ اچھی ہوگی، تو کیوں پاگل ہوا جاتا ہے۔" کنیز بڑے اطمینان سے سوچ رہی تھی۔ آپریشن کی خبر نے اسے پکی طرح یقین دلا دیا تھا کہ اب سکینہ اٹھ کر نہ آئے گی۔

"تو مجھے جلدی سے روٹی دے دے، کام سے جانا ہے ری۔" دین محمد نے اپنے پاؤں کھینچ لیے "کل سے کچھ نہیں کھایا۔" کنیز نے جلدی سے روٹی، پیاز کی گٹھی اور تھوڑا سا مکھن اس کے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ اتنے دن بعد دین محمد کو دیکھ کر اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس سے ایک بات بھی نہ کی جا رہی تھی۔

جلدی جلدی روٹی کھا کر دین محمد اٹھ کھڑا ہوا اور بھینس کے کھونٹے سے زنجیر کھول کر اسے باہر ہانکنے لگا۔ کنیز بھاگ کر سامنے آ گئی۔ "ابھی سے کہاں چلا رے، ابھی تو پیروں کی دھول بھی نہیں جھڑی۔"

"بھینس کا سودا کر آیا ہوں، اسے بیچنا ہے ری، بہت سی دوائیں کھریدنا ہیں، آرام کا بکھت نہیں۔"

"بچے بن دودھ کے کیا کریں گے رے؟ یہ تیرے آنگن کی سان ہے! میں اسے نہ بیچنے دوں گی۔" کنیز نے زنجیر پکڑ لی۔

دین محمد ایک لمحے کو جیسے بے بس سا ہو کر کنیز کو تکنے لگا اور پھر اسے اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ دیوار سے جا لگی۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دین محمد نے مڑ کر کنیز کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ "میرا انتظار نہ کیجیو میں کاسٹیشن چلا جاؤں گا۔"

"بھینس نہ بیچ رے تو! تجھے میری قسم نہ بیچیو۔" کنیز دروازے تک دوڑی اور پھر جیسے تھک کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "اری سکینہ تو مرنے سے پہلے میرا گھر لٹا کر جائے گی۔ تجھے کبر میں بھی چین نہ پڑے! تیرے کیڑے پڑیں۔"

دین محمد بھینس کو ہنکاتا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے دھول کا بادل امنڈ رہا تھا۔ کنیز بڑی حسرت سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب دین محمد نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دروازے کا سہارا لے کر اس طرح اٹھی جیسے اچانک بوڑھی ہو گئی ہو۔ اس کی سا طاقت جواب دے گئی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی ـــــ "بیچ دے رے، کنیز پھر سے بھینس کھرید لے گی، تیرے آنگن کی سان نہ جانے دے گی۔"

بھینس جانے سے آنگن کیسا سونا سونا سا لگتا۔ کنیز نے باہر چھپر کے نیچے بندھے ہوئے بیل کھول کر آنگن میں باندھ لیے۔ پھر بھی بھینس والی بات نہ بنی۔

دین محمد کو گئے چھ دن ہو گئے۔ ان دنوں میں کنیز نے ایک بار آنگن اور برآمدہ لیپ لیا تھا۔ بیلوں کے لیے کھیت سے بھوسا اٹھا اٹھا کر گھر لاتی تھی۔ گھر کی دیواریں جھاڑی تھیں، جالے چھڑائے تھے، پھر بھی کام کر کر کے اس کا جی نہ بھرتا۔ رات ہوتے ہوتے وہ اس قدر تھک جاتی کہ کسی کروٹ چین نہ پڑتا۔ نیند نہ آنے سے ساری فکریں دھاوا بول دیتیں۔ دین محمد کی یاد بری طرح ستاتی۔ اسے بار بار خیال آتا کہ سکینہ کی موت پر اس کا کیا حال ہوگا۔ ایسے وقت میں اس کا پاس ہونا کتنا ضروری تھا۔ وہ اسے تسلی تو دے لیتی، اس کے آنسو تو پونچھ دیتی۔ اب وہ اکیلا کیا کرے گا۔

دس دن گزرے تو کنیز کا سارے کاموں سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ وہ بولائی بولائی پھرتی۔ بچے سارا دن باہر گلی ڈنڈا کھیلتے اور تنہا کنیز کو ڈھیروں خدشات ڈسنے آ جاتے ـــــ اگر سکینہ اچھی ہو گئی تو؟ آپریشن کے بعد وہ اتنے دن تک نہیں آیا۔ وہ اتنے دن کیسے زندہ رہی۔ کیا اس کی اتنی پتھر زندگی ہے؟ کیا وہ نہیں مرے گی؟

انجام کے انتظار میں کنیز کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں۔ چھوٹے اگر کسی وقت کھیلتے کھیلتے آ کر دروازہ بند کر دیتا تو کنیز دوڑ کر کھول دیتی ـــــ "نہ میرے لال درواجہ نہ بند کر تیرا ابا آئے گا۔"

گیارھویں دن دوپہر کو دین محمد آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا جیسے بچوں کو تلاش کر رہا ہو اور پھر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کنیز جلدی سے اس کی طرف لپکی ـــ "سکینہ کیسی ہے رے؟ تجھے کیا ہو گیا؟ تُو تو پہچانا بھی نہیں جاتا۔"

کنیز جواب کے لیے اس کا منہ تک رہی تھی اور وہ کھاٹ سے پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ گال پچک گئے تھے اور ہونٹوں پر سیاہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

"بول رے سکینہ کیسی ہے؟" کنیز بہت بیتاب ہو رہی تھی۔

"ہائے بیچا نگی، ساتھ چھوڑ گئی جالم!" دین محمد جیسے خواب میں بولا۔

"ہائے ری سکینہ ——" کنیز نے اپنا سینہ کوٹ لیا، بال نوچ ڈالے مگر اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اتنے زور زور سے سینہ پیٹتے ہوئے اسے ذرا بھی تکلیف کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

وہ سینہ پیٹتے ہوئے دین محمد کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی مگر نہ تو دین محمد رویا نہ اس نے کنیز کو سمجھایا۔ اس کا چہرہ کس قدر سپاٹ ہو رہا تھا۔ شاید وہ بہت رو لیا تھا۔ شاید اسے صبر آگیا تھا۔

کنیز اس کے یوں خاموش بیٹھنے پر کس قدر حیرت محسوس کر رہی تھی —— "ساری باتیں جندگی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ مرے کو دو چار دن سے جیادہ کون روتا ہے ری! سب بھول جاتے ہیں۔" — اس نے بڑے فخر سے سوچا اور دین محمد کے پیروں کی دھول اپنے آنچل سے جھاڑنے لگی۔ —— "جندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، پل کے پل کیا سے کیا ہو جاتا ہے، اب تو گم نہ کرو۔" کنیز نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔

"سکینہ کی کھاطر میں نے جانے کیا کیا سہا۔ ایک رات گاؤں والوں نے گھیر کر لاٹھیوں سے مارا بھی تھا۔ جکھم اب تک دکھتے ہیں۔" دین محمد نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "اس کے کھیرے بھائی نے کتنا جور مارا، کتنے جتن کیے پر سکینہ میرے پاس آ کے رہی۔ اس کا کھاوند جہر کھا کر مر گیا پر سکینہ اس کی موت پہ بھی نہ گئی۔ کہتی تھی میں تو ایک پل کو بھی تیرا ساتھ نہ چھوڑوں۔ جا، جالم! آکھر کو سدا کے لیے ساتھ چھوڑ گئی ناں۔" دین محمد نے احمقوں کی طرح ہر طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

پھر وہ ایک دم چونک پڑا اور کنیز سے بولا۔ "اے کنیج! ایک جروری بات تو میں بھول ہی گیا۔"

اسی ضروری بات کے لیے تو کنیز نے چھ مہینے دین محمد کی پوجا میں گزار دیے تھے۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "ہائے جلدی سے بول دے نا جروری بات۔"

دین محمد نے کرتے کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر کنیز کی طرف بڑھا دیا۔ "تیرا کام کھتم ہو گیا کنیج! چھ مہینے پورے ہو گئے۔ یہ لے، میں نے کاگج لکھوا لیا ہے۔ اب جا۔"

"دینو رے! ——" کنیز آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے جیسے کچھ کہنا ہی نہیں تھا۔

پلٹ کر ایک پل کے لیے اس نے چھوٹے کو ڈھونڈا پھر اٹھی، کاغذ کو پاجامے کے نیفے میں اڑسا اور بولی۔ "ہاں رے، اب چلوں، نہیں تو سانجھ پڑ جائے گی۔"

گاڈ بلس یوُ

مہندر ناتھ

جے سنگھ جب وکٹوریہ ٹرمنس سے باہر نکلا تو اُس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ہلکا سا بستر۔ دُور سمندر میں سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل آوارہ گھوم رہے تھے۔ اُسے بمبئی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ آج پہلی بار اس بڑے پھیلے ہوئے شہر میں وارد ہوا تھا۔ اس شہر کے متعلق اُس نے بے شمار افسانے سُنے تھے اُنھیں کو ذہن میں محفوظ رکھ کر اُس نے ادھر کا رُخ کیا۔ کاریں اور بسیں بے تحاشہ بھاگ رہی تھیں۔ لوگوں کا جمِ غفیر چاروں طرف رواں دواں تھا۔

جے سنگھ کو صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی۔ وہ کچھ دن بمبئی میں ٹھہرے گا اور پھر جالندھر شہر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ وہاں اُس کی ماں اور اُس کی بہن انتظار کر رہے تھے۔ جن کپڑوں میں وہ ملبوس تھا اُس سے صاف عیاں تھا کہ وہ ایک معمولی سا سپاہی تھا جو کانگو کے محاذ پر امن قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یوں دیکھنے میں جے سنگھ کافی وجیہہ اور خوش شکل تھا۔ لمبا قد، ذرا چھریرا بدن، گندمی رنگ، سینہ چوڑا چکلا، کسرتی بدن، لمبی لمبی باچھیں، عمر بائیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ چکنے چکنے گالوں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ شاید آج اس نے شیو نہیں کی تھی۔ براؤن قمیص اور براؤن نکر اور موٹے موٹے بھاری بوٹ پہنے ہوئے، وہ ایک باوقار سپاہی لگتا۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے؟ کس ہوٹل میں ٹھہرے؟ ایک دو دنوں کے لیے وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ تاکہ صبح ہوتے ہی وہ اس خوبصورت شہر کو دیکھ سکے۔ بمبئی کی اونچی اونچی شاندار عمارتیں جو عام طور پر سات آٹھ منزلہ ہوتی ہیں — کافی گرانڈیل اور پُرشکوہ نظر آتی ہیں۔ اس شہر میں اجنبی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے بھاری بوٹوں کی تھاپ اکثر راہگیروں کو چوکنا کر دیتی۔ ایک دو لڑکوں نے اس کے سامان کو اُٹھانے کے لیے پیش کیا۔ مگر جے سنگھ کا پُروقار چہرہ جب انھیں گھوم کر دیکھتا تو وہ فوراً اپنی راہ لیتے۔ اس لمبے تڑنگے سپاہی کا ایک تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا۔

فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر وہ سوچنے لگا کہ وہ کس ہوٹل کی طرف رُخ کرے؟ اچانک ایک ٹیکسی اس کے سامنے رُکی، اور— ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھا۔ لانبی لانبی مخروطی انگلیاں، جن کے ناخنوں پر پالش تھا۔ اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔ جے سنگھ ایک لمحے کے لیے ڈرا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر ٹیکسی میں دیکھا۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ پہلے وہ اس مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھا، اُس نے سوچا شاید اس لڑکی نے غلطی سے اشارہ کر دیا۔ وہ پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ لڑکی نے پھر مُسکرا اس کی طرف دیکھا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا اور کہا "کم اِن"۔

جے سنگھ ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ دوسرے لمحے خون نے جوش مارا۔ اور وہ ٹیکسی کے اندر تھا۔ جب سیٹ پر بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں دو لڑکیاں تھیں۔ ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بالکل بدحواس سا ہو گیا۔ وہ اب کیا کرے؟ یہ لڑکیاں اسے کہاں لے جائیں گی!

"تم کہاں سے آیا؟" ایک لڑکی نے اُسے کہنی مار کر کہا۔

"میدانِ جنگ سے۔"

"لڑنے جا رہے ہو یا لڑ کر آ رہے ہو؟" دوسری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کالج سے آ رہا ہوں اور گھر جا رہا ہوں۔" جے سنگھ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"جالندھر میں۔"

"اِدھر کیوں اُترا؟"

"بمبئی دیکھنے۔"

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ایک بولی "میرا نام مَیری ہے۔" دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلی لڑکی نے کہا "اور یہ میری چھوٹی بہن ایلس ہے۔" جے سنگھ کی گردن گھڑی کے پنڈولم کی طرح دونوں طرف گھومنے لگی۔ وہ دونوں لڑکیوں کے بیچ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔

"تمہارا نام؟" مَیری نے زبان کو دانتوں کے بیچ میں سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

"جے سنگھ۔"

"تم سکھ ہو؟"

"نہیں تو۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اتنی شیریں، اتنی شہد آگیں ہنسی اُس نے آج تک نہ سُنی تھی۔ اُس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا تھا۔ کس بازار سے گزر رہا تھا۔ عالیشان عمارتیں کدھر تھیں۔ ٹیکسی دوڑی جا رہی تھی۔ اُس کا سوٹ کیس اور بستر کہاں تھا؟ وہ ایک لمحے کے لیے چونکا۔ دیکھا کہ سوٹ کیس اُس کے پاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ اور سامنے کی سیٹ پر اس کا بستر رکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی میں اتنی کم روشنی تھی کہ دونوں لڑکیوں کے چہرے دھُندلے دھُندلے سے دکھائی دیتے تھے۔ لڑکیوں کی قربت نے اس کے سانس کی رفتار کو تیز کر دیا۔ خون کی گردش تیز تر ہوتی گئی۔ اگر اُس کے جسم کا درجۂ حرارت لیا جاتا تو یقیناً ۱۰۴ ڈگری نکلتا۔

ایک غیر آباد جگہ پہ ٹیکسی رُکی۔ پہلے مَیری اُتری۔ پھر ایلس، اُس کے بعد جے سنگھ اُترا۔ اُس نے اپنا سوٹ کیس اور بستر اُتارا۔ ایک لڑکی نے اُس کا سوٹ کیس لے لیا اور دوسری نے بستر اٹھانا چاہا مگر اُس نے خود ہی بستر اُٹھا لیا۔ وہ چلنے لگا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے آواز دے کر کہا "سیٹھ ٹیکسی کا کرایہ؟"

اُس نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ مَیری نے کہا "مَین دیکھتا کیا ہے؟ کرایہ کیوں نہیں دیتا؟"

جے سنگھ نے سامان اٹھا لئے اور لڑکیوں کے ساتھ ہو لیا۔

ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جہاں دونوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ برآمدے میں داخل ہوتے ہی میری چلّائی "ممی ممی۔ دیکھو نا — تمہارے لیے ایک خوبصورت GUEST لائی ہوں۔"

ایک موٹی بھدی عورت باہر نکلی۔ اُس نے گھوم کر جے سنگھ کو دیکھا۔ ایلس نے ممی کو آنکھ ماری جسے ممی نے دیکھ لیا مگر جے سنگھ نہ دیکھ سکا۔

تینوں اندر چلے گئے۔ مکان زیادہ کشادہ نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے سے دو کمرے ایک رسوئی ایک برآمدہ ایک چھوٹا سا غسل خانہ۔ جس کمرے میں اُسے بٹھایا گیا وہ ڈرائنگ روم تھا۔ صوفہ قیمتی نہ تھا مگر صاف اور ستھرا تھا۔ ایک تپائی جس پر ایک نیلے رنگ کا گلدان تھا جس میں گلاب کے پھول خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک پُرانا گراموفون رکھا تھا۔ دیواروں پر مغربی اور مشرقی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سُرخ رنگ کے پردے لگے ہوئے تھے۔ گراموفون کے قریب ہی ایک سنگھار میز بچھی ہوئی تھی۔ اور گھر سے بے سروسامانی کے آثار نمایاں نہ تھے۔ گھر کی حالت دیکھ کر جے سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ لڑکیاں اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ وہ اُسے اپنے گھر کیوں لائیں؟ کیا یہ لڑکیاں اس کا بستر اور ٹرنک چھین کر اُسے قلاش بنا دیں گی؟ اس کی جیب میں صرف چار سو روپے تھے۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے لیے کچھ کپڑے خریدنا چاہتا تھا۔ ماں کے لیے ایک سوتی ساری۔ اور بہن کے لیے ایک آرٹیفیشل سلک کی ساڑی۔ گلے کے لیے ایک نقلی موتیوں کا ہار۔ اور کانوں کے لیے لمبے لمبے بُندے اور جھلملاتے ہوئے ستاروں میں کڑھی ہوئی چُنری۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ میری اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اور اُس نے چائے کی پیالی پیش کی۔ کمرے میں روشنی کافی تیز تھی۔ اور روشنی میں اُس نے میری کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اُس کے اتنا قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا گرم گرم سانس اُس کے رخساروں کو چھو رہا تھا۔ میری تو واقعی حسین تھی۔ بڑا ہی خوبصورت بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ بلاؤز آسمانی رنگ کا تھا۔ اور اسکرٹ کی رنگت گلاب کے پھولوں کی طرح سُرخ تھی۔ اور اُس کے نیلے نیلے بلاؤز میں اس کے گول اور سڈول بازو ثمربار ڈالیوں کی طرح جھکے ہوئے تھے۔ کتنی شفاف سی جلد تھی۔ دودھ میں نہائی ہوئی پنڈلیاں۔ جے سنگھ کی نگاہیں کبھی میری کے جسم سے ٹکراتیں اور کبھی اس کے حسین چہرے پر آ کر اٹک جاتیں۔ ایسی گوری گوری لڑکیاں اس نے جالندھر میں کبھی نہیں دیکھیں۔ اتنی بے باک اور بے دھڑک بات کرنے والی لڑکیاں اسے کب اور کہاں ملیں گی۔ مگر یہ لڑکیاں اُس سے کیا لیں گی؟ وہ کس مصرف کے لیے اُسے یہاں لائی تھیں؟ وہ یوں کسی لڑکی کے ساتھ نہ بیٹھا تھا۔ اتنی بے تکلفی کسی لڑکی نے اس کے ساتھ نہ برتی تھی۔

"ہین تم کیا کھائے گا؟"

"کھانا کھاؤں گا۔"

"ڈِنر کھائے گا؟"

"یس میری"

"تم انگلش جانتا؟"

"میں میٹرک پاس ہوں میری۔" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ایلس - ڈارلنگ ایلس - سنگھ کین سپیک انگلش۔"

اتنے میں ایلس آگئی۔ وہ واقعی میری سے چھوٹی تھی۔ میری سے زیادہ حسین نہ تھی۔ میری سے کچھ زیادہ ہی دُبلی تھی۔ میری کے مقابلے میں کم باتیں کرتی۔ جو کچھ میری کہتی اُسی پر عمل کرتی۔ میری کے آنکھ کے اشارے کو سمجھتی تھی۔

رات کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اپنے اِرد گرد دو جوان لڑکیوں کو دیکھ کر اُس کے دماغ میں عجیب غریب خیالات اُبھرے۔ یہ بیس بائیس برس بڑے سپاٹ اور بے رنگ گزرے تھے۔ وہ نہایت ہی شریف اور دیانتدار قسم کا نوجوان تھا۔ جے سنگھ کو اپنی ماں اور بہن سے بے حد پیار تھا۔ وہ انھیں دو زندگیوں کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی جیب میں صرف چار سو روپے تھے۔ اور وہ ان چار سو روپوں کو سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے خیال ضرور آیا کہ وہ کسی ایسے چکر میں نہ پھنس جائے کہ لڑکیاں اُس کے روپوں پر ہاتھ صاف کر دیں۔ اُس نے سوچا اس وقت یہاں سے جانا درست نہیں۔ جب صبح ہو گی تو وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو سنگھ؟" میری نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ تم مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟"

"سچ کہہ دوں سنگھ؟"

"ہاں میری۔"

"تم فٹ پاتھ پر اکیلے کھڑے تھے؟"

"ہاں"

"اُس وقت تم بہت اچھے لگے۔"

"کیوں؟"

"تمہارے ایسے لڑکے اس شہر میں بہت کم آتے ہیں۔" اُس نے اس کے گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔

سنگھ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔

"تم ڈرو نہیں۔ صبح ہوتے ہی تم جہاں جانا چاہو گے ہم تمھیں پہنچا دیں گے۔ تمھیں بھوک لگی ہے؟"

"ہاں۔"

"کچھ پیو گے؟"

"کھانے کے ساتھ پانی"

"کھانے سے پہلے کچھ پیو گے؟"

"کیا؟"

"وسکی۔ شراب۔ دیسی؟"

"نہیں نہیں میری، میں نے آج تک شراب نہیں پی۔ میں شراب نہیں پیوں گا۔ میری ماں نے شراب پینے سے منع کیا تھا۔"

”ہماری ممی ہمیں شراب پلاتی ہے اور وہ خود بھی پیتی ہے۔ تمہاری ممی ایکدم خراب ہے۔ ایلیس تین گلاس۔“

ایلیس دوڑتی ہوئی اندر گئی۔ فوراً ایک بوتل دیسی شراب اور تین گلاس لے آئی۔ پہلے گلاس میں شراب ڈالی، پھر سوڈا۔ میری نے ایک گلاس سنگھ کو دیا۔ ”لو اسے اب پی لو“ میری اور ایلیس نے مسکراتے ہوئے گلاس کے ساتھ گلاس ٹکرائے۔ ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا، بجلی کی روشنی میں تینوں چہرے چمکے۔ اور میری اور ایلیس نے گلاس خالی کر دیا۔

سنگھ ابھی تک ہاتھ میں گلاس پکڑے ہوئے تھا۔ ”مین شرم کا بات نہیں۔ اگر تم شراب نہیں پیئے گا تو فل مین کیسے بنے گا۔“

میری نے سنگھ کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ پھر سنگھ کے منہ کو لگایا ”تمہیں میری قسم۔“

سنگھ نے ایک گھونٹ لیا۔ بڑا کڑوا ذائقہ تھا۔ پھر دوسری بار منہ لگاتے ہی گلاس خالی کر دیا۔ ”شاباش مین۔ اب تم لڑے گا۔ اب تم کانگو میں PEACE قائم کرے گا۔“

اور اسی طرح سنگھ دو تین پیگ پی گیا۔ زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی۔ اس لیے شراب زیادہ چڑھی۔ رخسار تمتما اٹھے۔ سارے بدن میں خون لہریں مارنے لگا۔ ڈر اور خوف کا جذبہ غائب ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اداسی اور غم کی جگہ خوشیوں نے لے لی۔

میری اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ شراب کے نشے میں میری کی آنکھیں اور سرخ ہو گئیں۔ ماتھے پر زلف لہرا گئی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میری اس کے قریب سرک رہی تھی۔ ایلیس نے اٹھ کر ریکارڈ لگا دیا۔ راک اور رول کا ریکارڈ۔ لپکتی مچلتی، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آرکسٹرا کی ایک دھن، جو دماغ سے زیادہ جسم پر اثر انداز ہوتی۔ جو انسان کو اچھلنے کودنے پر مجبور کرتی۔ دونوں لڑکیاں اپنی جگہ سے اٹھیں اور راک رول کی دھن پر ناچنے لگیں۔ ان دونوں لڑکیوں کے جسم اس دھن پر تھرکنے لگے۔ سنگھ کو شراب چڑھ گئی۔ وہ فطرتاً ہنگامی زندگی کا دلدادہ نہ تھا۔ اس لیے آگ کی تپش کو سینے میں دبائے وہ صوفے پر بیٹھا رہا۔ اس ناچ، موسیقی اور لے کی محفل کو دیکھتا رہا۔ جب ریکارڈ ایک بار ختم ہو جاتا تو لڑکیاں دوبارہ ریکارڈ لگا دیتیں۔ اور اپنے جسم کو ٹوسٹ دیتے ہوئے، تیزی سے بل کھاتی ہوئیں، اس دھن پر تھرکتیں۔ اس تیز و تند رقص میں دو جوان جسم اس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔ ایک خاص انداز میں ایک خاص پوز میں۔ ایک خاص ڈھنگ میں۔ یہ دونوں جسم جذبے کی پوری شدت کے ساتھ دھن میں رچے ہوئے بل کھائے جا رہے تھے۔

اچانک میری اس کی طرف لپکی اور اسے کھینچ کر بیچ میں کھڑا کیا اور اسے ناچنے کے لیے کہنے لگیں۔ سنگھ بے چارہ کیا ناچتا۔ دونوں لڑکیاں اس کے ارد گرد ناچنے لگیں۔ شراب اور چڑھ گئی۔ پھر دونوں تھک کر صوفے پر بیٹھ گئیں، سنگھ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

”مین ہم تم کو کل ناچ سکھائے گا۔“

اتنے میں ممی آئی اور کہا ”کھانا تیار ہے۔“

تینوں ساتھ والے کمرے میں گئے اور ایک چھوٹی سی میز کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ کھانا کافی لذیذ تھا۔ سنگھ کی بھوک چمکی۔ اس نے بغیر کسی شرم کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے سبھی لوگ خاموش رہے۔ صرف میری مسکرا مسکرا کر اس کی طرف

دیکھتی رہی۔ ایلس شراب کے نشے میں جھوم رہی تھی۔ ممی اُس کے آگے سے پلیٹ ہٹا کر کہنے لگی ”ایلس اب جا کر سو جاؤ۔“

ایلس چپکے سے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

سنگھ اور میری ڈرائنگ روم میں آئے۔

”سنگھ تم صوفے پر سو سکتے ہو۔ کیا میں جاؤں؟“ وہ جانے کے لیے مُڑی۔ پھر ایک قدم آگے بڑھی۔ دروازے کے قریب جا کر دونوں پردوں کو آپس میں ملا دیا۔ پھر سنگھ کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک سنگھ! کِس می“

سنگھ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

میری صوفے پر بیٹھ گئی۔ سنگھ کو اپنے قریب بٹھایا، اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے قریب لائی اور کانپتے ہوئے لبوں کو چوم لیا۔ سنگھ کے ہاتھوں میں بلا کی سختی آ گئی تھی۔ سنگھ کے رخسار تپ اُٹھے۔ سنگھ نے میری کی کمر کے گرد ہاتھ رکھا۔ میری نے اپنا جسم پتھر کی طرح سخت کر لیا۔

”نہیں چھوڑ دو!“ میری نے سنگھ کا ہاتھ اپنی کمر سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اُچک کر اُس سے الگ ہو گئی۔ ”گڈ نائٹ مین۔“ اور پردے کو سرکا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میری کے چلے جانے کے بعد اُس کا سَر گھومنے لگا۔ آنکھوں میں غنودگی سی چھا گئی اور وہ صوفے پر سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کمرے میں دُھندلی دُھندلی سی روشنی تھی۔ سُورج سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہوا فرّاٹے بھرتی ہوئی دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اُس نے اپنے آپ کو اپنے بستر پہ پایا۔ اچانک اُس کا ہاتھ نکر کی جیب میں گیا۔ بٹوہ اپنی جگہ پر تھا۔ اُس نے فوراً بٹوہ نکالا۔ اور نوٹ گنے۔ ایک نوٹ بھی کم نہ تھا۔ اُس بٹوے میں صرف ایک تصویر تھا۔ میری کی تصویر BATHING COSTUME میں۔ اس تصویر میں جسم کا ہر خط اُبھر آیا تھا۔ اور تصویر پر لکھا تھا۔ آئی لو یو ڈارلنگ۔ اُس کی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اُسے تصویر دی تھی اور اُس پر اپنے ہاتھ سے پیار بھرا فقرہ لکھا تھا۔ جو کچھ اُس نے اُن لڑکیوں کے متعلق سوچا تھا۔ سب کچھ غلط نکلا۔ یہ دونوں لڑکیاں بے حد اچھی تھیں۔ کسی لڑکی نے اُسے دھوکا نہیں دیا۔ کون کہتا ہے کہ اس دُنیا میں اچھے لوگ نہیں۔ یہ لوگ مجھے جانتے نہیں، مجھے دیکھتے ہی اپنے گھر لے آئے۔ مجھے کھانا کھلایا، شراب پلائی، میری نے سونے سے پہلے اس کا بوسہ لیا، کتنے شیریں ہونٹ تھے میری کے۔ اور پھر دونوں لڑکیوں نے راک رول کی دُھن پر ناچیں تھیں۔ میری کی مسکراہٹیں، اُس کی دلنواز ہنسی، اُس کے جسم کی گرمی، ایلس کی شوخی اور پھر اس قسم کی مہمان نوازی اس زندگی میں کہاں ملے گی۔ وہ ان سب کا کتنا شکر گزار تھا۔ اجنبی شہر میں ان لوگوں نے اُسے پناہ دی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا۔ سامنے سے میری ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی پکڑے ہوئے داخل ہوئی اور اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ چائے کی پیالی سے ہلکی ہلکی بھاپ اُڑ رہی تھی۔ اور ریشمی زلفوں کی طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی اپنے ہاتھ میں لے لی اور دل سے ہر قسم کے شک و شبہات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ میری کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر وہ ایک عجیب سی مسرت محسوس کرنے لگا۔ یہ واقعی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ کوئی تصنع، بناوٹ نہیں، کوئی لالچ اور فریب نہیں۔ کوئی مانگ نہیں۔ اُس نے

میری کے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھا، جو اُس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے پہلی بار میری کے پاؤں کو دیکھا۔ کتنے حسین اور متناسب تھے اُس کے پاؤں۔ ایڑیاں صاف شفاف، اُجلی اُجلی، پھر اُس نے میری کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ بے حد سوئی ہوئی آنکھیں۔ پلکیں خلوص اور پیار سے رخساروں پر جھکی ہوئی اور کالے سیاہ بال۔ اس کے مضبوط اور توانا کندھوں پر بادلوں کی طرح جھکے ہوئے۔ گردن بے حد سپید سپید سی۔ جہاں بھورے بھورے سے بال لرز رہے تھے۔ ”کیا دیکھ رہے ہو میں؟“

”نہیں“

وہ اُس کے اور قریب آ گئی۔ اور اس کی دائیں ٹانگ اُس کی بائیں ٹانگ کے ساتھ تھی۔ سنگھ میری کی گرم ٹانگ کی آنچ کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایسی خوشی سے ہمکنار ہو رہا تھا جو شاید اُس نے زندگی بھر محسوس نہ کی تھی۔ نرم نرم گوشت کا ہلکا ہلکا دباؤ۔ خون کی گرمی کی ہلکی ہلکی حدت۔ گرم گوشت کا ہلکا ہلکا سا نرم احساس، اس کی ٹانگوں کے بال، میری کے نرم بالوں سے اُلجھ گئے تھے۔ ایک خفیف سی بجلی کی لہر اس کے رگ و پے میں سما گئی۔ یہ نشہ عجیب و غریب سا تھا۔ شراب کا نشہ دل کے ہر تار کو چھیڑتا ہوا اُسے ایک انجانی وادی میں پہنچا رہا تھا۔ ایک نرم اور گرم وادی میں۔ ایک خوابناک وادی میں۔ جہاں ریشم ہی ریشم تھا۔ جہاں نرمی کے گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ ایک نشیلی غنودگی سی۔ جو اُس کے دل و دماغ پہ آہستہ آہستہ حاوی ہو رہی تھی — وہ چاہتا تھا کہ میری اُس کے قریب بیٹھی رہے۔ شاید زندگی بھر اُسے ایسا موقع نہ ملے۔ شاید وہ کانگو کے محاذ پر مارا جائے۔ اس لیے وہ اس وقت مشفق اور مہربان میری سے الگ نہ ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں جتنے شک اور وسوسے تھے، اب سب ختم ہو گئے تھے۔ شک اور شبہات کی جگہ محبت نے لے لی۔ دل میں بہاروں کے شگوفے پھوٹ پڑے تھے۔

میری اپنی جگہ سے اُٹھی اور کہنے لگی۔ ”تم سنگھ جلدی نہا کر تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم باہر چلیں گے تمہیں بمبئی دکھائیں گے۔“

وہ جلدی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ سنگھ نے ناشتہ کیا اور تینوں ٹیکسی میں بیٹھ کر بمبئی دیکھنے چلے۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھا۔ گیٹ وے اوف انڈیا کے سامنے پانی کی وسیع چادر پہلی بار دیکھی تھی۔ ایک کے بعد دوسری آ رہی تھی۔ دُور جہاز لنگر انداز تھے اور بادلوں کے قافلے آسمان پر پرواز کر رہے تھے۔ کبھی کبھار بارش زور سے آتی کہ سر جھکانے سے پہلے ہی وہ بھیگ جاتے۔ میری نے آئس کریم کھانے کی فرمائش کی۔ میری نے آئس کریم کھاتے ہوئے اس کی کریم چھین لی۔ اور اپنی آئس کریم اُسے دے دی۔ جہاں کہیں وہ کھڑا ہوتا وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو جاتی۔ جہاں وہ بیٹھتا۔ اُس کے قریب آ کر بیٹھ جاتی اور پھر مسکرا مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی۔ میری کی آنکھوں میں عجیب قسم کا نشہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا بلاوا تھا جس سے وہ آج تک ناآشنا تھا۔ گیٹ وے اوف انڈیا سے ہو کر میرین ڈرائیو کی طرف بڑھے۔ پھر چوپاٹی سے ہوتے ہوئے HANGING GARDEN میں پہنچے، وہاں تند و تیز ہوا پھولوں کو چومتی گزر رہی تھی۔ ہر پلاٹ میں رنگین پھول مہک رہے تھے اور ڈھلوان کے نیچے سمندر لہریں مار رہا تھا۔

وہ پہر کو انھوں نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ اُس کے بعد ایئر کنڈیشن سینما میں تینوں نے ایک فلم دیکھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ شاید اس کے بعد بھی یہ حادثہ کبھی نہ ہو۔ وہ چند دنوں کا مہمان تھا۔ کل یا پرسوں گھر

چلا جائے گا۔ وہ میری اور ایلس کے قریب اتنا آچکا تھا۔ کہ اُس کی ماں اور بہن ذہن کے دریچے سے بہت دُور کھڑی تھیں۔ فلم دیکھنے کے بعد وہ دونوں بہنوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ میری کے ہاتھ میں تھا۔ اور میری اس کے ہاتھ کو دبا رہی تھی۔ یہ گوشت پوست کی انگلیاں نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ یہ نرم نرم انگلیاں جو اُس کی طاقتور انگلیوں کے درمیان پیوست تھیں زندگی کا ایک وحشی راگ گا رہی تھیں۔ اور وہ ایک بے سُدھ۔ شرابی کی طرح، اور ہی لذت سے ہمکنار ہو رہا تھا۔

جب فلم ختم ہوئی تو ہال سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جہاں ٹکٹ بکتے ہیں وہیں اُنھیں کھڑا رہنا پڑا۔ بہت سے لوگ وہیں کھڑے تھے۔ باہر جانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ میری اس کے ساتھ چمٹ گئی تھی — یہ اُس کی زندگی کا عجیب سا تجربہ تھا۔ میری اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ پہلے پیچھے کھڑی تھی۔ جب کسی نے دھکا دیا تو وہ آگے آکر کھڑی ہو گئی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ میری کے بال اس کے رخساروں سے کھیل رہے تھے۔ میری کے دونوں کندھے اُس کی جوان چھاتی سے ہمکنار تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے، دونوں ہاتھوں میں پسینہ آگیا تھا۔ دونوں کے دل کی دھڑکنیں تیز تر تھیں۔ آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ اچانک بارش بند ہو گئی۔ تینوں باہر نکلے۔ شام ہو چکی تھی۔ میری اسے ایک دوکان میں لے گئی۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے لیے ایک بلاوز کی فرمائش کی۔ ایلس نے اپنے لیے چپل کی مانگ کی۔ پھر میری نے آنکھیں مٹکا کر سنگھ کی طرف دیکھا جیسے وہ کچھ اور خریدنا چاہتی ہے۔ سامنے ایک نہایت خوش رنگ قسم کا کپڑا لٹکا ہوا تھا۔

"یہ میرے جسم پر کیسا رہے گا؟"

"بہت ہی عمدہ۔"

"تو پھر ایک پیس خرید لوں؟"

"ایلس نے موتیوں کے ہار کی فرمائش کی۔ ہار بھی خرید کر دیا۔ جب دونوں چلنے لگیں۔

"ارے ممی کے لیے کچھ نہیں خریدا۔" میری چلائی۔

پھر ممی کے لیے کپڑے خریدے گئے۔ جب وہ اس دوکان سے باہر نکلے تو فوراً دونوں ایک اور دکان میں گھس گئیں۔ وہاں سے LIPTON چائے کا ایک ڈبہ خریدا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور VANISHING CREAM بھی خرید لی۔

"بس اب اور کچھ نہ خریدیں گے؟" میری چلائی اور اُس نے سنگھ کے ہاتھ کو دبایا۔ تینوں گھر کی طرف چل دیے۔

کھانا کھانے سے پہلے تینوں نے شراب پی۔ پھر راک رول کا ڈانس کیا اور اس کے بعد ڈنر۔ ممی کپڑوں کو دیکھ کر پھولے نہ سمائی۔ آج ممی کے چہرے پر رونق تھی۔ اُس کی باتوں میں کرختگی اور اکھڑپن نہ تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اُسے اُس پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ ماما نے مرنے سے پہلے ہی جنت کے دروازے کھول دیے تھے۔ سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ بھی نہ ملا۔ کھانا کھانے کے بعد فوراً سنگھ کو نیند آگئی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ میری نے سونے سے پہلے اُس کے لبوں کو چوما تھا۔

اگلے دن ناشتہ کرنے کے بعد تینوں باہر نکل گئے۔ جوہو کو دیکھا۔ وہیں ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ پھر ایک انگریزی فلم دیکھی۔ باہر نکل کر ایک ریستوران میں کیک اور کافی پی۔ پھر دونوں بہنیں ایک اسٹور میں گھس گئیں۔ وہاں سے کلپ، ٹاپس، باڈی، نیل پالش، گلے کے لیے موتیوں کا ہار اور پھر بسکٹ کے ڈبے اور اسی طرح دیگر چیزیں خریدیں۔ ان سب کے

دام سنگھ کو دینے پڑے۔ تین دنوں سے وہی خرچہ کر رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا سرمایہ ختم ہو رہا تھا۔ شام کو گھر آ کر میری نے اُس سے بیس روپے مانگے جو سنگھ نے اسے فوراً دیے۔ پھر دیسی شراب آ گئی اور تینوں نے پی۔

شراب پی کر، پھر کھانا کھا کر، جلدی جلدی سنگھ اپنے کمرے میں آ گیا۔ آج شراب زیادہ نہیں چڑھی تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا کر رہا تھا؟ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اِن تین چار دنوں میں تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے۔ صرف ایک سو کا نوٹ باقی تھا۔ اب وہ جالندھر نہیں جا سکتا۔ اُسے اپنے کئے پر افسوس سا ہونے لگا۔ مگر میری کی محبت اُس کے دل میں اُجاگر ہو گئی تھی۔ چار دن جو اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اگر ایک دن وہ اور ٹھہرا تو اس کی جیب بالکل خالی ہو جائے گی۔ مگر وہ کیا کرے؟ کوئی اُسے دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اُس سے پیسے نہیں مانگ رہا تھا۔ یہ ان کی ضروریاتِ زندگی تھیں، انھیں پورا کرنا اس کا فرض تھا۔ بیچاری لڑکیاں میری — میری تو کتنی خوبصورت ہے۔ کتنی اچھی ہے۔ یُو آر مائی ڈارلنگ، صرف میری، میری ہو۔ اتنے میں میری اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ شراب میں بدمست، وہ اتنا کیوں پیتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ میری اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ان نگاہوں میں صرف شراب کی مستی نہ تھی۔ حسن اور شباب اپنے پورے عروج پہ تھا۔ دو آتشہ رنگ و روپ کا ایک خوبصورت مجسمہ۔ میری اس وقت بے حد اچھی لگی۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ شاید بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھار بارش اور ہوا کا ملا جُلا تھپیڑا، دروازے سے ٹکراتا اور پھر ایک شور بلند ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ شور کم ہو جاتا۔

وہ میری سے کیا کہے۔ شراب پی کر میری بھی اس سے کچھ نہیں کہتی۔ شراب پی کر زیادہ سنجیدہ اور متین ہو جاتی ہے۔ میری نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ناریل کے درخت کے اوپر چاند اٹک کر رہ گیا ہو۔ آج اس نے شراب تھوڑی پی تھی۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں ممی کام کر رہی تھی۔ ایلس اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔ کیا یہ بلب فیوز (FUSE) نہیں ہو سکتا۔ اس وقت روشنی کتنی بُری لگتی ہے۔ اچانک روشنی ایک لمحے کے لیے ماند سی پڑ گئی۔ اُس نے موقع پا کر میری کی پیشانی کو چوم لیا۔

"میں جاگ رہی ہوں سنگھ۔ تم سو کیوں نہیں جاتے۔ الوداع میرے سنگھ۔"

وہ اُٹھنے لگی۔ سنگھ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر بٹھا لیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ روتی آواز میں بولا۔

"مجھے جانے دو" میری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جانے لگی، سنگھ نے اسے پھر پکڑ لیا۔

"مائی CHILD اب تم سو جاؤ۔"

سنگھ کو غصہ آیا۔ یہ کیا سمجھتی ہے؟ کیا میں بچہ ہوں۔ اُس نے میری کو زبردستی اپنی طرف گھسیٹا اور اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ میری کچھ نہ بولی۔

"سنگھ مجھے چھوڑ دو" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

وہ پھر اُسے پکڑنے کے لیے اُٹھا۔ میری نے اُسے ہلکا سا چانٹا مارا۔

"ڈونٹ بی سلی (DONT BE SILLY) چپکے سے سو جاؤ۔" اور اپنی کمر کو ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہلکا سا چانٹا لگنے کے بعد اُسے اس بات کا احساس ہوا کہ جو کچھ اس نے کیا اسے نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہونے لگا۔ ہاں، اُسے کل یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

جب صبح ہوئی تو میری اُسی طرح چائے کی پیالی لے کر وارد ہوئی۔

"جو کچھ رات کو ہوا مجھے اُس کا بے حد افسوس ہے۔ شراب چڑھی ہوئی تھی نا۔ معاف کر دو سنگھ۔ آج نیشنل پارک چلیں گے پکنک منانے۔" اس نے پھر پیار بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے گالوں پہ رگڑا، پھر زور سے اُس کے بالوں کو کھینچا اور پھر ایک ہلکا سا بوسہ اس کے ہونٹوں کا لیا۔

باورچی خانے سے ممی کی آواز آئی۔ "میری ذرا اِدھر آنا۔"

میری چلی گئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد تینوں تیار ہو گئے۔ رات جو کچھ سنگھ نے سوچا تھا اُس پر عمل نہ کر سکا۔ در اصل وہ میری سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت میں تو بہت ہی ناجائز حرکتیں جائز ہوتی ہیں۔ نیشنل پارک جانے سے پہلے میری اور ایلس اُسے درزی کے پاس لے گئیں جہاں انھوں نے بلاؤز اور اسکرٹ سلنے کے لیے دیے تھے۔ سنگھ نے درزی کا بل ادا کیا۔ درزی کی دکان پر میری اور ایلس کو دو تین سہیلیاں اور مل گئیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے اور سب لڑکیاں اٹھ کر باہر نکلیں۔

نیشنل پارک پہنچ کر جو کچھ اُس نے دیکھا شاید اُس کا اثر سنگھ پر نہ ہوتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس سارے گروپ میں پیسے خرچ کرنے کے لیے صرف وہی رہ گیا تھا۔ کھانا، پینا، چائے، بس کا کرایہ، ٹافیاں، پھل سب کچھ خریدنے کے لیے اس کی جیب خالی ہو رہی تھی۔ میری زیادہ تر اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہی۔ وہ اب سنگھ کے قریب نہ آئی۔ ایک عجیب قسم کی اُداسی اُس کے ذہن پر چھا گئی۔

واپسی پر میری اُس کے ساتھ بیٹھی اور پوچھنے لگی "تم اُداس کیوں ہو؟"

وہ اُسے کیا بتاتا کہ وہ اُداس کیوں ہے؛ وہ خاموش رہا۔

جب تینوں گھر پہنچے تو دیکھا ڈرائنگ روم میں تین مرد شراب پی رہے تھے۔ تینوں نے میری اور ایلس کو دیکھا، پھر تینوں کی نگاہیں سنگھ پر جم گئیں۔ سنگھ نے پہلی بار ان تینوں مردوں کو میری کے مکان پر دیکھا تھا۔

ایک نے ایلس کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ دوسرے نے اپنا شراب کا گلاس میری کو پیش کیا۔ میری شراب کو غٹ غٹ پی گئی اور پینے کے بعد میری مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی۔

سنگھ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں یقین نہ کر رہی تھیں۔ وہ کیا کچھ دیکھ رہا تھا؛ یہ مرد کون تھے؟ اس سے پہلے کیوں نہیں آئے؟ آج ایلس اور میری نے اپنا رویہ کیوں بدل لیا؟

ایک نے شراب کا گلاس سنگھ کو پیش کیا۔

سنگھ نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔

"غصے کو تھوک دو مین۔"

جس کے ساتھ میری بیٹھی ہوئی تھی، وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اور وہ ایک سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اپنا شراب کا گلاس میری کو پیش کر رہا تھا۔ "اور پیو اور پیو میری۔" اُس نے میری کے شانے کو چومتے ہوئے کہا۔

اچانک سنگھ کا ہاتھ اُٹھا، اور اس نے آگے بڑھ کر اُس ادھیڑ عمر کے منہ پر ایک زور کا چانٹا رسید کیا۔ طمانچہ لگتے ہی تینوں سنگھ پر حملہ آور ہوئے۔ اور سنگھ کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ سنگھ اکیلا تھا وہ تین تھے۔ اس نے کافی مزاحمت کی مگر وہ تینوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چانٹے، مُکے، لاتیں اُس پر برس رہی تھیں۔ نچلے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ اور اُس کا سر گھومنے لگا۔ وہ تینوں مل کر اُسے ہلاک کر دیں گے۔ وہ زندگی کی آخری سرحد پر کھڑا تھا۔ کوئی اُسے بچانے والا نہ تھا۔ زندگی میں اتنی بے رحمی کہاں سے آگئی۔ میری کا بوڑھا عاشق سنگھ کے سر پر بوتل مارنے ہی والا تھا۔ میری نے سب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اچانک سنگھ کا سر چکرایا۔ اور وہ زمین پر گرا۔ جب اُسے ہوش آیا۔ اُس نے میری کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ سنگھ کے سامنے اُس کا سوٹ کیس اور بستر رکھا ہوا تھا۔ اس نے چپکے سے سوٹ کیس اور بستر اٹھایا اور سامان کو ٹیکسی میں رکھا۔ جب ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اُس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا میری سامنے کھڑی تھی۔

"یہ لو پانچ روپے۔ سیدھے وکٹوریہ ٹرمنس چلے جاؤ۔ گاڈ بلس یو" اُس نے میری کی طرف دیکھا۔ میری کی آنکھوں میں کسی قسم کی کوئی نرمی نہ تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کی محبت کا کوئی لمحہ باقی نہ تھا۔ وہ ایک پتھر کے بُت کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے لب بھنچے ہوئے تھے آنکھوں اور چہرے سے دہشت اور کرختگی نمایاں تھی۔ شاید یہ میری نہ تھی کوئی اور لڑکی تھی۔ جب ٹیکسی چلنے لگی۔ تو سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گہری رات کے سناٹے میں اُسے صرف دو چہرے نظر آئے۔ ایک تھا اس کی ماں کا دوسرا اس کی بہن کا۔ جو ابھی تک اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔

بے مصرف ہاتھ

جیلانی بانو

اللہ جانے میں رقو پھوپو کی کہانی کب لکھ سکوں گی۔

بعض وقت جب میں کسی جذباتی لڑکی کی سنسنی خیز کہانی سُنتی ہوں، جب کوئی افسانہ نگار کسی معمولی سے واقعہ کو بڑے خوبصورت انداز میں لکھتا ہے تو مجھے اپنی بے بسی پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ پھر خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی بھی آتی ہے۔ مجھ جیسے پاگلوں سے کون کہانیاں سنے گا۔ پھر کہانی تو ہمیشہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کے بارے میں لکھی جاتی ہے۔ بدصورت لڑکیوں کی تو کوئی کہانی نہیں ہوتی۔ کم سے کم ایسی لڑکی کی کہانی تو میں نے آج تک نہیں سُنی جس کے چہرے کی کھال اور گوشت غائب ہو۔ آنکھوں کی جگہ سُرخ گڑھے ہوں اور ہتھیلی سے لے کر ناک تک کی ہڈیاں دکھائی دیں۔ —— اوہ —— میں خود بھی اب رقو پھوپو کو یاد کر کے لرز جاتی ہوں۔ یہی خوفناک صورتیں تو بچوں کو ڈرا کے پاگل بنا دیتی ہیں۔ سُنا ہے یہ چڑیلیں اپنے سحر سے انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ آدمی زندگی بھر مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح تڑپتا رہتا ہے مگر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

اگر میں بھی یہ کہانی لکھوں تو اپنے آپ کو ایسی بکی لکھتے ہوئے کتنی شرم آئے گی۔ جاسوسی ناولوں کی ہیروئن بن کر مجھے کہنا پڑے گا کہ میں ایک سحرزدہ مکان میں رہتی تھی جس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ پھر وہاں مجھے ایک چڑیل نے دیکھا اور سو جان سے عاشق ہو گئی۔ سُنا ہے یہ چڑیلیں اپنے چاہنے والے کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں۔ وہ اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔

مینٹل ہاسپٹل کے اس بستر پر بیٹھے بیٹھے میں سوچ رہی ہوں کہ انھوں نے مجھے پاگل کیوں مشہور کر دیا —— مجھے کون سی آگ جلا گئی —— میں کیوں راکھ بن گئی —— ! آخر میں اپنے بچے کو کیوں مارنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنا مُنّا بے مصرف کیوں نظر آتا ہے!

ٹھہریئے۔ میں ذرا اپنے آنسو پونچھ لوں۔

رقو پھوپو کی کہانی لکھنے بیٹھی تو مجھے اپنی سُدھ بُدھ کہاں رہے گی۔ اگر ان سطروں پر کہیں ان کی نظر پڑ گئی تو —— اوہ نہیں چاہئے کہ اب میں رقو پھوپو کا نام بھی اپنی زبان پر لاؤں اور آج میں اس سارے کاغذ پر صرف رقو پھوپو کا نام ہی لکھے جاؤں گی۔

نہ جانے کہانیاں کیسے شروع کی جاتی ہیں۔ اب اس جھگڑے میں کون پڑے۔ کوئی نہ کوئی بات ہو گئی ہو گی۔ مجھے تو وہاں سے یاد ہے جب شادی کے بعد میں ان کے ساتھ پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔ انھوں نے میرے لیے حیثیت سے بڑھ کر بڑا خوبصورت سا مکان لیا تھا۔ اچھے سے اچھا فرنیچر خریدا اور ایک چھوڑ دو دو نوکر بھی رکھے تھے۔ ہم دونوں جیسی محبت میں سنے

آج کل کے تو کسی میاں بیوی میں نہیں دیکھی۔ ہمارے درمیان تو کوئی مول تول نہ ہوا۔ انھوں نے تو مجھے اپنی پلکوں پر بٹھا لیا تھا لوگ محض الفاظ سے شاعری کرتے ہوں گے لیکن وہ تو سچ مچ میرے دل کی دھڑکن بنے بلکہ ہیں (آج جب وہ ڈاکٹر سے کہتے ہیں کہ میں نے ان کی اور منّے کی جان لینے کی کوشش کی تھی) وہ اب بھی میری روح ہیں۔ میری زندگی ہیں۔ وہ دیکھتے تو، کہ انھیں مارنے کے بعد کیا میں زندہ رہ سکتی تھی ——؟ وہ چاہے لوگوں سے کچھ کہتے پھریں لیکن رتّو پھوپو میری زندگی نہیں تھیں۔ میری کچھ بھی نہیں تھیں۔ اگر وہ میری کچھ ہوتیں تو میں ان کے ساتھ کیوں نہ مرجاتی! یوں سلگ سلگ کر راکھ کیوں بنتی! تو خیر' آج کی بات چھوڑیئے میں تو آپ کو اس دن کا قصہ سنا رہی تھی جب ہم "خود مختار منزل" کے اوپر والے پورشن میں آئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ میں جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئی۔ نیچے مالک مکان کے گھر میں بچوں اور نوکروں کی چیخ پکار ہو رہی تھی اور سڑک پر انسانوں کا ہجوم بہہ رہا' پھر میری نگاہ اوپر اٹھ گئی جہاں دو دو چاند مسکرا رہے تھے۔ ایک تو گیارہ تاریخ کا سہک رو چاند ہمیں دیکھ دیکھ کر کھل اٹھا تھا اس کے قریب وہ کھڑے تھے۔ میں ان کی باہوں میں چھپ کر شرما گئی۔

"میرا چاند کہاں چھپ گیا ——!" انھوں نے جھک کر پوچھا۔

"اللہ کوئی مجھے بھی تو چاندنی میں لے جائے —" نیچے کسی عورت نے بڑی مترنم آواز میں کہا۔ میں چونک پڑی۔

"نیچے مکان کے مالک رہتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ تمھارا دل بہلا رہے گا۔" انھوں نے اطمینان دلایا۔

"میں چاند کو نہ دیکھ سکوں مگر چاند تو مجھے دیکھ لے گا۔" وہی خوبصورت آواز کہے جا رہی تھی۔

"نیچے تو کوئی میرے چاند کو دیکھنا چاہتا ہے۔" انھوں نے مصنوعی خفگی سے کہا اور ہم دونوں بالکنی سے ہٹ آئے۔ جانے کیوں وہ بڑے تنگی مزاج ہیں۔ شادی کے بعد مہینوں انھیں یہی اندیشہ رہا کہ شادی سے پہلے میں کسی اور کو تو نہیں چاہتی تھی اور اب بھی جب میں ان کے ساتھ ہوتی تو وہ میرے چاروں طرف مجھے دیکھنے والوں کو دیکھتے۔ ہر عورت کی طرح مجھے بھی ان کی یہ بات بڑی اچھی لگتی۔ جانے کیوں ہم عورتوں کی تو یہ فطرت ہوتی ہے کہ ہم کسی کی نظروں میں سما کر سب کی نظروں سے چھپ جائیں۔

صبح مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر کے بارے میں محلے والوں کی رائیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ "خود مختار منزل" کے رہنے والے واقعی اپنے دل کے بادشاہ تھے۔ ہماری ایک پڑوسن نے تو صبح ہی آ کر میرے کان بھرے کہ مالک مکان کی لڑکیوں سے ہوشیار رہنا۔ خوبصورت بلائیں ہیں چڑیلیں۔ ماشاء اللہ تمھارے میاں صورت شکل کے اچھے ہیں اور اس گھر میں مرنے جینے کے کیس بہت ہوتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے زینے والا دروازہ بند کر دیا۔ سنا ہے مرد کی جوانی تو تیز ہوا میں کانپنے والا پتہ ہے۔ ذرا سی جنبش میں بہک جاتی ہے۔

پھر شام کو وہ بالکنی میں جانے لگے تو میں نے ان کا راستہ روک دیا۔

"آپ یہاں مت کھڑے ہونا۔ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔"

وہ ہنسنے لگے اور اس کے بعد انھوں نے پھر کبھی بالکنی کا رخ نہیں کیا۔

دوسرے دن کا ذکر ہے جب آفس جاتے وقت میں ان کے سینے سے لگی کھڑی تھی کہ سیڑھیوں پر کسی نے دستک دی۔

وہ چونک کر مجھ سے ہٹ گئے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مالک مکان کی لڑکی تھی ساجدہ۔ بڑی خوبصورت سی، بڑی تیز طرار سی، بڑی چنچل سی، اسے دیکھتے ہی میں گھبرا گئی۔ عورت ذات اس معاملے میں بڑی سیانی ہوتی ہے۔ وہ آفس کی کنجیاں ڈھونڈنے لگے تو مجھے جانے کیوں غصہ آ گیا۔ آج ان کی آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا۔ سامنے پڑی چیز نظر نہیں آتی۔

وہ چلے گئے تو ساجدہ نے مجھ سے خوب باتیں کیں۔ جب گھڑی نے گیارہ بجائے ہیں تو اسے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اتنی دیر میں ہم بے تکلفی اور دوستی کے میلوں لمبے فاصلے طے کر چکے تھے۔ اس نے اپنے بارے میں ہر بات بتا دی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی اور مردوں سے کھیلنا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ آج کل اس نے ایک ہندو لڑکے کو پاگل بنا رکھا تھا۔ ان کا پورا خاندان بڑا جذباتی تھا اور جنونی حرکتیں کرنے میں وہ لوگ بڑے مشہور تھے۔ بڑی بہن ناجائز بچوں کو پالنے کے لیے ایک اسکول کھولنا چاہتی تھی اور اس کی خاطر وہ گھر بار چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ساجدہ کے ایک چچا ڈاکٹر تھے۔ ایک بار کوئی مریض ان کے آپریشن کی خرابی سے مر گیا تو انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی تھی۔ ساجدہ کا باپ کپڑے کا بہت بڑا تاجر تھا۔ اس مکان جیسے اس کے چار پانچ مکان شہر میں اور تھے۔ میں اسے چھوڑنے زینے تک گئی تو پھر کبھی آنے کی میں نے اسے دعوت دے دی لیکن مجھے اس بات پر بڑا غصہ آیا کہ آخر اس نے مجھے اپنے گھر کیوں نہیں بلایا۔ میں چاہتی تھی نیچے اتر کے اس قصہ کہانیوں والے گھر کو دیکھوں۔ شام کو میں نے ان سے یہ بات کہی تو وہ خوب ہنسے۔

"تم خود ہی چلی جاؤ۔ تمھیں تو اپنی لینڈ لیڈی سے ملنا چاہیے۔"

دوپہر کو میں نیچے گئی۔ زینہ ان کے صحن میں کھلتا تھا۔ ساجدہ کا گھر بڑا اچھا تھا۔ اتنے سلیقے سے سجے ہوئے گھر میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ جانے کتنے نوکر ہر طرف کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ دالان میں کرسی پر بیٹھی ایک خوبصورت سی ادھیڑ عمر کی خاتون نٹنگ کر رہی تھیں۔ میں سمجھ گئی وہ ساجدہ کی امی ہیں۔

میرے سلام کرنے پر وہ چونک پڑیں۔ سلائیاں ان کے ہاتھوں سے گر چکی تھیں۔ سب ہی گھبرا گئے اور یوں دیکھنے لگے جیسے میں نے چوری کرتے میں انھیں پکڑ لیا ہو۔

"ساجدہ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا اور ساجدہ کی امی بدحواسی میں ساجدہ کو پکارنے لگیں۔

"کون آیا ہے ——!" کسی نے بڑے نرم لہجہ میں پوچھا اور پردہ ہٹا کے باہر آ گیا۔

اسے دیکھ کر میں نے اپنی چیخ گلے میں گھونٹ لی۔ خوف کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے سامنے ایک چڑیل کھڑی تھی۔ اس کا منہ شاید چیل کوؤں نے نوچ کھایا تھا۔ آنکھوں کی جگہ سرخ گڑھے تھے اور ناک سے لے کر ٹھوڑی تک کہیں گوشت اور کھال نہ تھی۔

"یہاں آ بیٹھے۔" ساجدہ جلدی سے آئی اور اپنے ہاتھوں میں مجھے یوں سنبھال لیا جیسے میں گرنے والی ہوں۔ اس کی ماں نے بھی مجھے سہارا دیا۔ خوف کے مارے میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میرے پاؤں ساجدہ کے ساتھ جانے کو گھسٹ رہے تھے۔

"کیا اوپر والی کرایہ دار آئی ہیں ——؟" وہ چڑیل آگے بڑھنے لگی۔ "مجھے ذرا میں بھی ان سے باتیں کروں گی۔" وہ جانے کیسے

چل کر ہمارے کمرے میں چلی آئی ۔

"یہ ہماری رقو پھوپو ہیں۔ کل میں ان کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔" ساجدہ نے آہستہ سے میرے کان میں کہا: "ان کے سر پر غلطی سے تیزاب گر گیا تھا اس کی وجہ سے سارا چہرہ جل گیا ہے۔"

یہ سن کر میں کچھ حواسوں میں آئی ۔

"اسی لیے تو ہم کسی کو اپنے گھر نہیں بلاتے۔ آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے ——؟" ساجدہ اور اس کی ماں شرمندہ ہو رہی تھیں اور ساجدہ مجھ سے چھپ کر اپنے آنسو پونچھنا چاہتی تھی۔

"پرسوں رات آپ ہی ہمارے صحن میں اُجالا پھیلا رہی تھیں ——؟" بغیر ہونٹوں کی ہلتی ہوئی بتیسی دیکھ کر ٹھنڈے پسینے چھوٹ جانے لگے۔

جواب کا انتظار کیے بغیر انھوں نے پھر پوچھا: "میری صورت دیکھ کر آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے ——؟"

"جی نہیں۔" میں نے نہایت مری ہوئی آواز میں کہا۔ یوں جیسے ماں کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر بچے جھوٹ نہ بولنے کا اقرار کریں۔

اب میں نے ذرا اطمینان کی سانس لے کر اسے دیکھا۔ اس کے سیاہ بال اور سڈول جسم پچیس تیس برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ گلابی گلابی سی رنگت تھی اور ہاتھ تو اتنے خوبصورت تھے کہ میں انھیں دیکھے گئی۔ ایسے گلابی سڈول ہاتھ صرف چغتائی کی تصویروں میں نظر آسکتے ہیں۔ تو شاید کل یہی آواز چاندنی میں نہانا چاہتی تھی۔

"آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں ——؟" انھوں نے پھر پوچھا تو ساجدہ کی امی نے میرے کان میں کہا ——

"معاف کیجیے۔ آپ اس دروازے سے اوپر چلی جائیے ورنہ رقو آپ کی جان کھا لے گی"۔

اور اب میں سوچتی ہوں کہ میں اس دروازے سے باہر کیوں نہ چلی گئی۔ آخر رقو نے میری جان کھا لی۔ بعض وقت ذرا سی کاہلی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے! شاید یہ "خود مختار منزل" کا سحر تھا۔ شاید اس گھر میں کوئی ایسی خوشبو ضرور پھیلی تھی کہ انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ جبھی تو رقو پھوپو کی اس خوفناک صورت میں جانے مجھے کون سی کشش نظر آئی کہ میں وہاں بیٹھی تھی۔

"بھابی جان! کیا وہ بہت خوبصورت ہیں ——؟" آخر وہ میرے پاس آ بیٹھیں۔

"ہاں! ماشاء اللہ بڑی پیاری سی صورت ہے۔" ساجدہ کی امی نے پھر سلائیاں اٹھا لیں۔

"جبھی تو ——" انھوں نے اپنے گلابی ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ "جبھی تو ہماری چھت پر آج کل چاندنی اتنی دمکتی ہے۔" شاید وہ ہنس رہی تھیں۔ بغیر ہونٹوں کی خوفناک ہنسی۔ میں شرما گئی۔ ہائے اللہ یہ لوگ ہماری سب حرکتیں دیکھتے ہیں۔ ساری باتیں سنتے ہیں۔

"مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔" وہ میرے اور قریب سرک آئیں اور بڑی محبت سے میرا سانولا ہاتھ اپنے گلابی ملائم ہاتھوں میں تھام لیا۔

"مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جب کسی میاں بیوی میں اتنی گہری محبت ہو۔ جب آسمان کا چاند کسی کو زمین پر مل جائے تو عورت کو پھر کیا چاہیے۔"

وہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جلدی جلدی، ہنس ہنس کے، رک رک کر، ٹھنڈی سانسیں بھر کے اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں، جانے کیوں میرے دل میں ان کا احترام بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے لوگ دنیا میں کتنے کم ہیں جن کا چہرہ جل جائے اور دل سیاہ نہ پڑے۔

پھر انھوں نے چائے منگوائی۔ الماری سے پھل نکال کر لائیں۔ پنکھا کھولا۔ بالکل اسی طرح چلتی پھرتی رہیں جیسے آنکھوں والے کام کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ لاٹھی تھامے بغیر وہ کیسے چلتی ہیں۔ آخر میں پوچھ ہی بیٹھی۔ وہ یہ ہنس پڑیں۔

"مجھے اس گھر میں چلنے کی عادت ہے۔ اسی گھر میں تو میں پیدا ہوئی تھی۔ اکیس برس تک میں نے دونوں آنکھوں سے اس دنیا کو خوب دیکھ لیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اب بھی ہر چیز نظر آتی ہے۔ میں نے تو صرف ایک شکل نہ دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کرلی ہیں۔"

رفو پھوپو کے اوپر مجھے کئی پردے لٹکتے دکھائی دیے۔ کون جانے اندر وہ کہاں چھپی بیٹھی ہیں۔

تین گھنٹے بعد وہ بڑی مشکل سے مجھے اجازت دینے پر آمادہ ہوئیں۔ چلتے وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ان کی سگی بہن ہوں اور برسوں کے لیے بچھڑ رہی ہوں۔

"پھر کب آؤ گی ——؟"

"کسی بھی دن۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں۔ ہم تو کل دوپہر کھانے پر تمھارا انتظار کریں گے۔" انھوں نے میری ساری کا پلو تھام لیا۔ "تمھاری ساری کتنی مہک رہی ہے۔"

"یہ سینٹ انھوں نے لاکر دیا ہے۔" میں نے شرما کر کہا۔

"نہیں۔ ہم سے مت چھپاؤ یہ تو کسی کے پیار کی خوشبو ہے۔" ان کی ہنسی پھیل گئی۔

"آپ کو اس خوشبو کی بڑی پہچان ہے۔ پھر تو ہم بھی آپ کا دوپٹہ سونگھیں گے۔" میں نے ان کا دوپٹہ تھامنا چاہا تو وہ پیچھے ہٹ گئیں۔

"ہم سے ایسا مذاق مت کرنا ورنہ ہم خفا ہو جائیں گے۔"

گھر آنے کے بعد میں نے وہ ساری اتار پھینکی جسے رفو پھوپو نے چھوا تھا۔ اپنے ہاتھ خوب رگڑ رگڑ کے دھوئے اور میرا جی چاہا کسی طرح قے کر کے وہ چائے اور سیب نکال دوں جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے کھلائے تھے۔

پھر میں رفو پھوپو کے بارے میں سوچتی رہی۔ سنا ہے مرد جذبۂ رقابت میں ایسی آوارہ عورتوں پر تیزاب پھینک دیتے ہیں یا ان کی ناک کاٹ دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی بھر اس بے وفائی کی نشانی اپنے چہرے پر لیے پھریں۔ مگر جلانے والے نے رفو کے ہاتھ کیوں چھوڑ دیے۔ ان کے ہاتھ بھی تو بڑے خوبصورت ہیں۔ کتنے گرم اور ملائم —— توبہ —— میں نے اپنے ہاتھ مسہری پر رگڑ ڈالے۔

شام کو وہ آفس سے آئے تو میں دن بھر کی کتھا انھیں سنانے کو بیقرار بیٹھی تھی۔

"ایسی آوارہ لڑکیوں کا تو یہی حشر ہوتا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔ "اچھا ہے اب اس گھر کی دلچسپ کہانیوں میں تمھارا وقت خوب کٹے گا۔"

دوسرے دن شام کو میں ان کے ساتھ پکچر دیکھنے جا رہی تھی کہ زینے میں ساجدہ مل گئی۔ "کل آپ نے خوب انتظار دکھایا۔ رفو پھوپو نے تو کل سے کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"واقعی ——!" میں شرمندہ ہو گئی اور انھیں باہر ٹھہرا کے ساجدہ کے ہاں چلی گئی۔

ساجدہ کی امی نے میرے سلام کے جواب میں چاند سے بیٹے کی دعائیں دیں اور میری آواز سن کر رقو پھوپو پلنگ سے اٹھ بیٹھیں۔

”اچھا تو ری آگئیں —— اکل تو اپنے میاں کی صورت دیکھ کر تم اس نکٹی چڑیل کو بھول ہی گئیں۔“

”اس کا تو دماغ چل گیا ہے۔“ ساجدہ کی امی نے میری پشیمانی دیکھ کر کہا۔ ”میں نے کل لاکھ سمجھایا کہ تم کھانا کھا لو شاید انھیں یاد نہ رہا ہو، مگر یہ ایک سر پھری ٹھہری۔ کل سے بھوکی پڑی ہے۔“

”مجھے واقعی بڑی شرمندگی ہے۔ آپ کل سے میری خاطر بھوکی ہیں۔“ میں نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”نہیں۔ بس یوں ہی میں نے کھانا نہیں کھایا ——“ وہ لاپروائی سے بولیں۔ ”تم جانے کیوں مجھے بہت پسند آگئی ہو اور مجھ موئی کی یہ عادت ہے کہ ہمیں جو اچھا لگے ہم اسی کے ہیں یا پھر کسی کے نہیں۔ کل سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تمھیں ایک منٹ کو نہ چھوڑوں۔ کل میں نے اپنے ہاتھ سے تمھارے لیے کلیجی پکائی تھی۔“

”تو آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔“ میں نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں، اس کی کیا ضرورت تھی ——“ وہ شدتِ اضطراب میں کانپ رہی تھیں۔ ”جو بات دل سے اتر جائے اسے یاد دلانے سے کیا فائدہ ——!“

پھر مجھے جانے کیا ہوا۔ جانے کونسی آنچ تھی جس میں میری ساری نفرت اور خوف پگھل گیا اور میں نے جلدی سے رقو پھوپو کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ مجھ سے چمٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سرخ گڑھے گہرے سرخ ہو رہے تھے۔ بغیر آنکھوں کے آنسو بہانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

ان کا دکھ دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ ہمارے ساتھ ساجدہ اور اس کی ماں بھی آنسو پونچھ رہی تھیں۔

پھر ہم میز پر بیٹھے۔ کل کی باسی کلیجی کے نوالے انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ اس کے بعد امرود کا وہ کچالو کھلایا جو انھوں نے خود بنایا تھا۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کھایا۔

سات بجے شام کو جب میں بڑی مشکل سے دوسرے دن دوپہر کو آنے کا وعدہ کر کے اوپر آئی تو وہ سوٹ اور جوتوں سمیت مسہری پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے غصے کے مارے منہ پھیر لیا اور میں سن ہو کر رہ گئی۔

رقو پھوپو کے پاس بیٹھ کر مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں ان کے ساتھ پکچر دیکھنے نکلی تھی۔

میں نے انھیں ہزار طرح سے منایا مگر وہ طعنے دیتے رہے۔

”میں تو اسی قابل ہوں کہ تم اس نکٹی چڑیل کو دیکھ کر مجھے بھول جاؤ۔ اچھا ہوا تم محبت کی بھوکی تھیں وہاں تمھیں اپنے قدرداں مل گئے۔“

اب میں سخت الجھن میں تھی کہ رقو پھوپو کے بارے میں انھیں کیسے سمجھاؤں۔ اس دن سے آج تک میری یہ الجھن باقی ہے۔ جانے کیوں انھیں رقو پھوپو سے بیر بڑھتا گیا اور میں ان کے چوری چھپے یوں نیچے جاتی جیسے ان کی غیر موجودگی میں اپنے کسی عاشق کے پاس جا رہی ہوں۔

مجھے دیکھ کر ساجدہ کی امی کہتیں: ”رقو نامراد کو تم کیا ملی ہو جیسے آنکھوں کی روشنی مل گئی ہے۔ سارا دن تمھارا ذکر کرتی ہے،

تمھارے لیے کھانے کو لاتی ہے۔"

میری آواز سنتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آتیں۔ کئی بار وہ راستے میں رکھے ہوئے اگالدان، میز یا کرسی سے ٹکرا کے گر پڑیں۔ گھٹنے زخمی ہو گئے یا کہنیاں چھل گئیں مگر وہ گھٹنے سہلا کر مجھ سے لپٹ جاتیں۔

"تم کہاں ہو، یہ تو میں تمھاری خوشبو سے پہچان لیتی ہوں۔"

"میں تو کوئی خوشبو نہیں لگاتی رفو پھوپو! آپ جانے کیسے مجھے سونگھ لیتی ہیں۔"

"تم یہ باتیں نہیں سمجھو گی۔" انھوں نے آہ بھر کے کہا۔ "میں تو ہر وقت تمھیں دیکھتی رہتی ہوں۔"

"مگر رفو پھوپو میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ آپ مجھے دیکھیں تو ریجکٹ کر دیتیں۔"

"نہیں تم بہت پیاری ہو۔" وہ میرے ہاتھ تھام لیتیں۔ "جبھی تو تمھارے میاں تمھیں اتنا چاہتے ہیں۔ مرد عورت کی شکل ہی تو دیکھ سکتے ہیں۔ روح میں جھانکنے کی فرصت کسے ملتی ہے۔" وہ بڑی فلاسفر بن کر کہتیں۔

رفو پھوپو سے میری بڑھی ہوئی دوستی ساجدہ کے ہاں بھی کسی کو پسند نہیں تھی۔ ان کی طرف جھکتے دیکھ کر اب ساجدہ بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی۔ ساجدہ کی اتی اٹھتے بیٹھتے رفو کو ڈانٹتیں۔

"تجھے تو دنیا میں اور کوئی کام نہیں رہا۔ مگر نوری بچاری تو بیکار نہیں ہے۔"

کبھی یوں ہوتا کہ ان کے آفس سے آنے کا وقت ہو جاتا، میں گھر جانا چاہتی مگر رفو پھوپو میرے ہاتھ نہ چھوڑتیں۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاتی کہ وہ میرے وہاں جانے پر کتنے خفا ہوتے ہیں۔ ایسے وقت پھر ساجدہ کی اتی الجھتیں۔

"کم بخت نامراد بلا کی طرح چمٹ گئی ہے بچاری کی جان کو۔ وہ بھی تو گھر بار والی ہے۔ ہر وقت تیری وحشت ناک صورت کہاں تک تکے جائے۔"

پھر وہ زینے میں آ کر مجھ سے معافی مانگتیں۔

"کیا کروں بیٹی! اللہ نے مجھے جانے کن گناہوں کی سزا دی ہے۔ کم بخت کو موت بھی تو نہیں آتی اسی لیے میں تو اپنے گھر میں کسی کو بلاتے ہوئے ڈرتی ہوں۔"

مجھے اور شرمندگی ہوتی۔ اب میں سب کو لاکھ یقین دلاتی کہ مجھے رفو پھوپو بہت پسند ہیں۔ میں ان کے پاس مجبوراً نہیں بیٹھتی مگر کوئی یقین نہ کرتا۔

گھر آتی تو وہ الگ خفا ہوتے۔ انھیں جانے کیوں رفو پھوپو اتنی بری لگتی تھیں۔ اب تو وہ میری ساری لاپروائیوں کا الزام رفو پھوپو پر رکھتے۔

"آپ تو یوں ان سے جلنے لگے ہیں جیسے وہ آپ کی رقیب ہوں۔" ایک دن میں ان سے لڑ پڑی۔

"اور نہیں تو کیا رقیب کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔" انھیں بھی غصہ آ گیا۔ "میں خوب جانتا ہوں ایسی عورتوں کو۔ اب کوئی مرد تو اس کی صورت پر تھوکے گا نہیں اس لیے وہ تمھیں اپنے جال میں پھانس رہی ہے۔"

"آپ مجھے ایسی ذلیل عورت سمجھتے ہیں؟" بے بسی کے مارے میں رو پڑی۔

اس دن ہم دونوں خوب لڑے مگر یہ ہماری پہلی لڑائی تھی اس لیے انھوں نے مجھے فوراً منا لیا۔ میں نے اس دن رفو پھوپو سے کبھی نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔ آخر انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ خود زبردستی مجھے زینے تک چھوڑنے آئے۔

مجھے ڈر تھا کہ تین دن تک نہ جانے سے رفو پھوپو نے اپنا جانے کیا حال کیا ہوگا۔ مجھ سے بہت خفا ہوں گی۔ مگر وہ حسبِ عادت اسی بے تابی سے میری طرف دوڑیں۔

"رفو پھوپو! میں تین دن نہ آسکی، بات یہ ہوئی کہ ——"

"اونہہ، بات کچھ بھی ہو ——" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں کہ کوئی مجھے آخر کیوں پسند کرے گا! تمھارے میاں بھی مجھ سے ملنے پہ خفا ہوتے ہوں گے۔"

"نہیں اللہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔" میں حیران تھی کہ یہ بات انھیں کیسے معلوم ہوئی۔

"مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو نوری!" آج جانے کیوں وہ اتنی سنجیدہ ہو رہی تھیں۔ "میں نے حماقت میں ہمیشہ چلتی ہواؤں کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔"

"رفو پھوپو! مجھے معاف کر دیجئے۔" میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"معافی کاہے کی چندا ——" لوگوں نے بڑے پیار سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیا میں یہ بات نہیں جانتی کہ تمھارے میاں کیا چاہتے ہوں گے۔ مجھے تم اسی لیے تو اچھی لگتی ہو کہ کوئی تمھیں اتنا چاہتا ہے۔"

"رفو پھوپو ——" میں جانے کیوں چلا پڑی۔ "وہ کون ظالم تھا جس نے تیزاب پھینک کر آپ کی دنیا جلا ڈالی۔" میری آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ گئے۔

"پاگل، تم سے یہ غلط بات کس نے کہی کہ کسی نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے تو خود اپنی آنکھیں پھوڑی ہیں۔"

"سچ ——" میں اچھل پڑی۔

"ہاں —— !" ان کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ "تم ذرا سوچو کہ جو ہماری جان بھی ہو اور روح بھی، جس کی محبت پر ہمیں اپنے وجود کی طرح یقین ہو وہ اچانک بدل جائے تو —— تو ——" ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے جیسے خون ٹپکنے والا تھا —— "نجم میری آنکھوں میں بار بار جھانکتا تھا —— رفو! کیا بات ہے تمھاری آنکھوں کے اندر میں ہی میں نظر آتا ہوں؟ —— اس کی یہ بات سن کر میرا جی چاہتا تھا اپنی آنکھیں کس کے بند کر لوں، کہیں نجم پھسل نہ جائے —— اور پھر وہ نجم مجھ سے بدل گیا۔ ایک کروڑپتی کی دولت نے اسے کھینچ لیا۔ مجھے لوگوں کے کہنے پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ پھر اس نے خود مجھ سے کہا کہ ابا جان زبردستی ایک لڑکی میرے سر منڈھ رہے ہیں۔ یہ سن کر میں چپ رہی۔ میں نے اس کی دلہن کے کپڑے خود سیے، رات رات بھر جاگ کر آنگن میں گیت گائے۔ جو چیز ہماری نہیں رہی اس کے لیے کیوں روئیں۔ پھر دروازے پہ وہ شہنائیاں گونج اٹھیں جو ہمیشہ سے میرے کانوں میں بسی ہوئی تھیں۔ میں نے کتنے ہزار بار یہ خواب دیکھا تھا کہ گھر روشنیوں سے جگمگا رہا ہے آنگن میں میراثنیں گا رہی ہیں اور نجم کی بہنیں اپنے جگمگاتے دوپٹے اس کے سہرے پر ڈالے اسے مسند کی طرف لا رہی ہیں۔ پھر کوئی زور سے چلایا۔ "نجم کی دلہن کہاں ہے ——؟" اور میں پان بناتے بناتے رک گئی۔ اس کے بعد میں اپنے گھر کی طرف

ہری سے بھاگی۔ پھر سب مجھے ڈھونڈنے نکلے کہ میں نجم کی دلہن دیکھوں۔ نجم خود آیا۔

”میں تمھاری دلہن کو اس لیے نہیں دیکھوں گی کہ اس نے کہیں میری آنکھیں دیکھ لیں تو ——“

یہ سن کر نجم چلا گیا مگر اس کی دلہن خود اندر آ گئی۔ میں گھبرا کے بھائی جان کی ڈسپنسری میں بھاگی اور تیزاب کی بوتل اپنے چہرے پر انڈیل لی۔

”اوہ —— مجھے کس قدر سکون ہوا ہے اس دن ——“ رفو پھوپو نے اطمینان سے کہا۔ ”جیسے میری جلتی ہوئی آنکھوں پر کسی نے برف کی ڈلیاں رکھ دیں۔ جیسے کلیجے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔“

”مگر رفو پھوپو! آنکھیں اتنی سستی تو نہیں ہوتیں کہ ایک شخص کے لیے بند کر لی جائیں۔“ میں آخر پوچھ بیٹھی۔

”مجھے آنکھیں جلانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی چندا ——“ انھوں نے بڑی محبت سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”میں اب بھی اپنا ہر کام کر لیتی ہوں، اور پھر وہ آنکھیں میری کہاں رہی تھیں جن میں نجم بسا ہوا تھا۔“

میں نے ان کے ٹھنڈے سفید ہاتھ پکڑ لیے۔

”جانے نجم صاحب آپ کے ہاتھ کیسے بھول سکے ہوں گے۔ سچی رفو پھوپو! میں تو آپ کے ہاتھوں پر مرتی ہوں۔“

”ہائے اللہ! یوں نہ کہو بھئی۔“ وہ خوش ہو گئیں۔ ”کہیں میں یہ ہاتھ تمھیں نہ دے دوں۔“

پھر ہم دونوں ہنس پڑے۔

”اب ان ہاتھوں کو کبھی مت چھوڑنا ورنہ یہ بھی بے مصرف ہو جائیں گے۔“

اس دن ہم خوب ہنسے تھے۔ رفو پھوپو کے دل سے بھی جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا اور وہ بہت خوش تھیں۔ ساجدہ اور اس کی امی بھی اس دن ہمارے پاس آ بیٹھیں۔ وہ دورے پر تھے اس لیے دن بھر ہم نے خوب لطیفے سنائے۔ ساجدہ کی امی نے پوریاں بنائیں اور رفو پھوپو نے خود فروٹ سلاد بنایا۔

وہ میرے لیے خود کھانا پکاتی تھیں چاہے کتنی ہی بار ہاتھ جلے۔ خود کپڑے خرید کر میرے لیے سلواتیں، میرے لیے تحفے بھیجتیں تو وہ اٹھا کر پھینک دیتے۔ رفو پھوپو کی بے بسی سنا کر میں نے کتنا چاہا کہ ان کے دل میں رفو پھوپو کے لیے رحم جاگے مگر ان کا دل اور پتھر بن گیا۔ میں نیچے جاتی تو وہ میرا راستہ روک لیتے۔ پھر ایک دن انھوں نے کہا کہ اب ہم دوسرے مکان میں چلے جائیں گے۔ ان کی خود غرضی پر میں بھنا اٹھی۔ رفو پھوپو کو مجھ سے دور کر کے انھیں کیا ملے گا۔ میرا جی چاہا کہ ان سے خوب لڑوں۔ مگر عشقِ مصلحت آمیز نے مجھے صبر کرنا سکھا دیا تھا۔

اس دن رفو پھوپو کا اندھاپن میرے آنسو نہ دیکھ سکا، جب میں نے انھیں گھر بدلنے کی خبر سنائی۔

”یہاں تمھیں کیا تکلیف ہے؟“ انھوں نے اداس لہجے میں پوچھا۔ ”اگر کرایہ زیادہ ہے تو میں بھائی جان سے کہہ کر کم کروا دوں گی۔“

”نہیں یہ بات ہے کہ ان کا آفس دور چلا گیا ہے اس لیے ہم وہیں رہیں گے۔“

”اچھا ——“ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گئیں۔ ”جب تم نہیں آتی تھیں تو تمھاری آواز سن کر خوش ہو لیتی تھی۔“

"میں وہاں سے بھی آپ کے پاس آیا کروں گی۔" پھر میں رونے لگی اور یہ دیکھ کر میرے آنسو اور بہنے لگے کہ رفو پھوپو رونا چاہتیں مگر رو بھی نہ سکتی تھیں۔

اب میں کبھی کبھار ان سے چھپ کر رفو پھوپو سے ملنے آجاتی تھی۔ ان دنوں مجھے متلی چکر شروع ہوا۔ رفو پھوپو نے یہ خبر سنی تو بس کھل اٹھیں۔

"نوری! اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے بینائی مل جائے۔ میں اپنے بیٹے کو دیکھ لوں۔"

وہ مجھے روز کھٹی میٹھی چیزیں پکا کر بھیجتی تھیں۔ انھوں نے ساجدہ سے بہت سے چھوٹے چھوٹے کپڑے سلوائے تھے۔ میری آواز سنتے ہی وہ کوئی لوری گانے لگتیں۔ پھر مجھے گلے لگا کر پیار کرتیں۔ انھیں ہنسی آتے چلی جاتی۔

پھر ایک دن انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"نوری! تمھیں یاد ہے نا میں نے اپنے ہاتھ تمھیں دے دیے ہیں ——؟ تو بھئی ان کا مصرف یہ ہوگا کہ تمھارا بچہ پالیں گے تم اس کے لیے آیا مت رکھنا۔ مجھے اپنے گھر میں رکھ چھوڑنا۔"

"ہائے رفو پھوپو! ایسا نہ کہیے۔" میں واقعی سہم گئی کیونکہ ایسی خوفناک صورت والی اندھی سے وہ اپنا بچہ کیوں پلوائے۔

آج کل تو وہ مجھ سے اور بھی خفا رہتے تھے۔ رفو پھوپو ہمارے گھر سے اتنی دور تھیں۔ پھر بھی وہ ہر وقت ہمارے گھر پر چھائی رہتیں۔ اب وہ مجھ سے سیدھی طرح بات بھی نہ کرتے۔ آفس سے اچانک بے وقت لوٹ آتے۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ میں گھر میں ہوں یا رفو پھوپو کے ہاں۔

کبھی کبھی میں سوچتی کہ بس اب رفو پھوپو سے میری دوستی ختم۔ میں اپنا گھر کیوں جلاؤں۔ وہ مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ راتوں کو وہ دیر سے گھر آتے۔ میرے ساتھ کبھی کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔

پھر ایک دن رفو پھوپو کے تقاضوں سے تنگ آکر میں ان کے ہاں گئی تو بس ان سے الجھ پڑی۔

"میں آخر اپنے میاں کا بھی کچھ خیال کروں یا دن رات آپ ہی کے پاس بیٹھی رہوں۔ وہ میری لاپرواہیوں سے کتنے اداس رہنے لگے ہیں۔"

یہ سن کر رفو پھوپو خلاف توقع کھل اٹھیں۔

"اللہ تم دونوں کی محبت قائم رکھے۔ میں اب کبھی تمھیں نہیں بلاؤں گی۔ بس اب میں اپنے بیٹے کو پیار کرنے خود ہی آنکلوں گی۔"

ان کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔

آخر میں ہار گئی۔ رفو پھوپو تو کانٹوں بھری جھاڑی بن کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ ایک طرف سے چھڑاتی تو دوسری طرف سے گھیر لیتیں۔

پھر میری طبیعت خراب ہوئی۔ جس وقت میں ہاسپٹل جا رہی تھی تو وہ بار بار آنکھیں مل رہے تھے۔ ان کی اداس صورت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں اپنی تکلیف بھول گئی۔ آج کتنے دنوں کے بعد میں نے اپنے لیے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ منا پیدا ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھے جیسے انھیں مجھ سے کوئی شکایت ہی نہ رہی ہو۔

منّے کو لے کر جب ہم گھر آئے تو میں نے ان سے ایک ہی التجا کی اور انھوں نے میری بات مان لی۔ آج تو وہ میری ساری خطائیں معاف کر چکے تھے۔ مجھے منہ مانگا انعام دے سکتے تھے۔

پھر وہ خود رفو پھوپو کو لانے ان کے ہاں گئے۔ ان کا ہاتھ پکڑ کے خود سیڑھیاں چڑھائیں اور جھولے میں سے بچہ اٹھا کے ان کی گود میں دیا۔

"لیجئے یہ ہے ہمارا منّا۔"

"آپ کا منّا نہیں یہ تو میرا بچہ ہے۔" رفو پھوپو نے اسے اپنے سینے سے چمٹا کر کہا۔ "اسے میں پالوں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ——!" اچانک جانے کیوں انھیں غصہ آ گیا۔ "بھلا آپ بچے کو کیسے پال سکتی ہیں —— نہیں صاحب میں اپنے بچے کے بارے میں اتنا جذباتی بننے کو تیار نہیں ہوں۔"

رفو پھوپو نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اپنے ہاتھ مروڑنے لگیں۔ میں بھی تڑپ کر رہ گئی۔ بھلا کوئی یوں بے مروتی سے جواب دیتا ہے۔

رفو پھوپو نے آہستہ سے بچہ مجھے دے دیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ کمرے میں بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے حد غصہ میں کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ پھر اچانک رفو پھوپو کی چیخ سُن کر میں اچھل پڑی۔ وہ بُری طرح تڑپ رہی تھیں اور ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے بیچ میں پھنس گئے تھے۔ ہم دونوں نے بڑی مشکل سے کھینچ کھینچ کر ان کے ہاتھ نکالے جو کہنیوں کے پاس سے ٹوٹ کے مڑ گئے تھے اور ساری کرسی خون سے رنگ چکی تھی۔

"رفو پھوپو! یہ آپ نے کیا کیا ——" میں غم کے مارے پاگل ہو گئی۔

"میں بے مصرف چیزوں کو اپنے پاس نہیں رکھتی۔" انھوں نے آہستہ سے کہا اور خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد مجھے جانے کیا ہوا کہ میں منّے کا گلا دبانے دوڑی۔ میرا بس چلتا تو میں منّے اور اس کے ابا دونوں کو ختم کر ڈالتی۔ دنیا سے ساری بے مصرف چیزوں کو مٹا ڈالتی۔

لیکن میری کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں سلاخوں کے پیچھے بستر پہ لیٹی میں مُنّے کا انتظار کرتی ہوں۔ وہ کتنے بے درد ہیں کہ مجھے اس اندھیرے کمرے میں بند کر گئے ہیں۔ یہاں بیٹھی میں سوچتی ہوں کہ اپنے بے مصرف ہاتھوں سے میں رفو پھوپو کی کہانی ہی لکھ لیتی۔

پتھیرا

صادق حسین

اُس کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بھٹوں کے مالک، راج مزدور، گاڑی بان، کھیپ بھرنے والے، سب کے سب اُسے پتھیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ اینٹیں پاتھتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اُس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ اُس کا بدن چلچلاتی دھوپ میں تانبا بن گیا تھا۔ اور اُس کے تانبے کے مضبوط ہاتھ حیرت انگیز تیزی سے مٹی کو پانی میں سوند سکتے تھے۔ اس کی اُنگلیاں کمال پھرتی سے گُندھی ہوئی مٹی کو آہنی سانچے میں ڈال کر کچی اینٹوں کی تخلیق کر سکتی تھیں۔ مٹی اور پانی۔ ان دو عناصر کے مزاج کو وہ اُتنا ہی پہچانتا تھا جتنا کہ بیگم جان اُس کے پیار، غصّے اور بھوک کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے تو وہ جیٹھ کی گرمی میں بھی ٹھیک وقت پہ کھانا لے کر برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاتی تھی۔ سر پہ اینڈوا، اُس پہ لسّی کی ٹھلیا اور روٹیوں کی پوٹلی۔ اس انداز میں بیگم جان کا قد اور بھی لانبا معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی بیگم جان نے برگد کی گھنی چھاؤں میں پہنچ کر اُس میدان کی طرف دیکھا جو زمین کی سطح سے نیچا تھا۔ جہاں پسینے میں شرابور مرد عورتوں کے جوڑے اپنے اپنے کام میں مُنہمک تھے۔ عورتیں گُندھی ہوئی مٹی کے نپے تلے لوندے بنا رہی تھیں۔ مرد آہنی سانچوں کو پلٹ پلٹ کر اینٹیں نکال رہے تھے۔ اگرچہ پیشے کی رُو سے اُن عورتوں کو پتھیرنیں اور مردوں کو پتھیرے کہنا مناسب تھا، تاہم اُن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نام تھا۔ صرف ایک چوڑے چکلے سینے والے نوجوان کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اُسے ہر شخص پتھیرا کہہ کر پکارتا تھا۔ آج بھی وہ نوجوان چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا چند ماہ پہلے جب بیگم جان اُس کے ساتھ کام کیا کرتی تھی تو دیکھنے والے دانتوں تلے اُنگلیاں دبا کر رہ جاتے تھے۔ جب پتھیرا اور بیگم جان مل کر کام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی، پانی، حرکت اور پسینے نے سارے میدان پہ فتح پالی ہو۔ بیگم جان تو اب بھی چاہتی تھی کہ پتھیرا اُسے کام پہ آنے کی اجازت دے دے۔ لیکن یہ بات زبان پر لانے سے بیگم جان ڈرتی تھی۔ اس لیے کہ اُسے چند ماہ پہلے کی واردات بھولی نہیں تھی۔ اُس دن ایک نو وارد نے اُس پہ آوازہ کسا تھا۔ اُس دن اگر ٹھیکیدار اور دوسرے لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو پتھیرا نو وارد کی تکا بوٹی کر دیتا۔ اُس واقعے کے بعد دو چار دن تو بیگم جان خود ہی کام پہ نہ آئی بھٹے کے قریب اینٹیں جوڑ کر بنائی ہوئی کوٹھڑی میں پڑی رہی۔ لیکن جب اُس کی انگلیوں میں چُل ہونے لگی اور اُس نے کام پہ جانے کی خواہش ظاہر کی تو پتھیرا اُسے اینٹوں کے میدان میں لانے کے بجائے قریب کے گاؤں میں لے گیا جہاں اُس نے بالا بالا ایک چھوٹا سا کچا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

آج بھی پتھیرے کے جسم کا تانبا سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ بیگم جان کو دیکھتے ہی چمکتا ہوا تانبا کام جہاں کا تہاں چھوڑ کر ندی، بستی اور بیگم جان کے پاس پہنچ گیا۔ اور برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اُس نے ندی اور بستی کی طرف زیادہ اور بیگم جان ی طرف کم توجہ دی۔ شروع شروع میں بیگم جان کو پتھیرے کا یہ رویہ سانپ بن کر ڈستا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ے کے بعد وہ سمجھ گئی کہ پتھیرے کی بھوک پتھیرے کے پیار سے زیادہ جاندار ہے۔ بیگم جان یہ بھی جانتی تھی کہ پتھیرا کھانا کھا لینے ے بعد اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن آج پتھیرے کی بھوک اور پیار میں نمایاں کمی تھی۔ جب ایسا ہوتا تھا تو بیگم جان سمجھ جاتی تھی کہ پتھیرا اُداس ہے۔ اور تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ جب پتھیرا اُداس ہو تو اُس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ ی ہے آج بیگم جان پتھیرے کو کھانا کھلا کر چپکے سے کھسک گئی۔ اور پتھیرا برگد کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر اُونگھنے لگا اور جب وہ اُونگھتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ وہ سوچتا ہے، اُن باتوں کے متعلق جو اپنے پرائے کی زبان پر تھیں۔ دوسری شادی۔ کیونکہ پانچ سال سے اُوپر گزر چکے تھے مگر ابھی تک کوئی آس نہ بندھی تھی۔ بیگم جان نے لاکھوں جتن کئے۔ پیر فقیر، تعویذ گنڈا، ٹونے ٹوٹکے، مزاروں پر منتیں، دوا دارُو، اُس نے سب کچھ کیا مگر اُمید بر نہ آئی۔ آخر کار میٹھی میٹھی لوریاں اپنے ذہن کے گوشوں میں دبا کر وہ پتھیرے کی بھوک، پیار اور غصے کی تن من سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ بعض اوقات بیگم جان کو یوں معلوم ہوتا جیسے اینٹیں پاتھتے پاتھتے پتھیرے کا دل بھی اینٹ کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب کبھی اُس کے ذہن کے گوشوں میں دبی ہوئی میٹھی میٹھی لوریاں اُبھر کر سارنگی کے تاروں کی طرح سُن سُن کر اُٹھتیں اور وہ اپنے خیالی ننھے مُنّے کی باتیں کرتے کرتے بے اختیار رو پڑتی تو پتھیرا اُٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگتا، سُوتلی بٹنے میں محو ہو جاتا یا اچانک اُسے کوئی اور کام یاد آ جاتا۔ بیگم جان بانجھ ہے۔ اس موضوع پر پتھیرا اپنے رشتہ داروں کی باتیں سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ بڑی بوڑھیاں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر نسل کی سلامتی کی تلقین کرتیں مگر پتھیرے کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگتی۔ کبھی کبھی گاؤں کی گلی سے گزرتے ہوئے جب پتھیرا کسی بچے کی طرف غور سے دیکھتا تو بچہ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں اور جُڑی بھویں دیکھ کر ڈر جاتا اور چیخیں مارتا ہوا گھر کو بھاگ جاتا۔ ایک دن پتھیرا خود اپنی چیخ سُن کر سہم گیا۔ اور یہ وہ چیخ تھی جو دوسرا انسان نہیں سُن سکتا۔ یہاں تک کہ وہ کربناک گونج بیگم جان بھی نہ سُن سکی حالانکہ وہ اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ بیگم جان پہلی مرتبہ پتھیرے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئی۔ پھر یکایک اُسے مسرت کا احساس ہوا، یہ سوچ کر کہ پتھیرے کا دل اینٹ کی طرح سخت نہیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد بیگم جان سوچنے لگی۔ کہ اینٹ کی طرح سخت دل تو کہیں بہتر تھا۔ کیونکہ پتھیرے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی تھی۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ بیگم جان کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہے۔ پتھیرا بان کے کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کے تانبے ایسے سینے پر ایک پڑوسی کا بچہ بیٹھا، توتلی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ پتھیرے کی آنکھوں سے بہتی ہوئی ندی کا راز بیگم جان اچھی طرح جانتی تھی۔ اور ایک دن بیگم جان کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا دھارا پھُوٹ نکلا۔ اور اُس دھارا کا سرچشمہ وہ خوشی تھی جو ایک عورت ہی جان سکتی ہے۔ اُس دن پتھیرے نے محسوس کیا کہ آسمان پر دھنک نکل آئی ہے۔ سوکھی ٹہنیاں ہری ہو گئی ہیں۔ کچی اینٹیں چاندی کی طرح کھنکنے لگی ہیں اور تمام کائنات نغمہ و ساز سے گونج اُٹھی ہے۔ اُس کا غصہ بیٹے کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔ اور اُس کے پیار نے برگد کے پیڑ کے ڈالوں اور جٹاؤں سے زیادہ پھیل کر بیگم جان کو اپنی گھنی چھاؤں میں لے لیا۔ تانبے ایسے جسم میں دُونی طاقت آ گئی۔ بیگم جان تھی

وزنی چیزیں اُٹھانا بند کر دیں۔ ذائقہ کھٹی چیزوں کی جستجو میں رہنے لگا۔ ایک دن بیگم جان نے دو چھوٹے چھوٹے کُرتے، نہالچے اور لنگوٹ سی کر اپنی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھ ڈالے۔ لمحات کے قافلے کِھل کِھل ہنستے بیت گئے۔ اور پھر ایک دن پچھلے پہر میں، ایک عورت دوڑتی ہوئی اینٹوں کے میدان میں پہنچی۔ اُس نے پتھیرے کے کان میں کچھ کہا۔ پتھیرا فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ بھٹے کی چمنی سے بھی اونچا ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں آہنی سانچے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہوں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی سمت چل پڑا۔ اُس کے ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے ماتھے پر لرز رہی تھیں۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی پگڈنڈی پر اُس کے ننگے پاؤں کی دھمک سُن کر بٹیروں کی ڈار خوفزدہ ہو کر دوسری طرف نکل گئی۔ اُس کے دائیں بائیں گیہوں کی سنہری بالیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اُس کے پنجے اور ایڑیاں، پگڈنڈی کے کناروں پر اُگی ہوئی ہری ہری دُوب پر پھولوں کی طرح دعائیں برسنے لگیں۔ ہر رنگ، ہر شے، ہر منظر سے بے نیاز وہ اپنے وجود سے ہٹ کر چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا۔ نئی زندگی کی پہلی آواز سُن کر اُس کا انگ انگ ناچ اٹھا۔ اپنے نوزائیدہ بچّے کو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ وہ چیخ پڑے، قہقہے مارے، پچاس روپے کے سکّے جو اُس نے زمین میں دفن کر رکھے تھے۔ آج انھیں اندھیرے سے باہر نکال کر دائی کی جھولی میں ڈال دے۔ جذبات کے ہجوم میں اُس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اُس نے مسکرا کر بیگم جان کے خشک ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ عورتوں کے مبارکباد کے شور سے پھُولا نہ سمایا۔ آج بیگم جان پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ رات گئے دیئے کی لَو میں وہ سوئی ہوئی بیگم جان اور اپنے بچے کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے زمین میں سے پچاس روپے کے سکّے نکال کر بیگم جان کے میلے کچیلے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ دوسرے دن بھانڈ آئے تو منہ مانگا انعام پا کر نہال ہو گئے۔ بہشتی، نیم کے پتوں کا سہرا سردل سے باندھ کر ہٹا تو پتھیرے نے دو روپے اُس کی مٹھی میں تھما دیے۔ دائی کو چھینٹ کا جوڑا اور پانچ روپے دے کر رخصت کیا گیا۔ بڑی بوڑھیوں نے منہ میٹھا کیا۔ اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔

چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ سُگھڑ عورتوں نے مشورہ دیا "مُنّے کے ختنے کرا ڈالو۔ بچہ بڑا ہو جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔" بیگم جان نے پتھیرے سے ذکر کیا۔ اگلے دن پتھیرے نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ آن کی آن میں میدان کے چاروں کونوں میں خبر پھیل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ بار بار دہرائے جانے پر یہ بات بھی خود بخود طے پا گئی کہ پتھیرا ساری برادری کو میٹھے چاول کھلائے گا۔ پتھیرا شام کو گھر لوٹ کر آیا تو بیگم جان بھانپ گئی کہ وہ کسی سوچ میں گُم ہے۔ بات کھلی تو بیگم جان نے تن کر کہا "میرے لاڈلے کے ختنے دھوم دھام سے ہوں گے۔ اگر دُنیا میں ضرورت نہ ہوتی تو قرض اور سُود کا وجود نہ ہوتا۔" یہ سُن کر پتھیرے کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ دوسرے ہی دن وہ قرض مانگنے کے لیے ٹھیکیدار کے پاس جا پہنچا۔ ٹھیکیدار چارپائی پر بیٹھا ہوا پتھیروں کے جمعدار سے باتیں کر رہا تھا۔ پتھیرے کو دیکھ کر ٹھیکیدار مسکرا کر بولا "بڑی عمر لے کر آئے ہو۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" پتھیرا زمین پر بیٹھ گیا۔

ٹھیکیدار بولا "تمھیں سُن کر خوشی ہو گی کہ مجھے ایک بہت بڑا ٹھیکہ ملا ہے۔ چند سرکاری عمارتیں ساٹھ دن کے اندر اندر تعمیر ہو جانی چاہئیں۔ مجھے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں سپلائی کرنی ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ لیکن یہ میری آبرو کا سوال ہے۔ میں نے

فیصلہ کیا ہے کہ اگلے اتوار اس میدان میں اینٹیں بنانے کا مقابلہ ہو۔ جو شخص سب سے زیادہ اینٹیں بنائے گا اُسے اُجرت کے علاوہ دو سو روپے کی رقم بطور انعام دی جائے گی۔"

"اللہ سرکار کو سلامت رکھے۔" پھیرا بولا

ٹھیکیدار نے چلم کا گہرا کش لے کر دھواں ناک سے باہر نکالا۔ جمعدار نے صافے کا شملہ دُرست کر کے مونچھوں کو دو چار تاؤ دیے۔

ٹھیکیدار بولا۔ "اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا میرے پاس اینٹوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے گا۔ اور پھر اس طرح میں دوسرے بھٹوں کے کاریگر کم از کم ایک دن کے لیے میرا کام کریں گے۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ کاریگر لوٹ کر دوسرے بھٹوں پر نہ جائیں۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس علاقے میں ایسا جوان پیدا ہی نہیں ہوا جو تم سے زیادہ اینٹیں بنا سکے۔ اس لیے سمجھ لو کہ اگلے اتوار دو سو روپے کی رقم تمہارے پاس پہنچ گئی۔"

ٹھیکیدار کی گفتگو سُن کر پھیرے کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ گھر پہنچ کر اُس نے سارا قصہ بیگم جان کو سنایا۔ بیگم جان کو بے حد مسرت ہوئی۔ وہ بولی "جب خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔" طے پایا کہ اگلے اتوار بیگم جان اُس کے ساتھ کام کرے گی۔ اگر پھیرا بجلی کی طرح کوندے بھرے گا تو وہ شعلہ بن کر میدان کے سینے پر لپک لپک جائے گی۔ دو سو روپے کی رقم حاصل کرنے کے لیے۔ تاکہ مُنّے کے ختنے دھوم دھام سے ہو سکیں۔

⁂

اتوار کے دن میدان کے چاروں طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آنے لگے۔ قرب و جوار کے دیہاتوں سے بوڑھوں، جوانوں اور نو عمر لڑکوں کی ٹولیاں، سورج نکلنے سے پہلے ہی تماشا دیکھنے آ پہنچیں۔ تماشائی دن کا کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ باجرہ، مکا اور گیہوں کی روٹیاں، آم کا اچار، گڑ کی ڈلیاں، پیاز کی گٹھیاں۔ برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں درجنوں پانی سے بھرے کورے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر شخص ٹھیکیدار کی سخاوت اور حسنِ انتظام کی تعریف کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس میدان میں میلہ لگ گیا ہے۔ ڈھول کی پہلی آواز بلند ہو کر آس پاس کی وادیوں میں گونجی۔ میلوں ٹھیلوں کے شوقین جاٹ سینے پھیلا کر مست ہو گئے۔ میدان کے چاروں طرف انسانوں کی چوہری چوہری دیواریں کھنچ چکی تھیں۔ اس لیے نئے آنے والے تماشائیوں میں سے کچھ برگد کے پیڑ پر چڑھ کر ڈالوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ میدان سے ذرا پرے، ٹیلوں ٹبوں اور اینٹوں کے چھٹے پر کھڑے ہو گئے۔

میدان کے بیچ نمبردار کا کلف دار شملہ دُور سے نظر آ رہا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ نمبردار کو ثالث مقرر کیا گیا ہے۔ اور نمبردار کے فیصلے سے پہلے ہر شخص فیصلہ کر چکا تھا کہ ٹھیکیدار بڑے دماغ کا مالک ہے، جس نے اُس علاقے میں ایک نئے میلے کی بنیاد رکھی ہے۔ کبڈی، سمی، دنگل، کھلیانوں اور میلوں ٹھیلوں میں تو ہمیشہ ڈھول بجتے تھے مگر اینٹوں کے میدان میں کبھی ڈھول کی آواز نہ سُنی گئی تھی۔ وہاں تو صدیوں سے انسان کا پسینہ بہتا چلا آیا تھا۔ خدا جانے وہاں پھیروں کے کتنے قبیلے مٹی کھودتے کھودتے خود پیوندِ زمین ہو گئے تھے۔ آج اُس میدان میں مرد عورتوں کے جوڑے اپنے برسوں کے ریاض کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے گزشتہ شام مٹی گوندھ کر رکھ چھوڑی تھی۔ آج صبح گندھی ہوئی مٹی کو پانی کے چھینٹے دے کر تر کیا تھا۔ میدان میں ریت بچھی ہوئی

تھی۔ مرد لوہے کے سانچے سامنے رکھے ڈھول کی دوسری آواز کے منتظر تھے۔ عورتیں مٹی کا پہلا لوندا بنانے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ ڈھول کی دوسری آواز پر حرکت کا طوفان آنے والا تھا۔ اُس آواز سے پہلے خیالات کے قافلے، اپنی اپنی بساط کے مطابق، تمناؤں کے میناروں کا تیزی سے چکر کاٹ کر لوٹ آئے۔ منچلے تماشائی شرطیں بدنے لگے۔ کسی نے نسوار کی چٹکی لی۔ بانکے نوجوانوں نے سگریٹ سلگا لیے۔ بڈھے حقے گڑگڑانے لگے۔ ثالث نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیے۔ جمعدار نے صافے کا پیچ ابرو پر سے ہٹا کر ٹھیکیدار کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ مشرق میں پھیلی ہوئی سُرخی گاؤں کی کنواری بیٹی کی طرح شرما کر چھپ گئی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں پہاڑوں کی اوٹ سے اُبھر کر میدان میں جھانکنے لگیں۔

ڈھول کی دوسری آواز بلند ہوئی۔ حرکت کا طوفان آ گیا۔ لوہے کے سانچے بے تحاشا کھٹ کھٹ کرنے لگے۔ نسوانی ہاتھوں کے لوچ لچک اور پھرتی نے میدان کے ذرّے ذرّے کو گرما دیا۔ پسینے کے تھرتھراتے ہوئے قطرے آوازیں دینے لگے۔ دھرتی کانپ اُٹھی۔ زندگی کے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ ڈھولکیے کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چوبیں ڈھول کے پُڑوں کو اندھا دُھند پیٹنے لگیں۔ ڈھولکیا خود جوش میں آ کر اپنا سر دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔ دھما دھم۔ دھما دھم۔ گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ تماشائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بیگم جان کے ہاتھوں کی پرچھائیاں کمال تیزی سے میدان کے تپتے ہوئے سینے پر گردش کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پھیرے کے جسم کا چمکتا ہوا تانبا نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی اور پرچھائیوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ سینوں کے اندر مچلتی ہوئی تمناؤں نے رگوں کو اُکسا کر انگلیوں میں برقی روئیں دوڑا دی تھیں سبتے بلتے۔ گاؤں کے پہلوان نے ایک ٹانگ پر ناچ کر داد دی۔ کہیں دُور سے آیا ہوا کاریگر، بیگم جان اور پھیرا کی جوڑی سے آگے نکل گیا تھا۔ نیا جوش، نیا ولولہ، نئی دلچسپی کی لہر میدان کے چاروں کونوں میں دوڑ گئی۔ بیگم جان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ خیالوں کا تاج محل ڈولنے لگا۔ ہاتھ اوچھے پڑنے لگے۔

پھیرا بدستور کام کرتے ہوئے آہستہ سے بولا: "گھبراؤ نہیں بیگو! تم تھک جاؤ گی تو میں اکیلا نپٹ لوں گا۔ میرے سینے میں میرا دم، میرا ایمان ہے۔ اور اگر ایمان مضبوط ہو تو انسان پہاڑوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔"

یہ سُن کر بیگم جان کے جُثّے میں قوت عود کر آئی۔ ہاتھ بجلیاں بن کر کوندے بھرنے لگے۔ دو سو روپے کے سکّوں کی جھنکار کانوں میں امرت رس گھولنے لگی۔ اُدھر پانسا پلٹ گیا۔ ایک سیاہ فام کاریگر سب سے آگے نکل گیا تھا۔ پھیرا تیسرے نمبر پر تھا۔ ڈھول کی شہ پا کر سیاہ فام کاریگر کا انگ انگ پھڑک اُٹھا۔ اُس کی صحت مند ساتھن کی آنکھیں ہمت اور ارادے کی لَو دینے لگیں سبتے بلتے۔ جیو مائی کے لال۔ ایک کہرام مچ گیا۔ وہ شور، گہما گہمی گھنٹوں جاری رہی۔ پہلا ڈھولکیا تھک گیا تو دوسرے نے اُس کی جگہ لے لی۔ بیچ بیچ میں کاریگر پانی پی لیتے۔ کوئی کمر سیدھی کر لیتا۔ کوئی انگلیاں چٹخا لیتا۔ جنگ جاری تھی مگر کام کی رفتار سُست پڑ گئی۔ آہستہ آہستہ ہاتھوں کی حرکت ڈھول کی آواز کا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگی۔ ٹھیکیدار نے میدان کا جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ ایک مہینے کا کام ایک دن میں ہو گیا تھا۔ اور اب اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ہونے والی تھی۔ ایک ہی رفتار پر کام کرتے ہوئے پھیرا سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب وہ چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ اُس کے سینے میں اُس کا دم اُس کا ایمان تھا اور اُس کا مضبوط ایمان ایک عجیب و غریب رفتار اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ بیگم جان تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ صرف سیاہ فام جوڑا پھیرے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ باقی تمام کاریگروں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے پتھیرے کے ہاتھ بھی کام کرنے سے انکار کر رہے ہوں، جیسے اس کی انگلیوں میں شیشہ بھر گیا ہو، جیسے اندھیرے میں کوئی ٹٹول رہا ہو۔ پتھیرے کا مقابلہ کرنے والا آخری جوڑا دفعتاً رک گیا۔ جیسے ان کے سامنے کوئی بلند پہاڑ آ گیا ہو۔ سیاہ فام اور اس کے ساتھی شکست قدموں سے چلتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔ گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ ڈھول کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

"پتھیرا جیت گیا! پتھیرا جیت گیا!" ہر طرف شور مچ گیا۔ لوگ میدان میں ناچنے لگے۔

ڈھولکے کی شوخ، باغیانہ اور تیز و تند چوٹیں۔ ناچنے والوں کے بول، چیخ پکار۔ مستی میں آئے ہوئے انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"ہم جیت گئے ہیں۔ اٹھو اب گھر پہنچ کر آرام کرنا۔" بیگم جان نے پتھیرے کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

پتھیرا زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیگم جان خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پتھیرے کو اٹھا رہی تھی۔

"جیو مائی کے لال!"

گاؤں کا حکیم ہجوم سے نکل کر آگے بڑھا۔ اس نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر پتھیرے کی آنکھیں دیکھیں، نبض ٹٹولی، اور پھر سر ہلاتے ہوئے اپنی سفید چادر پتھیرے پر ڈال دی۔

سناٹا چھا گیا۔

بیگم جان کو یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ اس میں دھنسی جا رہی ہو۔ بیگم جان کی ایک چیخ سنائی دی اور وہ پتھیرے کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

"پتھیرا جیت گیا" اس آواز سے میدان گونج رہا تھا۔ اس گونج میں بیگم جان کی نحیف اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی——

"نہیں، پتھیرا ہار گیا۔ ٹھیکیدار جیت گیا ہے۔"

فاصلے

مختار مسعود

میرا دفتر شہر کے بارونق حصے میں بڑی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک بوسیدہ عمارت میں واقع تھا۔ یہ دو منزلہ بارک لکڑی اور کھپریل کی بنی ہوئی تھی کسی زمانے میں کھپریل سرخ ہوئی اور لکڑی سبز مگر اب تو شہر کی گرد اور زمانے کی گردش نے انہیں خاکستری ہی نہیں بلکہ سیاہی مائل کر دیا تھا۔ یہ بارک عالیشان بنگلوں سے گھری ہوئی تھی جن کی کھڑکیوں سے کولر سر باہر نکالے دن رات گنگناتے رہتے، ادھر کسی کا وہ عالم تھا کہ ہر محراب اور روشندان میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کبوتر یوں پھڑپھڑاتے رہتے، گویا یہ ویرانہ انہی کے دم سے آباد ہے۔ یہ عقدہ بھی اسی دفتر میں کھلا کہ مہاجر اور کبوتر ہر دو کے لئے کسی عمارت پر تصرف کس قدر آسان ہے۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا، سیڑھیوں کے بعد برآمدہ شروع ہوتا جس کے ایک کونے میں لکڑی کی اوٹ کی دوسری طرف ملاقاتیوں کے لئے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں ایک بوڑھا پہرے دار ملنے والوں کی جانچ پڑتال کرتا، یہ چہرے اور جوتے دیکھ کر بتا سکتا کہ کون مالدار ہے اور کون معزز۔ یہ چہرے مہرے سے سائل اور سفارشی، چال ڈھال سے سول اور فوجی اور محض کالر سے کلرک اور افسر میں تمیز کر لیتا، البتہ سمگلر اور لیڈر میں کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتا سبھی ملاقاتی اس سے گرم جوشی سے ملتے، کچھ لوگ مصافحہ کے لئے بند مٹھی بڑھاتے اور کچھ سگرٹ پیش کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے تاکہ اسے پیکٹ سے دو چار سگرٹ نکالنے میں زیادہ ڈھٹائی نہ دکھانی پڑے۔ دو چار ملاقاتی صوفوں پر بٹھا دیئے جاتے اور بیشتر برآمدے میں لکڑی کے کٹہرے سے ٹیک لگائے کھڑے رہتے، عام طور پر ان کی باری دیر سے آتی اس لئے وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتے، پہلے دانتوں سے ناخن تراشتے پھر ناک میں انگلیاں دیتے رہتے، اس کے بعد مہنگی بیڑیاں یا سستے سگرٹ سلگاتے جاتے، پھر دیر تک تھوکتے اور کھنکھارتے رہتے یہاں تک کہ گلا خشک ہو جاتا اور وہ کٹہرے سے ٹیک لگائے اونگھنے لگتے۔

ملاقاتیوں کی نشست کے ساتھ ہی میرے کمرے کا دروازہ تھا۔ یہ عام طور پر بند رہتا اور اس کے آگے بھاری پردے پڑے رہتے تیز ہوا یہاں ہمیشہ چلتی مگر صرف پردے کی سلوٹوں اور میری پیشانی کی شکنوں میں اضافہ کر سکتی۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے بیشتر دروازے مستقل بند تھے۔ کچھ دروازے سیاہی مائل گہرے سبز پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور بعض کے آگے بھاری بھرکم آبنوسی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے تو چوڑے پیندے اور لمبے ڈھانچے والی الماری دیکھتے ہی ملکہ وکٹوریہ یاد آ جاتی ہے جس کی تصویر کبھی ہر قاعدے میں اور بت ہر چوک میں مل جاتا تھا۔ میرے دفتر کی آبنوسی الماریوں میں عہد وکٹوریہ کے ان دقیانوسی قوانین کی ضخیم اور مجلد کتابیں پڑی تھیں جو منسوخ ہوئی توڑے جا چکے ہیں بلکہ ان کو توڑنے والے ادارے بھی کئی بار توڑے جا چکے ہیں۔ میں نے ان کتابوں سے کبھی استفادہ نہیں کیا کیونکہ میں قوانین کے سلسلے میں صرف روزناموں کو مستند

رہتا ہوں۔ کمرہ بہت بڑا تھا اور اس کے ایک سرے پر کھڑکی کے پاس میں نے میز جما رکھا تھا۔ بسا اوقات میرے ہوتے ہوئے بھی یہ کمرہ خالی خالی سا لگتا لہٰذا اس احساس کو دور کرنے اور کسی اور احساس کو تقویت دینے کے لئے میں نے یہ چارلس نیپیئر سے لے کر اپنے پیشرو تک کے نام ایک خوشنما تختے پر لکھ کر آویزاں کر دیئے۔ سٹور روم سے چند بھدی رنگین تصویریں بھی نکل آئیں اور انہیں بھی دیدۂ عبرت بنانے کے لئے میں نے کمرے میں سجا دیا۔ یہ قد آدم تصویریں ان فرنگیوں کی تھیں جنہیں کبھی ہم بھی قد آور سمجھا کرتے تھے۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ اس کمرے کا فرش لکڑی کا تھا۔ ساگوان کے پتلے اور لمبے ٹکڑے اس قرینے سے جڑے ہوئے تھے کہ ان پر دری اور قالین بچھانے کی ضرورت ہی نہ تھی، یہ چوبی فرش مجھے اس کمرے کی سب سے نمایاں خصوصیت معلوم ہوئی اور میں بہت جلد اس سے مانوس ہو گیا۔ اگر میں سر جھکائے فائل دیکھ رہا ہوں اور ایک سایہ کاغذوں پر آ جائے تو میں سر اٹھائے بغیر جان جاتا تھا کہ شفیق آئے ہیں، دبے پاؤں پنجوں کے بل سمٹے سمٹائے یہ اس طرح کمرے میں داخل ہوتے کہ ان کی چاپ تک چوبی فرش میں جذب ہو جاتی۔ کھٹ کھٹ کی نپی تلی آواز آتی تو میں سمجھ جاتا کہ محسن علی آئے ہیں، یہ ہمیشہ اچھے سوٹ اور نئے بوٹ پہنتے اور بوٹوں کی صرف ایڑیاں استعمال کرتے۔ کبھی کبھی سارا فرش ہلنے لگتا اور لکڑی چیخنے لگتی، میں سمجھ جاتا کہ خان بہادر صاحب آئے ہیں، اگر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ پہلے ہی کیا کم وزنی تھے، جواب عجیب ہم ہر روز نئے سنگ بنیاد لئے پھرتے ہیں۔ فرش پر ننگے پاؤں کی سرسراہٹ ہوئی، میں نے جان لیا کہ پٹہ دار آیا ہے۔ اس نے میز پر ایک چٹ رکھی، ملاقاتیوں کا وقت شروع ہونے میں ابھی بہت دیر تھی، یہ صبح سویرے یوں چٹ لے آنے کا کیا مطلب، میں نے غصے سے سر اٹھایا، سر اٹھا ہی رہ گیا اور غصہ نہ جانے کہاں چلا گیا، چٹ پر ناپختہ قلم سے لکھا تھا ——— شیریں، لیلےٰ اور عذرا

چند دنوں سے تین عورتیں مجھے ہر روز ملنے آتیں، ان تینوں کا کام ایک سی نوعیت کا تھا اور اگرچہ یہ شہر کے مختلف حصوں میں رہتی تھیں مگر میرے دفتر کے باہر باقاعدگی سے جمع ہوتیں اور پھر اکٹھی ہو کر مجھے ملنے آتیں۔ ان عورتوں سے میری ملاقات ذرا معمول سے ہٹ کر ہوتی۔ عموماً مہربان دوست تعارف کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کبھی بلی کے بھاگوں چھینکا خود ہی ٹوٹ جاتا ہے، کبھی سینما یا سفر میں نشستوں کی ترتیب رنگ لاتی ہے، کبھی ہوٹل یا کلب میں بازی لگ جاتی ہے، شہر کی بارونق سڑکوں پر بھی راہ و رسم کے مقامات آتے ہیں، ٹیکسی اور تانگے بھی آپ کو منزل مقصود تک پہنچا سکتے ہیں، پکنک گاہوں میں بھی پینگیں بڑھانے کا سامان ہوتا ہے سمندر کے کنارے ہر ایک کا دل ڈوبتا اور ڈولتا رہتا ہے، نمائش میں تو سبھی نمود کیلئے بےقرار ہوتے ہیں، ٹیلیفون کا غلط نمبر ہی بعض اوقات صحیح نمبر نکلتا ہے۔

چند روز ہوئے دفتر کے باہر میدان اور سڑک کو گھیر کر قناتیں اور شامیانے لگائے گئے۔ شامیانوں کے نیچے کرائے کی کرسیاں بچھائی گئیں اور ایک کونے میں چند کرسیوں پر "برائے خواتین" کی چٹ بھی لگائی گئی۔ سامنے ڈائس سجائی گئی، یوں تو یہ عام سی ڈائس تھی مگر اس کی ترتیب کچھ مختلف تھی۔ بیچ میں ایک میز اور کرسی تھی، کرسی کی پشت اونچی اور سیٹ گہری تھی، میز پر جو دو گلدان تھے ان میں موسم کے پھول لگے ہوئے تھے مگر جتنے بے موسمی ہو سکتے ہیں وہ میز پوش پر کاڑھے ہوئے تھے، ڈائس کے دائیں جانب کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں جانب دفتر سجا ہوا تھا اور ڈائس کے درمیان مائیکروفون کی تاروں سے بچا کر تین بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے، ایک نیلا تھا دوسرا پیلا اور تیسرا سبز، تینوں میں تالے لگے ہوئے تھے اور تالوں پر مہریں تھیں۔

صبح سویرے لوگوں کا تانتا بندھ گیا، لوگ ہر طرح کی سواری پر آ رہے تھے، عام طور پر وہ سواری کو دور کھڑا کرتے اور

پیدل چل کر شامیانے میں پہنچتے، کبھی کبھی کوئی لمبی کار والا اسے شامیانے کے نزدیک لے آتا اور جونہی لوگ اسے گھورتے وہ فوراً ہجوم میں گم ہو جاتا۔ لوگ اجلے اجلے کپڑے پہنے تھے، سر ڈھکے ہوئے اور کاندھوں پر چادر یا بڑا رومال ڈالا ہوا تھا۔ شامیانے میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ اور عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بالآخر مقررہ وقت پر شفیق صاحب نے مائکروفون سنبھالا اور بولے "خواتین و حضرات حج کے لئے قرعہ اندازی شروع کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ...." اعلان کا باقی حصہ درود و سلام میں ڈوب گیا، نام نکلنے شروع ہوئے پہلے چند ناموں کا بھی خوشی سے استقبال کیا گیا مگر جلد ہی انہیں اپنی اپنی فکر لاحق ہونے لگی سیٹیں کم تھیں اور عرضیاں زیادہ اس لئے بامراد کم ہوئے اور نامراد زیادہ صبح سے دوپہر دوپہر سے سہ پہر سہ پہر سے شام ہونے کو آئی مگر لوگ اسی طرح جمے بیٹھے رہے عماموں کی کلف یا قمیضوں کی استری کا ذکر ہی کیا، صبح کے کھلتے ہی ڈھلتے ہوئے آفتاب شام تک غروب ہو گئے اور امیدوں کی کتنی ہی کرنیں شفق رنگ ہو گئیں جہاں صبح عطر ہی عطر تھا وہاں دوپہر کو پسینے چھوٹے اور شام کو آنسو بہہ نکلے۔ بالآخر اعلان ہوا۔ "یہ آخری سیٹ تھی اب قرعہ اندازی ختم ہوتی ہے۔" اس اعلان کے ساتھ ہی ہجوم جو دن بھر ضبط کئے بیٹھا تھا آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا اور میں نے کئی آنکھوں سے شعلے نکلتے اور لاوا بہتے دیکھا۔ مجمع چھٹنے لگا کوئی چارخانہ رومال سے منہ پونچھ رہا تھا۔ کوئی عرضیاں اور رسیدیں سنبھال رہا تھا، چند انگڑائیاں لے رہے تو چند مائیں بدھی کر رہے تھے، کچھ لوگ واپسی کے لئے تیزی سے دو چار قدم بھی اٹھا چکے تھے، یکایک خواتین کی نشستوں سے کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح آواز آئی۔

"میرا نام کہاں ہے، مجھے اجازت کیوں نہیں ملی، تم خدا کے احکام پہ قانون کی پابندی لگانے والے کون ہوتے ہو۔ یہ پاکستان ہے یا ...."

مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا، ہر شخص کے قدم جہاں پڑے وہیں گڑ گئے، سبھی نے مڑ کر اس عورت کو دیکھا جواب رکھتے ہی بن نہ آتی تھی، بلند اور پاٹ دار آواز میں اس نے چیخ چیخ کر عمر بھر کی داستان سنا دی۔

یہ سیاہ رنگ کی مکرانی عورت تھی۔ ڈیل ڈول میں لمبی چوڑی، بھرا بھرا جسم، بڑے بڑے ہاتھ پیر، ناک چھوٹی اور چپٹی منہ کشادہ اور دانت لمبے، اس کی آنکھیں ڈراؤنی تھیں جنہیں وہ دیر تک بغیر جھپکے کھولے رکھتی۔ اس نے بوہروں کی طرح فراک پہنا ہوا تھا جو ٹخنوں کو چھو رہا تھا، اس سیاہ پھول دار فراک کے نیچے میلا سا پاجامہ تھا، شاید وہ ننگے پاؤں تھی مگر اس کے سر پہ جو پھٹا ہوا دوپٹہ تھا اس کی کئی تہوں میں اس نے اپنے جسم کو لپیٹا ہوا تھا، وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی اس نے سینے پہ دوہتڑ مارنے شروع کر دئے اور اس کے منہ سے کف نکلنے لگا، ذرا سی دیر میں اس نے آسمان سر پہ اٹھا لیا اور ایسا لگا جیسے وہ ابھی اسے زمین پہ دے مارے گی۔ میں نے ہمت کی اور اس کے پاس چلا گیا۔ وہ میری بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھی، اور سنتی بھی کیسے وہ مدت سے ماہی گیروں کے گاؤں میں خاموشی سے زندگی بسر کر رہی تھی مگر صبر و شکر کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ پچاس برس پہلے وہ ایک جھونپڑی میں پیدا ہوئی۔ اور اگر اس نصف صدی میں اس کی زندگی میں کچھ ہلچل آئی تو صرف اتنی کہ وہ اسی بستی کی ایک جھونپڑی سے نکل کر دوسری جھونپڑی میں آ گئی۔ عمر بھر یوں تنگی ترشی سے گزر کرنے کے بعد اس نے صرف ایک خواہش کی مگر وہ بھی قانون سے ٹکرا کر حسرت بن گئی۔ وہ مدتوں خاموشی سے سلگنے کے بعد یکایک اپنی مایوسیوں کی مشعل لئے دو جہان کو آگ لگانے نکل پڑی اور یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، بہرحال جب گھن گرج ختم ہوئی اور بادل بہہ نکلے تو میں نے اسے کل دفتر آنے کے لئے کہا،

بڑی دیر منانے کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ وہ صبح مجھے دفتر میں ملنے آئے گی۔

بات ختم ہوئی تو کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کوئی جہاز کمپنی کا نام پوچھتا تو کوئی روانگی کی تاریخ، کسی کو ادارہ کی نوکری تھی تو کسی کو ہم سفر کی تلاش، کوئی مذہبی مسئلہ پوچھتا تھا تو کوئی سرکاری قانون۔ میں حتی الامکان ضابطے کے مطابق جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا جن کے تسلی بخش ہونے کا مجھے یقین ہے۔ سوال و جواب نے طول پکڑا اور ہمارے حلقے میں کچھ عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ جن میں بیشتر خاموش تھیں مگر چند ایک تو ان کے حصے کی باتیں بھی کر رہی تھیں، چونکہ کئی لوگ بیک وقت باتیں کر رہے تھے اس لئے شور کافی تھا۔ یکا یک میں نے جھرمٹ میں ایک نورانی چہرہ دیکھا اور رک گیا۔ وہ عورت دیر سے مجھے بیٹا بیٹا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھے بغیر اسے دلاسہ بھی دے چکا تھا۔ کہ اس کی بات سنی جائے گی، اب جو میں نے اس کی طرف دیکھا تو نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

یہ عورت پچاس سے اوپر ہو گئی اس نے ایک سپید میلا ٹوپی دار برقع پہنا ہوا تھا جس کا تھوڑا سا حصہ اٹھا کر ٹوپی پر رکھا ہوا تھا۔ اور باقی گھیر میں اپنی غربت چھپائے کھڑی تھی، اس کے پاؤں میں ایک پرانی جوتی تھی جس کی ایڑیاں اس نے بٹھائی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ جھریوں کے باوجود دمک رہا تھا۔ وہ بکھرے ہوئے سفید بالوں اور آدھے گرے ہوئے دانتوں کے باوجود خوبصورت تھی، وہ بے حد گوری تھی، اس کے نقش باریک اور اس کی جلد شفاف تھی، مونہہ کچھ پوپلا اور ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

”بیٹا مجھے ضرور بھیج دے، میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں، اللہ تیرا بھلا کرے۔

وہ پنجابی لہجے میں بولتی تھی اور اس کی بوڑھی رگوں میں کشمیری خون دوڑ رہا تھا، وہ عورت بولتی کم اور روتی زیادہ تھی۔ جب اس کی ہچکی بندھ گئی تو میں نے اسے دلاسہ دیا اور کہا صبح میرے دفتر میں آ جانا، اس نے آنکھیں اوپر اٹھا کر بڑی سادگی سے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے، تم کون ہو، تمہارا دفتر کہاں ہے، کیا مجھے کوئی اندر آنے دے گا؟ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دفتر سے بہت دور رہتی ہے اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے پیدل آئی ہے۔ اس کو کل پھر اتنی مسافت طے کرنی پڑے گی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ رات وہیں دفتر کے باہر سو رہے۔ اس نے نصف صدی برتن مانجھ مانجھ کر جو پیسے جوڑے تھے، انہیں بسوں پر ضائع کرنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ چونکہ اس کی بوڑھی ٹانگوں نے ابھی زندگی کا بوجھ کچہری روڈ سے بیاری تک اٹھائے جانا تھا اس لئے میں نے اسے جلد رخصت کیا اور صبح وقت پر پہنچنے کی تاکید کر دی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر دکھائے، یہ ایک بھیانک منظر تھا، پچاس سال تک برتن مانجھے جائیں تو ہاتھ محض چھالوں بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان ہاتھوں سے کمائے ہوئے پیسے کو بھی شاید ہاتھوں کی میل کہتے ہوں گے۔

بہت سے لوگ جب کئی بار وہی باتیں پوچھ چکے جو دن بھر بار بار لاؤڈ سپیکر پر دہرائی جا چکی تھیں تو بھیڑ خود بخود چھٹنے لگی میں نے سوچا اب کوئی کام باقی نہیں اور تھوڑے بہت لوگ جو ادھر ادھر کھڑے ہیں وہ محض میری رخصت کے منتظر ہیں اس لئے مجھے چلنا چاہیئے۔ میں نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ کسی نے سامنے سے راستہ روکا، ایک اور عورت ہاتھ میں کاغذات لئے کھڑی تھی۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں، وہ اپنی سوتی ساڑھی کے پلو سے انہیں خشک کر رہی تھی مگر وہ خشک ہونے میں کب آتی تھیں۔ یہ ادھیڑ عمر کی سادی سانولی سی عورت تھی، اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کا معمولی سا پرس اور دوسرے میں ٹاٹ کا صاف سا تھیلا اور کچھ کاغذات تھے۔ میں نے سر جھکایا تو نظر اس کی کم قیمت اور پرانے ڈیزائن کی سیاہ گرگابی پر ٹھہر گئی۔ میں نے پوچھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں“؟

اس کی گویائی جواب دے چکی تھی اس لئے میرا سوال اندھیرے میں کھو گیا۔ ایک طویل لمحے کے بعد اس نے غمناک پلکیں اور سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا تو آپ کل صبح دفتر میں مل لیں۔"

اس نے خاموشی سے ساتھ چھوڑ دیا اور میں دفتر کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ شام پڑ چکی تھی، عمارت میں کافی اندھیرا تھا اور صرف دو چار چندھے بلب چوکیداری کر رہے تھے، بوجھل قدموں کی چاپ برآمدے اور سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی کمرے تک میرا پیچھا کرتی رہی، اس اجنبی آواز سے گھبرا کر میں رک گیا، سامنے دیوار پر سر چارلس نیپئر کی تصویر لگی ہوئی تھی، یہ وہی سر چارلس ہیں جنہوں نے سندھ فتح کرنے پر حکومت کو تار برقی سے اطلاع دی کہ آج مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے۔

یہ تینوں عورتیں اس واقعے کے بعد روز میرے دفتر آتی تھیں اور آج بھی انہیں آنا ہے لیکن یہ چٹ جو چپڑاسی ابھی میز پر رکھ گیا ہے اس پر جو نام لکھے ہیں وہ ان کے تو نہیں ہیں، میرے پاس تو محمد بی بی، برکت بی بی اور بیگم، روشن دین آیا کرتی ہیں، یہ شیریں، لیلیٰ اور عذرا کون ہیں۔ میں نے چپڑاسی کو اشارہ کیا کہ انہیں اندر بھیج دو اور خود کسی فائل میں گم ہو گیا، چوبی فرش سے کٹ کٹ کر مہین مگر واضح آوازیں اٹھنے لگیں۔ اونچی ایڑیاں اور وہ بھی آہنی اور دو چار نہیں بلکہ چھ عدد فرش پر چل رہی تھیں، لہٰذا وہ پکار پکار کر ان کے آنے کی خبر دے رہا تھا، یہ چوبی فرش خاکسار سہی مگر جہاندیدہ ہے آوازیں بند ہوئیں، میز پر کچھ تو سایہ بڑھا اور کچھ خوشبو کے جھونکے آئے، میں نے ان جھونکوں کو کرسی پیش کی اور فائل مکمل کرنے کے لئے چند لمحے مانگے، میں بظاہر فائل میں گم تھا اور دراصل اسی ادھیڑبن میں لگا تھا کہ یہ کون ہیں اور کیا چاہتی ہیں۔

شیریں، لیلیٰ اور عذرا تینوں جوان تھیں یا یوں کہئے ایک نوخیز، ایک نوجوان اور ایک جوان تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق ایک سترہ برس، دوسری بیس اور تیسری پچیس کی ہو گی۔ شیریں سب سے بڑی تھی، گدرے جسم بڑے بڑے کولھوں اور گول چہرے والی، اس نے سرخ ریشمی ساڑھی کے نیچے بغیر آستین کا مختصر سا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اس کے گورے بدن کی ایک قاش بلاؤز اور جمپر کے درمیان پھنسی ہوئی تھی، اس کے بال کٹے ہوئے اور ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے لاپروائی سے ساڑھی کا پلو یوں ڈالا ہوا تھا جیسے ایک ہی وقت میں خود اعتمادی اور خودنمائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اس کے سینڈل، پرس، رسٹ واچ، نیل پالش اور لپ اسٹک سبھی کا رنگ ایک تھا اور یہ موزونیت اس کی جاذبیت کو بڑھا رہی تھی، لیلیٰ سانولے رنگ اور تیکھے نقشوں والی لڑکی تھی، اس نے چست قمیض اور تنگ شلوار کے ساتھ گلے میں بل مار دوپٹہ ڈالا ہوا تھا، اس کی گردن صراحی دار اور انگلیاں مخروطی تھیں، اس کا جسم اگر مصور کے لئے تھا تو کمر شاعر کے لئے، اس کے بال سامنے سے گھنگریالے تھے مگر اس نے اصلی بالوں کی نقلی چوٹیاں باندھی ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں کے گرد سبز ہالہ بنا ہوا تھا اور سیاہی کی ایک لکیر آنکھوں کے گوشوں سے نکلی ہوئی تھی۔ اس نے بھوئیں نوچی ہوئی تھیں اور وہاں سیاہ پنسل سے ایک محراب بنائی ہوئی تھی۔ نہ اس کی پلکیں اپنی تھیں اور نہ ہی ناخن، معلوم نہیں اور کیا کچھ مصنوعی ہو گا مگر مجموعی طور پر وہ ایک ایسا موزوں مصرع تھی جسے دیکھ کر ہر ایک کو گرہ لگانے کی سوجھتی۔ عذرا تو وہ دبلے جسم اور گورے رنگ کی لڑکی تھی، اس نے سیاہ جین اور پیلا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور سارے بال [illegible] جھلملا رہا تھا، اس نے جالی کا ایک شاپنگ بیگ گود میں لیا ہوا تھا جس میں

تینوں لڑکیاں بڑے اطمینان سے میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، میں نے جس کی طرف دیکھا وہ مجھے بھری ہوئی دو نالی بندوق نظر آئی ان کی نگاہیں بے باک تھیں، باتیں البتہ وہ رک رک کر بڑی ادا سے کرتیں۔ ان کے معنی خیز جملے کبھی ادھورے تھے جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کو آنکھوں سے دیکھتیں پھر دیر تک مسکراتی رہتیں، کبھی کبھی مسکراہٹ گوشۂ چشم سے پھیل کر ہونٹوں تک پہنچ جاتی، خون کی رنگت میں لتھڑی ہوئی قاشیں جدا ہوتیں اور موتیوں کی لڑیاں جگمگا اٹھتیں۔

جب گفتگو شروع ہوئی تو میں نے سنجیدہ انداز میں پوچھا

" میں آپ کی کیا خدمت ادا کرسکتا ہوں۔

جواب میں وہ مسکرا دیں، اور ایک نے کہا۔

" ہاؤ سویٹ آف یو"

میں ابھی سنبھلا نہ تھا کہ شیریں بولی

" خدمت تو ہمیں کرنا چاہیئے جو آپ کے پاس چل کر آتے ہیں ہمیں آپ سے کام سے بھی اور نہیں بھی، دراصل ہم نے آپ کی شہرت سنی تو یوں ہی ملنے آگئے ورنہ ...." شیریں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

" ہمیں آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق" ببلے نے کہا

" اور میں تو صرف آپ کو دیکھنے آئی ہوں" عذرا بولی " سنا تھا ...."

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے غیر ارادی طور پر پی۔ اے سے صرف اتنا کہا کہ میں کسی کال کے لئے فری نہیں ہوں۔ میں نے ریسیور رکھا تو تینوں لڑکیاں فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھیں۔ مجھے وہ اچھی لگیں مگر کافی جھنجھلاہٹ ہوئی۔

میں نے اپنے وقت اور گفتگو کے رُخ کو ان لڑکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، یہ سوچے بغیر کہ جس ملاقات کی یہ ابتدا ہو اس کی انتہا کتنی جلد ہوسکتی ہے اور کون کون سے روگ لگا سکتی ہے ہم لوگ دیر تک بڑے خوشگوار ماحول میں گپ کرتے رہے، کافی کا دور بھی چلتا رہا، بات سے بات نکلتی رہی اور ہم ایک دوسرے کے قریب اور قریب تر ہوتے چلے گئے۔ بے تکلفی اور گرمجوشی بڑھتی گئی، قہقہے کمرے میں تیرنے لگے، میرے علم میں بھی خوب خوب اضافہ ہوا۔ شیریں ڈرائیونگ اور سومنگ کی شوقین ہے، ببلے پینٹنگ، اور پکنک پسند کرتی ہے، عذرا وائلن، چاکولیٹ اور ریڈیو سیلون کی رسیا ہے۔ یہ تینوں ایک فیشن ایبل ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی ہیں، ان کے یہاں ٹیلیفون بھی ہے اور دو موٹریں بھی ہیں۔ یہ لوگ ڈنر کے لئے اکثر ائیرپورٹ جاتے ہیں اور وہاں رات گئے تک مختلف ملکوں سے آئے ہوئے طرح طرح کے جہاز اور مسافروں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ چند پائلٹ ان کے جاننے والے ہیں اور جب ان کے جہاز آتے ہیں تو پھر یہ صبح سے پہلے واپس نہیں آسکتیں۔ شیریں نے بتایا کہ اُسے ایکٹر اور پائلٹ بہت پسند ہیں ببلے کرکٹ کے کھلاڑیوں پر جان دیتی ہے اور عذرا کا ہیرو صرف جمی ہے جمی کے بارے میں بات ہنسی میں ٹل گئی اور میں یہ بھی نہ جان پایا کہ وہ کالج کا لڑکا ہے یا کوئی پالتو چیز۔

یہ تو ظاہر تھا کہ تینوں لڑکیاں کھاتے پیتے اور آزاد گھرانے کی تھیں اور بہر طور ماڈرن کہلا سکتی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے ان کا تجربہ کہیں زیادہ وسیع اور گہرا تھا، وہ نیم وا آنکھوں متبسم لبوں اور ادھ کھلے جملوں کے اثر سے واقف تھیں اور ان کا برمحل استعمال کرتی تھیں۔ دیر تک وہ مکڑی کی طرح ایک نقرئی جال بنتی رہیں اور میں سب کچھ جانتے بوجھتے اس میں پھنستا رہا۔ دو ایک بار جی کڑا کر کے میں نے

اس حالت سے نکلنے کی کوشش ہوئی مگر ہر کوشش عذرا کے ہونٹوں، لیلیٰ کی زلفوں اور شیریں کے ننگے پیٹ کی تلاش سے ٹکرا کر ناکام ہو گئی۔ وہ چلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ میں بھی تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ رسمی کلمات کے ساتھ میں ان سے ہاتھ ملا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ آخر کس کام سے آئی تھیں۔ وہ تینوں یکایک غمگین بننے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا، ہم بڑی دکھی ہیں اور آپ سے بڑی امیدیں لے کر آئی ہیں۔ میں نے کام کی نوعیت پوچھی تو عذرا بولی۔

"پہلے وعدہ کیجئے کہ کر دیں گے۔"

میں نے سوال دہرایا تو لیلیٰ نے کہا۔

"معمولی سی بات ہی تو ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو شیریں نے بات پوری کر دی۔

"دیکھئے نا ہماری ممی کو جیل ہو گئی ہے آپ سپرنٹنڈنٹ کو کہہ دیں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

میں ایک طویل سکتے کے بعد سنبھلا اور صرف اتنا پوچھا کہ جیل کیوں ہو گیا۔ معلوم نہیں کس نے جواب دیا کہ سمگلنگ کا کیس تھا، تھوڑا سا سونا اور کوکین بنگلے سے نکلی تھی۔

وہ رخصت ہوئیں تو میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور گہرا سانس لیا۔ میز پر کافی کی خالی پیالیاں پڑی تھیں، ایش ٹرے میں شیریں نے سگریٹ کے جو ٹکڑے پھینکے تھے اُن سے دھواں نکل رہا تھا۔ شیلف پر فائلیں جمع ہو گئی تھیں۔ کلاک پر نظر پڑی تو مجھے حیرت ہوئی کہ وقت دبے پاؤں اتنا آگے نکل گیا تھا۔

پٹے دار نے سلام کیا اور میز پر ایک چٹ رکھی۔ میں نے بڑی بے دلی سے اس پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا — محمد بی بی، برکت بی بی، اور بیگم روشن دین۔

اڑان اپنی اپنی

امر سنگھ

وہ ماں کے بستر میں اکڑوں پڑا تھا۔ ماں کا پلنگ اُسے ہمیشہ ہی اچھا لگتا۔ جب ماں بھی اس میں ہوتی تو یہ ایک طرح کی آسودگی دیتا اور جب ماں وہاں نہیں ہوتی تب بھی یہ آرام دہ محسوس ہوتا۔ نیند تو بہرحال اپنی پلنگڑی پر بھی آجاتی تھی۔ لیکن جو نیند اس میں گھس کر آتی تھی اُس کی بات ہی اور تھی۔ ویسے اگر نیند نہ بھی آتی اور وہ آنکھیں کھولے اس پلنگ میں دبکا پڑا رہتا تو اسے یہ پلنگ ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک پُرسکون سیارے کی طرح معلوم ہوتا جہاں سے وہ ایک بالکل نئی اور انوکھی دنیا کا نظارہ کرتا رہتا۔

اور یہ دُنیا تھی سامنے والی نانک شاہی اینٹوں کی دیوار جس پر چونے گچ کا پلستر سیلن کی وجہ سے پھول کر اُدھڑ گیا تھا اور سفیدی کی بیسیوں تہوں اور فیروزی اور گلابی رنگ کے ڈسٹمپر کی دو تہوں کے نیچے سے جا بجا جھانکتا نظر آتا تھا۔ پلستر کے مختلف مقامات پر مختلف تہوں تک اُکھڑے ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف اشکال اور رنگوں کے دھبے بن رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھبے عجیب وغریب پیکرات میں ڈھل جاتے اور پھر چھت کے ٹپکنے کے آثار نیلے اور ہرے رنگ کے دریا اور ندیاں تالاب بن کر ان پیکرات کو قدرت کے گوناگوں کھلے نظاروں کے پس منظر مہیا کرکے ایک پوری دنیا کی تشکیل کر ڈالتے۔ جس میں یہ پیکرات ہاتھی، گھوڑوں، شیروں، بکریوں اور ہرنوں، کبوتروں، موروں اور چڑیوں۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی شکلیں اختیار کر لیتے۔ اور پھر اس دنیا کی ایک اور خوبی تھی۔ وہ یہ کہ ایک ہی پیکر اگر اپنے بائیں طرف کے پیکر کے ساتھ مل کر ماں کی گود میں لاڈ کرتے ہوئے بچے کا روپ دھار لیتا تھا تو اپنے دائیں ہاتھ والے پیکر کے ساتھ مل کر درخت کی ٹہنی سے جھولتا ہوا لنگور بن جاتا اور نیچے والے منظر کے ساتھ مل کر ایک سفید ریش بڈھے کا چہرہ۔

اور وہ گھنٹوں بستر میں دبکا ان پیکرات کے جوڑ توڑ کرتا اور ان کو نئے نئے معنی عطا کرکے نت نئی چیزوں کے نظارے کرتا اور محظوظ ہوتا رہتا۔

ایسی حالت میں وہ اس دنیا کے وجود کو بالکل بھول جاتا جو اس مکان کی نچلی چھت پر بستی تھی اور جہاں رہ رہ کر اس کی ماں اور باپ میں چخ چخ ہوا کرتی تھی۔ اور اس ساری دنیا کو بھی فراموش کر دیتا جس کے بیچوں بیچ ماں باپ اور گھر کی یہ دنیا آباد تھی۔ لیکن یہ پُرشور دنیا بار بار اس کی حسین اور پُرسکون دنیا میں گھس کر اس کو تہس نہس کرتی رہتی۔ لیکن بار بار وہ اسے پھر سے بساتا رہتا۔

اس وقت بھی وہ ماں کے بستر میں دبکا سامنے کی دیوار کو تکے جا رہا تھا اور وہ اپنی دنیا کی سیر کرنے میں مصروف تھا کہ اس کی ماں

وہ تین بار آواز لگا چکی تھی کہ وہ اسکول جانے کے لئے تیار ہو جائے لیکن وہ ان آوازوں کی طرف سے کان بند کئے مست مارے پڑا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا۔

— ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے ایک لڑکا (اس کی اپنی عمر کا) ایک ہرنی کے بچے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ ہرنی کے بچے نے اپنے دونوں اگلے کھر اٹھا کر لڑکے کی بڑھی ہوئی ہتھیلیوں پر ٹکا رکھے تھے۔ اور پیار بھری نظروں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک ہرنی گردن موڑے اپنے بچے کا بدن چاٹ رہی تھی .....

"اوئے مدّی ......!"

اور پُر شور دنیا پھر اُس کی پُر سکون دنیا میں آگھسی۔

یہ بلاقی کی آواز تھی جو معمول کے مطابق اُسے اپنے ساتھ مدرسے لے جانے کے لئے آیا تھا۔ اور اس کے دروازے پہ کھڑا آواز لگا رہا تھا۔ یہ آواز اس کے کان سے دماغ اور پھر دماغ سے دل میں چھید کرتی ہوئی گزر گئی اور اس کی حسین دنیا میں زلزلہ آنے لگا۔

"وے مدّی ..... وے مدنا .... وے مدن وے ......!"

اس کی ماں نے لگاتار تین آوازیں لگا کر اس کی دنیا کو بالکل ملیا میٹ کر دیا۔

"آتا ہوں .....!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا اور بے دلی کے ساتھ پلنگ سے اُترنے لگا۔

وہ تو مست مارے پڑا رہتا لیکن اُسے معلوم تھا کہ اب اگر وہ زیادہ دیر یہاں رُکا رہا تو اس کی ماں خود اوپر آجائے گی اور اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے گی۔ اس لئے جلدی سے وہ نیچے اترا۔ اُسے بلاقی پر غصہ آیا۔ لیکن پھر اُس نے یہ سوچ کر غصہ تھوک دیا کہ اس میں بلاقی کا کیا قصور تھا۔ منشی جی نے اس کی ڈیوٹی اسے آواز دے کر مدرسے ساتھ لانے کی لگا دی تھی۔ جسے اگر وہ پوری نہ کرتا تو خود اس کی پٹائی ہو جاتی۔ اور پھر بلاقی اس کا دوست بھی تو تھا۔ اُس کی رفاقت میں بھی تو ایک طرح کی تسلی ملتی تھی۔

"کہاں وڑاں ہو گیا تھا تو .....؟" ماں نے گھرکا اور جلدی سے اس کا بستہ اس کے کندھے سے لٹکا دیا۔ دو ٹکیاں اُسے دکھا کر اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اور مدن من ہی من میں منمناتا دروازے کی طرف دوڑا جہاں بلاقی کھڑا کہہ رہا تھا۔ "اوئے یار ..... جلدی چل نا!"

اسے بلاقی اپنے سبھی دوستوں سے زیادہ اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ ان سب سے مختلف تھا۔ اُس کی ناک کی نتھلی ہلتی دیکھ کر مدن کو ہنسی آگئی۔ بلاقی کا اصل نام رام ناتھ تھا۔ چونکہ اس سے پہلے اس کے چھ سات بھائی مر چکے تھے۔ اس لئے اس کے والدین نے بچپن ہی میں کسی منت کی بنا پر اس کی ناک میں ایک ننھا سا بُلاق ڈلوا دیا تھا۔ اس بلاق کی رعایت سے عرفِ عام میں اس کا نام بلاقی پڑ گیا تھا۔ خوش ہو کر مدن نے بلاقی سے اس کا حال چال پوچھا۔ جس کا جواب بلاقی نے رسمی طور پر دیا۔

اور پھر وہ دونوں مدرسے کی طرف روانہ ہوئے۔

گلی سے نکل کر وہ بازار میں پہنچے۔ گلی کے سامنے حلوائی کی دکان تھی۔ حلوائی گرما گرم پوریاں تل رہا تھا۔ پوریاں تلنے کی خوشبو ناک میں پہنچی تو بے شک وہ پیٹ بھر ناشتہ کر کے آیا تھا (نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد ہی وہ جاڑ [illegible] کے بستر میں جا گھسا تھا کیونکہ مدرسے جا کر اسے بیٹھ کر گھڑیاں گننا تھا) اس کی اشتہا بیدار ہو گئی۔ اس نے تجویز کیا کہ [illegible] جائے۔ مگر بلاقی نے [illegible] کہ مدرسے کو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے اور مزید دیر ہو گئی تو ماسٹر جی [illegible] [illegible] آیا ہے بلاقی

جھاڑ پی کر مدن نے اپنی اشتہا کا گلا گھونٹ دیا اور چپ چاپ بلاقی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

چوک میں شوالے کے ساتھ تیرتھ پتنگ فروش کی دکان تھی۔ پتنگ اڑانے کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے تیرتھ نے خوانچہ لگایا تھا۔ شوالے کی ساتھ والی دکان کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے تیرتھ نے اپنا خوانچہ دکان سے کافی آگے بڑھا کر بازار میں لگا رکھا تھا۔ خوانچے کے بیچوں بیچ اناردانے اور گڑ کو کوٹ کر بنائے گئے معجون نما چورن کا ایک مخروطی مینار کھڑا تھا جسے چاندی کے ورق لگا کر سجایا گیا تھا۔

اس مینار کو دیکھ کر مدن کے دل میں گُدگُدی شروع ہو گئی اور زبان سے رال ٹپکنے لگی۔ اس کا جی چاہا چورن کھایا جائے لیکن ابھی ابھی بلاقی نے اسے جھاڑ پلائی تھی اور اب چورن کا نام لیا تو وہ ایک بار پھر ڈپٹ دے گا۔ لیکن کھٹے کھٹے چورن کا چٹ پٹا ذائقہ اس کی زبان پر گھلنے لگا۔ اور وہ اس کی ترغیب کے آگے بے بس ہو گیا۔ ایک دُزدیدہ نگاہ سے اس نے بلاقی کی طرف دیکھا۔ بلاقی کی نظر بھی چورن کے سیاہ اور بھے مینار پر ٹکی ہوئی تھی۔ ”شاید بلاقی کے دل میں بھی چورن کھانے کی تمنا مچل رہی ہو۔“ مدن نے سوچا اور اُسے کچھ حوصلہ ہوا۔

”بلاقی یار!“ اس نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا، ”تھوڑا سا چورن لے لیں.....؟“ اور وہ بلاقی کے چہرے کو تکنے لگا۔

جی تو بلاقی کا بھی للچا رہا تھا۔ پوری کے معاملے میں تو سوال بھوک اور اشتہا کا تھا۔ مگر یہاں سوال بھوک اور اشتہا کا نہیں بلکہ مزے کا تھا۔ لیکن اس نے مدن کو پوری اس بنا پر نہیں کھانے دی تھی کہ اسکول کو دیر ہو رہی تھی اور اب چورن کھانے پر رضامندی ظاہر کی تو مدن کیا سوچے گا چونکہ اب اپنا جی چورن کھانے کو چاہ رہا ہے اس لئے رُکنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے نیم رضامندی سے چہرے پر نمائش کے تاثرات ئے ہوئے گھور کر مدن کی طرف دیکھا۔

”اس یں کوئی دیر نہیں لگے گی۔“ مدن نے بلاقی کے چہرے پر نمائش کے جھوٹے تاثرات دیکھ کر ملتجیانہ استدلال کے ساتھ کہا ”جھٹ سے چورن لے لیں گے اور چلتے چلتے کھاتے جائیں گے۔“

یہ دلیل اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن گئی۔ بلاقی یوں تو خاموش رہا مگر اس کے قدموں کا رُخ اپنے آپ ہی تیرتھ کے خوانچے کی طرف ہو گیا۔

”بھائی، ٹکے کا چورن دینا!“ مدن کی آواز میں اطمینان تھا۔

ے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ مینار کے ایک حصے سے چٹکی بھر چورن الگ کر کے کاغذ پر رکھا اور مدن کی طرف بڑھا کر بولا،

ے!“

”آگ لگا کر دے نا۔“

”ٹکے کے چورن کو آگ نہیں لگتی۔“ خوانچے والے نے کہا۔

چورن کی لذت تو خیر ہوتی ہی تھی۔ لیکن جب اسے آگ لگتی تھی تو اس کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آگ لگنے سے چورن کا [illegible] ستک مارا جاتا تھا اور اس کا ذائقہ کچھ کسیلا سا ہو جاتا تھا۔ مگر آگ لگتے وقت چورن کی چٹکی پر سے ایک شعلہ لپکتا اور پلک جھپکتے ن نیلے سے گلابی اور پھر بسنتی رنگ میں بدل کر خاموش ہو جاتا کہ بس لطف آجاتا۔ دوسرے ہی پل ہوا میں سفید دھوئیں کا ایک ننھا سا بادل عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتا ہوا پھیلنے لگتا اور پھر ایک آدھ منٹ میں ہوا میں تحلیل ہو کر بالکل نابود ہو جاتا۔ اس ایک آدھ منٹ میں اشکال کی جس [illegible] نظر نواز ہوتی۔ ایک تھرل (THRILL) کا احساس اس کو دیکھنے [illegible] کا اصل [illegible]

"اچھا۔۔ آنہ ایک کا دے دو۔" مدن نے جلدی سے ایک آنہ پیشگی ہی خوانچے والے کو دیتے ہوئے کہا۔

خوانچے والے نے چورن کی ایک چٹکی کا اضافہ کر کے اسے کاغذ پر پھیلایا اور ایک پیڑا سا بنا دیا۔ اس نے ایک شیشی میں سے پوٹاشیم کلوریٹ کا تھوڑا سا سفوف اس پیڑے کے گڑھے میں انڈیل دیا۔ چورن کے پٹار کی چوکی پر اُس نے ایک چھوٹی سی شیشی گاڑ رکھی تھی جس کے کھلے منہ میں ایک سلاخ پڑی تھی۔ اس نے یہ سلاخ نکالی اور گندھک کے تیزاب میں بھیگے ہوئے اس سلاخ کے سرے کے ساتھ پوٹاش کو چھو دیا۔ ایک شعلہ لپکا اور چشم زدن میں نیلا، گلابی، نارنجی اور بسنتی رنگ بدل کر گُل ہو گیا۔ اور پھر سفید دھوئیں کا ایک لچھا ہوا میں چھلاوے کی طرح پھیلنے لگا۔ خوانچے والے نے چورن کی پڑیا بنا کر مدن کے ہاتھ میں تھما بھی دی مگر وہ محوِ تعجب حیرت ہوا اس دھوئیں کو تکتا رہا۔ اسی طرح جس طرح وہ اپنی ماں کے پلنگ کے سامنے والی دیوار کو تکا کرتا تھا۔

دھوئیں کا بادل ہوا میں تحلیل ہو کر ناپید ہو گیا اور مدن پھر اس پُرشور دنیا میں لوٹ آیا۔ اس نے چورن کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کی دو گولیاں بنائیں اور ایک گولی بُلاقی کو دے دی۔ خوانچے سے ہٹتے ہوئے جس وقت مدن چورن کی گولی بلاقی کی ہتھیلی پر رکھ رہا تھا تو اس کی نظر پاس کی مہین مہین تیلیوں سے بنے ہوئے تین فٹ مربع پنجرے پر پڑی جس میں تیرتھے نے مُرغ پال رکھا تھا۔ پنجرے کے وسیع اور لق و دق فرش پر ایک تنہا مُرغ اداسی سے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

مدن کو ایک دم وہ نظم "ایک پرندے کی فریاد" یاد آگئی جو ابھی کل ہی مدرسے میں استاد نے پڑھائی تھی اور لڑکوں سے کہا تھا کہ وہ اسے حفظ کر لیں۔ اور مدن کا دل بے حد اُداس ہو گیا۔ چورن اُسے بدذائقہ سا معلوم ہونے لگا اور اس نے اپنے حصے کا چورن بھی بلاقی کو دے کر کہا،

"لو یار۔ یہ بھی تم ہی کھا لو۔"

بلاقی نے حیران ہو کر مدن کی طرف دیکھا اور اُسے اداس پا کر بولا؛

"کیوں، کیا بات ہے؟ تم کیوں نہیں کھاتے؟"

"میرا جی نہیں چاہتا۔" مدن نے بے چین سا ہو کر جواب دیا۔

"جی نہیں چاہتا! کیوں؟"

"یونہی ——"

"ابھی ابھی تو اتنے شوق سے لیا ہے تم نے؟" بلاقی نے پوچھا۔ "اب ایک دم کیا ہو گیا ہے تمہارے جی کو؟"

"کچھ نہیں!" مدن کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"مدّی ......!" بلاقی نے اُسے اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا "یار کیا ہو گیا ہے تمہیں ایک دم؟"

مدن خاموش رہا۔

"لو یہ چورن کھاؤ!" بلاقی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میری قسم جو نہ کھاؤ تم......... ہاں ہاں چکھو تو سہی آخر

"ہاں!"

"یار، تم نے وہ ..... تیرتھ کا مُرغ دیکھا؟"

"ہاں!" بلاقی نے کہا "کیوں، تمہارا بھی جی چاہتا ہے ایسا مُرغ پالنے کو؟"

"نہیں۔ یار نہیں۔"

"تو پھر؟"

"اسے دیکھ کر میرا دل اُداس ہوگیا ہے۔" مدن جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے بولا۔ "تم نے دیکھا وہ بے چارا کس طرح اکیلا اور اداس ہو کر بیٹھا ہے پنجرے میں؟"

مدن کو سنجیدہ دیکھ کر بلاقی بھی سنجیدہ ہوگیا۔

"ہاں!"

"یار! یہ لوگ کیوں آزاد پرندوں کو قید میں ڈال دیتے ہیں؟" مدن نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"اُن کا شوق ہے۔" بلاقی نے جواب دیا (وہ مدن سے پہلے ہی اپنے دل میں اُٹھنے والے اسی قسم کے سوالوں کے جواب اپنے بزرگوں سے پا چکا تھا اور پوری طرح مطمئن نہ ہونے کے باوجود سعادت مند بچے کی طرح بزرگوں کے کہنے پر صاد کر چکا تھا۔)

"یہ بھی کیا شوق ہوا!" مدن بولا "دوسروں کو دُکھ دے کر خوش ہونا یہ بھی کوئی "انسانیت" ہے؟"

بلاقی کو بھی کل والی نظم یاد آگئی اور اس کا نیم مطمئن دل بے اطمینان ہوگیا۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔

"میرا بس چلے تو" مدن بولا "جتنے بھی پرندے پنجروں میں ہیں، سب کو آزاد کردوں"

"لیکن ہمارے بس میں ہو جب نا!" بلاقی پر بھی اداسی طاری ہونے لگی۔

"بلاقی یار! ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"کیوں نہ ہم تیرتھ سے کہیں کہ وہ اس پرندے کو آزاد کردے۔"

"لیکن وہ ہماری بات نہیں مانے گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس نے مُرغ لڑانے کے لئے پال رکھا ہے۔"

"اچھا تو مرغوں کو لڑاتے بھی ہیں؟"

"ہاں۔ بڑی بڑی شرطیں بد کر۔" بلاقی نے اپنی جانکاری اُنڈیلی "اور تیرتھ کے اس مرغ نے تو کئی پالیاں ماری ہیں۔"

"یہ تو اور بھی بُری بات ہے۔" مدن نے ترس کے جذبے سے پگھلتے ہوئے کہا۔

"ایک تو اِن بے چاروں کو قید میں ڈالتے ہیں۔ اوپر سے انہیں آپس میں لڑاتے بھی ہیں۔ اتنے خوبصورت اور بھولے بھالے پرندوں [illegible] ہے نا بلاقی؟"

"ہاں، ہے تو سہی۔" بلاقی نے حامی بھری۔ "مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

مدن خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

"بلاقی!" مدن کو جیسے بات سوجھ گئی۔ "یار۔ کیوں نہ ہم اپنی کتاب والی نظم تیرتھ کو سنائیں۔ اور جب اس کا دل پسیج جائے تو اُسے کہیں کہ وہ اس مُرغ کو آزاد کر دے۔"

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔" بلاقی نے صاد کیا۔

سامنے مدرسے کا پھاٹک آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اندر چلے گئے۔

یہ ہفتے کا روز تھا۔ چوتھی گھنٹی پر چھٹی ہو جانے والی تھی۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مدن کو بھی یہ جان کر خوشی ہو رہی تھی کہ آج حساب کا اُستاد نہیں آیا تھا۔ اور آخری گھنٹی کیونکہ حساب کی تھی اس لئے چھٹی اور بھی جلدی ہو جائے گی۔ لیکن ان کی خوشی مایوسی میں بدل گئی جب ہیڈ ماسٹر نے چھٹی دینے سے انکار کر دیا اور لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی کتاب میں سے ایک ایک پیرا نقل کر کے دکھائیں۔ اس حکم پر مدن جھنجھلا اُٹھا۔ آخر اس میں کیا تُک ہے۔ نقل کرنے کا کام تو پہلے دوسرے درجے میں ہوتا ہے۔ اور اس کی تو املا میں بھی شاذ و نادر ہی کوئی غلطی ہوتی تھی۔ ایسے لڑکوں کو کتاب پر سے نقل کرنے کا کام دینا سراسر زیادتی ہے۔ بے ضرورت، بے مصرف حروف جھکائے رکھنے کے لئے بٹھائے رکھنا حماقت آمیز ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

خیر کڑوا گھونٹ کر کے اس نے چند ہی منٹوں میں مطلوبہ پیراگراف نقل کر لیا۔ مدن اور بلاقی نے سب سے پہلے جا کر اپنی اپنی کاپیاں ہیڈ ماسٹر کو دکھا دیں۔ اور پوچھا کہ کیا اب انہیں گھر چلے جانے کی اجازت ہے۔ مگر ہیڈ ماسٹر نے ڈپٹ کر انہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جانے کا حکم دے دیا۔

غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے وہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس وقت مدن کو اسکول ایک قید خانہ معلوم ہو رہا تھا جس میں وہ خود ایک مجبور اور بے حس قیدی کی طرح بند تھا۔

چپ چاپ اور بے کار بیٹھے بیٹھے وہ بری طرح بیزار ہو رہا تھا۔ ایک ترنگ سی اس کے دل میں اُٹھی۔ اس نے کتاب کھولی اور "پرندے کی فریاد" نکال کر پڑھنے لگا۔ بلاقی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ دونوں اس نظم کو استاد کی بتائی ہوئی دھن میں گا گا کر پڑھنے لگے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ   وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

. . . .

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے   دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

جوں جوں نظم آگے بڑھتی گئی۔ غم و اندوہ، حسرت و مایوسی کا ایک طوفان مدن کے سینے میں بیدار ہوتا گیا۔ اس نظم کا پرندہ تیرتھ کا مرغ بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اور پھر جیسے مرغ نہیں وہ خود پنجرے میں بند تھا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ قریب تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑیں کہ چھٹی کی گھنٹی زور زور سے بج اُٹھی۔ چاروں طرف شور مچ گیا اور لڑکے اُٹھ اُٹھ کر باہر کو بھاگنے لگے۔ مدن نے جھٹ اپنی کتاب بستے میں رکھی اور بلاقی کی طرف دیکھا۔ بلاقی اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتا ہوا چلنے کو تیار تھا۔

وہ دونوں اسکول سے باہر نکل آئے۔

بازار میں پہنچ کر مدن کی نظر بازار کے بیچوں بیچ جا رہی بھینسے کی گاڑی پر پڑی جس نے اپنے پیچھے شوالے والے چوک کا سارا منظر چھپا رکھا تھا۔ اسے یک لخت یاد آیا کہ اس گاڑی کے عین پیچھے شوالہ ہے۔ شوالے کے اوپر سے گھوم کر اُن کا اپنا بازار آ جاتا تھا۔ جس میں تھوڑی دور جانے پر حلوائی کی دکانوں کے عین سامنے والی گلی میں اس کا گھر ہے اور چند منٹ تک چلنے کے بعد وہ اپنے گھر پہنچ جانے والا ہے تو اس کے دل سے اچانک وہ چھوٹی سی خوشی مفقود ہو گئی جو چھٹی کی گھنٹی بجنے پر اس کے دل میں ایک ننھے سے بلب کی طرح روشن ہو گئی تھی۔

یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو اس کا جی باہر نکلنے کو نہ چاہتا تھا۔ اسکول میں وہ چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کرتا رہتا تھا مگر جب اسکول سے نکل کر بازار میں پہنچتا تو اس کا دل گھر واپس جانے کو نہ چاہتا۔

اس کے قدم رُک گئے۔

"کیا بات ہے، مدن؟" بلاقی نے پوچھا۔ "رُک کیوں گئے؟"

"بلاقی یار! اب گھر جائیں گے کیا؟"

"اور کیا؟"

"یار! ابھی سے گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"تو اور کہاں جاؤ گے؟"

مدن خاموش ہو گیا۔ وہ اور جا بھی کہاں سکتے تھے۔ اور وہ اداس ہو کر بے دلی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

"یار! یہ بازار بھی کتنا چھوٹا ہے!" مدن کو خاموشی جیسے گراں محسوس ہونے لگی تھی۔ "جھٹ ختم ہو جاتا ہے۔"

"تمہارا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا؟" بلاقی نے پوچھا۔

"نہیں!"

"تو میں بتاؤں؟"

"کیا؟"

"تمہارے پاس ایک اکنی ہے نا صبح والی؟"

"ہاں!"

"اور ایک اکنی میرے پاس بھی ہے۔"

"پھر؟" مدن نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا۔

"تو ہمارے پاس ہو گئے دو آنے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تیرتھ کی بھیری پر آٹھ بار داؤ لگا سکتے ہیں۔ بس خوب مزا رہے گا۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور کھٹی میٹھی گولیاں بھی کھانے کو مل جائیں گی۔"

"اور کیا معلوم قسمت کھل جائے۔" مدن نے خوشی سے چہک کر کہا "اور ہماری سوئی . . اس کے منہ سے پڑ جائے۔"

"ہاں۔ پھر ہمارے پاس بہت سی گولیاں ہو جائیں گی اور ہم دن بھر مزے سے چوستے رہیں گے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔"

اور وہ دونوں تیزی سے چوک کی طرف چلنے لگے۔

شوالے کے اوپر سے گھوم کر جوں ہی وہ تیرتھ کی دکان کی طرف مڑے تو ان کے دل بجھ کر رہ گئے۔ تیرتھ کی دکان بند تھی۔ انہوں نے ارد گرد چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید اس کا خوانچہ کہیں نظر آ جائے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ تیرتھ کی دکان کے سامنے کھڑے مایوسی اور بے دلی سے اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

اچانک مُرغ کی سریلی سیٹی کی آواز اُن کے کان میں پڑی۔ وہ مُرغ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ ایک سیٹی پھر گونجی اور جھٹ ہی مُرغ نے اپنے نغمے کی پوری استھائی الاپ ڈالی۔

آواز اوپر کی طرف سے آ رہی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دکان کی چھت پر۔ منڈیر کے کونے کے اوپر تیرتھ کا پنجرہ پڑا تھا اور اس میں مرغ بڑے جوش کے ساتھ گلا پھلا پھلا کر گا رہا تھا۔

اس کا گانا سن کر مدن کو پھر اسی پرندے والی نظم کا خیال آ گیا اور مُرغ کی ہر تان کے ساتھ نظم کے مصرعے یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس کا دل رحم سے بھر آیا۔ پنجرے میں بند مُرغ کی فریاد اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی اور جب:

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

کے آخری مصرعے اس کے ذہن میں گونجے تو اس نے روہانسی آواز میں پکارا —

"بلاقی!"

"ہاں!"

"سُن رہے ہو، بے چارہ مُرغ کس طرح رو رو کر فریاد کر رہا ہے۔"

"یار۔ میرا بس چلے تو ابھی اس کو آزاد کر دوں۔" بلاقی نے بھی گلوگیر ہو کر کہا۔

اُنہوں نے پھر چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ بازار میں قریب قریب خاموشی اور ویرانی چھا رہی تھی۔ ارد گرد کے مکانوں کی کھڑکیوں میں بھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ مندر اُداس پڑا تھا۔ دکاندار دکانوں پہ بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ تیرتھ کی دکان کی چھت پہ مُرغ کے سوا اور کوئی متنفس دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شوالے کی چھت پر جانے والی تنگ سیڑھیوں پہ مرمّت کی وجہ سے ملبے کی تہ جم کر ایک ہموار سی چڑھائی بن گئی تھی۔ لیکن اِس پہ چڑھ کر چھت پر پہنچنا آسان کام نہ تھا۔

"بلاقی!"

"ہاں!"

"کیوں نہ ہم ان سیڑھیوں پر چڑھ کر شوالے کی چھت پہ چلے جائیں۔" مدن نے تجویز پیش کی۔

"وہاں جا کر کیا کریں گے؟" بلاقی نے پوچھا

"وہاں سے پھاند کر تیرتھ کی چھت پر پہنچ جائیں گے۔ اور ——" اس نے بلاقی کا ردِ عمل جانچنے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ بلاقی کی آنکھوں میں اشتیاق و اشتاق دیکھ کر وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا "اور —— پیچھے سے پنجرے کی کھڑکی کی تیلی نکال دیں گے۔ بے چارہ مرغا بھی آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے۔ پھر سے اُڑ جائے گا۔"

"لیکن —— پھر کسی نے دیکھ لیا تو ——" بلاقی نے خدشہ ظاہر کیا

"دیکھے گا کون؟" مدن نے کہا "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

بلاقی نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر مدن کا بازو دبا کر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "اچھی طرح دیکھ لو ۔ ۔ ۔ دیکھ لیا نا؟"

"دیکھ لیا" مدن نے پھر چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا۔

وہ دونوں آگے پیچھے اینٹوں ڈھیلوں کے انبار پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اوپر چڑھ گئے۔ چھت پر پہنچ کر اطمینان کی خاطر انہوں نے پھر اردگرد کا جائزہ لیا۔ سبھی مکانوں کی کھڑکیاں یا تو بند تھیں یا بالکل خالی تھیں۔ آہستہ سے منڈیر پھاند کر وہ تیرتھ کی چھت پر آ گئے۔ یہاں سے ایک بار پھر چاروں طرف جھانک کر تسلی کر لی اور پھر آہستہ آہستہ اس پنجرے کے قریب آ گئے۔ مرغ گاتا گاتا ایک دم خاموش ہو گیا۔ مدن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی رہائی کا انتظار کر رہا ہے۔ چپکے سے مدن نے کھڑکی کی تیلی کھینچ لی اور وہ پیچھے ہٹ کر مرغ کے اڑنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن مرغ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

ایک لمحہ، دوسرا لمحہ، تیسرا لمحہ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مرغ نے پھر سے گانا شروع کر دیا۔

"معلوم ہوتا ہے مرغ کو نظر نہیں آیا کہ ہم نے تیلی کھینچ لی ہے۔" بلاقی نے سرگوشی کی اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پوری کھول دی۔ مرغ اُڑ کر تیلیوں کی پچھلی دیوار پر جا بیٹھا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ کر انتظار کرنے لگے۔ مرغ پھدک کر دیوار سے اُترا آیا اور فرش پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"یہ اُڑتا کیوں نہیں؟" مدن نے تعجب کے ساتھ پوچھا "اب تو کھڑکی پوری کھلی ہے۔"

"پتہ نہیں —— شاید کھڑکی اسے نظر نہ آ رہی ہو۔" بلاقی نے کہا "میرا خیال ہے اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔"

اور مدن کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بلاقی نے اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈال دیا۔ مرغ پھڑپھڑا کر پچھلی دیوار کی تیلیوں پر جا آویزاں ہوا۔

"بے وقوف، ہم تجھے آزاد کرانے آئے ہیں۔" بلاقی نے جھنجھلا کر زیرِ لب کہا اور ہاتھ پھر مرغ کی طرف بڑھایا۔ مرغ بے چینی سے پھڑپھڑاتا ہوا پنجرے میں ادھر اُدھر اُڑنے لگا۔

"او —— تیرتھ ۔ اوئے تیرتھا۔ اوئے لڑکے تیرا مرغ اُڑائے دے رہے ہیں۔"

مدن اور بلاقی نے خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ سامنے والی کھڑکی میں ایک موٹا توندیل براہمن اضطراب کے ساتھ اپنے جنیئو کا دھاگہ پھراتے ہوئے تیرتھ کو خبردار کر رہا تھا۔ ایک ثانیہ بھی رُکے بغیر وہ دونوں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے اور ملبے پر سے گرتے لڑکھڑاتے اُتر کر تیزی سے اپنی گلی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

گلی میں داخل ہو کر وہ رُکے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ گلی کی نکڑ پر آ کر بازار میں شوالے کی طرف جھانک کر دیکھا تیرتھ

انھیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اُن کے دل کو کچھ قرار آیا اور وہ اُن عمودی بلیوں کا سہارا لے کر باتیں کرنے لگے جو اس لئے زمین میں گاڑ رکھی تھیں کہ گاڑیاں وغیرہ گلی کے اندر نہ جا سکیں۔

بلاقی فکر مند ہو رہا تھا کہ اب مدرسے کون سے راستے سے جایا کریں گے۔ چوک سے گزرے تو تیرتھ پکڑے گا کہ ہم نے اُس کا مُرغ اڑا دیا ہے۔ مدن کی رائے تھی کہ کیونکہ تیرتھ نے ہمیں دیکھا نہیں اس لئے وہ کیوں کر جان سکے گا کہ اس کا مُرغ ہمیں نے اڑا دیا ہے۔ بلاقی کا خیال تھا کہ وہ موٹا پنڈت اس کو بتا دے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مدن کی اس کو پہچان نہ رہی ہوگی لیکن بلاقی کے بارے تو وہ ضرور تیرتھ کو بتا دے گا کہ تھیلی والے لڑکے نے اس کا مُرغ اڑا دیا ہے۔ مدن نے بلاقی کی تسلی کے لئے خیال دوڑایا کہ پنڈت کو اس کی تھیلی ہرگز ہرگز نظر نہ آئی ہوگی کیونکہ بلاقی پنجرے کی آڑ میں تھا۔ اور پھر جب وہ بھاگے تھے تو ہمہ وقت اُن کی پشت ہی پنڈت کی طرف رہی تھی۔ اور تھیلی تو بلاقی کی ناک میں پڑی ہوئی تھی۔

بلاقی کی کافی حد تک تسلی ہو گئی۔ مگر اب مدن کی رائے تھی اور کافی تکلیف دہ رائے تھی کہ ایک بار چوک میں سے گزر کر تسلی کر لی جائے کہ مرغ واقعی اڑ چکا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ کوئی ہمیں پہچانتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بلاقی کے سر پر سے بلا آتی ہوئی ٹل گئی جب مدن نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود ہی چوک میں جائے گا اور بلاقی وہیں کھڑا رہ کر اس کا انتظار کرے۔ بلاقی مطمئن ہو گیا۔ مگر جب مدن چلنے لگا تو بلاقی کو وہاں اکیلے کھڑے رہنا دوبھر دکھائی دینے لگا۔ اس نے مدن کو روک لیا اور رائے دی کہ مدن کو واپس اُسی رستے سے چوک کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ گلی کے پچھلے راستے سے عقبی بازار میں جائیں اور وہاں سے اوپر سے گھوم کر شوالے والے چوک میں سے اس طرح گزریں جیسے ہم اِس واقعہ سے قطعی بے خبر ہیں اور دن میں پہلی بار وہاں سے گزر رہے ہیں۔ بلاقی نے اس مہم میں خود کو بھی شامل تو کر لیا تھا۔ مگر اب اس نے واضح طور پہ کہہ دیا کہ وہ مدن کے ساتھ رہے گا تاکہ آڑے وقت میں ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ کسی کو اگر شک آمیز نظروں سے اپنی طرف دیکھتا پائیں تو اول تو بلاقی مدن کی آڑ میں ہو کر نکل جائے۔ بالفرض پکڑے بھی جائیں تو صاف مُکر جائیں اور کہیں کہ ہم تو مدرسے سے آرہے ہیں۔

ان تمام وسوسوں کے ساتھ خود کو تسلیاں دیتے ہوئے اندر سے سہمے سہمے مگر بظاہر بالکل بے پروا وہ چوک میں سے گزرے۔ تیرتھ کی دکان کھلی تھی اور وہ اپنا خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ قریب ہی دکان کے بڑھاؤ پر اس کا پنجرا پڑا تھا۔

تیرتھ کو دیکھ کر اُن کا دل دھڑکا۔ بلاقی مدن کی اوٹ میں ہو گیا مگر مدن نے خوف کے تاثرات چہرے پہ نہ آنے دیئے۔ بے فکری کا انداز بنائے چلا چلتا کنکھیوں سے وہ تیرتھ کے چہرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ مدن کو یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ تیرتھ کی نظریں شک و شبہ کی آمیزش سے مبرا تھیں۔ وہ اُنہیں اسی طرح معمول کے انداز سے دیکھ رہا تھا جس طرح دوسروں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اس کے سامنے سے گزر گئے۔ مدن کے دل میں ایک بار اُس کی رُولٹ پہ قسمت آزمائی کرنے کا خیال آیا مگر اس نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ ساتھ چلا گیا۔

جب وہ پھر اپنی گلی کے سرے پہ پہنچ گئے تو ان کے دل ہر طرح کے خوف اور وسوسے سے آزاد تھے۔ اور بلاقی نے تو یہاں تک کہہ دیا:

”ارے یار! بات تو کچھ بھی نہ تھی۔ ہم خواہ مخواہ ہی ڈرتے رہے۔“

اور پھر وہ اپنی کچھ دیر پیشتر کی حالت کو یاد کرتے، اپنی ہی باتوں کو دُہراتے اور انہیں مضحکہ خیز رنگ میں پیش کر کے ہنستے رہے۔

اس طرح جھنجھلا کر انھوں نے خوف کے اس ہنگامی تناؤ کو ختم کر ڈالا اور جب یہ ہنگامی تناؤ ختم ہو گیا تو مستقل تناؤ نے جو اس ہنگامی تناؤ کی وجہ سے تحت الشعور میں چلا گیا تھا، مدن کے دل میں پھر سے سر اُبھارنا شروع کیا۔ ایک دم وہ خاموش ہو گیا۔ بلاقی نے چونک کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور وہاں سنجیدگی طاری دیکھ کر وہ خود بھی خاموش ہو گیا۔

"لیکن یار! وہ مرغ تو کم بخت اُڑتا ہی نہیں۔" مدن کے چہرے پر کرب آلود بے قراری کے آثار نمودار ہو گئے۔

"حیرانی ہے۔" بلاقی نے کہا۔ "کھڑکی تو کافی دیر تک کھلی رہی ہوگی۔"

"ہاں۔ اور اتنی دیر میں ایک چھوڑ پچاس مرغ اُڑ کر آزاد ہو سکتے تھے۔"

"معلوم ہوتا ہے یہ مرغ بہت بدقسمت ہے۔" بلاقی بولا۔

"نہیں بے وقوف ہے۔" مدن کو مرغ پر غصہ آنے لگا۔ "ہم نے جو اتنی محنت کی، اس قدر خطرہ مول لیا۔ اس احمق نے سب بے کار کر دیا۔"

اپنی اس پُرخطر محنت کے ضائع چلے جانے کا احساس کر کے بلاقی کو افسوس کے ساتھ فکر بھی ہونے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ اس ناکامی کا ازالہ کس طرح کیا جائے۔

"مدّی۔۔!" آخر اُسے سوجھ ہی گئی۔ "تمہاری بات ٹھیک ہے۔ تیرتھ کا مرغ واقعی احمق ہے۔ وہ ہماری بات سمجھا ہی نہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ وہ ہماری بات ہی نہیں سمجھا۔"

"لیکن مجھے ایک بات سوجھی ہے۔" بلاقی بولا۔

"کیا؟"

"وہ ہمارے پڑوس میں ہے نا، دامودر پنڈت!"

"ہاں۔"

"اس نے ایک طوطے کو قید کر رکھا ہے۔"

"ہوں!"

"وہ طوطا ہماری طرح باتیں بھی کرتا ہے۔" بلاقی نے قدرے توقف کے بعد مدن کو ہمہ تن توجہ پا کر کہا۔ "میرا خیال ہے ہم اسے آزاد کرائیں۔"

"بالکل ٹھیک!" مدن نے خوشی سے تمتما کر کہا۔ "لیکن اُسے اڑائیں گے کیسے؟"

"دامودر پنڈت اس وقت 'چندے' مانگنے گیا ہوگا۔ طوطے کا پنجرہ اُس کی برساتی میں سائبان کے ساتھ لٹک رہا ہوگا۔ ہم اپنی چھت پر چڑھ کر دامودر کی برساتی میں اُتر جائیں گے اور چپکے سے پنجرے کا دروازہ کھول دیں گے۔"

منصوبہ پوری طرح تیار تھا۔ وہ دونوں بلاقی کے گھر پہنچے۔ بستے ڈیوڑھی میں رکھ کر وہ چھت پر جا چڑھے۔ بلاقی کی ماں نے اسے آوازیں دیں کہ وہ مدرسے سے آیا ہے۔ بھوکا ہوگا اس لئے کچھ کھا پی لے۔ مگر بلاقی نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی اُسے بھوک نہیں اور وہ تھوڑی دیر بعد کھائے گا۔ اور وہ مدن کو ساتھ لے کر دامودر پنڈت کی برساتی میں اُتر گیا۔ ممٹی میں سے نیچے جھانک کر انھوں نے اطمینان کر لیا کہ گھر میں کوئی ہے تو نہیں۔ مگر گھر میں ہونا کس نے تھا۔ دامودر پنڈت مجرد بوڑھا تھا اور اس وقت چندے، روٹیاں وغیرہ مانگنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

پسپاٹے اطمینان کے ساتھ وہ طوطے کے پنجرے کے پاس چلے گئے۔ مدن نے لوہے کی تیلیوں سے بنائے گئے پنجرے کے دروازے کی کنڈی میں سے لوہے کی دیسی ساخت کی مڑی تڑی میخ نکال دی۔

طوطا جو پہلے "گنگاراماں چوری کھانی اُوں؟" کی رٹ لگا رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر چائیں چائیں کرنے لگا۔ مدن کو محسوس ہوا کہ وہ آزادی کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔ اس نے جھٹ پنجرے کا دروازہ کھول دیا، طوطا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

"گنگاراماں! ہم نے تمہارا پنجرہ کھول دیا ہے۔" مدن نے طوطے کو مخاطب کیا "اب تم آزاد ہو سکتے ہو۔ اور اپنے بال بچوں اور بچھڑے ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوشی سے اڑانیں بھر سکتے ہو۔"

مگر گنگارام اپنے اڈے پر بیٹھا گردن گھماتا رہا۔ مدن کو خیال ہوا کہ طوطا باری باری سے اپنے دونوں کان آگے کر کے ان کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"یار! یہ گنگارام بہرہ معلوم ہوتا ہے۔" بلاقی نے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

"گنگاراماں!" مدن نے بہرے کو سنانے کے لئے بلند آواز سے پکارا۔

"شی شو۔" بلاقی نے خوف زدہ ہو کر اُسے متنبہ کیا۔ "کوئی سن لے گا۔"

"تو پھر کیا کریں؟" مدن نے دبی زبان سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے" بلاقی بولا "ہم دروازے کے آگے سے ہٹ جائیں اور پچھلی طرف جا کر اسے باہر کو دھکیلیں۔ شاید ہمیں سامنے کھڑے دیکھ کر یہ ڈرتا ہو۔"

وہ دونوں آگے سے ہٹ کر پنجرے کی پچھلی طرف آ گئے۔ طوطے نے جھٹ اپنا رُخ پچھلی طرف کر لیا اور خوف زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

مدن نے طوطے کو دروازے سے باہر دھکیلنے کے لئے اپنی انگلی پنجرے میں ڈالی۔ طوطے نے جھپٹ کر کاٹ لیا۔

"اوئی!" کہہ کے مدن نے انگلی باہر کھینچ لی۔ اور اسے اپنے منہ میں ڈال سہلاتے ہوئے بولا،

"بدمعاش، احسان فراموش!"

اور پھر غصے سے جھنجھلا کر گویا ہوا "بلاقی، بند کر دے یار پنجرہ۔ پڑا سڑنے دے اس حرامی کو۔"

اور بلاقی نے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا۔

اچانک خفگی، جھنجھلاہٹ، ترار اور اکتاہٹ کے ملے جلے احساسات کے درمیان مدن کے دل میں گھر جانے کی خواہش شدت سے بیدار ہو گئی۔

اُترن

احمد شریف

اس کرسٹان لڑکی کا نام تو اصل میں گریس سوینی تھا مگر اس کے جاننے والے سب اسے سوہنی کہتے تھے۔ حالانکہ سوہنی سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔

ایڈورڈ روڈ، کرپا رام کمپاؤنڈ یا لندن بک کمپنی کے گردونواح میں ہر شام کسی نئے مرد کے ساتھ گھومتے پھرتے آپ نے بھی اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ شام کے وقت جب وہ بن ٹھن کر نکلتی تو ایڈورڈ روڈ پر واشنگٹن ٹائپ رائٹر کمپنی سے لیکر لارنس کارپٹس تک کے دکانداروں کے دلوں میں ہلچل سی مچ جاتی وہ ان دکانداروں کی لمبی قطار کے سامنے رامز ہوٹل میں رہتی تھی جو سلطنت برطانیہ کی طرح سکڑتے سکڑتے اب صرف دو چھوٹے چھوٹے رہائشی کمروں پر مشتمل رہ گیا تھا۔

ان دنوں میں انہی دکانوں میں پاشا کتب فروش کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔

ایک شام ہم دوکان کے پچھلے حصے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ اچانک پاشا پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنا بھول گیا اور پیالی ہاتھ میں لیکر ایک ٹک باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ برآمدے میں سوہنی میز پر سجے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ پاشا نے اپنی حالت پر کسی حد تک قابو پایا اور چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کہنے لگا۔

"سالی، گاہک کا انتظار کر رہی ہے۔"

برآمدے کا زینہ چڑھتے ہی میں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور ابھی تک اس کے حسن سے مسحور سا تھا۔ لیکن میری حالت اتنی غیر نہ تھی جتنی پاشا کی۔ میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ پاشا نے چائے کی آدھی پیالی پرے رکھ کر اپنی ڈھلکی ہوئی تہبند کو توند پر کسا، سوہنی کی طرف دیکھ کر توند پر ہاتھ پھیرا اور پھر میری طرف جھکتے ہوئے ایک آنکھ ذرا سی آنکھ میچ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"جسم دیکھو کیسا کسا ہوا ہے۔"

ویسے بھی اس وقت سوہنی کے سراپا میں نمک ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس نے گھنگھریالے کالے بالوں کا ایک پھول پیشانی پر بنا کر باقی بال کانوں کے پیچھے پھیلائے ہوئے تھے جن میں سونے کی تاروں کے ربن چمک رہے تھے۔ لمبی پلکوں میں گھری بڑی بڑی شفاف اور چمکیلی آنکھیں سوتے جاگتے کا قصہ کہہ رہی تھیں۔ غازے کی سرخی اس کے رخساروں کے رنگ میں گھل مل گئی تھی۔ سکرٹ کے کھلے گریبان سے آدھی قوسیں اور گولائیاں جھانک رہی تھیں۔

وہ دونوں طرف الماریوں میں لگی کتابوں کا جائزہ لیتی اندر آگئی۔ اسے قریب سے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ اتنی حسین نہ تھی جتنی دور سے نظر آتی تھی۔ لیکن مایوسی کا احساس جلدی ہی جاتا رہا۔ اس کے چہرے کے خدوخال رفتہ رفتہ آنکھوں کو جچنے لگے۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اوپر کا رسیلا ہونٹ تھا جو نچلے ہونٹ پر اس نفاست سے رکھا ہوا تھا کہ ذرا سا دبانے سے رس ٹپک پڑنے کا احتمال تھا۔

وہ پاشا کے قریب رک کر ایک کتاب کے نیم عریاں سرورق کو بغور دیکھنے لگی۔ بظاہر لاپروائی سے اس نے سڈول شانے کے گرد سکرٹ کے کسے ہوئے فیتے میں ایک انگوٹھا ڈال کر اسے ذرا سا اوپر اٹھایا اور پاشا سے مخاطب ہوئے بغیر پوچھنے لگی۔

"از دیئر اینی تھنگ ایب نورمل مسٹر پاشا"

اس نے پاشا کے نام کا پہلا حصہ یا دونوں ہونٹ ملا کر اس طرح ادا کیا جیسے پیار سے پاشا کا ہوائی بوسہ لیا ہو۔ پاشا کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور پتلون آپ ہی آپ توند پر سے ڈھلک گئی۔ اس نے ذرا سا منہ کھولا مگر کوئی آواز نہ نکلی۔ سوہنی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ ہی اس کے جواب کا انتظار کیا۔ وہ مڑی اور خراماں خراماں باہر کی طرف چل دی اور میری نگاہیں ایک ایک قدم پر اس کے جسم میں پڑتے سوسو بلوں میں کھو گئیں۔ میں نے کئی بار اس کے پیچھے آنے والوں کو قدم بڑھا کر آگے آگے آتے، اس کی صورت کا جائزہ لیتے اور پھر دانستہ رفتار سست کر کے پیچھے رہ جاتے دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کا جسم پشت کی جانب سے بے پناہ جاذب اور پرکشش تھا

پاشا ابھی تک منہ کھولے دروازے کی طرف تک رہا تھا۔ سوہنی دکان سے ذرا ہٹ کر بس سٹینڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ پاشا کی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس بلایا اور اس کے شوق کو ہوا دینے کی خاطر ہنس کر کہا۔

"پاشا کہو تو ٹانکا لگوا دیں۔"

اس نے بہت لمبی سانس بھری اور غم سے چور لہجے میں بولا۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔"

اس کے دل سے نکلی ہوئی آہ ابھی کراہ بن کر دکان میں گونج رہی تھی کہ ڈاکٹر ثقلین کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ وہ سٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے، کمر پہ ہاتھ رکھے، برآمدے میں میز کے پاس کھڑا بس سٹینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔

"ہوریلی؟"

اس نے مجھے دیکھ کر سسکی سی لی۔ اور اپنے کلینک کی طرف چلا گیا۔ اس کا کلینک پاشا کی دکان سے آگے سٹائلش ٹیلرز سے ملا ہوا تھا۔ اس کے نپے تلے قدموں کے تعاقب میں میری نظر برآمدے کی ٹائیلوں پر پڑی جہاں پان کی کئی پیکیں ایک دوسری کے پہلو میں کسی غریب کے بچوں کی طرح آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھیں۔ سٹائلش ٹیلرز کا کٹر شاہ پان کھانے کا عادی تھا۔ لگتا تھا اس شام اس نے معمول سے زیادہ ہی پان کھائے تھے۔ اور بار بار پیک تھوکنے باہر آیا تھا۔

بس آئی اور چلی گئی۔ سوہنی اس میں سوار ہوئی۔ وہ ٹہلتی ٹہلتی نگاہوں کا ایک ہجوم اپنے ساتھ لیے، فارس کارنیس کا موڑ کاٹ کر فیروز سنز کی زیر تعمیر عمارت کی طرف چلی گئی۔ واشنگٹن ٹائپ رائیٹر کمپنی کا مکینک غضنفر رحیم نے اس شام نہ جانے کتنی مشینوں کے پرزے کھول ڈالے تھے۔ ابھی تک بس سٹینڈ سے متصل کھمبے کے پاس کوئی گم شدہ پیچ ڈھونڈ رہا تھا۔

اس شام پاشا پر ٹوٹ کر اداسی چھائی رہی۔ میں نے اسے بہلانا چاہا مگر وہ ایک پاؤں کرسی پر رکھے، ماتھا تھامے، دکان پر آنے

جانے دنوں سے بیٹھا اس ملاح کی طرح بیٹھا رہا جس کی ناؤ ابھی ابھی ڈوبی ہو۔ بالآخر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

ایک دن میں وہاں پہنچا تو دکان خالی پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ پاشا غائب تھا۔ میں کرسی کھینچ کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں مڑا اپنی دکان سے نکلا۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پچ پیک تھوک کر مونچھیں پونچھتا ہوا اندر چلا گیا خود ملینک کیسٹ ٹیپ ریکارڈر پر بچکا لہک لہک کر گا رہا تھا۔

کوٹھے توں اُڈ کانواں
سد پٹواری نوں جند سجناں دے ناں لاواں

اسی اثنا میں میری نظر پاشا پر پڑی۔ وہ ڈاکٹر ثقلین کے کلینک کے سامنے پردوں کے پاس ستون کی آڑ لئے مضحکہ خیز حالت میں کھڑا تھا۔ اس سے آگے فارن کارپس کا مالک بوڑھا خان نروس حالت میں بیٹھا بے مزگی سے سیب چھیل رہا تھا۔ سارا ماحول ایسا تھا جیسے کوئی لڑکی تن کر انگڑائی لے رہی ہو۔ میں نے پاشا کو آواز دی۔

"پاشا!"

مجھے اپنی آواز ضرورت سے زیادہ اونچی اور کرخت سنائی دی۔ پاشا چونک کر مڑا اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر روانگی کے وقت انجن کی طرح بھاپ چھوڑی۔

"شی"

اور انگلی سے ڈاکٹر ثقلین کے کلینک کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا سوہنی اندر ہے۔ میں اٹھ کر کلینک کے سامنے بس سٹینڈ پر کھڑا ہوا۔ اتنے میں بس آ کر رکی اور خلیل اترا۔ وہ بھی پاشا کی دکان پر کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ میری اس سے اچھی جان پہچان تھی۔ میں نے اس وقت اس سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور ہم وہیں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میری ساری توجہ ڈاکٹر کے کلینک کی طرف تھی۔ سوہنی شوکیس پر جھکی ڈاکٹر سے محو گفتگو تھی۔ ان کے پاس ایک انگریز سٹیج ایکٹر کھڑا ٹھوڑی پر آگے کی طرف مڑے ہوئے چند بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ سوہنی فکرمند لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر، میں موٹی ہوتی جا رہی ہوں"۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیئے سے جھلملائے۔ اس نے بھرپور نگاہوں سے سوہنی کے بھرے بھرے جسم کو دیکھا۔ سوہنی ہنس کر بولی۔

"دیکھو نا ڈاکٹر، ننھی سی جان اور ہزار غم ــ پھر بھی ــ"

"لیکسیٹو لو"۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ "بروکلیکس"۔

"نو نو۔ لیمدار اور چپا پرو کلکیس مجھے اچھا نہیں لگتا" سوہنی نے برا سا منہ بنایا اور ڈچ سٹیج ایکٹر کی طرف مڑ کر انگریزی میں بولی

"اینو ٹھیک رہے گا۔ کیوں ڈارلنگ"۔

ڈارلنگ نے اپنے وجود کو ذرا سا خم دے کر ہاں میں ہاں ملا دی۔ اینو کی شیشی لیکر سوہنی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وزن کرنے کی مشین ہے ڈاکٹر؟"

"ہوں ہوں"۔

ڈاکٹر نے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا اور پھرتی سے شوکیسوں کے پیچھے سے نکل کر دروازے کی طرف آیا۔ مشین لڑکی کے کیبن میں بند دروازے کی اوٹ میں پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے دروازہ ذرا سا بھیڑ کر کیبن کھولا۔ سوہنی نے مشین پر چڑھ کر اپنے پیروں ک رف دیکھا اور پوچھنے لگی۔

"کتنا وزن ہے ڈاکٹر؟"

اس وقت یونہی مجھے خیال آیا کہ اگر وہ پاشا سے وزن پوچھتی تو وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر ذرا سا صحیح وزن بتا دیتا۔ ڈاکٹر عمدا جھکنے کی غلطی اپنا رخسار سوہنی کی ران سے رگڑتا ہوا جھکا اور وزن دیکھ کر بولا۔

"ایک سو بیس پاؤنڈ"

"او، گاڈ"

سوہنی نے جھرجھری لی اور بیہوش ہو کر ڈاکٹر پر ڈھیر ہو گئی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ ایکٹر نے ٹوپی اتاری بدحواس ہو کر جلدی جلدی ہوا کرنے لگا۔ سوہنی نے ڈاکٹر کی باہوں میں پڑے پڑے آنکھیں کھول دیں اور دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ڈاکٹر تم بہت سویٹ ہو۔"

اور پھر ایکٹر کے بازو میں بازو ڈال کر دکان سے باہر گئی۔ پاشا ابھی تک ستون کے پاس بت بنا کھڑا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرے تو سوہنی خلاف توقع رکی اور گرم جوشی سے بولی۔

"ہلو خلیل۔"

"ہلو سوہنی۔"

سوہنی نے اپنا ہاتھ جلدی سے سکرٹ پر رگڑا اور خلیل کے سامنے پھیلا کر کہنے لگی۔

"ذرا میرا ہاتھ تو دیکھو مسٹر خلیل۔"

خلیل نے سوہنی کے نرم و نازک ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔

"بہت نازک ہے۔"

"کم آن ڈارلنگ۔"

ایکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔ خلیل کو اس کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے اسے ٹھیٹ پنجابی میں ڈانٹا۔

"اوئے ٹھہر اوئے کا غانی بکر سے۔"

وہ کچھ نہ سمجھ کر ڈاڑھی کھجانے لگا۔ سوہنی اٹھلا کر بولی۔

"دیکھو نا میرا ہاتھ۔"

خلیل نے بڑی آہستگی سے پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔

"آج رات تمہارے ستارے روشن ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ایکٹر کرے کر رامز ہوٹل کی طرف چلی گئی۔ پاشا جا چکا تھا۔ میں نے خلیل سے کہا۔

"خلیل کسی طرح اپنے پاشا اور سوہنی کے ستارے ہی ملا دو۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اکا دکا ستارے ٹمٹما رہے تھے اور گمبھیر آواز میں بولا۔

"سوہنی کا ستارہ تو ازل سے مہینوال کے ستارے سے ملا ہوا ہے۔"

اس پہ اس وقت نہ جانے کیسے کیسے اسرار منکشف ہو رہے تھے۔ میں چپ ہو رہا اور ہم دونوں پاشا کی دکان کی طرف چلے آئے۔

پاشا کی دکانداری روز بروز چوپٹ ہونے لگی۔ یوں تو سوہنی سبھی کے اعصاب پر سوار تھی لیکن ڈاکٹر ثقلین وقتاً فوقتاً، سے آوارہ اور بدچلن کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ غفور مکینک اس کی یاد میں اور بھی اونچے سروں میں گانے لگتا۔ شاہ کرم سے اور کچھ نہ ہوا۔ تو اس نے پان کھانے کی تعداد بڑھا دی اور خواہ مخواہ دل کا مریض بن بیٹھا۔ البتہ ایک پاشا ایسا تھا جس کو سچ مچ روگ لگ گیا۔ وہ ہر وقت اداس اداس گم سم بیٹھا رامز ہوٹل کی طرف دیکھتا رہا۔ چند دنوں سے زندگی اس سے روٹھ سی گئی تھی۔

ایک دن میں اور خلیل دکان کے اندر بیٹھے پاشا کی حالت زار پر آنسو بہا رہے تھے کہ ایک خوش پوش گاہک دکان پر آیا۔ پاشا نے جو کہ برآمدے میں بیٹھا تھا، اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ گاہک نے اس کی سرد مہری پر خفیف سا ہو کر خود ہی پوچھا۔

"پاشا تمغہ آ گیا؟"

"پرسوں آیا تھا۔"

پاشا نے منہ پھیر کر روکھا سا جواب دیا۔ گاہک نے کہا۔

"ہمارے ہاں تو پہنچا نہیں۔"

"پرسوں ہی بھیج دیا تھا۔"

"اچھا!"

"جی۔"

پاشا سانپ کی طرح پھنکارا۔ گاہک کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ بیچارا اپنا سا منہ لے کر واپس ہو گیا۔ جب وہ دکان سے اتر کر ذرا دور چلا گیا تو پاشا زیر لب حقارت سے بڑبڑایا۔

"چلے آتے ہیں منہ اٹھائے۔ اپنے دفتر تک کی خبر نہیں کیا آتا ہے، کیا جاتا ہے۔"

دراصل اسے گاہکوں کا آنا بہت ناگوار گزرنے لگا تھا۔ دکان کی تباہی اور اس کی بگڑی ہوئی حالت پر خلیل کو بہت ترس آیا۔ کہنے لگا۔

"اے کاش ......"

اس نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ سوہنی دکان کے سامنے سے گزری۔ خلیل بھاگا بھاگا ہوا باہر گیا اور چٹکی بھر اس کے پیروں کی مٹی اٹھا لایا اور پھر تانبے کے پانی کا ایک گلاس بھر کر دھیتی پر چڑھ گیا۔ وہ دھیتی پر بیٹھا دیر تک پانی میں سوہنی کے پیروں کی مٹی گھول کر اپنی پامسٹری اور نجوم کے ٹوٹکے چلاتا رہا۔ میں نے اگربتیاں اٹھا کر جگہ جگہ روشن کر دیں۔ دکان کی ٹھہری ٹھہری فضا میں نقلی صندل کی

تیز خوشبو کے ساتھ دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں لہرانے لگیں۔

خلیل دوچھتی سے اترا تو اس کی آنکھوں میں کشف کے گلابی ڈورے چل رہے تھے اس نے گلاس پاشا کی طرف بڑھا کر کسی پہنچے ہوئے ملنگ کی طرح کہا۔

"لو، پیو۔"

"کیا ہے؟"

" پاشا کے چڑچڑے پن میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔ خلیل مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"شربتِ وصال۔"

پاشا پہلے تو ہچکچایا پھر گلاس لیا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔

خلیل کی عملیات ہاتھ کے ہاتھ رنگ لے آئیں۔ پاشا کی دکان گئی رات تک کھلی رہنے لگی۔ ہم خوش تھے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا اور دکان تباہ ہونے سے بچ گئی۔ لیکن ہماری خوش فہمی جلدی ہی دور ہو گئی۔

سوہنی پر جان دینے والوں کی کمی نہ تھی۔ ایسے بھی تھے جو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے صدر کے بارونق بازاروں اور سڑکوں پر گھوم کر اپنے مال کی نمائش کرنے میں فخر محسوس کرتے اور ایسے بھی تھے جو چھپ چھپ کر اس کے کمرے میں آتے اور چند گھڑیاں اس کے ساتھ گزار کر رات کے اندھیرے میں واپس ہو جاتے۔ پاشا کی دکان رات گئے تک کھلی رہنے کا راز یہ تھا کہ اس نے ان لوگوں کو دیکھنے میں تسکین کا ایک پہلو نکال لیا تھا جو سوہنی کو قریب سے دیکھ کر رات کو واپس آتے تھے۔

خلیل کو پتہ چلا تو اس نے سر پیٹ لیا اور سر پکڑ کر دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر کسی سے بات کئے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز بعد ایک دن شام کے وقت وہ دکان پر آیا تو بہت خوش تھا۔ ادھر پاشا کی حالت بارش میں مسلسل بھیگنے والے کاغذ کی سی ہوتی جا رہی تھی اس نے پاشا کے قریب آ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور پھر اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے بولا۔

"سوہنی جا رہی ہے۔"

پاشا نے متعجب سا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اس نے ڈھلکی ہوئی پتلون سلیقے سے توند پر کسی اور اسی وقت دکان بند کر کے ساتھ ہو لیا۔

ہم رامز ہوٹل کے برابر آفتاب ریستوران میں جا بیٹھے اب پتہ نہیں یہ اتفاق تھا یا خلیل نے سچ مچ سوہنی سے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ ادھر چائے آئی ادھر سوہنی پہنچ گئی۔ پاشا نے زبان کلے میں اٹکا کر بغور اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور پھر گردن جھکا کر جیسے دل میں اتری ہوئی تصویر دیکھنے لگا۔ سوہنی خلیل کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ہنس کر ہاتھ اس کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ خلیل اس کے گورے گورے ہاتھ پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر کر بغور لکیروں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر فکرمند لہجے میں سوہنی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"آج کی رات تم پر بہت بھاری ہے۔"

اس نے تھوڑی دیر توقف کر کے سوہنی کے چہرے پر اپنی بات کا ردِ عمل دیکھا اور سرگوشی کی۔

"تیرا گھر خالی ہے"

"میں بھی خالی ہوں"

وہ کسی بھیگی ہوئی بلی کی طرح اشارے کو کافی سمجھ کر آہستہ سے بولی۔ ہم جلدی جلدی چائے پی کر اٹھ کھڑے ہوئے خلیل کا فلیٹ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کمرے میں ہم بیٹھے وہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی دیوار کے ساتھ، بڑے سے پلنگ کے سرہانے کھونٹی پہ ریشمی کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ خلیل نے کونے میں رکھی ہوئی ہلکے نیلے رنگ کے بڑے کاغذی شیڈ والی ٹیبل لیمپ جلا دی۔ نیلگوں ماحول میں سوہنی کا حسن اور بھی نکھر آیا۔ خلیل اٹھا اور الماری کے نچلے خانے سے کپڑوں تلے چھپا کر رکھی ہوئی وسکی کی آدھی بوتل نکال لایا اور دور چلنے لگا۔ میں چونکہ پیتا نہیں اس لئے پینے والوں کا رنگ دیکھنے لگا ماحول کی اجنبیت جلدی ہی دور ہو گئی۔ نشے نے وہ پردہ اٹھا دیا جو ابھی تک ہم لوگوں کے درمیان حائل تھا۔ سوہنی کا چہرہ تمتما اٹھا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے مچلنے لگے۔ اس نے اپنی جگہ پہلو بدل کر دہکتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر تر کیا اور ایک پہلو پہ ذرا سی جھک کر سکرٹ کا گردن سے کمر تک کا زپ کھول ڈالا اور آپ ہی آپ بڑبڑائی

"بہت گرمی ہے"۔

زپ کھلنے سے سکرٹ کا کھلا گریبان اور بھی ڈھلک گیا اور پاشا کی نگاہیں گریبان میں اتر گئیں۔ سوہنی میری طرف سے ذرا سا منہ موڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کی مرمریں پیٹھ پر ریڑھ کی ہڈی کی کڑیاں گداز جسم پر قدرے ابھری ہوئی تھیں۔ میرا جی چاہا دو کڑیوں کے درمیانی ننھے سے گڑھے میں دھیرے دھیرے انگلی پھیرنے لگوں۔

ہلکی ہلکی خنکی کے باوجود سوہنی کی شفاف پیشانی اور رسیلے ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمایاں ہو گئیں اور اس نے سکرٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ حسین عورت کو کپڑوں میں چھپی دیکھ کر آدمی کی حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ سوہنی کو نیم عریاں دیکھ کر تو میرے وجود میں آگ سی لگ گئی لیکن اس محفل میں میری حیثیت شہ بالے کی سی تھی۔ ایک برات کے دو دو دولہے موجود تھے۔ میں وہاں سے کسی بہانے کھسکنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ خلاف توقع پاشا نے آگے بڑھ کر سوہنی کی بریسیئر کے ایک حصے میں انگلی ڈال کر کٹوری سی اوپر اٹھا دی۔ اس چھیڑ خانی پر سوہنی کے جسم نے احتجاجاً سر ہلایا اور پھر معمول پر آ گیا۔ اس قسم کے حرکات غالباً سوہنی کے روزمرہ میں داخل تھیں۔ اس نے بریسیئر اتار کر پلنگ کے سرہانے پہ ڈال دی اور چاندنی پر چت لیٹ گئی اس کا جسم چھت سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ خلیل، جو اتنی دیر سے خاموش تھا، دھیرے سے بولا۔

"سوہنی"

"ہوں"

اس نے لیٹے لیٹے ہنکارا بھرا۔ خلیل کہنے لگا۔

"تم کیسی سوہنی ہو!"

"کیوں؟"

"ہماری سوہنی نے تو چناب میں ڈوب کر مہینوال کے لئے جان دے دی تھی"۔

"دے تو میں بھی دوں پہ کوئی مانگنے والا ہی نہیں"۔

بات کرتے کرتے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پلنگ کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا پسینے میں شرابور جسم دیکھ کر گمان ہوتا تھا۔ جیسے مینواں کی سوہنی چناب پار کر کے ابھی ابھی کنارے پر آئی ہو۔ ہم سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کھونٹی پر ریشمی کپڑوں کے درمیان ٹنگی ایک برسیئر اتاری اور آہستہ الٹ پلٹ کر سائز کا اندازہ کرتی ہوئی اپنی جگہ آ بیٹھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے برسیئر پہنی۔ پھر اپنے بھرے بھرے جسم کو دونوں ہاتھوں میں لیکر تولا اور خلیل سے کہنے لگی۔

مسٹر خلیل، یہ برسیئر مجھے دے دو۔"

خلیل کے سارے وجود کا خون یک دم سمٹ کر اس کے چہرے پر جھلکنے لگا۔ وہ برسیئر غالباً اس کی بیوی کی تھی۔ لیکن اس نے بات بنا دی ہنس کر کہنے لگا۔

"اترن لے کر کیا کرو گی۔ اسی کے ساتھ کی نئی لے دیں گے۔"

"یہی دے دو مسٹر خلیل" سوہنی نے لجاجت سے کہا۔ اس نے گردن جھکا کر لمبی سانس لی اور بولی "اس میں سے عورت کی بو آتی ہے" پاشا جلدی سے آگے بڑھا اور سوہنی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ بڑی عقیدت اور احترام سے اسے دونوں آنکھوں پر ملا اور پھر میرا بازو پکڑ کر اس طرح زینہ اتر آیا جیسے کسی عبادت گاہ سے نکل رہا ہو۔

بند راستے

احمد سعید

سوتے سوتے زینے کا سانس آہستہ آہستہ تیز ہو جاتا، اُس کے ماتھے پہ شکنیں پڑنے لگتیں اور اس پہ پسینے کی بوندیں ابھر آتیں، وہ گھبرا کر کروٹ پہ کروٹ لیتی، پھر کچھ عرصہ کے لیے چپ، بے حس و حرکت پڑی رہتی جس کے بعد اس کے چہرے پہ خوف کے آثار پیدا ہونے لگتے — یوں معلوم ہوتا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ اور وہ چیخنا چاہتی ہو۔ لیکن یہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی۔ اب اُس کے اندر سے عجب گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی جیسے اُس کے پہاڑی وطن پہ بارش ہو، اس میں بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں جو بادل بن کر خونخوار درندے بن کر آگے بڑھتے اور اس پہاڑی علاقے پہ آناً فاناً چھا جاتے اور ان میں سے بجلی کے کوندے دور دور سے آگے کو لپکتے، بجلی کہیں گرتی دکھائی دیتی اور گرد و گرد پہاڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتیں اور راستے روک دیتیں۔ جب بارش نہ ہوتی تو ریچھ اور شیس (چیتے) اپنی کھوہ سے باہر نکلتے، ریچھ جو نوجوان عورتوں کو بھی اٹھا کر لے جاتے اور سننے میں آیا تھا، ان کے تلوے چاٹ چاٹ کر انھیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیتے اور — اور — پھر یہ آدمی کے کسی کام کی نہ رہتیں۔ شیس (چیتے) ان سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے کیونکہ یہ برق کی مانند تاریکی سے شکار پہ آنِ واحد میں لپک کر اسے دبوچ لیتے۔ یہ چیتا ہے، سبک رفتار جادوگر جن کی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح چمکتیں اور دہکتیں اور دن میں نیلگوں گہرے ساکن پانی کی طرح اپنے دیکھنے والے کو مقناطیسی انداز میں پتھرا سی دیتیں — زینے کے پہاڑی وطن کے دامن میں بھی ایسی جھیل تھی جس کے کنارے چیتے اور ریچھ پانی پیتے، الھڑ دوشیزائیں پانی بھرتیں اور بعض اس کی تہ میں جھانکتے جھانکتے اس کی نذر ہو جاتیں۔

اس خواب کے اندھیارے میں ایسی دو آنکھیں شیس کی آنکھیں۔ زینے پر حملہ آور ہوتی دکھائی دیتیں، پھر ایک ریچھ نما ہاتھ اس کی طرف بڑھتا، اُس کی کمر کے گرد حمائل ہو جاتا اور اُسے اٹھا کر جھپاک سے تاریکی میں تحلیل ہو جاتا۔

"شیس! شیس!!" کبھی کبھار وہ خواب میں چلا بھی اٹھتی۔ یہ سنکر نہ صرف اُس کے پاس ہی دبا ہوا اُس کا بڑا بھائی عزیز گل بلکہ ان کے اڑوسی پڑوسی بھی لرز گئے تھے جیسے کالا چور نوجوان لڑکیوں کو رات کے وقت ان کے گھر سے سوتے سوتے اٹھا کر لے جاتا اور ان سے زبردستی کر کے انھیں چچوڑی ہوئی ہڈی کی مانند کھیتوں میں پھینک جاتا۔ وہ شیس کی مانند اندھیری راتوں میں چپکے سے گھر میں کہیں سے آ ٹپکتا تھا جسے آخرکار سپیشل پولیس نے بڑی مشکل سے گرفتار کیا تھا۔ نیو ٹاؤن میں اس نے کچھ عرصہ

کے لیے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ پھٹے جلنے پر وہ پولیس کا ایک افسر نکلا تھا۔

لیکن آج کی چیخ نیو ٹاؤن میں ڈیڑھ برس سے کام کرتی زلیخے کے حلق سے نکلی تھی۔ اسے سن کر لوگوں نے کہا۔

"بیچاری بڑی دکھی ہے۔"

"اس کے شوہر کو بارہ برس کی قید جو ہو گئی ہے۔"

"توبہ توبہ۔ بارہ برس!"

"ایسا کون جرم کیا تھا اس نے؟"

"سنا ہے بہت بڑا ڈاکو ہے اپنے علاقے کا!"

"چھوڑ کیوں نہیں دیتی ایسے بدمعاش کو؟"

"بدنصیب کی جوانی برباد ہو جائے گی!"

"جبھی بھائی کے پاس یہاں آ گئی ہے۔"

"پیٹ کیا کیا نہیں کرواتا۔"

"اس کا بھائی پہلے یہیں گھر کا کام کرتا تھا۔ اب کسی فیکٹری میں ملازم ہے۔"

"بیگم، تم کیا یہ قصہ لے بیٹھیں رات کے وقت۔"

"بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ مرد بھی!"

"اخباروں میں تو آئے دن عورتوں کے ایسے قصے بھی چھپتے ہیں۔"

"بہت ترس آتا ہے تو سوت بنا لاؤ۔"

"پھر تو آپ کی مدت کی من کی مراد پوری ہو جائیگی۔ اسی سے مرد لوگ اس سے اتنی ہمدردی جتاتے ہیں۔ اگر میرے گھر اب کہیں آئی تو ٹانگیں تڑوا دوں گی اس کی!"

"چھ چھ چھ! میں تو مذاق کر رہا تھا بیگم۔ پر مت بھولنا، مولوی لوگ ایک سے زیادہ شادی پر پابندی کے سخت خلاف ہیں!"

"میں ایسے مولویوں کی داڑھی نہ نوچ لوں۔"

"لاحول ولا۔ اچھا بابا، اب سو جاؤ۔"

"سو جاؤ زلیخے! شہر میں شیر کہاں سے آیا۔"

"شیر خاں، شیر خاں۔" مشتاں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بھائی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ردعمل میں عزیز گل نے اپنی طرف سے بڑا یقین دلایا کہ شیر خاں جلد رہا ہو کر گھر واپس آ جائے گا اور زلیخے کے مصیبت کے دن کٹ جائیں گے۔

.... آٹھ نو مہینے تک شیر خاں کا مقدمہ چلتا رہا تھا۔ ملزم کو اس دفعہ ڈاکہ میں بلکہ قتل میں مدد دینے کے جرم میں بارہ برس قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی۔ استغاثہ کے مطابق شیر خاں نے لاش کو غائب کرنے میں قاتل کی سب سے زیادہ مدد کی

تھی۔ اس کے باوجود شیر خاں کے لواحقین نے نہ صرف اسے بلکہ اس کے چچا قاتل کی سزا میں بھی تخفیف اور رحم کے لئے اپیل ل تھی۔ ایسے جرائم پیشہ خاندان کا نام سن کر کوسوں تک کے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس نے اپنے ہی خاندان کے دو تین افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے تھے۔ چنانچہ جب شیر خاں کے چچا، جمعہ خاں، کو سزائے موت ہوئی تو جہاں غیروں نے شکرانے کے دو دو نفل پڑھے، وہاں اس کے بعض اپنے رشتہ داروں نے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ اس نے انھیں ایک بڑے موذی سے نجات دلائی تھی۔ شیر خاں کو طویل سزا کاٹنے پر بھی انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔ گو چوری چکاری، ڈاکہ اور رہزنی تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی لیکن اس نے اپنے گاؤں کی چند دوشیزاؤں کی عصمت سے بھی کھیل ڈالا تھا کیونکہ اسے جب کبھی فرصت ملتی وہ کنواری لڑکیاں تاڑ کر انھیں یکے بعد دیگرے اپنی چیرہ دستی، طوفانی جوانی کی بھٹی میں جھونکنے کے متعلق سوچتا رہتا تی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ چوری اور عورت اس کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے — اُسے پہلی قید بھی عورت کے لیے چوری کرنے کے الزام میں ہوئی تھی — یہ زلیخے تھی۔ اس کی خالہ زاد بہن۔

چھریرہ جسم، چیل جیسا دراز قامت، شمشیر جیسا پھرتیلا اور طاقتور، ہلکی ہلکی بھوری مونچھیں رکھے دمکتا گورا چٹا رنگ، بانکا چھیلا یہ تھا شیر خاں جسے عرف سے لوگ شیر خاں شیں کے نام سے یاد کرتے۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا، عید بقر عید کے موقع پر مظفر آباد سے انگریزی طرز کے بال کٹواتا، سر پر قراقلی رکھتا، ڈب میں کمانی دار چاقو جس سے اس نے ایک حملہ آور شیں کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالا تھا اور نتیجتاً شیں کا لقب حاصل کرنے کا مستحق بھی ہو گیا تھا۔ چوری چکاری تو اسے ورثے میں ملی تھی اور جوانی اس پر یوں ٹوٹ کر برسی تھی جیسے پل جھپکنے میں مکی کے بھٹوں کو بیر بیر جتنے دانے لگ جاتے ہیں۔ جونہی اس کی مسیں بھیگنے لگیں نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک پیدا ہونے لگی اور اس کے ہونٹوں پر اپنے دیس کے عشقیہ گیت مچلنے لگے۔

چن چڑھیا جلاباں والا تے نال چناں دے ٹلیاں
توایں پری ہیں خاکی بندا کدوں طبیتاں رلیاں
چن چڑیا مبارک والا دتے نال پنے دے لالی
کڈ کلیجے توں گئی اڈوں

پنجرہ رہ گیا خالی

اور اس کا پہلا مخاطب زلیخے تھی جس کی عمر اس وقت بمشکل تیرہ چودہ برس تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے اس کے اندر کیوں کھد بد ہونے لگتی حالانکہ شکل صورت میں اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ ایک عام پہاڑی لڑکی تھی۔ وہ اپنے خالہ زاد بھائی شیر خاں کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جایا کرتی۔ جب کبھی وہ عید بقر عید کے دن اسلئے گھر آتا تو اُسے یوں دیکھتا جیسے اسے نگل جانا چاہتا ہو — "چور کہیں کا! مجھے چوری کی عید دینے آیا ہے، یہ جتانے کہ ان لوگوں کے پاس چار پیسے ہیں، بدمعاش کہیں کا" وہ دل ہی دل میں کہا کرتی لیکن اُسے منہ پر یہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی "بھلا میرے سامنے یہ کیوں ایسے گندے گیت گاتا ہے" البتہ چور اور بدمعاش ایسے القاب اُس نے شیر خاں پر دو تین مرتبہ جڑ دیے تھے۔ یہ سن کر اُس کی ماں نے اُسے

تنبیہاً کیا تھا کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ اگر زلیخہ نے کبھی پھر شیر خاں کو اس نام سے پکارا تو وہ سوتے میں اُس کا گلا گھونٹ دے گا۔ اور جب اس نے خود مذاقاً شیر خاں سے زلیخہ کے دیئے ہوئے القاب کا ذکر کیا تھا تو بے طرح والہانہ انداز میں قہقہہ لگاتا ہُوا اُسے راستے میں اکیلا گھیر بیٹھا تھا۔

"اری ذرا ٹھہر جا — یہ تو بتا میں نے تیری کونسی چوری کی ہے۔ مت بھول، یہ چور ہی تجھ سے شادی کرے گا۔"

"تھوہ تھوہ،" یہ سن کر زلیخہ نے جیسے طیش میں آ کر زمین پر تھوک دیا تھا اور زمین پر پاؤں پٹخ کر رو دہانسی ہو کر بولی تھی۔

"بدمعاش! میں تیری کیا لگتی ہوں جو تو مجھ سے شادی کرے گا۔"

"بس تیرا یہی غصہ، یہی نظر مجھے کھا گئی ہے۔ یاد رکھ تجھے شیر خان پسند کرتا ہے۔ قسمت جاگ اُٹھی ہے تیری!"

"مجھے — مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں بس نہیں۔ نہیں۔ ایک بار کہہ دیا۔"

"اگر انکار کرے گی تو — جانتی ہے نا مجھے؟" زلیخہ یہ سن کر اور شیر خاں کے بدلتے تیور دیکھ کر یوں یکلخت دم بخود ہو گئی تھی جیسے وہ اُسے واقعی اُٹھا کر لے جائے گا اور کہیں کسی غار میں لے جا کر قتل کر دے گا لیکن شیر خاں کو زلیخہ ایک مجسم دھتکار معلوم ہوتی جو اس کے لیے عجب مہمیز کا کام دیتی۔ اس کے تحت اُس کے دل میں اُسے بیوی بنانے کی خواہش تیز تر ہو جاتی۔ اگر اس کی جگہ جیر جان، مہر جان، قابل جان وغیرہ ہوتیں تو وہ انھیں وہیں شیں کی طرح دبوچ لیتا۔ ایسی لڑکیوں میں سے ایک گل بیبے کا باپ شیر خاں کی دست درازی کرنے کی کوشش کرنے کی خبر سن کر چھری لے کر اس سے بدلہ لینے اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شیر خاں کے چچا جمعہ خاں کو جونہی یہ خبر ملی تھی وہ بجلی کی طرح وہاں آ پہنچا تھا گو یہ معاملہ اس وقت بڑی صلح صفائی سے رفع دفع کر دا دیا گیا تھا۔ مگر اس واقعہ کے تیسرے روز ہی اس نے گل بیبے کے باپ کا چپکے سے صفایا کر دیا۔ جمعہ خان اس واردات سے ۱۲ گھنٹے قبل گاؤں سے باہر چلا گیا تاکہ کسی کو اس پر شک نہ گزرے۔ قتل کی رات شیر خاں ایک قریبی گاؤں میں ایک شادی میں شرکت کرنے گیا ہُوا تھا۔ اس کے باوجود لوگوں کو یقین تھا کہ مذکورہ قتل چچا بھتیجے کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ان کا بال تک بیکا نہ ہُوا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد شیر خان نئے کپڑے پہنے معصومانہ خود اعتمادی سے زلیخہ کا رشتہ لینے خود اپنی خالہ کے گھر آیا۔ اُس نے ایک ہی وار میں یہ قلعہ سر کر لیا کیونکہ اُس نے رسمی علیک سلیک کرنے کے بعد اپنی خالہ کے سامنے سو سو کے دس نوٹ گن کر رکھتے ہوئے کہا۔

"— یہ زلیخہ کے پیسے ہیں — ایک ہزار روپے — ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے اتنی قیمت نہیں دی۔ اپنے گھر کی لڑکی تو — خالہ — خیر —"

شیر خاں کے ایسے غیر متوقع رویے اور اندازِ استدعا سے پہلے تو اس کی خالہ سناٹے میں آ گئی، اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ لیکن ایک ہزار روپے اپنے سامنے پڑے دیکھ کر اس کے اوسان بہت جلد بحال ہو گئے۔ اپنی نظریں نوٹوں سے ہٹا کر اس نے شیر خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"— لڑکی کو ہوش تو آ لینے دو شیر خاں —"

"کیا باتیں کرتی ہو خالہ — اپنے گھر جا کر جوان ہو جائے گی۔ تم ۔ تم فکر نہ کرو۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ اتنی سی چوڑی ہٹی کٹی ہے۔ ٹھیک ہے، سب ٹھیک۔" شبیر خان نے جواباً ہنستے ہوئے کہا۔

اس کی خالہ جانتی تھی کہ وہ بچپن سے ہی بڑا ضدی اور منچلا تھا۔ جس چیز پر اس کا دل ایک بار آ جاتا اُسے لے کر ہی چھوڑتا۔ اور اب کا شبیر خاں آج سے پندرہ بیس برس پہلے کا بچہ نہ تھا۔ وہ اپنے مشہور و معروف ڈاکو اور قاتل چچا جمعہ خاں کا دستِ راست تھا۔ اس کا رات گئے زینبے کا رشتہ مانگنے اکیلے ان کے ہاں آنا اسی اَمر کا ثبوت تھا۔ جب اس نے پہلے سے دروازے پر دستک دی تھی تو ایک لحظہ کے لیے اس کی خالہ کا دل بیٹھ گیا تھا اور اس کی بکریاں تک چونک پڑی تھیں۔ کیونکہ اتنی رات گئے کسی کے گھر صرف چور ہی آ سکتا تھا۔ "لیکن گھبراؤ نہیں خالہ۔ میں ہوں شیر خاں تبیں دروازہ کھولو۔" سن کر اس کی خالہ کی جان میں جان آئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی شبیر خاں نے ایک ننھی سی ٹارچ کی تاریکی کو چیرتی ہوئی شعاعیں اپنی خالہ کے چہرے پر ایک لمحہ کے لیے گاڑتے ہوئے ایک طرف موڑ دی تھیں۔ اس سمے زینبے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی کہ اُسے کوئی ریچھ اٹھا کر غار میں لے جا رہا ہے، اس کی آنکھیں اندھیرے میں شبیر کی آنکھوں کی طرح دمک رہی ہیں لیکن ان میں کچھ ایسا جادو ہے کہ وہ گُنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن چیخ اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی۔ ریچھ غار کا دروازہ پنجہ مار کر کھول دیتا ہے اور ہنس کر زینبے کو اندر کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ وہ دبک کر کمبل میں سکڑ گئی اور اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اتنے میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی خالہ کسی سے باتیں کر رہی ہے۔

"گھبراؤ نہیں خالہ۔ شبیر خاں تم سے کبھی دھوکا نہیں کرے گا۔ لیکن میرے یہاں آنے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔"

"........ نہ — نہیں نہیں بیٹا تم — فکر نہ کرو۔ لیکن اتنی جلدی بھی کیا تھی؟"

"تم بس یہ سنبھالو اور شادی کی تیاری کرو۔ ایک مہینے کے اندر اندر ہو جائے بس سب کچھ۔"

"بیٹا شبیر۔ ہم بیوقوف لوگ ان کاغذوں کو کیا جانیں۔ ہمیں تو گننا بھی نہیں آتا۔"

"— ہوں — اچھا — تم فی الحال یہ اپنے پاس رکھو۔ پھر بدل دوں گا۔"

"نہ نہ بیٹا۔ خدا نہ کرے، کہیں بھیڑ بکریوں کے منہ لگ گئے تو میں تجھے کیا منہ دکھاؤں گی ..... اور لوگوں نے دیکھ لیے تو —"

"تو؟ — تو —"

"..... میرا مطلب ہے مجھے کہیں چور نہ سمجھ بیٹھیں۔"

"چور۔ چور۔ چوری۔ ک۔ ک۔ کون کہے گا۔ ہیں؟" شبیر خاں نے معاً اپنی ڈب سے کمانی دار چاقو نکال کر، اُسے کڑک سے کھول کر اپنی خالہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "جو تمہیں یا۔ زینبے کو کچھ کہے گا وہ۔" اس نے چاقو کا پھل خیالی دشمن کے سینے میں گھونپتے ہوئے دکھا کر اس کا جواب دیا۔ وہ ساتھ ہی ہنس پڑا اور اس نے چاقو بند کر کے اپنی خالہ کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

"ڈر گئیں خالہ — میں تو تخول کر رہا تھا۔" وہ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر ایک ثانیہ کے لیے کچھ سوچ کر بولا۔ "فجر کی نماز تک تمھیں پانچ پانچ روپے کے نوٹوں میں ساری رقم مل جائے گی۔" کہتے ہوئے شیر خاں چپاک سے اٹھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندھیرے میں کالے بادل کی طرح تحلیل ہو گیا۔

"بکری بیچ دی ماں۔ بڑی قیمت ملی؟" زلیخے نے شیر خاں کے چلے جانے کے بعد کروٹ بدل کر کہا۔

"بکری! — بڑی خوش قسمت ہے، پگلی۔ تجھے اتنا پسند کرتا ہے — اگر بوڑھا ہوتا اور شیر خاں سے زیادہ پیسے دیتا پھر بھی تو — لیکن کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ مجھے تیرا باپ خرید کر لایا تھا۔ جیسے تیرا دادا تیری دادی کو۔ جس نے انکار کیا اس نے اپنا خون کروا لیا۔ لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتیں۔"

"کل گڑ کے چاول پکاؤ گی نا پھر؟"

"بکرے کا گوشت بھی کھلاؤں گی۔"

"سچ؟"

"ہاں۔ اب سو رہو۔ دُعا کرو......"

"دعا کرو —" .... زلیخے کے کانوں میں گونجا اور اس کا دل جیسے اس خیال سے بیٹھنے لگا۔ کیا شیر خاں اپنا وعدہ پورا کرے گا — ہاں — وہ فجر کی نماز سے پہلے سو سو روپے کی سات گڈیاں اور ایک چھوٹا سا سونے کا ہار لے آیا — لیکن ہار کیوں؟

"روپے کم ہو گئے تھے، اس لیے یہ ہار سے پورے کر دیے ہیں۔"

"سونے کا ہے —"

"مجھ پر شک کرتی ہو —"

"اوہو — نہیں بیٹا۔ بھلا کبھی میں تم پر شک کر سکتی ہوں۔ میں نے زندگی میں —"

"فکر نہ کرو۔ زندگی رہی تو زلیخے کو کئی سونے کے اور ہار لا کر دوں گا — ایک مہینے بعد برات لے کر آؤں گا۔"

وہ پھر چونک اُٹھا اور خالہ کے سرہانے کے ساتھ لگی کھاٹ کی طرف اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"چور! چور!!" اسے دیکھ کر زلیخے کے کانوں میں گونجا۔ "چور تمھیں کتنا خوش رکھے گا ورنہ ہم لوگوں کے پاس چار بکریوں اور ایک مریل گائے کے سوا ہے ہی کیا۔ گھر میں ایک کھاٹ۔ وہ بھی کسی سے مانگی ہوئی — چار ٹنٹناتے برتن۔ کھانے کو مکی کا آٹا۔ دن رات لسی کے ساتھ کھانے کو — وہ تو پاگل ہے — خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا۔ وہ ساتھ چار پیسے کے کپڑے لتے اور زیور بھی لاتی۔ لیکن ماں کو دیے ہوئے روپے میری مٹھی میں تھوڑے آنے ہیں۔ اچھا کھانے پینے اور پہننے کو دے گا۔ اور سونے کا زیور بھی۔ سونے کا۔ زلیخے — چور — چور۔ تیرا شوہر شیر خاں نہیں — کیا چور رہے — پھر بھی! اور تو — بکری —"

زلیخے کمبل منہ پر ڈالے سوچتی رہی۔

اس کے چند روز بعد گاؤں میں خبر سنائی دی کہ شیر خاں نے راستے میں کسی تاجر کو لوٹ لیا تھا۔ وہ ڈیڑھ ایک ہزار روپے کی اون راولپنڈی بیچ کر آ رہا تھا کہ اُسے کسی نے چاقو دکھا کر لوٹ لیا۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق مجرم شیر خاں تھا۔ اس کے کمانی دار چاقو نے اُسے یک لخت پکڑوا، اور چھڑوا بھی دیا۔ سارے علاقے میں فقط اُسی کے پاس ایسا چاقو تھا جو اس نے سرحد پار سے منگوایا تھا۔ ڈکیتی کے وقت اس نے منہ پر ڈھاٹھا باندھ رکھا تھا۔ اور اس پھرتی سے روپے اڑا کر رفوچکر ہو گیا تھا کہ اس کا پتہ نہ چل سکا۔ فقط اُس کا نمایاں چاقو تاجر کو امتیازی نشان اور ثبوت کے طور پہ یاد رہ گیا تھا۔ یوں بھی جمعہ شیر خاں کے خاندان کا کوئی فرد کسی جرم کی لپیٹ میں آجاتا تو نہ جانے پولیس کو اس کے خلاف ناکافی ثبوت کیوں ملتا اور وہ بچ نکلتا۔

شیر خاں نے اپنی خالہ کو ایک ہزار روپیہ اسی تاجر سے لوٹ کر دیا تھا۔ باقی روپے جمعہ خاں نے وہ مقدمہ وقدمہ لڑنے کے لیے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس نے سو سو کے نوٹوں کے عوض اسے ایک ایک روپے کے نوٹ اور ایک ار بعد میں دے دیا تھا۔ چونکہ مستغیث بھی ایک بارسوخ تاجر تھا اس لیے وہ مجرم شیر خاں کو چھ ماہ قید کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن مقدمہ کے دوران ہی ایک ماہ بعد برات لے کر آیا اور زلیخے کو بیاہ کر لے گیا۔ اس نے اپنی ساس خالہ کو دلہن کو پوری طرح تیار کرنے کے لیے خوشبودار تیل، صابن حتیٰ کہ سہاگ کا لال ریشمی جوڑا بھی اپنی گرہ سے فراہم کیا تھا اور جب وہ گاؤں میں چاندی کے ’بندے‘ پاؤں میں مرگی سی چپل لیکن گلے میں سونے کا ہار پہن کر آئی تھی جو اس کی ماں کو شیر خاں نے دیا تھا تو اس کے گھر میں دلہن بن کر قدم رکھتے وقت شیر خاں نے اُسے کہا تھا۔

”چوری کے لباس میں پری معلوم ہوتی ہو۔“ یہ سن کر وہ پانی پانی ہو گئی تھی۔ اور اس کا جی چاہا تھا کہ شیر خاں کی پہنائی ہوئی سب چیزیں وہیں اتار کر اس کے منہ پر دے مارے۔ ”زلیخے! میری بات تمھیں بری لگی ہے۔ ہے نا۔؟“

لیکن وہ گم سم سی لکڑی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی گئی تھی، مور کی طرح اور اس نے اپنے کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے تھے۔

”میں دو چیزیں تمھیں بھیجنا۔ بھو۔ل۔ گیا تھا۔ معاف کرنا۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں سے سونے کے بندے نکال کر اُسے پہنا دیے اور پاؤں میں پہننے کے لیے ایک زری کی جوتی اپنے پاؤں سے اس کی طرف سرکا دی۔ یہ بستر کے پاس ہی رکھی تھیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے لیے زلیخے کو اس بات کی خبر نہ رہی کہ وہ کہاں ہے، اُس کے پاس کون کھڑا اس سے کیا باتیں کر رہا ہے —— وہ تو اپنے آپ کو ایک غار میں کھڑا دیکھ رہی تھی، وہی غار جو اس نے ایک ماہ پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ جب شیر خاں نے اُسے اُٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا تو وہ چونک کر اس سے لپٹ گئی جیسے کسی شے سے ڈر گئی ہو۔

”بکری، بکری ہے تو زلیخے۔ ارے، کیا ہوا ہے تمھیں؟ میں شیر خاں ہوں شیر خاں۔“

”شیں۔ شیں۔ شیر خاں شیں۔“ زلیخے نے اُس کی مسحور کن نیلی نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں وہ آنکھیں اس کے قریب سے قریب تر آتی گئیں۔

”شیر خاں شیں سب سے بڑا چور۔“ یہ سن کر شیر خاں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پہ شام لگی ڈانگ دے ماری ہو۔

وہ ایک لحظہ کے لیے رُکا، پھر اس نے شیر کی مانند زلیخے کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔

"زلیخے، پر تیرا تو میں مالک ہوں۔" یہ سن کر زلیخے نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی، پھر ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔

"اسی لیے تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"مجھے۔ تم پاگل ہو۔ لیکن وعدہ کرو تم چوری یا بُرا کام نہیں کرو گے۔"

"کوشش کروں گا۔"

شادی کے پندرہ روز بعد وہ ایک تاجر کو لوٹنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا، ڈیڑھ مہینہ تک مقدمہ چلتا رہا اور آخرکار اُسے چھ ماہ کی قید ہوئی۔

جب زلیخے اسے ڈسٹرکٹ جیل میں ملنے گئی تو اُس نے ہاتھ باندھ اس سے استدعا کی کہ آئندہ کے لیے چوری کرنا چھوڑ دے۔

"پگلی، بہت بھول کہ اگر کوئی اور ہوتا تو کم از کم ڈیڑھ دو برس کی قید ہوتی اسے۔ فکر نہ کر، اکری۔"

"مالک! ۔ شیر خاں ۔" زلیخے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "اسی لیے شادی کی تھی مجھ سے ۔۔۔۔۔ اور ۔ اور نہ جانے ۔ آگے چل کر کیا ہوگا۔"

اس کے جواب میں شیر خاں نے سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے بڑے پیار سے دبایا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تیری خاطر اتنی قید کوئی مہنگا سودا نہیں۔"

اور اس کے جواب میں زلیخے نفی میں سر ہلا دیتی جیسے اُسے خطرہ ہو کہ نہ جانے شیر خاں رہا بھی ہو یا نہ ہو یا اس کی قید میں توسیع ہو جائے۔ اُسے ہر ماہ یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے پاؤں میں کوئی وزنی شے باندھ دی گئی ہو۔ لیکن پہلے یہ احساس صرف اس تک ہی محدود تھا لیکن ایک وقت آیا جب شیر خاں کو بھی اس کا پتہ چل گیا...... یہ سن کر کہ وہ باپ بننے والا ہے اس کا جی چاہا کہ جیل کی سلاخیں توڑ کر باہر نکل جائے۔ پر اب تو وہ رہا ہونے والا تھا۔ یہ اس کی پہلی قید تھی جو اس نے پہاڑی گیت گا گا کر اور ہر ہفتے زلیخے کو ملنے کی خوشی میں کاٹ لی۔ بلکہ وہ قید ہونے کا متمنی معلوم ہوتا تھا۔

جہاں تک زلیخے کا گھر پر اکیلا ہونے کا سوال تھا، گو اُس کی ساس اُس کے پاس ہفتہ ہفتہ آ کر رہ جاتی، وہ اتنے کشادہ اور بھرے پُرے مکان میں اب تک اپنے آپ کو اجنبی سی محسوس کرتی تھی۔ چار پانچ کمروں، صحن اور ڈیوڑھی پر مشتمل شیر خاں کا اپنے لیے بنا بنایا ہوا مکان اُسے یہ کہتا محسوس ہوتا "تم میری نہیں ہو۔" لیکن اس کے اندر دھرے آٹھ دس بکس اس کے نرم نرم بستر، نئے نکور پلنگ، اور گائے بھینس کی ایک جوڑی سب اب اس کے تھے۔ اتنی کم عمر میں شیر خاں یہ سب کچھ کہاں سے لے آیا تھا۔ نہیں۔ یہ اُسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملے تھے۔ وہ خاندان جس کا نام اور کارنامے سن کر بڑے بڑوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے۔ زرخرید بیویاں بھلا ان کے سامنے کیسے دم مار سکتی تھیں۔ لیکن زلیخا کو شیر خاں کے گھر میں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اُس کی قیدی ہو اور وہ گھر ڈسٹرکٹ جیل جہاں وہ اُسے ہر ہفتے ایک بار ملنے جایا کرتی۔ اُسے

ں محسوس ہوتا کہ شیر خاں ہی اس گھر کا مالک نہیں۔ اس نے کسی کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس وقت اسے سینکڑوں گھر یاد آنے جو ایک ڈیڑھ کوٹھڑی پر مشتمل تھے جن میں اکا دکا بھیڑ بکری یا گائے بندھی نظر آتی۔ جن کے گوبر اور مینگنیوں میں فرشی گھاس پھوس پر سارا گھر، ماں باپ، بیٹا بیٹیاں کڑاکے کی سردیوں کے دو دو مہینے اندر ہی گزار دیا کرتے یا ساری رات دو تین کمبل یا پھٹی پرانی رضائی میں درخت کی سلگتی جڑ یا کٹی ہوئی بڑی سی شاخ کی آگ تاپتے، گھاس پھوس کی جوتیاں بناتے اور بھیڑ بکریوں ی اون کے کمبل بناتے بناتے، دن رات مکی کے آٹے کی روٹی اور لسی کھاتے پیتے گزار دیتے۔ ان کے تن پر مہینوں ایک ی جوڑا چلتا جو آخر کار چیتھڑے بن کر ان کے جسم سے لٹکنے لگتا اور پھر وہ ان میں پیدا شدہ سوراخوں کو شکستہ گھروں کے سوراخوں کی طرح بند کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔

جب کبھی سورج نکلتا تو ان کے گھر کی چھتوں سے بڑے درختوں کی طرح منجمد پانی کی لٹکتی ہوئی جٹیں عجیب سماں پیدا رتیں۔ ان کو پگھلاتی سورج کی شعاعیں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ گاؤں سے ڈیڑھ ایک کوس جھیل پر اس وقت عجب سماں ہوتا۔۔۔ وہ نیلگوں جھیل جس کی تہ میں پریاں رہتیں اور جدھر جھانکتے، نوجوان لڑکیاں اپنے ہوش و حواس کھو سی بیٹھتیں۔ اب برفیلا چٹیل میدان سی معلوم ہوتا۔ بعض نڈر، الھڑ دوشیزاؤں کی طرح زلیخے نے وہاں سے کئی مرتبہ پانی بھرا تھا اور اس کی منجمد سطح پر پھسلنے کا کھیل کھیلتی رہی تھی ۔۔۔ جب برف کی تہ کہیں سے اچانک پھٹ جاتی اور ایک آدھ لڑکا یا لڑکی اس میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا تو گاؤں والوں کو یوں محسوس ہوتا کہ انھیں کسی گناہ کی سزا ملی ہے ۔۔۔ یہ چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ زلیخے کے لیے۔ اس عرصہ میں اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ یک لخت پہاڑی غاروں سے نکل کر ان کی چوٹیوں پر پہنچ گئی ہو۔ لیکن یہ سب چھ ایک خواب تھا، ناقابلِ یقین خواب، ماسوائے اس کے کہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر پہاڑوں کی طرح جامد و ساکت دکھائی دیتی تھیں۔ پر شیر خاں ۔۔۔ جنگل کا شیر پنجرے میں یک دم قید کر لیا گیا تھا اور وہ ساری دنیا سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ اس کا بڑا بھائی ہوش سنبھالتے ہی کام کاج کی تلاش میں لاہور چلا گیا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو برس سے گھر بیس روپے ماہوار کے حساب سے وطن جانے جانے والوں کے ہاتھ روپے بھیجتا رہتا۔ اس نے ماں کو تاکید کی تھی کہ یہ رقم اس کی شادی کے لیے جوڑتی رہے۔ جب وہ ایک برس بعد ایک مہینے کی چھٹی پر وطن آیا تھا تو اور تو اور ایک لحظہ کے لیے شیر خاں بھی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا ۔۔۔ پتلون، بش شرٹ اور انگریزی جوتے پہنے، انگریزی وضع کے بال کٹوائے، بھرے بھرے اور تنے ہوئے سرخ گالوں والا یہ شخص تو کوئی اجنبی معلوم ہوتا تھا!

"اوے۔ تو۔ صاحب کے خانسامے!" شیر خاں نے اسے پہچانتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "اتار اس اترن و، کیا ہم پر رعب جمانے آیا ہے؟" اس نے جل کر عزیز گل زلیخے کے بھائی کو کہا۔

کتنا دکھ ہوا تھا زلیخے کو شیر خاں کی یہ بات سن کر ۔۔۔ وہ اب شیر خاں ہی کی بیوی بن کر اس کے گھر بیٹھے پچھلے دنوں سے اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ عزیز گل اسی لیے اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ زلیخے کی شادی کے بعد گھر پر اس کی ماں کے پاس اس کے دو چھوٹے بھائی رہ گئے تھے۔ باپ تو مدت کا کھانستا کھانستا چل بسا تھا۔ اس کے علاج کے لیے انھوں نے جو قرضہ اٹھایا تھا وہ کئی برس تک ان کے سر پر گرجتا رہا۔ زلیخے کی شادی کے بعد یہ بوجھ ان کے سینے سے کہیں جا کر

ہشا تھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس کی چھوٹی بہن بھی کہیں ٹھکانے لگ جاتی۔ جہاں تک ان کے چھوٹے بھائی کی نوکری کا تعلق تھا اس کے لیے عزیز گل لاہور میں کوشش کر رہا تھا۔ لیکن شیر خاں کی بڑی سخت ہدایت کے مطابق وہ گھر سے باہر ایک لمحہ کے لئے بھی پاؤں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں جب تک اس کا چچا جمعہ خاں گھر پہ نہ ہو تو وہاں پہ پہرہ دینا زیگنے کا فرض تھا۔ اسے شیر خاں کا حکم تھا کہ کسی غیر شخص کو گھر میں گھسنے تک نہ دے۔ اگر کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو کہہ دے کام سے ابھی باہر گیا ہے۔ گرفتار ہونے سے قبل اور بعد وہ متواتر کئی روز گھر سے غائب رہتا اور جب واپس آتا تو اچانک، دبے پاؤں، رات کے وقت۔

"اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا سو رہا ہوں"۔ وہ اس سے کہتا۔

"لیکن لوگ اگر یہ پوچھیں کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے تو کیا جواب دوں؟ تم نے مجھ سے حالات میں وعدہ کیا تھا......"

"اب۔ ہم ایک نہیں تین ہیں۔ تم، میں اور یہ بچی۔ اگر۔ کام۔۔ نہ کروں تو کھائیں کہاں سے؟"

"۔۔ دوسرے کیا بھوکے مر جاتے ہیں؟"

"دوسرے۔ دوسرے۔۔ ہوں۔۔ زبان لگ گئی ہے اب تمہیں"

عزیز گل کو دیکھا ہے تم نے۔ تھوڑے سے پیسوں میں کتنا خوش رہتا ہے۔ جو کھاتا ہے اُسے لگتا ہے؟

"تم جیسے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ دن رات کھانے کو جو کچھ نہیں ملتا" شیر خاں نے اب تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"......تم اگر اپنے ہاتھ سے کما کر کھاؤ تو سوکھی روٹی بھی گھی ہو کر لگے گی!"

یہ سن کر شیر خاں یوں تلملا اُٹھا جیسے اُسے کسی نے تیل میں بھیگا ہوا ہنٹر دے مارا ہو۔ کون ہوتی تھی زیگنے اُسے بار بار چور اور ڈاکو کہنے والی، اس کی زر خرید بیوی۔

"بکری کو کیا چارہ کہاں سے آتا ہے۔ تیری جان کیوں ہر وقت خطا رہتی ہے۔ تو کھا پی اچھے کپڑے پہن، حنیفہ (ان کی لڑکی) سے کھیل اور موج کر۔"

"جس بکری کو ہر وقت اپنے سامنے چھری دکھائی دے وہ کیا کھائے گی۔"

"تو فکر نہ کر۔ تیرا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔ آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں اس کی جو تیری طرف آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھے۔"

"...... مجھے کیا معلوم تھا تو میرے ہی لئے پہلے چھ مہینے قید کاٹے گا۔"

"لیکن اب تو میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوڑ دیا ہے۔ کب؟ شادی کے بعد تین مرتبہ جیل جا چکے ہو۔۔!"

یکے بعد دیگرے زیگنے شیر خاں کو بڑے معصومانہ انداز میں تازیانے پہ تازیانے لگا رہی تھی۔ سچ بھی یہ ہے کہ اُسے خود معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بکری کی طرح ممیا اُٹھتی، کبھی خوف کے مارے، کبھی فضا کی مخصوص گھٹن محسوس کر کے۔ ٹھیک ہے اپنے گاؤں میں اس نے شیر خاں کو شروع شروع میں چند نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کرنے کے سوا اور کوئی بُرا کام، چوری چکاری یا ڈاکہ ڈالتے نہیں دیکھا تھا وہ ایک ایسی بجلی تھا جو دور دور کے علاقوں میں گرتی تھی اور زیگنے کے لیے ایک مسحور کن لیکن ڈراؤنا خواب

. . . رات کے سناٹے میں جب وہ منہ پر ڈھاٹا باندھے گھر کے دروازے پر ہلکی سی خوفزدہ دستک دے کر اسے کھلواتا درپیچے سے پہلے اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا جاتا، وہاں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا یا اس کی کوٹھڑی کی کھڑکی میں کوئی پراسرار سایہ اسے پہلے سے کچھ سمجھاتا یا اشارے اشارے میں کچھ باتیں کرتا تو اس کے دل میں عجب وسوسے اٹھتے۔ وہ دوسرے کمرے میں شبہ میں پڑے پڑے دل کے کان لگا کر اس پُر معنی لیکن ناقابلِ فہم بھنبھناہٹ کو سنا کرتی۔ اتنے میں شیر خاں اس پر پیچھے سے جھک کر دیکھتا کہ آیا وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ اس پر زلیخے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کا گلا گھونٹ دے گا اور شیر خاں کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ وہ ابھی اٹھ کر اسے ہتھکڑی پہنا دے گی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پسینے میں شرابور ہو جاتے، ان کے سانس تھم جاتے، بالخصوص جب کبھی کبھار اس پر جھکے ہوئے شیر خاں کی سانس سہواً اس کے چہرے پر پڑتی تو اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے۔ اگر ایسی کیفیت میں اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل جاتی تو عجب نہ تھا۔

"زلیخے۔ زلیخے۔" شیر خاں اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا۔ "کیا بات ہے جانی۔ زلیخے۔ کیا ہوا؟" وہ معاً اس کے بستر میں گھس کر اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے پوچھتا "خواب دیکھ رہی تھی کیا۔ ڈراؤنا خواب — کیا۔ کیا دیکھا — تو نے؟"

"معلوم نہیں۔ کیا تھا۔ خواب کہ۔"

"کہ۔ تمھیں کوئی رسیوں سے باندھ کر کہیں دور لے جا رہا ہے۔"

"رسیوں سے ....؟ ہا ہا ہا۔"

"اس کھڑکی سے آتا ہے وہ!"

"کھڑکی۔ کھڑکی۔ کون سی۔ اوہ۔ تو تمھیں اس سے ڈر آتا ہے۔ لو میں بند کر دیتا ہوں۔ مجھے دراصل اندر گرمی لگتی ہے اس لیے اسے بعض اوقات کھول دیتا ہوں۔"

"چلو کہیں اور چلے جائیں۔"

"باپ دادا کا وطن اور گھر چھوڑ کر۔"

"عزیز گل بھی کتنی دور گیا ہوا ہے۔ ہمارے وطن کے چھوٹے چھوٹے لڑکے آئے دن روٹی کمانے پنجاب جاتے ہیں"

"عزیز گل۔ اس کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کیا کرو۔ بڑا مغرور ہو گیا ہے، شادی پر بھی نہیں آیا۔"

"چھٹی نہیں ملی ہوگی۔ ورنہ ضرور آتا۔ میرے لیے ایک ریشمی سوٹ بنوا کر بھیج دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات پرانی ہو گئی ہے میں تو کہہ رہی تھی ہم بھی کسی بڑے شہر چلے چلیں۔ وہاں دونوں کام کریں گے۔"

"کا.....م — کام — اگر تمھیں یہاں کی روٹی اچھی نہیں لگتی تو کہیں اور چلی جاؤ۔ تم جانا چاہتی ہو —؟"

"تمھیں کیا معلوم کہ لوگ ہمیں کیسی بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

"جلتے ہیں تم سے — کنگال امیروں سے جلا کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ کُڑھا نہ کر .... کوئی میرے متعلق پوچھنے تو نہیں آیا تھا......؟"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے سب لوگ ہر وقت ہمارے ہی گھر کو تکتے رہتے ہوں . . . . ."

"تمہیں تو وہم ہو گیا ہے۔ اچھا اب سو جاؤ۔"

عزیز گل کو شیر خاں سے پہلے دن سے ہی نفرت تھی۔ جب اُسے پتہ چلا تھا کہ اس کی ماں زلیخے کی اس سے شادی کر رہی ہے تو اس نے اُسے ایک چور کو اپنا داماد بنانے سے روکا تھا کیا ہُوا اگر وہ اس کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے جواب میں زلیخے کی ماں نے یہ جواب دیا کہ عزیز گل پھر اپنی بہن کے لیے کوئی ایک ہزار روپے دینے والا شوہر تلاش کر دے۔ ایسا دو ٹوک جواب سن کر عزیز گل خاموش ہو گیا تھا۔ بلکہ اُسے تب سے گھر خرچ کے لیے پیسے بھیجنے کی بجائے خود اپنی شادی کے لیے روپے جوڑنے کی فکر دامنگیر ہو گئی تھی۔ پتہ چلا تھا کہ وہ اب تنخواہ کے علاوہ فرصت کے اوقات میں مالی کا کام کر کے پچیس تیس روپے زائد بنا لیتا تھا۔ یہ کام سیکھ کر وہ گھر کے کام سے فارغ ہو کر جزوی طور پر نہ صرف اپنی کوٹھی میں ڈیڑھ ایک گھنٹہ صرف کرتا بلکہ ایک آدھ دوسری کوٹھی سے بھی روٹی کپڑا مفت۔ یوں اُسے کل سو روپے سے اوپر آمدنی ہو جاتی تھی سو روپے۔ صرف رات کو کام کرنے سے نہیں بلکہ دن کو۔ اُسے یہ خطرہ تو لاحق نہ رہتا کہ اُسے کوئی پکڑ کر لے جائے گا۔ شیر خاں تو اس عرصہ میں کئی بار چوری کرنے کے جرم میں سزا کاٹ آیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ پولیس اسے ہاتھ تک نہیں لگا سکتی۔ لیکن عزیز گل کام سے فارغ ہو کر کتنی بے فکری سے سوتا ہوگا۔ جیسے وہ خود شادی سے پہلے گھر پر سوتی تھی۔ کاش وہ چند روز کے لیے بھائی کے پاس سکھ کی نیند سونے کے لیے چلی جاتے۔ لوگوں کی کھا جانے والی نظروں سے بچ جاتے۔ حنیفہ بھی تو اپنے ماموں کو کتنا یاد کرتی تھی . . . . لیکن اب تو شاید وہ بھی ان سے خفا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ مہینے سے اُس کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اگر شیر خاں زلیخے کو لاہور یا کسی اور جگہ لے جانے کو تیار نہ تھا تو نہ سہی، وہ خود ہی چلی جائے گی۔ عزیز گل کے پاس لاہور۔ لیکن شیر خاں جب 'کاروبار' کے سلسلے میں گھر سے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ غائب رہے گا تو زلیخے کو گھر کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ نہ جانے اس میں کونسے خزانے بند تھے۔ ایک کمرہ اس کی اپنی کوٹھڑی تو اس کی عدم موجودگی میں ہمیشہ بند رہتی۔ زلیخے کو اس سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے اندر سے دو آدمیوں کے آپس میں گتھم گتھا ہونے کی آوازیں آ رہی ہوں۔ جب وہ بہت اکیلی محسوس کرتی تو اپنی چھوٹی بہن کو چند روز کے لیے اپنے ہاں بلا لیتی۔ صرف ایک دو روز کے لیے چونکہ شیر خاں کو اس کے سسرال میں سے کسی کا اس کے گھر آنا پسند نہ تھا۔

"نہ جانے کوئی کیا یہاں سے اُٹھا کر لے جائے۔ اتنی محنت سے گھر کی چیزیں بنائی ہیں۔ سب تیرے لیے ہیں، تیرے لیے زلیخے۔" شیر خاں زلیخے سے کہا کرتا۔ اُسے گھر کی ہر چیز اور اس کی تعداد یاد تھی۔ گھر میں کتنے پلنگ اور چارپائیاں، کتنے کمبل اور کتنے سرہانے ہیں۔ اگر ایک آدھ کہیں ادھر اُدھر ہو جاتی تو بہانے بہانے اپنے سسرال معلوم کرنے جاتا کہ وہاں تو منتقل نہیں ہو گئی۔

"ہم چور نہیں جو تم ہمارے ہاں پولیس کی طرح تفتیش کرنے جایا کرتے ہو۔" جب زلیخے کو شیر خاں کا اُن کے ہاں خود ہی کسی شے کو اِدھر اُدھر کسی بکس میں سہواً بند کرنے سے یا اپنے ساتھ باہر لے جانا بھول کر اُسے اپنے سسرال تلاش کرنے جانے کا پتہ چلتا تو وہ اُسے تنگ کرتی۔

"سنبھالو اپنا گھر، میں چلی — ہم چور جو ٹھہرے —" زینب نے ایک روز شیر خاں کو اس کے چھوٹے بھائی پر شک کرنے پر غیر معمولی حد تک بگڑ کر کہا۔

"پہلے تو پاگل تھی، اب میں پاگل ہو گیا ہوں۔ غصہ تھوک دو۔ دراصل میں ہی بھول گیا تھا۔ میں وہ چادر ایک دوست کو دے آیا تھا۔" یہ چادر دراصل چوری کا مال تھا اس نے چند روز تک تو اُسے اپنی کوٹھڑی میں چھپا رکھا تھا، پھر ایک روز کسی کو بیچ آیا تھا اور یہ رقم کب کی کھا پی بھی چکا تھا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں اب باہر کم جایا کروں گا اور اگر تم چند روز کے لیے لاہور جانا چاہتی ہو تو ہو آنا۔ لیکن جونہی میرا پیغام پہنچے واپس چلی آنا۔"

شیر خاں کے منہ سے لاہور جانے کی اجازت سن کر زینب کو گھر کی دیواریں پیچھے ہٹ کر اس کے لیے باہر جانے کا راستہ انی حوم ہو گئیں۔ چھ برس میں پہلی بار آزادی کے خیال نے اُسے چکرا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر خاں کو دیکھنے لگی۔ کیا یہ جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ اس نے دل ہی میں سوچا۔ ضرور کوئی بات ہے۔

"سچ؟ — کب؟"

"جب بلاؤں تب آنا۔"

"تو ابھی نہیں جاتی۔"

"ہائے اُلٹی کھوپڑی —— میں نے کہا ہے کہ — جونہی بلاؤں واپس آ جانا۔"

"اکیلی؟ — تم؟"

"فکر نہ کرو، تجھے کوئی راستے میں سے اُٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو شیر خاں کا نام لے دینا۔"

اس پر زینب ہنس پڑی، اس کی مخصوص خاموش ہنسی جو وہ بہت کم ہنستی۔

"تمہارے ساتھ بھی کسی کو بھیج دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آجکل کاروبار بھی ذرا مندا ہو گیا ہے۔"

"اچھا ہوا — پھر شہر میں کوئی نوکری تلاش کر لیں گے۔"

"تو نری بکری کی بکری رہی۔ بھوکا نہیں مرنے دیتا تجھیں۔ وہ کم بخت —!"

"کون؟ —"

"کو۔ کوئی نہیں۔ قسمت کے پھیر ہوتے ہیں۔"

"خدا کے لیے اب پھر کہیں جیل میں —— میں تباہ ہو جاؤں گی۔ تمھیں۔ دیکھو۔ خدا رسول کا واسطہ دیتی ہوں۔"

"اری، کیا بات بات پہ ڈر جاتی ہے تو بھی۔ شیر خاں تو شیں ہے شیں — تو شیر خاں شیں کی بیوی ہے .... تو پانچ چھ روز تک چلی جانا — اب تو خوش ہونا —؟"

ان دنوں شیر خاں بڑا گھبرایا گھبرایا رہتا۔ اس کی وجہ علاقے کا نیا تھانیدار خدا داد خاں تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بدمعاشوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ جمعہ خاں، شیر خاں اور اُن کے ساتھی مدتوں کسی ایسے تھانیدار کا اپنے علاقے میں تبادلہ

ہونے سے رکواتے رہے تھے۔ لیکن جب سے حکومت نے ہر محکمے کے کئی بڑے بڑے افسر سکریننگ کے ذریعے بے ایمانی اور رشوت ستانی کے الزام میں برطرف یا موقوف کر دیے تھے تو جمعہ خاں پارٹی کی شامت آ گئی۔ خداداد خاں جیسے جابر اور ایماندار افسر کو جمعہ خاں پارٹی کا ہی قلع قمع کرنے کے لیے اس علاقے میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس نے بھی قسم کھائی تھی کہ ان خاندانی چوروں اور قاتلوں کی بیخ کنی کر کے ہی دم لے گا۔ اُسے اپنے کپڑوں پر پیوند لگوانے میں شرم نہ آتی، نہ ہی روکھی سوکھی کھانے میں۔ چنانچہ اس نے علاقے میں آتے ہی پہلے جمعہ خاں اور پارٹی اور تمام دس نمبریوں کی کانفرنس بلائی اور اس میں انھیں متنبہ کر دیا کہ اگر اُس کے پاس ان کے خلاف آئندہ کبھی کوئی شکایت پہنچی تو وہ انھیں اُلٹا لٹکا کر ان کی چمڑی اُتروا دے گا۔ اس تنبیہ کے علاوہ اس نے اپنے بیشتر ماتحت بھی بدلوا کر ان کی جگہ قابلِ اعتماد آدمی رکھے۔

خداداد نے یوں بدمعاشوں کے پاؤں میں جیسے میخیں گاڑ دی تھیں۔ چنانچہ اب شیر خاں کا بھی رات کے وقت حاضری دینے کے لیے گھر پر رہنا ضروری ہوتا۔ نئے تھانیدار خداداد خاں جسے شیر خاں اور پارٹی نے قہر خاں کا نام دیا، کے آنے سے سارے گاؤں انھیں تھانہ دکھائی دینے لگا۔ جب رات کو پولیس کا سپاہی ان کے مکان کے سامنے آ کر ان کی حاضری کے لیے ان کا نام بلند آواز میں لے کر پکارتا اور اُن کے باہر آنے کا منتظر رہتا تاکہ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ وہ گھر پر موجود ہیں اور ان کے کسی نعم البدل نے ان کی طرف سے جواب نہیں دیا تو ان کے جی میں آتا کہ اُس کی گردن وہیں مروڑ کر رکھ دیں۔

”شیر خاں۔ کیوں بھئی گھر پہ ہو؟“ جب سپاہی شیر خاں کے گھر کے سامنے آ کر آواز دیتا تو اُس کا ہاتھ فوراً اپنے کمانی دار چاقو کی طرف لپکتا اور وہ دوسرے بدمعاشوں کی طرح پولیس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا گھر سے باہر آ کر بڑے اکھڑ انداز میں جواب دیتا: ”ہاں بھئی۔ گھر پہ ہی ہوں۔ نیند کیوں خواہ مخواہ خراب کیا کرتے ہو۔“ رات کے وقت حاضری دینا اُسے پولیس سے علانیہ جوتے کھانے کے مترادف تھا۔ کمبختوں نے اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ تھانیدار کے حکم کے مطابق انھیں شام کے چھ بجے سے لے کر صبح کے چھ بجے تک گھر سے باہر قدم رکھنا منع تھا۔

پولیس کے اس قدم سے زلیخے کو عجب سکون حاصل ہُوا جیسے اس نے شیر کو پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ اب تو شیر خاں بُرے کاموں سے باز آ جائے گا اور اگر اُس نے کسی قسم کی گڑبڑ کی۔ تو ـــ نیا تھانیدار اسے کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید نہ کر دے۔ پھر میں کیا کروں گی۔ کیا مجھے بھائی کے پاس لاہور جانا پڑے گا۔ زلیخے کا ذہن چرخے کی طرح چلنے لگا۔ وہ شیر خاں سے اس ضمن میں استفسار کرنے سے بھی ڈرتی کیونکہ وہ بات بات پر کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔ نیا حکم نافذ ہونے پر اس نے تین دن کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر ایک رات جب وہ حاضری سے گیارہ بجے ہی فارغ ہو گیا تو باہر جانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہُوا۔ اس وقت زلیخے کو یوں محسوس ہُوا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اکیلی رہ جائے گی۔ اُس نے اس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑا کر اس سے کہا:

”شیر خاں! تمھیں خدا کی قسم باہر نہ جاؤ ـــ“

”کہیں دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمھارا۔ میں ذرا ہوا خوری کے لیے باہر چلا ہوں۔ ورنہ میرا یہاں پڑے پڑے

دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گا زلیخے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں۔ میں۔ اب۔ ابھی واپس آجاؤں گا۔ تمھیں معلوم ہے میں رات گئے گھر واپس آنے کا عادی ہوں۔ بس۔ بس۔ شطرنج کی ایک بازی کھیل آؤں۔" اس نے زلیخے کا گال بڑے پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "دروازے کے پاس ہی چارپائی ڈال لو۔ میں جونہی آؤں کھول دینا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس کا کچھ جواب دیتی وہ بڑی سرعت سے گھر سے باہر نکل گیا۔ کالے کپڑے پہنے وہ تاریکی کا جزو بن گیا۔ اُس کے جانے کے بعد زلیخے دروازے کا کنڈا لگا کر وہیں ڈھیری ہو گئی۔ اور اس کے کان شیر خاں کی واپسی پر لگ گئے۔ اس نے معاً اُٹھ کر دُور کونے میں جلتی لالٹین کی بتی نیچے کر دی تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ شیر خاں گھر پر نہیں ہے اور وہ دروازے سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کرتی رہی۔

خیالات اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اُسے ایسے لگا جیسے ایک درخت سے ایک انسان نما شبیہ ایک راہ گیر عورت پر بجلی کی طرح لپک کر اُسے منہ میں اُٹھا کر لے گیا ہے۔ جب وہ لرز کر چونکی تو اُسے کہیں دُور سے "شیں، شیں" کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ والے دیہات میں چیتا حملہ آور ہوا تھا اور کسی کی بھیڑ یا بکری اٹھا کر لے گیا تھا۔ "شیر خاں ابھی نہیں آیا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس کی حاضری تو ہو گئی ہوئی ہے۔" زلیخے نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ایک لحظہ کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس دوران ان کے کوٹھے پر دھب سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ "بلی ہو گی۔" زلیخے نے لاشعوری طور پر اپنے پاس پڑی ہوئی تلوار کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ لالٹین بجھ گئی ہے۔ لیکن اس نے تو ابھی شام کو اس میں تیل کی پوری بوتل ڈالی تھی! وہ عجیب خوف سے کانپ اُٹھی۔ کسی نے بتی بجھا تو نہیں دی کیا؟ اس نے جلدی سے ٹارچ جلا کر اس کی وجہ معلوم کرنا چاہی لیکن ٹارچ تو اندر سے خالی تھی۔ اب اُس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ مکان میں ضرور کوئی گھس آیا ہے۔ سانس لگا کر۔ بہر نوع وہ جی کڑا کر کے تلوار ہاتھ میں تھامے گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ چلتی ایک کونے تک جا پہنچی اور تلوار تان کر، دبک کر وہاں بیٹھ گئی۔

اس وقت اُسے شیر خاں کی کوٹھڑی سے روشنی کی باریک سی شعاع رینگتی دکھائی دی۔ کوٹھڑی کا دروازہ شیر خاں جاتی دفعہ بند کرنا بھول گیا تھا، اُسے معاً خیال آیا۔ پھر روشنی بند ہو گئی۔ یہ ٹارچ کیا اس کی ہی تو نہ تھی۔ ہیں۔ وہ تو خالی تھی۔ شیر خاں کے پاس تو اپنی ٹارچ تھی۔ اس نے پھر آواز پر کان لگا دیئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کپڑے اتار رہا ہے۔ سرسر۔ سرسر۔ کپڑوں کی سرسراہٹ۔ پھر ننگے پاؤں چلنے سے کوٹھڑی سے ملفوف سی آواز اُبھری۔ یہ رک گئی۔ پھر "زلیخے۔ زلیخے" کی دبی ہوئی کھسر پھسر سی سنائی دی۔ یہ تو شیر خاں تھا۔ "زلیخے زلیخے۔ جانی" اب زلیخے کو یقین ہو گیا کہ یہ شیر خاں ہی تھا لیکن اس وقت اسے اس کی آواز میں عجب کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں ہوں۔"

"شیر۔ تم کب آئے؟"

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں نے لالٹین بھی بجھائی تھی۔"

"اوہ ۔ تو لالٹین تم نے بجھا دی تھی ۔"

"کیوں ؟"

"رات کے وقت اس کا جانا ٹھیک نہیں ۔ خواہ مخواہ پڑوسیوں کو شک گزرتا ہے ۔"

"اور بیٹری ؟"

"جاتی دفعہ اس کا مصالحہ میں جو نکال کر لے گیا تھا ۔"

"چور ۔۔ !"

"چور ! ۔ چور ۔۔ زلیخے ۔" شیر خاں نے اپنی چیخ دباتے ہوئے کہا ۔

"ڈرو نہیں ۔ لیکن تم آئے کہاں سے ۔"

"کھڑکی کھلی چھوڑ گیا تھا ۔"

"کھلی ! ۔ شیر، کھڑکی کھلی ! ۔"

"نہیں نہیں ۔ میرا مطلب ہے میں نے خود باہر سے کھولی تھی ۔"

"وہ کیسے ۔ اور کیوں ۔"

"کیسے تو پھر بتاؤں گا ۔ کیوں، اس لیے کہ تم اور ساتھ والے کہیں ڈر نہ جائیں ۔"

"بڑے چالاک ہو ۔ بالکل شیں ہو نہیں !"

اس پر شیر خاں ہنس دیا ۔

"تم نے کپڑے بھی بدل ڈالے ۔ میں بھی کہتی تھی یہ سُرسُر کی آواز کیا ہے ۔"

"آں ۔۔۔ ہاں ۔ راستے میں کیچڑ میں ۔ پاؤں پھسل گیا، سارے کپڑوں کا ستیاناس ہو گیا ۔۔ کوئی آیا تو نہیں تھا ۔"

"نہیں ۔"

"اچھا تو ۔ جلدی جلدی دو ایک مرغے ذبح کر کے بھون ڈالو ۔"

"ابھی تو دن بھی نہیں چڑھا ۔"

"لیکن اب تو فجر کی بانگ بھی ہو چکی ہے ۔"

"ابھی کچھ دیر آرام کر لو ۔"

"کھا کر سوؤں گا ۔"

"مرغ میں لا دیتی ہوں ۔ ذبح تم کر دینا ۔"

"نہیں نہیں آج تم خود ہی کر لو ۔"

زلیخے کے پاس ہر وقت پندرہ بیس مرغے مرغیاں رہتے ۔ جو شیر خاں نے اپنے لیے پال رکھے تھے ۔ لیکن جب زلیخے انھیں لینے برآمدے میں پڑے ڈربے کی طرف گئی تو ایک سایہ سا جھپاک سے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھ کر کوٹھے کی طرف چلا

اور [illegible] گٹھڑی اٹھائے نیچے اتر آیا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ یہ شیر خاں تھا۔ اس نے گٹھڑی میں سے کوئی چیز نکال کر [illegible] اچھی طرح کپڑے سے پونچھا، پھر اپنی جیب میں ڈال لیا اور گٹھڑی بکس میں بند کر کے اسے تالہ لگا دیا۔ ادھر ادھر جھانکا، پھر اپنے بستر پر یوں گر پڑا جیسے اس میں کھڑے ہونے کی سکت نہ ہو۔

وہاں پڑا پڑا وہ یک [illegible] چونک کر اٹھ بیٹھتا، پھر لیٹ جاتا۔

"یہ روشنی کدھر سے آ رہی ہے۔ دروازہ بند کر دو زلیخے۔ کہاں ہو، کیا کر رہی ہو، دروازہ بند کر دیا تھا نا؟" اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ "بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرا پیٹ کاٹ رہا ہو۔"

"ابھی ایک ہی ہوا ہے۔"

"وہیں لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

جب زلیخے ایک مرغا بھون کر اس کے پاس لے آئی تو شیر خاں نے اُسے اپنے قریب آنے کو کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"آنکھیں بند کر لو۔"

"بات کیا ہے آخر؟"

"میں جو کہتا ہوں، آنکھیں بند کر دو۔"

"کیا ہے۔ یہ؟"

"اب آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔"

"ہار۔ سونے کا ہار۔ شیر خاں۔ کیا رات میں چو۔"

"چوری نہیں، قتل کا ہار۔ قتل کا، شیر خاں۔ خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا!"

سپیدۂ سحر تیزی سے پھیل رہا تھا۔ سب انسپکٹر خداداد نے یک لخت دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

زلیخے صحن سے لکڑی لیکر آئی تو واپسی پر دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ اس وقت دبے پاؤں جوتا اتار کر پیچھے سے سیڑھی لگا کر، پولیس کے سپاہی ایک ایک کر کے کوٹھے پر آ رہے تھے اور اس پر لیٹ کر اس موقعہ کا انتظار کر رہے تھے کہ اگر ممکن ہو وہ دروازہ توڑے بغیر مکان میں داخل ہو جائیں۔ شیر خاں کے زلیخے کو اندر بلانے پر وہ پنجوں کے بل ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے لیکن اب سب انسپکٹر خداداد خاں عرف قہر خاں آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے سپاہیوں نے بندوقیں مضبوطی سے تھام لیں اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ دو سپاہی شیر خاں کی باہر کو نکلتی ہوئی عقبی کھڑکی پر پہرہ دینے لگے۔

خداداد کے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جو اس نے شیر خاں پر تان لیا تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھ سیل والی بیٹری تھی۔ جونہی اس کی شعاع شیر خاں کی آنکھوں میں پڑی وہ جست لگا کر ایک کونے کی طرف لپکا۔ اتنے میں اس کے قدموں کے پاس ہی پستول کا ایک فائر ہوا اور شیر خاں دہشت کے مارے وہیں منجمد ہو کر رہ گیا۔

"رحم کرو سرکار، رحم۔ خدا کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔ یہ بے گناہ ہے۔"

"کرلو گرفتار۔ اور مکان کی فوراً تلاشی لو۔" خداداد نے کڑک کر کہا۔ مکان کی ڈیوڑھی کے دروازے کے ساتھ لگی ایک جڑ بُت فاتحانہ انداز میں خداداد کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی — پولیس کی خاص مخبر۔ اندر سے زلیخے نے خداداد کے قدموں پر پڑ کر گڑگڑا کر شیر خاں کو چھوڑ دینے کی التجا سنائی دے رہی تھی۔ وہ روتی چیختی، سینہ پیٹتی تھانیدار سے منت سماجت کرتی جاتی کہ اب شیر خاں کو چھوڑ دو۔" اگر اس نے کبھی پھر چوری کی تو میں اس کا خون کر دوں گی!"

"خون! — حضور یہ دیکھیے، بکس سے گٹھڑی میں بند یہ خون آلود زنانے کپڑے برآمد ہوئے ہیں۔" ایک سپاہی نے تھانیدار کو ایک گٹھڑی اور چند کپڑے دکھاتے ہوئے کہا۔

"بالکل تازہ ہے — ہے نا شیر خاں؟"

یہ سن کر شیر خاں چیتے کی مانند کپڑوں کی طرف جھپٹا۔ لیکن تھانیدار نے اس کے سر پر زور سے پستول کا دستہ مار کر اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔ اس اچانک حملے کی تاب نہ لا کر شیر خاں تیورا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

"ہتھکڑی لگا کر تھانے لے چلو۔ اور جمعہ خاں کے ساتھ اسے بھی حوالات میں بند کر دو۔"

"شیر خاں نے کیا خون کیا ہے — اور یہ ہار —" زلیخے چیخ اٹھی اور معاً غش کھا کر فرش پر جا گری۔

"یہ ہار بھی اتار لو۔ بڑی بدقسمت ہے۔ بیچاری!!"

چنانچہ شیر خاں کو اسی رات چار میل دور ایک گاؤں میں ایک نوجوان لڑکی کے قتل میں مدد دینے کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا۔ اس واردات کی تفصیلات یہ تھیں کہ شیر خاں کے چچا جمعہ خاں نے رات کے پچھلے پہر ایک سواتی زمیندار کی بیاہتا لڑکی کو رات کے پچھلے پہر رسہ کے ذریعے اس کے والد کے گھر میں گھس کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پانچ برس ہوئے مقتولہ کے والد نے جمعہ خاں جیسے بدمعاش اور غیر سواتی شخص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت جمعہ خاں نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اگر اس نے اپنی لڑکی کی کسی دوسری جگہ شادی کی تو وہ اس سے سخت بدلہ لے گا۔ چونکہ لڑکی کا والد خاصا تگڑا اور نڈر زمیندار تھا اس لیے اس نے جمعہ خاں کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی سال اپنے ہی خاندان میں اپنی لڑکی کی شادی کر دی تھی۔ اس دن سے جمعہ خاں لڑکی کو قتل کرنے کے لیے موقعہ کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ برس بعد وہ جب باپ کو ملنے گھر آئی تو جمعہ خاں نے اُسے کمرے میں تنہا پا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیر خاں سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے لاش کو کوٹھے پر سے نیچے پھینک دیا تاکہ موخر الذکر اُسے فوراً ٹھکانے لگا دے۔ مقتولہ چونکہ نہایت قیمتی کپڑے اور ایک آدھ زیور پہننے کی عادی تھی اس لیے قاتل نے یہ چیزیں شیر خاں کو انعام کے طور پر دے دیں۔ علاوہ ازیں اُسے پانچسو روپیہ نقد دینے کا بھی وعدہ کیا۔ جمعہ خاں نے قتل کے وقت مقتولہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تاکہ اس کی لاش باہر پھینک کر اوپر سے چھلانگ لگا کر فرار ہو جائے لیکن لڑکی کی چیخیں سن کر جب گھر کے افراد دروازہ توڑ کر اندر آ پہنچے۔ اس عرصہ میں جمعہ خاں کوٹھے سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ لیکن شدید اندھیرے کے باعث زمین پر گرنے کی بجائے ایک پتھر پر جا گرا جس سے اس کا کولہا ٹوٹ گیا جس کے باعث وہ وہیں پکڑا گیا۔

اس اثناء میں شیر خاں نے وقت کی کمی کے باعث اور اس ڈر سے کہ رات گشت کرتا ہوا کوئی سپاہی اُسے گھر پر

موجود نہ پا کر اس پر کسی قسم کا شک کرے۔ مقتولہ کے کپڑے تھے اور زیور اتار کر اسے ایک عمیق کھڈ میں پھینک آیا۔ اُسے یقین تھا کہ جنگلی جانور صبح ہونے سے پہلے لاش کو ہضم کر جائیں گے۔ سارے راستے میں یہ بھی ڈر لگا رہا کہ اگر اس نے لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے چاہے تو کہیں سے کوئی جنگلی جانور اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ رات کو کالے کپڑے پہنے تاکہ وہ تاریکی کا ایک جزو بن جائے وہ لاش کو کندھے پر اٹھائے اور ایک ہاتھ میں تلوار لیے بجلی کی مانند مقتولہ کے گاؤں سے آدھ ایک میل دور کھڈ کی طرف لپکا اور لاش کو ٹھکانے لگا کر ایک اور راستے سے سرپٹ بھاگتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ جہاں اس نے پہلے اپنے مکان کے کوٹھے پر گٹھڑی کو پھینک دیا اور بعد ازاں اپنی کوٹھڑی کی کھڑکی کو اندر سے مخصوص طریقے سے کھول کر مکان کے اندر آ گیا۔ اس وقت زلیخے کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کیے اونگھ رہی تھی۔ اس کی دائیں جانب کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اس نے لپک کر پہلے اُسے گل کر دیا۔ پھر اپنے خون آلود سیاہ کپڑے بدل ڈالے۔ وہ ہاتھ منہ راستے میں ہی ایک ندی پر دھو آیا۔

اس کے نتیجے میں اس پر اور جمعہ خاں پر آٹھ نو مہینے مقدمہ چلتا رہا۔ جمعہ خاں کو قتل کے جرم میں سزائے موت ہوئی، شیر خاں کو اس میں شریک ہونے کی بنا پر بارہ برس قید بامشقت۔ ہر دو مجرموں نے سزائیں تخفیف کے لیے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔

" بارہ برس!" جب عزیز گل نے زلیخے کو لاہور میں وطن سے آیا ہوا مقدمے کے فیصلے کے بارے میں خبر سنائی تو وہ ایک لمحہ کے لیے پتھرا گئی۔ " بارہ برس۔"

" زلیخے۔ فکر نہ کرو۔ انھوں نے اپیل کی ہے۔ قید کم ہو جائے گی۔" عزیز گل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

" قید کم ہو جائے گی۔ تجھے کیا۔ جہنم میں جائے وہ اور میں۔ تم نے تو ایک روز بھی گھر آ کر نہ پوچھا۔ زلیخے زندہ ہے یا مر گئی اور ماں ایک ہزار روپیہ لے کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی ....."

" زلیخے۔ زلیخے۔ اس میں میرا کیا قصور۔ ؟"

" تمھیں کیا۔ زلیخے جئے یا مرے۔ تمھیں تو اپنی شادی کی پڑی ہے، اپنی کی۔"

مدت سے افواہیں گرم تھیں کہ اس دفعہ شیر خاں اور جمعہ خاں کو کوئی طاقت پوری سزا ہونے سے نہیں بچا سکے گی۔ شیر خاں کے کہنے پر زلیخے نے گھر کی ہر شے حتیٰ کہ گھر تک بیچ کر مقدمہ لڑنے پر لگا دیا تھا۔ جب اس پر آخری روپیہ خرچ ہو گیا تو اس نے عزیز گل کی طرف رجوع کیا۔

" کچھ دیر جیل میں سڑنے دو۔ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" عزیز گل نے جل بھن کر اپنی شادی کے لیے پسماندہ سات سو روپے میں سے پہلے سو روپے زلیخے کو مقدمہ لڑنے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔ اور بعد ازاں تین سو روپیہ اور دے کر اس نے ہاتھ روک لیا۔ زلیخے کو اپنی لڑکی سمیت اس کے ہاں پڑے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ عزیز گل کی بچی کھچی تنخواہ ان پر ہر ماہ خرچ ہو جاتی۔

" بارہ برس کٹ کر نو یا دس رہ جائیں گے .... نو برس۔ زلیخے۔ اس وقت تک کیا ہو گا۔" اپیل دائر ہونے پر اس نے سوچا۔

" نو لمبے برس۔" زلیخے نے بھی سوچا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی رنگت پیلی پڑتی گئی اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑنے لگی۔ وہ

مدد متواتر بھائی کے ہاں کھانے کو ہاتھ نہ لگاتی۔ آخرکار اُس کی پڑوسن عورتوں کے بھانے بجھانے پر اس نے مصیبت کے یہ دن کاٹنے کے لیے بیس روپے ماہوار مع روٹی کپڑا ایک گھر میں ملازمت کر لی۔ جس سے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں کی چمک دوبارہ عود کر آئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اب بغیر بھوکے نہیں مریں گے۔ کوئی چور راہ سے ان کی محنت کا معاوضہ نہیں چھین کر لے جائے گا۔

اب غلام محمد بلے نے جو اپنی نیلی آنکھوں کی وجہ سے بلا تنور والا کہلاتا عزیز گل کے نام زلیخے کے لیے پیام بھجوایا۔ زلیخے چند ہفتوں سے بلے کے تنور پر روٹیاں لگوانے کے بہانے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھی رہتی۔ گورا چٹا، کشادہ پیشانی، گھنگھریالے بال، چھریرا جسم اور ضرورت کے وقت ہتھ چھٹ بلا۔ اس نے ایک روز خود زلیخے کو اُس سے شادی کرنے کی پیشکش کی تھی۔

"...... وہ اب جیل سے واپس نہ آئے گا۔ جمعہ خاں کی مانند۔ میں نے تمھارے لیے تھانیدار سے مشورہ لیا ہے۔ وہ بھی کہتا ہے زلیخے سے کہو۔ شیر خاں سے کاغذ لے لے۔"

اس عرصہ میں عزیز گل کو ان دونوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے تعلقات کی بھنک پڑ گئی تھی۔ جب یہ خدائی نقارہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو عزیز گل نے زلیخے کا بلے سے ملنا قطعاً بند کر دیا۔

"اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ نہ صرف تمھارا بلکہ ہم سب کا خون کر دے گا۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"اپنے ساتھ ہم سب کو مروانے پر تلی ہوئی ہے کیا؟"

"میں پہلے کیا کم مری ہوئی ہوں۔ بیس برس یہ قید کاٹتے ہو گئے ہیں۔ مجھے کاغذ دلوا دو۔"

"کاغذ!..... تیری تو مت ماری گئی ہے!"

"تو جو بڑا عقل والا ہے۔ مجھے کاغذ لا کر دو گے کہ نہیں؟" زلیخے نے گھگھیا کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں اُس کا جواب معلوم ہے۔ پھر بھی ضد کرتی ہو۔"

"میں کب تک اس کی راہ دیکھتی رہوں گی!"

اس کے جواب میں عزیز گل کی گردن اس کے سینے پر یوں ڈھلک گئی جیسے کسی نے اس کا منکا توڑ دیا ہو۔ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکال کر زلیخے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"... کسی سے پڑھوا لو۔"

"یہ کب آیا تھا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا.... کیا لکھا ہے۔؟"

"کیا دکھاتا اور کیا سناتا ۔ ایک ہفتہ ہوا آیا تھا۔"

"کچھ منہ سے بولو تو۔"

"— اُسے بلے کے معاملے کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ اِس نے لکھوایا اور کہلوایا ہے کہ زندگی بھر طلاق نہیں دوں گا... اور۔ گر۔ کو۔ کوئی گڑبڑ کی تو جیل سے رہا ہو کر سب کا خون کر دوں گا!"

ڈائن

اختر جمال

کمرے اندھیرے میں اچانک کسی نے اسے سوتے سوتے دبوچ لیا۔ وہ چیخ مارنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق میں آواز گھٹ کر رہ گئی۔ کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ خود کو اس انجانے بھوت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ بالکل بے بس ہو گئی۔ آخر کار اس نے خود کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

اور جب اس نے تھک کر اپنے جسم کو ڈھیل دی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے بدن پر ڈھائی من کا بوجھ رکھا ہوا ہے... گوشت ہی گوشت۔ بھیانک گوشت جس کے نیچے دب کر اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اسے اپنے گالوں پر موٹے موٹے دہکتے ہوئے ہونٹ محسوس ہوئے مانو ان میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ سانسوں کے شعلے اس کے کومل چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے اور اس بھوت نے اسے بے تحاشہ چومتے ہوئے کہا "ڈرو نہیں —— ڈرو نہیں پیاری! —— میں ہوں چاندنی —— تمہاری چاندنی۔"

"کون؟ —— مس چاندنی —— میرے اللہ!" اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ مس چاندنی نے اسے اچانک سوتے ہوئے کیوں پکڑ لیا ہے۔ آخر وہ کیا چاہتی ہیں؟ مس چاندنی ایک دم وفورِ جذبات سے پھوٹ پڑیں۔ "مجھے تم سے محبت ہے!" گہری سانس لے کر انہوں نے سرگوشی میں کہا —— "جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا ہے میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ میں تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں۔ مجھ پر رحم کرو ——!"

"آخر —— آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ سہم کر بولی۔

"میں بس تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں۔ میں... میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔"

اس کا دل چاہا کہ ڈھائی من کے بوجھ کو زمین پر گرا دے اور اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دے —— ڈائن —— بڑی آئی پیار کرنے والی۔ اس سے پیار کرنے والے بھلا کم ہیں —— امّی، ابّا، بھیّا، آپا —— اور —— اور ادریس بھائی —— شاید وہ بھی پیار کرتے ہیں جبھی تو اس کی طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور تنہائی میں ہمیشہ جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کچھ نہیں کہہ پاتے —— مگر آج تک کسی نے بھی اس طرح پیار نہیں کیا۔ یہ کیسا عجیب و غریب پیار ہے۔ یہ تو شاید دھوکے سے اسے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ آدھی رات کو اس طرح اچانک کمرے میں آنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ لیکن وہ اسے کیوں مارنا چاہتی ہے؟ —— اگر وہ اپنا نام نہ بتاتی تو اندھیرے کی کوکھ میں جنم لینے والی اس ڈھائی من کی چیز کو وہ ضرور ڈائن سمجھتی —— مگر کیسی عجیب بات ہے

مگر وہ مس چاندنی ہے ——!

کالج میں داخلہ لئے آج اسے پورا ہفتہ ہوا ہے۔ کاش وہ کالج میں داخلہ ہی نہ لیتی۔ بلا سے گھر پہ پڑھ پڑھ کر ہی امتحان دے ڈالتی امی تو یہی چاہتی تھیں مگر ابا میاں چاہتے تھے کہ فیروزہ ڈھیر سی ڈگریاں لے۔ کتنی اچھی اچھی باتیں سوچ کر انہوں نے اسے کالج میں داخل کرایا تھا۔ ہوسٹل اور کالج کے اخراجات کے لئے اپنے ضروری مصارف میں کمی کی تھی۔ مگر اس قربانی کا الٹا ہی نتیجہ ہوا۔ تعلیم و علم تو الگ رہی اس کی جان پر بھی آبنی —— وہ ان کے غلیظ پیاروں سے تنگ آکر رونے لگی۔

"ہیں! تم عجیب لڑکی ہو۔ پیار کرنے پہ روتی ہو —— پاگل! روؤ مت۔ میں اپنی جان بھی تم پہ نچھاور کر دوں گی۔ تم تو اتنی خوبصورت، اتنی سمجھدار لڑکی ہو۔ پھر بھی تم روتی ہو۔ اُف یہ تمہاری سسکیاں، میرے دل پہ چھریاں سی لگ رہی ہیں۔"

مگر اِن سب باتوں کے باوجود وہ روئے جا رہی تھی۔ وہ روتی رہی۔ وہ اس کے سر کے بالوں کو چھو کر کبھی سمجھاتیں، کبھی کمر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتیں اور اندھیرے میں اُن کا ہاتھ بار بار بہک کر سینے پر آجاتا۔

رونے کی بھی حد ہوتی ہے۔ سسکیاں دھیمی ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں اور مس چاندنی دلکش انداز سے فلمی ہیرو کی سی نرمی، مٹھاس اور جذباتیت سے بولیں —— "آہ وہ دن! جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسمبلی میں میری نظر جب نئی فسٹ ایئر کی لڑکیوں پر پڑی تو تم اچانک گڑبڑا کر رہ گئی۔ تم خاموش سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اپنا نام پکارے جانے پر تم نے آہستہ سے 'یس میڈم' کہا۔ ایک سیاہ لٹ تمہارے گورے گورے گالوں کو چوم رہی تھی۔ اور پھر جب تم نے دفعتاً آنکھیں اوپر اٹھائیں تو میں تمہیں دیکھتی رہ گئی۔ کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں تمہاری اف! ایسی آنکھیں جن پہ ہر نظارہ خود فدا ہو۔ سفید یونیفارم میں تم جنت کی حور لگ رہی تھیں۔" وہ اس تیزی سے جملے بول رہی تھیں جیسے یہ رٹے ہوئے ہیں اور جیسے خود بخود ان کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ برسوں سے لیکچر دیتے دیتے وہ ہر ٹاپک پر کس قدر بے تکان بولنے کی عادی ہیں سو اسی طرح اظہارِ محبت کے طریقوں پر بھی انہیں پورا ملکہ حاصل ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ کون سی مچھلی کس انداز سے شکار کی جاتی ہے۔ بعض مچھلیوں کے لئے جال کو گہرا چھوڑ کر ڈھیل دینی پڑتی ہے اور بعض مچھلیوں کو بس ایک دم پھانس کر نکال لینا چاہئے۔ بعض مچھلیاں کھانے پینے کا لالچ زیادہ کرتی ہیں، ان کے لئے جال میں مٹھاس پیدا کرنی پڑتی ہے مگر بعض مچھلی صرف ہاتھ کی پھرتی ہی سے شکار ہو سکتی ہے۔ اور ایک بار چنگل سے نکل جائے تو ہاتھ آنا ممکن نہیں۔ وہ فیروزہ کو بھی اسی قسم کی سمجھتی تھیں۔ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے خوشی بھی ہوئی اور اس نے اپنی تعریفیں سُن کر مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو سچ مچ تقدیر کے حوالے کر دیا۔ جب اس نے پہلی بار مس چاندنی کو دیکھا تھا تو اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا تھا اور ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔ چھوٹا سا قد —— بے تحاشہ گوشت۔ بس جیسے گوشت کا کھمبا ہو۔ سیاہ رنگ۔ موٹی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پیشانی برائے نام۔ گھنے سیاہ بال جو بڑی سی چوٹی کی صورت میں کمر سے نیچے تک جا رہے تھے۔ چوڑے چوڑے سفید دانت جو ہونٹوں کے پس منظر میں دن اور رات کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ اس نے دل میں توبہ توبہ کی۔ اللہ میاں نے اسے بھی بنایا ہے۔ بیچاری کا اس میں کیا قصور ہے۔

پرنسپل صاحبہ نے اس کے ابا جان سے مس چاندنی کا تعارف کرایا۔ "آپ مس چاندنی ہیں۔ ہماری نفسیات کی لیکچرار اور ہوسٹل کی وارڈن۔

مس چاندنی نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ڈر گئی۔ یہ نفسیات کی لیکچرر ہیں۔ کہیں سمجھ نہ گئی ہوں کہ میں دل ہی دل میں ان کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ مس چاندنی نے شفیق مسکراہٹ سے کہا "تمہارے ہوسٹل میں کافی جگہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہر کمرے میں دو لڑکیاں رہتی ہیں لیکن میں انہیں علیحدہ کمرہ دے دوں گی تاکہ یہ سکون سے لکھ پڑھ سکیں۔" اباجان اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ فیروزہ بہت محنتی اور ذہین لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک میں اپنے ضلع بھر میں سب سے زیادہ نمبر لئے ہیں۔ یہ واقعی بڑی اچھی بات ہے کہ اسے علیحدہ کمرہ مل جائے گا۔ فیروزہ کو کالج بہت پسند آیا۔ بڑی سی صاف شفاف عمارت۔ خوبصورت لان۔ بڑے بڑے گھنے درخت۔ پھر وہ گھنٹی بجنے پر اسمبلی میں گئی جہاں تمام اسٹاف اور ساری طالبات موجود تھیں۔ سفید براق جیسے یونیفارم میں تمام طالبات اپنے درجوں کے مطابق لائن میں کھڑی تھیں۔ اور ان کے عین مقابل اسٹاف۔ ان کے سیاہ گاؤن اسے ساریوں اور کپڑوں پر بہت بھلے معلوم ہوئے۔ پرنسپل صاحبہ کے قریب ہی اسے مس چاندنی دکھائی دیں۔ سیاہ گاؤن میں وہ چھپ سی گئی تھیں۔ اس نے سوچا کم از کم انہیں تو سفید گاؤن پہننا چاہیئے تاکہ یہ دکھائی تو دیں۔ حاضری کے بعد قرآن شریف کی تلاوت شروع ہوئی اور اسلامیات کی ٹیچر اور پھر پروفیسر صاحبہ نے تفسیر بیان کی۔ اس کا دل خلوص، نیکی اور اچھے جذبات سے پُر ہو گیا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں خوب محنت سے پڑھوں گی اور دنیا میں بہت اچھے اچھے کام کروں گی۔

پہلا پیریڈ انگلش کا تھا۔ اسے انگلش کی لیکچرر بہت پسند آئیں۔ دبلی پتلی سنجیدہ سی خاتون۔ انہوں نے پہلے ہی دن اپنی قابلیت سے نئی طالبات کا دل موہ لیا۔ دوسرا پیریڈ نفسیات کا تھا۔ نیا مضمون تھا اور اس نے بڑے شوق سے لیا تھا۔ اگرچہ مس چاندنی کو دیکھ کر وہ نفسیات سے سہم سی گئی تھی۔ جیسے مس چاندنی کی شخصیت گویا خود نفسیات کے مضمون کی شخصیت تھی۔ جب وہ پیریڈ لینے آئیں تو اس کا سارا ڈر جاتا رہا۔ اسے مضمون بہت اچھا لگا مگر ایک بات بہت عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکچر کے دوران جب بھی اس کی نظریں اوپر اٹھتیں وہ انہیں اپنی جانب دیکھتا پاتی۔ وہ پریشان سی ہو گئی۔ قلم لیک کرتا ہے۔ کہیں سیاہی تو منہ پر نہیں لگ گئی۔ اس نے رومال سے دو تین مرتبہ چہرہ پونچھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی اس نے سرگوشی میں کئی آوازیں سنیں۔ سالِ گزشتہ کی فیل شدہ لڑکیاں آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

چند دن تو وہ پریشان سی رہی۔ ہر وقت پیچھا کرتی ہوئی نظریں۔ خواہ وہ کلاس میں ہو یا اسمبلی میں، مس چاندنی کی نظریں اسے اپنے چہرے کو کھرچتی محسوس ہوتیں اور وہ پریشان سی ہو جاتی۔ آخر وہ اس طرح کیوں دیکھتی ہیں۔ ہوسٹل کے وارڈن ہونے کی حیثیت سے وہ لڑکیوں کے معاملات میں دخل دینے کی عادی ہیں مگر اسے ان کا بار بار آ کر پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھنا بھی اچھا نہ لگا۔ اس کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی خاص قسم کا تھا جسے نہ صرف وہ بلکہ سب ہی لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں۔ حد سے زیادہ خاطر مدارات کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور آج ہفتہ بھر بعد اچانک وہ اس طرح ٹوٹ پڑیں! اور اب لڑکیوں کی مسکراہٹ اور سرگوشیوں کا مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا۔

مس چاندنی جس طرح آئی تھیں اسی طرح صبح ہونے سے پہلے چلی گئیں۔ سویرے جب وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اسے اپنے سارے وجود سے گھن آئی۔ اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا مس چاندنی کے بوسوں کے داغ شاید وہ ساری زندگی نہ دھو سکے۔ وہ گھبرا کر غسل خانے میں گھس گئی اور دیر تک ٹھنڈے پانی سے بدن مل مل کر نہائی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ہاتھوں کا میل اس کے بدن سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ کیوں نہ وہ آج ہوسٹل سے سارا سامان لے کر گھر چل دے۔ مگر پھر یہ تعلیم۔ وہ کسی اور کالج میں چلی جائے گی۔ اور اگر دوسرا کالج

لیکن ابھی تم نے کہا ہوتا تو . . . . . تو کیا وہ پڑھنا چھوڑ دے گی؟

اور پھر جب وہ آئینے کے سامنے بال سلجھا رہی تھی تو اچانک اس کے دل میں ایک انوکھی تمنا پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی شکل کو غور سے دیکھا۔ مس چاندنی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ کاش! کاش وہ بدصورت ہوتی۔ انتہائی خوفناک ــــ ڈائن ــــ اوہ! وہ کانپ گئی۔ مس چاندنی کی طرح! وہ بھی تو ڈائن لگتی ہیں۔ اور اگر وہ ڈائن ہوتی تو مس چاندنی ہوتی اور کسی پر اچانک ٹوٹ پڑتی ــــ نہیں ــــ نہیں۔ وہ ڈائن بننا نہیں چاہتی۔

وہ جب ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو ساری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ ہر طرف مسکراتی ہوئی، طنز اور شرارت سے پُر آنکھیں۔ اس نے چوروں کی طرح نظریں جھکا لیں۔ جیسے تیسے میز تک آئی اور خاموشی سے توس اٹھا کر بغیر مکھن لگائے نگلنے لگی۔ اس کی ہم جماعت رضیہ اسے چپ چاپ دیکھ کر بولی "فیروزہ کیا بات ہے۔ تم تو بالکل زرد اور بیمار نظر آ رہی ہو۔"

"رات بھر میرے سر میں درد رہا۔"

"میں نے تمہارے کمرے میں آدھی رات کو دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز سنی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ . . . ."

رضیہ بات بھی پوری نہ کرنے پائی تھی کہ سال دوئم کی شگفتہ ہنس کر بولی ــــ

"مس چاندنی غالباً اسپیرو کی ٹکیہ دینے گئی ہوں گی۔"

فیروزہ گھبرا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ رخسانہ نے چاروں طرف دیکھ کر کہا "خبردار! ہونٹ بند، زبان بند، آنکھیں بند، کان بند۔"

"ناک بند نہ کریں؟" شگفتہ نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں، سونگھنے کی اجازت ہے۔" رخسانہ ہنس پڑی۔ "تمہیں پتہ ہے کتے سونگھ کر ہی سراغ رسانی کرتے ہیں۔" اور پھر وہ سب ہنس پڑیں۔ صرف رضیہ اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر رضیہ سے لپٹ جائے اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے اور زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ اس کے حلق میں کانٹا سا پھنس گیا اور اس کی آواز بھی حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پلکیں بوجھل ہو کر آنکھوں میں چلمن ہو گئیں۔ اس کے حالت چھپانے سے عاجز تھے۔ نرم نرم توس ہڈی کی طرح سخت لگ رہا تھا۔ مگر وہ اسے دانتوں تلے پکڑے رہی۔ اور پھر جب اس نے بی اے کی لڑکیوں کو ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے دیکھا تو یکایک بھاگ جانے کی خواہش اتنی شدید ہو گئی کہ وہ چائے کی پیالی آدھی چھوڑ کر بغیر کسی سمت دیکھے تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی۔ چٹخنی بند کر کے اس نے چاروں طرف دیکھا وہ کانپ کیوں رہی ہے۔ اسے کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ ساری لڑکیوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ ہر طرف ڈائنیں نظر آ رہی ہیں۔ وہ کیا کرے، کہاں جائے! وہ سیدھی پرنسپل صاحبہ کے پاس جائے گی اور انہیں سب کچھ بتا دے گی۔ صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ ایسی صورت حال میں ایک دن بھی کالج میں نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن بھلا کیا پرنسپل صاحبہ اس کے متعلق جانتی نہ ہوں گی۔ پھر . . . پھر شاید ان باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ ورنہ مس چاندنی کو کب کا کالج سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ اور اسے پرنسپل صاحبہ سے کہنا بھی بے کار نظر آیا۔ اگر مس چاندنی دشمن ہو گئیں تو جینا عذاب کر دیں گی۔

اُف میرے اللہ! میں کیا کروں؟ اس نے آئینہ دیکھا۔ وہ پہلے سے بیمار لگ رہی تھی۔ اس کے گالوں کی سرخی اور شادابی جیسے رات بھر میں کسی جونک نے چوس لی تھی۔ وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ کیسا خوف ناک اور گھناؤنا پیار تھا۔ کیسی محبت تھی جس نے اسے رات بھر میں مسل کر رکھ دیا جیسے ننھی سی کلی گرم لو کے جھکڑ سے ایک لمحہ میں باسی پھول بن جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا کا دوسرا نام محبت ہے۔ آفرینش کا راز اور زندگی کا مقصد محبت ہے۔ وہ رات بھر اس کے کانوں میں کہتی رہیں مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے محبت ہے۔ اُف! کیا یہ محبت ایسا خوف ناک اور گھناؤنا چولا بھی پہن سکتی ہے؟ یا پھر یہ محبت نہیں کچھ اور ہے۔ مگر یہ سب کیا ہے؟ ——— یہ کیا ہے؟ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کمرہ بند کر کے اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہے۔ کسی کلاس میں شریک نہ ہو۔ اسے دروازہ کھولنے کے خیال سے ہی ڈر لگ رہا تھا۔ تنہائی اور خاموشی ——— کتنی پیاری چیزیں ہیں۔ اور اسے اچانک موت کی آرزو ہوئی ——— تنہائی، خاموشی ——— گہرا سکوت ——— وہ گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس طرح کہ کوئی بھی اسے نہ ڈھونڈ سکے۔ گھنٹی کی آواز سنائی دی اور وہ اچھل پڑی۔ اب وہ کیا کرے۔ اسے کمرے میں بند دیکھ کر بھی طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوں گی۔ ہو سکتا ہے مس چاندنی ہی پوچھنے آ جائیں کہ وہ کلاس میں کیوں نہیں گئی۔ مس چاندنی کی آمد کے خوف سے وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی ساری قوت اکٹھی کر کے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور کتابیں لے کر نیچے اتر گئی۔

مس چاندنی نے اسے اسمبلی میں آج اور بھی زیادہ پیار سے دیکھا۔ وہ لرز گئی۔ اب اس بھوت کا سایہ اسے زندگی بھر نہ چھوڑے گا۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کی ساری شخصیت، اس کی تمام زندگی، اس کی جوانی، خوبصورتی، ذہانت اور علم۔ یہ سب چیزیں بھینٹ چڑھ جائیں گی۔ اس نے سوچا لوگ پرانے زمانے کے قصے کس قدر تعجب اور افسوس سے پڑھتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے کے لئے زندہ انسانوں کے گلے پر چھری پھیری جاتی تھی اور شوہر کے مرنے پر عورتیں ستی ہوتی تھیں۔ مگر کیا اس سے زیادہ خوف ناک بھینٹ بھی ممکن ہے جو وہ دے رہی ہے۔ کاش وہ پرانے زمانے میں جنم لیتی اور بخوشی ایک بار زندگی کا چولا اتار کر کالی دیوی کے چرنوں میں ڈال دیتی۔ اور اپنی پاک روح لے کر آسمانوں میں اڑ جاتی۔ مگر اب تو اسے ہر رات مرنا اور ہر صبح جینا ہے۔

وہ آنے والی رات کے خوف سے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اچانک مس چاندنی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کا رواں رواں خوف سے کانپ گیا۔ مس چاندنی نے بڑے پیار سے کہا "فیروزہ، تمہارے بھائی ملنے آئے ہیں۔"

وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک روشن ستارہ نکل آیا۔ منجدھار میں ہاتھ پیر مارتے مارتے اچانک کشتی کی پتوار ہاتھ میں آ گئی۔ "میرے بھائی، بھیا!"

"ادریس نام بتاتے ہیں۔"

وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ "ادریس بھائی؟"

"کیوں، کیا تمہارے بھائی نہیں ہیں؟"

"جی ..... جی، ہیں۔"

"سگے یا رشتے کے ———؟"

وہ جواب دیئے بغیر بجلی کی سی تیزی سے مہمان خانے کی طرف بھاگی۔ ادریس بھائی رشتے کے بھائی تھے جبکہ صرف سگے بھائی

مل سکتے تھے۔ مس چاندنی نے انہیں سگا بھائی سمجھ کر مہمان خانے میں بٹھلوا یا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر لپٹ جائے اور کہے کہ خدارا مجھے یہاں سے لے چلو، ابھی، اسی وقت — مگر وہ سنبھل گئی۔

"فیری، میں نے سنا کہ تم ہوسٹل میں ہو۔ سوچا تم سے ملتا جاؤں۔" ان کی بڑی بڑی سیاہ پتلیاں چمک رہی تھیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کا رواں رواں کہہ رہا تھا ادریس بھائی خدا کے لئے مجھے اس قید خانے سے لے چلو۔ یہاں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے لے چلو، ورنہ میں مرجاؤں گی، پھر تم عمر بھر پچھتاؤ گے۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ چپ بیٹھی زمین تکتی رہی۔ نہ جانے اسے ادریس بھائی کے سامنے کیا ہو جاتا ہے، نہ بولا جاتا ہے نہ نظر ہی اٹھتی ہے۔

"فیری، مجھ سے بات نہ کرو گی؟" ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور ایک دم طوفان امڈ آیا۔

ادریس بھائی پریشان ہو گئے۔ "فیری، روؤ مت — پگلی۔ ہمت سے کام لو۔ کیا گھر بہت یاد آتا ہے؟"

"ہاں، ادریس بھائی میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے گھر بہت یاد آتا ہے۔"

"واہ، چڑیا کا سا دل ہے۔ سنا ہے تمہاری ہفتہ بھر کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ ماموں صاحب کو لکھ دو آ کر لے جائیں گے۔"

"مگر ادریس بھائی میں آج ہی اور اسی وقت جانا چاہتی ہوں —— ورنہ —— ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

"اوہ، فیری! میں تو تمہیں بہت بہادر اور سمجھ دار سمجھتا تھا۔ اور تم اس قدر ڈرپوک نکلیں۔ بھلا میں تمہیں کیسے لے جا سکتا ہوں؟ سب لوگ —— سب لوگ کیا کہیں گے۔"

"تو پھر آپ ابھی جا کر ابا جان کو بھیج دیجئے۔"

"میں! میں انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ میں تم سے ملنے گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"کیوں ......" کیوں انہوں نے اس قدر پیار سے دہرایا کہ وہ شرم سے دہری ہو گئی۔ ان کی چمکتی ہوئی پتلیوں کو دیکھنے کی اس میں ذرا بھی ہمت نہ تھی۔

"سچ ادریس بھائی۔ مجھے گھر بہت یاد آتا ہے۔ مجھے لے چلئے۔"

"فیری، چند روز میں تمہارا جی لگ جائے گا۔ ہم تو کوئی سال بھر گھر سے باہر رہے اور اب ٹریننگ کے لئے سمندر پار جانا پڑے گا۔ بھئی ہم تو آج تک نہیں روئے، اور نہ ہی اتنی دور دراز جا کر روئیں گے۔"

"آپ مرد ہیں۔"

"واہ، تم تو عورتوں کی برتری کے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔"

"اب مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ مجھے لے چلئے ادریس بھائی۔ مجھے اپنے ساتھ......"

"فیری، میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔ مگر ایسے نہیں۔ بڑے زور شور سے، ڈنکے کی چوٹ! میرے ساتھ چلو گی فیری؟ ہم پھر اپنا گھر بنائیں گے۔"

"ہٹیئے آپ بڑے خراب ہیں۔ جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔" گلاب کے پھول اس طرح آتشیں ہو گئے، اور اس نے

شرما کر اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔ وہ شریر آنکھیں مسکانے لگیں۔ اسی لمحہ مس چاندنی اچانک کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور اس محجوب اور شرمیلے ماحول میں ایک دم بوکھلا کر رہ گئیں اور انہیں شدت سے اپنے فرض کا احساس ہوا۔

"ملاقات کا وقت ختم ہے۔" ایک طرف شرم کی سُرخی اور دوسری طرف نگاہوں کی چمک انہیں ذرا بھی نہ بھاتی۔ ان کا بس چلتا تو اس لمحہ ادریس کو دھکے دے کر باہر نکال دیتیں۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر "خدا حافظ فیری" کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"یہ تمہارے سگے بھائی تو نہیں لگتے۔" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

فیروزہ سہم گئی۔

"جی میرے ما..... موں..... کے...."

"پرنسپل صاحبہ کو خبر ہوگئی تو مجھے بھی باتیں سُننا پڑیں گی۔ آئندہ یہ صاحب نہ آئیں تو اچھا ہے۔"

"وہ انجینئرنگ کے لئے باہر جا رہے ہیں۔"

"خیر، پھر میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" اور انہوں نے اطمینان کا قہقہہ بلند کیا۔

فیروزہ نے سفید جھک کپڑوں میں ملبوس سیاہ گوشت کے کھمبے کو لرز کر دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

مس چاندنی کو پہلی نظر دیکھنے پر جس چیز کا احساس ہوتا تھا وہ بدصورتی کے علاوہ بہت زیادہ صاف و شفاف لباس تھا۔ یوں تو سب ہی ٹیچرز صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتی تھیں لیکن مس چاندنی کے کپڑوں میں کچھ اتنی نفاست اور صفائی ہوتی تھی کہ متوجہ کر لیتی تھی۔ اکڑتا ہوا کلف اور بولتی ہوئی استری ——— وہ دن میں دو مرتبہ ضرور نہاتیں۔ چپل تک کئی بار دھوتی تھیں۔ انہیں دھونے دھلانے کا مرض سا تھا۔ ایسا لگتا کہ ان کی روح پر ایسے داغ ہیں اور اتنا گھناؤنا اور کثیف جامہ ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی بدن ملیں، سر اور جوتے دھوئیں، غلاظت نہیں چھوٹتی۔ خاکداں میں جو ذرا سی روشن چنگاری ہوتی ہے وہ ان کے ہاں بھی شاید ڈھیر سی راکھ میں دبی دبی آنچ دے رہی تھی اور ضمیر کی لعنت بس ان سے دھلوائے جاتی تھی اور وہ دھو دھو کر تھک جاتی تھیں۔ انہیں چین نہیں آتا تھا۔

چند روز فیروزہ بھی اسی طرح دھونے دھلانے پر تلی رہی۔ مگر پھر وہ تھک گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ اس غلاظت اور گندگی کو زندگی بھر نہیں دھو سکے گی۔ وہ خواہ کتنا ہی رگڑ رگڑ کر دھوئے مگر ان کے ہاتھوں کا میل اور ہونٹوں کے داغ اتنے ہی اُبھر آتے تھے۔ اور پھر وہ میل اس قدر بڑھتا گیا کہ اس کے جسم کا رنگ بن گیا اور داغ اس قدر پھیل گئے کہ اس کی شخصیت بن گئے۔ جب تک داغ نظر آتے رہے وہ اپنے وجود سے ایسی ہی نفرت کرتی رہی جیسے وہ ایک کوڑھی ہے۔ مگر جب وہ داغ اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئے تو پھر اسے عزیز ہو گئے۔ اس نے پرانی فیروزہ کو دفن کر دیا۔ وہ اب ایک نئی فیروزہ تھی جس کا رنگ روپ، شوخی اور ادائیں سب نرالی تھیں۔ گلاب کی کونپل اور سندر کلی ایک دم بچھو بن گئی۔ اب جو ذرا اس پر کوئی فقرہ چست کرتا یا آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا تو وہ اس جرم کی سزا دلوائے بغیر نہ رہتی۔ مس چاندنی کے کان بھرتی اور مس چاندنی اس کے لئے وارڈن سے سوتن بن جاتیں۔

فیروزہ انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے مس چاندنی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومتی۔ سنسان گوشوں اور باغ کے کنجوں میں ان کی باتیں سُنا کرتی۔ مس چاندنی جہاں فیروزہ کو دور سے بھی دیکھتیں تو اس طرح کھڑی ہو جاتیں جیسے انسان نہیں کھمبا ہیں۔ فیروزہ اپنی خوبصورتی سے پہلے جتنی لاپرواہ تھی اب اتنی ہی مغرور اور خود پسند ہو گئی تھی۔ وہ روائتی محبوبہ کے ناز و انداز سیکھ رہی تھی۔ اردو غزلوں

کا سارا ماحول اس کے سامنے کھلے پیج کی طرح تھا۔ اس کی چال تک میں اتراہٹ آ گئی۔ وہ اکثر روٹھ جاتی اور مس چاندنی سوکھا سا منہ لئے اسے منانے کے جتن کرتیں۔ کئی بار ہوسٹل کے لان میں یہ منظر دیکھا گیا کہ فیروزہ کرسی پر اکڑی ہوئی بیٹھی ہے اور مس چاندنی اس کے سامنے کھڑی ہیں۔ لڑکیاں کھسر پھسر کر کے کہتیں کہ آج تک کسی کے ایسے نخرے نہیں اٹھائے تھے۔ یہ بڑھاپے کا عشق ہے۔ مس چاندنی بہت جذباتی ہو گئی ہیں۔

جب چھٹیوں میں تاریخ و جغرافیہ کی سوسائٹی کی طرف سے سیر و تفریح کا پروگرام بنا اور بہت سی لڑکیاں اور لیکچرر چلنے کو تیار ہوئیں تو مس چاندنی پیش پیش تھیں۔ کالج کے سلسلے میں وہ بہت سرگرم تھیں۔ اس سلسلے کے سر پر خاصا کام اٹھا کر دیا جاتا تھا جسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ ایک اچھی منتظم تھیں اس لئے ہر مہم میں آگے آگے ہوتیں۔ چناب کی سیر کا وہ دن بڑا خوبصورت تھا۔ چناب کے کنارے شیشم کے گھنے درختوں کے سایوں میں دوپہر کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔ اور جب کنارے کی ریت میں پیر ڈال کر بیٹھ جائیں تو عجیب طرح کی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔ کنارے پر ہوائیں اٹھلاتی ہوئی چلتی ہے جیسے سوہنی کی روح محبت کا ابدی راگ گا رہی ہو۔ شام ہوتے جب چاروں طرف سورج کی ہلکی ہلکی سرخی چھا جاتی ہے تو سورج کا عکس چناب میں یوں اتر جاتا ہے جیسے تھکا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں سونے کے لئے لیٹ جائے۔ کائنات ایک خوبصورت اکائی معلوم ہوتی ہے۔ ہر طرف حسن، بے پناہ حسن اور گہرا سناٹا۔ خاموشی کا حسن پہاڑوں پہ محسوس کیا جا سکتا ہے یا ساحل پہ۔ چناب کے پل پر سے گزرتی ہوئی موٹریں، لاریاں اور تانگے پل بھر کے لئے خاموشی کا طلسم توڑتے ہیں اور پھر چاروں طرف سناٹا اپنا جادو جگا دیتا ہے۔

فیروزہ ہمیشہ سے قدرتی مناظر کی شیفتہ تھی۔ چناب کے کنارے آ کر اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہی سوہنی کا دوسرا جنم ہے۔ وہ مس چاندنی کو بھی بھول گئی اور تنہا ٹہلتی ٹہلتی دور نکل گئی —— بہت دور —— اس لمحہ اس کے اندر وہ پرانی فیروزہ جاگ گئی تھی جو اب سے چار سال پہلے فسٹ ائیر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ چلتی گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ سورج غروب ہونے کے بعد واپس جانا ہے۔ اچانک اس کی نظر دریا کے کنارے اس درخت پر پڑی جسے کسی نے کاٹ کر چبوترہ سا بنا دیا تھا۔ اس پر ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھی ہوئی تھی۔ سارا جسم ننگا تھا۔ فیروزہ کو اس لمحہ وہ بھی قدرت کا ایک حصہ نظر آیا۔ چمکتی ریت۔ پانی۔ شیشم کے ہرے بھرے درخت اور وہ آدمی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک ننگے مرد کو پہلی بار اس طرح دیکھا تھا۔ انسانی حسن کا جادو دل و دماغ میں ایک عجیب سی مسرت بھر دیتا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی یونانی دیوتا کے دربار میں خاموش کھڑی ہے۔ یا وہ سائیکی ہے جو اپنے کیوپڈ کی تلاش میں زندگی بھر آوارہ رہی ہے۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ جال ڈالے بیٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سمندر کی ساری مچھلیوں نے اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈ لی ہے —— چکنی پیٹھ، لمبی لمبی مضبوط ٹانگیں اور فولادی ہاتھ جن میں جال تھا محنتی اور مضبوط ہاتھ جو مچھلیاں پکڑتے ہیں، لکڑیاں کاٹتے ہیں، ہل چلاتے اور بیج بوتے ہیں، جن کے بل پہ تہذیب و تمدن کی اونچی عمارت قائم ہے۔ اور جو عروج و ترقی کی منزلوں سے بے پرواہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی تلاش میں راستے سے کانٹا ہٹاتے اور پھول چنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ کتنے خوش نصیب ہوں گے جنہیں یہ مضبوط ہاتھ محبت سے تھامیں گے اور کتابوں سے رٹے ہوئے محبت بھرے فقروں کو دہرانے کی بجائے اپنے دل کی ساری حسرتیں اور بیتابیاں محبت کے سیدھے سادے بوسوں میں جذب کر دیں گے۔ وہ ہاتھ تھا —— اور فیروزہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور اسی لمحہ اس نے دور سے ایک آواز سنی اور چونک کر دیکھا۔ مس چاندنی دور سے ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ ان کی آواز

پر وہ اور بھی چونک پڑا ——— وہ پیچھے اچھل پڑا۔ کہیں سوہنی کی روح تو نہیں ہے۔ اور جب مس چاندنی دوڑتی ہوئی آئیں اور اس آدمی سے بے خبر تنہائی کے احساس سے سرشار ہو کر فیروزہ سے لپٹ گئیں تو وہ دیہاتی بوکھلا کر بھاگا۔ جیسے ویرانے میں کوئی چڑیل دیکھ کر بھاگتا ہے۔ اس کے سیدھے سادے دماغ میں ایک خیال اُبھرا ——— یہ وہی چڑیل ہے جس نے سوہنی کا گھر اجاڑ دیا تھا اور اب سوہنی کو ستاتی پھر رہی ہے۔ اور بدروحوں کی اس نگری سے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دور چلا گیا۔ یہ سوہنی ہر جنم میں کیا کھڑاگ کیوں اٹھا لیتی ہے۔ فیروزہ مس چاندنی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مس چاندنی، میں کالج چھوڑنا نہیں چاہتی۔ پھر، کیا کروں۔ جی چاہتا ہے جان بوجھ کر فیل ہو جاؤں۔"

"پگلی تیرا کیریئر خراب ہو جائے گا۔"

مس چاندنی کو بھی یاد آیا کہ اب فیروزہ کا سالانہ امتحان سر پہ ہے اور وہ عنقریب چلی جائے گی۔

"فیروزہ تو کالج سے چلی جائے گی مگر میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ اب کوئی یہ جگہ پُر نہ کر سکے گا۔"

فیروزہ مسکرا دی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بھی ایک خوبصورت جھوٹ ہے۔ کیونکہ مس چاندنی فسٹ ایئر کی رخسانہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں اور اسے بھی رخسانہ پسند تھی۔ مس چاندنی اجارہ داری کی قائل نہ تھیں۔ ان کے لئے فیروزہ، رخسانہ وغیرہ وغیرہ ایک ہی وجود کی طرح تھیں۔ ایک دوسرے سے ان کی دوستی کا بندھن کچھ عجیب سا تھا۔ اُلجھے ہوئے بے شمار دھاگے کچھ اس طرح بٹے ہوئے تھے کہ انہیں سلجھانا اور الگ الگ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ایک بڑی سی گتھان تھی جسے کوئی نہ توڑ سکتا تھا نہ کھول سکتا تھا۔

مس چاندنی کی سابق دوستیں بھی اکثر ملنے آیا کرتی تھیں، پرانی شاگردیں بھی تھیں۔ جن میں سے کوئی ایم اے میں تھی اور کوئی شادی شدہ کئی بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی وہ مقناطیس کی کشش سے کھنچی چلی آتی تھیں۔ ان میں سے جب بھی کوئی آتا فیروزہ کے کمرے میں ٹھہرتا۔ فیروزہ مس چاندنی کو تجدید ملاقات کا پورا موقع دیتی تھی اور خود نئے رومان کے نشے میں سرشار ہو جایا کرتی تھی۔ مس چاندنی کی ہر پرانی محبوبہ فیروزہ کی عاشق بن کر لوٹتی۔ اور فیروزہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ جب وہ دیکھتی کہ اس کی محبت میں سارا جہان پاگل ہے۔ اس کا رواں رواں کھل اٹھتا۔ وہ ناچتی، اٹھلاتی، ہنستی، جیسے وہ سکندر اعظم ہے جس نے ساری دنیا فتح کر لی ہے۔ یا کولمبس ہے جس نے ایک نئی دنیا دریافت کر کے اس پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اور چناب کے کنارے وہ دونوں ہنستی اور گدگداتی رہیں۔ جب بسوں کے ہارن کی بار بار آواز آئی تو وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

مس چاندنی لڑکیوں میں بیٹھ کر انہیں کی طرح زندہ دل ہو جایا کرتی تھیں۔ گیتوں اور ٹپوں کے شور میں مس چاندنی کے قہقہے بھی شامل ہوتے تھے۔ سب ہی خوش اور مگن تھے مگر مس چاندنی کے قہقہوں کی گونج میں دوسروں کی ہنسی دب کر رہ گئی تھی۔ مس چاندنی بہت ہنستی تھی۔ اکثر تو ان کی ہنسی سن کر تعجب ہوتا تھا کہ آخر ہنسنے کی بات کیا ہے۔ ایسا کھنکتا ہوا زوردار قہقہہ ہوتا کہ اس کی گونج دور دور سنائی دیتی۔ پھر اس ہنسی میں وہ بشاشت کی لہر، زندگی کی اُمنگ اور مسرت کی شوخی نہ تھی جو ہنسی کو ہنسی بناتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہنسی ایک طرح کا ہتھیار ہے جسے وہ انتقام کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ وہ ساری دنیا سے انتقام لے رہی ہیں۔ نہ جانے کس بات کا انتقام، شاید اپنی بدصورتی اور محرومی کا انتقام!!

مس چاندنی نے آنکھ کھولتے ہی نفرت اور حقارت دیکھی تھی۔ ایسا لگتا جیسے ہنسی اسے اپنے ساتھ لے چلنے سے کتراتی ہو۔

اور والدین پیار کرتے ہوئے بھی اداس ہو جاتے ہیں۔ اگر اپنے گوشت کا لوتھڑا کوئی نالی میں پھینک سکتا تو شاید اسے نالی میں پھینک دیا جاتا۔ جب وہ اپنی سب بہنوں کے ساتھ اچھے اچھے کپڑے پہنتی تو کبھی کوئی اس کے کپڑوں کی تعریف نہ کرتا اور بہنوں کے کپڑوں کی سب تعریف کرتے حالانکہ اس کے کپڑے بھی ویسے ہی ہوتے تھے۔ تعریف تو الگ رہی۔ اسے اچھے اچھے کپڑوں میں دیکھ کر لوگ چپ ہو جاتے اور پھر جب وہ ذرا سمجھدار ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ لوگ اس پر ترس کھاتے ہیں۔ اسی لئے چپ ہو جاتے ہیں۔ مگر رحمدل لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں مذاق اڑانے والے اور نفرت کرنے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ یہ دکھ بھرا احساس زندگی کو ہمیشہ کے لئے تلخ بنانے کو کافی تھا۔ اسے بھڑکیلے اور بیش قیمت کپڑوں سے خود بخود نفرت ہو گئی۔ جوانی اور احساس کمتری ساتھ ساتھ زندگی میں داخل ہوئے۔ جوانی کے لطیف اور نرم و نازک احساسات دنیا سے بہت زیادہ پیار کرنے کا جذبہ۔ جینے اور کام کرنے کی امنگ۔ آنکھیں بند کر کے کسی انجانے نشے میں سرشار رہنے کی آرزو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شرم، نفرت اور سب سے زیادہ خوف ۔۔۔! آئینہ دیکھتی تو سارے گھر سے چھپ کر جیسے چوری کر رہی ہے اور پکڑے جانے کا اندیشہ ہے بڑی آپا اسے ہمیشہ ایسے موقع پر مسکرا کر دیکھتیں۔ بڑی آپا جیسے اپنے لمبے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ خود تو وہ گھنٹے آئینے کے سامنے بیٹھی بال سلجھایا کرتی اور جو اسے دیکھتیں تو پوچھتی "چاندنی کیا کر رہی ہو" وہ گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ جاتی اور اس لمحہ اسے بڑی آپا سے انتہائی نفرت محسوس ہوتی۔ اس کا دل چاہتا کہ بڑی آپا سے صاف پوچھے کہ کیا مجھے آئینہ دیکھنے کا حق نہیں ہے، میری بھی تو دو آنکھیں، ناک، کان، دماغ سب کچھ ہے کیا میں بھینگی ہوں کانی ہوں۔ خدا کا بھی کتنا احسان ہے کہ اس نے صحیح سلامت پیدا کیا۔ اگر میں اندھی، لولی لنگڑی ہوتی تو نہ جانے یہ لوگ کیا سلوک کرتے" اور یہ سوچ کر وہ کبھی خدا کی ناشکری نہ کرتی اور صابر و شاکر نظر آتی۔ "ہر شخص کو اپنی صحت پسند ہے یہ کتنی اچھی بات ہے۔ اسی لئے تو دنیا رہنے کے قابل ہے مگر خدا جانے دوسروں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے میں اگر بری ہوں تو نہ دیکھا کریں، اپنی آنکھیں بند کر لیا کریں" کئی بار اس نے یہ باتیں سوچیں مگر کسی سے کچھ نہ کہا۔ جب اس کا رونے کو جی چاہتا تو وہ ہنس پڑتی اور وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ عید، بقرعید، شادی بیاہ، ہر موقع پر وہ بھی خوشی خوشی سب کے ساتھ شریک ہوتی مگر اس کے لئے ہر نئی تقریب اور تہوار نئے نشتر ساتھ لئے آتا۔ ایسے موقعوں پر اس کے ڈھیر سے رشتے کے بھائی گھر میں آتے جاتے تو احساس کمتری اس کی رگ رگ میں سلگ اٹھتا۔ رشتے کے بھائی اس کی بہنوں کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلاتے اور وہ کلیاں ایک ایک کر کے کسی نہ کسی کی جھولی میں گر گئیں اور اب پھول بن کر مہک رہی ہیں۔ کسی کا میاں تھانیدار ہے، کسی کا اوورسیئر، کسی کا ٹھیکیدار۔ مگر وہ اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور محنتی ہوتے ہوئے بھی بوجھ بنی رہی۔ ماں باپ پر، زمین پر ۔۔۔ اور کبھی کبھی تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اپنے جسم کا بوجھ وہ خود بھی نہیں اٹھا سکتی وہ اتنی ذہین نہ ہوتی تو بے حس پتھر بن جاتی مگر اب تو نفرت اور انتقام کی چنگاریاں اس کی رگ و پے میں سلگ رہی تھیں۔

جب اس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تو والدین نے مزید تعلیم کے لئے لاہور بھیج دیا اور وہ ہوسٹل میں رہنے لگی۔ چاندنی کی شادی کا خیال اس کے والدین نے بھی دل سے نکال دیا اس کا کوئی پیغام نہ آتا تھا اور آتا بھی تو کسی بڈھے رنڈوے یا نکمے لڑکے کا۔ اس وجہ سے یہی مناسب سمجھا گیا کہ وہ تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔

ہوسٹل میں چاندنی کی روم میٹ ایک بڑی عمر کی لڑکی تھی جو ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھی وہ حد درجہ خلیق اور سمجھدار تھی اس نے چاندنی کی قدر و قیمت پہلی ہی نظر میں بھانپ لی۔

کیا ہوا جو اس کے خط و خال بُرے اور رنگ کالا ہے اس نے ایک دن پوچھا "تمہارا نام چاندنی کیوں رکھا ہے؟" چاندنی حسبِ معمول ہنس پڑی "والدین اپنی تسکین کے لئے بدصورت بچوں کے خوبصورت نام رکھ دیتے ہیں"۔

"واہ، کیا تم بدصورت ہو" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ظاہر ہے باجی، یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے"۔ اس کی آنکھیں ہنستے ہوئے سنجیدہ ہو گئیں۔

"کیا صرف گورا رنگ نہ ہونے سے انسان بدصورت کہلاتا ہے۔ کالے رنگ میں تو زیادہ جاذبیت ہوتی ہے۔ حبشی کس قدر سیاہ فام ہوتے ہیں مگر گوری قوموں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں تم نے کبھی اپنے جسم کو غور سے دیکھا ہے۔"

وہ زندگی میں پہلی بار شرما گئی۔ پہلی دفعہ کسی نے اُسے پسندیدگی سے دیکھا تھا مسرت کی ایک انجانی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں تشکر کے احساس سے جھک گئیں۔

اس رات جب اس کی روم میٹ نے سردی سے کپکپاتے ہوئے کہا "مجھے تو ہمیشہ کسی نہ کسی کے ساتھ سونے کی عادت ہے اکیلی لیٹتی ہوں تو بستر بہت ٹھنڈا لگتا ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ دونوں ساتھ سوئیں گے تو بستر خوب گرم ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا زرینہ باجی"۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے پاس چلی گئی۔

رات کی تاریکی میں نہ تو نقش نظر آتے ہیں اور نہ گورا چٹا رنگ۔ اندھیرے میں آنکھیں نہیں ہاتھ دیکھتے ہیں اور صرف گوشت نظر آتا ہے اور زرینہ کے ہاتھوں نے چاندنی کو پسند کر لیا۔

چاندنی کو ایک راستہ مل گیا۔ وہ اس نئے تجربے سے خوش تھی۔ اس کے رخسار چومے جانے کی خواہش سے سلگ اُٹھتے تھے سینے میں جذبات اور احساسات کا جوار بھاٹا اٹھتا تھا۔ اس کی باہیں ٹوٹتی تھیں اور کمر آپ ہی آپ بل کھا کر دکھنے لگتی تھی، آنکھیں ہر سو، پیار اور محبت کی متلاشی تھیں۔ چاندنی نے زرینہ باجی کو پا کر ساری دنیا پا لی۔ اسے مسرت سے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ گیا اور پھر اُسے مردوں سے نفرت ہو گئی۔ سختی، کرختگی، خودغرضی بس مرد اپنے لئے جیتا ہے۔ اپنے لئے محبت کرتا ہے، اپنے جذبات اور خواہشات کی تسکین اس کی زندگی کا مقصد ہے اپنی ہوس اور نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے حسین چہرے کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کا نام اُس نے محبت رکھ چھوڑا ہے۔ اسی وجہ سے اُسے کبھی کسی بدصورت لڑکی سے محبت نہیں ہوتی۔ اور........ اور زرینہ باجی! وہ خود کتنی خوبصورت ہیں مگر وہ محبت کرنا اور دل رکھنا جانتی ہیں۔ انہیں مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مرد اُن کا دم بھرتے ہیں۔ مگر وہ کسی کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں۔ "مردوں سے محبت کا نتیجہ کیا ہے۔ بس کتیا کی طرح بہت سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں"۔ زرینہ باجی نے ایک دن ہنس کر کہا۔ اور اس نے سنجیدگی سے سُنا اور حرف آخر سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ان کی باتیں گرہ میں باندھ لیں۔

ایک دفعہ زرینہ باجی کی ایک بڑی پرانی دوست ملنے آئیں۔ چھوٹے سے قد کی گول مٹول سی گوری چٹی عورت۔ وہ بھی زرینہ باجی کی طرح ہنس مکھ اور زندہ دل تھیں۔ زرینہ باجی اور وہ لپٹ کر ہنستی رہیں جیسے ان دونوں نے مل کر دنیا کی ساری خوشی سمیٹ لی ہے اور پھر ان کی دوست زرینہ باجی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولیں "میں چھٹی ہوتے ہی بھاگی چلی آ رہی ہوں۔ تیرے لئے مر رہی تھی"۔ زرینہ باجی نے اسی گرمجوشی سے لپٹ کر انہیں پھر پیار کیا۔ "تو اگر ایک دن اور نہ آئی ہوتی تو میں خود پہنچ جاتی"۔ ان کی دوست کسی کالج میں لیکچرر تھیں۔ رات کو جب زرینہ باجی اور ان کی دوست اکٹھی سونے لیٹیں تو چاندنی کو بہت برا لگا۔ پہلی بار رقابت کی آگ اس کے دل میں سلگی۔ اس کا خوب زور زور سے رونے کو

[illegible]۔ وہ [illegible] کہ زرینہ باجی کی تنہا حقدار وہی ہے۔ وہ بستر پر ادھر اُدھر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی، مگر تھوڑی ہی دیر میں زرینہ باجی نے اسے پیار سے پکارا اور ہنس کر کہا "ہم دونوں تو اکٹھے سوتے ہی ہیں آج تم ثریا کے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

"نہیں ——— میں ——— میں نہیں سوؤں گی۔" وہ شرما گئی۔ جیسے کوئی کسی نامحرم کا نام لے دے۔

"ارے شرماؤ مت" ثریا نے اٹھ کر پیار سے اُس کا ہاتھ تھاما اور اس کے بستر میں گھس کر لیٹ گئی۔

ثریا دو دن رہی اور جب وہ چلی گئیں تو چاندنی کو ان کا پیار رہ رہ کر یاد آتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ اُسے زرینہ باجی کا ایک وجود اور مل گیا تھا۔ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ زرینہ باجی کے بہت سے وجود ہو جائیں اور اُن کا ہر وجود اس سے محبت کرے اور وہ زرینہ باجی کے ہر وجود کو پوجے اور پھر اسے بہت سی زرینہ باجیاں ملیں۔ ان کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں نام کو بھی حسد، جلن اور رقابت کا مادہ نہ تھا وہ سب آپس میں اس طرح شیر و شکر تھیں جیسے ایک مذہب کو ماننے والے اور ایک پیغمبر کی امت۔ چاندنی کو اپنی زرینہ باجی کے ہر نئے وجود میں ایک نئی مسرت ملتی۔ اور پھر جب وہ ایم۔ اے کے پہلے سال میں آئی تو پھر خود چاندنی سے زرینہ باجی بن گئی اور پھر ایک دم زندگی کے اڑتیس سال گزر گئے۔ زندگی میں اس نے کھویا زیادہ یا پایا زیادہ وہ کبھی اس کا اندازہ نہ کر سکی۔ بہرحال سوسائٹی میں وہ ایک اچھی حیثیت کی مالک تھی اور اب اپنے گھرانے میں سب سے ممتاز فرد تھی۔ اور تو اور اب وہ رشتے کے بھائی جو اُسے کبھی منہ بھی نہ لگاتے تھے آدمی اور جن بچوں کے باپ بننے کے بعد اسے مرعوب ہو کر دیکھنے لگے تھے۔ اور اپنی دبلی سوکھی سدا بیمار رہنے والی بہنوں کے ساتھ جب وہ مضبوطی اور سمجھداری کی باتیں کرتی تو بہنیں احساس کمتری کے مارے بول بھی نہ پاتیں اور ان کے شوہر اس کے تندرست جسم اور ذہین دماغ پر دل ہی دل میں عش عش کرتے مگر اب اسے اس قسم کی پسندیدہ نگاہوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس نے کبھی کسی بہنوئی یا رشتے کے بھائی کو منہ تک نہ لگایا۔ وہ ان سے اس طرح بات کرتی تھی جیسے وہ سب اس کی سطح سے نیچے ہیں۔ محلے اور پڑوس میں دور دور تک اس کی عزت تھی۔ ساری جوانی شرافت سے گذار دی کسی نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ اس کی شرافت اور پاکبازی کا لوگ کلمہ پڑھتے تھے۔ ماں باپ کو اپنے بیٹوں پر اتنا فخر نہ تھا جتنا اپنی لائق بیٹی پر۔ وہ سب کی مدد کرتی تھی۔ سب کا خیال رکھتی تھی۔ شادی بیاہ کے موقع پر سب سے آگے ہوتی۔ ایسی محفلوں میں وہ کسی مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی، اس کی شرم و حیا خاندان کے لئے ایک مثال تھی۔ البتہ جب لڑکیوں میں بیٹھتی تو اس عمر میں بھی شوخ اور چنچل بن جاتی اور پھر بڑی بوڑھیاں بلند قہقہے سن کر سوچتیں کہ کیا حرج ہے آخر بیاہ نہیں ہوا، لڑکی ہی ہے۔ اس کا ہنسی مذاق ساری محفل میں جان ڈال دیتا۔ خود دلہن کو سنوارتی اور پھر پیار سے چوم کر اسے آئینہ دکھاتی۔ ایک دفعہ ایک بہت خوبصورت دلہن کو دیکھ کر وہ بے اختیار بولی "ہائے، مجھے تیرے دولہا پہ رشک آتا ہے۔" بڑی بوڑھیوں نے ترس کھا کر اُسے دیکھا۔ وہ سمجھیں اس کا بھی دلہن بننے کو جی چاہتا ہوگا۔ لیکن یہ بات سبھی جانتے تھے کہ اب چاندنی شادی نہیں کرے گی حالانکہ اب اس عمر میں اس کے اتنے پیغام آتے تھے جتنے بہنوں کے بھی نہ آئے تھے۔ یہاں تک کہ کنوارے لڑکوں کے بھی پیغام چلے آتے تھے۔

"کیا ہوا جو شکل و صورت خراب ہے۔ آخر آدمی کا بچہ ہے پھر اتنی پڑھی لکھی ہے۔ پھر پانچ سو روپے ماہوار کماتی ہے۔ صورت لیکر کیا چاٹنا ہے زندگی میں صورت ہی تو کام نہیں آتی۔ مفلسی اور بدحالی سے اچھی اچھی صورتیں بھی بگڑ جاتی ہیں اور پھر اگر پانچ دس سال لڑکے سے بڑی ہے تو کیا ہوا! ہمارے رسول کی سنت ہے ......" پیغام لانے والے کچھ اس قسم کی باتیں سوچتے تھے مگر اب چاندنی بہت سمجھدار تھی وہ صاف کہہ دیتی "مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے؟" اس فقرے سے سب لاجواب ہو جاتے واقعی اسے شادی کی کیا ضرورت ہے

وہاں کا قصہ ہے

نئی دنیا کی سرحدوں میں ایک عرصہ دراز کے بعد پرانی دنیا کا ایک مسافر آگیا مس پانی نے ہنس کر کہا "تمہارے وہ بھائی تم سمجھو ایک ارنسٹ ابھی بنے آنے لگے!"

ایک لمحے کے لئے وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ ادریس بھائی! وہ تو ان چار سالوں میں انہیں بھول ہی گئی تھی۔ گھر سے آئے ہوئے خطوں میں کبھی کبھی ان کا ذکر ہوتا تھا۔ اور اُسے معلوم تھا کہ وہ انگلینڈ میں ہیں اور تجربہ و عافیت میں ہیں مگر نہ جانے پچھلے سالوں میں اس نے ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا وہ اپنی گذشتہ زندگی کو بھی اب بھول چکی تھی یہاں تک کہ گھر جاتی تو پہنچنے سے پہلے چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کرتی۔ گھر میں ذرا جی نہ لگتا اور اب پورے چار سال بعد ادریس بھائی اس سے ملنے آئے ہیں نہ جانے اتنے عرصے وہ کیا کیا کرتے رہے۔ وہ اس الھڑ لڑکی سے ملنے گئے تھے جس نے ان سے رو رو کر گھر لے جانے کی خواہش کی تھی اور اب وہ ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی سے ملیں گے جو شادی بیاہ کی منزلیں طے کئے بغیر ہی ایک پختہ کار عورت بن گئی ہے۔ ایسی کلیاں بھی تو ہوتی ہیں جو نسیم سحر کے ہلکے جھونکوں سے کھلنے کے بجائے اچانک تند و تیز ہوا کی لپیٹ میں آکر پھول بن جاتی ہیں۔ اور ماحول میں خوشبو بکھیرے بغیر آندھی کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں سے پل بھر میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ ان کی کوکھ اندھی ہوتی ہے۔ ان کی چھاتیاں پتھر ہوتی ہیں ان سے دودھ کی دھاریں دودھ کے قطرے بن کر ننھے ہونٹوں میں زندگی کا رس نہیں ٹپکاتیں۔ ان کی مامتا کو کوئی نہیں جگا سکتا۔ وہ جاگنے سے پہلے ہی مر جاتی ہے۔ عورت ماں بھی ہوتی ہے۔ جب ماں مر جاتی ہے اور صرف عورت زندہ رہ جاتی ہے تو وہ عورت شیطان بن جاتی ہے۔ ایسا شیطان جس سے ابلیس بھی پناہ مانگتا ہے۔

اس نے کمرے میں چاندنی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ہنس پڑی۔

"ادریس بھائی تو میرے رشتے کے بھائی ہیں"

"اوہ، تم مل لو۔ کوئی حرج نہیں"۔ انہوں نے مہربان ہو کر کہا۔ اب انہیں کسی رقیب کا کھٹکا نہیں تھا۔ بلکہ اُن کا دل رقیب کو نیچا دکھانے کی خواہش سے مچل اٹھا تھا۔

جب وہ مہمان خانے میں آئی تو ادریس اس طرح گرمجوشی سے آگے بڑھا کہ وہ گھبرا گئی۔ جیسے وہ اٹھا کر لے جائیگا۔

"ادریس بھائی آداب!"

اس نے فیروزہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ "فیری، کتنے عرصہ بعد تمہیں دیکھا ہے۔ تم کس قدر بدل گئی ہو"

"اچھا سچ! .... کیا تبدیلی دیکھی آپ نے؟"

"پہلے تم ایک کلی کی طرح معصوم اور شرمیلی تھیں اور اب ایک شگفتہ پھول کی طرح شوخ اور شریر معلوم ہوتی ہو"

وہ ہنس پڑی "اور آپ اب تو چھت کی برابر لمبے ہو گئے ہیں۔ ہمارے مہمان خانے کی چھت پہلے ہی سے ٹپکتی ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے اور ہاں آپ ولایت سے اکیلے آگئے ہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی دنیا کے دستور کے مطابق آپ بھی ایک مادام لائیں گے۔ افسوس بڑی بھدی ہے آپ........"

"شکریہ میں تو اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہاں سے کیا لاتا۔ نہ پوچھو یہ چار سال کیسے گذارے ہیں اور اب میں اپنا وعدہ

کرنے آیا ہوں، اب میں جلد ہی تمہیں لے جاؤں گا۔"

"اوہو ادریس بھائی، اب تو وہ سب باتیں پرانی ہو گئیں، آپ کو اب تک یاد ہیں"

اس نے ترس کھا کر دیکھا: "سچ پوچھئے تو اب کالج چھوڑنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ رفتہ رفتہ دل لگ جائے گا اب تو جناب مجھے ایم اے کرنا ہے۔"

"اوہ ——— وہ تو تم بعد میں بھی کر سکتی ہو۔"

"خوب، بھلا پنجرے میں بند ہو کر پنچھی کیا کر سکتا ہے؟"

"تو .... تم شادی کو اب پنجرہ کہنے لگی ہو۔"

"ادریس بھائی، سچ میں تو آزاد فضاؤں میں اڑنا چاہتی ہوں۔"

"ہم دو ہنسوں کے جوڑے کی طرح آزاد فضاؤں میں پرواز کریں گے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اچھا جی، تو ولایت میں آپ کی دال نہیں گلی ——— چہ .... چہ ——— بڑا افسوس ہے۔"

"بڑی شریر ہو۔ پہلے دیسی تو لے آؤں پھر ولایتی کی کوشش کروں گا۔"

"اوہو! یہ دم خم!" وہ ہنسنے لگے۔

"سچ ادریس بھائی، آپ بے حد دلچسپ آدمی ہیں۔"

"خوب، اچھا کمپلیمنٹ دیا۔ شکریہ! بھلا آپ کیا کم دلچسپ ہیں۔ اور جب دو دلچسپ آدمی مل جائیں گے تو زندگی واقعی دلچسپ ہو جائے گی۔"

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے منہ دھو رکھئے۔ اچھا، آپ چائے پئیں گے۔ دیکھئے آپ کے لئے گرما گرم سموسے اور پکوڑے آ رہے ہیں۔" مس چاندنی نے ٹرے میں چائے بھجوائی۔ وہ رقیب پر دل کھول کر مہربان تھیں۔ اب وہ ہارا ہوا پورس تھا جو سکندر اعظم کے سامنے تھا۔

"پیری، اب مجھے چلنا چاہیئے، ڈرتا ہوں کہیں تمہاری وارڈن نہ نازل ہو جائیں۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ بالکل جیل خانے کے داروغہ کی سی شخصیت ہے۔ اس روز میں تو واقعی ڈر گیا تھا۔"

"ادریس بھائی، آپ احسان فراموشی کر رہے ہیں کیا جیل کا داروغہ اس طرح خاطر کرتا ہے؟"

"اچھا! تو یہ تکلفات انہوں نے فرمائے ہیں۔ بڑا خیال رکھتی ہیں تمہارا۔ غالباً انہیں

"معلوم ہے کہ ہم کوئی ایسے ویسے نہیں بلکہ تمہارے ہونے والے ...."

"چلئے بھی، چپ رہیئے ورنہ ابھی انہیں بلا لوں گی۔"

"خدا کے لئے انہیں مت بلاؤ۔ اب ولایت سے میم لیکر نہیں آیا تو شے لطیف سے بالکل محروم بھی نہ سمجھو یعنی میں تو چلا ورنہ وارڈن آ جائیں گی۔"

"آپ پھر اسی قدر مذاق اڑا رہے ہیں، یاد رکھئے بدلہ لوں گی۔"

"دیکھا جائے گا، ہمیں بھی بہت سے بدلے لینے ہیں۔" اور اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ ہولے سے تھپک کر وہ چلا گیا۔

بیچارے ادریس بھائی۔ اس نے سوچا، اُسے سچ مچ ان پر ترس آیا۔ اس نے اپنے دل کے گوشوں میں دور دور تک جھانکا۔ وہاں اس نام اور محبت کا کبھی بسیرا تھا، کسی نے دریچے سے جھانکا ضرور تھا مگر اب پورے چار سال گزر گئے اور بھولے سے بھی کوئی کھٹکا کھٹکتا ہے نہ طاقوں میں جو چراغ کی ننھی سی ٹمٹماہٹ تھی اُسے سرد سرد جھونکوں نے کب کی گل کر دی تھی اب تو دل کی جگہ کسی نے برف کی ٹھنڈی سِل رکھ دی ہے۔ چار سال بعد اس محبت کو دیکھنے سے جذبات و احساسات میں ذرا بھی تو آنچ نہیں اٹھی بھلا برف کی سِل پر بھی کوئی آگ جلا سکتا ہے کتنے پاگل ہیں ادریس بھائی۔

فیروزہ جب بی۔ اے کا امتحان دے کر گھر لوٹی تو ڈھیروں رشتے ٹوٹ پڑے۔ اس نے بہت شور مچایا کہ میں آگے پڑھوں گی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہو جائے تو اپنے جوڑ کے اچھے لڑکے نہیں ملتے۔ انہوں نے فیصلہ سنا دیا اور اس کے والد نے حسبِ عادت ان کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ فیروزہ کو بہت غصہ آیا۔ اماں بھی عجیب باتیں کرتی رہیں اور مس چاندنی کا چھٹیوں میں گھر آنا بھی اماں کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "دوستی ہم عمروں میں ہوتی ہے یہ تمہاری کیسی استانی ہیں، ہر وقت ہنسی مذاق اور قہقہے۔ اور بھی تو پروفیسر ہیں ان میں سے کوئی کبھی نہیں آیا۔ یہ کیوں چھٹی میں تمہارے پاس آتی ہیں۔"

"اماں آپ کس قدر تنگ نظر ہیں۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہیں۔" اماں مصلحتاً خاموش ہو گئیں۔ اس کی بڑی بہن جب سسرال سے آئی تو تو اس نے باقاعدہ شادی کی مہم شروع کر دی۔ فیروزہ نے بحث مباحثے سے باجی کو قائل کرنا چاہا مگر اس کی ایک نہ چلی۔

"فیری عورت کی تکمیل ماں بن کر ہوتی ہے۔ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے اس کا گھر ہو، بچے ہوں۔ مجھے تو تمہاری مس چاندنی پر ترس آتا ہے میں سوچا کرتی ہوں کہ جب یہ بوڑھی ہو جائیں گی تو زندگی انہیں کس قدر کاٹے گی۔"

باجی، وہ کبھی بوڑھی نہ ہوں گی۔ ڈھیر سے بچے پیدا کر کے عورت بوڑھی اور بدصورت ہو جاتی ہے شادی نہ کر کے وہ اپنی جوانی اور خوبصورتی میں بیس برس کا ضرور اضافہ کر لیتی ہے۔"

"لیکن فیری، مجھے تو یہ بوڑھی کنواریاں سنکی سی لگتی ہیں خواہ ڈاکٹر ہوں یا استانی ہوں یا نرس، ان میں کسی چیز کی کمی ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے توازن نہیں ہوتا۔" اور پھر باجی نے اس کے آئے ہوئے رشتوں پر تبصرہ کر کے کہا، "تم اچھی طرح سوچ لو، تمہاری مرضی سب چیزوں سے زیادہ مقدم ہے۔ اور ہاں ادریس بھائی کے متعلق تمہیں معلوم ہے وہ تمہارے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مستحق امیدوار ہیں۔ انہیں تم سے جو لگاؤ ہے اُسے سب ہی محسوس کرتے ہیں۔"

"مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے اچھا، کل صبح تک سوچ کر بتا دینا۔" باجی چلی گئیں۔ وہ بے معنی نظروں سے تصویریں دیکھتی رہی۔ جو رشتے کے لئے آئے ہوئے خطوط سے نکال کر باجی رکھ گئی تھیں اور پھر اس نے یکایک سب کو ماچس کی تیلی دکھا دی اور تکیہ پر سر رکھ کر آتشدان میں ان کے جلنے کا نظارہ دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ادریس بھائی...... ادریس بھائی اُسے واقعی بہت چاہتے ہیں ان کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے جسے سارا زمانہ جانتا ہے مگر ایک وہ ہی نہیں جاننا چاہتی۔ جن دنوں وہ اسکول میں پڑھتی تھی جانے کیوں اسے ادریس بھائی کے متعلق سوچتے رہنے کا خبط سا تھا۔ اور پھر اسے ان کا پہلی بار کالج آنا یاد آیا اور پھر آخری بار ——— لوگ تو ولایت جا کر خوب عیش کرتے ہیں اور وہ اس کی یاد کو سینے سے لگائے لوٹے۔ بیچارے! آخر اُن میں کیا برائی

[illegible] کیوں نہ وہ ان سے شادی کرے۔ اچھے خاصے خوش مذاق آدمی ہیں اگر شادی ہی کرنا ہے۔ تو پھر ادریس بھائی سے زیادہ مناسب آدمی نہیں ملے گا اور پھر ادریس بھائی اُسے چاہتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی بات ہے اور وہ بیچارے یہ خبر سن کر کس قدر خوش ہو جائیں گے کہ اس نے انہیں پسند کر لیا ہے۔ خوب، تو اب وہ ملنے بیٹھنے آئیں گے۔ کتنے خوش ہوں گے کہ آخر جیت ان کے حصے میں آئی پورس کو اس کی سلطنت واپس مل گئی۔

دولہن بننا، شادی ہونا۔ یہ سب دلچسپ منزلیں ہیں دلچسپ اور خوبصورت۔ اس نے گھونگٹ کی اوٹ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ گہرے سرخ پردے گل داؤدی کے سفید پھول مینٹل پر دو تصویریں تھیں۔ ایک اس کی اور دوسری ادریس کی۔ اس نے ادریس کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ کیسا بھولا بھالا اور صحت مند چہرہ ہے۔ اور آنکھیں۔ یہ آنکھیں کتنی پرکشش اور جادوگر مشہور ہیں۔ سچ مچ ان میں کوئی بات ضرور ہے۔ بیچاری رخسانہ! کتنی محبت کرتی ہے۔ ادریس بھائی سے۔ کاش اس غریب سے شادی کر لیتے۔ کس قدر خوش ہوتی اگر وہ اس کمرے میں دلہن بن کر آئی ہوتی۔۔ بیچاری —— اس کے رخسار ان پردوں کی طرح دھک اُٹھتے۔ ان کے قرب کے خیال سے ہی اس کے بدن سے آنچ اٹھتی۔ شاید چپکے سے تصویر چوم لیتی۔ مگر یہ مرد بھی اچھے خاصے سنکی ہوتے ہیں جتنی ان کی پرواہ کرو اُتنے ہی بے نیاز اور جس قدر تغافل برتو اتنے ہی دیوانے۔ اب وہ ذرا بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی تو ہر ایک دم بھرتا ہے۔ اور بیچاری رخسانہ اپنے دل کا حال سہیلیوں پر کھول کر خواہ مخواہ رسوا ہوئی۔ ادریس نے آگے بڑھ ہاتھ تھامنے کے بجائے کہہ دیا "میں نے تو تمہیں ہمیشہ سگی بہن سمجھا ہے۔ میں تمہارے بارے میں اور کچھ سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں"۔ اور رخسانہ سسک سسک کر خاموش ہو گئی۔ وہ سچ مچ سگی بہن بن گئی۔ اس نے دل کھول کر ادریس کی شادی میں ارمان نکالے سر پہ آنچل ڈال کر دولہا کا ہاتھ پکڑ کر اندر لائی۔ ساری رسموں میں دولہا کی بہن کا پارٹ ادا کیا۔ دولہا کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس لئے سب نے اسے دولہا کی بہن مان لیا۔ ادریس نے آخر اُسے کیوں سگی بہن نہیں سمجھا۔ وہ اسے کن نظروں سے دیکھتا رہا۔ کسی زمانے میں اُسے بھی یہ نظریں اپنے روئیں روئیں میں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر پھر اچانک ان آنکھوں نے اپنی ساری کشش کھو دی اس نے دوبارہ تصویر کو غور سے دیکھا اور سوچا مس چاندنی کاش اسے دولہن بنا ہوا دیکھتیں۔ اس نے جب بن سنور کر آئینہ دیکھا اُسے بیساختہ ان کی یاد آئی۔ وہ کتنی تعریف کرتیں خوبصورت الفاظ کا جال بن دیتیں۔ دیوانہ وار چومتیں۔ مگر وہ نہیں آئیں۔ شادی کا دعوت نامہ ملنے پر انہوں نے ایک خوبصورت انگوٹھی بھجوائی تھی۔ فیروزہ نے وہ انگوٹھی بھی منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ ہی پہن لی تھی اور دونوں انگوٹھیوں کو دیکھ کر سوچا تھا اب یہ ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔

پردوں میں سرسراہٹ ہوئی مینٹل پر رکھی ہوئی تصویر میں یکایک جان پڑ گئی۔ بشاشت، امنگ، جوش اور مسرت۔ وفور جذبات سے اس کی آنکھیں بول رہی تھیں اور لبوں پہ ایک شریر مسکراہٹ۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جس بت کی زندگی بھر پوجا کی وہ اب اچانک ایک عورت کے روپ میں اس کے سامنے ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کی اپنی ہے۔ اس کے بچپن کی آرزو۔ جوانی کا خواب۔ اس نے سوچا اب وہ روٹھے گی اور شرمائے گی وہ اسے منائے گا اور وہ دل بھر کر ستائے گی۔

"فیری —— میری فیری!" وہ پیار سے تڑپ کر پکارا۔

"فیری، دیکھو آخر میں تمہیں لے ہی آیا۔ کیا اب بھی تم مجھ سے بھاگو گی؟"

وہ ایک مٹی کے بت کی طرح ہاتھ سے چھوٹتے ہی اس کی آغوش میں گر گئی۔ شرمانے اور لجانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کرنا سیکھ لیا تھا اور پھر اچانک فیروزہ کا جی گھبرانے لگا۔ جذبات کی دہکتی ہوئی بھٹی میں اس کا جی گھٹنے لگا۔ سانسوں

کے چھونے سے اُسے وحشت سی ہونے لگی اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سارا وجود پگھل جائے گا۔ اس نے ایک نظر ادریس کی طرف دیکھا چوڑا چکلا سینہ، جذبات و احساسات کی تیز آنچ، مضبوط بازو جو پیار، حفاظت اور زندگی میں اعتماد کا احساس دلاتے ہیں، وہ آنکھیں جو ہر پل مست اور آسودگی سے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ نہ جانے کیوں فیروزہ کو یہ سب چیزیں انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوئیں۔ وہ اسکی بہت بھری دیوانگی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دلچسپ تماشا ہو۔

اس کے پیار، وہ یکایک تڑپ کر علیحدہ ہوگئی۔ عجیب طرح کی سختی اور کرختگی کا اسے احساس ہوا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا نرم محبت کا انداز چاہتی تھی۔ نرم نرم گوشت جو آسودہ کر سکے اس کا جی گھبرانے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جیسے اُسے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہے جیسے وہ خود مرد ہے۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے ڈھیر سارے زیورات نوچ کر پھینک دے۔ اور اپنے بیش قیمت بھاری کپڑے اتار کر بھاگ جائے ــــــ دور، بہت دور کسی جنگل میں جہاں ہر طرف ہرنیاں چوکڑیاں بھرتی ہوں اور وہ ایک خوفناک ڈائن بن کر ان ہرنیوں کا پیچھا کرے۔

محل

نوید انجم

شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھائے اچھلتی ہوئی وہ کمرے میں سے نکلی تو جیناں سمجھ گئی، یہ گالوں پہ جو گلال برس رہا ہے تو ضرور فیروز اس کے پیچھے بھاگا ہوگا۔ ناگواری سے بھویں اچکا کر اس نے سوچا نامراد بھی کیا مزے سے باؤلی ہوئی پھر رہی ہے۔ اتنی سی شرم بھی تو نہیں اور پھر یہ پھوپھی اماں بھی ایسی ہیں کہ کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مجال ہے جو اسے کبھی جھڑکا ہو یا اس فیروز کو ہی ڈانٹا ہو... اک دو بار صاف دیکھا بھی کہ صاحبزادے چھمو کا دوپٹہ پکڑ کر کھینچ رہے ہیں اور وہ بے شرم سینے پہ اپنا ایک ہاتھ رکھے دوسرے سے دوپٹہ کھینچتے ہوئے ڈکرا رہی ہے، پر پھوپھی اماں نے ساری بات ہنس کر گنوا دی۔

”اے چھوڑو بیٹا ـــ کام کرنے دو کم بخت کو۔“ انھوں نے کہا اور اپنا پاندان کھولے پان بنانے میں مشغول ہوگئیں۔

جیناں نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ اماں اِدھر ہوتیں تو جانے کیا کرتیں۔ وہ تو رائی برابر بات کو بھی لے بیٹھتیں اور وہ اودھم مچاتیں کہ کچھ نہ پوچھو ـــ وہ تو شکر کرو انہیں اس بات کی کوئی خبر ہی نہ تھی کہ پھوپھی کی نند کا بیٹا فیروز آج کل نوکرانی پہ آتی ہوئی جوانی دیکھ دیکھ کر مچل رہا ہے اور ان کی لاڈلی بیٹی سارے کرتوت دیکھ رہی ہے۔

اور اس شام تو غضب ہی ہوگیا جب جیناں نے دیکھا فیروز بالٹی پانی سے بھرے برآمدے کے پار والے غسل خانے میں نہانے گیا اور وہ نامراد اپنے نچلے لب کو دانتوں تلے دبائے موٹی موٹی کالی آنکھیں تجسس اور شرارت سے جھپکاتی غسلخانے کے دروازے کی دراڑوں میں سے جھانک کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اِدھر ہٹ مُردار!“ جیناں نے کہا اور یہ کہتے وقت اس کے چہرے پہ سُرخی کی گہری لکیریں پھیلیں۔

”تمہیں کیا بی ـــ؟“ چھمو نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

”تجھے شرم نہیں آتی ـــ؟“ اس نے بڑی کوشش کر کے کہا، ”پھوپھی اماں کو بتا دوں گی، ہاں!“

”بتا دو ـــ اونہہ!“ وہ منہ پھاڑ کر بولی اور پھر سے دراڑوں میں سے لگی جھانکنے۔

سچ پوچھو تو اس لمحے جیناں کے دل میں بھی جھانکنے کی خواہش اٹھی پر اس نے سختی سے اپنے اس احساس کو دبا لیا اور دل ہی دل میں چھمو کے ڈھیٹ پن پر بل کھاتے ہوئے ایک طرف کو ہوگئی۔

کن انکھیوں سے اس نے چھمو کو دیکھا۔ مردار کی جیسے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ سینے پر دونوں ہاتھ دھرے وہ اپنی ہنسی دبانے

کی کوشش کر رہی تھی۔ بالوں کی آوارہ لٹیں اڑ اڑ کر چہرے پر بکھر رہی تھیں اور دانت بج رہے تھے۔

"اے اگر اس نے تجھے دیکھ لیا تو ——" جیناں نے ڈر کر کہا۔

"تو کیا؟" اس نے مڑ کر تیزی سے کہا۔

اور اسی دم پانی کے بہت سے قطرے جیناں پر آپڑے۔ گھبرا کر وہ ایک طرف ہوئی تو چھمو کی چیخ سُن کر اس نے دیکھا وہ بُری طرح پانی سے شرابور ہو رہی تھی —— اور فیروز دیوار کے اُدھر سے سر اٹھا اٹھا کر ہنسے جا رہا تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں سے اندر بھاگ آئی۔

کمرے میں آتے ہی تولیہ لے کر اس نے اپنی بھیگی ہوئی گردن کو صاف کیا اور سینے میں دبے ہوئے غصے کو ایک گہرا سانس لے کر ختم کرنا چاہا۔

چھمو کی کھنکتی ہوئی ہنسی سُن کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"ہائے رے —— وہ ہنستی ہوئی ہولے ہولے کہہ رہی تھی —" بڑا چالاک ہے جل —— دیکھو تو مجھ کو بھگو کر رکھ دیا!"

"کمینی —— !" جیناں نے غصے سے کہا۔

"چل ہٹ بڑی بنتی ہے۔" چھمو نے جیسے مچل کر کہا۔ "اللہ قسم تم نے تو دیکھا ہی نہیں۔ ذرا دیکھتیں تو خبر ہوتی!"

"میں کوئی تیری طرح ہوں؟" اس نے تنک کر کہا۔ "مجھے کیا پڑی ہے کہ مردوں کو دیکھتی پھروں۔"

"سچی کہوں —— !" وہ اپنی آنکھیں نچا نچا کر کہنے لگی۔ "میں نے اسے دیکھا تو ——"

"حرافہ!" اس نے بڑی کوفت سے کہا۔

"جا ری! بڑی شریف بنتی ہے۔" چھمو نے اس بار تنک کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے ری! اجی جب تو تیرے بھی لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

اس کا دل چاہا روتی ہوئی پھوپھی اماں کے پاس جائے اور سارا قصہ کہہ سنائے۔ اس کمینی نے کیا سمجھ رکھا تھا اسے۔ کیا سارے ہی اس کی طرح ذلیل ہوتے ہیں! پر پھوپھی اماں کے سامنے اس کی ہمت نہ پڑی اور دیر تک وہ یہ سوچتی رہی کہ بات کا آغاز کس طرح کرے۔

"کہو بیٹی ——" پھوپھی اماں نے پان کی اتنی بڑی گلوری منہ میں ڈالی کہ ایک طرف کا گال پھول گیا۔

"وہ دیکھیے نا —— پھوپھی اماں ——" اس نے کہا۔ "میرا مطلب ہے آج —— آج کیا تاریخ ہوگی؟"

"مجھ غریب کا تو حافظہ ہی ٹھیک نہیں بیٹی ——" پھوپھی اماں نے پیار سے کہا۔ "اب تو تم لوگوں کے دن ہیں تاریخیں یاد کرنے کے۔"

گھبرا کر اس نے کہا۔ "میرا مطلب ہے پھوپھی اماں آج مجھے اِدھر آئے ہوئے کتنے روز ہو گئے؟"

"کیوں بیٹی —— کیا اتنے سے دنوں میں اماں کے لیے اداس ہو گئیں؟"

"نہیں —— نہیں یہ بات تو نہیں ——" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تو سوچ رہی تھی اماں جانے کیا کر رہی ہوں گی اس وقت؟"

"بیٹی ہنڈیا پکا رہی ہوں گی —— اور کیا کرنا ہے بیچاری نے۔" پھوپھی اماں نے کہا۔ "اللہ بخشے ہماری اماں بھی اس وقت چولہے کو لگی ہوتی تھیں۔"

پریشان ہو کر وہ پھوپھی اماں کے کرتے کو ترپائی کرنے کے بہانے باغیچے میں جامن کے پیڑ کے نزدیک گھاس پر آ کر بیٹھ گئی۔ سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے اس نے سوچا۔ خیر چھیڑنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ آدمی سو طرح کے مذاق کرتا ہے پر یہ جو گندی باتیں کرتی ہے چھمو —— یہ بالکل اچھی نہیں۔ اماں نے کئی بار بتایا کہ ذرا سی گندی بات منہ سے نکلی نہیں کہ جنت میں بنے ہوئے عالیشان محل کی اینٹیں گرنی شروع ہو گئیں۔ پر یہ چھمو نامراد، ان پڑھ اور نچلی جاہل قسم کی لڑکی ہے۔ کیا جانے اللہ کے احکام کیا ہیں اور اس کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے۔

جس دن سے وہ پھوپھی اماں کے ہاں آئی ہوئی تھی، اس چھمو اور فیروز کی چھیڑ خانی دیکھ کر دل ہی دل میں درود پڑھتی رہتی تھی۔ ہزار بار لاحول بھیجنے کے باوجود اسے یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ چھمو کو فیروز کے چھیڑنے سے کیا ملتا تھا اور وہ بھی ایسا تھا کہ جونہی چھمو کو اکیلا پاتا کوئی نہ کوئی حرکت کر جاتا جس کا ذکر وہ بڑا مزا لے لے کر اس سے کیا کرتی —— "اے بی —— کیا بتاؤں اس نے کیا کہا۔" ایسے میں اس کی آنکھیں بڑی خوفناک انداز میں چمکتیں۔ "میں چینی لیے آ رہی تھی نا، کہنے لگا میری کڑا کے دار ریوڑی کدھر چلی ہو؟"

"گندا۔"

"لو اس میں گندگی کی بات کیا ہے؟" حیرت سے پلکیں اٹھا کر وہ بے شرمی سے بولی۔ "ہاں تو پتہ ہے اس نے کیا کیا؟"

"مجھے کیا خبر —— تو جانے اور تیرا وہ بدذات ......" وہ ہولے سے یہ کہتے کہتے رک گئی۔

"جا ری —— تجھے کیا خبر کیسا اچھا ہے وہ —— گبھرو جوان ہے۔ گبھرو جوان ——" اس نے سینہ اکڑا کر کہا۔

اس نے سوچا اماں کہتی ہیں وہ لڑکیاں جن کی نسل ایسی ویسی ہو —— یا جن کی نسل میں کوئی فرق آ جائے وہ ایسی حرکتیں کرتی ہیں۔ اسے بے اختیار چھمو پر بڑا ترس آیا —— بے چاری کا اس میں قصور کیا ہو سکتا ہے۔ دلار سے بولی "چھمو! تیرا باپ کیا کرتا ہے؟"

"پڑا سوتا ہے۔" وہ بولی۔

"پر کام کیا کرتا ہے؟" اس نے اس کے بات کرنے کے برے انداز کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"کہا جو ہے پڑا سوتا رہتا ہے —— کام کرتا تو مجھے کاہے کو یہاں نوکر رکھواتا ——" چھمو نے گھٹنے سکیڑ کر کہا۔

"اور ماں ——؟"

"وہ مجھ نصیبوں جلی کو جنم دے کر خود میٹھی نیند سو گئی۔"

اسے چھمو پر بڑا ترس آیا —— ہے ہے بیچاری —— اور اس نے دل میں عہد کیا اب کبھی اس یتیم کو گالی نہ دوں گی۔

اور وہ یتیم اب سب کچھ بھول بھال کر اٹھلا رہی تھی۔ "بی —— میں تو سوچتی ہوں جانے تو کیسی لڑکی ہے ——؟"

"کیوں؟"

"اور کیا۔" وہ ہولے سے بولی۔ "اچھا اک بات تو بتا۔"

"کیا؟"

"تیرا دل کبھی نہیں چاہا ـــ؟" اس نے ہنستے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کس بات کو؟"

"اسے یہی کہ کوئی تیرے بالوں کو کھینچ کر بھاگ جائے۔"

"چل ہٹ ـــ" وہ اسے گالی دیتے دیتے رک گئی۔

"بڑا مزا آتا ہے ـــ پھر اس کے بازو بھی تو بڑے سخت ہیں ـــ ابھی پرسوں اس نے......" وہ ہنسنے لگی۔

"کیا ـــ کیا کیا پرسوں ـــ اس نے؟" ہکلا کر اس نے پوچھا۔

وہ سرگوشیاں کرنے لگی "میں ڈیوڑھی میں آ رہی تھی کہ دروازے کے پیچھے وہ کھڑا تھا۔ میرے ادھر پہنچنے پر جھٹ سے سامنے آ گیا اور زبردستی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور ـــ" وہ ٹھنکنے لگی۔

"جا جا ـــ میرے ساتھ بات نہ کر۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھ سے کلام بند کر دے ـــ تو بڑی گندی ہے۔"

چمپو نے کمر کے گرد ہاتھ رکھا ـــ "اللہ قسم بانو تو پوری عورت ہی نہیں ـــ اور یا تو جان بوجھ کر ایسی بنتی ہے!"

اس بار وہ گالی دیے بغیر نہ رہی پر وہ ڈھیٹ کی ڈھیٹ ہنستی رہی اور یہ آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر کمرے میں چلی آئی۔

کڑھتے میں سُوئی ٹانک کر اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر ایک جمائی لی اور پھر انگڑائی کے سے انداز میں بانہیں پھیلاتے ہوئے جامن کے پیڑ کے تنے کو گھورنے لگی۔ کچی جامنوں سے لدے پیڑ کی شاخیں تنے تک جھک آئی تھیں اور اس نے سوچا اس بار پھل خوب ہو گا اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ ان جامنوں کے پکنے تک پھوپھی اماں کے ہاں ہی رہے۔

شام سر پہ آ رہی تھی اور شفق کی سُرخی جبیناں کے چہرے پہ اپنا ہلکا ہلکا عکس ڈال رہی تھی اور وہ تپائی چھوڑ کر سستانے کے سے انداز میں آنکھوں پہ اپنی ہتھیلیاں رکھے گھاس پہ بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور پلکیں جھپک کر دیکھا تو اسے فیروز گھورتا ہوا نظر آیا ـــ!

اس نے جلدی سے سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا۔

"وہ کدھر ہے ـــ؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کون ـــ چمپو؟" اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں ـــ" وہ بڑے عجیب انداز سے مسکرایا۔ "میں تو مالی کا پوچھ رہا ہوں ـــ"

"مجھے کیا خبر ـــ؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا تو چمپو کدھر ہے ـــ؟" اس نے اس بار مسکراہٹ کو ہنسی میں ڈھال لیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرائی اور اسے اپنے آپ پر شدید غصہ بھی آیا آخر ایسے میں یہ مسکراہٹ کیوں منہ پر آ بیٹھی تھی ـــ دل میں کچھ کچھ اس بات کا افسوس بھی ہو رہا تھا کہ یہ لڑکا بھی بس اسی نامراد کو پوچھتا رہتا ہے اور جان بوجھ کر اس نے بڑے معصوم سے میں کہا۔ "پھوپھی اماں بیٹھی چھالیا کتر رہی ہوں گی۔"

"لسبتی جواب نہیں تھا بھابی۔ پر چھوڑو زمین کی تو سنو آسمان کی۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "ابھی میں ملانی جی کے بارے میں نہیں پوچھا۔"
اس نے جل کر کہا: "مجھے کیا خبر میں کوئی چھمو کی رکھوالی پر لگی ہوئی ہوں!"
وہ ہنستا ہی رہا ـــ اور وہ دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی کہ کم سے کم اسے یوں ہنسنا نہیں چاہیے ـــ!

اس سہ پہر گرمی بڑی تھی اور جھیناں کا دل چاہا کہ ٹھنڈے پانی سے خوب نہائے ـــ پر وہ نامراد چھمو کتنی دیر سے برآمدے والے نل کے ارد گرد چادر لٹکائے بیٹھی نہا رہی تھی۔ کچھ دیر تو جھیناں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی پر جب وہ نہا کر نہ نکلی تو اس نے چادر کا کونا کھینچا اور چلائی: "اے بی ـــ ذرا جلدی نہا ـــ نہانے بیٹھی ہے کہ جگالی پر لگی ہے ـــ"

"اے میں کوئی بھینس ہوں ـــ" وہ اندر سے بھینس کی طرح ڈکرائی۔

"اتنی دیر میں تو پچ آدمی نہا لیں ـــ"

"آتی ہوں!" اس نے زور زور سے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

اور جب جھیناں نہانے گئی تو پہلے تو اسے فرش کی صفائی کا خیال آیا ـــ جانے وہ کیسے نہائی تھی کہ ہر طرف گندگی پھیل رہی تھی اور اچھی طرح فرش دھو کر صاف کر کے جب وہ اپنے جسم پر صابن مل رہی تھی کسی نے چادر اٹھا کر زور سے ایک بھیانک آواز نکالی۔ بوکھلا کر اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فیروز کو گھورنے لگی جو حیرت، پشیمانی اور گھبراہٹ کے عالم میں آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا۔ وہ کچھ اس بری طرح سے سٹپٹائی کہ کچھ دیر تو اسے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ برہنہ نل کے بہتے ہوئے پانی کے دھارے کے عین نیچے کھڑی ہے اور پھر اچانک اس کے سارے بدن پر چیونٹیاں سی چھبیں اور چہرے پر جلن ہونے لگی۔

چادر چھوڑ کر وہ یہ کہتے ہوئے ہٹ گیا: "معاف کرنا ـــ میں سمجھا تھا ـــ وہ ہے ـــ"

سینے پر ہاتھ دھرے وہ گم سم اسی حالت میں کھڑی رہی اور پانی کا دھارا ایک شور کے ساتھ اس کے جسم پر گرتا رہا اور پھر جب اسے احساس ہوا کہ یہ سب کیا ہوا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روہانسی ہو کر اس نے اپنے لب دانتوں سے کاٹے اور پھر اپنے ننگے بازو کو زور سے کاٹ کاٹ لیا۔ پھر غصے سے اس نے اپنے سر کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔

جانے پھوپھی اماں اس وقت کہاں ہیں ـــ وہ رو ہی دی ـــ اس کی چیخ سن کر وہ ضرور بھاگی آتیں، اور پھر اس نے اپنی چیخ سے کہیں زیادہ خوفناک آواز میں پکارا: "چھمو ـــ چھمو ـــ!"

چھمو نے سامنے والے کمرے کے اندر سے آواز دی: "کیا ہے؟"

"چھمو ادھر مر!" اس نے غصے سے کہا۔

"نہیں مرتی!" وہ وہیں سے چیخی۔

"ٹھہر تو جا مردار ـــ میں ابھی تیری خبر لیتی ہوں!" اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور سسکنے لگی۔

پر جب وہ نہا کر کپڑے پہنے باہر نکلی تو بڑے کمرے میں سے اسے پھوپھی اماں کی آواز آئی۔ وہ گیلے بال تولیے سے خشک کرتی ہوئی ادھر کو آئی۔ فیروز پھوپھی اماں کے آگے بڑے فرمانبردار انداز میں بیٹھا تھا اور جانے کیا باتیں ہو رہی تھیں کہ اسے آتا دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔

بیٹی نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں، کچھ اور رک کے پھر بولی: "پھوپھی اماں —— چھمو کہاں ہے؟"

"جانے کہاں ہے ادھر مرتی ہی نہیں" فیروز نے شرارت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اس کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھی —— صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔

"کیا بات ہے بٹیا؟" پھوپھی اماں نے کہا۔

فیروز نے جلدی سے کہا: "ہاں ممانی جی! یہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی بڑے زور سے چلاتی تھیں۔ ان سے پوچھیں کیا ہوا تھا؟"

تلملا کر اس نے منہ پھیر لیا۔

"کیا ہوا تھا بیٹی؟"

"وہ چھمو سے کام تھا ——"

"کام تھا چھمو سے پر یہ تو یوں چیخی تھیں جیسے سانپ دیکھ لیا ہو ——" فیروز نے بن کر کہا۔

"ہاں ——" اس نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔ "میں کیچوے کو سنپولیا سمجھی تھی!"

"ارے نہیں ——" پھوپھی اماں نے گھبرا کر کہا —— "بیٹی ذرا خیال رکھنا —— کیچوے اور سنپولیے میں فرق کم ہی معلوم ہوتا ہے کہیں غلطی سے ہاتھ لگا بیٹھیں تو خواہ مخواہ اذیت ہوگی۔ اللہ بچائے ان منحوسوں سے!"

اور اسے احساس ہوا وہ سانپ تو چھمو بیٹھی تھی اور زہر اس کے تن بدن میں پھیل رہا تھا —— یہ کیسا زہر تھا کہ ایک نشہ سا سارے انگ انگ میں گھل مل رہا تھا اور کیف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر پپوٹے بھاری ہو ہو کر گرنے لگے تھے۔

وہ بہکے بہکے انداز میں کمرے میں سے نکل گئی۔

اور اب وہ جامن کے پیڑ تلے بیٹھی کوئی کام کر رہی ہوتی تو ذہن کسی اور ہی سوچ میں ڈوب رہا ہوتا اور آنکھیں نئے نئے خواب بن رہی ہوتیں۔ ایسے میں اسے چھمو بھاگتی ہوئی نظر آتی تو وہ چونکتی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتی اور پھر فیروز کو دیکھتے ہی اس کے لبوں پر ایک رسیلی مسکراہٹ پھیلنے لگتی۔ وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے زور سے چلاتا: "چھمو ادھر مرتی کیوں نہیں؟" تو وہ پلکیں بند کر کے اپنے لبوں پر بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کو سمیٹنے کی کوشش کرتی اور اب تو وہ خود چھمو کو بلا کر اپنے پاس بٹھاتی اور اس سے سرگوشیوں میں پوچھتی: "کوئی نئی بات نہیں کہی اس نے؟"

چھمو مزا لے لے کر اس کی کوئی نئی حرکت بتاتی اور وہ بڑے غور سے اس کی خرافات سنتی اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یونہی بن کر کہتی: "اللہ ہم تم سے بات نہیں کرتے —— کیسی گندی باتیں کرتی ہو ——"

پہلے پہل چھمو اس کے رویے پر بڑی حیران ہوتی پر بعد میں اس نے یہ کہہ کر زور شور سے اپنی باتیں کرنی شروع کر دیں کہ اب پتہ چلا تم واقعی لڑکی ہو —— ورنہ پہلے تو میں یہ سمجھی تھی تو پوری عورت ہی نہیں۔

دن اب یوں پر لگا کر اڑے کہ اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا اور جامنیں پک گئیں۔ انہی دنوں اماں کے ماموں پھوپھی اماں کے ہاں آئے اور انہوں نے بیٹی کو بلا بھیجا —— پر اس کا دل نہ چاہا کہ جائے اور پھوپھی اماں نے اس کی خواہش سمجھتے ہوئے کہہ دیا: "اے بھائی رہنے دو —— ابھی کچھ دن اور —— آخر کو ماں ہی کے پاس جانا ہے ——"

اور جامنیں کھاتے فیروز کی مجھو سے چھیڑ چھاڑ ہوتی دیکھ کر وہ یوں محسوس کرتی رہی جیسے اسے کوئی میٹھی میٹھی لوریاں دے کے بہلا رہا ہو اور ایسے ہی جب مجھو اس سے اپنی باتیں کرتے ہوئے گدگداتی تو اس کے سارے وجود پر نشہ سا چھا جاتا اور کانوں میں معصوم گھنٹیاں سی بجنے لگتیں۔

دنوں کے گزرنے کا تو بالکل خبر نہ ہوئی اور جب اماں نے ابا کے ہاتھ یہ پیغام کہلا بھیجا کہ بیٹی تمھاری بہن زینت اپنے بیاہ کے بعد پہلی بار ملنے آئی ہوئی ہے تو اسے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

پھوپھی اماں کے ہاں سے آتے سے وہ مجھو کو مل اور پھوٹ پھوٹ کر روئی اور جب دروازے سے باہر جانے کو تھی تو اس نے فیروز کو دیکھا۔ اس کی شریر آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی جیسی مجھو سے مذاق کرتے وقت ہوتی تھی اور گیلے گیلے لبوں پر مسکراہٹ کی چمک شدت سے تھی۔ وہ اسے ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا "بھئی جیناں! ہم سے کوئی خطا تو نہیں ہوئی نا——؟"

اس نے بچوں کی طرح سر ہلا دیا۔

"ہمیں بھول تو نہ جاؤ گی؟"

وہ چپ رہی—— اور وہ مجھو کے کندھے پہ ٹھوکا دے کر بولا "بھئی لوگ بڑے احسان فراموش ہوتے ہیں—— جاتے وقت یوں پرائے بن جاتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو——"

اور وہ خاموشی سے پلکیں جھپکتی اور کن انکھیوں سے مجھو کو تکتی واپس آگئی۔

گھر پہنچ کر چند دن تو وہ نڈھال نڈھال سی رہی۔ دل میں آتا اماں سے پوچھے زینت میاں کے ساتھ آئی ہے تو کیا مجھے بلانا ضروری تھا! پر کچھ کہہ نہ پائی۔ اماں نے اس کے تیور دیکھ کر جیسے جان لیا کہ بیٹی کو پھوپھی اماں کچھ زیادہ ہی پسند آئی تھیں اور ایک دن موقع دیکھ کر اسے خوب سمجھایا بلکہ یوں کہو کہ بیچاری کو خوب لتاڑا۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے اور عزیزوں کے ہاں جا کر یوں گھر سے بیزار نہیں ہوا کرتے۔ انھوں نے اسے ایک طویل لیکچر کے بعد یہ ذہن نشین کرایا اور وہ چپکی بیٹھی رہی۔

"اے بنو—— آخر کو زینت پہلی بار ادھر آئی ہے۔"

زینت آئی تو کون سی ایسی آفت آگئی۔ اس نے دل میں سوچا—— اور اسے بڑی کوفت ہوئی۔ اس صبح جب وہ ذرا جلد اٹھی اور چائے کے لیے پانی گرم کرنے باورچی خانے میں گئی تو اسے زینت کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا اور اس نے دیکھا—— زینت کے میاں نے بیوی کے رخسار پر ایک چٹکی لی اور بیوی نے گال ملتے ہوئے اک ذرا منہ بنایا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

جیناں کے سینے میں ایک میٹھا سا درد اٹھا—— اسے مجھو یاد آئی اور فیروز کی یاد جیسے اس کے ارد گرد جال بننے لگی۔ اور پھر اس کا دل چاہا زینت سے کہے "میں دیکھ رہی تھی دولہا بھائی نے تمھارے چٹکی لی تھی—— وہ فیروز مجھو سے اسی طرح مذاق کیا کرتا تھا——" اس کے قدم تیزی سے زینت کے کمرے کی طرف اٹھے پہ دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گئی اور اسے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ بھلا یہ بات وہ زینت سے کیسے کر سکتی تھی؟

زینت اور اس کے دولہا کے مذاق دیکھ دیکھ کر اس کے سارے تن بدن میں میٹھے میٹھے درد کا ایک لامتناہی سلسلہ سا

شروع ہوتے تھے اور اس کا دل بے ساختہ چاہنے لگتا کہ وہ انہیں کہے میں جاتی ہوں — وہاں پھوپھی اماں کے ہاں ——— پھر رک کر رہ جاتی —

بات سے بات پھوپھی اماں کے ہاں کی کوئی نہ کوئی بات ذہن کے دریچے میں آکر اٹک جاتی اور احساسات کی تیز ہواؤں میں جھولتی رہتی پر اس اٹکنے اور سلگنے میں جو تکلیف محسوس ہوتی اسے بیان کرنا انتہائی مشکل تھا اور آنکھیں بند کر کے وہ گہری سوچ میں ڈوبی ذہن کے دریچے سے لگی ہوئی باتیں نوچ نوچ کر اتارنے کی کوشش کرتی اور ایسے میں نڈھال ہو کر ہانپنے لگتی۔

زینت اپنے شوہر کے ہمراہ کچھ دن کے بعد چلی گئی پر اس کے ذہن کے نازک پردوں پر چھو اور فیروز کے گہرے نقش چھوڑ گئی اور جوں جوں وہ فیروز کا خیال دور کرنے کی کوشش کرتی، وہ اتنا ہی زیادہ یاد آتا اور اب تو وہ آنکھیں بند کرتی تو اسے اپنے سامنے فیروز اندھیرے میں سے روشنی کی طرف آتا ہوا محسوس ہوتا اور کئی بار وہ کسی کا سانس اپنے کانوں میں محسوس کرتے ہوئے کانپ گئی اور گھبرا کر آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی، پر وہاں کوئی نہ ہوتا ——— وہ اکیلی اور تنہا ——— جیسے ازل سے ابد تک کے لیے تنہا اور اکیلی تھی اور بس کسی کے سانس کا کانوں سے چھونے کا احساس اس کا ساتھی تھا — پر یہ ساتھی کیسا اذیت دینے والا تھا!! آئینہ دیکھتے ہوئے اس دوپہر اس نے ہلکے سے اپنے دائیں رخسار پہ ایک چٹکی لی — یوں کیسا محسوس ہوتا ہے ——— پھر ایک جلن سی محسوس ہوئی ہلکی سی جلن — اس نے زور سے دوبارہ چٹکی لی ——— اور درد سا محسوس ہوا ——— پر چھو کہتی تھی ——— اور چھو تو بہت کچھ کہتی تھی۔

فیروز کے ہاتھ کا لمس آنکھیں بند کیے وہ اپنے رخسار پہ محسوس کرنے لگی اور اسے خیال آیا چھو ٹھیک ہی کہتی تھی — اور یہ سوچتے ہی وہ بہکی بہکی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھنے لگی جیسے وہ فیروز کی یادوں میں یوں گھر گئی تھی جیسے کوئی پاگل بچوں کے ہجوم میں گھرا ہو۔

لیکن وہ پاگل چیخ سکتا ہے اور یہاں کوئی بھی نہ تھا ——— وہ تنہا تھی، بالکل تنہا ——— کوئی سہیلی، کوئی رفیق —— کوئی چھو کوئی فیروز کوئی بھی تو نہ تھا جس سے کچھ کہہ سکتی اور پھوپھی اماں کے ہاں کی باتیں یوں بار بار احساسات کی تیز ہواؤں میں لٹکی تو نہ رہتیں۔

سردیاں آئیں تو لحاف اوڑھے وہ خود سے باتیں کرنے لگی — اور پھر جیسے وہ خود اپنی ذات کو بھلا بیٹھی اور فیروز حقیقت بن کر اس کے قریب رہنے لگا۔ اپنے دونوں بازو اپنے ارد گرد باندھ کر وہ جیسے فیروز سے لپٹی ہوتی اور پھر سارے دن کے قصے اسے سنایا کرتی۔ اماں کی کہی ہوئی باتیں جھڑکیاں طعنے سو سو طرح کا غصہ وہ فیروز کو سبھی کچھ بتایا کرتی۔ آج اماں نے یہ کہا۔ آج وہ یہ کر رہی تھی کہ انہوں نے اسے اس بات سے جھڑکا اور ایسے ہی سارے قصے ———

اس نے اپنے فیروز کو گھر کی ایک ایک بات سے باخبر کر دیا ——— باخبر کیا وہ تو سب کچھ جان گیا۔ اس کے احساسات کو ——— اور لحاف کے اندر اپنے تکیے کو بھینچتے ہوئے اس نے اپنے سارے ارمان اسے بتا ڈالے ———

اس کا کوئی ایسا خواب نہ تھا جس میں فیروز نہ ہو — بلکہ یوں کہو اس کے خواب فیروز کے وجود سے جنے جا رہے تھے اور یہ خواب پھیل رہے تھے بکھر رہے تھے اور وہ انہیں سمیٹنے کی کوشش میں اور پھیلاتی چلی جا رہی تھی۔

اور پھر اماں اور ابا کی باتوں میں اسے چھو اور فیروز کی جھلک نظر آنے لگی اور وہ منہ بسور کر کہتی "اے لو — وہاں

پھوپھی اماں کے ہاں سے ۔۔۔

اور اماں پوچھتیں کیا ہوا ۔۔۔ تمہاری پھوپھی اماں کو؟

وہ جھینپ جاتی اور پھر بات کرتے وقت وہ فیروز کو بتاتی ۔۔۔ وہ جو تم نے حرکت کی تھی نا ۔۔۔ ارے وہی جس سے [illegible] تو ابھی آج مری بات الجھنے کی ۔۔۔

اور پھر سپنوں میں کھوئی تو وہ بات حقیقت بنی ہوئی اور چھو کی جگہ وہ خود اپنے آپ کو دیکھتی۔ کبھی غسلخانے کی دراڑوں سے جھانکتے ہوئے تو کبھی جامنوں سے جھولی بھرتے ہنستے ۔۔۔ اور انہی دنوں اس کے خوابوں میں شہنائی کی آواز گونجنے لگی۔ سرد راتوں میں شہنائی سنتے ہی وہ مچل مچل جاتی۔ اب تو سب خوابوں کی جگہ حقیقت لے لے گی اور اب تو کوئی آئے گا۔ اس کا فیروز آئے گا اور اسے لے جائے گا ۔۔۔ وہاں لے جائے گا جہاں وہ خوابوں میں پہنچی تھی۔ ان تمام جگہوں پر جہاں اس کے ارمانوں اور آرزوؤں نے بسیرا کیا تھا۔ ایک ایک گھڑی قیامت بن رہی تھی اور وقت اس آہستگی سے چل رہا تھا کہ بارہا وہ راتوں کو خوابوں سے چونکتی تو جھنجھلا جھنجھلا جاتی ۔۔۔

جانے وہ لمحے کب آئیں گے ۔۔۔!

اور پھر وہ لمحے آئے تو جیسے ایک ایک لمحے کے ہزاروں لمحے بن گئے۔ ایسے طویل ایسے لمبے کہ کاٹے نہ کٹتے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی رہی اور اس کے اردگرد نہ جانے کہاں سے ایک دم آج اتنی ساری سہیلیاں ۔۔۔ ارے ہاں! اسی کی سہیلیاں، آگئیں ۔۔۔ کوئی ڈھولک لیے بیٹھی ہے تو کوئی سہرا گا رہی ہے۔ ہر طرف شور ہے، اک میٹھا میٹھا ۔۔۔ کانوں میں رس گھولتا ہوا شور ہے اور وہ حیرت سے اپنے اردگرد چوری چوری دیکھتی رہی۔ یہ سب کہاں سے آگئے ہیں ۔۔۔ پہلے تو وہ تنہا تھی ۔۔۔ تنہا اپنے فیروز کے ساتھ اور ہاں وہ چھو جو اسے اپنی جگہ دے کر ماضی کے گڑھوں میں کود گئی تھی اب جیسے چھلانگ مار کر اس کے سامنے آگئی ۔۔۔

پر وہ ہے کہاں ۔۔۔ پھوپھی اماں کہاں ہیں ۔۔۔ وہ چھو کہاں ہے؟

دو ایک بار اس کے کانوں میں چھو کی آواز آئی۔ اس نے چونک چونک کر گھونگھٹ اٹھا اٹھا دیا اور اسے دیکھنا چاہا پر وہ کہیں نظر نہ آئی ۔۔۔ البتہ پھوپھی اماں اپنے اتنے بڑے پاندان سمیت اسے اپنے پاس بیٹھی نظر آئیں اور اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول بیٹھا۔

اور پھر ایک طوفان سا اٹھا۔ خوشی اور مسرت کا طوفان ۔۔۔ اور اس نے خود کو اس میں گھرے ہوئے پایا اور پھر جب وہ چونکی تو اس نے دیکھا۔ اماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ابو رو رہے تھے ۔۔۔ اور اس کی سہیلیاں رو رہی تھیں۔ ابا نے سر پہ ہاتھ رکھا تو بے اختیار آنسوؤں کا ایک سمندر سا اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

اور اب وہ بیٹھی تھی۔ پھولوں کی مہک میں بسی سجائی زیورات سے لدی پھندی وہ بیٹھی تھی اور اس کا ساتھی ۔۔۔ اس کا اپنا ساتھی اس کے قریب بیٹھا سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پہ پلکیں چپک سی رہی تھیں اور لاکھ کوشش کے باوجود وہ اس کے [illegible] باصرار کہنے پر بھی ان پلکوں کے بھاری اور وزنی پردوں کو اٹھا نہ سکی۔

اور پھر اس نے اس کے سانس کو اپنے کانوں کی لوؤں پہ محسوس کیا، پھر یہ سانس دھیرے دھیرے اس کے رخسار تک

[illegible] ہوا آنکھوں کی پلکوں پر سہرا ابھرا ہوا تھوڑی چمک سی پیدا اور پھر اس کے ہونٹوں میں گھل مل گیا ۔
[illegible] محسوس کیا جیسے دیکھا اور اپنے آپ ہی ڈھلتا ہوا محسوس کیا ۔ وہ ایک لمحہ جب وہ دونوں اپنی ذات ایک [illegible]
[illegible] ۔۔۔ وہ اس کے جسم کانپا اور جذبات کے تیز طوفان میں کمزور پتے کی طرح لرزا اور کانپنے لگا ۔ وہ بے قابو ہوتے
ہوئے [illegible] بے اختیار اس بری طرح چمٹ گئی جیسے کبھی جدا نہ ہو گی اور اس کے لرزتے اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے سرگوشیاں
میں نکلا ۔ میرے فیروز ۔۔۔ میرے اپنے ۔۔۔"

اور پھر جیسے اس کے بجلی سی کوندی ۔۔۔ اس کی آنکھوں پر سے پلکیں گھبرا کر اٹھ بیٹھیں اور پھر کڑکتی ہوئی بجلی سے آنکھیں
چکا چوند ہونے لگیں ۔ اس تاریکی میں اسے اتنی روشنی نظر آئی جیسے سورج سوا نیزے پر آن چمکا ہو ۔۔۔

وہ اپنی مٹھیاں بھینچ تلملاتے ہوئے چیخ رہا تھا ۔ " وہ کون ہے ۔۔۔ فیروز کون ہے ؟ ۔۔۔ مجھے بتاؤ !" اور قریب
پڑی ہوئی تپائی پر ٹکر مارتے ہوئے چیخا ۔ "کتیا !"

خوف کے ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے خود کو یوں سمیٹا جیسے جنت کے عالیشان محل کی گرتی ہوئی اینٹوں سے خود کو بچانے
کی کوشش کر رہی ہے !

نئی کتابوں پر تبصرہ

شعر العرب علامہ شبلی نعمانی نے فارسی شاعری کی تاریخ "شعر العجم" کے نام سے پانچ جلدوں میں لکھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اُردو شاعری کی تاریخ "شعر الہند" کے نام سے دو جلدوں میں تالیف کی۔ عربی کی جگہ اس وقت تک خالی تھی اسے پروفیسر عبدالصمد صاحب صارم الازہری نے "شعر العرب" شائع کرکے پورا کیا۔ اوّل الذکر دونوں تذکروں اور شعر العرب میں فرق یہ ہے کہ پہلی دونوں کتابوں میں بالترتیب فارسی اور اُردو کی تاریخ مسلسل طور پر بیان کی گئی ہے مگر موخر الذکر کتاب میں عربی شعراء کا مختصر حال اور ان کے بہترین عربی اشعار کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر دونوں کتابیں علی الترتیب براہ راست فارسی اور اُردو میں لکھی گئی تھیں مگر موخر الذکر کتاب ترجمہ ہے مشہور عرب فاضل ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ کی مشہور عالم کتاب "الشعر والشعراء" کا۔ عربی ادب میں اس کتاب کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے اور یہی شہرت غالباً اس کے ترجمہ کا باعث ہوئی۔ یہ قریباً دو سو شعراء کا مبسوط تذکرہ ہے جس میں امرؤ القیس سے لے کر اشجع اسلمی تک کے شعراء کا حال ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے یہ تذکرہ جاہلی شعراء سے لے کر عباسی دور کے شعراء تک محدود ہے۔ بعد کے شعراء کے متعلق فاضل مترجم نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کا تذکرہ دوسری جلد میں خود مرتب فرمائیں گے۔ علامہ صارم ازہری پاکستان کے مشہور ادیب ہیں اور اب تک ایک سو بارہ عربی، فارسی اور اُردو کی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ زیر تنقید کتاب بڑی تقطیع کے ۴۲۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ترجمہ لفظی ہے اس لیے اس میں وہ شگفتگی اور روانی پیدا نہیں ہو سکی جو ایک تصنیف میں ہونی چاہیے۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا فاضل اور عالم ہو مگر وہ کسی زبان کے لفظی ترجمہ میں ہرگز لطافت اور خوبی پیدا نہیں کر سکتا۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ہی لے لیجیے اس کا لفظی ترجمہ ہے "ساتھ نام اللہ رحمٰن رحیم" بتلائیے کیا بات بنی؟ کتاب کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم کو کتاب کے شائع کرنے کی عجلت میں شاید اس پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، ورنہ اس قسم کے فقرے اس میں نہ ہوتے کہ "میں نے اس کتاب میں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن پر شعر غالب تھا" ص۱۲، یا مثلاً "ہمارے نزدیک اس کی بات بنا بر تاخیر زمانہ کے یا نو پید ہونے کے بے قیمت نہیں ہو گئی ہے" ص۱۳، یا "اگر خدا ہماری خاطر اس سے مصائبات کو اور موت مقدر کو دفع کر دے تو کیا ہی بہتر ہو" ص۱۵۹، یا "اس کے سینہ میں راز گاہ ہے" ص۱۶۱، یا "رقیبوں کی آنکھیں چھپ جاتی ہیں" ص۱۶۲، یا "میں سخاوت کے جوانمرد کی سخاوت کو تعزیت کرتا ہوں" ص۱۶۳، یا "اب ہم سخاوت کے ٹھوکر کھانے اور بخالت کے سخاوت پر ظلم سے ڈرتے ہیں" ص۱۶۳، یا "نابغہ اقوا کرتا تھا" ص۱۶۶۔ امید ہے کتاب کے دوسرے اڈیشن میں یہ ساری باتیں دور کی جائیں گی اور کتاب نہایت حسین شکل میں ناظرین کے سامنے آسکے گی۔

کتاب کے شروع میں مترجم اور مؤلف کے حالات، عرضِ مترجم اور مقدمہ مؤلف شامل ہے۔ مقدمہ میں ابن قتیبہ نے فنِ شعر کی مختلف اصناف پر بحث کی ہے۔ شعراء کے حالاتِ زندگی ابن قتیبہ نے بالعموم بہت ہی کم لکھے ہیں یہاں تک کہ بعض شعراء کے

مرتضائی میں اہل دل کے کلام کا انتخاب خاصا دیا ہے۔ اس کمی کو فاضل مترجم نے اس طرح پورا کیا ہے کہ کتاب کے آخر میں اکثر شعرا کا مستند حال لکھ دیا جو یقیناً بہت مفید اور اضافہ ہے۔ کتاب نیوز پرنٹ پر چھاپی گئی ہے اور غیر مجلد ہے قیمت آٹھ روپے ہے اور ملنے کا پتہ ادارہ علمیہ ۵۳ دھنی رام روڈ، انارکلی لاہور ہے۔ (م-ا)

تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی

یہ کتاب جس قدر اسم بامسمیٰ ہے اسی قدر دلچسپ اور پُرلطف ہے۔ اس قدر زیادہ کہ شروع کر کے ختم کیے بغیر چین نہیں آتا۔ اس عجیب و غریب داستان کے مصنف مولوی محمد جعفر تھانیسری ثم پانی پتی ہیں جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے مشہور مجاہد تھے اور انھوں نے جوشِ جہاد میں قید و بند کے ہولناک مصائب برداشت کیے۔ ان کو انگریزوں نے پہلے موت کی سزا دی، پھر اسے حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا۔ تقدیر کے زبردست تھے جو کالا پانی سے زندہ بچ کر پانی پت واپس آ گئے اور اپنے مصائب و آلام کی یہ پُر درد کہانی بڑے اثر انگیز الفاظ میں تحریر کی۔

اس کتاب کے کئی اڈیشن اس سے پہلے شائع ہو کر ختم ہو چکے تھے اور اب ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ جناب محمد ایوب صاحب قادری ایم اے جوائنٹ سکرٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی صد ہزار مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کے مختلف اڈیشن بڑی محنت سے اکٹھے کیے اور پھر ان کی مدد سے نہایت صحت کے ساتھ اس اڈیشن کو مرتب کیا، اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا، اس پر تعلیقات کا اضافہ کیا، اس کا اشاریہ مرتب کیا، اس کے حواشی اور تعلیقات میں قریباً ۷۰ کتابوں سے اخذ و انتخاب کیا اور اس کے بعد اس کتاب کو شائع کیا۔ اس لحاظ سے یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ بہتر اڈیشن ہے اور بلاشبہ ایوب صاحب کا بڑا اعلیٰ درجہ کا علمی کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی کم کتابیں ایسی لیاقت اور کاوش سے شائع ہوئی ہیں جیسی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ ایوب صاحب کا دماغ علمی کاموں کے لیے نہایت موزوں واقع ہوا ہے اور وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں بڑی لیاقت، کاوش اور محنت کے ساتھ اسے انجام دیتے ہیں۔ اس سے قبل مولوی رحمان علی کی مشہور فارسی کتاب تذکرہ علمائے ہند کو بھی وہ ایسی ہی خوبی کے ساتھ مدون کر چکے ہیں ——

تواریخ عجیب کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے اور ملنے کا پتہ پاک اکیڈمی (۱۴۱/۱) وحید آباد۔ گولی مار کراچی ۵ ہے۔ (م-ا)

تاریخ سرکشی ضلع بجنور

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کے وقت سرسید بجنور (یو۔پی) میں صدر امین تھے یکایک ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو وہاں خبر پہنچی کہ فوج میں بغاوت ہو گئی اور دہلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس اطلاع کے پہنچتے ہی دوسرے اکثر مقامات کی طرح بجنور میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس وقت وہاں ۲۰ کے قریب انگریز بہادر اور ان کے بچے موجود تھے مگر سب کے چہرے فق ہو گئے اور ان کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے کھیلتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ ایسے ہولناک وقت میں جبکہ انگریز کے لیے زمین و آسمان میں کہیں جائے پناہ نہ تھی سرسید نے کمال بہادری سے کام لے کر اور اپنی جان کو سخت خطرہ میں ڈال کر نہ صرف مسٹر شیکسپیئر ڈپٹی کمشنر اور تمام انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں بلکہ ان کو محفوظ مقام پر پہنچا کر مطمئن کر دیا اور انگریز ڈپٹی کمشنر کے چلے جانے کے بعد ضلع بجنور کا انتظام بڑی خوبی سے کیا۔ جب اس عظیم خدمت اور بے نظیر قربانی و ایثار کے صلہ میں انگریزی حکومت نے سرسید کو میر صادق علی والیٔ چاندپور ضلع بجنور کا ضبط شدہ بڑا بھاری علاقہ بطور انعام دینا چاہا تو سرسید نے یہ کہہ کر اس کے لینے سے انکار کر دیا کہ "میں ایک مسلمان کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھاؤں گا۔"

ہنگامہ کے اس تمام دوران میں جو جو ہولناک واقعات خاص بجنور اور متعلقہ علاقہ میں پیش آئے۔ سرسید کو جس طرح بار بار سینہ سپر ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں نے جس بری طرح علاقے کو لوٹا۔ جتنی تباہی اور بربادی اُس وقت ہر جگہ پھیلی۔ جتنے ظلم اُس زمانہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے اور جس طرح سارے علاقے میں خود فساد برپا کر کے اُس کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ ان سب حادثات کا آنکھوں دیکھا نہایت دردناک حال ۱۸۵۸ء میں سرسید نے تاریخ سرکشی ضلع بجنور کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب اُس پر آشوب زمانہ کے ہولناک واقعات کا نہایت صحیح مرقع ہے۔ مگر عرصہ سے نایاب تھی اور کہیں نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر سید معین الحق ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی مدیر بصائر کراچی و سکریٹری ہسٹاریکل سوسائٹی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے دوبارہ نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ شروع میں بطور مقدمہ سرسید پر ایک بصیرت افروز مضمون لکھا ہے۔ جس میں ان کی مختلف حیثیتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پھر اُس پر نہایت محنت کے ساتھ حواشی لکھے ہیں۔ جن جن اہم شخصیتوں کے نام اس کتاب میں آئے ہیں۔ اُن کے حالات آخر میں بہت تلاش کے بعد فراہم کئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آج سے ایک سو برس پہلے کے اُس ہولناک اور خونی ہنگامہ کے تمام واقعات آنکھوں کے آگے پھرنے لگتے ہیں جس کی بربادی اور تباہی کو ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس سے زیادہ صحیح اور مستند مرقع ان واقعات کا آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۳۱۰۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: سلمان اکیڈمی۔ حق نشان نمبر ۳۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۵

(م۔ ا)

تذکرہ صوفیائے پنجاب

پنجاب کے وہ صوفی اولیاء اللہ جن کی کوشش اور سعی کی بدولت اس علاقہ میں اسلام پھیلا۔ تاریخ اسلام کی نہایت اہم اور نمایاں شخصیتیں ہیں۔ اُن کے نام مبلغینِ اسلام کے لحاظ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور اُن کا تذکرہ زبانوں پر باقی رہے گا۔ ان بزرگوں کی زندگی کو عوام نے خوارق اور کرامات کے پردوں میں ایسا چھپایا کہ اُن کا اصلی چہرہ لوگوں کی نظروں سے مخفی ہو گیا اور کسی کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ ان مقدس اصحاب کی اصلی کرامت اور حقیقی معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے محض اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر۔ عرب۔ عراق اور ایران سے آ کر سرزمین پنجاب میں ڈیرے ڈالے اور یہاں بیٹھ کر یہاں کے روحانی مُردوں کو زندہ کیا۔ روحانی بہروں اور اندھوں کو کان اور آنکھیں بخشیں۔ اور تین کروڑ ساٹھ لاکھ خداؤں کے پجاریوں کو خدا کے واحد و یگانہ کا بندہ بنایا۔ غرض اپنے روحانی فیض سے ایک عالم کو منور کیا۔ اور اپنی زندگیاں خدا کے دین کی نصرت و اعانت اور اسکی تبلیغ و اشاعت میں وقف کر دیں۔ خود نہ کبھی اچھا کھایا نہ اچھا پہنا۔ جھونپڑیوں میں رہے اور میدانوں میں اپنی عمریں بسر کیں۔ مگر دنیا کو اسلام کی لازوال دولت سے مالا مال کر گئے۔ خدا اُن سے خوش ہو گیا اور افضل البشر۔ خیر الرسل۔ نبی مجتبیٰ۔ احمد مصطفیٰ خاتم النبیین حضرت محمد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے راضی ہو گئے۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔" جس پر شاعر مشرق نہایت فخر سے کہتا ہے ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

تذکرہ صوفیائے پنجاب: ان ہی مقدس اور محترم بزرگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے پنجاب میں بیٹھ کر اسلام کی تبلیغ کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پنجاب کے کونہ کونہ اور قریہ قریہ تک پہنچایا۔ یہ قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب سالہا سال کی محنت و کاوش، تلاش و اقتباس، انتخاب و اخذ کے بعد مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرتب فرمائی ہے۔ اور ان بزرگوں کے حالات کی جمع و ترتیب میں حتی الامکان بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اور ایک بہت عمدہ ذخیرہ بزرگان دین کے حالات و واقعات کا ہمارے لیے فراہم کر دیا ہے۔ جن سے ہم اصلاح و ہدایت اور اخلاق و موعظت کے بہت سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ باقی رہے عیوب و نقائص تو ان سے سوائے قرآن کریم کے کونسی کتاب خالی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی بعض باتیں غلط لکھی گئی ہوں۔ بعض بزرگوں کے حالات تشنہ ہوں۔ بعض صوفیوں کی سوانح موجود نہ ہوں۔ مگر ان معمولی فروگذاشتوں سے نہ دنیا کی کوئی کتاب خالی ہے اور نہ ان سے کتاب کی افادیت اور عظمت میں کچھ فرق آتا ہے۔ دنیا میں کون کہہ سکتا ہے کہ میری مرتبہ کتاب ہر نہج سے کامل، مکمل اور اکمل ہے اور اب اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں! پس اگر اس قابل قدر تذکرہ میں بھی بعض بزرگوں کے نام اور حالات لکھنے رہ گئے ہوں تو اسے مورد طعن بنانا اور قدوسی صاحب کی بے انتہا محنت پر پانی پھیرنا کوئی محمود صفت نہیں۔ جسے موصوف نے نہایت کاوش کے ساتھ ۸۲ عربی، فارسی اور اردو کتابوں سے اخذ کر کے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے صفحات ۱۰، ۱ ہیں اور اس میں ۹۳ بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ کاغذ اچھا لگایا گیا ہے اور ۹۳ صوفیاء کے تذکروں پر منقسم ہے۔ قیمت مجلد علاوہ محصول ڈاک پندرہ روپے ہے۔

ملنے کا پتہ: سلمان اکیڈمی جن نشان ع۳۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵ (م - ل)

مجلسِ ترقی ادب لاہور کی کلاسیکی مطبوعات

پاکستان میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر مجلس ترقی ادب لاہور قدیم اُردو اساتذہ کے نثری اور منظوم شاہکار جدید اصولوں کے مطابق مرتب کرا کے شایانِ شان نفاست کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ ان کتابوں میں متن کی صحت، علامات وقف اور پیراگراف بنانے کا خاص خیال رکھا گیا ہے، نیز کتاب کی ادبی اہمیت، مصنف کے حالاتِ زندگی اور طرزِ نگارش پر جامع مقدمے لکھوا کر شاملِ کتاب کیے گئے ہیں۔ تمام کتابیں دیدہ زیب ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں، قیمتیں انتہائی کم رکھی گئی ہیں تاکہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔

اس سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں :-

۱۔ مسافرانِ لندن (سرسید کا سفرنامۂ لندن) مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۲/-
۲۔ قصصِ ہند، از شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد	۲/-
۳۔ ابن الوقت، از شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد دہلوی	۳/۵۰
۴۔ وکرم اُروسی، از مہاکوی کالی داس، ترجمہ محمد عزیز مرزا لکھنوی، مرتبہ عشرت رحمانی	۱/۷۵
۵۔ رسومِ ہند، از رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی، کپتان ڈبلیو۔ جے۔ الرائیڈ	۳/۵۰
۶۔ حیاتِ سعدی، از شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	۲/۵۰
۷۔ فردوسِ بریں، از مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی، مرتبہ سید وقار عظیم	۲/-
۸۔ مذہبِ عشق، از نہال چند لاہوری، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی	۲/-
۹۔ سوانحِ مولانا روم، از شبلی نعمانی، مرتبہ سید عابد علی عابدؔ	۲/۵۰
۱۰۔ مقالاتِ سرسید (دس حصوں میں) مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی حصہ اول: ۴/۵۰، حصہ دوم: ۲/۵۰، حصہ سوم: ۳/- حصہ چہارم: ۵/۵۰، حصہ پنجم: ۴/۵۰، حصہ ششم: ۴/۵۰، حصہ ہفتم: ۲/۵۰، حصہ ہشتم: ۱/۷۵، حصہ نہم: ۲/۵۰، حصہ دہم: ۲/۷۵	
۱۱۔ دیوانِ خواجہ میر درد، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی	۳/۵۰
۱۲۔ فسانۂ مبتلا، از ڈپٹی نذیر احمد	۴/۵۰
۱۳۔ قواعدِ زبانِ اُردو مشہور بہ رسالۂ گلکرسٹ	۲/-
۱۴۔ نورتن، از محمد بخش مہجور	۶/-
۱۵۔ مہتابِ داغ	۷/۵۰

مجلسِ ترقی ادب، ۲۔ نرسنگ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور

ستائیس سال کے بعد

نقشِ چغتائی

کا نیا ایڈیشن نہایت آب و تاب اور رعنائی سے شائع کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

تصاویر کی ندرت۔ حسنِ طباعت۔ سائز۔ کاغذ۔ جلد۔ ضخامت کے اعتبار سے پہلے ایڈیشن سے بالکل مختلف، نہایت جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔

چغتائی آرٹ

کی رنگینیوں کا بے مثل مرقع ہے۔ اس کی اشاعت پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ نیا ایڈیشن

چھ رنگین تصاویر۔ سولہ ایک رنگ تصاویر اور تین صفحہ جمیل سے مزین ہے۔ ہر ایک صفحہ منقش حاشیہ کے ساتھ دو رنگ میں اور تمام متن بلاک میں ولائیتی کاغذ پر چھپا ہے

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

کی مثال قائم کی گئی ہے۔

آرٹ اور ادب

کے اس غیر فانی نقش کو دیکھ کر آپ پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہوگی مصوری کی عدیم النظیر خدمت کے علاوہ اردو ادب اور طباعت کی عظیم الشان خدمت انجام دی گئی ہے ◆

جلد سنہری نہایت خوبصورت بائبل نما

قیمت پچیس روپے ۲۵/-

مکتبہ کارواں ——— کچہری روڈ۔ لاہور

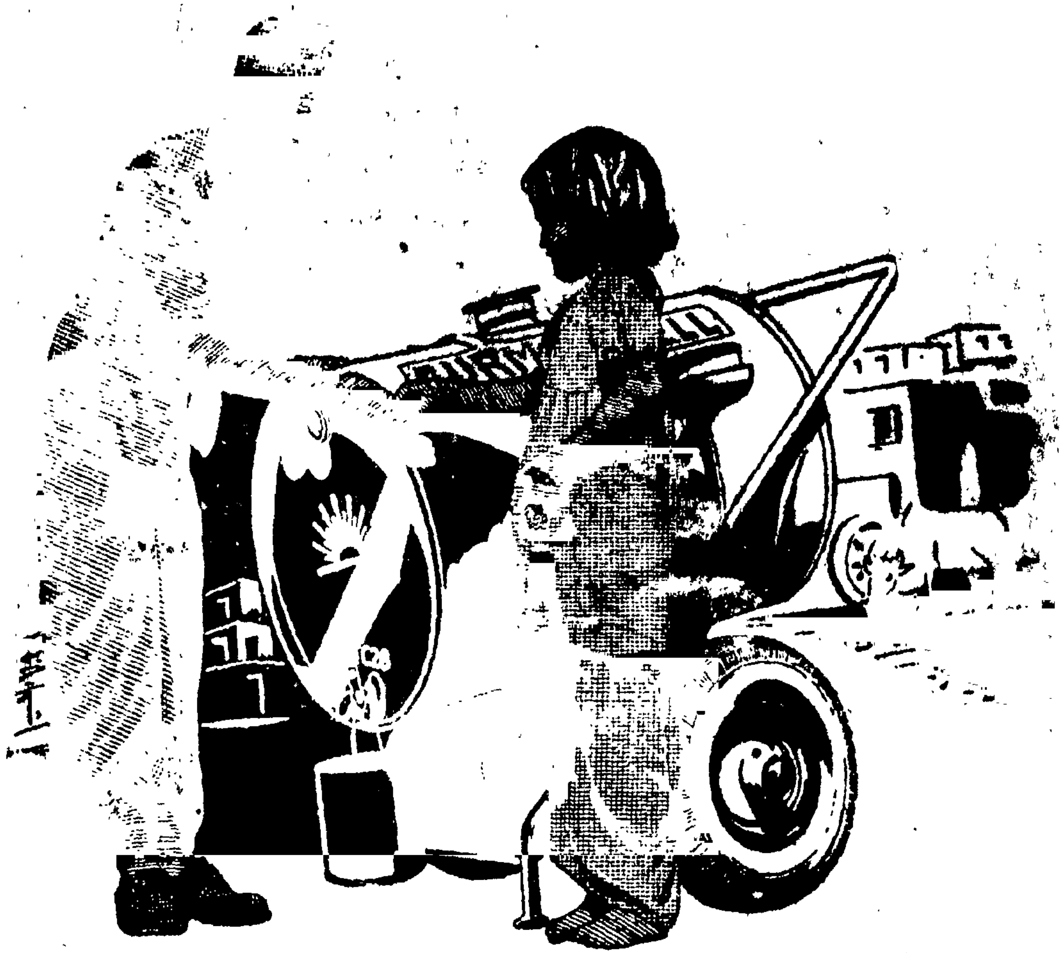

فوری خدمت

اور وہ بھی گھر بیٹھے

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں آدمیوں کو مٹی کے تیل کی ضرورت ہے چنانچہ برما شیل کا عملہ ہمہ وقت اس بات کیلئے کوشاں رہتا ہے کہ آپ کی ضرورت گھر بیٹھے ہی پوری ہو سکے۔

آپ کی مزید سہولت کیلئے برما شیل نے جابجا "کیروسین فلنگ اسٹیشن" بھی بنائے ہیں تاکہ آپ حسب ضرورت مٹی کا تیل خرید سکیں۔

برما شیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

برما شیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(پاکستان میں قائم شدہ۔ کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود ہے)

ہماری کتابیں

جو علم و ادب کی آبرو ہیں

غیر مطبوعہ بہارستان	امیر مینائیؒ	انتخابِ کلام	۲/۵۰
بادۂ شبینہ	اخترؔ انصاری	〃	۳/۵۰
من آنم	فراقؔ گورکھپوری	مجموعۂ مکاتیب	۴/-
شعلۂ طور	جگرؔ مرادآبادی	مجموعۂ کلام	۴/۵۰
بنفشے کے پھول	کرشن چندر	ناول	۲/-
میری یادوں کے چنار	〃	〃	۴/-
گدھے کی واپسی	〃	طنزیہ	۳/-
سورج نہیں نکلا	اے حمید	ناول	۴/-
صاحب	محمد طفیل	خاکے	۲/-
جناب	〃	〃	۳/-
اندازے	فراقؔ گورکھپوری	تنقید	۵/-
ہماری داستانیں	سید وقار عظیم	〃	۵/-
انتقاد	عابد علی عابد	〃	۳/-
ید بیضا	〃	ڈرامے	۵/-
ایک حمام میں	عشرتؔ رحمانی	ڈراما	۲/-
خلفائے محمد	عمر ابو النصر	سوانح	۱۰/-
بازارِ حیات	احمد ندیم قاسمی	افسانے	۳/-
آنچل	〃	〃	۳/-
اردو غزل گوئی	فراقؔ گورکھپوری	تنقید	۲/-
منٹو	ابو سعید قریشی	سوانح	۴/۲۵
سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	افسانے	۳/-
قول و قرار	عدم	مجموعۂ کلام	۲/۵۰
رنگ و خم	〃	〃	۳/-
باغ و بہار	〃	〃	۴/۵۰
روزن	قتیلؔ شفائی	〃	۳/-

[illegible]	بلونت سنگھ	ناول	۴/-
مٹی کی مونا لیزا	اے حمید	افسانے	۲/۵
سیاست الٰہیہ	ابن تیمیہ		۳/۵
مضامین جمال الدین افغانی		مضامین	۵/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	ناول	۴/-
پندرہ انگشت	رشید اختر ندوی	〃	۳/-
عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	خطوط	۲/۵
آگ	قیسی رام پوری	ناول	۳/-

اسلامی کتب

بلالؓ	عباس محمود العقاد	سوانح	۲/۲۵
عہد نبوی کی اسلامی سیاست	عبد المتعال الصعیدی		۵/-
اسلام کا نظام عدل	محمود بن محمد بن عرنوس		۴/۵۰
خدیجہؓ	عبدالحمید السحاری	سوانح	۴/-
نبی اُمی	عمر ابو النصر	〃	۵/-
عرب کے تین مدبر	〃	〃	۴/-
خالدؓ		〃	۴/-

تصانیف شوکت تھانوی

بھابی	۴/۵	بارِ خاطر	۴/-	مولانا	۳/۵
خدانخواستہ	۳/-	کتیا	۲/۵۰	سسرال	۲/۲۵
مابدولت	۳/-	جوڑ توڑ	۴/-	وغیرہ وغیرہ	۲/-
غالب کے ڈرامے	۲/۵۰	نیلوفر	۶/-	سب بے قاعدہ	۲/-
غزالہ	۶/-	سودیشی ریل	۳/-	سانچ کو آنچ	۳/۵۰
کارٹون	۲/۵۰	بقراط	۲/۵۰	مضامین شوکت	۲/۵۰
نکمرہ	۳/-	قاضی جی حصہ اول	۲/۵۰	قاضی جی حصہ دوم	۳/۵۰
		قاضی جی حصہ سوم	۲/۵۰		

ادارۂ فروغِ اردو - لاہور